یاد از شام غریبانِ خموشاں کردیم
مشتے از سرمہ گرفتیم و پریشاں کردیم

تاریخ لکھنؤ

لکھنؤ کی سیاسی، علمی، ادبی اور تمدنی تاریخ

مرتبہ

محمد باقر شمس

دارالتصنیف کی ساتویں پیشکش

تاریخ لکھنؤ

لکھنؤ کی سیاسی، علمی، ادبی اور تمدنی تاریخ

مرتبہ

محمد باقر شمس

پتہ: دارالتصنیف سی۔۳۰، رضویہ سوسائیٹی کراچی ۱۸
قیمت

مصنف : محمد باقر شمس

طابع : احمد برادرس پرنٹرز، ناظم آباد، کراچی

ناشر: محمد فاخر

کتابت : سکندر طاہر

قیمت : ۲۵۰/- روپے

ملنے کا پتہ: دارالتصنیف ۳۰، سی رضویہ سوسائٹی کراچی ۱۸

نذرِ عقیدت

علوم و فنون کے مربی تہذیب و تمدن کے معمار

فرمانروایانِ اودھ

کی

بارگاہ میں

ذرۂ ناچیز

شمس

دیباچہ طبع دوم

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی بڑا کام بے ساں گمان ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کے لئے بھی یہی ہوا۔ ایک صاحب کی فرمائش پر میں نے لکھنؤ کے متعلق ایک مضمون رسالہ عکس لطیف کے لئے لکھا دو تین قسطوں میں اس کو تمام کرنے کا ارادہ تھا مگر جب مضمون شائع ہوا تو لوگوں نے اسے بہت پسند کیا۔ مکرم صاحب ایڈیٹر رسالہ نے اس سلسلہ کو جاری رکھنے پر اصرار کیا بات میرے بھی ذوق کی تھی سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ایک کتاب مرتب ہو گئی۔ جس کا سہرا اکرم صاحب کے سر ہے۔ پھر انہوں نے ہی ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب سے ایک تعارف لکھوا کے اس کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جو اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ہے ادیب مکرم صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جس کے لئے وہ شکر گزاری کے مستحق ہیں موصوف خاندان عشق و نفتش کی یادگار ہیں، شاعر ہیں، مضمون نگار علم و فن کے پرستار ہیں۔

پہلے ایڈیشن میں فرمانروایان اودھ کے حالات سے نہ ہونے کے برابر تھے۔ صرف انہی باتوں کی تفصیل تھی جس کا تعلق علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے ہے احباب کا اصرار تھا کہ حکمرانوں کے حالات بھی ہونا چاہئیں۔ میں نے بھی اس کمی کو محسوس کیا۔

کیونکہ ان کے حالات میں بہت غلط فہمیاں پیدا کر دی گئیں ہیں۔ جنکا دور کرنا ضروری تھا اور میں نے بہت حد تک اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اس ایڈیشن میں منشی انعام علی کی قلمی تاریخ اوصاف آصف سے بہت اہم واقعات

لئے ہیں جو کسی اور تاریخ میں نہیں ہیں جیسے صفدر جنگ کی مرہٹوں سے پہلی جنگ ان کی شادی ابدالی جنگ شجاع الدولہ کی شادی وغیرہ کے تفصیلات منشی جی برہان الملک کے زمانہ میں لکھنؤ میں تھے صفدر جنگ کے زمانہ میں ان کی ملازمت میں داخل ہوئے اور پھر ان کے ساتھ رہے آصف الدولہ کے زمانہ میں پیرانہ سالی کی وجہ سے نوکری سے سبکدوش ہو کے اپنے وطن بجنور ضلع لکھنؤ چلے گئے اور وہیں یہ تاریخ لکھی جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ لکھا ہے اس میں کوئی بات جھوٹ نہیں ہے اس کے علاوہ اس ایڈیشن کی تیاری صاحب زادہ مہدی علی مرزا صاحب کی توجہ کی رہین منت ہے۔ موصوف اودھ کے شاہی خاندان کے فرزند رشید ہیں اور اپنے بزرگوں کی طرح علم وفن کے قدردان ہیں۔ انہوں نے اودھ کی تاریخ کا اچھا خاصہ ذخیرہ فراہم کیا ہے اور ہر اس شخص کو وہ کتاب دے دیئے ہیں جس کو سمجھتے ہیں کہ وہ اس سے کام لے سکتا ہے۔ مجھے بھی انہوں نے بہت سی کتابیں دیں جن کی مدد سے میں یہ کتاب لکھ سکا جس کے لئے میں ان کا شکرگذار ہوں۔

پہلے ایڈیشن میں ۱۹۵۰ء تک کے لکھنؤ کی تاریخ تھی۔ اس ایڈیشن میں آج تک کے لکھنؤ کی مختصر تاریخ ہے۔ اور تصویروں کا بھی اضافہ ہے۔ علمائے اہل سنت تصویر کشی حرام سمجھتے ہیں اس وجہ سے ان کی تصویریں نہیں ہیں علمائے شیعہ میں جن کی تصویریں ان کے اخلاف نے فراہم نہیں کیں۔ ان کے نہ ہونے کا مجھے افسوس ہے۔

حسین انجم صاحب ایم اے ایڈیٹر رسالہ طلوع افکار کا شکریہ ادا

نہ کرنا ناسپاس گذاری ہوگی۔ موصوف ایک بڑے عالم و فاضل مولانا حسن علی لندنی کے اخلاف میں ہیں اور علم و فن کے پرستار ہیں، شاعر ہیں اور انشاء پرداز ہیں موصوف نے اس کتاب کی طباعت میں سہولتیں پیدا کیں۔ جس کا میں دل سے شکر گذار ہوں۔

آخر میں یہ عرض کر دوں کہ اس کتاب کے نصف آخر میں کچھ لوگوں کے حالات کم اور کچھ کے زیادہ ہیں اس ناہمواری کا مجھے احساس ہے مگر اب لوگوں کے حالات فراہم کرنا جو میرے خیالات کے مطابق نہیں ہے جو کچھ بھی ہے اور جیسا بھی ہے حاضر خدمت ہے۔

فقط والسلام

ذرّہ ناچیز

شمس

۱-۱-۹۱

دیباچہ طبع اوّل

ادارۂ عکسِ لطیف کی پیشکش

برصغیر پاک و ہند کے مایہ ناز ادیب مولانا سید محمد باقر صاحب شمس نے لکھنؤ کی علمی اور تمدنی تاریخ کا جو سلسلہ عکسِ لطیف میں شروع کیا تھا وہ باقساط پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ قارئین کرام نے جسقدر اس مضمون کو پسند کیا اس کا اندازہ ادارہ کو تعریفی خطوط کی کثیر تعداد کے موصول ہونے سے ہوا، ہر صاحبِ ذوق اس تاریخ کی مکمل قسطوں کو محفوظ کرنے کا خواہشمند تھا، بیشتر شائقین ادب کے پاس یہ اقساط سرمایۂ ادب کی حیثیت سے محفوظ ہیں لیکن صدہا اربابِ ذوق ایسے ہیں جن کے پاس اس سلسلہ کی کوئی نہ کوئی کڑی کم ہے۔ اور وہ بار بار ادارے کو خط لکھ کر مختلف یا مکمل قسطیں طلب کرتے ہیں ہم اپنی اس کوتاہی پر معذرت خواہ ہیں کہ ان کی فرمائش کو پورا کرنے سے قاصر رہے قارئین کے خلوص طلب اور ہماری گذارش نے جناب شمس کو اُن اقساط کے دوبارہ شائع کرنے پر آمادہ کر لیا ہے اور اب جناب موصوف نے نظر ثانی میں حذف و اضافے سے اس ادب پارے کو نئی جلا بخشی ہے ادارہ جناب شمس کی اس نوازش کا شکر گذار ہے جو تعریفی خطوط ہمیں موصول ہوئے ان میں جناب مولانا سید مرتضیٰ حسین صاحب فاضل کا خط اس غرض سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ کتاب کی افادیت پر ایک بصیرت افروز تبصرہ ہے۔

۲۲-۳-۱۹۷۱ء

جناب مکرم صاحب   السلام علیکم ، مزاج شریف

عکسِ لطیف جلوہ ریز ہوتا رہتا ہے، شکریہ۔ دسمبر ۱۹۷۰ء اور جنوری ۱۹۷۱ء کے

دونوں پر چھلے، میری مخلصانہ دعائیں اور حقیقت پسندانہ آفرین قبول فرمائیں "عکس لطیف" جس ادبی معیار کا ترجمان ہے یہ ماہنامہ جس محنت سے آپ مرتب کرتے ہیں وہ لائق ہزار تحسین ہے۔

گرامی منزلت جناب شمس صاحب قبلہ نے زبان و تاریخ ثقافت لکھنؤ پر جو طویل مطالعہ فرمایا ہے اسے سب اہلِ نظر جانتے ہیں خدا آپ کے ادارے کو پروان چڑھائے آپ نے جناب موصوف کے افادات کو شائع فرما کے تاریخ ثقافت پر احسان کیا ہے، جناب شمس صاحب کی محققانہ کتاب دہلی اور دکن پر لکھی ہوئی بہت سے تالیفات پر برتری رکھتی ہے، ادب، فن، رہن سہن، تاریخ وفیات، تذکرہ، اہل فن، اہل ہنر، علاقوں، قصبوں، شہروں اور متعدد پہلوؤں سے بحث و نظر کے لئے جو مختصر تاریخ تحقیق بیان فرمائے ہیں اس نے کتاب کو جامع اور بے حد کارآمد بنا دیا ہے۔

صاحبان ذوق، ارباب تحقیق، اور تاریخ کے طلبا ادب و ثقافت پر کام کرنے والوں کے لئے یہ کتاب مطالعہ کے نقطہ نظر سے فکر انگیز ہے اور معلومات کے زاویہ نظر سے مختلف مقامات پر حوالہ کی کتاب ہے۔

میری طرف سے مولانا کی خدمت میں تسلیم عرض کریں، میں اس نادر تحفے کے ارسال پر آپ حضرات کا ممنون ہوں....

بزرگوں کی خدمت میں آداب، احباب سلام قبول کریں۔

(خاکسار مرتضیٰ عفی عنہ)

مکرم لکھنوی

ایڈیٹر رسالہ عکس لطیف. کراچی

یکم جنوری ۱۹۷۲ء

ھ

تعارف

جناب ڈاکٹر احسن صاحب فاروقی

ڈین اف فیکلٹی اف آرٹ بلوچستان یونیورسٹی

مولانا سید محمد باقر شمس صاحب کی ہستی سے علمی اور ادبی طور پر مستفیض ہونے والوں میں میں اپنا شمار کر کے فخر کرتا ہو۔ موصوف نے جو اضافے تاریخ، علم دینیات اور ادب میں کئے ہیں وہ سب کے لئے فیض رساں ہیں، زیر نظر کتاب میں انھوں نے ایک ایسا اہم کام انجام دیا ہے۔ جو ہماری تہذیب اور کلچر کی تاریخ میں اہم رہے گا۔ لکھنؤ کا نام آتے ہی ہمارے سامنے ایک نہایت حسین و دلکش تہذیب کا نقشہ کھینچتا ہے۔ نوابان اودھ کا جو بعد میں شاہان اودھ کہلائے اسکا دور اندرونی اور بیرونی جھگڑوں سے بری ہونے کی وجہ سے عجیب اس کا دور تھا جس میں وہ ساری تہذیب جو مسلمانوں کی آمد سے لے کر سلطنت مغلیہ کے زوال تک دہلی میں ارتقاء کرتی رہی لکھنؤ میں آکر ایک خاص نکھار پر ہو چکی۔ سید احمد خان اور ان کے پیروؤں نے اس تہذیب کو تخریب کا نام دیا اور اس لئے اس کی طرف سے ایک تعصب قائم ہو گیا جس کی بناء پر اس کی خوبیوں کی طرف عام لوگوں اور مورخوں نے دیکھنے سے انکار کیا شمس صاحب اس تہذیب کی زندہ تاریخ ہیں یہ ان کے خاندان اور اس کے ماحول کی چیز ہے اور انھوں نے اس کے حالات اس ہمدردی کے ساتھ لکھے ہیں جو ہی اس کی خوبیوں کو نمایاں کر سکتی ہے۔ اس کتاب کو

پڑھ کر ہماری آنکھوں کے سامنے تعصب کی عینک اُتر جاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ سرزمین اودھ نے ایسے خوبصورت پھول لگائے تھے جن کی دنیا کی ہر تہذیب خوشہ چیں ہو سکتی ہے۔

اس کتاب کی تعجب انگیز صفت اس کی وسعت اور گہرائی ہے یوں تو عام تاریخ کی طرح اس میں بھی بادشاہوں کے ناموں کی سرخیاں ہیں اور حالات انھیں کے ماتحت لائے گئے ہیں مگر بادشاہوں کے حالات سے زیادہ علمی، ادبی، مذہبی دستکارانہ، سپاہیانہ سرگرمیوں کے حالات نہایت دلکش طریقہ پر بیان ہوئے ہیں مصنف موصوف عالم اور علمائے دین کے خاندان سے ہیں مگر موسیقی اور اس کے سلسلے کے وہ سب کارنامے جنہوں نے اودھ دربار کو راجہ اندر کا اکھاڑا بنا دیا تھا ان کی نظر میں ہیں اور وہ مختلف راگوں اور راگنیوں کے بیان میں بھی ویسی ہی وضاحت سے کام لیتے ہیں جیسی ادبی یا علمی اُمور کے بیان میں ہم اس کتاب کو لکھنؤ کی انسائیکلوپیڈیا کہہ سکتے ہیں۔ اور اسی طرح استعمال کر سکتے ہیں۔

مولوی عبدالحلیم شرر نے بھی اس موضوع پر کافی لکھا ہے اور ان کے حوالے شمس صاحب نے دیئے ہیں مگر شمس صاحب کی کتاب شرر صاحب کی تمام تصانیف سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور اسی لئے ہم اسے لکھنوی تہذیب کا آخری نقطہ کہہ سکتے ہیں۔

کتاب کو پڑھنے سے بڑے بڑے انکشاف ہوتے ہیں اور عام معلومات کی صحت ہوتی ہے مثلاً واجد علی شاہ اختر کا ہمارے ذہن میں انگریزوں کے پروپاگنڈے سے جو تصور رہتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ عیش پرستی میں

ہر وقت محو تھے عورتوں کے ساتھ ناچنے کے سوا ان کا کوئی کام نہ تھا شمس صاحب شرر کے حوالے سے تصدیق کرتے ہیں کہ مٹیا برج کے واجد علی شاہ کو میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے وہ اتقا اور پرہیزگاری خدا ترسی اور خدا پرستی کی مجسم تصویر تھے" یا راجہ درگا پرشاد کے حوالے سے بتاتے ہیں " ان کا سا کوئی بادشاہ علوم و فنون کی ایسی جامعیت کے ساتھ ہند کی سرزمین سے نہیں اٹھا اور اس فضل و کمال کے کسی فرمانروا نے ہندوستان کی فضا میں علم بادشاہی بلند نہیں کیا۔"

اس کتاب کی گوناگوں خوبیوں میں سے چند ہی کی طرف اشارہ کافی ہے، کتاب آپ کے سامنے ہے سب سے اہم بات جو علمی کتاب کی حیثیت سے اس کتاب سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب کو خواہ مخواہ تخریبی کہا گیا اصل میں وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیب کا عروج تھی، اس تہذیب کے حسین عناصر نے لکھنؤ کو بھی ایک شہر بنا دیا تھا۔" اور شاعری کے جو تجربے یہاں ہوئے وہ اردو ادب کے لئے دائمی طور پر اہم رہیں گے۔

محمد احسن فاروقی
یکم جنوری ۱۹۶۲ء

ابتدائیہ

ہر جگہ کے علمی تمدنی اور سیاسی حالات کے پیدا ہونے کا بڑا سبب وہاں کا جغرافیہ ہوتا ہے اودھ کا علاقہ جو کسی زمانہ میں پنجاب سے رہتاس اور گورکھپور سے ہاپڑ تک تھا زرخیزی میں ہندوستان کا باغ اور مردم خیزی میں دماغ ہے

پہاڑ۔ شمال میں کشور ہندوستان کی فصیل ہمالیہ ہے جس کی پیشانی کو آسمان جھک کے چومتا اور چوٹی کو سورج اپنی کرنوں سے گوندھتا ہے۔ اس کے دامن میں اعلیٰ درجے کا کلک ہوتا ہے آہنی قلم کے رواج سے پہلے وہ پارکر PARKER تھا۔

معدن۔ لاجورد کی ایک کان ہے جس کا پتھر چمکدار اور قیمتی ہوتا ہے۔

دریا۔ گنگا اور جمنا کی جولانگاہ یہی ہے گھاگرا یہیں مست خرام ہے جس میں دنیا کی مشہور مچھلی مہاشیر ہوتی ہے۔ سئی۔ گومتی۔ کلیانی ریٹ۔ ہموریا۔ دراری بوڑھ راپتی اور بیس پچیس ندیاں نیپال کے پہاڑوں سے ستھلی موہانہ۔ ساردا۔ اُل۔ دکن سے آگے پورے ملک میں پانی کا جال بچھا دیتی ہیں۔ سو بیگھے پر دس بیگھے کے حساب سے جھیل اور تالاب ہیں

صحرا۔ اترا اور پچھم جنگل ہے اس کے تین حصے ہیں۔ پہلا ستھلی اور موہانہ کے بیچ میں کھیری گڈھ کا دو سو تر سٹھ میل لمبا۔ شیر، ہاتھی، ارنا، بھینسے اور ہر قسم کے درندوں چرندوں اور پرندوں سے بھرا ہوا۔ ساکھو اور شیشم، اس کا حاصل ہے۔

دوسرا کوڑیا نالے اور گرواندی کے بیچ میں دو سو انہتر میل لمبا اس میں بھی شکار بہت ہے اور لکڑی اس کی آمدنی ہے۔

تیسرا ایک سو ستر میل کی لمبائی میں گونڈہ کا ہر قسم کے جانور اور بہت اچھے قسم کی بلّیاں ہوتی ہیں۔

دشت :۔ پورے ملک میں ریگستان اور بنجر زمین کے چھوٹے ٹکڑے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ساری زمین ہموار پانی کی کثرت سے سیراب۔ ہر قسم کا اناج اور بہترین قسم کے پھل ہوتے ہیں۔

موسم :۔ نہ گرمیوں میں آگ برستی ہے اور نہ جاڑوں میں برف پڑتی ہے۔ برسات بہار اپنے ساتھ لاتی ہے در و دیوار پر سبزہ اُگ آتا ہے دن کو پھولوں کی پنکھڑیاں رات کو آگ کی چنگاریاں ہوا میں اڑتی ہیں۔ گھٹائیں جھوم جھوم کے آتی ہیں اور ٹوٹ ٹوٹ (تتلیاں) کے پانی برستا ہے بجلی کڑکتی (چمکتی) ہے بادل گرجتا ہے اور اندھیرا گھپ ہو جاتا ہے۔ کبھی ڈونگرا برستا ہوا نکل جاتا ہے۔ کبھی جھالا برستا ہے کبھی پھوار پڑتی ہے۔ کبھی موسلا دھار پانی گرتا ہے کبھی جھڑی لگتی ہے اور تین تین دن سورج دکھائی نہیں دیتا۔ کبھی گھٹا کے پردے سے جھانکتا اور پھر آڑ میں چھپ جاتا۔ کبھی پانی برس کے نکل جاتا ہے اور دھوپ کے ساتھ قوس قزح نکل آتی ہے۔ کالی گھٹا کے کالے پھلندے کی آواز لگاتے ہوئے سبزی والے نکلتے ہیں — دسہری، سفیدہ ثمر بہشت گلی گلی بکتے ہیں۔ کھوئے پٹی والے آواز لگاتے پھرتے ہیں گھروں میں کڑھائیاں چڑھتی ہیں پوریاں تلی جاتی ہیں۔ بھٹے بھونے جاتے ہیں اور موسم کا لطف اٹھایا جاتا ہے۔

دیہاتوں میں کھیتیاں لہلہاتی ہیں دریا جوش مارتے ہیں تالاب اُبل جاتے ہیں۔ بط۔ قاز۔ سرخاب۔ سمن۔ سیخ پر۔ بگلے اور سارس غول کے غول پانی اور دھان کے کھیتوں پر گرتے ہیں۔ کوئل کوکتی ہے پپیہا تان لگاتا ہے مور مست ہو کے ناچنے لگتا ہے۔

انسانوں کو بھی موسم گدگداتا ہے۔ درختوں پر جھولے پڑتے ہیں۔ کم سنیں بیچ میں بیٹھتیں جوانیں کناروں پر رسیاں پکڑ کے کھڑی ہوتیں اور گھٹنوں کو موڑ کے کمر سے

زور لگا کے پینگ بڑھاتیں اور گیتوں کی لمبی تانیں الاپتی ہوئی سینہ تان کے اٹھتی ہیں تو معلوم ہوتا کہ کیف موسم ان کے سینوں میں ہمک رہا ہے۔

ادنیٰ درجہ کی عورتیں سڑکوں پر ساون گاتی پھرتی ہیں کہیں کھیتوں میں، ہلکی ہلکی پھوہار میں ساون گا گاکے دھان لگاتیں اور موسم کے مزے لوٹتی ہیں۔ قدرت کی فیاضی شہد کے سر پر گلاس ٹپکا کے سامان کیف میں اضافہ کردیتی ہے اور شہر سے دیہات تک زندگی کو بہار گود میں اٹھالیتی ہے۔

آب وہوا: قاضی محمد صادق خاں اختر نے لکھا ہے کہ

> ربع مسکوں میں ہندوستان کو فوقیت حاصل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کھانے کی عمدہ چیزیں خوشگوار پانی آرام کی جگہ اور جانوروں کا چارہ موجود ہے گرمی جاڑا معتدل پڑتا ہے...... اور اودھ کو ہندوستان میں سب جگہوں پر فضیلت ہے۔ محامد حیدریہ قلمی

آب وہوا کا اثر انسانوں پر: آب وہوا کا اثر انسانوں پر نہ پڑنا کسی طرح ممکن نہیں۔ قاضی محمد صادق خاں اختر کا بیان ہے

> یہاں کے لوگوں کے جسم کی ساخت میں نزاکت مزاج میں نفاست اور گرمیٔ اختلاط لباس کی پاکیزگی جیسی ہے ہندوستان میں کہیں نہیں

مورخ فرشتہ لکھتا ہے کہ:۔

> ہندوستان میں سب سے پہلے باقاعدہ حکومت اودھ میں قائم ہوئی۔ ہندوستان میں پہلا شہر جو آباد ہوا وہ اودھ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تہذیب وتمدن کی نزاکتیں سب سے پہلے اودھ میں پیدا ہوئیں جو وہاں کے باشندوں کی علمی وذہنی بلندیوں کا نتیجہ تھیں۔

آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کے لوگوں کے کام و دہن کی ساخت، نا بھرے لوگوں سے الگ ہے، وہ ہر زبان کو اس کے خاص لہجے میں بول سکتے ہیں، ان کے تلفظ میں ایسی صفائی اور نکھار ہے جو کسی اور جگہ کے لوگوں کو نصیب نہیں۔ باتوں میں دلکشی اخلاق میں کشش مزاج میں رنگینی ذہانت۔ حاضر جوابی۔ نکتہ رسی۔ تواضع۔ انکسار۔ بانکپن۔ غیرت۔ حمیت۔ سیر چشمی۔ دریا دلی۔ سخاوت۔ شجاعت۔ پاکیزگی نفاست حُسن پرستی اور نفاست ان کے وہ اوصاف ہیں جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔

بادام، آم اور بیل کا شربت ہم نے لکھنؤ میں کسی کو پیتے نہیں دیکھا۔ دہی کی لسی ۱۹۲۰ء تک نفیس چیز نہیں سمجھی جاتی تھی۔ گڑ اور اس سے بنی ہوئی چیزیں سوا تل کے لڈو کے نہیں کھائی جاتیں۔ فالسوں کو دن بھر بھگو دینے سے ان کا رنگ اور مزا پانی میں آجاتا ہے اور مل دینے سے مزا بھی خراب ہو جاتا ہے اور لطافت بھی باقی نہیں رہتی زعفران کا شربت اور نیبو (لیمو) کا آبشورہ پسند کیا جاتا ہے۔ ہر میٹھی چیز میں مٹھاس تیز ہوتی ہے والد مرحوم کو ہم نے کبھی بیر، خسکر قند، مولی اور گاجر کھاتے نہیں دیکھا۔

شاعری

لکھنؤ کے ہر آدمی کا ذہن شاعری کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ لباس چال ڈھال سلام و جواب کے انداز محفل و مجلس کے تکلفات عالم رئیس نقال طوائفیں، عام پیشوں کے لوگ ہر چیز میں شعریت پیدا کرنے کے عادی ہیں۔ ان کا اوڑھنا بچھونا شاعری ہے۔ شادی و غم کے رقعے مجلس و محفل کے دعوت نامے شعریں ہوتے تھے ایک اخبار منظوم نکلتا تھا جس میں ایڈیٹوریل، خبریں، اشتہارات

صہ ۔ نظم میں ہوتے تھے بات بات پر لوگ شعر اور مصرعوں سے مطلب ادا کرتے میں سودا

بیچنے والوں کی صدائیں شاعرانہ ہوتی ہیں۔ ایک پان کی دکان پر یہ مصرعہ لکھا تھا ع

کرتی ہے سرخرو وہ گلوری ہے پان کی

حکیم میرن صاحب کے دواخانہ کا نام معدن الادویہ اس کے سائن بورڈ پر یہ مصرعہ لکھا تھا ع

دواخانۂ معدن الادویہ

شعر گوئی اور شعر فہمی سے کوئی گھر خالی نہیں ہر گھر میں دو چار شاعر ملیں گے عورتیں تک شعر کا مطلب سمجھتی ہیں اور اکثر شعر کہتی ہیں بعض لوگ شعر میں بات کرتے ہیں تمام اصناف سخن پر قدرت رکھنے والے اور کسی ایک صنف سے مختص ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں۔

مشاعرے | آئے دن مشاعرے ہوتے ہیں۔ سفید چاندنی کا بے شکن فرش کاغذی ہانڈیوں میں ہر ایک کے سامنے پان حقہ جن پر بیلے یا چنبیلی کے ہار لپٹے ہوئے گرمیوں میں زعفرانی شربت برف کا پانی جاڑوں میں کشمیری چائے آنے والوں کا جھک کے سلام کرنا حاضرین کا حسب مراتب سروقد کھڑے ہو کے کسی کو نصف قد سے اٹھ کے کسی کو نصف قد سے اٹھ کے کسی کو بیٹھے بیٹھے کمر سے ذرا جھک کے کسی کو گردن جھکا کے جواب سلام دینا مزاج پرسی کرنا اور اس کا دست بستہ شکر خدا الحمد للہ کہنا مؤدب نشست مہذب گفتگو مشاعرہ شروع ہونے پر مصرعوں کا اُٹھانا اور دوسرے مصرع کا قافیہ بولنا اہل لکھنؤ کا حصہ ہے۔ شعر کی تعریف میں کہتے واہ کیا بولتا ہوا قافیہ ہے۔ کیسی نازک تشبیہ ہے۔ کیا نازک استعارہ ہے۔ کیسا بلیغ کنایہ ہے۔ ایک لفظ سے مضمون اپنا کر لیا ہے کس پہلو سے مصرع لگایا ہے کیا الفاظ جمع کئے ہیں ایک لفظ سے جان ڈال دی ہے نیا گوشہ نکالا ہے۔ کیسا برابر کا مصرعہ ہے۔ کیا برجستہ شعر کہا ہے اس طرح وہ شعر کی اس خوبی کی تعریف کرتے ہیں جس سے اس میں لطف پیدا ہوا ہے۔ اس سے سخن فہمی اور نکتہ رسی کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔

اگر کسی کے یہاں کوئی غلطی ہوئی یا کسی لفظ سے ذم کا پہلو پیدا ہو گیا تو اس کو نہایت مناسب طریقے سے ٹوکتے ہیں کبھی صرف یہ کہدینے سے کہ فلاں شعر پھر ارشاد فرمایئے لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ اس میں کچھ غلطی ہے کبھی مصرع صحیح کر کے پڑھ دیتے ہیں شاید آپ اسے

بدتہذیبی سمجھتے ہوں مگر لکھنؤ میں ایسے موقع پر خاموشی ادب او رشاعر کا نقصان سمجھی جاتی ہے۔ بے راہ روی سے روکنا اور غلطی پر ٹوکنا ضروری سمجھتے ہیں ایسی گرفتیں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں آپس کی صحبتوں میں اخباروں رسالوں میں ان پر بحثیں ہوتی ہیں سارے شہر میں چرچا رہتا ہے اس سے زبان و بیان کے بڑے نازک پہلوؤں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اس سے لکھنؤ کا کوئی شاعر محفوظ نہیں رہتا میر انیسؔ نے ایک بند میں تار۔ بار قافیہ اور پہ دوڑے ردیف نظم کردی تھی بند کا ایک مصرع یہ ہے ؎

جس طرح سے نغمے کی صدا تار پہ دوڑے

جیسے ہی انھوں نے یہ بند پڑھا محمد جعفر صاحب اُمید نے لہاڑہ پیدوڑے ایک روایت یہ ہے کہ امید صاحب نے اس بند کو دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی میر صاحب سمجھے کہ نغمہ کی صدا کے تار پر دوڑنے پر اعتراض ہے انھوں نے ایک مختصر تقریر کرکے بتایا کہ نغمہ کی صدا تار پر دوڑتی ہے بعد میں لوگوں نے بتایا کہ یہ دوڑے پر اعتراض ہے۔

میر انیسؔ کے پوتے دولہا صاحب عروجؔ نے سلام کا مطلع پڑھا

غریبوں سے بھی مل جُھک کر ذرا او کروفر والے تکبر چلتی پھرتی چھاؤں پر کرتا ہے زردوالے

ان کے سگے بھانجے فائقؔ صاحب نے اعتراض کیا کہ اے زردوالے ہماری زبان نہیں یوں تو کابلی والے کچالو والے پکارے جاتے ہیں۔

آرزو صاحب نے مطلع پڑھا ؎

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی!

اس پر اعتراض ہوا کہ ٹوٹ کے برسا پانی روزمرہ کے خلاف ہے ٹوٹ ٹوٹ کے ہونا

چاہیئے۔

یہ باکمال اور مسلم اساتذہ کا ذکر ہے نومشقوں کی غلطی پر جب وہ غزل پڑھ چکتے تھے تو انھیں ٹوک کے کہتے کہ فلاں شعر پھر سے پڑھیئے اور اساتذہ انھیں بتاتے کہ اس میں یہ غلطی ہے اسے یوں درست کر لیجئے وہ جھک کے تسلیم کرتے اس طرح مشاعرے شاعری کی درسگاہ بن گئے تھے۔

نومشقوں کی غلطی پر مجمع سے آواز آتی تھی حرف اصلی گر گیا۔ خبن واقع ہو گیا، ردیف بیکار ہو گئی کبھی مصرع درست کر کے کوئی پڑھ دیتا۔ تعریف پر آداب کرتے اور کہتے ذرہ نوازی ہے۔ بندہ پروری ہے حسنِ سماعت ہے۔ ہمت افزائی ہے یہ مشاعرے شاعری کی درسگاہ بن گئے تھے سامعین غلطی پر نہ ٹوکنا اپنی سخن فہمی کے خلاف سمجھتے تھے۔

اسی کو شاعر نے کہا ہے ؎

رند کھل جاتا ہے یاں کھوٹے کھرے کا پردہ
لکھنؤ اہلِ ہنر کے لئے ٹکسال ہے آج

ہندو مسلمانوں کی طرح آداب۔ تسلیم۔ مزاجِ اقدس۔ مزاجِ گرامی۔ الحمدللہ شکرِ خدا۔ واللہ باللہ کہتے ہیں اور شعر و شاعری میں مسلمانوں سے مقابلہ کا دعویٰ رکھتے ہیں۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ تھا ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

رائے منولال صبا کا شعر ہے۔

لائے اس بُت کو التجا کر کے   کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

دیا شنکر نسیم نے کہا ہے۔

غازی الدین حیدر نے روضہ حضرت علیؑ کی نقل بنوائی اور اس کا نام شاہ نجف رکھا مرنے کے بعد وہیں دفن ہوئے۔ لالہ صاحب رائے فرہاد نے تاریخ کہی ـ

حیدر بہ نجف مقام بگرفت

ملا محتشم کاشی کا ہفت بند منقبت امیرالمومنین میں آج تک لاجواب ہے اس پر جیسے برابر کے مصرعے راجہ الفت رائے الفتؔ نے لگائے ہیں کوئی مسلمان شاعر بھی نہ لگا سکا۔ پہلا بند سنیئے :۔

السلام اے مدحِ تو آیاتِ قرآنِ مبیں   السلام اے ذات پاکت کعبۂ علم و یقیں
السلام اے پایہ ات تاج سر عرش بریں   السلام اے سایہ ات خورشید رب العالمیں
آسمان عِز و تمکیں آفتاب داور دیں

اس آخری دور میں نوبت رائے نظر اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اساتذہ کے ساتھ غزل پڑھتے تھے اور برابر کی ٹکر لیتے تھے۔ محشر صاحب نے ان کا ذکر مجھ سے جن الفاظ میں کیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے دل میں کتنی عظمت تھی۔ تاریخ ادب اردو میں ان کا مرثیہ جو انھوں نے اپنے بیٹے کے مرنے پر کہا تھا ایک شاہکار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اس کا ایک بند سنیئے :۔

ہزاروں ناز سے اس لختِ دل کو پالا تھا   کبھی نہ دھوپ میں باہر اسے نکالا تھا
اُسی سے خانۂ تاریک میں اجالا تھا   قمر تھا یہ تو نظر اس قمر کا ہالا تھا
مجھے بھی دفن کرو اس کے ساتھ تربت میں
یہ کس طرح سے اکیلا رہے گا غربت میں

نقاد اور تذکرہ نگار اس مرثیہ کو ایک شاہکار کی حیثیت سے پیش کرتے رہے ہیں

مگر اس کا ایک پہلو خاص طور پر توجہ کے قابل ہے۔

شاعر ہندو ہے جس کے یہاں مردہ جلایا جاتا ہے
اس کو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ اس کے ساتھ مجھ کو بھی جلا کے خاک کردو۔

جلانے میں جسم خاک ہو کے فنا ہو جاتا ہے۔ دفن کرنے میں باقی رہتا ہے۔ ساتھ دفن کرنے میں جسمانی ساتھ باقی رہتا ہے اس میں جو بات ہے وہ جلانے میں نہیں شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنے مذہب اور واقعہ کے خلاف رسم کو اختیار کر کے شعر میں غضب کا درد اور اثر بھر دیا ہے۔

سودے والے تشبیہ واستعارہ میں سودا بیچتے ہیں مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ ایک کبڑیا چوک میں گنّے بیچ رہا تھا اور صدا یہ تھی۔

ارے بھئی کنکوے کون لوٹے گا۔

مطلب یہ تھا کہ یہ گنّے لگّے کے برابر ہیں۔ جامن بیچنے والا کہتا ہے کالی گھٹا کے کالے پھلیندے۔ ککڑیوں والا کہتا ہے۔ لیلیٰ کی انگلیاں ہیں مجنوں کی پسلیاں ہیں۔ کیا خوب ککڑیاں ہیں۔ گولر والا کہتا ہے شہد کی کپیاں ہیں۔ بیر والا آواز لگاتا ہے پیوندی بیر بھٹکے سیر برف کی ڈلیاں بیچنے والا کہتا ہے:- محبت میں گھل رہی ہے۔ موم پھلی والا کہتا ہے۔ موم پھلی کی ٹھنگا جاڑے کی بہار

لکھنؤ کے سوا اور کہیں کے ہندو مرگھٹ کو گل لالہ نہیں کہتے۔

موسیقی

اہل فن کی کثرت اور ان کے کمال کے لحاظ سے بھی لکھنؤ موسیقی کا بہت بڑا مرکز اس کے علاوہ وہاں کے ناچ گانے اور طبلہ کا ایک نرالا انداز ہے جو لکھنؤ طرز کے نام سے مشہور ہے یہ طرز گانے کا ایک خاص کیف ہے جس کا بیان کرنا پھول کی خوشبو کو لفظوں

کے ذریعہ سکھانے کی کوشش کرنا ہے اس وجہ سے کچھ فنی باتیں بتانے پر اکتفا کی جائے گی۔

ہندوستان میں موسیقی کے تین طرز ہیں لکھنوی بنارسی اور مرہٹی ان میں ہر ایک کا انداز الگ اور کیف جدا ہے لکھنوی طرز بڑا دلکش ہے یہ دلکشی بعض تصرفات سے پیدا ہوئی ہے۔

وہ سُر جس پر راگ کا دارومدار ہو کہ اگر اس کو نکال دیا جائے تو سمجھ میں نہ آئے کہ یہ کون سا راگ ہے ایسے سُر کو وادی کہتے ہیں اور اس کے معاون سُر کو سم وادی گرتھ کی بھیروی میں مدھم راگ وادی اور سُر سم وادی ہے۔ بنارس کی بھیروی میں سُر وادی اور پنچم سم وادی ہے۔

لکھنؤ کی بھیروی میں گندھار وادی اور دھیوس سم وادی ہے اس سے اس کا ایک خاص کیف پیدا ہو گیا اور یہی تغیرات لکھنؤ کی موسیقی میں انفرادیت پیدا کرتے ہیں اس کے علاوہ دو چیزیں لکھنؤ کی خاص ایجاد ہیں ایک ٹھمری دوسرے دادرا۔ ٹھمری کا ایسا طریقہ ایجاد ہوا جس کے لئے کوئی خاص سُر نہیں ہر ہلکے سُر میں اس کو گایا جا سکتا ہے اس وجہ سے اس کو ہر وقت گانے کا موقع ہے۔ اس میں شرنگار رس (تغزل) کے بولوں کی پابندی ہے اگر اس میں خیال کے بول لگا دیئے جائیں تو فوراً معلوم ہو جاتا ہے اور یہ بات اعتراض کے قابل سمجھی جاتی ہے لکھنؤ کی ٹھمری بہت مقبول ہوئی کوئی اور گانا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

دادرا طبلہ کے ایک تال کا نام ہے جس میں چھ ماترے (حرکتیں) ہیں لکھنؤ میں یہ ایک راگ کا نام بھی ہے اس کی لے شوخ ہوتی ہے۔

کہروا تال میں آٹھ ماترے ہوتے ہیں اس میں دادرے کے بول لگاتے ہیں ان

دونوں تالوں میں نرت اور بھاؤ جس خوبی سے ادا ہوتا ہے وہ بات کسی اور طرح نہیں ہوتی
اسی طرح کے تصرفات لکھنؤ طرز کے نام سے مشہور ہیں -

رقاصی

رقاصی کا کمال طوائفوں سے زیادہ رقاص مردوں میں ہے اس کی ابتدا پرکاش سے ہوئی یہ سعادت علی خاں کے زمانے میں تھا زمین پر بتاشے بچھا کے ناچتا تھا کوئی بتاشا ٹوٹنے نہیں پاتا تھا اس کے بعد بندادین اور کالکا پراس کا خاتمہ ہوگیا اور مسلم ہے کہ ایسے رقاص دنیا میں نہیں سنے گئے تلوار کی دھار پر ناچنا تو معمولی بات تھی تین سو چوراسی گھنگھرو پاؤں میں باندھ کر ناچتا تھا اور جتنے گھنگھرو کہتے اتنے ہی بجتے تھے اس کا ایک ناچ خاص طور پر مشہور تھا ایک تھالی میں سیندور پیس کر رکھ دیا جاتا تھا. پہلے وہ اس تھال میں کھڑا ہوتا تھا اور وہیں سے رقص کرتا ہوا سفید چاندنی کے فرش پر آتا رقص تمام کرتا تو کبھی چاندنی پر ہاتھی کی شکل بنی ہوئی نظر آتی تھی کبھی کرشن جی بین بجاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور وہ کنارے کھڑے ہو کے اسی طرح بانسری بجاتا کہ معلوم ہوتا تھا کہ کرشن جی کی بانسری سے آواز نکل رہی ہے -

آنحضرتؐ کے معراج پر جانے کی تصویر کھینچ دیتا اور لوگ محو حیرت ہو جاتے تھے.

طوائفوں میں بعض بتاشوں پر اور کچھ اور بعض خنجری لے کے ناچتی تھیں اور بھاؤ بتانے میں طرح طرح کے کمالات دکھاتی تھیں تلوار چلانا کنکیا اڑانا وغیرہ

نقالی

لکھنؤ کے نقال (بھانڈ) بھی مشہور تھے ڈرامے اور سنیما کی ایجاد سے پہلے ان کی بڑی قدر تھی شادی بیاہ میں دور دور بلائے جاتے تھے ان کی نقل لطف زبان ظرافت اور ذہانت کا شاہکار ہوتی تھی جس کا پلاٹ وہ خود بناتے تھے اور اس میں ایسا

لطف ہوتا تھا کہ لوگ ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے مہینوں اس کے چرچے رہتے تھے ہر صحبت میں ان کی پھبتیوں کی تعریف ہوتی تھی۔ لکھنؤ میں ایک گرہ صیہے وہاں ایک نواب صاحب رہتے ہیں جو گرہ ھیا کے نواب کہے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں شادی میں بھانڈ بلائے گئے نقل میں ایک نے سب سے کہا اٹھیئے تعظیم کیجئے گرہیا کے نواب صاحب آرہے ہیں۔ ایک ہانڈی آئی اس کا ڈھکنا کھولا تو بڑا سا مینڈک اچھل کے باہر آیا۔ ایک دیہات میں کسی رئیس نے بھانڈوں کو بلایا۔ نقل کے دوران کسی بات پر خوش کے اپنے کندھے سے دو شالہ اتارکے اس کے سر پر ڈال دیا۔ دو شالہ کو ایک جگہ سے کیڑا کھا گیا تھا۔ اس نے دو شالہ کا ایک سرا خود پکڑا ایک دوسرے کو دیا اور کیڑا کھائی ہوئی جگہ کی طرف اشارہ کرکے پوچھا اس میں کیا لکھا ہے اس نے کہا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اس نے کہا بے وقوف جب یہ دو شالہ بنا تھا محمد رسول اللہ کہاں تھے۔ لکھنؤ کا قاعدہ ہے کہ انعام میں بے عیب چیز دی جاتی ہے

ایک دیہاتی رئیس نے شادی میں بھانڈوں کو بلایا ان کے کھانے کے وقت قورمہ گھٹ گیا صاحب خانہ نے اس میں نمک اور پانی ڈال کے تھوڑا بکوایا اور دسترخوان پر ان کے سامنے رکھ دیا۔ لکھنؤ میں قورمہ لعاب پر ہوتا ہے نہ شوربا لگتا ہے نہ بھنا ہوتا ہے۔ انھوں نے قورمہ میں شوربا دیکھا تو چیخنا شروع کیا کچھ کہتے تھے ہو سکتا ہے کچھ کہتے تھے نہیں ہو سکتا۔ اس شور کی آواز سن کر مہمان اور صاحب خانہ کمرے میں آئے اور پوچھا کہ کیا ہو سکتا ہے کیا نہیں ہو سکتا تو ایک طرف کے آدمیوں نے کہا ہم لوگ کہتے ہیں کہ یہ آبِ خالص ہے اس سے وضو ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ آب مضاف ہے اس سے وضو نہیں ہو سکتا۔ صاحب خانہ بہت شرمندہ ہوئے اور کہا کہ اس وقت تو کھا لیجئے آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔

داستان گوئی

یہ دہلی اور لکھنؤ کا خاص فن ہے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ پاٹ دار آواز میں داستان شروع کرتے ہیں جنگ کی گیرو دار دریاؤ صحرا کی ہولناکی پرستان کا نقشہ حُسن و عشق کی کرشمہ سازیاں معشوق کی صورت لباس ادائیں زیورات کی تفصیل عاشق کی مجنونانہ شکل اس کی بیقراری کی لفظوں اور اشاروں میں تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ لوگ بھوک پیاس بھول جاتے ہیں رات رات بھر بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔

داستان روکنا بھی داستان گو کا کمال سمجھا جاتا ہے مثلاً داستان گو یہ کہہ رہا ہے چلتے چلتے جنگل آگیا اور شام ہوگئی اب جنگل کی شام کا سماں اس نے کھینچنا شروع کیا اس میں اتنا طول دیا کہ آدھ آدھ گھنٹہ گذر گیا اور سننے والوں پر بار نہ ہوا وہ اسی منظر کشی میں محو ہوگئے اس کے بعد پھر داستان شروع ہوئی۔

حماسہ خوانی

اپنی قومی اور ملکی لڑائیوں کا حال سننے کا شوق ہر قوم کو رہا ہے اور ہر زبان کی نظم و نثر میں اس طرح کی داستانیں موجود ہیں۔

مسلمانوں میں فردوسی کا شاہنامہ نصاب تعلیم میں داخل تھا امراء و سلاطین کی صحبتوں میں بڑے ڈرامائی انداز سے پڑھا جاتا تھا ایران ترکستان اور ہندوستان میں کئی سو برس تک اس کا بڑا زور رہا۔

گیارہویں صدی کے اواخر میں ملا رفیع باذل[1] نے حضرت علی کے محاربات

---

[1] محمد رفیع نام باذل تخلص حافظ شیرازی کی اولاد میں تھے دہلی میں پیدا ہوئے امرائے کبار میں شمار تھا۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے گورنر رہے آخر میں بانس بریلی کے صوبیدار تھے ۱۱۲۳ھ میں انتقال ہوا ان کی کتاب حملۂ حیدری سب سے پہلے لکھنؤ میں مفتی میر عباس کے منظوم مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی۔

عہدِ رسول تک کے نظم کئے اور اس کا نام حملۂ حیدری رکھا اس کی تصنیف انھوں نے فردوسی کے شاہنامہ کو سامنے رکھ کے کی ہے میں نے ایسے بہت سے شعر چھانٹے تھے جو شاہنامہ سے ماخوذ ہیں جیسے

سپر بود بر دوش افراسیاب	چو ابر تنک بہلوئے آفتاب	شاہنامہ
سپر بود بر دوشِ زوج بتول	چو مہر نبوت بہ پشت رسول	حملۂ حیدری

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شاہنامہ کی ہر جگہ پیروی کی ہے اور وہی زور وشور لڑائیوں میں دکھایا ہے۔

لکھنؤ میں داستانوں اور افسانوں کے ساتھ اس کا بھی بڑا رواج تھا اس کا پڑھنا ایک خاص فن تھا روساء علما اور شعراء خود بھی پڑھتے تھے اور دوسروں سے بھی سنتے تھے بہت سے لوگوں نے اس کو اپنا پیشہ بنالیا تھا اس کا شوق دور دور پھیل گیا تھا ہماری ابتدائی عمر تک اس کے پڑھنے والے موجود تھے جو بڑے شد ومد سے پڑھتے تھے

خطاطی

لکھنؤ خطاطی کا ایک بڑا مرکز ہے شرفا خطاطی سیکھتے تھے اس فن کو بہت ترقی ہوئی اور ایسے ایسے خطاط پیدا ہوئے جنھوں نے شانِ خط میں لکھنؤ کا ایک مخصوص طرز پیدا کر دیا جو لکھنوی اندازِ تحریر کے نام سے مشہور ہے۔

لکھنؤ کے خطاطوں کی وصلیاں اور طغرے دنیا کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں اور حیرت سے دیکھے جاتے ہیں۔

معکوس نویسی لکھنؤ کی خاص ایجاد ہے اور اب تک زندہ ہے

مصوری

لکھنؤ کے مصور بھی یادگارِ زمانہ تھے انسان جانور، مکھی مچھر اور بھنگوں تک

ایسی ایسی تصویریں بنائیں کہ دوسرے ملکوں کے لوگوں نے دیکھ کے دانتوں انگلیاں دبالیں ہر زمانے میں مشہور مصور لکھنؤ میں پیدا ہوئے جن کا ذکر تاریخ کے ہر دور میں کیا گیا ہے تفصیل سے اس کتاب میں آئے گا۔

لکھنؤ کا نگارخانہ فن مصوری کا حیرت انگیز شاہکار ہے۔ غدر کے بعد وقف حسین آباد کی طرف سے فرمانروایانِ لکھنؤ کی قدآدم تصویریں لکھنؤ کے مصوروں سے بنوا کے ایک وسیع ہال میں لگائی گئی ہیں جو بے مثال ہیں۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ واجد علی شاہ دُنیا کے حسین ترین انسانوں میں تھے ان کی ایسی بولتی ہوئی تصویر بنائی ہے کہ ایک انگریزن اس کو دیکھ کے غش کھا کے گر پڑی یہ مشہور بات صحیح ہو یا غلط اس کا ثبوت اب پیش کرنا تو ممکن نہیں مگر اس سے کمال فن ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس تصویر کے متعلق یہاں تک کہا جاتا ہے اس کے علاوہ لکھنؤ کے مردہ عجائب خانہ میں بے شمار تصویریں علماء و رؤساء لکھنؤ کی آج بھی موجود ہیں امیرالدولہ لائبریری میں بعض نایاب تصویریں ہیں

ناخن سے دومنٹ میں تصویر بنادینا لکھنؤ کی خاص ایجاد ہے۔ بعض مصوروں نے تانبے کے پتّر پر ایسی اُبھری ہوئی تصویریں بنائیں جو انگلینڈ کی نمائش میں رکھی گئیں اور اس کو بڑے بڑے انعامات ملے۔

معماری

لکھنؤ میں ابتداء میں جو عمارتیں بنیں وہ دہلی کے طرز تعمیر کے موافق تھیں مچھی بھون بننے کے بعد ایک خصوصیت یہاں کی عمارتوں میں یہ پیدا ہوگئی کہ دروازوں پر مچھلیاں ضرور بنادی جاتی تھیں پرانے مکانوں کی اندرونی اور بیرونی محرابوں اور دروازوں میں اب تک مچھلیاں موجود ہیں مگر یہ کوئی ایسی بات نہیں جسے فنِ تعمیر میں جدت

کہا جا سکے۔

آصف الدولہ کے زمانے میں تعمیرات کو بڑی ترقی ہوئی ان کے امام باڑے کی چھت دُنیا میں فن تعمیر کا عظیم شاہکار ہے لداؤ کی اتنی بڑی چھت جس میں لکڑی کا نام نہیں عجائبات عالم میں ہے اس کی وسعت درودیوار کی بلندی کرسی اور محراب و در میں ایسا تناسب ہے کہ انسان اس کو دیکھ کے حیران ہو جاتا ہے اس کا رومی دروازہ بھول بھلیاں باؤلی یہ سب دُنیا کی عظیم عمارتیں ہیں جن کا جواب کہیں اور نہیں مل سکتا اور بے شبہ منجمد موسیقی ہیں۔

اس کے علاوہ آصف الدولہ نے چارسو باغ بنوائے تھے باغ کا لفظ سن کے ہمارا ذہن درختوں سے آگے نہیں بڑھتا کیونکہ ہندوستان میں ایسے ہی باغ ہوتے ہیں جیسے آم کا باغ امرود کا باغ وغیرہ۔

آصف الدولہ نے درختوں کے علاوہ رمنے کوشکین مکان نہر حوض تالاب بھی بنوائے تھے جو ایران کے باغوں کا خاص انداز ہے۔

آج بھی بنارسی باغ میں سنگ مرمر کے رمنے کوشکین اسی زمانے کی موجود ہیں جو اس کی تاریخ کو دہرا رہی ہیں اس طرح لکھنؤ ہندوستانی اور ایرانی طرز تعمیر کا ایک شہر بن گیا۔

آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں نے انگریزی طرز کا ایک نیا شہر بسایا جو بہت دنوں تک نیا شہر کہا جاتا تھا۔

سعادت علی خاں کے بعد لکھنؤ میں خالص عربی طرز کی عمارتیں بھی بنیں جن میں کربلائیں روضہ کاظمین اصل کی ہو بہو نقل ہے۔ ہر پیشہ اور فن کے لوگ اپنے کام میں جدت اور حسن پیدا کرتے ہیں۔

باورچی

پلاؤ زردہ قورمہ کواب تمام دنیا کے مسلمانوں کی مرغوب غذا ہے مگر لکھنؤ میں یہ چیزیں جیسی پکتی ہیں کہیں اور نہیں پک سکتیں۔ قورمہ میں ہلدی مرچیں اور کھٹاس نہیں پڑتی ہے نہ شوروا لگتا ہے نہ بھنا ہوا ہوتا ہے۔

سالن اور قلیے میں ہلدی مرچیں اور کھٹاس پڑتی ہے اور شوروا لگتا ہے مگر کسی جزو کا مزہ نمایاں نہیں ہوتا کہ دانت کھٹے ہو جائیں یا آدمی سوسو کرنے لگے۔ تلی ہوئی اردیوں اور تلے ہوئے آلوؤں کا سالن لکھنؤ کی خاص چیز ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بہت مرچیں اور کھٹاس کھانے والوں اور بالکل مرچیں اور کھٹاس نہ کھانے والوں اکو مزے کا معلوم ہوتا ہے۔ میٹھے چاولوں میں مزعفر متنجن اور سفیدہ کا مزے میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔

تگنی اور چوگنی کے چاول لکھنؤ کے باورچی کے سوا کہیں اور کا باورچی نہیں پکا سکتا۔ یعنی ایک سیر چاولوں میں تین سیر اور چار سیر شکر ہر دانہ ایک دوسرے سے الگ ہوگا۔ قورمے اور سالن کے مزہ میں فرق ہوگا۔ کواب کی سانپ کی طرح بیسیوں قسمیں ہیں اور ہر ایک کا خاص مزہ ہوتا ہے۔

نہاری لکھنؤ کی خاص چیز ہے شیرمال باقرخانی وہاں سے بہتر کہیں نہیں پکتی۔

ماقوتی کا نام کہیں اور کے لوگ نہیں جانتے۔

بالائی عام پسند ہے کثرت سے بکتی ہے اور بہت شوق سے کھائی جاتی ہے اور ہر چیز بالائی سے کھائی جاتی ہے روٹی سے بھی.... مزعفر و متنجن زردے سے بھی یہاں تک کہ آم اور خربوزے بھی بالائی سے کھاتے ہیں۔

ہندوستان بھر میں کسی اور جگہ ایسی چیزیں نہیں پکتیں۔

رکابدار۔۔ اچار چٹنی مربہ حلوہ بنانا رکابداروں کا فن ہے اور اس میں انھوں نے بڑے بڑے کمالات دکھائے اور ایسے مزے کی چیزیں بنائیں جو اپنی آپ نظیر ہیں اسکے علاوہ حلوے کے طباق اور بڑی حلوہ سوہن پر چاندی سونے کے ورق اس پر پستہ بادام کی ہوائیوں سے نقش و نگار طغرے اشعار اور نام ایسے خوشخط لکھے تھے کہ بڑے بڑے خطاط ایسے ہی قلم سے لکھ سکتے ہیں۔

اچار چٹنی۔ حلوے اور مربے کی اتنی قسموں کے بناتے تھے جو شکل و صورت اور مزے میں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوتی تھیں۔

خالص شکر کے گلاس اور فانوس ایسے بناتے تھے کہ اعلیٰ درجہ کا بلور معلوم ہوتا تھا۔ مربہ پر قورمے کا دھوکا ہوتا تھا۔

عام مربّوں کے علاوہ فالسے کروندے مرچوں اور کریلے تک کا مربہ بنایا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا اور آج بھی ان چیزوں کا مربّہ کوئی نہیں بنا سکتا جب تک انھیں رکابداروں سے نہ سیکھے۔ فالسوں کا مربہ فقط لکھنؤ کے رکابدار بنا سکتے ہیں آم کا مربہ شیشے کی طرح چمکدار دیکھنے میں کرارا کھانے میں نرم ہوتا ہے

نہاری۔ شاہی زمانے سے دو دو دکانیں قائم ہیں۔ ایسی نہاری گھر میں نہیں پک سکتی

بالائی۔ لکھنؤ کی مشہور ہے اور اہل لکھنؤ بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کا عام اس کا عام رواج ہے۔ زردہ متنجن سے تو کھاتے ہی ہیں۔ آم اور خربوزے بھی بالائی سے کھاتے ہیں۔

کواب (کباب) نہایت عمدہ ہوتے ہیں گھر میں ایسے کواب پکانے میں بہت اہتمام اور محنت کرنا پڑتی ہے بعض کوابیئے ایسے کواب بناتے ہیں کہ گھر میں پک ہی نہیں سکتے۔

اس وجہ سے نہاری، کواب بالائی عام طور سے بازار سے آتی ہے ۔

حلوائی ۔ ہر طرح کی مٹھائیاں بنانے میں کمال رکھتے ہیں امرتی خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے۔ ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی حلوائی کسی نہ کسی مٹھائی کے بنانے میں مشہور رہا ہے ۔ ہمارے زمانے میں پاٹے نالے کی برفی مشہور تھی اور حقیقت میں بے مثل ہوتی تھی

خوانچے والے ۔ بالائی اور فالسہ کی برف نمش کی قفلیاں، کھیر کے پیالے، کابلی، کچالو، سہال، شاخیں، اندرسے کی گولیاں، تل کے لڈو، کھویا پٹی، ریوڑیاں بیچتے ہیں یہ لکھنؤ کی مشہور چیزیں ہیں ۔ نمش کی قفلیاں اور سہال شاخیں کہیں اور ہوتی ہی نہیں باقی چیزیں اور جگہ بھی بنتی ہیں مگر وہ بات کہاں دوسرے شہروں کے خوانچے والے لکھنؤ کی ریوڑیاں کہہ کے بیچتے ہیں

عطر ساز : ۔شمامتہ العنبر اور حنا کا عطر لکھنؤ کی ایجاد ہے ۔ دنیا میں ایسا عطر کہیں نہیں بنتا

تنبولی ۔ لکھنؤ میں پان نہیں ہوتے باہر سے آتے ہیں مگر یہاں کے تنبولی درخت کے ٹوٹے ہوئے پتوں میں کاریگری دکھاتے ہیں اس کو سفید خستہ مزیدار بناتے ہیں اور تازگی میں فرق نہیں آنے پاتا ۔

کمہار ۔ مٹی کے برتن، حقے، چلمیں (سادی اور روغنی) پانوں کی کاغذی ہانڈیاں شالنبادن منڈھی گوٹا ٹنکی آبخورے خوبصورت سبک اور نفیس بناتے ہیں ۔

مٹی کے پھل اور ترکاریاں اصل پھلوں میں ملا دینے کے بعد پہچانی نہیں جاسکتیں مٹی کے کھلونے، بھشتی، دھنکیے، جولاہے، مٹھائی والے، ترکاری والے چھپکلی، کچھوا، خرگوش، ہرن، گائے بھینس کوا اور ایک انچ کا سارس ایک پاؤں اٹھائے مثل بناتے ہیں ۔

آدمی کی خفیہ حالتوں کے مجسمے ایسے عمدہ دنیا میں کہیں نہیں بنتے۔

کسیرے:۔ تانبے کے برتن ایسے سڈول بناتے ہیں کہ ہندوستان بھر میں پسند کئے جاتے ہیں لوٹے اور پتیلی کی اونچائی اور گولائی میں ایسا تناسب ہوتا ہے کہ وہ بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ لگن کی گہرائی اور لگر کم ہوتی ہے جس سے وہ بہت سڈول ہوجاتی ہے۔ برتنوں پر ایسے اُبھرے ہوئے نقش و نگار بناتے ہیں جو کہیں نہیں بن سکتے۔ بجھرا۔ سبو دان۔ ڈونگیا یہاں کے کسیروں کی خاص ایجاد ہے۔

مسی گر:۔ لوٹے کی ٹونٹی اس صفائی سے جوڑتے ہیں کہ ٹانکا دکھائی نہیں دیتا۔

قلعی گر:۔ رانگے کی قلعی بے مثل کرتے ہیں پتیل کا لوٹا اندر سے رانگے کی قلعی سے سفید اوپر سے زرد لکھنؤ کے قلعی گروں کی ایجاد ہے۔

سنار:۔ سونے چاندی کے سادے اور جڑاؤ گہنے نفیس و نازک بناتے ہیں اور ٹانکا دکھائی نہیں دیتا۔

سادے کار:۔ دہری زہ کی انگوٹھیاں لکھنؤ کی خاص ایجاد ہے اور کہیں اور کا سادے کار نہیں بنا سکتا۔

حکاک:۔ نگ تراشنے اور جلا دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

جوہری:۔ سارے ہندوستان میں مانے ہوئے ہیں جو خالی پرکھنے میں فرد نہیں جلا دینے اور جھوٹے کو سچا بنا دینے میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ بلور کو ہیرا بنا دیں گنگا برت، دو پلکا جیسا چاہئے بنوا لیجئے اور کیا مجال جو دوسری جگہ کا جوہری پرکھ لے۔

ملمع ساز:۔ سونے چاندی کا ملمع بے مثل کرتے ہیں

رفوگر:۔ شال میں رفو اور رنگ لکھنؤ سے بہتر کہیں نہیں ہوتا۔

رنگریز:۔ کپڑا رنگنے میں کمال رکھتے ہیں۔ چھینٹ کے عام ہونے سے پہلے رنگ کے

پھول بھی بناتے تھے، آبی، بیازی، اگری، بسنتی، کاکریزی، بسنتی، شربتی، فالسئی ملاگیری ہلکے اور سوفیانہ رنگ لکھنؤ سے بہتر کہیں نہیں رنگے جاتے۔

چھاپے گر:۔ لحاف رضائی کی فردیں، توشک اور پلنگ پوش، مارکین، چھالٹین اور غلتے پر بہت خوش وضع چھاپتے ہیں اور رنگ اتنا پکا ہوتا ہے کہ دھوئے دھوئے نہیں جاتا۔ لکھنؤ کی فردیں شہر شہر بکتی ہیں۔

چوڑی والے:۔ چوڑیاں بھی لکھنؤ کی خاص صنعت ہے، چوڑی والی گلی اب تک اس کا مشہور بازار ہے۔ شہانی چوڑیاں لکھنؤ کی ایجاد ہے۔

درزی:۔ اچکن، شیروانی، انگرکھا، پاجامے، گھٹنا چوڑی دار، ٹوپی دوپلی کشتی نما، گول اس برصغیر کا مہذب ترین اور ہندوستان کا قومی وسرکاری لباس خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے

نداف:۔ پاؤ بھر روئی میں پوری رضائی بھر دیتے ہیں۔ اور چھٹانک بھر روئی میں پوری بنڈی مع آستینوں کے۔

پھول والے:۔ ہار گجرے، پھولوں کے زیور، ان میں سونے چاندی کے جابجا تار لکھنؤ والوں کی ایجاد ہے۔ پھول والی گلی اس کا مرکز ہے۔

شہ سواری اور سلوتری کے بڑے بڑے کامل موجود ہیں۔

سپہ گری:۔ جل بانک، اگن بانک، علی مدد اور رستم خانی یہاں کی ایجاد ہے بانک، بنوٹ، تلوار، پھینکیتی، تیر اندازی، بندوق کا نشانہ، پیراکی شرفا کا خاص فن ہے۔

بانکے ہیں تو پرانی چیز مگر لکھنؤ کے بانکوں نے فن کے ساتھ جوانمردی میں بانکپن کی شان بڑھادی کہیں اور کا بانکا ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ وہ سپر یا زرہ بکتر سے

حفاظت ننگ و عار سمجھتے تھے بشربتی کے انگرکھوں پر تلواریں کھانا ان کا شعار تھا۔ جاڑا گرمی برسات کوئی چیز انھیں مغلوب نہیں کر سکتی۔ کپڑا کے جاڑے ہے۔ شربتی کے انگرکھوں میں گزرتے تھے اور سردی لگنے کا اندازہ کسی کو نہیں ہو سکتا تھا۔

بہروپیے :۔ بہروپیوں نے روپ بھرنے میں وہ کمال دکھایا کہ عقل حیران ہو گئی ایک بہروپیے نے آدھا چہرہ ایک پیرزال کا بنایا۔ جھریاں۔ بغبغے۔ سفید بال۔ آدھا ایک خوبصورت نوجوان عورت کا۔ گھونگھٹ سے کبھی اِدھر کا چہرہ دکھاتا کبھی اُدھر کا دیکھنے والے سمجھتے تھے کہ وہ کبھی بوڑھی عورت بن جاتا ہے کبھی جوان۔ یہ فرق سمجھ میں نہ آتی۔ اس تیزی سے وہ چہرے کو حرکت دیتا تھا کہ ایک چہرے کے دو رخ دو طرح کے سمجھ میں نہ آتے تھے۔

ایک بہروپیا لنگور بن کے دوڑتا ہوا اس طرح آیا سب لنگور سمجھے اس نے اپنے قد کو اس طرح سکوڑ لیا تھا لنگور سے بڑا نہ معلوم ہوتا تھا۔

طوائفیں :۔ لکھنؤ کی طوائفیں تہذیب سخن سنجی حسن و جمال اور کمال فن میں مشہور تھیں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ ہر مشہور یا خاندانی طوائف صاحبِ جائداد اور دولت مند تھی اس وجہ سے معمولی آدمی ان کے یہاں جانے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا تھا رؤسا انھیں بلاتے تھے اور رئیس زادے ان کے یہاں جاتے تھے بعض شعراء سے بھی ان کے روابط تھے کیونکہ وہ خود شعر کہتی تھیں اور شعراء کی قدردان تھیں۔

دری پر سفید چاندنی کا فرش صدر میں مسند بچھی ہوئی اور وہ گاؤ تکیہ سے لگ کے بڑی شان سے بیٹھی تھیں چودہ گز کا بڑے پائنچوں کا پاجامہ شلوکہ اور دوپٹہ مانگ میں افشاں آنکھوں میں سرمہ کا دنبالہ ہونٹوں پر پان کا لاکھا یا مسی کی دھڑی، ہاتھ پاؤں میں مہندی۔ کپڑے عطر سے بسے زیور سے آراستہ پانچ سیر کا بڑا سا پاندان چکنی ڈلی، الائچیوں سے بھرا ہوا اور عطردان آگے رکھا ہوا۔

رئیس زادے پہلے سے اطلاع دیتے ہیں کہ ہم فلاں دن فلاں وقت آئیں گے اس دن اگر کسی اور سے وعدہ نہ ہوا تو وہ کہتیں زہے نصیب کہ سرکار کنیز کو سرفراز فرمائیں اور وہ جب تشریف لاتے تو سروقد تعظیم کے لیئے کھڑی ہوجاتیں اور کمر تک جھک کے سات سات تسلیمیں بجالاتیں اپنی جگہ سے ہٹ کے انھیں صدر میں مسند پر بٹھاتیں اور خود دوسری طرف فرش کے کونے پر بیٹھتیں۔ پاندان اٹھا کے ان کے آگے رکھ دیا جاتا وہ پان لگا کے خاصدان میں دونوں ہاتھوں پر رکھ کے پیش کرتیں اگر گانے کی فرمائش کی تو سازندے آتے اور جھک جھک تسلیمیں کر کے بیٹھ جاتے گانا شروع ہوتا تعریف پر اٹھ اٹھ کے تسلیمیں کرتیں یہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی صحبت ہوتی۔ جس میں سیکڑوں روپیہ ان کو انعام میں مل جاتا سرشام سے چوک میں ہجوم ہوجاتا اور ساز و آہنگ کی آوازوں سے فضا گونج اٹھتی۔

مہترانیاں :۔ روزانہ شرفا کے گھروں میں جانے سے وہ بھی مہذب و شائستہ بن گئی ہیں وہی محاورے اور روزمرہ وہی شین قاف کی درستی وہی لب و لہجہ اپنے کام سے فارغ ہو کے نہا دھو کے صاف ستھرے کپڑے پہن کے پلنگ پر اجلا چادر بچھا کے بڑا سا پاندان سامنے رکھ کے بیٹھی ہیں تو انجان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ بیگم صاحب نہیں ہیں۔

نصیر حسین خاں خیال نے داستان اردو میں شیخ جان محمد شاد لکھنوی کی زبانی ایک مہتر کا یہ واقعہ لکھا ہے :۔

غدر کے زمانہ میں میں پار (دریا پار) لکھنؤ کا ایک محلہ) میں رہتا تھا۔ فوراً ایک صبح قیصر باغ کی طرف آنا پڑا انگریزوں اور باغیوں کی فوجیں پڑی تھیں بیلی گارد کا محاصرہ تھا۔ اس طرف جانے لگا ایک بھنگی ہاتھ میں جھاڑو لئے کھڑا تھا مجھے دیکھ کر بولا میاں صاحب جان کی خیر مناؤ ادھر ادھر نہ جاؤ میں نے کہا خیر ہے کہا گورے کمک کو آ چکے ہیں اور جنرل انرم بھی

یہی چاہتے ہیں اور کیا کہوں ۔ ۶

لاکھوں ہیں کوئی قبل کوئی بعد آئے گا   گنتی بڑھے گی جب عدم آئے گا[1]

علما۔ کچھ معقولات میں کچھ منقولات میں کچھ ادب و تاریخ میں کچھ فقہ و اصول میں کچھ تمام علوم میں درک رکھنے والے ہر زمانے میں کثرت سے موجود رہے اور اس پایہ کے کہ ان کا مثل ہندوستان میں کہیں نہ تھا۔ معقولات اور کلام و مناظرہ میں تو دنیا میں ان کا ثانی نہ تھا۔ اس آخر زمانہ میں مشرقی علوم کا چراغ علمائے لکھنؤ نے روشن رکھا۔

اطبا:۔ خاندانی اطبا کے علاوہ حاذق طبیب ہمیشہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ہر طبیب کا مطب طب کی درسگاہ بھی ہے جہاں وہ بلا معاوضہ پڑھاتے ہیں اور دور دور سے لوگ طب منطق فقہ اصول پڑھنے آتے ہیں اور جو تھوڑا سا بھی کسی علم میں امتیاز حاصل کر لیتا ہے پھر وہ لکھنؤ نہیں چھوڑتا کیونکہ اس کو اپنے فن کی جو قدر لکھنؤ میں نظر آتی ہے وہ کہیں اور ہوتے دکھائی نہیں دیتی۔ قرب و جوار کے رؤسا لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ ہر جگہ کی مشہور چیز لکھنؤ میں خرید لیجئے۔

تہذیب:۔ آداب نشست و برخاست اور تہذیب و تمدن میں دنیا کا مشہور شہر ہے یہاں کے خاص و عام میں جو شائستگی اور سلیقہ ہے وہ کہیں نہیں دیکھا گیا حفظ مراتب

---

[1] ایک صبح لکھنؤ کی زبان میں ایک دن صبح کو کہتے ہیں مجھے دیکھ کر بولا لکھنؤ والے نہیں بولتے مجھے دیکھ کر کہا لکھنؤ کی زبان ہے میاں صاحب ادھر نہ جاؤ لکھنؤ کا مہتر نہیں کہہ سکتا میاں ادھر نہ جائیے گیا ہوگا جان کی خیر مناؤ۔ لکھنؤ کا مہتہ کسی شریف آدمی سے نہیں کہہ سکتا آپہی چاہتے ہیں یہ لکھنؤ کا روزمرہ نہیں۔ آیا ہی چاہتے ہیں روزمرہ ہے   خیال نے اپنی زبان میں واقعہ لکھا ہے۔

کا لحاظ خطاب و جواب میں دلکشی زبان کی لطافت لہجہ کی شیرینی و سامعہ نوازی شین قاف کی درستی خاص و عام میں یکساں ہے حسن خلق اور خودداری کے ساتھ انکسار خندہ جبینی، شائستگی سکون وقار لازمۂ انسانیت ہے وہ اپنے لہجہ و معنی پیدا کرتے ہیں صرف ایک سلام کو لے لیجئے بزرگوں کو سلام کرنے کے طریقہ میں احترام و عظمت اور بزرگی کا اعتراف ظاہر ہوتا ہے بے تکلف دوستوں کو "آداب عرض" ہے کہنے میں دونوں الف کی آواز میں اُتار چڑھاؤ سے اشتیاق محبت اور خلوص کا مفہوم پیدا کرتے ہیں۔ حُسنِ معاشرت کی یہ دلکشی کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی۔

امیر مینائی کو بہشت میں بھی ان کی اداؤں کے دیکھنے کی توقع نہیں وہ بڑی حسرت سے کہتے ہیں ؎

کہاں ہوں گی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

یہ باتیں یوں سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ باہر جاکے لکھنؤ کی قدر ہوتی تھی۔ میر انیس حیدرآباد دکن مرثیہ پڑھنے گئے۔ کئی بند ہوا میں اڑ گئے۔ کسی نے ان شاعرانہ لطافتوں کی داد نہیں دی میر صاحب نے مرثیہ زانو پہ رکھ کے مجمع کو حسرت سے دیکھا اور کہا ہائے لکھنؤ تجھے کہاں سے لاؤں" اب اس کا مطلب سمجھئے۔ ع

لکھنؤ ہم پر فدا ہے ہم فدائے لکھنؤ

باہر کا آدمی آکے سمجھتا ہے کہ لکھنؤ کیا چیز ہے۔ تہذیب و شائستگی کسے کہتے ہیں سخن فہمی کس کا نام ہے اور علوم و فنون میں کمال کی کیا حد ہے۔ اس تہذیب و شائستگی نفاست اور نزاکت کے ساتھ سپاہیانہ بانکپن خاص جوہر ہے اس میں اتنا مبالغہ کیا جاتا ہے کہ پرانے لوگ بڑے بڑے آپریشن میں بیہوشی لینا جوانمردی کے

خلاف سمجھتے تھے گھر پر آپریشن ہوتا تھا اور مجال نہیں کہ تیوریوں پر بل پڑ جائے بہر حال نفاست، حسن پرستی، شعروشاعری خوش پوشاکی اور خوش خوراکی معاشرہ کا خاص جزو ہے۔

بے ڈھنگی بات انسانیت اور شرافت کے خلاف سمجھی جاتی ہے ہر شخص خود اپنے اوپر نگاہِ احتساب رکھتا ہے پانچوں کپڑوں سے درست، تہذیب و شائستگی سے اٹھنا بیٹھنا، سلام بندگی خطاب و جواب میں دلکشی اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔

میر انیسؔ مجلس میں مرثیہ پڑھنے سے پہلے قدِ آدم آئینہ کے سامنے مرثیہ پڑھتے تھے کہ نشست اور سر و گردن کے اشاروں میں کہیں بے ڈھنگاپن تو نہیں پیدا ہوتا۔ شاد عظیم آبادی نے انھیں لوگوں کی تصویر کھینچی ہے۔

وہ صورتیں متبرک وہ ان کی شان و شکوہ — مہذبانہ وہ باتیں وہ جانفزا گفتار
ہر اک کو وضع کا پاس اپنے دوستوں کا لحاظ — لبوں پہ خُلق کی باتیں دلوں میں صبر و قرار
محاوروں میں وہ شیرینیاں کہ صلِّ علیٰ — وہ جب کریں تو باہستگی کریں گفتار
جھکائے سر کو شرافت سے راستہ چلنا — ادب سے ہاتھ اٹھانا سلام کو ہر بار
کریں غریب کا بھی تا بفرش استقبال — بہت لحاظ کہ آئے نہ ان کے دل پہ غبار
بہادرانہ امنگیں سپاہیانہ شوق — جریب دست مبارک میں اور کمر میں کٹار
کوئی جگہ کوئی صحبت نہیں کہ ہوں نہ وہاں — مورخ و شعراء و ادیب و نثر نگار

مولانا صفی نے اسی تصویر کو اپنے رنگ میں یوں پیش کیا ہے

لکھنؤ اے اوجِ ہمت کے ستارے لکھنؤ — لکھنؤ اے ہند کی آنکھوں کے تارے لکھنؤ
خلق کے جوہر چمکتے ہیں تری اکسیر میں — جذب دل کا مادہ ہے خاکِ دامنگیر میں
وہ لب و لہجہ نہ ہو گوشِ سماعت پر جو بار — روزمرہ وہ کہ جو حسن ادا سے ہمکنار

لکھنؤ کے ہر کہ و مہ کی زباں ہے نرم و صاف ‏ ‏ ہے درست اس کے عوام الناس کا بھی شین قاف

لکھنؤ کا طبقۂ انفار تک شیریں کلام ‏ ‏ روزمرہ وہ فصیح ان کا وہ فراشی سلام

لکھنؤ اک خطۂ آباد و مردم خیز ہے ‏ ‏ جو یہاں پیدا ہوئے ہیں ذہن ان کا تیز ہے

بیشتر موزوں طبیعت بیشتر موزوں خیال ‏ ‏ خوش مزاج و خوش دماغ و خوش نوا و خوش مقال

لکھنؤ کے خاص باشندے مرنجان و مرنج ‏ ‏ نکتہ فہم و نکتہ رس ہنس مکھ ظریف و بذلہ سنج

پائیے گا عامیوں کو بھی مہذب نکتہ رس ‏ ‏ واقف آداب مجلس باخبر با حس و مس

اہل لکھنؤ اتنے ذہین کیوں ہیں؟ لکھنؤ والوں کے اتنے شائستہ اور ذہین ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کے سب سے بڑے عالموں، فاضلوں، فلسفیوں، شاعروں اور سپاہیوں کی اولاد ہیں انھیں حکمت یونانی تہذیب ایران فصاحت عرب اور فلسفہ ہند نے سیکڑوں برس اپنی گود میں پالا ہے۔

اسے یوں سمجھئے کہ عالم و فاضل فلسفی و شاعر علوم و فنون کے ماہر سپاہی منشا و مدبر ہزاروں برس کے علوم و فنون کا خلاصہ و جوہر جو دنیا میں پھیلے ہوئے تھے انھیں حالات نے زمین کی طنابیں کھینچ کے لکھنؤ پہنچا دیا یہاں؛ طمانیت سے بیٹھ کے انھوں نے تمام علوم و فنون کو معراج پر پہنچایا اور آخر میں تمام علوم و فنون الگ الگ ذات میں نہیں رہے بلکہ ایک ایک ذات مجمع علوم و فنون بن گئی۔

اس کی مختصر روداد یہ ہے کہ اودھ کی حکومت جب سے قائم ہوئی بدامنی اور یورش سے محفوظ رہی۔ شجاع الدولہ تک اتنی مضبوط تھی کہ اس کے حدود میں کسی حریف کو قدم رکھنے کی جرأت نہ تھی۔

آصف الدولہ کے زمانہ میں انگریزوں کی حمایت میں آ گئی۔

سعادت علی خاں تک چاروں طرف سے انگریزی مقبوضات سے گھر گئی۔

اس سے جہاں نقصانات ہوئے وہاں یہ فائدہ بھی ہوا کہ بیرونی حملہ آوروں اور لوٹ مار سے محفوظ ہو گئی حکمرانوں کو اپنی حفاظت کی فکر نہ رہی۔ ایک مختصر فوج قیام امن اور شان و شوکت کے لیے کافی ہوتی۔ فوجی مصارف کم ہو گئے۔ حکمرانوں کو بے فکری اور فارغ البالی ملی دولت ملی اور لطفِ زندگی حاصل کرنے کے سوا کوئی کام نہ رہا۔ ذہن کی تمام صلاحیتیں اسی پر صرف ہونے لگیں اور دل کا حوصلہ نکالنے میں کوئی مانع نہ رہا۔

زندگی کا لطف اٹھانے کے لئے سب سے پہلے انسان کی توجہ عورت کی طرف ہوتی ہے اس کے بعد غذا لباس، مکان سامان آرائش، تفریحات۔ شعر و غنا لہو و لعب دہلی میں اس سلسلے میں جو کچھ ہوا وہ تاریخ سے پوشیدہ نہیں بیگم کے ہاتھ ایک جام شراب پر سلطنت بیچ ڈالنے والے دل پھینک بادشاہ کو بھی تاریخ جانتی اور محمد شاہ رنگیلے کو بھی پہچانتی ہے اودھ کے فرمانروا بھی اسی معاشرے میں پلے تھے مگر وہ ایرانی بھی تھے ان میں ایک رکھ رکھاؤ سنجیدگی متانت نفاست اور سپاہیانہ بانکپن تھا۔

عام لوگ بھی کھانے پہننے کے شوقین تھے عربی پڑھتے تھے خوشنویسی سیکھتے تھے۔ شہسواری کی مشق کرتے تھے۔ سپہ گری میں مہارت پیدا کرتے تھے۔ سپاہیانہ وضع میں رہتے تھے۔ سیر چشمی الوالعزمی غیرت وحمیت جز و طبیعت تھی۔ شعر و سخن سے فطری مناسبت تھی رقص و غنا کبوتر بازی اور مرغ بازی تفریحی مشاغل تھے۔ طوائفوں سے دلچسپی تھی تہذیب، شائستگی اور نفاست کا ہر بات میں لحاظ تھا۔

حکمراں سے لے کر معمولی آدمی تک اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ انھیں باتوں پر دل کھول کے روپیہ خرچ کرتا تھا۔

ہندوستان کے اکثر حصوں میں لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ انگریزی عملداری میں امن تھا مگر وہاں ان باتوں کی قدر نہ تھی ملک کے کونے کونے سے اہل فن دوڑ دوڑ کے

چلے آرہے تھے

میر علی لطف کا بیان ہے کہ ایک ایک کمال کا ہزار ہا آدمی موجود ہے اس طرح سیکڑوں برس سے جہاں جہاں علوم و فنون پھیلے ہوئے تھے سب کو لکھنؤ نے کھینچ لیا اور صاحبان فن اپنی قدر بڑھانے کے لیے جدتیں پیدا کرنے لگے جس نے نئی بات نکالی اس کی دھوم مچ گئی۔ انعام و اکرام سے مالا مال ہو گیا اس کا دل بڑھا دوسروں کی ہمت بڑھی۔ اس طرح تمام علوم و فنون ترقی کر کے آسمان پر پہونچ گئے اور اس چھوٹی سی سلطنت میں جو کچھ ہو گیا وہ دنیا میں کہیں نہیں ہوا عمارتوں کی عظمت، لباس کی وضع، رئیسوں کی شوکت و شان۔ سپاہیوں کی آن بان موسیقی کا طرز، شاعری کا انداز صنعتوں کی جدت طرازی زبان کی شیرینی تمدن کی لطافت، تہذیب کی نزاکت، مہا شرے کی نفاست سے لکھنؤ خود ایک شعر بن گیا۔ اس کا ہر کوچہ اوراق مصور تھا۔ اسی کی تاریخ آپ کے سامنے پیش کی جائے گی جس سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ فرمانروایان اودھ نے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کو ترقی دینے میں کیا کچھ کیا جس سے لکھنؤ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا ایسا مرکز بن گیا جس کا مثل دنیا میں نہ تھا۔

لوگ مشتاق تھے دیدار کے دیوانے تھے
ہفت اقلیم میں اس شہر کے افسانے تھے

ہمارے زمانہ تک دور دراز کے لوگ لکھنؤ کو دیکھنے آتے تھے حسین آباد کا امام باڑہ رومی دروازہ نصیر الدین حیدر کی کربلا چھتر منزل دیکھنے کے قابل عمارتیں ہیں خاص طور پر آصف الدولہ کا امام باڑہ اور واجد علی شاہ کا قیصر باغ اپنی شان و شوکت میں عدیم النظیر ہے نہ ایسا کہیں امام باڑہ ہے نہ دنیا کے کسی بادشاہ نے نہ واجد علی شاہ

کا ایسا محل کبھی بنوایا نہ آج کہیں ہے۔ مردہ اور زندہ عجائب خانہ بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

لکھنؤ کی شام

گھڑی دن رہے لکھنؤ پر بہار آتی ہے صاف ستھرے کپڑے پہنے پرانے لوگ جریب نوجوان چھڑی ہاتھ میں لئے سڑکوں اور گلیوں میں نظر آتے ہیں۔ کسی کا محلہ میں کسی کے یہاں بیٹھنے کا معمول ہے۔ بعض دوکانیں احباب کا اڈہ ہیں۔ کمپنی باغ تفریح گاہ ہے گرمیوں میں بنچوں اور گھاس پر احباب کی ٹولیاں ہوتی ہیں دلچسپی کی باتیں اور شعر و شاعری ہوتی ہے۔

حضرت گنج لندن کا بازار معلوم ہوتا ہے۔ امین آباد فینسی چیزوں کا بازار ہے چینی کے برتن، گھڑیاں، سائیکلیں بچوں کی گاڑیاں، اعلیٰ قسم کے کپڑے، جوتے ٹوپیاں کتابیں اور طرح طرح کے سامان کی بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ ایسا عمدہ سامان شہر میں کہیں اور نہیں ملتا۔ چاروں طرف دوکانیں بیچ میں بہت بڑا پارک ہے جس میں سبزہ لگا ہے۔ جہاں لوگ بیٹھتے ہیں اور دلچسپی کی باتیں کرتے ہیں۔ اور نماز مغرب جماعت سے پڑھتے ہیں۔ مجمع کی کثرت سے کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔

وکٹوریا اسٹریٹ:۔ پر ایک طرف بزازہ ہے دوسری طرف ہر قسم کی دوکانیں ہیں۔

پارچہ والی گلی:۔ کڑھی ہوئی دو پلی ٹوپیوں اور کرتوں کا بازار ہے۔

چاول والی گلی سونے چاندی کے زیور اور دلہن دولہا کے پر تکلف جوڑوں کی دوکانیں ہیں جہاں یہ سب چیزیں کرایہ پر ملتی ہیں۔ چوڑی والی گلی میں صرف چوڑیوں کی چھوٹی بڑی دوکانیں ہیں۔

پھول والی گلی:۔ گلفروشی کا بازار ہے۔

یحییٰ گنج میں تانبے اور پیتل کے برتنوں کی بڑی بڑی کوٹھیاں ہیں اسی کے برابر مسی گر اور قلعی گروں کی دوکانیں ہیں۔

میوے والی سری:۔ اچار چٹنی سرکہ عرق نعناع اور مربوں کا بازار ہے۔

ڈالی گنج:۔ غلہ کی بہت بڑی منڈی ہے۔ ہر بازار کی ایک خاص خصوصیت اور اس کی چہل پہل کی خاص نوعیت ہے۔

چوک کی سڑک دراصل لکھنؤ کی شہ رگ ہے جس میں خون کی جگہ شراب و شکر جاری و ساری ہے۔

ساری دنیا میں آفتاب چلے جب طلوع ہو لیکن یہاں طلوع ہوتا ہے شام ہی کو اور جب صبح ہوتے ہوتے وہ غروب ہوتا تو خدا جانے حسن و محبت کی کتنی داستانیں اپنے ساتھ لے جاتا ہے جھٹپٹا ہوتے ہی وہ پردہ گیان حریم ناز کا اہتمام دلربائی وہ حوریان بزم سوز و ساز کی جلوہ فرمائی .... نیاز فتحپوری لگا

کوئی گوری کوئی چمپئی کوئی سانولی سلونی۔ خد و خال اس قدر باریک گویا ہیرے کے قلم سے ترشے ہوئے ہیں .... کوئی کڑیل جوان کوئی نوجوان کوئی ان دونوں کے درمیان مہکتی ہوئی اٹھان کوئی گٹھے جسم کی کوئی دھان پان کسی کی ناک میں نتھ کسی کی ناک میں نیم کا تنکا جوش ملیح آبادی بادوں کی برات

ہر ایک حسن میں یکتا چاند سا چہرہ کالے کالے بال پھول سے گال سرو سا قد حور کی صورت پری کی خصلت ہرن کی چھل بل چکور کی چال مور کی طرح مست تارے کی طرح چمکتی کوٹھوں پر دل چھیننے اور جان لینے کے لئے بیٹھتی ہیں

خونریز نگہاں کرشمہ کوشاں ہم خنجر و ہم نمک فروشاں

مولانا قیوم ابو الفضل پنجاب حقیقت قلم

وہ سارنگیوں کی تھرتھراہٹ کے ہواؤں میں ہلکورے وہ گمکتے ہوئے طبلے۔ بالا خانوں کے چھجوں سے وہ مکھڑوں کی برستی ہوئی چاندنی اور زلفوں کے گرتے ہوئے آبشار۔ (جوش ملیح آبادی یادوں کی برات)

وہ فردوس گوش نعمتہائے جانگداز وہ جنت نگاہ عشوہائے ناز وہ فضائے مشکبو — وہ صدائے ہائے و ہو۔

گویا ایک سیلاب تھا رنگ و نور کا ایک تلاطم تھا نشاط و سرور کا یا بقول غالب ؎

عرش سے تا فرش اِک طوفانِ موجِ رنگ تھا

(نیاز فتحپوری نگار)

شعراء کے یہاں شاگردوں کے مجمع اور سیف سخن پر صیقل کا وقت بھی یہی ہے اطباء کا درس بھی اسی وقت شروع ہوتا ہے۔

علماء کے درس کا وقت بھی یہی ہے کوئی محلہ ایسا نہیں ہے جہاں متعدد علماء کی مسند درس نہ بچھتی ہو اور اس کے حاشیہ پر طلبا نہ ہوں

شفاء و اشارات کے غوامض صدرا و شمس بازغہ کے مطالب اور افق المبین کی نہیں معلوم کتنی گتھیاں سلجھا کے لکھنؤ کا آفتاب ڈوبتا اور اذان مغرب سے فضا گونجتی رات کی تاریکی خیمہ لگاتی اور ساز و آہنگ کی لہریں ناچنے لگتیں اسی نغمہ و سرود والی رات میں اسی کیف و سرود والی رات اسی ناز و نیاز والی رات میں ایسے گوشے بھی ہیں جو عبد و معبود کے راز و نیاز سے روشن ہو جاتے تسبیح و تہلیل کی آوازیں بلند ہوتیں اور صلوٰۃ نیم شبی سے محراب عبادت گونجتی اور رات کی اسی ہنگامہ خیزی میں ہزاروں اشہب قلم میدان تحقیق میں اس طرح دوڑتے کہ سینا و فارابی کی روح پھڑک جاتی۔

لکھنؤ کی صبح

جب صبح کا قافلہ منزل شب طے کر کے افق لکھنؤ پر اترتا تو نہیں معلوم کتنی حسن و عشق کی داستانیں بنا کے فلسفہ و منطق کے نکتے حل کر کے ادب و شعر کے کتنے دفتر مرتب کر کے رات رخصت ہوتی اور اذانِ صبح کے ساتھ نغمہ و آہنگ کا سیلاب تھمتا رات کے جاگے اور تھکے ہوؤں کو خستگی بستر پر ڈال دیتی اور نسیم صبحگاہی کے جھونکے خواب سحر گاہی کا پیغام دیتے اور آفتاب نئے ہنگاموں کا سیلاب ڈھکیلتا افق سے سر نکالتا۔

اکھاڑوں میں پہلوانوں کا زور گلی گلی اور گھر گھر ورزش اور سپہ گری کی مشق سے لکھنؤ پہلوانوں کا شہر معلوم ہوتا ہے۔

اطبا کے مطب کا ہنگامہ کہاروں کا ڈولیوں پر مریضوں کو لانا سودے والوں کی آوازیں کھیر کے پیالے غش کی فیلیوں کی صدائیں بالائی کے سکورے۔ دودھ کی ہانڈیاں گھروں میں عورتیں بیچتی پھرتی ہیں۔

شیرمال تافتان کلچے۔ نہاری اور بالائی کی دوکانوں پر ہجوم طلباء کا کتابیں بغل میں دبائے اساتذہ اور مدارس کی طرف جانا گھڑی دن چڑھے سے دکانیں کھلنا شروع ہوتی ہیں اور کاروباری لوگ تیزی سے اپنے کام میں مشغول ہو کے سہپہر کے ہنگامے کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔

یہ ہے لکھنؤ ع

مثل جس کا کوئی دنیا میں نہیں

اس کی تاریخ دلچسپ بھی ہے حیرت انگیز بھی ہے اور عبرت خیز بھی ہے اور قابل فخر بھی اس اور دنیا کے سامنے پیش کرنا قومی فریضہ تھا جس کو میں نے انجام دینا ضروری سمجھا

مقدمہ

شاہان اودھ کی فیاضیوں اور قدر دانیوں نے لکھنؤ کو حسن و جمال میں پرستان سپہ گری میں سیستان، علم و حکمت میں یونان، تہذیب و تمدن میں ایران، شعر و سخن میں اصفہان اہل کمال کی کثرت میں نصف جہان بنا دیا تھا اس لکھنؤ کو ۱۹۴۹ء تک ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اگر غفلتوں کا سن نکال دیا جائے تو پچیس برس ہوش کے زمانے میں وہ ہمارے سامنے رہا۔ اس سے پہلے کے لکھنؤ کی سیر تاریخوں میں کی جو کچھ دیکھا وہ سب اس میں سے لکھ دیا۔ اس کے بعد انقلاب آیا اس میں اس پر کیا گذری وہ لوگ بیان کریں گے جنہوں نے اس انقلاب کو دیکھا ہے۔

۱۹۴۹ء تک کی جو روئداد ہم نے بیان کی ہے اس میں جی تو یہی چاہتا تھا کہ تمام علوم فلسفہ، منطق، ریاضی، ہیئت، نجوم، طب، حدیث، تفسیر، کلام، مناظرہ تاریخ اور ادب کی ترقیاں فنون لطیفہ میں موسیقی کا عروج، خطاطی کے نمونے مصوروں کے مرقعے۔ عمارتوں کے نقشے نئی ایجادوں کی تصویریں، پرانی ساخت میں تبدیلیوں کی شکلیں سپہ گری کے کمالات۔ رؤسا کی قدردانی، اکابر کے حالات اہل فن کے کمالات سب کچھ لکھ دیا جائے مگر یہ تاریخ بغداد کی طرح چالیس جلدیں ہوتیں جن کو پڑھنے کا نہ کسی کے پاس وقت نہ چھپنے کا امکان نہ اس سرمایہ تک پہنچ اس وجہ سے ان سب کے سرسری ذکر پر اکتفا کی گئی۔

ہر اتوار کے نخاس اور ہر مہینے کے لکھنؤ کی چہل پہل میلے ٹھیلے درگاہوں کی قوالیاں، مجلسیں جلسے جلوس نذر و نیاز کے تکلفات مرثیہ خوانوں اور حدیث خوانوں کے کمالات بھی بیان کرنے کے قابل تھے مگر ان سب کو طول کے خیال سے ترک کر دینا ممکن

ہے کہ دوبارہ اشاعت میں بڑھادیا جائے۔

زبان وشاعری پر تفصیلی بحث ہے مگر اس میں بھی شعراء کے حالات ان کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام نہ ملنے سے جو کہنا چاہتا تھا وہ نہ کہہ سکا۔ جو کچھ ہے وہ قلم برداشتہ ہے اور بہت سی خامیوں کے ساتھ ہے جن کا دور کرنا ممکن نہیں۔

اب پچھتاتا ہوں کہ جب ہندوستان میں تھا اس وقت خیال نہ آیا نہیں تو وہاں کے عجائب خانوں، کتب خانوں قدیم خاندانوں اور پرانے بزرگوں سے بہت کچھ مل جاتا اب بھی یہ کام وہیں رہ کے کرنے کا ہے جو میرے لیے ممکن نہیں۔

اس خیال سے کہ ایک عظیم تہذیب اور دلکش تمدن کی تاریخ سے بعد کی نسلیں ناواقف نہ رہیں جو کچھ دل میں تھا اُسے کاغذ رکھ دیا کہ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔

سیاسی حالات وہی بیان کئے ہیں جن کا تعلق تہذیب وتمدن سے ہے

ہم نے اہل لکھنو کے تہذیب وتمدن کی تاریخ لکھی ہے اسی وجہ سے شاہان اودھ کی دلچسپیوں اور فضول خرچیوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے کیونکہ انھیں سے لکھنؤ کی تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کو معراج ملی۔

ملک کی آمدنی کا کوئی سیاسی مصرف باقی نہیں رہ گیا تھا۔ سب ایک ذات کے لیے تھی جس میں حفظ نفس بھی تھا رعایا پروری بھی اور علوم وفنون کی سرپرستی بھی ۔

تفریحات کے اکثر موقعوں پر وہ اپنی رعایا کو بھی شریک کرتے تھے اس نے ان کو خوشحال اور جاں نثار بنادیا تھا۔

دو ہی صورتیں تھیں یا قارون کا خزانہ جمع کیا جاتا یا جو ہوا وہ ہوتا میں سمجھتا ہوں کہ خزانہ زیر زمیں قارون کی طرح نہ اپنے لئے مفید ہوتا نہ دوسروں کے لئے اور

بلکہ آخر میں انگریزوں کے ہاتھ لگتا ۔ اس سے اتنا تو ہوا کہ لکھنؤ علم و تہذیب کا ایسا مرکز بن گیا کہ دنیا میں کوئی جگہ اس کا مقابلہ نہ کرسکی۔

اسی زمانہ میں ہندوستان کے اکثر حصوں میں ایسی ہی آزاد حکومتیں قائم ہوئیں مگر کوئی لکھنؤ نہ بن سکی۔ اس کے اسباب پہ آپ غور کریں گے تو وہی باتیں نظر آئیں گی جنہیں شاہان اودھ کے عیوب میں پیش کیا جاتا ہے۔

کتنی بے عقلی کی بات ہے کہ لکھنؤ میں علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی ترقی کا لوگ اعتراف کرتے ہیں مگر ان باتوں پر اعتراض کرتے ہیں جن سے ان کو ترقی ہوئی یہ لوگ ان دونوں کے رشتہ کو کاٹ دیتے ہیں اور فضول خرچیوں کے افادی پہلو کو نظرانداز کرکے برائی پر اتر آتے ہیں جس میں اتنا مبالغہ ہوتا ہے کہ شیطان بھی شرما جاتا ہے۔

آج بھی ہر جگہ کے حکمراں سلاطین اودھ سے زیادہ خرچ کرتے ہیں مگر ان سے رعایا کو کتنا فیض پہنچتا ہے ؟ اگر دوسرے سلاطین کے مصارف اور فیوض کا مقابلہ کیجئے۔ تو شاہان اودھ کی قدر ہوگی۔

سلطنت مٹ گئی مگر آج تک مشرقی تہذیب کا چراغ جل رہا ہے۔ علوم و فنون کے چشمے ابل رہے ہیں۔ ہر فن کے باکمالوں سے شہر بھرا پڑا ہے باہر کا ہر صاحب کمال لکھنؤ آکے اپنے کو ہیچ پاتا ہے۔

ان کے بنائے ہوئے سیکڑوں مکانوں میں ہزاروں شرفا آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ان کے قائم کئے ہوئے خیرات خانے کتنے بے سہاروں کا سہارا ہیں ۔ یونانی شفاخانہ انگریزی اسپتال آج بھی موجود ہے۔

ان کے جاری کئے ہوئے وثیقوں سے ہزاروں آدمی آسودہ حال ہیں ۔

ہر سال حج و زیارت کو لوگ بھیجے جاتے ہیں

ان کی عمارتیں ویران نہیں ہیں۔ ان سے فیض کے چشمے جاری ہیں ۔

جاڑوں میں رضائیاں اور کمبل تقسیم کئے جاتے ہیں ۔

عربی مدارس علماء کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں اس لئے جو کچھ ہوا وہ قابل قدر اور تہذیب وتمدن کی عمارت کا سنگ وخشت ہے اسی کی تاریخ آپ کے سامنے پیش ہے جو حقیقت میں لکھنؤ کا تعارف ہے اس کا حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب لکھنؤ کی زندگی کا ہر پہلو پیش کر دیا جائے جن سے دنیا میں اس نے ایک منفرد مقام حاصل کیا اور لوگ اس کی دید کے مشتاق ہوئے۔ میں نے امکان بھر کوشش کی ہے کہ لکھنؤ کا ایسا مرقع پیش کردوں کہ پڑھنے والے اسے سمجھ سکیں بلکہ آنکھوں سے دیکھ لیں ۔ میرے خیال میں کوئی بات کہنے سے نہیں رہ گئی ہے اور ایک ایسی ہمہ گیر تاریخ مرتب ہو گئی ہے جسے مرحوم ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب علم تاریخ میں اضافہ اور تاریخ کا نیا ماڈل کہتے تھے اس کو لکھنؤ کی زبان میں لکھا گیا ہے جس سے اسکی فصاحت وبلاغت کا درجہ معلوم ہو سکتا ہے ۔

کتاب کی تصحیح نہ ہو سکی غلطیاں بہت رہ گئیں جس کا مجھے افسوس ہے اب اب یہ پڑھنے والوں کے فہم، دیانت اور انصاف پر ہے کہ وہ غلطیوں کو میرے سر تھوپیں یا کاتب کو ذمہ دار ٹھہرائیں ۔ فقط

ذرہ ناچیز
شمس
۱۰ / اگست ۱۹۹۱ء

تاریخ لکھنؤ

حصہ اوّل

ہندو عہد سے دورِ نوابی تک

اودھ کے تقدس کی تاریخ

اودھ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہ ہزاروں برس سے علم و فضل اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہی ہے۔

سری رام چندرجی، لکشمن جی، ہنومان جی ایسے مقدس اوتار۔ منوجی ایسا مقنن ویاس جی، ایسا فلسفی کا دیری ایسا طبیب والمیک ایسا شاعر اور کالیداس ایسا ادیب بھیم اور ارجن ایسے سورما اسی خاک سے اُٹھے جن کا نام دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

اس کی مردم خیزی کی وجہ اس کی زرخیزی ہے جو ہمیشہ طاقتور قوموں کو بلاتی رہی۔ تاریخ میں ہر قوم کے متعلق ہم یہی دیکھتے ہیں کہ وہ شمالی ہند میں آباد تھی جس کو ایک طاقتور قوم نے اُکے نکال دیا۔

باہر سے آنے والے آریوں نے بھی اسی کو پسند کیا اور اس کا نام آریہ ورت رکھا۔ اس کا صدر مقام اتر کوشل دریائے گھاگھرا کے کنارے تھا جو بعد کو اجودھیا کے نام سے مشہور ہوا۔

اجودھیا نام پڑنے کی وجہ جودھ[1] جو اصل میں یودھ ہے اس کے معنی جنگ کے ہیں اور اجودہ جس سے جنگ نہ کی جاسکے۔ یہ شہر بہادر چھتریوں کی طاقت کا مرکز ہونے کی وجہ سے ناقابلِ تسخیر تھا

---

[1] گلستان اودھ صلا

اجودھیا کا تقدس | میرا خیال ہے کہ اس شہر کے تقدس کی وجہ سے اس میں جنگ و جدل کی ممانعت تھی۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ آج خالق کائنات کا نام ہے اس نے ایک صنعت پیدا کر دی ہے اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ خالق کائنات کا ناقابل تسخیر یا پُرامن شہر۔

راجہ درگا پرشاد لکھتے ہیں:

یہ ان سات متبرک مقامات میں سے ایک ہے جن سے نارائن کا جسم بنا ہے بلکہ یہ ان جگھوں سے بھی بلند ہے۔ کیونکہ اس سے نارائن کا سر بنا ہے۔ یہ شہر زمین پر نہیں بلکہ برھما کی رتھ پر آباد ہے۔ یہاں کے بسنے والے گن ہوں سے پاک ہیں۔

جو شخص یہاں آنے کا ارادہ کرتا ہے اس کو اور اس کے بزرگوں کو مکتی (دا واگون کے چکر سے نجات) مل جاتی ہے۔ جو یہاں آنے والوں کے لئے سواری مہیا کرتا ہے اس کو بھی مکتی مل جاتی ہے[1]

اجودھیا کا تمدن | رامائن کے مصنف والمیک نے لکھا ہے۔

یہ شہر منوجی نے بسایا ہے اس کی وسعت بارہ یوجن[2] ہے۔ اس شہر میں شاہرائیں بنی ہوئی ہیں جن پر پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے[3]

اودھ نام پڑنے کی وجہ | اودھ کے معنی وعدہ کے ہیں رام چندر جی نے

---

[1] گلستان اودھ ص۳

[2] ایک یوجن چار مربع کوس کا ہوتا ہے۔

[3] والمیکی رامائن ص۲۰

بن باس کے بعد یہاں آنے کا وعدہ کیا تھا اس وجہ سے اودھ کہا جاتا تھا یعنی وعدہ کا شہر۔ ایک مدت کے بعد اجودھیا دارالسلطنت کا نام اور اودھ پورے صوبہ کا نام پڑ گیا۔[1]

اودھ کی چوحدی مشرق میں بہار، مغرب میں دہلی، جنوب میں دریائے گنگا، شمال میں نیپال ہے۔

باشندے یہاں کے پرانے باشندے برہمن، چھتری ویش اور شودر ہیں برہمن برہما کے سر سے، چھتری بازوں سے، ویش پیٹ سے اور شودر پاؤں سے پیدا ہوا ہے۔ برہمن کا کام علم حاصل کرنا، چھتری کا حکومت کرنا، ویش تجارت اور شودر خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

طبعی خصوصیات برہمن تنگ نظر متعصب اور پست فطرت ہے کشمیری برہمن مستثنیٰ ہیں وہ روشن خیال غیر متعصب خلیق ہیں۔ الہ آباد میں نہرو اور سپرو خاندان لکھنو میں چکبست اور موشر غابرہمن شرافت وانسانیت کا پیکر۔ اور ہندوستان کی آبرو میں چھتری بلند نظر عالی ہمت علم وفن کا قدردان شرافت کا مجسمہ حکمرانی اور رعایا پروری کی خوبو اس میں اب بھی باقی ہے۔ سپاہیانہ آبان بھی رکھتا ہے۔ کاستھ خلیق متواضع شاعر وانشا پرداز ہے۔

ویش اللہ میاں کی گائے ہے، شودر اپنے کو سب کا خدمت گزار سمجھتا ہے سب اپنی حالت پر مطمئن ہیں اور سمجھتے ہیں کہ برہمانے ہمیں اسی حالت میں رہنے اور اسی کام کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس وجہ سے شودر ویش کا، چھتری برہمن کا ہم پلہ

---

[1] تاریخ طلسم ہند ص ۲۶۹

اپنے کو نہیں سمجھتا۔ برتاؤ میں چھتری سب سے اونچا ہے برہمن بھی اس کو سلام کرتا ہے۔ شہروں میں ویش اگر پڑھ لکھ کے عزت و منصب حاصل کر لیتا ہے تو وہ اونچی ذات والوں کے برابر ہو جاتا ہے۔

یہ سب معتدل مزاج شانتی اور اہنسا کے پجاری ہیں۔

لکھنؤ کے تقدس کی تاریخ

طول البلد و عرض البلد اجودھیا سے اسی میل دور گومتی کے دونوں کناروں پر بارہ درجہ اکاون دقیقہ دریا سے شمال کی طرف اور اسی درجہ پچاس دقیقہ مشرق کی طرف رام چندر جی کے بھائی لکشمن جی نے ساٹھ گاؤں کا ایک شہر بسایا جس کے بیچ میں لچھمن ٹیلہ تھا (اب شاہ پیر محمد کے ٹیلہ کے نام سے مشہور ہے) اس شہر کا نام لکشناوتی رکھا اور رشیوں کو یہاں بسایا جنہوں نے علوم کی نئے سرے سے بنیاد رکھی۔ کچھ دنوں میں یہ پورا علاقہ عبادتخانوں اور درسگاہوں سے بھر گیا۔

راجہ جدتھرٹ کے بیٹے جنم جی نے اس علاقہ کو رشیوں کی جاگیر میں دے دیا اس طرح یہ پورا علاقہ علم و تمدن کا مرکز بن گیا۔

ودیانگر لکھنؤ سے چالیس کوس پر ایک پرانا علمی مرکز ودیانگر (شہر علم) تھا جہاں مون (خاموش) پجاری اور علماء رہتے تھے۔ رام چندر جی بن باس کو جاتے ہوئے یہاں ٹھہرے تھے یہ مقام اب جائسؔ کے نام سے مشہور ہے۔ ملک محمد

پدماوت میں کہتے ہیں ؎

جائس نگر دھرم استھانا

کاشی سلطنت اودھ کی مشرقی سرحد پر دریائے گنگا کے کنارے کاشی (بنارس) ہے جس کے چپہ چپہ سے تقدس کی تاریخ وابستہ ہے آج بھی وہ سنسکرت نجوم اور موسیقی کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

سورج کنڈ شمال میں سورج کنڈ (برائچ) ہے

پراگ جنوب میں دریائے گنگا اور جمنا کے سنگم پر پراگ (الہ آباد) ہے لکھنو کو اگر بیچ میں رکھا جائے تو اس کے چاروں طرف اجودھیا سورج کنڈ ودیا نگر، کاشی اور پراگ علم وعبادت کے مرکز تھے۔

اودھ کے ہندو حکمران مسلمانوں کی آمد کے وقت سورج بنسی چھتریوں کا ایک خاندان یہاں حکمران تھا [۱]

کرنل ولکاکس مہتمم رسدخانہ شاہی کی تحقیق ہے کہ راجہ سمرن گڈھ کے آبا اجداد کی یہاں حکومت تھی [۲]

اس خاندان کے چھتری ہونے میں اختلاف ہے کچھ مورخین ویش کہتے ہیں [۳]

---

[۱] احسن التواریخ ص۷ تاریخ طلسم ہند ص۲۶۹

[۲] احسن التواریخ ص۱۱-۸-۷ تاریخ زمانہ دیان اودھ ص۳۲

[۳] تاریخ زمانہ دیان اودھ منشی رائے لال موہانی مطبوعہ نامی پریس لکھنو ص۳۲

اودھ میں اسلامی علوم وتمدن کی تاریخ

ساتویں صدی عیسوی

ظہورِ اسلام | ساتویں صدی عیسوی میں جزیرہ نمائے عرب میں پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا ان کی وفات کے بعد مسلمان فتح ممالک کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے دیکھتے دیکھتے وہ رومن امپائر اور ایرانی شہنشاہیت پر قابض ہو گئے اس کے بعد ترکستان اور منگولیا کو فتح کر کے ان کے گھوڑے ہندوستان میں داخل ہوتے اور اٹک سے کٹک تک کوئی ان کی لگام نہ پکڑ سکا۔ ان کے پیچھے اسلامی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کے قافلے بھی آنا شروع ہوئے جن کی ابتدائی منزلیں ملتان، بھکر اور لاہور تھیں۔

پانچویں صدی ہجری

پانچویں صدی ہجری میں مسلمان لاہور سے آگے بڑھ کے شمالی ہند میں داخل ہوئے۔ محمود غزنوی فتوح تک آیا۔

جائس | یہ نجم الدین[1] ۶۲۰ھ میں سبزوار سے ایک جرار لشکر لے کے آئے اور

---

[1] امام حسن عسکری ؑ کی شہادت کے بعد خاندانِ رسالت میں کوئی مدعی امامت نہیں رہا تو ان لوگوں کو قید سے رہا کر دیا گیا۔ ۱۲ رمضان ۲۶۰ھ کو ابوطالب حمزہ بن محمد بن طاہر بن جعفر بن امام علی نقی ایران چلے گئے وہاں ۲ ربیع الاول ۳۱۰ھ کو شیراز میں انتقال کیا ان کے بیٹے ابو یعلیٰ محمد نے سبزوار جا کے قیام کیا انہیں کے پوتے سید نجم الدین تھے جو سادات جائس و خاندان اجتہاد کے مورث اعلیٰ ہیں یادگار رجمی مولفہ سید آل محمد مہر جائسی بی اے۔

ددیانگر کو فتح کرکے کاشی پر حملہ کیا جہاں وہ شہید ہوگئے۔

صاحب تذکرۃ السادات لکھتے ہیں کہ "وہ ساری رات عبادت میں بسر کرنے والے متقی تھے۔ علم وفضل میں بھی ممتاز تھے۔

سید شرف الدین ان کے بیٹے بنارس سے اپنے مفتوحہ علاقہ ددیانگر میں آکے سکونت اختیار کر لی اور اس کا نام جائے عیش رکھا جو عوام کی زبان پر جائس ہوگیا اور یہی نام مشہور ہوا ان کے قیام سے جائس مسلمانوں کا علمی مرکز بن گیا۔

سید سالار مسعود غازی ۴۲۳ھ میں دہلی فتوح۔ مانک پور اور ستر کھ کو فتح کرتے ہوئے لکھنو آئے اور پھر سورج کنڈ (بہرائچ) پر حملہ کیا جہاں وہ شہید ہوگئے ان کے ساتھیوں میں اکثر نے لکھنو میں قیام کر لیا جن کی اولادیں ایک لکھنوا ور سندیلہ میں موجود ہیں مگر ان میں کوئی ایسا نہ تھا جو اپنی حکومت قائم کرسکتا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر انہیں لوگوں کی حکومت قائم ہوگئی جو پہلے سے لکھنو کے حکمران تھے۔

کرنل ولکاکس کا خیال ہے کہ وہ راجہ سمرن گڑھ کے اجداد تھے ۱۰۶۹ء میں اس خاندان کے راجہ نرسنگھ دیو حکمران تھے۔

مؤلف احسن التواریخ کا بیان ہے کہ مسلمانوں کی آمد کے وقت سورج بنسی چھتری خاندان کا راجہ جے چند ولد مدن چند بن گوبند چند یہاں کا فرمانروا تھا۔

لکھنو میں اسلامی علم وتمدن کی تاریخ

چھٹی صدی ہجری

چھٹی صدی ہجری کے شروع میں لکھنو کی علمی حیثیت کی ابتداء ایک ولی کامل شاہ قیام الدین کے قیام سے ہوئی انہوں نے ایک بڑکے درخت کے نیچے دھونی رمائی ان کو بڑی مرجعیت حاصل ہوئی ان کے انتقال کے بعد بھی وہ مقام زیارت گاہ بنا رہا[1] شاہی زمانہ میں سلطان العلماء سید محمد صاحب مجتہد العصر نے لوگوں کو وہاں جمع ہوتے ہوئے دیکھ کے ایک چھوٹی سی مسجد اس جگہ پر بنوادی جس سے وہ اجتماع ختم ہوگیا یہ بساطنوں کی مسجد کہی جاتی ہے کیونکہ اس کے آگے کی دیوار میں بساطنوں کی چھوٹی چھوٹی ذکائیں ہیں بڑ کا درخت اب تک مسجد پر سایہ کئے ہوئے ہے یہ جگہ چوک میں گول دروازہ کے قریب ہے۔

دوسرے بزرگ شیخ کبیر قدوۃ الدین بن میرک شاہ ابن ابویعلیٰ اسرائیلی ہیں انہوں نے حضرت عثمان ہارونی سے فیض حاصل کیا اور مسلمانوں کے تسلّط کے بعد یہاں آئے بڑے جری اور صاف گو تھے شاہ وگدا سب کے منھ پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے باز نہیں رہتے تھے اودھ کے بارہ ۱۲ گاؤں میں ان کی اولاد آباد ہے جن میں بیشتر علماء ومشائخ ہوئے شیخ کبیر کا انتقال ۱۲۰۸ھ / ۱۶۰۵ء میں ہوا[2]

ساتویں صدی ہجری

ساتویں صدی ہجری میں لکھنو کی علمی حیثیت میں اضافہ ہوا اور اس کے

---

[1] حیات شبلی ص ۱۴ نزہۃ الخواطر۔ [2] نزہۃ الخواطر بحوالہ بحر ذخار۔

اطراف میں بہت سے علمی مرکزوں کی بنیادیں پڑیں۔

لکھنؤ میں سمرقند سے فتنہ تاتار (۱۲۱۷ء) کے زمانہ میں ایک بزرگ آئے اور گومتی کے کنارے قیام کیا۔[1]

شیخ ضیاء الدین کرمان سے شیخ سمرقندی کی زیارت کو آئے اور ان کی محبت میں لکھنؤ کو اپنا وطن بنا لیا۔[2]

ملک محمد بختیار خلجی نے ۶۳۱ھ/۱۰۳۰ء میں اودھ کو فتح کیا مگر وہاں زیادہ نہیں ٹھہرا بہار کی فتح کو روانہ ہو گیا۔

ناصر الدین بن التمش ۶۴۳ھ/۱۲۴۹ء میں اودھ کا حاکم ہو کے آیا یہ بہت قابل آدمی تھا اس کا ذکر تاریخوں میں با اقبال شہزادے ہوشیار جنرل مدبر حکمران اور جید عالم کی حیثیت سے آتا ہے۔ مولانا عبدالحئی لکھتے ہیں:

عالم دین ناصر الدین محمود بن التمش۔ علم و دانش سخاوت و شجاعت ہر ایک خوبی میں ممتاز تھا۔ ۶۴۳ھ میں اودھ کی سربراہی سے ممتاز ہوا تو یہیں طرح اقامت ڈال دی۔[3]

اس کے دربار سے بڑے جلیل القدر علماء وابستہ تھے ان میں جن کو شہرت حاصل تھی وہ یہ ہیں۔

مولانا قاضی جلال الدین کاشانی دہلی میں مدتوں قاضی الممالک کے عہدہ پر فائز رہے ۶۳۹ھ معز الدین بہرام شاہ کو تخت سے اتارنے کی سازش میں متوب ہو کر اودھ چلے آئے سنہ ۶۴۱ھ میں علاء الدین بن مسعود نے امیر طغان کے پاس سفیر بنا کے بھیجا جو لکھنوتی (بنگال) میں اس کا نائب تھا۔ سنہ ۶۴۲ھ میں جب ناصر الدین محمود

---

[1] حیات شبلی ص۱۲ [2] نزہۃ الخواطر تذکرۂ علمائے ہند [3] نزہۃ الخواطر۔

اودھ کا حاکم ہوا تو اس نے ان کو قاضی الممالک کا عہدہ دیا۔ ۶۴۸ھ میں لکھنؤ میں انتقال ہوا[1]

مولانا قاضی شمس الدین ناصر الدین محمود کے مقرب خاص تھے ۶۵۱ھ میں جب علاؤ الدین تمام ملک کے سفید وسیاہ کا مالک بن گیا تو اس نے ان کو پورے ملک کا قاضی اور مشیر الامور بنا دیا جس پر لوگوں نے حسد کیا اور بادشاہ کو بدظن کر دیا۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ دلی سے نکال دیئے گئے تو اپنی جاگیر پر چلے آئے[2]

حاتم خان خان جہان آخری صدی ہجری میں اودھ کا صوبیدار رہا یہ خود عالم اور علماء کا مربی تھا اس کے ساتھ بہت سے اہل کمال لکھنؤ آئے۔

امیر خسرو اس وقت اسی کے دربار سے وابستہ تھے وہ بھی اس کے ساتھ لکھنؤ آئے اور دو برس تک یہاں رہے اور بہت خوش رہے خود قران السعدین میں کہتے ہیں ؎

خان جہان حاتم مفلس نواز ٭ گشت باقطاع اودھ سرفراز

در اودھ از بخشش او تا دو سال ٭ ہیچ غم و نالہ نبود از شمال

اطراف لکھنؤ میں بھی علماء وفضلا علمی مسند بچھائے ہوئے تھے

اطراف لکھنؤ کے علماء

پالی مئو | مولانا داؤد بن محمد اودھی شریعت وطریقت میں کامل نظام الدین اولیاؒ کے معترف ومداح ہیں۔ پالی مئو میں انتقال کیا۔ قبر زیارت گاہ خاص وعام ہے[3]

[1] نزہۃ الخواطر بحوالہ طبقات ناصری ص۳۰۹۔ [2] نزہۃ الخواطر ۔۔۔۔ ص۳۰۹۔ [3] نزہۃ الخواطر۔

دلمئو ضلع رائے بریلی | مولانا شیخ بدرالدین علوی مشائخ چشتیہ میں ممتاز درجہ رکھتے تھے حضرت ہارونی سے اکتساب کر کے ہندوستان آئے اور قصبہ دلمئو میں قیام کیا۔ ۶۲۶ھ میں انتقال ہوا۔ مادۂ تاریخ "بدراتم" ہے۔ قبر زیارت گاہِ خاص وعام ہے۔ [1]

کنتور ضلع بارہ بنکی | مولانا شیخ سلیمان بن عبداللہ عباسی۔ شیخ شہاب الدین سہروردی اور خواجہ زید الدین شطاری کی صحبت سے درجۂ عرفان تک پہونچے۔ مولانا التمش کے زمانہ میں ہندوستان آئے اس نے شاہی محل میں ان کے قیام کا حکم دیا اور چار ہزار تنکہ پیش کیا مگر انہوں نے قبول نہ کیا۔ کنتور کو اپنا مسکن بنایا چالیس سال تک اپنے فیوض سے لوگوں کو مستفیض کیا۔ آخر میں ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ ایک سو دس سال کی عمر میں ۶۵۷ھ میں انتقال ہوا۔ [2]

کڑہ مانکپور | مولانا محمد بن مولانا احمد قطب الدین لقب باپ کی طرف سے محمد نفس ذکیہ کی اولاد میں تھے اور ماں شیخ عبدالقادر جیلانی کی بہن تھیں۔ اپنے والد اور مولانا عبدالرزاق پسر شیخ عبدالقادر سے تحصیل علم کے بعد شیخ عارف ابوالجناب نجم الدین کبریٰ سے تکمیل علوم ظاہر و باطنی کی فتنۂ تاتار میں اپنے والد کی شہادت کے بعد قطب الدین ایبک کے زمانہ میں ہندوستان آئے اس کے ساتھ لڑائیوں میں بھی شریک ہوئے اور قلعہ کوڑہ، قلعہ مانکپور اور قلعہ ہسوہ فتح کئے سلطان ان کی بہت تعظیم کرتا تھا۔

قاضی شہاب الدین نے ہدایت السعداء میں لکھا ہے کہ اس کے دربار میں ان کی

---

[1] نزہۃ الخواطر ۔ ۔ [2] ص ۳۰۹ ۔ [3] نزہۃ الخواطر بحوالہ طبقات ناصری ص ۳۰۹

نشست سب سے اعلیٰ تھی بادشاہ سر دربار ان کے ہاتھوں کو چومتا تھا۔

صاحب طبقات ناصری کا بیان ہے کہ بہرام شاہ نے انھیں شیخ الاسلام بنایا تھا۔ ۶۷۰ھ ہجری میں انتقال ہوا۔

مولانا حمزہ و لوحامد کنیت ابوبکر زید شہید کی اولاد میں تھے انقلاب روم کے لیڈر تھے التمش کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور کرڑہ میں سکونت کی۔

مارہرہ مولانا شمس الدین مارہرہ کے قاضی بڑے جرأت مند اور بے باک تھے کسی بات پر بادشاہ سے خفا ہو گئے اور ایوب ترکمان کو اس کے قتل پر آمادہ کیا بادشاہ کو خبر ہو گئی اس نے ہاتھی سے روند وادیا۔

بدایوں قطب الدین ایبک نے ۵۹۱ھ میں بدایوں پر قبضہ کر کے ایک سال تک قیام کیا اور اپنے آقا معز الدین محمد سام متوفی ۶۰۲ھ کے نام مدرسہ معزیہ قائم کیا۔ اس وقت وہاں ذیل کے علماء موجود تھے۔

مولانا علاء الدین اصولی شریعت و طریقت دونوں میں اکمل جلال الدین تبریزی کے شاگرد اور نظام الدین اولیا کے اُستاد تھے۔

مولانا زین الدین اولیسی معاصرین میں ممتاز تھے بڑی مسجد کے عقب میں مدرسہ تھا جس میں پڑھاتے تھے۔ شاید وہی مدرسہ معزیہ تھا۔

مولانا حسام الدین ملتان کے رہنے والے محمد زکریا ملتانی کے فیض یافتہ بدایوں کے سکونت اختیار کی ۶۹۷ھ / ۱۲۹۸ء میں انتقال ہوا۔

مولانا کمال الدین جعفری علماء میں ممتاز اور صاحب فتویٰ تھے۔ اس وجہ سے قاضی مقرر کیے گئے۔

مولانا سراج الدین مشہور عالم اور صاحب صلاح و تقویٰ تھے۔

مولانا بدرالدین ابوبکر کینت خواجہ بختیار کاکی سے فیض حاصل کیا اپنے زمانہ کے مشہور صاحب خرقہ تھے دہلی سے بدایوں آکے قیام کیا اپنے بھائی کی طرح رسی بٹ کے روزی حاصل کرتے تھے ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ میں آخر وقت ان کی زیارت کو گیا تو یہ شعر زبان پر تھا۔

این تن چو غبارست میان من وتو ؛ آمد وقتیکہ از میاں برخیزد

۷۰۰ھ میں انتقال فرمایا۔

مولانا شہاب الدین بڑے صاحب علم وتقویٰ تھے امیر خسرو نے ایک قصیدہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

کرک | مولانا خواجہ عزیز عارف کامل اور فقیہ تھے شیخ نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی ان کے کشف وکرامات کے قائل تھے بدایوں کے مضافات میں قصبہ کرک میں ان کی خواب گاہ ہے۔

بلگرام | لکھنؤ سے کچھ فاصلہ پر ہردوئی کا ایک قصبہ ہے جابس۔ لکھنؤ اور بدایوں کے بعد اس کو علمی مرکزیت حاصل ہوئی۔

مولانا سید محمد صاحب الدعوۃ الصغریٰ جو سید محمد صغریٰ کے نام سے مشہور ہیں ۶۱۴ھ میں بلگرام آئے اور وہاں کے راجہ سری پر حملہ کرکے اس کے قلعہ کو فتح کر لیا جس کی تاریخ لفظ "خدا داد" سے نکلتی ہے۔ شیوخ زشوری اور ترکمانوں کے ساتھ وہاں سکونت اختیار کی اور عشر وصول کرنے کا فرمان شمس الدین التمش سے حاصل کیا بعد کے سلاطین نے اس کی توثیق کی اور ان کے احترام میں کمی نہیں کی۔ یہ امام زین العابدین کی اولاد تھے اور علم باطن میں خواجہ بختیار کاکی سے فیض حاصل کیا بلگرام میں ۳۱ رسال تک اپنے فیوض و برکات پھیلائے بہت سے مسلمانوں کو آباد کیا مسجد بنوائی اور اپنے بعد صاحب علم وفضل اولاد چھوڑی تھی

چھوڑی)۔ ۷۲۵ھ میں انتقال ہوا قصبہ کے شمال میں ایک باغ کے اندر دفن ہوئے

آٹھویں صدی ہجری

مولانا فرید الدین شافعی بڑے عالم متبحر اور صاحب فیض بزرگ شیخ الاسلام کے لقب سے مشہور تھے صاحب نزہۃ الخواطر ان کی علمیت کے متعلق لکھتے ہیں:

الشیخ العالم الکبیر العلامہ ۔ نحو ولغت وعربیت میں یکتائے روزگار

صاحب سیر الاولیا کا بیان ہے کہ

"در مجلس درس مولانا فرید الدین شافعی کہ شیخ الاسلام اودھ بود قاری کشاف پیش خدمت مولانا علاؤ الدین وخدمت مولانا شمس الدین و علمائے اودھ سامع بودند"

وہ علمائے اودھ جنھوں نے مولانا فرید الدین شافعی سے فیض حاصل کیا یہ ہیں:

مولانا بدر الدین اودھی اپنے زمانہ کے مشہور واعظ تھے مختلف مقامات پر وعظ کہنے جاتے تھے۔ ضیائے برنی نے لکھا ہے کہ دلی میں مہینوں قیام کرتے تھے ان کی مجلس وعظ میں ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوتے تھے اور اتنا متاثر ہوتے تھے کہ زار وقطار رونے لگتے تھے زہد وتقویٰ میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔

مولانا شیخ محمد مولانا یحییٰ اودھی کے بیٹے شمس الائمہ اور شمس الدین لقب فقہ واصول اور ادب میں مولانا فرید الدین شافعی اور مولانا ظہیر الدین بھکری کے شاگرد طریقت میں خواجہ نظام الدین اولیاء سے مستفید ہوئے صرف علمائے ومشائخ سے ملتے تھے سخاوت و بردباری میں مشہور تھے علم وفضل بھی مسلم تھا شیخ محمود اودھی ایک قصیدہ میں فرماتے ہیں۔

سالت العلم من احیاک حقا ÷ فقال العلم شمس الدین یحییٰ

شمس المعارف تصوف میں ان کی مشہور تصنیف ہے سنہ ۷۲۲ھ میں دہلی میں انتقال ہوا[۱]

مولانا شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی مولانا یحییٰ اودھی کے بیٹے اور مولانا شمس الدین کے بھائی اودھ میں پیدا ہوئے وہیں پروان چڑھے اپنے بھائی مولانا شمس الدین اور مولانا فخر الدین ہانسوی اور قاضی محمود کاشانی سے علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ طریقت میں خواجہ نظام الدین اولیا سے مستفیض ہوئے سنہ ۷۲۲ھ میں انہوں نے اپنی خلافت سے سرفراز کیا ان کے رحلت کے بعد ان کے جانشین ہوئے اپنے روحانی کمالات کی وجہ سے چراغ دہلی کہے جاتے تھے[۲]

مولانا علاؤ الدین نیلی شیخ فرید الدین شافعی کے شاگرد نظام الدین اولیاء سے مستفید ہوئے زہد و تقویٰ میں مشہور تھے ہر جمعہ کو وعظ کہتے تھے جس میں بے شمار لوگ شریک ہوتے اور ان پر ایسا وجد و حال طاری ہوتا کہ غش کھا کے گر پڑتے ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ یہ منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ایک مجلس میں ایک شخص اتنا متاثر ہوا کہ ایک چیخ ماری پھر دوسری چیخ مار کے مر گیا۔ میں اس کے جنازے میں شریک تھا[۳]

مولانا الشیخ زین الدین اودھی چراغ دہلی کے ہمشیرزادے اکابر علماء سے علوم ظاہری کی تکمیل کی اور اپنے ماموں سے علم باطن میں فیض حاصل کیا سنہ ۸۰۱ھ میں انتقال ہوا۔ ان کے اخلاف لکھنؤ کے قصبہ امیٹھی میں اب تک موجود ہیں۔

مولانا سماء الدین مولانا فخر الدین بجنوری[۴] کے صاحبزادے شیخ بہدیعی اپنے والد سے علوم ظاہر و باطنی حاصل کیا اس کے بعد مولانا زین الدین کے حلقۂ ارادت

---

[۱] سیر المجالس [۲] سبحۃ المرجان [۳] سفرنامہ ابن بطوطہ

[۴] ... ضلع لکھنؤ

میں داخل ہوئے خرقہ شیخ جلال الدین حسین بن احمد الحسینی البخاری الاوچی نے پہنایا۔ صاحب وجد و حال تھے۔ ۷۷۲ھ میں ایک سماع میں ایسی غشی طاری ہوئی کہ روح نفس عنصری سے پرواز کر گئی لکھنؤ میں دفن ہیں اطراف میں بھی علم کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

بجنور لکھنؤ کا ایک قصبہ بجنور مدتوں سے علم کا مرکز ہے۔ مولانا فخرالدین جو اصل میں سترکھ کے رہنے والے ہیں انھوں نے شیخ نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی سے بیعت کی زہد و تقویٰ اور علم میں شہرت کی وجہ سے بجنور کے قاضی ہوئے آخر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور وہیں انتقال ہوا۔

اطراف لکھنؤ کے علماء

سترکھ | بارہ بنکی کا ایک قصبہ ہے جو لکھنؤ سے تین کوس پر ہے۔

مولانا شیخ دانیال عبداللہ بن عباس سترکھی کی اولاد میں فقہ و اصول ادب میں تبحر خاص تھا نہیں معلوم کس طرح بیانہ پہنچ گئے وہاں قاضی عبداللہ نیشاپوری سے پڑھا اور ان کی صاحبزادی سے شادی ہو گئی۔ کچھ دن وہاں رہ کے دہلی آ کے شیخ نصیر الدین محمود کی بیعت سے فیض حاصل کر کے بیانہ گئے وہاں سے اپنی اہلیہ کو لے کے وطن روانہ ہوئے۔ قریب وطن پہنچے تو ڈاکوؤں نے شہید کر دیا لاش سترکھ میں دفن کی گئی۔ یہ واقعہ ۷۷۲ھ کا ہے مولانا صلاح الدین تکمیل علوم کے بعد دہلی گئے اور وہاں مجلس درس آراستہ کی۔[1]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی۔

کوڑہ | مولانا علاء الدین شیخ لکھے جاتے ہیں مگر موسوی سید تھے علوم عربیہ کامل دستگاہ رکھتے تھے اور دعوت وارشاد میں ممتاز تھے۔

دیوہ | دیوہ مضافات اودھ کا ایک متبرک مقام اکابر علماء اور صوفیا کی قیام گاہ ہے مولانا زین یہیں کے رہنے والے تھے۔ علم و تقویٰ میں شہرت رکھتے تھے۔

مولانا رکن الدین یہیں کے رہنے والے تھے۔ شرف الدین احمد منیری سے حدیث کا درس لیا اور انہیں سے روحانی فیض حاصل کیا۔

سندیلہ | مولانا علاء الدین نے شیخ نصیر الدین محمود سے برسوں طریقت میں فیض حاصل کیا شیخ نے ان کو خرقہ خلافت عطا کیا اور سندیلہ میں قیام کا حکم دیا۔ یہ عالم فقیہ متوکل اور صاحب کرامات تھے۔ سندیلہ میں قبر ہے۔

بہرائچ | مولانا شیخ محمد ابو جعفر کنیت عرف امیر ماہ مولانا جعفر کے بیٹے اور مولانا اسمٰعیل کے پوتے ہیں مولانا علاء الدین چشتی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ اپنے وقت کے مشائخ کبار میں تھے سید اشرف جہانگیر سمنانی ان سے ملاقات کو آئے اور ان کے کمالات کا اعتراف کیا فیروز شاہ بھی ان سے ملنے آیا تھا کشف المحجوب فی عشق المطلوب ان کی مشہور تصنیف ہے ۷۷۲ھ بمطابق ۱۳۷۰ء میں انتقال ہوا۔

گوپامئو | اودھ کے علمی مرکزوں میں گوپامئو بھی ایک بڑا مرکز ہے۔

مولانا شیخ مبارک یہیں کے رہنے والے تھے قاضی کریم الدین کے صاحبزادے علم و فضل صلاح و تقویٰ میں ممتاز تھے۔

کوئل ضلع علی گڑھ | مولانا شمس الدین بڑے عالم اور صوفی صافی تھے محمد تغلق نے ان سے ملنا چاہا مگر انہوں نے منظور نہیں کیا۔ ایک باغی کی تعریف کرنے اور اس کو شاہی کے قابل کہنے پر قید کر دیے گئے اسی قید میں آزاد ہوئے۔

مولانا جمال الدین مولانا عبداللہ کے بیٹے مولانا نظام الدین کے پوتے دہلی کے رہنے والے اپنے زمانہ کے مشہور عالم اور صوفی تھے۔ کوئل کے لوگ ان سے بہت عقیدت رکھتے اس وجہ سے وہیں قیام کر لیا۔

بدایوں مولانا رکن الدین فقہ واصول اور ادب میں ممتاز درجہ رکھتے تھے مولانا ابوالقاسم تنوخی کے شاگرد تھے۔

مولانا تاج الدین شیخ الاسلام قطب الدین محمد بن احمد الحسینی ممتاز مشائخ میں تھے علاء الدین خلجی نے آپ کو بدایوں کا قاضی مقرر کیا تاعمر وہیں رہے ان کے بعد ان کی اولاد نے بھی بدایوں کو اپنا وطن بنا لیا۔

جونپور مولانا نصیر الدین علوم ظاہر و باطن میں ممتاز شیخ شرف منیری کی خدمت میں برسوں اکتساب فیض کیا اور جونپور کو اپنے قیام کے لئے منتخب فرمایا۔

ظفرآباد ضلع جونپور مولانا صدر الدین ملتان میں پیدا ہوئے وہیں نشوونما پائی اور علم شریعت وطریقت میں تبحر حاصل کیا۔ شیخ ابوالفتح ملتانی سے خرقہ خلافت ملا سات مرتبہ پیدل حج کیا آخر عمر میں ظفرآباد کو اپنا وطن بنایا اور وہیں ۷۷۰ھ ہجری میں انتقال ہوا۔

مولانا رکن الدین مولانا صدر الدین ملتانی کے صاحبزادے اصول فقہ میں ان کو شہرت حاصل تھی تصوف ومعرفت میں بھی کامل تھے برسوں درس دیا آخر میں طریقہ سہروردیہ اختیار کیا اپنے والد سے کسب فیض کیا ان کی رحلت کے بعد اس سلسلہ کی قیادت کی ظفرآباد میں انتقال ہوا اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مولانا اسد الدین بن تاج الدین حسینی شیخ ضیاء الدین کرڑوی سے علوم ظاہری اور علوم باطنی کی مولانا رکن الدین سے تکمیل کی ان کا سال ولادت ۷۶۱ ہجری اور

سالِ وفات ۶۹۳ھ ہے

مولانا ظہیر الدین۔ نسب میں حسینی واسطی تھے عالم و شاعر تھے امراء و سلاطین کی مدح میں قصیدے کہتے تھے آخر میں خواجہ نظام الدین اولیاء سے بیعت کی اور صوفیت اختیار کی تصوف میں کئی کتابیں اور دیوان شعر یادگار چھوڑا۔

مولانا نظام الدین۔ فرقہ چشتیہ کے مشائخ میں تھے خواجہ نظام الدین اولیاء سے فیض حاصل کیا پھر ظفر آباد آئے اور مولانا اسد الدین کی خدمت میں رہے شعر بھی خوب کہتے تھے عربی فارسی دونوں زبانوں میں تصانیف موجود ہیں۔ فارسی کا ایک شعر سنیئے۔

یارمارا بہ ازیں زار و حزیں می خواہد ٭ بہ ازیں چست کرمارا بہ ازیں می خواہد

جھونسی ضلع الہ آباد | مولانا شیخ علی بن محمد ۶۰۰ھ میں بھکر میں پیدا ہوئے تیس سال کی عمر میں ملتان آئے اور مولانا رکن الدین ملتانی سے فیض حاصل کرنے بہار گئے وہاں منہاج الدین حسین سے مستفید ہوئے اور بیعت کی پھر نجم الدین ابراہیم کی بیعت کی شیخ رکن الدین کے حکم سے جھونسی میں قیام کیا۔

مولانا شیخ علی بن علی جھونسی میں ۶۶۰ھ میں پیدا ہوئے اپنے والد سے علم ظاہر و باطن کی تعلیم حاصل کی مختلف شہروں کی سیاحت کی فرقہ سہروردیہ کے مشائخ میں تھے تقی الدین لقب تھا۔

مولانا قیام الدین دہلی کے مشہور عالم مولانا اسد الدین کے ساتھ ظفر آباد آئے اور درس کا سلسلہ شروع کیا آخر میں تجرد اختیار کیا۔

نویں صدی ہجری

نویں صدی ہجری شمالی ہند میں اسلامی علوم کے فروغ کا زمانہ ہے لکھنؤ

اور اس کے اطراف میں بڑے بڑے علماء اور صوفیا موجود تھے۔

مولانا محمد بن مولانا ابو البقا کرمانی الملقب باعظم ثانی ان کے دادا کا ذکر ساتویں صدی ہجری کے اہل علم کے تذکرہ میں آچکا ہے آپ کا نام مولانا ضیاء الدین تھا وہ کرمان سے شیخ سمرقندی کی ملاقات کو لکھنو آئے تھے مولانا شیخ محمد کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ضیاء الدین کے ساتھ ان کے صاحبزادے مولانا ابوالبقا بھی تھے مولانا محمد لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اپنے تجرعلمی سے اعظم ثانی کے لقب سے مشہور ہوئے اپنے فرزند احمد اور اپنے شاگرد احمد کے ساتھ بغرض ادراہ حج کو گئے وہاں چھ سال تک رہے اکابر علمائے شافعیہ مکالمہ کے لئے آتے تھے اور فیض حاصل کرتے تھے۔

سلطان شرقی مسائل شرعیہ میں ان سے فتویٰ لیتا تھا انہوں نے منطق میں اشکال اربعہ اور ان میں قضایا کے اشکال اربعہ کو حرفِ اول بعدہٗ حرف ثانی سے مربوط کر کے موجبہ کلیہ "با" اور موجبہ سالبہ کایہ بب اور موجبہ جزئیہ بج اور موجبہ سالبہ جزئیہ بد فارسی میں اس طرح نظم کیا ہے

کل ولاشی وبعض ولیس الکل ؛ دور از رخ تو وسمہ دل
سورہائے "سودات" شمار ؛ ابجد آمد نشان ان ہر چار
ااا ب جاجب نخستیں راست ؛ اب وجاجب ودلنشیں برخواست
ااا ب جاجب واج داد ؛ سومیں راست حذو لا نعطن
اااج بابا اب ورا ؛ ادبج مشکل چار میں را

لکھنؤ میں ۸۰۷ھ ہجری میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور شہر سے باہر گومتی کے کنارے دفن کئے گئے قبر پر نہایت عمدہ مقبرہ تعمیر ہوا۔

مولانا شیخ محمد عرف شاہ مینا مولانا قطب الدین کے صاحبزادے صدیقی شیخ محمد نام شاہ مینا عرف لکھنؤ میں پیدا ہوئے وہیں پلے اور بڑھے مولانا شیخ قوام الدین کے تلامذہ میں داخل ہونے ان کے انتقال کے بعد قاضی فرید الدین سے شرح وقایہ۔ پڑھی اور مولانا شیخ محمد سے عوارف کا درس لیا شیخ سارنگ نے خرقہ خلافت پہنایا۔ زہد وقناعت اور ریاضت شاقہ سے قوی مضمحل ہو گئے مسلسل روزہ رکھتے تھے۔ رات بھر نماز پڑھتے تھے ہمیشہ باوضو اور چلہ کشی میں رہتے تھے۔ ہر وقت روبقبلہ بیٹھتے۔ جیسے نماز پڑھ رہے ہوں یعنی پاؤں پھیلائے نہیں دیکھے گئے جوتیوں کا رُخ بھی قبلہ کی طرف ہوتا تھا کسی سے سوال نہ کرتے ۸۷۰ھ میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ مزار اب تک زیارت گاہِ خاص وعام ہے۔ ہر جمعرات کو میلہ لگتا ہے اور قوالی کی دھوم رہتی ہے۔

مولانا شیخ سعد اللہ کندوری فراز قاضی سماء الدین کے بیٹے تھے والد اور شیخ اجمل جونپوری سے فیض حاصل کیا علم کے ساتھ سخاوت و ایثار میں بھی مثل نہ تھا ان کا دسترخوان فقراء و مساکین کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا تھا اس وجہ سے کندوری فراز کہے جاتے تھے شیخ قیام الدین نے ان کو شیخ الاسلام کا لقب دیا ۹۲۹ ہجری میں انتقال ہوا کسی نے رحمۃ اللہ علیہ سے تاریخ نکالی۔

مولانا سعد الدین مولانا سعد اللہ کندوری فراز کے چھوٹے صاحبزادے علم وعمل میں اپنے والد سے استفادہ کیا دور دراز سے طلبہ تحصیل علم کے لئے آتے تھے شاعر بھی تھے۔ سعدی تخلص تھا ان کا شعر ہے ؎

چوں دوست موافق است سعدی ؛ سہل است جفائے ہر دو عالم

۹۸۱ھ میں انتقال ہوا کسی مرید نے مخدوم قطب الدین اولیا سے

مادۂ تاریخ نکالا۔

مولانا محمد امین الدین۔ مولانا سعد اللہ کندری فرازکے صاحبزادے اپنے والد سے شریعت وطریقت میں فیض حاصل کیا ان کے بعد ان کی خلافت پر متمکن ہوئے سات دفعہ حج کیا آخری حج میں واپسی پر گجرات میں انتقال ہوا لاش لکھنؤ لاکے باپ دادا پاس دفن کی گئی سالِ وفات ۸۹۱ھ ہے۔

مولانا شیخ قاسم۔ بن مولانا برہان الدین علوم ظاہری وباطنی میں اپنے والد کے شاگرد مشائخ چشتیہ کے مشہور عالم تھے۔

مولانا شیخ محمد۔ مولانا محمد قاسم کے صاحبزادہ طریقت وشریعت میں اپنے والد اور مولانا سعد الدین شیخ فتح اللہ بدایونی شیخ احمد بن شہاب الدین دہلوی سے استفادہ کیا اور طریقہ مداریہ سہروردیہ میں شیخ بڈھن اور شیخ اجمل بہرائچی سے مستفیض ہوئے۔ 'آداب السالکین' سلوک پر جامع ومانع کتاب تصنیف کی ۱۲ رمحرم ۸۹۶ہجری میں انتقال ہوا۔

مولانا شمس الدین۔ مولانا نظام الدین کے صاحبزادے مولانا رفیع الدین اور شاہ اشرف سمنانی سے اکتساب کیا اور مسند ارشاد پر متمکن ہوئے۔

مولانا قاضی شہاب لدین۔ قاضی قدوۃ الدین اودھی کی اولاد میں تھے ذہن اتنا رسا تھا کہ پرکالۂ آتش کہے جاتے تھے۔ شاہ مدار کے مرید تھے جذب وصال کی کیفیت زیادہ ہوئی تو قضا سے علیحدہ ہوگئے اور ساری کتابیں دریا میں ڈال دیں اودھ کے موضع بڑا گاؤں میں انتقال ہوا۔

مولانا محمد مولانا ظہیر الدین عباسی کرڈوی کے صاحبزادے قوام الدین لقب حاجی الحرمین عرف نزہتہ الخواطر میں ان کو عالم الکبیر الشیخ الامام لکھا ہے اپنے وقت کے

اولیائے کبار میں تھے۔ شیخ نصیر الدین محمود دہلوی چراغ دہلی اور جلال الدین بخاری سے مستفید ہوئے اور انہیں سے خرقہ خلافت ملا سلسل سات حج کیے آخری حج کے بعد دمشق گئے وہاں شیخ قطب الدین مؤلف رسالہ مکیہ سے طریقہ ذکر سیکھا اور ہندوستان واپس آگئے لکھنؤ میں قیام کیا تصانیف میں ارشاد المریدین، معیار التصوف اساس الطریقہ لکھی ۲۰ر شعبان ۸۴۰ھ میں انتقال ہوا۔ مزار مبارک لکھنؤ میں زیارت گاہ ہے۔

اطراف لکھنؤ کے علماء

قصبہ مچھ گوان | مولانا سارنگ۔ فیروز شاہ کے زمانہ میں امراء کے زمرہ میں تھے مالوہ میں شہر سارنگ آباد کیا ایکا ایکی دنیا سے متنفر ہوگئے اور شیخ قوام الدین عباسی کرڑوی سے ذکر کا طریقہ اختیار کیا پھر حج و زیارت کے لیے گئے اور وطن واپس آکے شیخ یوسف بن احمد ایرجی کے حلقہ میں داخل ہوئے اور ان سے رسالہ مکیہ پڑھا شیخ صدر الدین احمد الحسینی نے جو فرقہ سہروردیہ کے مشائخ ہیں خرقہ خلافت بھیجا انہوں نے واپس کر دیا تو شیخ حسام الدین نے ان کو خرقہ قبول کرنے کا حکم دیا جس کی تعمیل کی اس سے ان کو بہت فیض حاصل ہوا ۸۵۵ھ میں قصبہ مچھ گواں متصل بہرہ میں انتقال ہوا وہیں دفن ہوئے۔

بہرائچ | مولانا شیخ بڈھن۔ شیخ عبد المقتدر کندی سے طریقہ چشتیہ میں اور شیخ اجمل بہرائچی سے طریقہ مداریہ و سہروردیہ میں استفادہ کیا بڑے صاحب فیض بزرگ تھے ۸۹۸ھ انتقال ہوا۔

کنتور ضلع بہرائچ | **مولانا محمد متوکل** بن اعز الدین ہرات کے رہنے والے نسلاً ترکمان شیخ نصیر الدین محمود کی خدمت میں باریاب ہوئے اور انھیں کے حکم سے کنتور میں قیام کیا زہد و توکل میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے ۸۲۶ھ ہجری میں بہ عمر ایک سو سال انتقال ہوا۔

مولانا محمود عین الدین۔ ابن یعقوب عثمانی مدار شاہ کے مرید تھے۔ فارسی میں ایک رسالہ حالیہ فی معرفۃ المدار یہ لکھا اپنے دور کے بڑے صاحب فیض بزرگ تھے محمود مدفق کے نام سے مشہور تھے ۸۹۰ھ میں کنتور میں انتقال ہوا۔

کچھوچھہ ضلع فیض آباد | **مولانا شیخ اشرف ابراہیم حسینی**۔ حسین سمنانی کے بیٹے جہانگیر لقب۔ سمنان میں پیدا ہوئے والد وہاں کے فرمانروا تھے امیرزادوں کی طرح رہے تعلیم و تربیت میں ممتاز درجہ حاصل کیا ساتوں قراءتوں میں قرآن حفظ کیا اُنیس سال کی عمر تک اپنے والد کے ساتھ حکومت کے امور انجام دینے کے بعد شیخ رکن الدین سمنانی کے حلقہ بیعت میں داخل ہوئے۔ ۲۳ سال کی عمر میں ترک دنیا کر کے ہندوستان آئے اور شیخ جلال الدین بن احمد کے مسترشدین میں داخل ہوئے پھر بنگال جا کے شیخ علاؤ الدین عمر لاہوری سے بیعت کی انہوں نے خرقہ خلافت عطا کیا وہاں سے جونپور آئے آخر میں کچھوچھے میں سکونت اختیار کی شادی نہیں کی۔ مقدس مقامات کی سیاحت کرتے رہے شام میں شیخ عبدالرزاق کاشی سے فصوص فتوحات اور الاصلاح الکبیر کا درس لیا۔ شیخ بہاء الدین نقشبندی بخاری سے طریقہ نقشبندیہ حاصل کیا اس سفر میں ان کے ساتھ شیخ رفیع الدین مداری منکن پوری بھی ساتھ تھے اس کے بعد ربع مسکون کا سفر کیا اس میں شیخ علی بن شہاب الحسینی ہمسفر تھے۔

تصانیف | اشرفیہ مختصر نحو میں۔ تعلیقات بدایہ فقہ بین العقول اصول فقہ۔ شرح

عوارف المعارف۔ شرح فصوص الحکم مراۃ الحقائق کنز الدقائق بشارۃ المریدین تصوف ہیں۔ قواعد العقائد علم کلام میں جواز برلعن یزید مناظرہ جواز غنا مکتوبات وملفوظات فقہ ہیں اور اورادالاشرفیہ اوراد ہیں۔

تفسیر | فتاوائے اشرفیہ دیوان فارسی۔ بحرالانساب نسب وسیرت۔ بحرالانکار۔ فوائد الاشرف۔ اشرف الفوائد بشارۃ الذاکرین۔ تنبیہ الاخوان قابلِ ذکر ہیں۔

۲۸ محرم ۸۰۸ھ میں کچھوچھہ میں انتقال ہوا۔ مزار زیارت گاہِ خاص وعام ہے۔[۱]

مولانا عبدالرزاق۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد ہیں جہانگیر اشرف سمنانی کے بھانجے خراسان میں پیدا ہوئے بارہویں برس اپنے ماموں کے ساتھ ہندوستان آئے انھیں سے علم ومعرفت حاصل کیا اس کے بعد چالیس سال تک کچھوچھے میں زندہ رہے ۸۲۹ھ ہجری میں وہیں انتقال ہوا۔[۲]

مولانا نظام الدین یمنی۔ یمن میں پیدا ہوئے وہیں نشوونما پائی ایک سفر میں جہانگیر اشرف سے ملاقات ہوگئی ان کے ساتھ کچھوچھے چلے آئے وہیں ۸۰۸ھ ہجری میں انتقال ہوا لطائف اشرفیہ فی ملفوظات اشرف تصنیف کی۔[۳]

ردولی ضلع بارہ بنکی | مولانا صفی الدین۔ مولانا نصیرالدین کے بیٹے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نواسے طریقت میں شیخ اشرف جہانگیر سے فیض حاصل کیا وہ ان کے بہت قدر دان تھے فرماتے تھے کہ شیخ صفی علوم میں ہندوستان کے عجائبات میں ہیں۔ مصنفات دستور المبتدی علم صرف میں اور غایۃ التحقیق شرح کافیہ

---

[۱] نزہۃ الخواطر جلد ۳ صفحات ۶۳۔ ۶۵ بحوالہ مہر جہانتاب۔ [۲] نزہۃ الخواطر ج ۳ صفحہ ۱۲۶ الکوائف الاشرفیہ۔ [۳] نزہۃ الخواطر ج ۳۔ ص ۳۰۷۔

چلپی نے کشف الظنون میں اس کی جامعیت کی بہت تعریف کی ہے ۸۱۹ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا رضی الدین۔ مولانا صفی الدین کے بھائی جونپور میں پیدا ہوئے اپنے نانا سے تحصیل علم کی فقہ واصول کلام وادب میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ ابراہیم شرقی نے ردولی کا قاضی مقرر کیا جہاں وہ درس بھی دیتے تھے اور اس کو اپنا وطن بنالیا۔

مولانا تقی الدین بن عمر ردولی کے رہنے والے مشہور صوفی اور ممتاز عالم دین تھے۔

مولانا احمد بن عمر مولانا تقی الدین کے چھوٹے بھائی ممتاز اولیا میں تھے۔ زہد وعبادت میں بے مثال ردولی میں پیدا ہوئے علوم متعارفہ کی تکمیل کے بعد مولانا جلال الدین گاذرونی سے اکتساب فیض کیا ان کے بعد مرتبہ شیخوخت پر فائز ہوئے ردولی میں انتقال ہوا۔

مولانا اسمٰعیل مولانا صفی الدین کے بیٹے بارہ ربیع الاول ۸۹۰ھ ہجری میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تکمیل علوم کی ذہانت وذکاوت میں مشہور تھے سولہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے درس دینے لگے اپنے والد کی رحلت کے بعد ان کے قائم مقام ہوئے بدھ کے دن ۱۲ ربیع الاول ۸۶۰ھ کو انتقال ہوا۔

دریاباد ضلع بارہ بنکی | مولانا محمد ابومحمد ندوائی کے بیٹے قاضی عبدالکریم اودھی کی اولاد میں تھے آپ کثیر مشہور تھے طریقت میں شیخ ابوالفتح بن عبدالحئی بن عبدالمقتدر کندی سے فیض حاصل کیا اور خلق کثیر نے استفادہ کیا ۸۰۲ھ میں انتقال ہوا۔

خیرآباد | مولانا سعد الدین قاضی بڈھن کے صاحبزادے قاضی صاحب خیرآباد کے قاضی تھے مولانا سعد الدین چھوٹے سے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ماں نے

پرورش کی مولانا اعظم ثانی سے شریعت اور شاہ مینا سے طریقت میں اکتساب کیا اور درجہ مشیخت پر فائز ہوئے۔

تصانیف | شرح بزدوی۔ شرح کافیہ۔ شرح مصابیح۔ شرح رسالہ مکیہ آخر عمر میں لکھنؤ سے خیرآباد چلے گئے وہاں ایک عالی شان خانقاہ بنوائی ۸۸۰ھ میں انتقال ہوا۔

نصیرآباد ضلع رائے بریلی | مولانا محمود کے والد مولانا علاء الدین عالم متجراور نصیرآباد کے قاضی تھے مولانا نے انہیں سے تحصیل علم کی اور ان کے بعد نصیرآباد کے قاضی مقرر ہوئے ۸۶۵ھ میں انتقال ہوا حفیرۃ الخطباء میں دفن ہوئے۔

مولانا محمد مولانا محمود کے صاحبزادہ تقویٰ میں اپنے والد کی طرح مشہور تھے اپنے والد کے بعد نصیرآباد کے قاضی ہوئے اور ستائیس سال قاضی رہے۔ ۸۹۵ھ میں انتقال ہوا۔

مانکپور | **مولانا جلال الدین** مولانا اسمٰعیل عمری کے بیٹے فقہ اصول اور ادب میں کامل طریقت میں اکمل زاہد شب زندہ دار کثرتِ عبادت اور کتابت سے روزی حاصل کرنے کے باوجود درس دیتے تھے مانکپور میں انتقال ہوا۔

مولانا خواجہ خضر مولانا جلال الدین کے صاحبزادے عالم فاضل اور زاہد تھے۔

مولانا **حسام الدین** مولانا خواجہ خضر کے بیٹے تھے اپنے والد سے درسیات پڑھنے کے بعد بنگال گئے وہاں نور قطب العالم پنڈوی سے بیعت کی اور خرقہ خلافت لیا۔ بابا شیخ کی اجازت سے مانکپور آئے۔

تصانیف | انیس العاشقین سلوک اور رفیق العارفین ملفوظات ہیں۔

پندرہ رمضان المبارک ۸۵۳ھ ہجری کو وفات ہوئی۔ مانک پور میں مزار زیارت گاہ عام ہے۔

مولانا فیض اللہ مولانا حسام الدین کے صاحبزادے قاضی شاہ کے نام سے مشہور تھے اپنے والد سے شریعت و طریقت میں استفادہ کیا اور ان کے بعد ان کے جانشین ہوئے مانکپور میں انتقال ہوا۔

مولانا نظام الدین مولانا فیض اللہ کے بیٹے میراں شاہ کے نام سے مشہور تھے مانکپور میں پیدا ہوئے ہیں اپنے والد سے علم ظاہر و باطن اکتساب کیا اور ممتاز درجہ پر تھے ۸۹۰ھ میں انتقال ہوا۔

کوڑہ | مولانا کمال الدین عرف کالو خاں مولانا حسام الدین مانکپوری کے شاگرد طریقہ چشتیہ کے مشائخ میں تھے اذکار آپ کی ایک عمدہ تصنیف ہے۔

مولانا شمس الدین خواجگی مولانا احمد کے صاحبزادہ علوم ظاہری و باطنی اپنے جد اعلیٰ شیخ علاؤ الدین سے حاصل کیے علم و تقویٰ دونوں میں منفرد تھے تصنیفات میں دو کتابیں ہیں۔ المرید والمراد سلوک میں اور اربعین حدیث میں شاعر بھی تھے ۸۹۶ھ ۱۱ محرم کو انتقال ہوا۔ تو انہیں کے حسب ذیل اشعار کا ان کی قبر پر کتبہ لگایا گیا ہے

برائے خدا اے عزیزان من ⁂ نویسند بر گور من ایں سخن

کہ چوں خواجگی در تہ خاک شد ⁂ نکو شد ز حکم جہاں پاک شد

فتحپور | مولانا حسام الدین قاضی عبدالمقتدر کے شاگرد فقہ و اصول میں اپنے وقت کے مشاہیر میں تھے۔ شیخ بڈھن بہرائچی وغیرہ نے ان سے کسب فیض کیا فتنہ کے زمانہ میں دہلی سے فتح پور آگئے تھے وہیں ۸۰۲ھ میں انتقال ہوا۔

قنوج مولانا جلال الدین مولانا ابوفتح کے بیٹے جلال ثالث مشہور تھے اُودھ میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم حاصل کی بہلول ابن کالالودھی کے زمانہ میں دہلی آئے اس نے قنوج کے نواح میں اُن کو جاگیر دی وہیں آباد ہو گئے۔ نواب صدیق حسن خاں انہیں کی نسل سے تھے سنہ ۸۸۱ھ میں انتقال ہوا۔

مکن پور مولانا بدیع الدین شاہ مدار، ہندوستان کے مشہور صاحب کرامت ولی ہیں ان کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے وہ سب خلاف عقل ہے۔ قاضی محمود قنوجی کنتوری نے الحالیہ میں تفصیل سے ان کے حالات لکھے ہیں۔ ان کی عمر چار سو یا چھ سو سال تھی۔ فرشتوں کے سردار سخیتائیل نے ان کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا اور یہ بشارت دی کہ اب کبھی آپ کو بھوک نہ لگے گی اور ایک خرقہ دیا کہ کبھی پرانا نہ ہو گا وہ ان علوم میں راسخ تھے جو اللہ کی ذات و صفات میں ہیں۔

عبد الباسط قنوجی نے لکھا ہے کہ ان کو کھانے پینے کی حاجت نہ تھی نہ کبھی سوتے ان کے جسم پر مکھی نہ بیٹھتی نہ کپڑا میلا ہوتا تھا چہرہ انوار الٰہی سے دمکتا رہتا تھا اپنے چہرہ پر سات نقابیں ڈالے رہتے تھے وہ اللہ کے اذن سے مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ زمین کے ہر گوشہ میں قطبوں کو مقرر کر رکھا تھا تمام ارض و سما ان کے قبضہ میں تھا خدا نے لوحِ محفوظ سے اپنا نوشتہ محو کر دیا تھا اور فرشتوں کو کاموں سے روک دیا تھا۔ ۸۴۴ھ ہجری میں انتقال ہوا ان کی قبر پر کئی بادشاہوں نے عمارتیں بنوائیں۔

جونپور شمالی ہند میں وہ آبے سے نیپال کی ترائی اور ہمالیہ کے دامن سے گنگ کے ساحل تک جس میں صوبہ اودھ الہ آباد اور روہیل کھنڈ شامل ہے مختلف مقامات پر مسلمانوں کے قیام سے اسلامی علوم کا چرچا ہوا اور متعدد شہر حاکم نشین بھی ہوئے مگر مسلمانوں کی کوئی مضبوط حکومت اس خطہ میں قائم نہیں ہوئی چھوٹے چھوٹے

صوبیدار کچھ جگہوں پر تھوڑے تھوڑے دنوں رہے پھر کہیں اور چلے گئے اور پہلے کے مقامی حکمران پھر قابض ہو گئے۔

جونپور اس خطہ کی مشرقی سرحد پر واقع ہے اس کو آباد ہوئے بہت دن نہیں ہوئے تھے ایک پس ماندہ علاقہ تھا نویں صدی کی ابتداء میں وہاں ایک مضبوط حکومت قائم ہوئی جو شرقی حکومت کہی جاتی ہے یہ حکومت تراسی سال تک قائم رہی قنوج سے بہار تک کا علاقہ اس کے زیر نگین تھا اس خطہ کی یہ پہلی اسلامی مضبوط حکومت تھی یہاں کے فرمانرواؤں میں ابراہیم شاہ اور اس کا پوتا حسین شاہ تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے خاص طور پر حسین شاہ بڑا عالم اور علماء کا قدردان تھا قاضی نصیر الدین سے اس نے علوم رسمیہ کی تکمیل کی حسین شاہ نے اپنے وقت کے مشہور نائکوں سے موسیقی میں وہ کمال پیدا کیا کہ بہت سے راگ ایجاد کیے ان میں حسینی راگ بہت مشہور ہے موسیقی پر ایک بہت عمدہ کتاب تحفۃ الہند لکھی اس کی قدردانی کا شہرہ ہوا اور دُور دُور سے اہل علم و فن جونپور آئے یہاں صرف علماء کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے۔

مولانا نصیر الدین دہلی میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی قاضی عبد المقتدر کندی سے تحصیل علم کر کے درس شروع کیا فقہ و اصول و ادب میں شہرت حاصل کی یموری یلغار میں جونپور چلے آئے تو یہاں کے قاضی بنا دیئے گئے ایک مدت کے بعد دُنیا ترک کر کے ایک حجرے میں مشغول عبادت ہو گئے۔ ۸۱۷ھ میں اسی حجرہ میں انتقال ہوا۔

مولانا حسام الدین نصیر اللہ اصفہانی کے بیٹے شاہ مدار سے فیض حاصل کیا اور فرقہ مداریہ کے اکابر میں شمار کیے گئے ابراہیم شرقی کے دور حکومت میں ۸۰۴ھ میں

انتقال ہوا۔

مولانا قاضی شہاب الدین دولت آباد ملک العلمار اصلی نام احمد ہے مولانا شمس الدین دولت آبادی کے صاحبزادہ مولانا خواجگی اور قاضی عبد المقتدر کندی سے تحصیل علم کی جامع علوم تھے ذکاوتِ ذہن ادراک فہم اور قوت حافظہ میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے ہر وقت مطالعہ کتب میں مشغول رہتے تھے قاضی عبد المقتدر کہتے تھے کہ ان کا گوشت پوست استخواں سب علم ہی علم ہے مولانا خواجگی کے ساتھ کالپی گئے وہاں سے جونپور آئے یہاں ان کی بہت قدر ہوئی مورخ فرشتہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ بیمار ہوئے ابراہیم شرقی ان کی عیادت کو آیا اور ہاتھ اٹھا کے دعا کی:۔ اللھم انی قدرت لہ موتًا فاصرف عنہ الی۔ دربار میں چاندی کی کرسی ان کے لئے بچھائی جاتی تھی۔

تصانیف حاشیہ موقانی۔شرح بزودی۔ارشاد (نحو میں) بحر مواج تفسیر حاشیہ قصیدہ بانت سعاد حاشیہ شرح قصیدہ بردہ مناقب السادات ہدایۃ السعداء رسالہ فی عقیدہ اسلامیہ ۸۴۹ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا ابو الفتح مولانا عبد الحیٔ کے بیٹے اور مولانا عبد المقتدر کندی کے پوتے ۷۷۰ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے باپ مرچکے تھے دادا نے پرورش کی اور فضائل علمی سے آراستہ کیا ایک مدت تک درس دیتے رہے تیموری حملہ میں جونپور آئے اور یہیں قیام کرلیا فقہ اصول کلام ادب اور نقد و شعر میں بڑا ملکہ تھا بڑے فصیح البیان تھے۔ جمعہ ۱۳ ربیع الاول ۸۵۹ھ انتقال ہوا۔

مولانا شیخ اجمل بن مولانا امجد مولانا جلال الدین بخاری کے شاگرد شاہ مدار کے مرید بہلول ابن کالا لودھی کے زمانہ میں انتقال ہوا۔

مولانا محمد مولانا عیسیٰ کے صاحبزادے صدیقی شیخ ۔ ۸۰۰ھ ہجری میں دہلی میں پیدا ہوئے وہیں نشو ونمایائی اور علمی وروحانی کمالات حاصل کئے تیموری یلغار میں اپنے والد کے ساتھ جونپور آئے یہاں قاضی شہاب الدین سے درس لیا اور بعد فراغ خود درس دینا شروع کیا۔ ایک مدت کے بعد طریقت کی طرف مائل ہوئے شیخ فتح اللہ اودھی سے بیعت کی اور ریاضت میں مشغول ہوگئے لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا۔

مولانا احمد بن محمد حنفی گیلانی قاضی نظام الدین کے نام سے مشہور تھے حنفیہ کے فقہائے کبار میں شمار تھا اجداد عرب سے آئے تھے اور گجرات میں قیام تھا وہیں مولانا پیدا ہوئے اپنے زمانہ کے مشہور علماء سے تحصیل علم کی اور بلند درجہ پر فائز ہوئے ابراہیم شرقی کے زمانہ میں جونپور آئے اس نے بڑی قدر ومنزلت کی اور قاضی مقرر کیا۔

فتاوائے ابراہیم شاہیہ ان کی معرکہ آرا کتاب ہے جس میں حنفی مسلک کے موافق فتویٰ ہیں چلپی نے کشف الظنون میں لکھا ہے ہو کتاب کبیر من افخر الکتب ۔ ۵۰۷ یا ۸۵۰ھ میں انتقال ہوا قبر ایک گاؤں چاچک پور میں ہے

مولانا شہاب الدین محمود شاہ شرقی کے عہد میں وہ یا ان کے اجداد کرمان سے ہندوستان آئے اور جونپور میں سکونت اختیار کی مولانا طبیب بھی تھے سلطان محمود منڈوی کے عہد میں منڈوہ (بنگال) آئے وہاں محمود شاہی کے نام تاریخ مالوہ کی ضخیم جلد لکھی۔

مولانا فخر الدین قاضی شہاب الدین کے نواسے جونپور میں پیدا ہوئے اور اپنے پرنانا قاضی شہاب الدین سے تکمیل کی۔

مولانا عادل الملک مولانا عبدالمالک بن بہاؤالدین حسینی اسمعٰ[illegible] سند شا

جونپور میں تحصیل علم کی اور ممتاز علماء میں شمار کیے گئے پنڈوہ (بنگال) جاکر شیخ علاء الدین عمر سے طریقت میں فیض حاصل کر کے جونپور آئے سلطان حسین شرقی کے ساتھ ۸۷۰ھ میں رائے بریلی گئے وہ جگہ اتنی پسند آئی کہ وہیں قیام کرلیا۔

مولانا عبد الملک بن مولانا عماد الملک عمری ادھمی جونپور میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے تحصیل علم کی اور ان کے مدرسہ میں درس دینے لگے شرح کافیہ شیخ شہاب الدین کا حاشیہ لکھا۔ ۱۲ ربیع الاول ۸۹۶ھ کو جونپور میں انتقال ہوا اپنے آبائی مقبرہ محلہ کٹگھرہ میں دفن ہوئے۔

مولانا سماء الدین المخاطب بہ قتلغ خان قاضی شہاب الدین کے شاگردوں سے پڑھا اور تبحر علمی میں اپنے امثال سے بازی لے گئے سلطان حسین شرقی کے استاد اور وزیر تھے شرقی ولودھی جنگ میں مارے گئے۔

مولانا علاء الدین بن عطاء الملک ابن عماد الملک قاضی شہاب الدین کے شاگرد تکمیل کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہوئے اور قاضی کی شرح کافیہ پر نہایت مفید حاشیہ لکھا اجداد کے مقبرہ محلہ کٹگھر میں دفن ہیں۔

ظفرآباد ضلع جونپور مولانا تاج الدین ناصحی ادھمی عمری ابراہیم ادھم کی اولاد میں ہونے سے ادھمی اور باپ یا دادا کا نام عمر تھا اس وجہ سے عمری لکھتے تھے مولانا اسدالدین کے شاگرد ہیں عمر درس دینے میں صرف کی حافظ قرآن زہد و ورع میں ممتاز تھے۔ ظفرآباد میں انتقال ہوا۔

مولانا رکن الدین فقہائے حنفیہ میں شہرت رکھتے تھے ایک لاکھ حدیثیں یاد تھیں صائم الدہر تھے اور اکل حلال کی کوشش کرتے تھے مولانا اسدالدین کے شاگرد تھے ۸۰۲ھ میں انتقال ہوا ایک مرید نے رکن دین افتاد سے تاریخ نکالی۔

مولانا نورالدین مولانا اسدالدین کے صاحبزادے ابو محمد کنیت ۷۲۳ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے مولانا قیام الدین سے تحصیل علم کی اور ایک ہزار حدیثیں ان سے حفظ کیں فصوص اور عوارف کا درس اپنے والد سے لیا درس مشغلہ تھا کم گو کم خوراک اور کم نوم تھے ۱۴ صفر ۸۱۲ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا شمس الدین مولانا رکن الدین کے بیٹے مولانا صدرالدین کے پوتے شیخ بڈھن کے نام سے مشہور تھے۔ علوم ظاہری اور طریقہ سہروردیہ کی تحصیل کے بعد مسند پر بیٹھے ۸۷۲ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا قطب الدین کا پورا نام ابوالغیث قطب الدین ہے مولانا نورالدین کے صاحبزادہ ۸۰۲ھ میں پیدا ہوئے حفظ قرآن کے بعد اپنے والد سے تحصیل کی ان کے بعد قاضی شہاب الدین سے پڑھا طریقت میں اپنے والد سے استفادہ کیا علم کے ساتھ زہد وعبادت میں ممتاز اور تواضع میں مشہور تھے۔ ۸۹۹ھ میں انتقال ہوا۔

مچھلی شہر ضلع جونپور | مولانا سناءالدین بن نظام الدین زینی غزنی میں پیدا ہوئے وہیں تکمیل علوم کی اپنے والد کے ساتھ ۸۱۷ھ میں ہندوستان آئے اور مچھلی شہر میں سکونت اختیار کی اپنے والد کے بعد مچھلی شہر کے قاضی مقرر ہوئے۔

بنارس | مولانا مبارک حمیدالدین صوفی بنارسی کے صاحبزادے تحصیل علم کے بعد درس وتدریس میں مشغول ہوئے ایک مدت کے بعد معرفت کی طرف مائل ہوئے جونپور آئے مولانا عیسیٰ سے کسب فیض کیا اور بنارس واپس آکے تزکیہ نفس میں مشغول ہوگئے۔ زہد وقناعت اور توکل میں مشہور تھے سوا کھانے کے اور کسی سے کچھ نہ لیتے۔ مشائخ چشتیہ میں بڑا درجہ رکھتے تھے ۹۰۰ ہجری میں بنارس میں انتقال ہوا۔

دسویں صدی ہجری

ہمایوں ۹۴۶ھ میں شیر شاہ سے شکست کھا کے کچھ دیر کے لیے لکھنؤ میں ٹھہرا تو یہاں کے آڑھتیوں نے اپنے شکستہ حال مہمان کی تواضع میں دس ہزار روپیہ نقد اور پچاس گھوڑا پیش کیے۔

نادر خاں شیر شاہی تسلط کے بعد لکھنو کا حاکم ہوا اس نے یہاں سونے چاندی کے سکوں کی ٹکسال قائم کی جو اودھ کی شاہی تک باقی تھی آج بھی وہ جگہ اپنے اس پاس کے مکانوں کے ساتھ ٹکسال ایک محلّہ کی حیثیت سے مشہور ہے۔

نصف صدی کے بعد یعنی دور اکبری میں اس شہر نے سیاسی اہمیت حاصل کی۔

لکھنو کا قصبہ شیخ عبدالرحیم بری روزگار کی تلاش میں دہلی گئے اور شاہی نوکر ہو گئے ہوتے ہوتے زیر تخت کھڑے ہونے والے شاہی منصبدار ہو گئے اقبال کی یاوری سے پرگنہ کورج اور لکھنو جاگیر میں مل گیا اور یہ بڑی دھوم دھام سے لکھنو آئے یہاں انہوں نے اپنی پانچ بیویوں کے لئے ایک عالیشان عمارت بنوائی جو پانچ حویلیاں تھیں اس کا نام پنچ محلا تھا اس کے شمال میں دریائے گومتی کے کنارے قلعہ بنوایا جس میں چھبیس دروازے تھے ہر دروازے پر دو مچھلیاں تھیں اس وجہ سے وہ مچھی بھاون کہا جاتا تھا جو بعد میں مچھی بھون ہو گیا۔ یہ بہت مضبوط قلعہ تھا اس کے گھونگھٹ پر شاہ پیر محمد کا ٹیلہ تھا اس وقت لکھنو یہیں سے شروع ہوتا تھا۔

گھوڑوں کے ایک فرانسیسی تاجر نے عالیشان عمارت بنوائی جو فرنگی محل کے نام سے مشہور ہوئی۔

جواہر خاں آخر عہد اکبری میں یہاں کے صوبیدار تھے ان کے نائب قاضی محمود بلگرامی نے چوک کے جنوب میں داہنی طرف محمود نگر اور بائیں طرف شاہ گنج آباد کیے

اور چوک کے درمیان اکبری دروازہ تعمیر کیا۔

اکبر نے یہاں کے برہمنوں کو باجپئی گھجر ھا وے کے لئے ایک لاکھ روپیہ دیا اس وقت لکھنو کے پرانے محلہ باجپئی ٹولہ، کناری ٹولہ، سوندھی ٹولہ، بنجارہی ٹولہ اور امیری ٹولہ چوک کے اس پاس تھے اور علمار وصوفیا کی قیام گاہیں تھیں۔

مولانا شیخ محمود قلندر ابراہیم لودھی کے زمانہ میں سپاہی تھے اس کی شکست کے بعد ترک دنیا کر کے گوشہ نشینی اختیار کی اور شیخ بہلول کے مرید ہو کے کچھ اسمار کی دعوت وتلقین حاصل کی تیس سال تک ان کی غذا صرف دودھ رہی۔

حسین خاں ٹکڑیہ جب لکھنو کا حکم ہوا تو عبدالقادر بدایونی اس سے ملنے لکھنو آئے دن اس کے ساتھ شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت ایک بلی شیخ صاحب کے پاس آکے چیخنے لگی انہوں نے کہا یہ بلی فریاد کر رہی ہے کہ تم لوگوں نے اپنا وقت بھی ضائع کیا اور صاحب خانہ کے حضور قلب میں بھی خلل ڈالا تاریخ وفات معلوم نہیں۔

مولانا شیخ محمود قلندر مولانا محمد قلندر کے صاحبزادے درسیات مولانا عبدالرحمن سے لکھنؤ میں پڑھیں۔ اور طریقہ قلندریہ میں انہیں سے فیض حاصل کیا تیس سال تک مسلسل ریاضت شاقہ میں مشغول رہے ۱۲ر شعبان ۹۸۶ھ میں رحلت ہوئی[1]

مولانا علاء الدین سید ہاشمی عالم صاحب کرامت صوفی اور شاعر تھے انکا یہ مطلع مشہور ہے۔

ندانم آں گل خوبی چہ رنگ وبو دارد ۔ کہ مرغ ہر چمنے گفتگوے اور دارد

ایک دفعہ ان کے گھر میں چور گھس آئے یہ اللہ اللہ کہتے ہوئے گردن اٹھا کے

---

[1] نزہۃ الخواطر

ر وڑپر دوڑے ان میں سے کسی نے شہید کر دیا یہ واقعہ ۹۹۸ھ کا ہے چہ شد ان مرشد کامل مادہ تاریخ ہے [1]

مولانا حمزہ ملک آدم کاکر جو ابراہیم لودھی کے اُمرا میں تھے ان کے پوتے ہیں بلند بالا بڑے وجیہہ اور شوکت وشان کے آدمی تھے سینہ تان کے شیر کی طرح چلتے تھے صاحب جذب تھے شہر میں آتے تو ہاتھوں میں پتھر ہوتے چاروں طرف پھینکتے جاتے مگر کسی کو کوئی پتھر لگتا نہیں تھا ہمیشہ تلاوت قرآن کرتے تھے جس کو اہل جانتے اس کو اپنے پاس بلا کے بٹھاتے عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ میں بھی ان کے پسندیدہ لوگوں میں تھا اور ان کی ملاقات کو اچھا سگون سمجھتا تھا عام طور پر لوگ ان سے بھاگتے تھے [2]

مولانا شیخ بیرک گومتی کے کنارے جنگل کے اندر ایک غار میں رہتے تھے۔ جہاں کسی کا گذ محال تھا۔ ہمیشہ روزہ رکھتے جمعہ کی نماز کے بعد افطار کرتے تھے ان کے گھر میں ایک بوڑھی عورت رہتی تھی جو کی سوکھی روٹی اور تھوڑے بیر جس کا درخت اس نے خود لگایا تھا پہنچا دیتی تھی۔

اگر کوئی مشقت اُٹھا کے ان کی ملاقات کو جاتا تو وہ وقت معین پر اپنے حجرہ کے دروازہ پر آکے بیٹھ جاتے مگر کوئی بات نہ کرتے ان کے غار میں بڑے بڑے سانپ پھن نکالے ہوئے ہر طرف ٹہلتے رہتے تھے [3]

مولانا ابوالغیث بخاری بڑے عالم و فاضل فرشتہ خصلت امراء و فقراء دونوں سے نزدیک شریعت کے پابند اور صوفیا کے پیرو۔ امراء و ملوک سے قربت کی وجہ سے دولت مند تھے مگر فقر کی جھلک موجود تھی تاریخ میر ستودہ سیر سے نکلتی ہے

---

[1] نزہتہ الخواطر [2] نزہتہ الخواطر [3] منتخب التواریخ

مولانا فخر الدین مولانا سعد الدین کے صاحبزادے لکھنؤ میں پیدا ہوئے. وہیں نشوونما پائی تحصیل علم شیخ ابوالفتح بن عبدالمقتدر کندی سے کی اور خود درس و تدریس میں عمر گذاری مشائخ چشتیہ میں شمار تھا شاہ مینا سے بڑی دوستی تھی ۹ ربیع الاول ۹۱۰ھ کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ کسی نے لفظ شیخ سے تاریخ نکالی

اطراف لکھنؤ کے علماء

کاکوری مولانا سیف الدین مولانا نظام الدین کے بیٹے مشہور علوی خاندان کی فرد تھے ۸۶۰ھ میں ولادت ہوئی آپنے والد سے تحصیل علم کی قرأۃ و تجوید میں شہرہ آفاق تھے۔ ذی قعدہ کے مہینے میں ۹۵۹ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا ضیاء الدین مدنی لکھے جاتے ہیں۔ ممکن ہے مدینہ ہی کے رہنے والے ہوں دو سال دہلی میں رہے۔ وہاں سے کاکوری آئے شیخ نظام الدین بن سیف الدین نے ان سے حدیث کا درس لیا کاکوری میں انتقال ہوا۔

مولانا من اللہ مولانا نعیم اللہ کے بیٹے مولانا سعد الدین خیرآبادی کے شاگرد تھے۔

امیٹھی ضلع لکھنؤ مولانا احمد الفیاض فقہ و حدیث سیر و تاریخ میں وحید روزگار ایک سال میں قرآن حفظ کیا۔ کثیر المطالعہ شیریں مقال کثیر الدرس متوکل اور قانع تھے۔

مولانا شیخ خاصہ مولانا خضر کے صاحبزادے مولانا عبدالعزیز جونپوری اور شیخ خواجگی سدھوری سے علم ظاہر و باطن کی تحصیل امیٹھی میں مسند درس بچھائی وہیں انتقال ہوا۔

خیرآباد مولانا صلح کمال الدین بن محمود قدوائی شیخ سعد الدین کے بیٹے اپنے

باپ سے تحصیل علم کی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوتے ترپن سال تک درس میں مشغول رہے ۹۰۳ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا نظام الدین سید بدالدین کے بیٹے سندیلہ کے رہنے والے شیخ سعدالدین خیرآبادی شیخ عزیز اللہ تلمبی اور دوسرے اہل علم سے تکمیل کے بعد اپنے وطن کے بجائے خیرآباد میں سکونت اختیار کی اور درس کا سلسلہ شروع کیا کچھ دنوں کے بعد علم باطن کی طرف متوجہ ہوئے۔ شیخ صفی الدین سائپنوری سے بیعت کی اور پھر خیرآباد واپس آکے گوشہ نشین ہو گئے ۷ ربیع الاول ۹۹۳ھ میں انتقال ہوا۔

ردولی مولانا حماد مشہود عالم صاحب درس تھے اسی وجہ سے قاضی مقرر ہوئے

مولانا عزیز اللہ۔ مولانا صفی الدین کے پوتے مولانا اسماعیل کے بیٹے ردولی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے تحصیل علم کی اور شہرت حاصل کی۔

مولانا علاء الدین بن سلیمان عادل بلادل کے نام سے مشہور تھے ردولی میں پیدا ہوئے وہیں نشو ونما پائی وہیں کے شیوخ سے تحصیل علم کرکے حج وزیارت کیلئے گئے وہاں سے واپس آکے دہلی میں شیخ عبدالغفور بن نصیر دہلوی سے بیعت کی مغلوب الحالت اور صاحب کشف وکرامت تھے ۹۵۳ھ میں وفات ہوئی۔ علاء الدین مجذوب سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

مولانا عبدالصمد مولانا عزیز اللہ کے بھائی مولانا اسمٰعیل کے بیٹے مولانا صفی الدین کے پوتے ردولی میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کی فقہ وادب وکلام میں تبحر حاصل تھا بڑے ذہین وطباع تھے۔ مولانا عبدالقدوس گنگوہی ان کو صدر العلماء بدر الفضلا محقق اور نعمان ثانی لکھتے تھے [1]

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۸۳

مولانا عبدالقدوس گنگوہی مولانا اسمٰعیل کے بیٹے مولانا عبدالصمد کے بھائی ردولی میں پیدا ہوئے تھیں نشو ونما پائی ابتدائی تعلیم ملا فتح اللہ معروف وچکنہ سے حاصل کی اور ابتدائے عمر میں درس ترک کر کے ردولی میں شیخ احمد بن داؤد کی قبر پر مجاورت اختیار کی پھر محسوس کیا کہ علم کے بغیر تصوف طعام بے نمک ہے تو پھر تحصیل علم میں مشغول ہوئے اور مدتوں مشغول رہے۔ آخر علم و معرفت کے دروازے کھل گئے شیخ احمد ردولوی نے خرقہ پہنایا کرامات و سکر میں ڈوبے رہتے تھے موت اور فاتحہ کے ذکر سے رو یا کرتے تھے۔

مصنفات : تعلیقات علی شرح صحائف۔ شرح عوارف المعارف، التصوف انوار العیون واسرار المکنون آخر میں گنگوہ چلے گئے تھے اس وجہ سے گنگوہی کہے جاتے ہیں ۹۴۴ھ میں انتقال ہوا۔

چندوار | مولانا وجیہ الدین بن نظام الدین چندوار میں پیدا ہوئے وہیں نشوونما پائی اور ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے بعد شیخ محمد منکن پوری کی خدمت میں ملا تو ان حاضر ہو کر فاتحہ فراغ کے بعد طریقت میں استفادہ کیا اور کئی چلے کھینچے۔ مصاح العاشقین فی احوال السالکین احوال مشائخ میں کتاب لکھی [1]

سندیلہ ضلع ہردوی | مولانا احمد بن مولانا محمد سندیلہ میں پیدا ہوئے وہیں نشوونما پائی اور وہیں کے علماء سے تحصیل علم کر کے شہرت حاصل کی۔

مولانا مبارک ابن الحسن نقوی سعد الدین خیرآبادی سے علم ظاہر و باطن کی تحصیل کر کے شیخ سالار رفیع الدین کوڑوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خرقہ خلافت حاصل کیا اس کے بعد شیخ نظام الدین امیٹھوی اور دوسرے اکابر سے فیض حاصل

---

[1] نزہۃ الخواطر۔ جلد ۴ ص۳۵

کیا اپنے وقت علامہ تھے آپ کا فتویٰ حرف آخر سمجھا جاتا تھا ۹۰۷ھ کو سندیلہ میں انتقال ہوا۔

گوپامئو ضلع ہردوئی | مولانا الہ داد مولانا سعد اللہ عثمانی کے بیٹے گوپامئو میں پیدا ہوئے وہیں پلے اور بڑھے وہیں کے علماء سے درس لیا اس کے بعد امیٹھی آکے مولانا نظام الدین کے درس میں شریک ہوئے اور گوپامئو واپس آکے وہیں انتقال کیا۔

مولانا قاضی مبارک بن مولانا شہاب الدین گوپامئو میں پیدا ہوئے تحصیل علم نظام الدین امیٹھوی سے کی مدتوں قضا کی مسند پر متمکن رہے۔

بلگرام ضلع ہردوئی | مولانا احسن شیخ الاسلام کے لقب سے مشہور تھے اپنے وقت کے مشہور عالم تھے دور دور سے لوگ ان کے درس میں آتے تھے۔

مولانا کمال الدین مولانا اکرم کے بیٹے مشہور صاحب درس بزرگ تھے۔

سدھور | مولانا خواجگی بن علی انصاری ان کے دادا نظام الدین ۸۰۲ھ میں ہجرت کرکے سدھور آئے مولانا خواجگی یہیں پیدا ہوئے اور شیخ تاج الدین جونپوری سے فیض حاصل کیا ان کے چار بیٹے تھے۔

(۱) شیخ المشائخ ۔ (۲) محمد ۔ (۳) محب اللہ

چاروں نے ان سے پڑھا اور سب عالم ہوئے مولانا محب اللہ اپنے والد کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔

لاہرپور | مولانا عبدالرحمٰن بن علاء الدین عباسی لاہرپور میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کی ان کے انتقال کے بعد دہلی جاکے شیخ عبداللہ تلبنی سے درس لیا اور صاحب فتویٰ ہوتے۔ بارہ سال تک سکندر لودھی کے مقرب رہنے کے بعد جونپور جاکے شیخ عبدالسلام قلندری سے مستفیض ہوئے اور وطن واپس آکے عبادت میں مشغول ہو گئے عمر طویل پائی۔

صفی پور ضلع اناؤ مولانا عبدالصمد بن علیم الدین عثمانی بلقب صفی الدین انہیں کی وجہ سے سائنپور کا نام صفی پور ہوا علامہ سعدالدین خیرآبادی سے تحصیل علم کی بڑے ذہین وطباع تھے تحقیق ومطالعہ میں اپنے ہمعصروں سے سبقت لے گئے عبادت اور ذکر ومعرفت میں بھی بڑا درجہ رکھتے تھے اپنے اُستاد سے خرقہ بھی حاصل کیا اور ان کی زندگی میں مشائخ کے ہم مرتبہ ہوگئے۔ بے شمار شیوخ وعلمار نے فیض حاصل کیا تھا۔

فتحپور مولانا عبدالغنی مولانا حسام الدین کے بیٹے فتحپور نواح لکھنؤ میں پیدا ہوئے جونپور میں تحصیل علم کی اور نظام الدین امیٹھوی سے درس لیا اور طریقت میں استفادہ کرکے فتح پور واپس آکے اور مجلس درس آراستہ کی۔

نیوتنی ضلع اناؤ مولانا ضیاء الدین بن مولانا سلیمان نیوتنی میں پیدا ہوئے ابتدائی کتابیں اپنے وطن میں پڑھ کے گجرات گئے وہاں قاضی وحیدالدین سے بڑا ھا اور ان کی صاحبزادی سے عقد کیا اور وہیں سید محمد قریشی سے سلسلہ قادریہ میں بیعت کی پھر حج وزیارت کو گئے اور وطن واپس آکے اپنے فیوض وبرکات عام کیے۔

الہ آباد مولانا محمد محب اللہ مانکپور کے رہنے والے حنفی مشائخ سے علم طریقت حاصل کیا اور انہیں کے حکم سے الہ آباد میں قیام کیا ۱۰۵۸ھ میں وفات ہوئی۔

مانکپور ضلع الہ آباد مولانا حامد الحسینی بن ابوالحامدان پڑھ تھے مگر کشف ونظر کے دروازے کھل گئے تھے۔ علمار نظری مسائل دریافت کرتے تھے اور جواب پر حیران ہوجاتے تھے فرقہ چشتیہ کے کبار مشائخ میں شمار تھا۔ بہت علمار نے ان کا استفادہ کیا ۹۱۰ھ میں وفات ہوگئی۔

مولانا نورالحق مولانا حامد کے صاحبزادے اپنے والد سے طریقت میں

اکتساب کیا اور ان کے بعد شیخوخت پر فائز ہوئے صاحب کشف وکرامات تھے ۹۲۱ھ کو وفات ہوئی۔

مولانا احمد بن مولانا نظام الدین مانکپور میں پیدا ہوئے اپنے والد اور چچا مولانا حکیم اللہ سے پڑھا والد کے بعد ان کے جانشین ہوئے صاحب وجد وحال مشائخ چشتیہ میں شمار تھا ۹۲۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا قاسم مولانا احمد کے بیٹے اپنے والد سے تحصیل علم کی اور ان کے بعد ان کی مسند پر بیٹھے بہت رعب وادب کے آدمی صاحب کشف وکرامت میں مشہور تھے ۹۶۵ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا شیخ سلطان مولانا قاسم کے بیٹے اپنے والد سے پڑھا اور ان کے بعد ان کے جانشین ہوئے ۹۸۸ھ میں رحلت کی۔

کوڑہ | مولانا سالار بن ہبۃ الدین حنفی کوڑہ میں پیدا ہوئے اس کے اہل علم سے پڑھا طریقت میں شیخ یعقوب شمس الحق خونپوری شیخ نظام الدین فتحپوری سے فیض حاصل کیا اور وطن واپس آکے علم وعرفان کی روشنی پھیلائی۔ ۸ ربیع الاول ۹۸۶ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا بہاء الدین مولانا سالار کے صاحبزادے اپنے والد سے شریعت وطریقت میں فیض حاصل کیا ان کے بعد ان کے قائم مقام ہوئے۔

فتح پور ہنسوہ | مولانا یعقوب بن ابو یعقوب ملقب بہ قاضی کمال الدین فقہ واصول میں ممتاز درجہ رکھتے تھے اپنے خسر قاضی فضیلت کے بعد ان کے منصب پر فائز ہوئے۔ شہنشاہ اکبر نے لشکر کا قاضی مقرر کیا کچھ دنوں بعد قاضی القضاہ ہوگئے اور مدت تک اس منصب پر فائز رہے نہایت خوش طبع خوش مذاق جامع کے بہت حریص

معتوی ماہ معجون کا استعمال رکھتے تھے کسی بات پر بادشاہ نے خفا ہو کے بنگال کا قاضی بنایا یہ بنگال پہنچے جب محمد معصوم کابلی نے بغاوت کی تو یہ اس کے شریک ہوگئے اکبر نے ان کو معزول کر کے قلعہ گوالیار میں قید کرنے کا حکم دیا۔ مگر یہ وہاں پہنچنے سے پہلے مر گئے یہ واقعہ ۹۹۸ھ کا ہے۔ ان کے باغات سربلند عمارتیں، نہریں، حوض ہنوز میں ہیں۔

جونپور مولانا سید محمد مدعی مہدویت باپ کا نام یوسف تھا۔ حسینی سید تھے ۸۴۷ھ کو جونپور میں پیدا ہوئے حفظ قرآن کے بعد شیخ دانیال بلخی سے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی پندرہ سولہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے اور غیر معمولی ذہانت سے اسرار العلماء کہے جانے لگے۔ درس و تدریس میں شہرت ہوئی کچھ دنوں بعد ریاضت میں مشغول رہے اس کے بعد اہل و عیال کو لے کے جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل گئے اور اپنے کو مہدی کہنے لگے پھر مالوہ گئے اور چندیری میں وعظ شروع کیا جس سے وہاں کے عوام میں مقبول ہو گئے وہاں کے مشائخ نے شہر بدر کر دیا وہاں سے منڈو گئے سلطان غیاث الدین خلجی اور مولانا ہداد ان کے معتقد ہو گئے جس سے ان کی عظمت بڑھ گئی پھر پانیر گجرات پہنچے وہاں وعظ و پند سے محمود شاہ کبیر راغب ہو گیا اور مجلس وعظ میں آنے لگا تو علماء نے منع کر دیا تو یہ دولت آباد ہوتے ہوئے احمد نگر آئے۔ یہاں کے رئیس امیر نظام شاہ بڑی تعظیم سے پیش آیا وہاں سے احمد آباد گئے ملا ضیاء الدین اور قاضی علاء الدین نے بیعت کر لی وہاں سے گلبرگہ آئے اور حرمین کے سفر پر روانہ ہو گئے مکہ معظمہ پہنچ کر دوسری مرتبہ دعوئے مہدویت کیا اور کہا من تبعنی فھو مومن مکہ میں قاضی علاء الدین اور شیخ نظام الدین نے آپ کی بیعت کی۔ یہ واقعہ ۹۱۰ھ کا

ہے۔ حج کے بعد احمد آباد گجرات آکر ذکر میں مشغول ہوئے۔ یہاں بہت لوگوں نے بیعت کی اب تیسری دفعہ مہدویت کا دعویٰ کیا ۹۰۳ھ وہاں کے علمار نے شہر سے نکال دیا تو بٹیں کے ایک گاؤں سولا سا پہنچے اور چوتھی مرتبہ مہدویت کا دعویٰ اس وقت سے کیا کہ من انکر فقد کفر اس پر علما سے نے بحث کی اور وہ سندھ چلے گئے وہاں بھی علمار نے مخالفت کی اور ان کو سندھ سے نکال دیا انہوں نے سندھ سے خراساں کا قصد کیا جس میں آٹھ سو معتقدین ساتھ تھے۔

قندھار پہنچے تو وہاں کے رئیس مرزا شاہ بیگ نے کہا اپنا دعویٰ مسجد میں پیش کیجئے۔ انہوں نے خوب وعظ کہا خود بھی روئے اور سامعین کو بھی رُلایا شاہ مرزا مائل ہوگیا اور ان کا راستہ کھولدیا بہ فراہ پہنچے وہاں کے امیر نے راستہ روک دیا اور شاہ حسین مرزا بادشاہ ایران کو لکھا کہ ان سے کیا سلوک کیا جائے اس میں نو مہینے گذر گئے اس میں ان کا انتقال ہوگیا جمرات کا دن ۹۱۰ھ تھا ان کے ساتھی متفرق ہوگئے ان کے دعاوی میں تین گروہ ہیں۔

ایک یہ کہتا ہے کہ صاحب کشف وکرامات تھے۔

دوسرا کہتا ہے کہ صاحب کشف تھے مگر تعبیر میں ان سے غلطی ہوئی۔

تیسرے کا خیال ہے کہ وہ مسلک جدید کے متبدع تھے۔

عبدالقادر بدایونی کہتے ہیں کہ وہ صاحب مقامات عالیہ طریقت میں صدق واخلاص کے مالک اور فقر میں رفیع المنزلت تھے ان کے اصحاب طریقہ جدیدکے متبدع تھے۔

عبدالرحمٰن امیٹھوی نے مراۃ الاسرار میں لکھا ہے کہ وہ عارف تھے مگر کشف میں غلطی ہوئی۔

ابن مبارک کہتے ہیں کہ انہوں نے غلبہ حال میں مہدویت کا دعویٰ کیا ان سے خوارق کثیرہ ظاہر ہوتے وہ اپنے دعوے میں سچے تھے۔

صاحب خزینۃ الاصفیاء کا قول ہے کہ انہوں نے غلبہ حال اور سکر میں انا المہدی کہا تھا جیسے بعض لوگوں نے انا اللہ وسبحانی وما اعظم شانی کہا۔

مولانا عبدالحیؒ نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے ہوش میں آنے کے بعد اپنے اقوال سے رجوع فرمایا تھا مگر ان کے حامیوں نے ان کے رجوع کو معتبر نہ ٹھہرایا خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا ایک نیا مذہب قائم ہو گیا۔

ابو رجاء محمد شاہجہان پوری نے اپنی کتاب الہدایۃ المہدیہ میں لکھا ہے کہ جونپوری اپنے اصحاب کو مہدی کہنے سے منع نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے باپ کا نام عبداللہ اور ماں کا نام آمنہ رکھدیا تھا اپنے مذہب کے اصول میں انہوں نے کتاب بھی لکھی تھی۔ جس میں یہ اصول تھے۔

الف : میں مہدی موعود ہوں ابوبکر، عمر، عثمان سے افضل ہوں۔

ب : آدم نوح ابراہیم وموسیٰ سے برتر ہوں۔

ج : سیدنا محمد کے مساوی ہوں اگرچہ دین میں ان کا تابع ہوں۔

د : محمد اور میں کامل مسلمان ہیں اور دوسرے انبیا ناقص الاسلام ہیں۔

ہ : اگر انسان انوار الہیہ اپنی آنکھوں سے اور دل سے سوتے اور جاگتے میں نہیں دیکھتا تو وہ مومن نہیں۔

و : ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اپنے وطن سے ہجرت کر کے صحبت صادقین اختیار کرے۔

: ہیں صفات الٰہیہ میں شریک اور منصب رسالۃ و نبوۃ پر فائز ہوں۔

تاریخ پالن پور گلاب ابن عبداللہ المہدوی میں مذکور ہے کہ فرقہ مہدویہ کے باقاعدہ کچھ اصول و فروع میں اس کا طریقہ بالکل اہل سنت کا ہے۔

مولانا خضر ابن رکن معروف شیخ بڈھن طریقت میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے استفادہ کیا علوم ظاہری و باطنی کے جامع صاحب تصنیف تھے۔

مولانا حافظ واسطہ کار کے نام سے مشہور اور مشائخ شطاریہ میں شیخ عبداللہ شطاری کے مرید تھے انہیں سے خرقہ خلافت ملا۔

مولانا دیتین مولانا احمد الرضی الشریف کے صاحبزادے طریقت میں مولانا [illegible] الدین مانکپوری اور شیخ جلال الدین اکبرآبادی سے مستفید ہوئے ۱۱ ربیع الاول ۹۲۲ھ میں وفات پائی۔

مولانا شہاب الدین مشائخ سہروردیہ میں بڑے پائے کے بزرگ تھے

مولانا صلاح الدین ابن قاضی نظام الدین صاحب فنا وائے ابراہیمیہ کے احفاد میں تھے۔ انہیں کی زیر سایہ تعلیم و تربیت حاصل کی اور رفضائل علمی سے آراستہ ہوئے ان کے انتقال کے بعد ان کی جگہ قاضی مقرر ہوئے۔

مولانا بہاء الدین ابن خلق اللہ بزرگوں کا وطن ناگور تھا کئی پشت سے جونپور میں آباد تھے۔ مولانا یہیں پیدا ہوئے تحصیل علم شیخ عیسیٰ جونپوری اور شیخ حامد شاہ مانکپوری سے طریقہ چشتیہ میں ممتاز درجہ حاصل کیا۔

شیخ غلام رشید نے گنج ارشدی میں لکھا ہے کہ مولانا سات سال تک حسین بالادستی کی خدمت میں رہ کے جونپور آئے اور ۲۷ سال شیخ عیسیٰ کی خدمت میں رہ کے شیخ حامد مانکپوری کی خدمت میں نو سال گذارے پھر مکہ مکرمہ گئے

بیس سال وہاں رہے ارشاد السالکین ان کی مشہور تصنیف ہے ایک سو سال کی عمر میں ۹۱۱ھ کو جمادی الاول کے مہینہ میں وفات ہوئی۔

مولانا علاء الدین الہ داد مولانا عبداللہ صوفی کے بیٹے جونپور میں پیدا ہوئے وہیں نشو ونما پائی شیخ عبدالملک جونپوری سے تحصیل علم کی طریقت میں سید حامد مانکپوری سے استفادہ کیا اپنے دور کے صاحب درس وفتویٰ اور مصنف تھے مصنفات: شرح کافیہ۔ شرح ہدایہ شرح اصول بزودی۔ شرح مدارک التنزیل ۹۲۲ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا قطب الدین بینا دل ۸۶۶ھ کو پیدا ہوئے بچپن ہی میں نگاہ جاتی رہی اس وجہ سے بینا دل مشہور ہوئے اکابر شیوخ سے استفادہ کیا ۹۹۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا مبارک مولانا خیرالدین کے بیٹے خیرالدین پور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کرکے جونپور آئے اور شیخ علی بن شطاری سے استفادہ کیا انہوں نے محمد لقب دیا تکمیل کے بعد مسند شیوخیت پر بیٹھے زہد وتقویٰ میں بے مثال تھے ۹۸۲ھ میں وفات ہوئی۔

مولانا محمد درویش قصبہ نوہرہ ضلع غازی پور کے رہنے والے تھے۔ تحصیل علم کے لئے جونپور آئے اور شیخ مبارک کے زاویہ میں قیام کیا ان کے علم وفضل کو دیکھ کے شیخ مبارک نے اپنی صاحبزادی کی شادی ان سے کر دی اس کی وجہ سے انہوں نے جونپور میں مستقل قیام کر لیا۔

مولانا محمد مولانا مبارک کے صاحبزادے کلام واصول وعربیت میں وحید روزگار نہایت سنجیدہ اور شائستہ طبیعت تھی۔

مولانا معروف مولانا عبدالواحد بخاری کے بیٹے جونپور میں پیدا ہوئے۔ علوم ظاہری اور طریقہ چشتیہ میں شیخ ہداد جونپوری سے فیض حاصل کیا اور طریقہ قادریہ وشطاریہ میں شیخ عبدالو ... پوری سے زہد وعبادت درس وتدریس میں زندگی گذاردی۔

مولانا عبدالعزیز بن مولانا طاہر عباسی ۸۹۶ھ کو جونپور میں پیدا ہوئے کمسنی ہی میں یتیم ہو گئے ماں نے پالا ابتدائی تعلیم جونپور میں حاصل کی بڑے ہوئے تو دہلی جاکے مولانا شیخ محمد اور شیخ ابراہیم سے پڑھا تصوف کی کتابیں مولانا عبدالوہاب سے پڑھیں طریقہ سہروردیہ اور قادریہ میں شیخ ابراہیم مذکور سے فیضیاب ہوئے اور جونپور واپس ہو کے اپنے والد کے دوست مولانا قاضی خان کی خدمت میں رہ کے طریقہ چشتیہ میں فیض حاصل کیا اور انسے اس طریقہ میں اجازہ حاصل کیا پھر دہلی گئے اور مزید علم ومعرفت حاصل کی کثیر التصانیف صاحب مراقبہ ووجد وحالت تھے۔ استغنا کی دولت سے بہرہ مند تھے۔

تصانیف: بائیس کتابیں ان کی تصنفات میں ہیں مگر صرف چار کا علم ہے۔

(۱) شرح حقیقت محمدیہ مورلفہ قاضی وجیہہ الدین گجراتی۔ (۲) رسالہ عینیہ ردعلی الغیویہ شیخ الملک (۳) رسالہ عزیزیہ۔ (۴) عمدۃ الاسلام فقہ میں

دوشنبہ ۶ رجمادی الثانی ۹۷۵ھ کو وفات ہوئی وہ اپنے نام کے ساتھ ذرہ ناچیز لکھتے تھے۔ ان کی رحلت کے بعد جب اس کے عدد نکالے گئے تو وہی سال وفات تھا

مولانا منجھلا جونپور میں پیدا ہوئے وہیں پلے بڑھے اور شیخ قوام حسینی سے تحصیل علم کی فقہ وادب میں شہرہ تھا جونپور کے قاضی مقرر ہوئے۔

مولانا من اللہ مولانا بہاء الدین کے بیٹے شیخ اڈھن کے نام سے مشہور تھے۔

مولد ومنشاء جونپور ہے وہیں اپنے والد سے تحصیل علوم ظاہر و باطنی کی اور ان کے بعد انکی مسند پر فائز ہوئے سو سال کی عمر پائی عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے اُٹھ بیٹھ نہ سکتے تھے۔ مرید اُٹھاتے بٹھاتے تھے۔ مونس الذاکرین ان کی عمدہ تصنیف ہے ۹۷۰ھ میں انتقال ہوا۔ شیخ اڈھن سے تاریخ وفات مستخرج ہوتی ہے۔

مولانا قطب الدین مولانا من اللہ کے بیٹے جونپور میں پیدا ہوئے وہیں نشو ونما پائی اپنے والد سے علم وعرفان کی دولت حاصل کی اور دوسرے علماء سے بھی مستفید ہو کر درجہ کمال کو پہنچے اپنے والد کے بعد ان کی مسند پہ بیٹھے جونپور میں انتقال ہوا اپنے والد کے پاس دفن ہوئے۔

مولانا عبدالسلام بن محمد جونپور میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کی اور اپنے دادا مولانا قطب الدین سے بھی پڑھا شیخ عبدالرحمن لاہرپوری سے طریقہ قلندریہ میں بیعت کی سو سال سے زیادہ کی عمر میں ۹۷۶ھ کو انتقال ہوا۔

مولانا محمد مولانا محمد حسن کے بیٹے مولانا طاہر عباسی کے پوتے مولد جونپور وہیں کے علماء سے تحصیل علم کر کے دہلی گئے۔ وہاں شیخ ابراہیم کی خدمت میں برسوں رہ کے حج کو گئے وہاں یمن کے شیخ کی بیعت کی اور مدینہ منورہ میں قیام کر لیا شیخ ابراہیم نے وطن جانے کی ہدایت کی تو دہلی آ کے قیام کیا۔

مولانا دانیال مولانا محمد حسن کے صاحبزادے علم وفضل حاصل کر کے سلاطین کی مصاحبت اختیار کی کئی بادشاہوں کے ندیم رہے ایک مدت کے بعد شیخ ابوالمجاہد مانکپوری سے سلسلہ چشتیہ میں بیعت کر کے جونپور آئے اور درس وتدریس شروع کیا ۹۹۲ھ میں وفات ہوئی۔

مولانا کبیر الدین ابن جہانگیر فقہ وادب توکل وایثار میں مشہور رہے ۲۸ر شعبان کو ۶۳ر سال کی عمر ۹۶۲ھ کو انتقال ہوا۔

مولانا عبد الجلیل ابن طٰہٰ انصاری عبد اللہ برونوی کی ذریت میں تھے طریقت میں شیخ عبد العزیز ابن الحسن دہلوی سے مستفید ہوئے فقہ وحدیث میں ممتاز تھے ۹۹۰ھ میں چوروں نے دہلی میں قتل کر دیا۔ قتیل عجیب مادہ تاریخ ہے

مولانا المدار جونپور میں پیدا ہوئے وہیں پرورش پائی اور اپنے والد سے علوم ظاہر و باطنی کی تحصیل کر کے ممتاز درجہ پر فائز ہوئے۔ مولانا عبد الحئی کا خیال ہے کہ شیخ بھکاری یہی ہیں۔

مولانا چندن فقہ وحدیث میں شہرت رکھتے تھے درس وتدریس مشغلہ تھا

مولانا نور الدین مولانا نصیر الدین عباسی کے فرزند طریقت میں اپنے والد اور شیخ قطب الدین سے مستفید ہوئے۔ مشائخ قلندریہ میں تھے ۹۶۳ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا فخر الدین بن کبیر الدین جونپور میں پیدا ہوئے وہیں کے علماء سے تحصیل علم کر کے درس وتدریس شروع کی دس سال کے بعد تصوف کی طرف راغب ہوئے۔ ترک دنیا کر کے کئی چلے کھینچے یہاں تک کہ معرفت کے دروازے کھل گئے مشائخ وقت نے ان سے استفادہ کیا ۹۹۲ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا شمس الحق معروف بحقانی شیخ عیسیٰ جونپوری سے اخذ طریقت کیا اور مرتبہ کمال پر فائز ہوئے درس وتدریس میں مشغول سماع کے مشتاق وجد و حالت سے بہرہ مند تھے۔

برونہ ضلع جونپور | مولانا احمد مولانا زین الدین کے بیٹے برونہ ضلع جونپور

میں پیدا ہوئے مولانا عبدالواسع سے تحصیل کی شریعت وطریقت دونوں میں درجۂ کمال پر پہنچے متعدد علوم پر دست رس تھا مزدوری کرکے روزی کماتے تھے کسی سے کچھ لیتے نہ تھے یہ دیکھ کے ان کے شیخ نے کچھ رقم دی جس سے تجارت کرنے لگے جمادی الثانی ۹۶۳ھ کو بروزنہ میں انتقال ہوا۔ تاریخ وفات انہیں کے نام شیخ احمد سے نکلتی ہے۔

ظفرآباد ضلع جونپور مولانا جلال الحق المخاطب بقاضی خان ابن مولانا یوسف ناصحی عمری وزیر عماد الملک کے نواسے انہیں کے زیرسایہ پرورش پائی۔ ۸۵۰ھ میں پیدا ہوئے ۹۴۴ھ یا ۹۵۰ھ میں وفات ہوئی۔ سترہویں سال فارغ التحصیل ہوکے شیخ حسن ابن طاہر عباسی سے طریقت میں فیض حاصل کیا۔ بادشاہ کی طرف سے قاضی مقرر ہوئے اسی زمانہ میں وہ بے مثل کتاب لکھی جو فتاوائے قاضی خان کے نام سے مشہور رہے۔

مولانا احمد بن اسمعیل فقہ حنفیہ کے مشہور و مستند عالم تھے منصب قضا پر فائز تھے بتیس برس کی عمر میں ۹۹۰ھ میں انتقال ہوا۔

غازی پور مولانا احمد غازی پور میں پیدا ہوئے اور تحصیل علم کرکے شہرت حاصل کی۔

مولانا حسام الدین مانکپور میں پیدا ہوئے وہیں نشوونما پائی اور تحصیل علم کی ۸۵۳ھ میں غازی پور آئے اور نصیر خان لوہانی نے بادشاہ سے قضا کا عہدہ دلوا دیا جس پر تا عمر قائم رہے ۹۰۵ھ غازی پور میں انتقال ہوا

زمانیہ ضلع غازی پور مولانا احمد غازی پور میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کی اپنے وقت کی مشہور فقیہ وادیب تھے زمانیہ میں قیام کرلیا تھا وہیں درس و تدریس شروع کی۔

چریاکوٹ ضلع اعظم گڑھ | مولانا محمد عاشق عباسی چریاکوٹ میں پیدا ہوئے وہیں تحصیل علم کی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا ایک عالیشان مدرسہ بھی تعمیر کرایا۔

تصنیفات: التفسیر المحمدی۔ جواہر العربیہ (ادب) حاشیہ تلوع (اصول فقہ) الکوکب الدری (مواریث) ۱۳۲۷ھ میں وفات ہوئی۔

گھوسی ضلع اعظم گڑھ | مولانا حبیب اللہ بن احمد فقہ و اصول و ادب میں امتیاز خاص رکھتے تھے۔ گھوسی کے قاضی تھے۔

نظام آباد ضلع اعظم گڑھ | مولانا عبدالقدوس قاضی قدن اور قطب صدیق کے نام سے مشہور تھے۔ طریقہ شطاریہ میں شیخ عبداللہ شطاری سے بیعت کی اور حافظ شطار واسطہ کار کی خدمت میں بھی . . . یاب ہوئے اور فیض حاصل کیا اور انہوں نے اپنی خلافت سے سرفراز کیا اپنے وقت کے مشہور قاضی تھے

ماہل ضلع اعظم گڑھ | مولانا خیرالدین ظفرآباد ضلع جونپور کے رہنے والے ماہل میں سکونت اختیار کر لی ابھی اس کے قریب ایک گاؤں خیرالدین پور کے نام سے آباد کیا۔

بنارس | مولانا فریدالدین بن قطب الدین عمری اپنے نانا کے گھر فتح خانقاہ میں پیدا ہوئے وہاں سے اپنے بھائی داؤد کے ساتھ تحصیل علم کے لئے بنارس آئے اور خواجہ مبارک کی خانقاہ میں قیام کیا اور انہیں سے مستفید ہو کر درجہ کمال کو پہنچنے کے بعد شیخ مبارک نے اپنا جانشین بنایا۔

مولانا داؤد مولانا قطب کے بیٹے اور مولانا فرید کے بھائی ان کے ساتھ بنارس آئے اور شیخ مبارک سے درسیات پڑھیں۔ ۱۴ شوال ۹۰۶ھ میں گنگا

میں ڈوب کے راہی عدم ہوئے۔

مولانا مبارک بن ارزانی شیرشاہ سوری اور سلیم شاہ سوری کے عہد میں وزارت پر فائز رہے اصل وطن آفرجک تھا ان کے اسلاف بنارس کے رہتے تھے ۹۸۰ھ میں انتقال ہوا تصانیف مدارج الاخیار اور مصابیح کے طرز پر مشارق الانوار لکھی

مولانا حسن بن اداؤ اپنے چچا مولانا فرید سے تحصیل علم کی اور طریقہ چشتیہ میں ان سے مستفیض ہوئے ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور جو کی سوکھی روٹی سے افطار کرتے تھے مرعوب الطالبین صرف میں لکھی سفر حجاز میں بحری ڈاکوؤں نے شہید کر دیا۔

جائس ضلع رائے بریلی مولانا مبارک بن مولانا جلال اشرفی جائس کے سادات اشرفی سے ہیں جائس میں پیدا ہوئے وہیں اپنے والد سے اور دوسرے علما سے پڑھ کر باپ کے بعد ان کی مسند عملی پر بیٹھے اور شہرت حاصل کی ان کی تلقین وہدایت سے اودھ کے بے شمار کسان مسلمان ہوئے۔

مولانا محمد بن ابو محمد ہندی کے مشہور شاعر اور بدمادت کے مصنف ملک محمد کے نام سے مشہور ہیں ہندی ادب میں ان کو خاص درجہ حاصل ہے۔ مولانا مبارک کے شاگرد تھے بدمادت کے علاوہ بھی ان کی اور تصنیفیں ہیں

نیر آباد ضلع رائے بریلی مولانا احمد مولانا محمد کے بیٹے نیر آباد میں پیدا ہوئے وہیں پروان چڑھے اپنے بھائی قاضی محمد کی رحلت کے بعد نیر آباد کے قاضی ہوئے ۲۷ سال تک اس عہدہ پر رہے اس کے بعد معزول کر دیئے گئے

نیر الدین فاتح نیر آباد (غضر انتخاب کے جد اعلیٰ) کی اولاد سے جائداد کا جھگڑا ہوا۔ قاضی کے فیصلہ پر فریقین راضی نہ ہوئے یہ دلبرداشتہ ہو کے

نیرآباد سے ہجرت کرکے رائے بریلی چلے گئے وہیں انتقال ہوا۔ سید ارحمن کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

قنوج مولانا صدرالدین حنفی اپنے زمانہ کے مشہور عالم اور بہلول لودھی کے ندیم تھے۔

مولانا سید حسن مولانا صدرالدین کے بھائی تھے اور بہت بڑے عالم تھے۔

مولانا سید امام یہ بھی مولانا صدرالدین کے بھائی اور عالم تھے۔

مولانا کبیرالدین ابن سلیمانی پشاوری قریہ مدنی مضافات پشاور میں پیدا ہوئے جوان ہوکر تحصیل علم کے لئے نکلے مختلف مقامات کے علماء سے تحصیل کرکے قنوج میں سکونت اختیار کی وہیں جمعرات کو ۹۹۲ھ میں انتقال ہوا۔

کوئل ضلع علی گڑھ مولانا عبداللہ حسینی مشاہیر علماء میں تھے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے زمانہ میں تھے ان کا ذکر رکن الدین محمد ابن عبدالقدوس گنگوہی نے کتاب اللطائف القدوسیہ میں کیا ہے۔

بدایوں مولانا جلال الدین چشتی بدایوں میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم پاکر دہلی گئے اور شیخ عبداللہ تلبنی سے منطق و فلسفہ کا درس لیا اور شیخ رفیع الدین محدث شیرازی سے حدیث پڑھی اور بدایوں آکے درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔

مولانا عبداللہ اصلی وطن سامانہ تھا نسلاً ہندو تھے ایک مسلمان عالم فارسی اور حساب پڑھتے تھے جب سعدی کا یہ شعر پڑھا ؎

محال است سعدی کہ راہ صفا ∴ تو ان رفت جز در پئے مصطفیٰ

تو دریافت کیا کہ مصطفیٰ کون تھے استاد نے آنحضرت کے مکارم اخلاق

نہایت موثر طریقہ سے بیان کئے کچھ دنوں بعد یہ دہلی گئے اور مولانا عبدالغفور بن نصیر الدین سے استفادہ کیا وہاں سے شیخ صفی الدین سائنپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے برسوں استفادہ کیا یہاں تک کے کشف وشہود کے دروازے کھل گئے پھر بدایوں میں قیام کیا فقہ واصول اور نحو میں خاص درجہ تھا مذہب حنفیہ کے فروعات تک مستحضر تھے نہایت ذہین اور زاہد تھے ۹۰ رسال کی عمر میں انتقال ہوا۔

مولانا ملوک شاہ عمری کنیت ابوعبدالقادر ابو حاتم اور سعد جلال الدین چشتی سے درس لیا شیخ عبداللہ سے طریقت میں مستفید ہوئے عبدالقادر امام اکبر شاہ کے والد ہیں ۲۷ رجب ۹۹۶ھ میں اسہال کبدی میں انتقال ہوا بیٹے نے جہاں فضل سے تاریخ مستخرج کی۔

سنبھل ضلع مراد آباد | مولانا عبدالغنی مولانا شاہ احمد چندیری کے شاگرد اپنے وقت کے مشہور عالم وصوفی تھے۔

مولانا محمد بن ابو محمد کی قرارت وتجوید میں یگانہ آفاق سات قراء توں میں قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ عبدالقادر بدایونی نے ان سے پڑھا تھا۔

مولانا حاتم شیخ عزیز اللہ تلبنی کے مشہور شاگرد معقولات میں یگانہ عصر طریقت میں بھی شیخ مذکور سے مستفید ہوتے اور شیخ علاءالدین دہلوی سے بھی کسب فیض کیا سنبھل میں مجلس درس قائم کی چالیس سال تک فیض جاری رہا بڑے عبادت گذار تھے ۹۶۸ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا عجائب ابن اسحٰق اسرائیلی شیخ سمار الدین دہلوی کے شریعت وطریقت میں شاگرد تھے ان کے بعد ان کے قائم مقام ہوئے۔

مولانا عبداللہ مولانا عثمان کے بیٹے مودودی نسب مولانا عطاء اللہ کے پوتے باپ کا انتقال دادا کے سامنے ہو گیا مگر انہوں نے اپنے چار بیٹوں کے ساتھ ان کو وارث شرعی بنا اس وجہ سے پنجو کہے جاتے تھے شمس الدین اور کمال الدین لقب تھا ۸۶۶ھ کو امروہہ میں پیدا ہوئے سنبھل میں مولانا عزیز اللہ تلبنی سے اور مولانا علاء الدین دہلوی سے طریقہ چشتیہ میں فیض حاصل کرکے امروہہ واپس آئے اور کچھ دنوں کے بعد صحرا میں چلے گئے دس سال تک جنگل میں رہنے کے بعد سنبھل آئے ۲۰ محرم ۹۶۹ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا عزیز اللہ تلنبہ ضلع ملتان کے رہنے والے ملتان میں تحصیل علم کرکے ایران گئے وہاں کے فلاسفہ سے منطق وفلسفہ کی تکمیل کرکے ہندوستان آئے اور سنبھل میں سکونت اختیار کرکے درس شروع کیا اور معقولات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ۹۶۵ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا عبدالحلیم مولانا حاتم کے بیٹے اپنے والد سے تحصیل علم کی اور درس وتدریس میں شہرت حاصل کی ۹۸۹ھ میں وفات ہوئی۔

مولانا حمید الدین موعظ اور تفسیر قرآن میں ید طولیٰ رکھتے تھے سلطان ہمایوں ان کا بہت معتقد تھا ۹۸۳ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا عثمان بنگال کے رہنے والے تحصیل علم کے لئے سنبھل آئے اور میاں حاتم سنبھلی سے درس لیا پھر گجرات جاکے علامہ وحید الدین گجراتی سے پڑھا تکمیل کے بعد سنبھل میں توطن اختیار کیا ۹۸۰ھ میں وفات ہوئی سہ گفتند رفت مردانہ مادہ تاریخ ہے

اعظم پور پرگنہ سنبھل مولانا عبدالغفور شیخ نظام الدین کاکوروی ارشد شیخ

عبدالقدوس گنگوہی سے شریعت و طریقت میں فیضیاب تھے درس و موعظ شغلہ تھا۔ فارسی شعر بھی خوب کہتے تھے۔ تصوف میں ایک کتاب بھی لکھی تھی ۹۸۵ھ میں انتقال ہوا۔

امروہہ ضلع مرادآباد مولانا محمود بن عطاء اللہ حسینی مودودی اپنے وقت کے مشہور عالم سلطان بہلول لودھی نے امروہہ کا قاضی مقرر کیا ملک العلماء خطاب دیا ۹۱۷ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا عبدالملک مولانا محمود کے بیٹے اپنے والد کی رحلت کے بعد ۹۱۷ھ سکندر لودھی نے امروہہ کا قاضی مقرر کیا ۹۵۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا الہ داد خوش مزاج ظریف الطبع ہنس مکھ شریں مقال حاضر جواب اداب شرع سے بے نیاز علماء کے لباس میں نہ تھے اکبر کے زمانہ میں ۹۹۳ھ فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ ایک موکہ کے دوران سیالکوٹ میں انتقال ہوا لاش امروہہ لائی گئی۔

مولانا عبدالغفور بن عبدالملک بدر عالم تھے ۹۵۰ھ میں اپنے والد کی جگہ امروہہ کے مفتی مقرر ہوئے ۹۹۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا عبداللہ بن احمد بن ابراہیم امام علی رضاؑ کی اولاد میں تھے ہندوستان کے مشہور اولیاء میں تھے عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ میں امروہہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے رضا بالقضا پر موعظ فرمایا اور خطاب میری طرف رہا جب میں گھر واپس آیا تو میری لڑکی کا انتقال ہو چکا تھا اس وقت شیخ کے موعظ کا مطلب سمجھ میں آیا ۹۹۷ھ میں رحلت فرمائی۔

مولانا عبدالشکور بن اسمٰعیل مودودی امروہہ میں پیدا ہوئے وہیں نشو نما

ہوئی۔ تحصیل کے بعد ہمایوں نے سہوان میں عہدۂ قضا پر مامور کیا اور وہ تمام آرامی جوان کے سالے محمد طاہر کو وہاں کے قاضی نے دی تھی انہیں دیدی محمد نے ان کو قتل کر دیا۔

مولانا محمد مولانا منتجب کے بیٹے میر عدل کے نام سے مشہور تھے۔ امروہہ میں پیدا ہوئے وہیں نشوونما پائی۔ تحصیل علم مولانا حاتم سنبھلی سے کی وہاں سے بدایون جا کے سید جلال الدین سے تکمیل اور علم و عمل میں شہرت حاصل کی شہنشاہ اکبر نے دارالعدل کی امارت پر متعین کیا۔ بڑے متقی، پارسا، نڈر اور بے باک تھے حدود اللہ کے سختی سے پابند تھے اور امر و نواہی کی تلقین میں کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے اسی وجہ سے ان کو سندھ کا قاضی بنا دیا گیا کہ پائے تخت میں رہنے کے قابل نہیں آداب دربار سے ناواقف ہیں ۹۸۲ھ میں انتقال ہوا۔

دسویں صدی ہجری تک ہندوستان کا علمی معیار

اس سے پہلے کہ لکھنؤ کی علمی تاریخ کا قدم آگے بڑھے دسویں صدی ہجری تک پورے ہندوستان کے علمی معیار کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ لکھنؤ کی علمی منزلت کا صحیح طور پر تعین ہو سکے۔

یوں تو اس برصغیر میں پانچویں صدی ہجری سے علمائے اسلام کا وجود پایا جاتا ہے مگر ان کا علمی درجہ بہت بلند نہ تھا۔ بیشتر صوفیا اور حدیث و تفسیر سے لگاؤ رکھنے والے مسجدی ملا تھے معقولات میں نہ اتنی بلند پایہ کتابیں تھیں نہ ان کی طرف وہ توجہ کرتے تھے بلکہ ان کے نزدیک وہ گمراہ کن تھیں۔

منقولات میں بھی مبتدی تھے مولوی ابوالحسنات ندوی لکھتے ہیں۔

جس طرح ہمارے زمانہ میں منطق وفلسفہ معیار فضیلت ہے اسی طرح دسویں صدی ہجری تک فقہ واصول معیار فضیلت تھا۔ حدیث میں صرف مشارق الانوار کا پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا اور جس خوش نصیب کو مصابیح ہاتھ آجاتی تھی وہ امام الدنیا فی الحدیث کے لقب کا مستحق ہو جاتا تھا۔ (ہندوستان کی قدیم درسگاہیں)

آزاد بلگرامی اور ضیائے برنی کا دعویٰ کہ ان علماء کا مثل سمرقند و بخارا بلکہ ربع مسکوں میں نہ تھا اس لحاظ سے صحیح ہے کہ اس وقت جو معیار لیاقت تھا اس میں ان کا مثل نہ تھا۔

سمرقند و بخارا وہی مقام ہیں جہاں کے علماء نے عبداللہ خاں ازبک کو علوم عقلیہ کی حرمت کا فتویٰ لکھ کے دیا جس کے نتیجہ میں قاضی ابوالمعالی ملا عصام الدین ملا مرزا جان ایسے فلاسفہ وہاں سے نکالے گئے۔

قاضی ابوالمعالی ہندوستان آئے اور اکبر کی قدردانیوں سے سرفراز ہوئے۔

شیخ عزیز اللہ اور شیخ عبداللہ ضلع ملتان کے رہنے والے ایران گئے اور علوم عقلیہ میں درک حاصل کر کے واپس آئے شیخ عبداللہ نے دہلی میں اور شیخ عزیز اللہ نے سنبھل ضلع مراد آباد میں قیام کر کے منطق و فلسفہ کا درس شروع کیا اس سے پہلے شرح شمسیہ اور صحائف کے سوا ہندوستان میں شائع نہ تھا۔

عبدالقادر بدایونی ذکر سکندر لودھی میں لکھتے ہیں۔

شیخ عزیز اللہ و شیخ عبداللہ تلبنی اس طرف آئے اور علوم عقلیہ کو ان اطراف میں رواج دیا۔

سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ:

ان دونوں عزیزوں کی درسگاہ سے دو کامل نکلے میاں حاتم سنبھلی اور مولانا الٰہ داد جونپوری" ان دونوں کا تبحر علمی کو اس شد و مد سے بیان کیا ہے۔

"میاں حاتم سنبھلی نے بیس دفعہ سے زیادہ مفتاح اور چالیس دفعہ سے زیادہ مطول کا درس دیا تھا۔

اور ملائے جونپوری نے فقہ میں ہدایا اور نحو میں شرح کافیہ اور تفسیر مدارک پر حاشیہ لکھا ہے۔ (حیات شبلی)

مولانا فریدالدین شافعی کی مجلس درس میں بیٹھنے والے علماء کشاف پڑھتے تھے یہ ان کی علمی معراج تھی۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے ایرانیوں میں اسلامی علوم کے ساتھ معقولات کو بھی بام عروج تک پہنچایا اور حدیث وتفسیر کے ساتھ علوم حکمیہ کے دریا بہا دیئے اور ان علوم کو اس درجہ پر پہنچایا جس پر اضافہ ممکن نہ ہوا افق المبین صدرا شارات وشرح اشارات کا مثل نہیں میر باقر داماد ملا۔ صدرالدین شیرازی محقق طوسی میر فتح اللہ شیرازی وہ لوگ ہیں جنہیں حکمائے یونان کے پلہ میں رکھ کے تولا جاسکتا ہے۔ افلاطون وسقراط کے مردہ علوم کو انہوں نے زندہ کیا۔ مورخ فرشتہ لکھتا ہے

"میر فتح اللہ شیرازی کے علم وفضل کی شہرت سن کے علی عادل شاہ نے بصد آرزو لاکھوں روپیہ اور خلعت وانعام بھیج کر شیراز سے بلوایا اور امارت واعزاز سے رکھا۔ ۹۸۸ھ میں ابراہیم عادل شاہ انھیں کی تدبیروں سے تخت وتاج کا مالک بنا۔"

اکبر کو جب ان کے کمالات کا علم ہوا تو ان کو خط لکھا اور ابراہیم عادل شاہ سے ان کو مانگ لیا ۹۹۱ھ میں وہ فتح پور پہنچے حکیم ابوالفتح شیرازی اور خانخاناں استقبال

کو بھیجے گئے۔ بڑے اعزاز سے دربار میں آئے وزیر اعظم مہاراجہ ٹوڈرمل کو حکم ہوا کہ تمام مہمات سلطنت ان کے مشورے سے انجام دیں۔ مدت کے اُلجھے ہوئے معاملے انھوں نے سُلجھائے امین الملک عضدالدولہ خطاب ملا کل ممالک ہندوستان کی صدارت پائے نام ہوئی اور خان اعظم کو کلتاش خاں کو ساتھ کر کے تسخیر دکن کے لیے روانہ کیے گئے۔

اکبری دربار کے تمام علماء جو اپنے وقت کے افلاطون تھے ان کے علم و دانش کے آگے کان پکڑتے تھے ملا عبدالقادر بدایونی ایسا شخص ان کے بحر علم کی گہرائی دیکھ کے دم بخود ہو گیا اپنی مشہور تاریخ میں لکھتا ہے۔

"دادی الٰہیات و ریاضیات اور کل اقسام عقلی و سفلی اور طلسمات و نیرنجات اور جرِ اثقال میں اپنا نظیر زمانے میں نہیں رکھتا تھا، مذہب کا بڑا متعصب تھا عین دیوان خانے میں جہاں کسی کی مجال نہ تھی کہ علانیہ نماز پڑھ سکے باطمینان تمام مذہب امامیہ کی نماز پڑھتا تھا اس معاملے سے چشم پوشی کر کے اس کے علم و حکمت اور تدبر و مصلحت کی وجہ سے اس کی پرورش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیے اور اپنی سالی سے شادی کر کے اپنا ہم زلف بنالیا۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"اعلم علمائے زماں مدتوں حکما و اکابر فارس کا پیشوا رہا تمام علوم عقلی و نقلی ہیئت نجوم ہندسہ، رمل، حساب، طلسمات، نیرنجات جرِ اثقال خوب جانتا تھا اس میں وہ مرتبہ رکھتا تھا کہ اگر بادشاہ متوجہ ہوتے تو رسد باندھ سکتا تھا۔"

ابوالفضل ایسے علامۂ روزگار نے جن الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے اس سے ان کی علمی عظمت کا اندازہ کیجئے۔

"میں سمجھتا تھا کہ عقلی تعلیمی کارواں لٹ کر راستہ بند ہو گیا مگر اس بزرگ معنوی کو دیکھ کر رائے بدلی کہ اگر علوم عقلی کی پرانی کتابیں نابود ہو جائیں تو یہ سرے سے نئی بنیاد رکھ سکتے ہیں اور جو کچھ ضائع ہوا اس کی پرواہ بھی نہ کریں علم وفضل کے ساتھ راستی و درستی و معاملہ فہمی میں بھی گوہر نایاب تھا۔"

فیضی نے تاریخ وفات میں ایک لفظ سے ان کے علمی درجہ کو ظاہر کیا ہے "افلاطون دنیا سے اٹھ گیا۔"

شہنشاہ جہاں را انوفاتش دیدہ پرنم شد ٭ سکندر را شکِ حسرت ریخت کا افلاطون از عالم شد

معتمد خاں اقبال نامہ میں ان کی وفات پر اکبر کے حزن و ملال کی یہ کیفیت بیان کرتے ہیں۔"

"علمائے متاخرین میں سید فتح اللہ شیرازی کے برابر کوئی نہیں ہوا۔ ۹۹۷ھ میں کشمیر میں انتقال ہوا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو فرمایا وہ ہمارے وکیل تھے طبیب و نجم تھے ان کے انتقال کا جو صدمہ ہوا ہے وہ ہم جانتے ہیں۔ اس درد کا وزن کون کر سکتا ہے اگر وہ اہل فرنگ کے ہاتھ لگ جاتے اور وہ جوہر شناس ان کے عوض خزائن سلطنت مانگتے تو ہم بڑی خوشی سے سودا کر لیتے کہ جوہر بے بہا نہایت ارزاں خریدا ۔"

<u>کمالات</u>: انھوں نے زیچ اکبری تیار کی جو آئین اکبری میں موجود ہے اور فلکیات

میں اہل ایران کی برتری کو ثابت کرتی ہے اس میں شک نہیں کہ دورۂ شمسی میں گھنٹے سب سے پہلے بطلیموس نے معین کئے مگر منٹوں کی صحیح تعین وہ بھی نہ کر سکا یہ کارنامہ دنیا میں سب سے پہلے اہل ایران نے انجام دیا اور ایسی قابلیت سے منٹوں کی یقین کی کہ آج کی تحقیق اور ان کی تحقیق میں چند سکنڈ کا فرق ہے۔

بطلیموس نے تین سو پینسٹھ دن پانچ گھنٹے پچپن منٹ بارہ سکنڈ دورۂ شمسی کے معین کیے تھے۔

خیام اور محقق طوسی نے تین سو پینسٹھ دن پانچ گھنٹے ۴۹ منٹ۔ معین کئے۔

کوپرنیکس نے ۱۵۴۳ء میں " " ۴۹ چھ سیکنڈ کیا۔ یعنی اس نے چھ سیکنڈ کا اضافہ کیا۔

کیپلر نے تین سو پینسٹھ دن پانچ گھنٹے ۴۸ منٹ ۵۷٫۶ سیکنڈ یعنی اس نے تقریباً ڈھائی سکنڈ کا فرق نکالا۔

لاکائل نے تین سو پینسٹھ دن پانچ گھنٹے ۴۸ منٹ ۴۹ سیکنڈ اس نے گیارہ سکنڈ کا فرق نکالا۔

موجودہ تحقیق تین سو پینسٹھ دن پانچ گھنٹے ۴۸ منٹ ۴۹٫۷ سیکنڈ۔ اس میں تقریباً دس سیکنڈ کا فرق ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ایرانیوں نے جس وقت نظر سے دورۂ شمسی کو معین کیا تھا اس میں آج تک ایک منٹ کا فرق بھی نہیں نکالا جا سکا۔

خیام اور طوسی کے سال میں ہر مہینہ تیس دن کا تھا جس میں ہر مہینہ کا وقت بھی مقرر تھا۔ یعنی جب آفتاب دوپہر سے کسی برج میں آئے سال کے آخر میں پانچ دن کا اضافہ ہوتا تھا۔

اس قاعدے میں اکبر کے زمانہ میں میر فتح اللہ شیرازی نے اضافہ کیا۔ انھوں نے ہر سال کے پانچ دن کو بارہ مہینوں پر اس طرح تقسیم کر دیا۔

فروردین۔	اردی بہشت۔	خورداد۔	تیر۔	امرداد۔	شہریور۔	مہر۔	ابان۔	آذر
۳۱	۳۱	۳۲	۳۱	۳۱	۳۱	۳۰	۳۰	۲۹
دے۔	بہمن۔	اسفندار						
۲۹	۳۰	۳۰						

اب سال میں صرف چھ گھنٹوں کی کسر باقی رہ گئی اور ہر سال پانچ دن کے اضافہ کی ضرورت نہیں رہی اس کام نام تاریخ الٰہی قرار پایا اور مغلیہ سلطنت میں رائج ہوا ہندوستان میں ۱۹۵۰ء کے قریب تک یہی سنہ مملکت نظام میں رائج رہا یہ تقویم آئین اکبری میں موجود ہے۔

ایجادات میں سب سے پہلے ایرانیوں نے مشین ایجاد کی۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ میر فتح اللہ شیرازی نے ۹۹۵ھ کے مینا بازار میں اپنی دُکان رکھی تھی جو انھیں کی ایجاد کا شو روم تھی اس کی خاص چیزیں یہ تھیں۔

(۱) مشین گن۔ ایک راؤنڈ میں بارہ فیر کرنے والی بندوق۔

(۲) آلہ جر ثقیل (CRANE) بھاری چیزوں کو اُٹھانے کی مشین جو چرخیوں سے بنائی گئی تھی۔ اور یہی چرخیاں مشینوں کی بنیاد ہیں۔

(۳) باد آسیا۔ ہوا سے چلنے والی چکی

(۴) آئینۂ حیرت۔ اس میں دور سے کچھ اور نزدیک سے کچھ نظر آتا تھا۔

(۵) قلعہ شکن توپ دیکھنے میں بہت بڑی اور پہاڑ پر چڑھانے کی ضرورت ہو تو حلقہ حلقہ الگ کر کے آسانی سے اوپر چلی جائے۔

(۹) نیرنجات کیمیادی اجزام سے مختلف تجربے۔

ایران کے تمدن اور علوم و فنون کی برتری کا ذہنی طور پر یہ اثر تھا کہ سلاطین مغلیہ جشن نوروز بھی بڑی دھوم سے مناتے تھے۔ جب کہ مارچ کا مہینہ ہندوستان میں خزاں کا مہینہ ہے اس کو بہار سے کوئی مناسبت نہیں۔

دیوان عام کے گرد ایک سو بیس ایوان رنگین پتھروں کی گلکاری سے باغ و بہار رہتے۔

ہر ایوان ایک امیر کو آراستہ کرنے کے لئے دیا جاتا تھا اور وہ بڑی کوشش سے اس کو سجاتا تھا سونے چاندی موتی مقیش بانات زربفت قالین بڑے بڑے جھاڑ فانوس کے علاوہ ملک ملک کی نادر اشیاء رکھ کے اپنی کارگزاری کا ثبوت بہم پہنچاتا تھا۔ میر فتح اللہ شیرازی اپنے ایوان میں علوم و فنون کو زندہ کر کے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے گھڑیاں گھنٹے، علم ہیئت کے آلات، کرے، ربع مجیب، اسطرلاب نظام فلکی کے نقشے جن میں مجسم صورتوں میں سیارے اور افلاک گھومتے نظر آتے تھے۔ جر اثقال کی کلیں، علم کیمیا، اور نیرنجات کے شعبدے جو ذرا ذرا سی دیر میں رنگ بدلتے تھے۔

افسوس ہے کہ ان چیزوں کی طرف توجہ نہ گئی ورنہ آج سائنس کی ایجاد و ترقی کا دعویٰ یورپ کو نہ ہوتا۔

فیوض: یہی وہ بحر علم تھا جس نے ایک طرف اپنی ایجادات اور کیمیاوی تجربوں سے اہل ایران کی ذہنی برتری کو ثابت کر دیا دوسری طرف علوم عقلیہ کے دریا بہائے اور اس سے سیکڑوں نہریں نکل کے اطراف ہند میں پھیل گئیں۔

غلام علی بلگرامی مآثر الکرام میں لکھتے ہیں۔

"حاشیہ محقق میرے ایک جم غفیر نے استفادہ کیا اس عہد سے معقولات کا دوسرا یہی رواج ہوا۔"

سید سلیمان ندوی کا بیان ہے۔

"میر فتح اللہ شیرازی اکبر کے زمانہ میں معقولات کا دفتر لے کے ہندوستان وارد ہوئے۔ ہندوستان میں متاخرین علمائے ایران کی معقولی کتابوں کا رواج میر مذکور ہی کے ذریعہ پھیلا۔" (حیات شبلی)

میر فتح اللہ شیرازی کے شاگردوں میں ملا عبدالسلام لاہوری نے شہرت حاصل کی اور ساٹھ سال تک مسند درس بچھاتے رہے ان کے شاگردوں میں ان کے ہم نام ملا عبدالسلام دیوی (دیوہ مضافات لکھنؤ) نے مرجعیت حاصل کی سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"یہی وہ بزرگ ہیں جن کے ذریعہ معقولات کا رواج ہندوستان کے مشرق و مغرب میں ہوا" (حیات شبلی)

ان کے شاگرد پنجاب میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی پورب میں ملا دانیال چوراسی شیخ محب اللہ شیخ واصف علی تھے جنہوں نے حکمائے ایران کی کتابوں کی تدریس میں اپنی عمریں صرف کر دیں ان پر شرح و حواشی لکھے۔ اور علوم عقلیہ کو معراج کمال پر پہنچایا۔

یہ سترھویں صدی ہجری تک پورے ہندوستان کی علمی ترقی کا جائزہ۔

گیارہویں صدی ہجری

گیارہویں صدی ہجری میں لکھنو کو سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی اس کی پچھلی خصوصیتوں میں کچھ ترقی ہوئی یعنی غلہ کی تجارت کمانوں کی صنعت عالموں اور صوفیوں میں اضافہ ہوا جہانگیر نے غلہ کی ایک بہت بڑی منڈی بنوائی جہاں اب ایک محلہ مرزا منڈی کے نام سے آباد ہے۔

شاہجہاں کے عہد میں یہاں کے صوبیدار سلطان قلی خان نے اپنے دو بیٹے فاضل و منصور کے نام سے فاضل نگر اور منصور نگر آباد کئے۔

اشرف علی خان رسالدار نے اشرف آباد اور ان کے بھائی مشرف علی خان نے مشرف آباد بسایا جس کا نام اب نوبتہ ہے یہاں کا بستہ آباد میں جن میں بڑے بڑے ادباء اور شعراء پیدا ہوئے اور لکھنو کا نام ان سے روشن ہوا۔

پیر خان ایک فوجی افسر نے ایک گڑھی بنوائی جہاں اب ایک محلہ پیر خان کی گڑھی کے نام سے آباد ہے۔

فدائی خان اورنگ زیب کے عہد میں یہاں کے گورنر بڑے دبدبے کے آدمی تھے۔

اورنگ زیب نے شاہ پیر محمد کے ٹیلہ پر ایک مسجد بنوائی۔

اس وقت ذیل کے علماء لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں علمی مسند بچھائے ہوئے تھے

مولانا عبدالقادر بن سلطان۔ ابراہیم ادھم کی اولاد تھے۔ ان کے اجداد عالم و فقیہ و محدث گذرے ہیں۔ ۹۹۶ھ میں لکھنو میں پیدا ہوئے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ۹۹۴ھ میں کسمنڈی میں پیدا ہوئے ان کی والدہ کا نام بوبو جیا تھا۔ یہ مولانا عبدالواحد کی بیٹی اور قاضی ضیاء الدین نیوتنوی کی پوتی تھیں۔ لکھنؤ میں انہوں نے

حفظ قرآن کیا۔ اور علوم حاصل کئے اس کے بعد لاہو چلے گئے مفتی عبدالسلام لکھنوی ثم لاہوری سے علوم عقلیہ کی تکمیل کر کے لکھنو آئے اور مجلس درس آراستہ کی۔ استاذ الاساتذہ تھے اودھ سے دہلی تک تبحر علماء ان کے شاگرد تھے۔

مولانا پیر محمد مولانا محمد شفیع دہلوی سید محمد قنوجی قطب الدین سہالوی غلام مصطفیٰ اشرفی جائسی وغیرہ سب ان کے شاگرد تھے اور انہیں سے ہندوستان میں علوم عقلیہ کو عروج ہوا، ۷ر شعبان سنہ ۱۰۸۶ھ کو لکھنو میں انتقال ہوا کسی نے رضی اللہ سے تاریخ نکالی۔

مولانا محمد وارث۔ مولانا عبدالقادر کے صاحبزادے لکھنو میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل کی مگر بہت جلد ترک و تجرد اختیار کر لیا مراقبہ میں مشغول ہو گئے اپنے والد کی زندگی میں سنہ ۱۰۷۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا عطاء اللہ بن حبیب اللہ عثمانی اصفہانی گھوسی ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے جونپور میں ملا محمود صاحب شمس بازغہ سے تکمیل کی فقہ و اصول اور کلام میں ممتاز تھے۔ تقویٰ و دیانت کے پیکر تھے۔ لکھنو میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں سنہ ۱۰۶۳ھ کو انتقال ہوا۔

مولانا محمد رضا مولانا عبدالقادر عمری کے بیٹے لکھنو میں پیدا ہوئے اپنے بھائی مولانا محمد وارث اور مولانا پیر محمد سے تحصیل کی اور ترک و تجرد اختیار کر کے برسوں ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہے پھر بغداد گئے وہاں سے حرمین کا سفر کیا وہاں سے بصرہ آئے۔ یہاں لوگوں کا ہر وقت ہجوم رہنے لگا تو گھبرا کے پھر مدینہ کا رُخ کیا وہاں مدتوں رہ کے لکھنو واپس آئے سنہ ۱۱۱۷ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا پیر محمد بن اولیاء جونپور کے ایک گاؤں اٹاوانی جو قصبہ منڈیاہو

ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کر کے لکھنوآئے اور مولانا عبدالقادر کے درس میں شریک ہوئے۔ اور اخذ طریقت مولانا پیر محمد سے کیا ان کے بعد درس وافادہ کی مسند پر بیٹھے۔

چوراس ضلع لکھنو مولانا شیخ دانیال مولانا شیخ زین العابدین کی اولاد میں تھے اور مولانا نصیرالدین اودھی چراغ دہلی کے بھانجے تھے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مفتی عبدالسلام دیوی سے علوم عقلیہ میں تکمیل کی اور طریقت میں شیخ سمی شاگرد شیخ نظام الدین امیٹھونی سے استفادہ کیا علم وعمل میں مشہور ہوئے۔ شیخ قطب الدین سہالوی وغیرہ نے زانوے تلمذ تہ کیا۔

مولانا سیف اللہ مولانا زین الدین کی ذریت میں تھے چوراس میں پیدا ہوئے وہیں نشو ونما پائی اور مفتی عبدالسلام دیوی کی خدمت میں حاضر ہو کے معقولات کی تکمیل کی اور شیخ جمال اولیاء سے طریقت میں استفادہ کیا اور علم کی بلندیوں تک پہنچے اور درس وتدریس سے خلق کثیر نے فائدہ حاصل کیا۔

امیٹھی ضلع لکھنو مولانا عبدالرزاق مولانا خاصہ کے بیٹے اور مولانا خضر صالحی کے پوتے امیٹھی میں پیدا ہوئے۔ مولانا نظام الدین امیٹھوی سے تحصیل علم کی پھر جونپور جاکے شیخ عبدالسلام قلندر سے طریقت میں مستفید ہو کر امیٹھی واپس آئے اور درس وتدریس شروع کی شیخ جعفر بن نظام الدین امیٹھوی اور قاضی حسین سرکھی ان کے شاگرد ہیں ۱۰۰۵ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا عبید اللہ مولانا عبدالرزاق کے بیٹے ۱۴ رمضان ۹۸۰ھ کو امیٹھی میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کی اور شیاخت کے درجہ پہنچے۔ ۹ر شعبان ۱۰۳۰ھ میں وفات ہوئی۔

مولانا علم اللہ مولانا عبدالرزاق کے صاحبزادے ۷ ارجمادی الاول ۹۵۲ھ کو امیٹھی میں پیدا ہوئے اور اپنے والد اور مولانا نظام الدین سے کسب علوم کرکے حجاز گئے وہاں اٹھارہ برس رہے فقہ و حدیث مشائخ عصر سے حاصل کرکے برہان پور واپس آئے عادل شاہ نے ان کو بہت اعزاز واحترام سے رکھا بہت کبر سنی میں دوبارہ حج کا ارادہ کیا اور واپس آکے ۱۰۲۲ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا عبدالرقیب مولانا جعفر کے صاحبزادے مولانا نظام الدین کے پوتے۔ اپنے والد سے اخذ علم کیا اور ان کے بعد ان کی مسند پر متمکن ہوئے ۱۰۸۹ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا جعفر مولانا نظام الدین صوفی کے صاحبزادے ۹۷۵ھ میں پیدا ہوئے۔ وہیں ابتدائی عمر تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد قاضی حسین سترکھی سے تکمیل کی خرقہ خلافت اپنے ماموں مولانا عبدالرزاق سے پہنا اور امیٹھی سے باہر موضع پرداس اقامت اختیار کی۔ جہانگیر نے صدر جہان بہانوی کی سفارش سے ان کو وہ گاؤں مدد معاش کے لئے دے دیا انہوں نے وہاں مسجد و مدرسہ اور طلبہ کی اقامت گاہ نہایت عالیشان بنوائی جس کے آثار اب تک باقی ہیں۔

صاحب نزہتہ الخواطر لکھتے ہیں کہ اہل بیعت علم و معرفت میں تھے قناعت و زہد و توکل میں خدا کی ظاہری ابت تھے۔ ان کی عجیب و غریب کراتیں مشہور ہیں ۱۰۴۵ھ کو موضع پرداس انتقال ہوا۔

مولانا محمد مولانا نظام الدین کے بیٹے مولانا جعفر کے بھائی اپنے والد سے طریقت و شریعت میں استفادہ کیا اور ان کے بعد ان کی مسند پر بیٹھے ۱۰۱۱ھ میں امیٹھی میں انتقال ہوا۔

مولانا ابو تراب عبدالرزاق مولانا خالد کے بیٹے امیٹھی میں پیدا ہوئے جوان ہو کر بیجا پور گئے وہاں اپنے بڑے بھائی مولانا علم اللہ سے علوم حاصل کئے اور امیٹھی واپس آکے درس و تدریس میں مشغول ہوئے اپنے زمانہ کے مشہور عالم تھے سنہ وفات معلوم نہیں۔

مولانا ابو سعید مولانا عبید اللہ کے بیٹے مولانا عبدالرزاق صامی کے پوتے مولانا ابو تراب کے بھتیجے امیٹھی میں ۱۰۰۰ھ پیدا ہوئے علمائے عصر سے علوم کی تحصیل کی اپنے وقت کے مشہور علماء میں تھے کریم النفس سخی عابد و زاہد صاحب درس و افادہ تھے ۱۰۶۱ھ کو محرم میں انتقال ہوا۔

مولانا ابو المجیب مولانا ابو سعید کے چھوٹے بھائی مولانا عبداللہ کے بیٹے ۱۰۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ مولانا نظام الدین عثمانی سے تحصیل علم کی اور ان کی صاحبزادی سے شادی کی ۱۰۳۴ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا ابو النجیب مولانا ابو المجیب اور ابو سعید کے بھائی اپنے والد سے تحصیل علم کی اور ان کے بعد ان کی مسند پر بیٹھے۔ ۱۰۸۱ھ میں انتقال ہوا۔

ستر کھ ضلع بارہ بنکی | مولانا حسین بن ابو الحسین مولانا عبدالرزاق امیٹھوی کے شاگرد طریقت میں بھی انہیں سے مستفید تھے۔ ایک مدت تک ان کی خدمت میں حاضر رہے ان کی صاحبزادی سے شادی ہوئی معقول و منقول میں علامہ عصر تھے مولانا جعفر ابن نظام الدین امیٹھوی ان کے شاگرد تھے۔

دیوہ ضلع بارہ بنکی | مولانا عبدالسلام بن مولانا مجیب اللہ مولانا احمد العباس کے پوتے دیوہ میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی اور وہیں تحصیل علم کر کے لاہور جا کے مفتی عبدالسلام لاہوری شاگرد میر فتح اللہ شیرازی سے

معقولات میں تبحر حاصل کیا۔ نہایت ذکی و ذہن جامع معقول و منقول و فقہ و اصول تھے۔ شمالی ہند میں استاذالکل کا درجہ رکھتے تھے۔ اس اطراف میں علوم و عقلیہ کو معراج انہیں کی بدولت ہوئی انہیں کے شاگردوں نے ان کے بعد ان علوم کو پھیلایا ان کی شہرت سُن کے شاہجہاں نے فوج کا مفتی مقرر کیا ایک مدت کے بعد معزول ہوئے اور لاہور میں سکونت اختیار کی مولا عبدالعلی فرنگی محلی نے رسالہ قطبیہ میں ان کی معزولی کی وجہ یہ لکھی ہے کہ وہ مختارات فقہا کے خلاف فتوی دیتے تھے مصنفات حاشیہ خیالی ۔ شرح عقائد۔ شرح منار ۔حاشیہ تفسیر بیضاوی شرح صحائف حاشیہ ہدایہ حاشیہ شرح تہذیب حاشیہ تلویح

بادشاہ نامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۰۴۷ھ تک زندہ تھے۔

ردولی ضلع بارہ بنکی مولانا ابوالقاسم شریعت میں حنفی طریقت میں چشتی وحدت وجود کے قائل تھے۔ علم وفضل میں شہرت رکھتے تھے دور دور سے تشنگان علوم سیراب ہونے آتے تھے فقرا بمنس زاہد و متوکل تھے۔

مولانا حمید الدین ابن قطب الدین عمری چشتی ردولی میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل کی اور علم وفضل میں شہرت حاصل کی اپنے والد کے بعد مسند ارشاد پر متمکن ہوئے۔

خیرآباد ضلع سیتاپور مولانا ابوالفتح مولانا نظام الدین چشتی کے صاحبزادے خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ اور اپنے والد سے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کر کے مولانا حاتم سنبھلی کے درس میں حاضر ہوئے اور وطن واپس آ کے ایک مدت تک درس و تدریس میں مشغول رہے اپنے والد کے بعد ان کی مسند پر بیٹھے بہت وجیہہ حسین تھے علم و فضل کا شہرہ تھا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ علوم و معارف میں

میں وحید روزگار تھے ان کی تصنیفات ان کی غزارت علم کا اور وسعت اطلاع کی شاہد ہیں اپنے والد کے انتقال کے بعد اٹھارہ سال تک زندہ رہے اور اپنے والد کے عرس میں حالت وجد میں انتقال ہوا۔ ایک مغنی نے یہ شعر پڑھا ؎

جان بجانان دہ وگرنہ تو بستاند اجل
خود تو منصف باش اے دل ان نکو یا این نکو

انہوں نے ان نکو ان نکو کئی دفعہ کہا اور مرگئے یہ واقعہ ۱۰۹۰ھ کا ہے قبر خیرآباد میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

مولانا رکن الدین مولانا نصیر الدین کے بیٹے مولانا نظام الدین کے بھیجے اپنے چچا سے علم ظاہر و باطن کی تحصیل کی انہیں سے خرقہ ملا۔ ایک مدت تک درس و تدریس میں مشغول رہے ان کے بعد بلگرام گئے وہاں بھی خلق کثیر کو درس دیا سنہ ۱۰۸۰ھ تک زندہ تھے۔

مولانا عبداللہ مولانا ابوالفتح کے صاحبزادے خیرآباد میں پیدا ہوئے وہیں اپنے والد سے تحصیل علم کی اور درس و تدریس میں شہرت حاصل کی۔

مولانا عبدالوالی مولانا ابوالفتح کے بیٹے خیرآباد میں تعلیم حاصل کر کے مختلف شہروں کے اساتذہ سے علم حاصل کیا اور طریقت میں اپنے والد کے دوست شیخ حبیب احد سے فیض حاصل کیا اور مسند ارشاد کو رونق بخشی اللہ نے ان کو کئی اولادیں عطا کیں جو خود عالم اور ان کی اولادیں بھی عالم ہوئیں۔

لاہرپور۔ مولانا مجتبیٰ عرف مُجا مولانا مصطفیٰ عباسی کے بیٹے لاہرپور میں پیدا ہوئے وہیں سن شعور کو پہنچے اس کے بعد لکھنؤ آکے مولانا عبدالقادر کے درس میں شریک ہوئے پھر جونپور جا کے شیخ عبدالقدوس سے طریقت میں فیض حاصل

کرکے وطن واپس آئے اور مجلس درس آراستہ کی شیخ عبدالرسول کھیموی اور سب سے علمائے فیض حاصل کیا۔ ۱۵ ربیع الثانی ۱۰۸۱ھ میں وفات پائی۔

ہرگام | مولانا مفتی اسمٰعیل بن خضر علوی حسینی ہرگام میں ۹۵۹ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد اور دوسرے علمائے تحصیل کی اور طریقت میں مولانا عبدالسمیع لاہر پوری سے بیعت کی جو ان کے ماموں تھے شیخ عبدالقدوس جونپوری نے بھی فیض حاصل کیا۔ فقہ و اصول و عربیت میں ان کا شہرہ تھا ہرگام کے مفتی مقرر ہوئے تا عمر عبادت و ریاضت میں شدت سے منہمک رہے ۱۰۳۰ھ میں انتقال ہوا ہرگام کے قریب اسمٰعیل پور گاؤں میں دفن ہوئے۔

مولانا اسداللّٰہ مولانا اسمٰعیل کے بیٹے ۹۹۵ھ میں پیدا ہوئے اپنے والد سے علوم حاصل کیے طریقت میں اپنے والد کے شیخ مولانا عبدالسمیع سے فیضیاب ہوئے۔ ساری عمر درس و تدریس میں گذاری ۱۰۶۱ھ کو ہرگام میں انتقال ہوا۔

مولانا ابو واعظ مولانا صدرالدین کے بیٹے مولانا اسمٰعیل کے پوتے قاضی عمادالدین بدایونی کے پروتے ہرگام میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی اور وہیں علوم متداولہ کی تکمیل کی اور مدت تک درس دیتے رہے۔ فتاوائے ہندیہ ان کے فتاوی کی کتاب ہے۔

گنگوہ | مولانا ابو سعید مولانا نورالدین کے بیٹے اور عبدالقدوس گنگوہی کے نواسے ردولی ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے گنگوہ میں پیدا ہوئے اپنے والد کے زیر سایہ پروان چڑھے طریقت میں شیخ نظام الدین تھانیسری سے استفادہ کیا اور گنگوہ مجلس ارشاد آراستہ کی شیخ محب اللّٰہ الہ آبادی وغیرہ نے ان سے استفادہ کیا ۱۰۴۹ھ انتقال ہوا۔

مولانا داؤد بن صادق گنگوہ میں پیدا ہوئے اپنے والد کی تربیت میں کمال علمی تک پہنچے ان کے بعد ان کی مسند پہ بیٹھے علم و معرفت کے ساتھ صاحب وجد وحال تھے ۱۰۹۵ھ میں انتقال ہوا۔

پہانی مولانا صدر جہان بن عبدالقادر پہانی میں پیدا ہوئے وہیں نشوونما پائی اور علم حاصل کیا پھر خیرآباد جاکے مولانا نظام الدین سے پڑھا۔ سند حدیث شیخ عبدالنبی گنگوہی سے حاصل کی انہیں کی سفارش سے توران میں فوج کے مفتی مقرر ہوتے ۹۹۲ھ میں سفارت پر ہندوستان آئے۔ یہاں صدارت پیش کی گئی جسے انہوں نے قبول کر لیا اور توران واپس نہیں گئے جہانگیر نے ان کو اپنا مقرب بنالیا اور چالیس حدیثیں حفظ کیں منصب میں اضافہ کیا جو چار ہزار تک پہنچ گیا جہانگیر کی دی ہوئی معافی اطراف قنوج میں بھی پچاس سال تک انہوں نے صدارت کی سو برس تک صحت و سلامت حواس کے ساتھ زندہ رہے۔ بدایونی نے لکھا ہے کہ عالم شاعر اور ظریف بھی تھے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

ہر تار زلف یار الٰہی بلا شود ؛ و آنگہ بہر بلا دل ما مبتلا شود

۱۰۲۰ھ میں انتقال ہوا پہانی میں دفن ہوئے۔

گوپامؤ ضلع ہردوئی مولانا آدم بن محمد شہاب الدین سہروردی کی اولاد میں تھے اس وجہ سے شہابی لکھتے تھے ۹۱۱ھ میں گوپامؤ میں پیدا ہوتے ابتدائی تعلیم سے حاصل کرکے جونپور گئے وہاں مولانا عبدالواسع چشتی سے علوم ظاہری و باطنی حاصل کئے اور گوپامؤ کے قاضی مقرر ہوتے جہاں انہوں نے درس کا سلسلہ بھی شروع کیا ۹۳۰ھ میں بابر نے ایک گاؤں مدد معاش کے لئے دیا اس وقت ان کی عمر ۳۰ سال کی تھی اور فقہائے حنفیہ میں شمار تھا۔ ۱۰۰۱ھ میں

میں انتقال ہوا

مولانا عیسیٰ مولانا آدم کے بیٹے مولانا نظام الدین خیرآبادی کے نواسے ۹۶۰ھ میں گوپامئو میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سے علوم حاصل کئے اسکے بعد شیخ نظام الدین امیٹھوی کے درس میں حاضر ہوکے تکمیل علوم کے بعد گوپامئو کے قاضی مقرر ہوئے شیخ جعفر بن نظام الدین کی صاحبزادی سے شادی کی ان سے تین بیٹے ہوئے اور تینوں عالم ہوئے ۱۰۲۲ھ کو انتقال ہوا۔

مولانا وجیہہ الدین مولانا عیسیٰ کے بیٹے مولانا جعفر امیٹھوی کے نواسے ۱۰۰۵ھ کو گوپامئو میں پیدا ہوئے اپنے دادا شیخ جعفر سے تحصیل علم کی اور دوسرے علماء سے بھی پڑھا اور گوپامئو کے مفتی مقرر ہوئے۔ کثیر الدرس تھے۔ بہت سے علماء نے ان سے فیض حاصل کیا۔

تصنیفات: شرح حص حصین۔ تعلیقات علی الخیالی۔ تعلیقات علی المطول رسائل فی التصوف ۱۰۸۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا عبدالوہاب گوپامئو میں پیدا ہوئے شیخ نظام الدین امیٹھوی سے تکمیل علم کی ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہ کے اخذ طریقت کیا اور علم و عمل میں شہرت حاصل کی۔

بلگرام ضلع ہردوئی | مولانا الہ داد محمد بن ابی بکر کی کونسل میں تھے بلگرام میں پیدا ہوئے وہیں جوانی تک رہے اور تعلیم حاصل کی اس کے بعد شیخ عبدالرحمٰن لاہرپوری کی خدمت میں حاضر ہو کے فقہ و اصول میں تجر حاصل کیا۔ اور بلگرام واپس آکے درس و تدریس میں مشغول ہوئے اور وہیں کے قاضی مقرر کئے گئے۔

مولانا بایزید ابن کمال چشتی فقہ حنفی میں اس کا تجر مسلم تھا عالم یزودی

کہے جاتے تھے سید محمد اشرف بلگرامی کا بیان ہے کہ میں نے اکابر خاندان سے سُنا کہ قاضی بایزید کا مثل ان کے زمانہ میں نہ تھا۔

مولانا سید حسن بن نوح فقہ کے مشہور عالم تھے قدوری پر ان کا حاشیہ بھی ہے سنہ ۱۰۸۰ھ تک زندہ تھے۔

مولانا سید حسین بن نوح اپنے والد اور بھائی کی طرح فقہ میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے کتابت و عبادت میں مشغول رہتے تھے گوشہ نشین آدمی تھے سنہ ۱۰۸۰ھ تک زندہ تھے۔

مولانا احمد بن عبدالمطلب حسینی واسطی اپنے چچا عبداللہ کے بیٹے مشہور تھے کیونکہ انہوں نے پرورش کیا تھا اس حق کے پیش نظر انہوں نے بھی اپنی انگوٹھی کا نقش احمد بن عبداللہ رکھا اعلیٰ درجہ کے خطاط بھی تھے نماز اشراق کے بعد کتابت کی مشق عمر بھر جاری رہی۔ حساب میں بھی بے نظیر تھے حکومت کے مختلف عہدوں پر مامور رہے سنہ ۱۰۹۶ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا اسمٰعیل قطب عالم حسینی واسطی کے بیٹے بلگرام میں پیدا ہوئے وہیں نشوونما پائی اور تحصیل علم کی اس کے بعد مفتی عبدالسلام دیوی اور عبدالحکیم سیالکوٹی سے تکمیل علوم کی معقول و منقول فقہ و اصول ادب و شعر میں وحید عصر و فرید تھے۔ مولانا عبدالجلیل بلگرامی نے تبصرۃ الناظرین میں لکھا ہے کہ یہ پہلے شخص ہیں جو بلگرام میں شیعہ ہوئے سنہ ۱۰۰۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا سید حسین بن ابراہیم ابن نظام الدین حسینی واسطی بلگرام میں پیدا ہوئے وہیں پرورش پائی اور علم حاصل کیا۔ پھر دہلی جا کے شیخ عبدالعزیز ابن حسن دہلوی سے طریقت میں فیض حاصل کیا اور مشیخت کے درجہ پہ پہنچے دہلی میں برسوں درس

دیا پھر بلگرام واپس آئے اپنے وقت کے مشہور مشائخ میں تھے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ان کا قول تھا کہ سادات امام حسین علیہ السلام کی اولاد ہیں یہ مغفور اور مبشر بالجنۃ ہیں ان کی بہت تعظیم کرتے تھے اور اس کا اعلان کرتے رہتے تھے۔مولانا غلام علی آزاد نے مآثر الکرام میں لکھا ہے کہ یہی مذہب شیخ محی الدین بن عربی کا بھی تھا اور ابن حجر مکی نے صواعق میں اسے نقل کیا ہے یہی مذہب قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا تھا۔انہوں نے اس موضوع پر ایک مخصوص رسالہ مناقب السادات لکھا ہے ۱۰۰۰ھ میں انتقال ہوا

مولانا رفیع الدین مولانا بدر الدین کے بیٹے اور مولانا رفیع الدین کے پوتے بلگرام میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کر کے اساتذہ عصر سے تکمیل علوم کی اور بلگرام واپس آکے درس میں مشغول ہوئے اور کمالات علمیہ میں شہرت حاصل کی بہت اچھے خطاط بھی تھے۔بہت سی کتابیں نہایت خوشخط مفید حواشی کے ساتھ لکھیں آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ میں نے مطول اور تلویح وغیرہ ان کی لکھی ہوئی دیکھی ہیں جو نہایت مفید حواشی کے ساتھ ہیں جمعہ کے دن ۸ ربیع الاول ۹۹۹ھ کو انتقال فرمایا۔

مولانا طیب بن عبدالواحد حسینی ۹۸۶ھ میں بلگرام میں پیدا ہوئے اپنے والد سے علوم حاصل کئے آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں لکھا ہے کہ وہ دہلی بھی گئے تھے اور شیخ عبدالحق بن سیف الدین بخاری سے مستفید ہوئے۔شریف بلگرامی نے مآثر المبتدئین میں لکھا ہے کہ وہ کثرت عبادت میں امام زین العابدین علیہ السلام کی تاسی کرتے تھے مدت عمر میں کوئی نماز قضا نہیں ہوئی جب میں آئمہ اور سلف صالحین کو دیکھنا چاہتا تھا تو اُن کو دیکھتا تھا ایسے ہی لوگوں کی برکت

سے زمین و آسمان قائم ہیں۔ پانچویں ربیع الاول ۱۰۶۶ھ کو انتقال ہوا۔

مولانا عبدالحیؒ مولانا ابوالفتح کے صاحبزادے بلگرام میں پیدا ہوئے وہیں اپنے والد اور دوسرے علماء سے تحصیل علم کی اور فقہ و اصول و ادب میں شہرت حاصل کی اپنے والد کے قائمقام ہوئے خلاصۃ الفقہ ایک رسالہ بھی لکھا۔

مولانا عبدالواحد بن ابراہیم سانڈی میں پیدا ہوئے اخذ طریقت شیخ عبدالصمد سائینپوری اور شیخ محمد حسین سکندر پوری سے کیا قنوج میں بہت دن تک رہے اس وجہ سے قنوجی کہے جاتے ہیں آخر عمر میں بلگرام آئے وہیں شادی کی وہیں وفات ہوئی۔

مصنفات: شرح قصہ الاخوۃ الاربعہ۔ شرح مصطلحات دیوان حافظ اور سبع سنابل ان کی مشہور تصنیفیں ہیں لیکن ایک انوکھی کتاب شرح کافیہ ہے بحث غیر منصرف تک یہ تصوف کی زبان میں ہے۔ بڑے صاحب فضیلت بزرگ صاحب کشف و کرامات تھے بدایونی نے منتخب التواریخ اور علاء الدولہ قزوینی نے نفائس المآثر محمد حسین منڈوی نے گلزار ابرار آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں ان کا ذکر کیا ہے اور تعریف کیا ہے۔ شب جمعہ ۳ رمضان ۱۰۱۷ھ کو انتقال ہوا۔

مولانا عنایۃ اللہ مولانا الہ داد کے بیٹے بلگرام میں پیدا ہوئے وہیں نشوونما پائی۔ اپنے والد سے علم حاصل کیا اور ان کے بعد بلگرام کے مفتی مقرر ہوئے

مولانا فیروز بن مولانا عبدالواحد بلگرام میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کی اور شریعت و طریقت میں درجہ کمال تک پہنچے اپنے والد کے بعد مسند مشیخت پر متمکن ہوئے درس و تدریس کے علاوہ فقراء کی خدمت بھی کرتے تھے چار سو لڑکیوں کی شادیاں کیں اور سب کو اچھا جہیز دیا سو برس زندہ رہے ۱۰۶۶ھ

میں انتقال ہوا۔

مولانا یحییٰ مولانا عبدالواحد کے بیٹے بلگرام میں پیدا ہوئے وہیں علوم وفنون میں ملکہ حاصل کیا اور درس وتدریس میں ناموری پیدا کی۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ انسانی شکل میں فرشتہ تھے۔ زہد وتوکل وقناعت میں مثل نہ تھا۔ میزان الاعمال ومعیار الاحوال سلوک میں ان کی تصنیف ہے بلگرام میں اپنے والد کے قریب دفن ہیں۔

مولانا یوسف مولانا ابوالمکارم کے صاحبزادے بلگرام میں علم حاصل کرنے کے بعد قاضی محب اللہ الہ آبادی سے تکمیل کی اور انھیں سے طریقت میں فیض حاصل کیا اپنے والد کے بعد بلگرام کے قاضی مقرر ہوئے ان کے مصنفات میں دو رسالے ہیں ایک عربی میں دوسرا فارسی میں دارا شکوہ کے سولہ سوالوں کے جواب میں جو اس نے قاضی محب اللہ سے کئے تھے ان کے حکم سے انہوں نے جواب لکھے اور ہدیہ سلطانیہ کا نام رکھا۔ ۵ ذی قعدہ ۱۰۸۰ھ کو بلگرام میں وفات ہوئی۔

کوڑہ **مولانا جمال اولیا** مشہور ولی مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے صاحبزادے کوڑہ جہاں آباد میں ۹۳۷ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سے فقہ واصول میں تبحر حاصل کرکے اودھ آئے قاضی ضیاء الدین نیوتنوی کی خدمت اخذ طریقت کیا اور رتبہ ارشاد پر پہنچ کے اجازت حاصل کرکے کوڑہ واپس آئے اور درس وتدریس میں مشغول ہوئے فقہ واصول وادب میں شہرہ تھا۔ شیخ رشید جونپوری ان کے شاگرد تھے ۱۰۴۷ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا لطف اللہ مولانا جمال اولیا کے شاگرد تمام علوم میں تبحر حاصل تھا مولانا ابوسعید امیٹھوی قاضی علم اللہ کجندی وغیرہ ان کے تلامذہ میں ہیں۔

مولانا مخدوم الدین بن مولانا شاہ الدین کوڑہ میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کی اور مشائخ چشتیہ میں شمار ہوئے اپنے والد اور دادا کے حالات میں ایک کتاب اسرار سالاری لکھی۔

کڑہ | مولانا یونس بن ابو یونس اپنے وقت کے مشہور عالم فقہ و حدیث فنون عربیہ میں مشہور زہد و قناعت اور اتباع سنت میں بڑا درجہ رکھتے تھے۔

مانکپور | مولانا احمد بن مجتبیٰ رضوی احمد حلیم مشہور تھے مانکپور میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کی۔ طریقت میں بھی انہیں سے فیض حاصل کیا مشائخ چشتیہ میں صاحب کرامات بزرگ تھے ۱۵ رجمادی الاول سنہ ۱۰۴۰ھ کو انتقال ہوا۔

مولانا صدر جہاں بن ابو الفتح مانکپور سے متصل ہولی (گاؤں) کے رہنے والے تھے۔ وہیں پیدا ہوئے جوانی میں حج و زیارت کے مشتاق ہو کے گھر سے نکلے اور دھار (مالوہ کا شہر) پہنچے وہاں مولانا عزیز الدھاروی سے ملاقات ہوئی ان کی خدمت میں برسوں رہ کے استفادہ کیا اس عرصہ میں مولانا دھاروی حج کے لئے گئے تو اپنے بیٹے تاج الدین کی تربیت میں ان کو دیتے گئے انہوں نے ان کو علم و تربیت سے آراستہ کیا۔ مولانا کا مدینہ میں انتقال ہو گیا تو یہ برہان پور چلے آئے وہاں شیخ عیسیٰ کی خدمت میں مدتوں رہ کے وطن واپس آئے مگر ہر سال ان کی زیارت کو جاتے تھے۔ ۱۷ ربیع الاول سنہ ۱۰۱۱ھ کو انتقال ہوا۔

مولانا عبد الکریم مانکپور میں پیدا ہوئے وہیں نشوونما پائی اور اپنے بھائی مولانا عبد اللہ سے علوم حاصل کئے جب ان کا انتقال ہو گیا تو یہ مانکپور سے نکلے سات دفعہ حج کیا اور ہندوستان واپس آئے۔ بنگال میں انتقال ہو گیا جسد مانکپور میں دفن کیا۔ ۱۵ صفر ۱۰۵۷ھ کو انتقال کیا۔

مولانا عبداللہ بن سلطان مانکپور میں پیدا ہوئے وہیں اپنے والد کی زیر تربیت علوم میں ملکہ حاصل کیا اور ان کے بعد مسند شیاخت پر متمکن ہوئے اپنے وقت کے جلیل القدر علماء میں تھے۔ صاحب کشف کرامات تھے سنہ ... میں انتقال ہوا

الہ آباد | مولانا محب اللہ بن مبارز صدرپور مضافات خیرآباد کے رہنے والے سنہ ۹۹۶ھ کو صدرپور میں پیدا ہوئے۔ یہیں جوان ہوئے اور تحصیل علم کی اس کے بعد لاہور جاکے مفتی عبدالسلام کے درس میں حاضر ہوئے میر سائیں بخش سیوستانی اور سعداللہ خان ان کے ہم درس تھے جب سعداللہ خان وزیر ہوگئے تو انہوں نے دونوں کو دہلی بلایا مگر میر محمد سائیں بخش نے زہد و ترک دنیا کی وجہ سے کوئی جواب نہیں دیا۔ مولانا محب اللہ پہنچ گئے ان کو الہ آباد کی نظامت دیکے رخصت کیا اس وقت انہوں نے الہ آباد میں قیام کیا اور الہ آبادی کہے جانے لگے مولانا اپنے وقت کے کبار مشائخ میں تھے اور علم و فضل میں استاد انکل تھے۔

مصنفات: شرح فصوص الحکم عربی اور فارسی میں۔ انفاس الخواص۔ مناظر اخص الخواص۔ ہیفت احکام سہ رکنی۔ کتاب المبین حکمۃ الیہ میں بحث وجود مطلق۔ شرح تسویہ۔ تسویہ وغیرہ رجب سنہ ۱۰۵۸ھ الہ آباد میں وفات ہوئی۔

مولانا صدرالدین بن مولانا داؤد حنفی چشتی قاضی گھاسی کے نام مشہور تھے۔ شیخ محب اللہ کے شاگرد اور انہیں سے بیعت تھے زندگی بھر ان کی خدمت میں رہے۔ ان کے بعد ان کی مسند شیاخت پر بیٹھے ملا قطب الدین سہالوی کے شاگرد ہیں ان اطراف میں معقولات کے مسلم استاد تھے عالمگیر کے زمانہ میں وفات ہوئی

مولانا صدرالدین بن حبیب اللہ اساتذہ جونپور سے انہوں نے علم حاصل کیا اور منطق و فلسفہ میں یکتائے روزگار ہوئے۔

مولانا عبدالعزیز مولانا محب اللہ کے خالہ زاد بھائی تھے انہیں کی خدمت علوم حاصل کئے۔

مولانا علی اکبر حسینی حنفی فقہ و اصول اور ادب میں بڑا درجہ رکھتے تھے سعد اللہ خان وزیر عالمگیر کے مقربین میں تھے ایک مدت تک اس کے بیٹے لطف اللہ کے معلم رہے اس کے بعد عالمگیر کا تقرب حاصل ہوا۔ اس نے ان کو شاہزادہ اعظم کا معلم مقرر کیا جب اس کو علوم دینیہ میں ان کا تبحر معلوم ہوا تو لاہور کا مفتی مقرر کیا جہاں وہ مدت العمر اس عہدے پر رہے ان کی دیانت اور انصاف میں شدت نے لوگوں پر ان کی ہیبت طاری کر رکھی تھی امراء ان سے عاجز تھے مگر عالمگیری دبدبے سے کچھ نہ کر سکتے تھے جب میر قوام الدین اصفہانی لاہور کے صوبیدار ہوئے تو انہوں نے نظام الدین کوتوال کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک آدمی بھیج کے ان کو اور ان کے بھانجے سید فاضل کو قتل کرا دیا جب عالمگیر کو معلوم ہوا تو انھوں نے صوبیدار کو معزول کر دیا اور کوتوال کو قاضی کے ورثاء کے سپرد کر دیا کہ وہ اس سے قصاص لیں اور صوبیدار کو قاضی شیخ الاسلام نستی کے حوالہ کیا کہ وہ شریعت کے موافق فیصلہ کریں مگر ورثائے قاضی اکبر علی نے معاف کر دیا۔ مصنفات میں فصول اکبری صرف میں انہیں کی لکھی ہوئی ہے جو آج تک درس میں داخل ہے اس کی ایک شرح بھی اصول اکبری کے نام سے لکھی تھی۔

مولانا محمد آصف صدر پور کے رہنے والے مفتی عبدالسلام دیوی کے شاگرد۔ الہ آباد کے قاضی تھے اپنے وقت کے مشہور عالم تھے شیخ محمد افضل اور مولانا عبدالرحمن عباسی کے استاد تفسیر بیضاوی پر نہایت مفید تعلیقات و حواشی لکھے ہیں۔

مولانا محمد شریف فقہ واصول وادب میں بڑا درجہ رکھتے تھے شیخ محمد یحییٰ عباسی نے وفیات الاعلام میں لکھا ہے کہ وہ علم وعمل صلاح وتقویٰ حسن خلق اور دین میں سختی کا پیکر تھے حق کہنے میں ذرا نہیں جھجکتے تھے خواہ وہ بادشاہ جابر ہی کیوں نہ ہو۔ الہ آباد میں مفتی تھے اور وہیں ۱۰۲۹ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

جھونسی ضلع الہ آباد مولانا تاج الدین بن منہاج الدین اپنے چچا نصیر الدین سے تحصیل علم کی۔ پھر جونپور آئے اور شیخ نور اللہ ابن طٰہٰ انصاری اور حاجی محمد سے طب پڑھی اور اس فن میں کئی رسالے لکھے معالجات میں بھی ید طولیٰ فاضل تھا فقہ اصول سلوک اور طب میں بے نظیر اور نحو میں یکتا صاحب کشف وکرامات تھے۔ ۱۴ ذی الحجہ جمعرات ۱۰۳۰ھ کو رحلت فرمائی۔

مولانا خواجہ کلاں بن نصیر الدین اپنے والد سے تحصیل علم کی پھر جونپور جاکے قاضی پیارے سے کتب درسیہ پڑھیں پانچ برس جونپور میں رہ کے وطن واپس ہوئے اور تھوڑے دن رہ کے شاہ پور گئے وہاں کے علماء سے درس لیا پھر اپنے والد کی خدمت میں حاضر ہو کے مجاہدہ نفس میں مشغول ہو گئے راتوں کو عبادت کرتے تھے دن کو روزہ رکھتے اور اوراد وظائف میں مشغول رہتے تھے بڑے مرتبہ کے بزرگ تھے۔ اپنے والد کے بعد مسند ارشاد پر متمکن ہوئے تاج الدین بن فرید الدین بنارسی ان کے شاگرد تھے ۱۰۴۰ھ میں انتقال ہوا۔

رائے بریلی مولانا ابو حنیفہ مولانا علم اللہ حسینی کے صاحبزادے نصیر آباد ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے اپنے والد کے ساتھ ہجرت کرکے رائے بریلی میں قیام کیا وہاں ۱۲۰۰ھ سے اپنے والد کے ساتھ حجاز گئے وہاں سے واپس آکے رائے بریلی میں مسند درس بچھائی تفقہ اور صلاح وتقویٰ میں اپنے والد کے قدم بقدم

تھے ان کی زندگی میں انتقال ہوا۔

سلون ضلع رائے بریلی مولانا پیر محمد مولانا عبدالنبی کے بیٹے مولانا ابوالفتح کے پوتے مولانا الہداد جونپوری کے پیروتے مولانا کے اجداد جونپور سے رائے بریلی سلون چلے آئے تھے۔ وہیں مولانا پیر محمد ۹۹۶ھ کو پیدا ہوئے تحصیل علم مولانا عبدالکریم مانکپوری سے کی اور وطن واپس آکے درس وتدریس شروع کی اور شہرت ہوئی عالمگیر نے دو گاں ان کو معافی میں دیئے جو اب تک ان کی اولاد کے پاس ہیں۔ ۱۰۸۰ھ میں انتقال ہوا۔

نصیرآباد ضلع رائے بریلی مولانا احمد بن اسحٰق نصیرآباد میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی پھر الہ آباد جاکے شیخ محب اللہ سے تکمیل کر کے وطن واپس آئے اور درس وتدریس میں ایک مدت تک مشغول رہنے کے بعد تصوف کی طرف مائل ہوئے اور گوالیار جاکے شیخ آدم اسمٰعیل جونپوری کی خدمت میں حاضر ہو کے استفادہ کیا۔ انہوں نے اپنا خلیفہ بنایا اور اب درس کے جگہ عبادت وریاضت میں مشغول ہو گئے۔ تصنیفات میں کئی کتابیں ہیں ان میں رسالہ حرمت غنا ہے ۱۰۸۰ھ میں نصیرآباد میں وفات ہوئی۔

مولانا فضل بن معظم نصیرآباد میں پیدا ہوتے وہیں تحصیل علم کی نہایت مقدس بزرگ تھے۔ مزدوری کرتے یہاں تک کہ لکڑیاں چن کے بیچتے تھے شان و شوکت ظاہری سے نفرت تھی صلہ رحم واعانت اپنی محنت کی کمائی سے کرتے تھے آخر میں ہجرت کر کے حرمین چلے گئے وہیں ۱۰۳۲ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا عبدالعزیز مولانا فتح عالم حسینی کے بیٹے شیخ الاسلام قطب العلوم کڑوی کی ذریت میں تھے نصیرآباد میں پیدا ہوئے وہیں علم حاصل کیا اور

افتا کی مسند پر بیٹھے کچھ دنوں کے بعد وہیں کے قاضی مقرر ہوئے۔ شاہجہاں کے دور میں وہ مولانا علم اللہ ماموں تھے۔

مولانا ہدایت اللہ بن مولانا معظم اسحق نصیر آباد میں پیدا ہوئے اور اپنے بڑے بھائی مولانا اسحق سے تحصیل علم کی فقہ واصول وادب میں شہرت حاصل کی

مولانا محمد مولانا عبدالعزیز کے صاحبزادے قاضی پیر علی کے نام سے مشہور تھے۔ نصیر آباد میں پیدا ہوئے وہیں اپنے والد سے تحصیل علم کی اور تفقہ میں شہرت حاصل کی نصیر آباد کے قاضی مقرر ہوئے اور تاعمر اس عہدہ پر فائز رہے

مولانا علم اللہ مولانا فضل کے بیٹے مولانا معظم کے پوتے ۱۰۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ولادت سے پہلے ان کے والد حجاز چلے گئے وہیں ان کا انتقال ہوگیا ماموں مولانا ابو محمد نے پرورش کی اور حجی خواجہ احمد سے تعلیم حاصل کی پھر اپنے ماموں کے ساتھ طلب معاش میں دہلی گئے وہاں دونوں مدتوں سرگرداں رہے اکثر لکڑی کا گٹھا سر پر اٹھا کے بیچتے تھے۔ بہت دنوں کے بعد شیخ آدم جونپوری کی خدمت میں پہنچے اور ایک مدت تک ان سے اخذ طریقت کیا صاحب کشف وکرامات تھے۔ خزینۃ الاصفیا میں لکھا ہے کہ مولانا عبدالحکیم سالکوٹی فرماتے تھے کہ مولانا علم اللہ نصیر آبادی نے مجھے ایک روپیہ دیا تھا اسے میں نے ایک تھیلی میں رکھدیا جب تک وہ روپیہ میرا رہا میری تھیلی کبھی خالی نہیں ہوئی ۹ ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ میں انتقال ہوا۔

مصنفات من العطیات اور عنایۃ الہادی دو کتابیں ہیں۔

جائس ضلع رائے بریلی | مولانا سید عبدالقادر سید نجم الدین فاتح جائس کی اولاد میں تھے بڑے عالم وفاضل شخص تھے اورنگ زیب ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ بہادر شاہ اول کے استاد اور اتالیق تھے۔ اورنگ نے ان کو

رائے بریلی کی تحصیل سلون میں اور دلمؤ سات لاکھ سالانہ کی جاگیر عطا کی تھی[1]

مولانا محمد امین فاتح جائس کی اولاد میں اپنے وقت کے علامہ تھے اورنگ زیب نے ان کو قاضی مقرر کیا تھا اور تا عمر اسی عہدہ پر قائم رہے[2]

جونپور | مولانا ابوالبقا مولانا درویش محمد کے بیٹے جونپور میں پیدا ہوئے مولانا محمد ماہ دیوگامی سے تحصیل علم کی علم و فضل ذکاوت و ذہانت قوت حافظہ اور شیرینی کلام میں مشہور تھے جونپور کے مفتی مقرر ہوئے۔ مصنفات میں اعراب القرآن دس جلدوں میں لکھی۔ حاشیہ شرح جامی اور حاشیہ شمسیہ بھی ان کی گرانقدر تصنیفین میں ۱۰۴۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا خوب اللہ مولانا حفیظ اللہ کے پوتے جونپور میں پیدا ہوئے وہیں کے علماء سے علوم حاصل کئے حدیث اور ادب میں شہرہ آفاق تھے۔ ایک ہزار آٹھ سو اخبار مرفوعہ کے متون یاد تھے الٰہ آباد کے قاضی مقرر ہوئے۔ مولانا شاعر بھی تھے حقہ کے متعلق ان کے دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

تماکو گرچہ ہست زبانکار کے بسے ∴ زو فائدہ ہیچ کس نہ دانست کے
اجر یہ ازیں چہ خوب باشد کہ ترا ∴ خاموش کند ز ہرزہ گفتن لختے

۱۴ شعبان ۱۰۰۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا ثناء اللہ بن ہدایۃ اللہ جونپور میں پیدا ہوئے وہیں علوم حاصل کئے اور جونپور کے قاضی مقرر ہوئے سات شوال ۱۰۲۳ھ میں وفات پائی بازار الف خان میں قبر ہے۔

---

[1] [2] بہار نبی مرتبہ سید آل محمد بجائس قلمی

مولانا نور محمد بن نصیر الدین ۱۶ رجمادی الاول جمعہ کے دن ۹۷۵ھ کو پیدا ہوئے سن رشد کو پہنچ کے اپنے والد اور دوسرے علمائے سے تحقیل علم کی قرآۃ و تجوید میں شہرۂ آفاق تھے اس وجہ سے مسجد میں خطابت انہیں کے ذمہ تھی فرقہ مداریہ کے شیوخ میں تھے رجب کے مہینہ میں ۱۰۵۹ھ کو وفات ہوئی

مولانا شمس الدین مولانا نور الدین کے صاحبزادے موضع برونامیں پیدا ہوئے اپنے وقت کے علامہ تھے اکبر نے ان کو شہزادہ پرویز کا معلم مقرر کیا ایک مدت کے بعد جونپور کے قاضی مقرر ہوئے ملا محمود جونپوری اور شیخ محمد رشید ان کے تلامذہ میں ۱۰۲۱ھ انتقال ہوا۔

مولانا شمس الدین مولانا محمد ماہ کے بھائی شیخ محمد افضل عثمانی کے شاگرد علامہ عصر و وحید دہر تھے عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہے۔

مولانا عبد الجلیل مولانا شمس الدین کے بیٹے مولانا نور الدین کے پوتے اپنے والد اور ملا محمود جونپوری اور شیخ محمد رشید سے علوم حاصل کئے طریقت میں مولانا عبد الجلیل لکھنوی سے فیض حاصل کیا۔ پرہیزگاری اور علم و تقویٰ میں شہرت رکھتے تھے ۱۰۷۶ھ کو انتقال ہوا۔

مولانا محمد صادق مولانا شمس الدین کے صاحبزادے اپنے والد اور ملا محمود جونپوری سے تحصیل علم کی اور علم و تقویٰ میں شہرت حاصل کی اپنے والد کی جگہ قاضی مقرر ہوئے بڑے متقی عابد قانع اور کثیر الدرس تھے ان کے والد کے شاگرد مولانا رکن الدین بحری آبادی شائستہ خان کے ندماء میں تھے! انہوں نے مولانا کو ایک کشمیری شال تحفہ میں دی مولانا ہدیہ یہ کہکے واپس کر دیا ؎

من دلق را باطلس شاہاں نمی خرم

ایک حکایت یہ بھی ہے کہ الہ وردی خان جب حاکم جونپور ہوا تو اس نے کسی غیر مشروع بات پر ان کی مہر چاہی انہوں نے انکار کیا۔ انہوں نے کشتی پر سوار ہو کے بیچ دریا میں ان کے پاس مہر بھیجی مگر وہ انکار پر قائم رہے تو وہ اس نے ان کے تقوی کا اعتراف کیا اور شرمندہ ہوا مولانا کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اپنے استاد ملا محمود جونپوری کے پیچھے کبھی نماز نہیں پڑھی ان کے فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے اس کے معنی یہ ہیں کہ صاحب شمس نازعہ اپنے فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے خارج از اسلام تھے ۱۰۶۸ھ مولانا کا ارتحال ہوا۔

مولانا محمد صادق مولانا ابوالبقا کے صاحبزادے اپنے والد سے تحصیل علم کر کے شہرت حاصل کی اور عالمگیر کے مقربین میں داخل ہوئے۔ محمد معظم کی تعلیم ان کے سپرد ہوئی جب وہ تخت نشین ہوا تو اس نے جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں ان کو ایک بڑی جاگیر دی وہ اپنی جاگیر پر گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ مصنفات میں شرح زنجانی شرح کافیہ عال الادب۔ الصادقہ حاشیہ عصدیہ آخری دونوں کتابیں رامپور کے کتب خانہ میں ہیں۔

مولانا محمد مودود محمد حسین حنفی کے صاحبزادے ۱۰۵۰ھ پیدا ہوئے۔ مولانا محمد رشید کے مشہور شاگرد ہیں ان کے ملفوظات بھی جمع کئے ہیں فقہ واصول فقہ اور ادب میں اپنے وقت کے مشہور عالم تھے ۱۰۸۰ھ میں جونپور کے قاضی مقرر ہوئے ۱۰۹۶ھ میں الہ آباد میں انتقال ہوا۔ لاش موضع بھادی میں قاضی منجھلا کے مقبرہ میں دفن کی گئی۔

مولانا ضیاءالدین مولانا محمد رشید کے شاگرد رشید حدیث و تفسیر میں بے نظیر تھے جبلی اسے ایک لکھا ہے کہ انہوں نے دوسرے علماء سے پڑھا تحصیل

بھی آگرہ اور مدینے بھی گئے وہاں شادی کی اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا

مولانا عبدالشکور مولانا شیخ مبارک کے بیٹے مولانا خیرالدین کی نسل سے تھے شیخ محمد رشید اور شیخ نوراللہ کے شاگرد عالم متبحر تھے شرح وقایہ ان کی تصنیف ہے ۸ جمادی الاول ۱۰۹۰ھ کو انتقال ہوا۔

مولانا عبدالعزیز بن مولانا فخرالدین صوفی اپنے والد اور دوسرے علماء سے تکمیل کی۔ علوم طریقت میں اپنے والد سے فیض حاصل کیا اپنے والد کے بعد ان کی مسند پر بیٹھے سیرۃ الاولیا کے مصنف اور بڑے بڑے علما کے استاد تھے۔

مولانا شیخ قیام الدین مولانا قطب الدین کے فرزند اپنے باپ اور دادا سے شریعت وطریقت میں استفادہ کیا اور ان کی مسند پر بیٹھے۔

مولانا ابوالعلا بن غلام حسین حنفی صوفی صدر جہان جونپوری کی اولاد میں تھے۔ شریعت وطریقت میں شیخ محمد رشید کے شاگرد تھے ان کے بیٹے مولانا ارشد سے خرقہ ملا شیخ یسین صوفی بنارسی نے اجازہ دیا طریقہ ظاہری کے پابند تقیہ زاہد اور عبادت گذار تھے ۱۰۹۸ھ میں انتقال ہوا اپنے دادا کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔

مولانا مبارک مفتی ابوالبقا کے چھوٹے بیٹے اپنے باپ سے تحصیل علم کی اور ان کے شاگرد محمد امین سے بحث ومذاکرہ علمی سے تبحر حاصل کیا۔ اس کے بعد دہلی گئے وہاں ملوک وامراء سے تقرب حاصل کیا جونپور کے مفتی مقرر ہوئے عمر درس وتدریس میں گذاری ۱۱۲۸ھ کو وفات پائی۔

مولانا عبدالباقی مولانا غوث الاسلام کے بیٹے ملا محمود کے شاگرد منطق وفلسفہ میں بحر ذخار درس تدریس میں شہرہ آفاق عالمگیر نے ایک گاؤں جاگیر میں دیا

دیا۔ تصنیفات میں اداب باقیہ فن مناظرہ میں عمدہ کتاب ہے ۱۰۸۰ھ میں رحلت ہوئی

مولانا جعفر بن عزیز اللہ ۸ رجب ۱۰۲۱ھ میں پیدا ہوئے۔ مادہ تاریخ شیخ موحد الدین ہے شیخ رشید اور دوسرے علمار سے تحصیل علم کی طریقت میں اپنے چچا مولانا نور محمد مداری سے فیض حاصل کیا۔ درس و تدریس زہد و قناعت علم و تواضع میں مشہور تھے۔ شیخ افضل الہ آبادی، عبدالرحمٰن عباسی الہ آبادی محمد ماہ دلو گامی ان کے شاگرد تھے۔ سہ شنبہ اٹھارہ جمادی الاول ۱۰۹۳ھ سال وفات ہے۔ تصنیفات میں ایک رسالہ نور الانوار ہے۔

مولانا محمود مولانا محمد کے بیٹے ۹۹۲ھ کو جونپور میں پیدا ہوئے اپنے باپ اور دادا سے درسی کتابیں پڑھیں فلسفہ اور منطق سے طبعی لگاؤ تھا نہایت ذکی اور سریع الذہن تھے۔ حافظہ بلا کا تھا۔ کمسنی میں ان کی عالمانہ گفتگو کبار علمار کو متحیر کر دیتی تھی۔ مولانا محمد یحییٰ عباسی الہ آبادی نے وفیات الاعیان میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں ایسا فلسفی پیدا نہیں ہوا۔

مصنفات: شمس بازغہ فلسفہ میں انشراح شرح الفوائد معانی بیان میں حرز الایمان رد شیخ محب اللہ الہ آبادی اقسام النساء میں دیوان اشعار ۱۰۶۲ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا شیخ مصطفیٰ علامہ دہر حسین تلیح خان لاہوری کے استاد جہانگیر کے زمانہ میں بغاوت کے الزام میں گرفتار ہو کے سامنے پیش ہوئے جب اس کو ان کے علم و فضل کا حال معلوم ہوا تو مولانا محمد بن یوسف ٹھٹھوی کو ان سے مباحثہ کا حکم ہوا اور دقیق مسائل میں ایک ہفتہ تک مباحثہ رہا مولانا ٹھٹھوی نے ان کے فضل کا اعتراف کیا اور معافی کی سفارش کی بادشاہ معاف کر کے آخر میں جانے کی اجازت دیدی۔ یہ حج و زیارت سے فارغ ہو کے جونپور آئے اور وہیں

انتقال ہوا۔

مولانا محمد رشید اپنے والد مولانا عبدالحمید اور مخدوم عالم سدھوری اور مولانا نور محمد مداری سے شریعت وطریقت میں فیض حاصل کیا۔ خرقہ ان کے والد نے دیا۔ فقہ واصول وتصوف میں شہرہ آفاق تھے مصنفات۔ رشیدیہ اصول مناظرہ میں معرکۃ آرا کتاب ہے اس کے علاوہ شرح ہدایۃ الحکمت خلاصۃ النحو اراۃ السالکین مقصود الطالبین دیوان اشعار ان کے مصنفات میں ہیں ۱۰۸۳ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا محمد خلیل اپنے والد مولانا شمس الدین اور شیخ محمد رشید سے علم ظاہری وباطنی حاصل کیا اور اپنے بھائی مولانا محمد صادق کی جگہ مفتی مقرر ہوئے ۱۰۸۹ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا نصیرالدین طریقہ مداریہ کے پیر وتصوف میں مشہور تھے ۱۰۷۶ھ میں وفات ہوئی۔

بھیرہ ضلع جونپور مولانا ابوالخیر ۱۰۰۸ھ میں سلطانپور میں پیدا ہوتے اپنے والد مولانا ابوسعید سے اور دوسرے شہروں کے علماء سے تحصیل علم کی پھر حجاز گئے اور حج وزیارت کے مشرف ہو کے اپنے وطن پھر واپس آئے ۱۰۵۹ھ میں انتقال ہوا۔

مچھلی شہر ضلع جونپور مولانا ثناء الدین حضرت جعفر طیار کی اولاد میں تھے اس وجہ سے اپنے کو جعفری لکھتے تھے بڑے عالم بحر تھے۔ مچھلی شہر کے قاضی مقرر ہوئے ان کی نسل میں بڑے صاحب فضیلت لوگ پیدا ہوتے اب بھی بہت سے لوگ ان کی نسل میں ہیں ان میں اکثر شہرت رکھتے ہیں سب اپنے کو جعفری لکھتے ہیں۔

گورکھپور | مولانا خلیل الرحمٰن ۔ مشاہیر علماء میں تھے فدائی خاں سے تقرب حاصل کیا اس نے عالمگیر سے سفارش کرنے ان کو منصب قضا دلوادیا۔

پڑیاکوٹ ضلع اعظم گڑھ | مولانا عبدالفتاح بن مبارک عباسی ۹۹۶ھ میں پیدا ہوئے۔ اساتذہ عصر سے علوم حاصل کئے۔ فقہائے حنفیہ میں بلند درجہ رکھتے تھے۔ شعر بھی خوب کہتے تھے ایک میراث نامہ فارسی ہو نظم کیا جس کا آخری شعر یہ ہے۔ ؎

خدارا شکر کز تحریر خامہ ؛ مہذب گشت این میراث نامہ

ربیع الاول ۱۰۵۷ھ میں انتقال ہوا۔

دیوگام ضلع اعظم گڑھ | مولانا محمد ماہ مولانا رکن الدین بحری آبادی کے شاگرد اخذ طریقت شیخ محمد رشید جونپوری سے کیا ان کے بیٹے محمد ارشد نے خرقہ عطا کیا نہایت ذہین اپنے وقت کے علامہ ہمیشہ درس و تدریس میں مشغول رہے۔ شیخ عبدالرسول ستر کھی اور حافظ امان اللہ بنارسی ان کے شاگرد ہیں ۱۰۹۵ھ کو لس البول میں انتقال ہوا۔

بحری آباد ضلع اعظم گڑھ | مولانا رکن الدین اپنے وقت کے مشہور عالم اور صاحب فیض بزرگ تھے بڑے بڑے علما کے استاد ہیں۔

بنارس | مولانا محمد یسین مولانا احمد صدیقی کے صاحبزادے جونپور کے دیہات منڈیاہوں میں پیدا ہوئے مولانا طیب بنارسی نے تربیت کی انہیں سے فقہ و اصول کی تعلیم حاصل کرکے جونپور آگے وہاں شیخ محمد افضل سے منطق و فلسفہ فقہ و اصول میں تبحر حاصل کرکے مولانا طیب کی خدمت میں آئے انہوں نے اپنا خلیفہ مقرر کیا ۱۰۴۱ھ میں کوڑہ گئے وہاں شیخ جمال ابن مخدوم سے ہدایہ اور

تنبیہ بیضاوی کا درس لیا اور اپنے وطن واپس آئے تو ان کے شیخ کا انتقال ہو چکا تھا ان کی قبر پر مجاورت اختیار کی شیخ محمد غوث نے ان کو شیخ کا قائمقام بنایا۔ عمر درس و تدریس میں بسر کی ۔ مناقب العارفین ایک مبسوط کتاب اخبار مشائخ میں لکھی۔

بدایون مولانا بدرالدین صدیقی نقہ و اصول و ادب میں مشہور تھے جہانگیر کی طرف سے بدایون کے قاضی مقرر ہوئے سنہ ۱۰۶۰ھ میں انتقال ہوا۔ قد خسف بدری مادہ تاریخ ہے۔

مولانا شیخ عبد الغنی بچپنے سے تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔ حالات طاری رہتے تھے لوگوں کے اصرار سے نکاح کیا روزگار کی تلاش میں دہلی گئے وہاں شیخ عبد العزیز جونپوری سے ملاقات ہوئی ان سے کتب درسیہ پڑھیں اور اخذ طریقت کیا ایک مدت کے بعد دہلی سے باہر مسجد خان جہاں میں عبادت میں مشغول ہو گئے۔ عالم کامل وجیہہ و خوبرو متوکل اور سخی تھے۔ ۹ر جمادی الاول سنہ ۱۰۱۱ھ کو انتقال ہوا۔

مولانا عبد القادر بن ملوک شاہ سنہ ۹۴۷ھ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے دادا مخدوم اشرف پشاوری سے حاصل کر کے شیخ حاتم سنبھلی سے فقہ کا درس لیا۔ آگرے میں شیخ ابو الفتح تھانیسری سے بعض علوم حاصل کئے اور شیخ مبارک (ابو الفضل کے والد) اور قاضی ابو المعالی سے معقولات کا درس لیا اصطرلاب میں میر علی متقی شیرازی سے تلمذ اختیار کیا شعر و انشا حساب موسیقی، شطرنج، صغر و کبر ضرب۔ البین (عود کی ایک قسم) ان سب میں مہارت رکھتے تھے۔ تاریخ فلسفہ منطق عرف و نحو میں بھی کامل عبور تھا۔ جلال خان تورچی اپنے

عین الملک شیرازی کی سفارش سے دربار میں پیش ہوئے اور علماء کے زمرہ میں داخل ہوئے۔ ان کا علمی اثر بڑھا گیا اور تمام علماء سے مرتبہ اور منصب میں بڑھ کر امام اکبر شاہ ہوئے۔ سنسکرت کی بہت سے کتابیں اکبر کے حکم سے ترجمہ کیں سب سے مشہور کتاب ان کی منتخب التواریخ ہے۔ پہلی جلد سبکتگین سے ہمایوں اور دوسری اکبر کے حالات میں ہے اس میں اپنے زمانہ کے علماء شعراء اطباء صوفیا سب کا ذکر کیا ہے جس سے خفا ہوتے ہیں اس کی افترا اور دروغ میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

مولانا عبدالباری علم و فضل صلاح و تقوی میں مشہور تھے اخذ طریقت شیخ رضی الدین عبدالباقی نقشبندی دہلوی سے کیا اور برسوں ان کی خدمت میں شیخ احمد سرہندی سے بھی فیضیاب ہوئے۔ اور مشیخت پر پہنچنے کے بعد شیخ کی اجازت سے وطن واپس آئے۔

مراد آباد مولانا عبدالرحیم بن عبدالرشید سار کے رہنے والے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے شاگرد مشہور عالم مراد آباد کے قاضی مقرر ہوئے وہیں درس و تدریس شروع کی شیخ سعداللہ بلگرامی وغیرہ کے استاد تھے۔

سنبھل ضلع مراد آباد مولانا تاج الدین بن ذکریا سنبھل میں علم حاصل کرکے شیخ طریقت کی تلاش میں اجمیر پہنچے شیخ معین الدین کی روحانیت سے تلقین حاصل کرکے حفظ انفاس وغیرہ کے طریقے جو چشتیہ میں ہیں حاصل کئے پھر ان کے حکم سے ناگور میں شیخ حمیدالدین صوفی کی قبر پر ذکر میں مشغول ہوئے اور پھر کسی شیخ طریقت کی تلاش میں نکلے یہاں تک کہ شیخ اللہ بخش شطاری کے پاس گڈہ مکتیسر پہنچے شیخ نے ان کا اس طرح استقبال کیا وہ ان کے منتظر تھے ان کی خدمت میں ریاضت شاقہ کرکے تزکیہ

فن حاصل کیا یہاں تک کہ درجہ کمال پر پہنچے طریقہ نقشبندیہ و قادریہ چشتیہ و مداریہ کا اجازہ حاصل کیا پھر شیخ عبد الباقی نقشبندی سے لاہور میں ملاقات کی۔ ان کے علاوہ اور بہت سے مشائخ سے فیض حاصل کیا۔

مولانا عبد الاول مولانا عبد العظیم کے صاحبزادے مولانا عثمان مودودی امروہوی کی نسل میں تھے مولانا تاج الدین سنبھلی کے بھانجے تھے اسی وجہ سے انہوں نے اپنا وطن سنبھل بنایا اور وہیں علم و معرفت حاصل کی اور مسند ارشاد و ہدایت پر متمکن ہوئے اپنے والد کے بعد حج و زیارت سے مشرف ہوئے اورنگ آباد میں ۱۰۶۹ھ کو انتقال ہوا۔

مولانا عبد الواحد بن مولانا کمال الدین سنبھل میں تعلیم پائی طریقت میں مولانا تاج الدین سے فیض حاصل کیا پھر حرمین گئے اور وہاں کے مشائخ سے استفادہ کیا فارسی میں ایک تفسیر بھی لکھی۔

مولانا سعد اللہ ابن ابدال یحییٰ تخلص سنبھل میں پیدا ہوئے۔ مولانا تاج الدین سے تحصیل علم کی اور بلند درجہ پہنچے مصنفات میں ایک دیوان ایک مثنوی بحر عمیق اور تذکرہ مشائخ یادگار چھوڑی ان کا شعر ہے ؎

اگر مشاہدہ دوست از پس مرگ است ٭ حیات خضر و مسیحا نصیب دشمن باد

مولانا عبد الحیٔ سنبھل کے مفتی اور کبار علماء میں تھے۔ علوم دینیہ میں ان کی تصنیفیں بھی ہیں۔

مولانا عبد الرحمٰن اخذ طریقت شیخ تاج الدین اور شیخ عبد الباقی دہلوی سے کیا اور علم و معرفت کے بلند درجات پر پہنچے اپنے شیخ کے حکم سے اپنے شہر کے شیخ ہوئے خلق کثیر نے فائدہ حاصل کی۔

مولانا عبداللہ بن عبدالعظیم حسینی مودودی شیخ تاج الدین کے نواسے شریعت وطریقت کے مشہور عالم تھے۔

مولانا عبدالعظیم بن مولانا منور حسینی اپنے والد سے علوم حاصل کئے اور مسند ارشاد پر متمکن ہوئے مولانا تاج الدین سنبھلی کی صاحبزادی سے شادی کی ۱۱۲۱ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا فاضل مولانا امجد کے بیٹے اپنے وقت کے علماء سے درسی کتابیں پڑھیں اور طریقت میں مولانا تاج الدین سنبھلی سے فیضیاب ہوئے۔ درس وتدریس میں زندگی بھر مشغول رہے۔ فقہ واصول ومعرفت میں شہرہ تھا۔ ۱۱۲۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا کمال محمد ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے مولانا فاضل سے تحصیل کی مولانا شاعر بھی تھے۔ فارسی اور ہندی دونوں میں کہتے تھے اور خوب کہتے تھے فارسی کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے۔ ؎

نگاہ من بفراق تو کارہا مردن ؛ بدیدہ تا سر مژگان ہزار فرسنگ است

۱۱۷۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا منصور کے بیٹے مولانا عبداللہ کے پوتے اپنے والد اور دادا سے شریعت وطریقت میں کسب فیض کیا اور درجہ ارشاد پر پہنچے ۱۱۰۸ھ میں انتقال ہوا۔ تاریک شد زمانہ سے کسی نے تاریخ نکالی۔

امروہہ | مولانا ابوالحسن بن منتجب حسینی نقوی شیخ شرف الدین کی نسل سے تھے۔ مفتی عبدالملک امروہوی سے تحصیل علم کی۔ شیخ الٰہ بخش گڈھ مکتیسری سے اخذ طریقت کیا۔

مولانا عبدالمجید مولانا معروف علوی کے بیٹے سنہ۹۸۰ھ میں پیدا ہوئے تحصیل علم کرکے باہر نکلے نارنول جاکے شیخ نظام الدین الہداد کے مدرسہ میں پڑھا اور وطن واپس آکے درس و تدریس شروع کی ذکرالاعلیٰ شرح اسمائے حسنیٰ ان کی تصنیف ہے سنہ۱۰۴۶ھ کو انتقال ہوا۔

مولانا غلام محمد بن دیار ابتدائی تعلیم حاصل کرکے دہلی گئے وہاں شیخ عبداللہ ابن عبدالباقی اور دوسرے علماء سے شریعت و طریقت کا اکتساب کیا۔ مولانا شاعر بھی تھے۔ عربی فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ان کے والد شیخ تاج الدین سنبھلی کے خلفاء میں تھے اور دادا شیخ اللہ بخش شطاری گڈھ مکتیشری کے خلیفہ تھے۔

مولانا فیض اللہ بن معروف محمد حنیفہ کی اولاد میں تھے اپنے بڑے بھائی مولانا عبدالمجید سے فیض حاصل کیا۔ اور ان کے بعد مسند شاد پر بیٹھے۔

مولانا محمود مولانا اشرف کے صاحبزادے اپنے والد سے تحصیل علم کرکے حجاز گئے وہاں سے واپس آکے شیخ تاج الدین سنبھلی سے اخذ طریقت کیا اور ان کی صاحبزادی سے شادی کی اپنے والد کی زندگی میں سنہ۱۰۳۱ھ میں انتقال ہوا۔

بارہویں صدی ہجری

لکھنو کی علمی فضا

بارہویں صدی ہجری اودھ میں اسلامی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کی ترقی کا دور ہے۔ شروع ثانی صدی یعنی گیارہ سو بیتیس تک بڑے بڑے علماء مسند درس بچھائے ہوئے تھے۔ مولانا کمال کی بلندیوں پر فائز ہونے کے ساتھ تصوف میں بھی بلند درجہ رکھتے تھے۔

۲۔ مولانا رحمتہ اللہ ابن غلام محمد اپنے وقت کے مشہور عالم تھے ان کی کتاب اخبار المشائخ صوفیا کے حالات میں بلند یہ کتاب ہے سنہ ۱۱۱۶ھ میں انتقال ہوا

۳۔ مولانا عصمت اللہ مولانا عبدالقادر عری کے صاحبزادے لکھنو میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کی ان کے بعد مفتی وجیہہ الدین گوپاموی سے پڑھا۔ مولانا پیر محمد سلونی سے طریقت میں مستفید ہوئے۔ مراد آباد کے قاضی مقرر ہوئے۔ نہایت سخی اور صاحب ایثار تھے۔ سو طالب علم ان کے دسترخوان پر روزانہ کھانا کھاتے تھے۔ فتاوائے ہندیہ کے مصنفین میں ہیں سنہ ۱۱۳۱ھ دکن جاتے ہوئے دریائے زیدا کے کنارے انتقال ہوا۔

مولانا غلام نقشبند گیارہویں ذی الحجہ سنہ ۱۰۵۱ھ میں گھوسی ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی تحصیل علم کے لئے دہلی گئے اور مولانا محمد شفیع سے کتب درسیہ پڑھ کے لکھنو آئے اور مولانا پیر محمد سے تکمیل کی ان کے بعد ان کے جانشین ہوئے ادب وشعر اور علوم حکمیہ میں اپنے زمانہ میں فرد فرید تھے

مصنفات ربع قرآن کی تفسیر لمعات عرشیہ ایک رسالہ وحدت وجود میں اور رقعیہ خزجیہ کی شرح لکھی ۱۱۲۶ھ میں لکھنو میں انتقال ہوا۔

۵ مولانا شرف الدین مولانا محی الدین کے بیٹے لکھنو کے خانوادہ علم وفضل میں پیدا ہوئے اپنے والد اور دوسرے علماء سے تحصیل علم کی طریقت میں مولانا غلام نقشبند سے فیض حاصل کیا عالمگیر کے مقربین میں تھے۔ بارہ صدی ذات کے منصب پر فائز تھے محمد شاہ کے زمانہ میں پنج ہزاری منصب ملا فدائی خان نے ان کو بہار کا حاکم مقرر کیا۔ برسوں وہ اس عہدہ پر رہے۔ مصنفات میں رسالہ جذر اصم حاشیہ شرح مواقف اور حاشیہ تفسیر بیضاوی لکھا ذی الحجہ کے مہینے میں ۱۱۳۳ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا عبدالبدیع ابن مولانا عبداللطیف علوم ظاہری میں اور مولانا شیخ ابراہیم قادری سے طریقت میں فیض حاصل کیا۔ لکھنو کو اپنا وطن بنایا وہیں ۱۱۰۲ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا محمد شاکر مولانا عصمت اللہ کے بیٹے اپنے والد اور مفتی وجیہ الدین گوپاموی اور مولانا پیر محمد لکھنوی سے تحصیل علم کی تصنیفات میں شرح تہذیب المنطق اور شرح قصیدہ بردہ رسالہ اعتقادیہ اور رسالہ قاسمیہ، رسالہ در احوال موتی اور خلاصۃ المطالب حل لغات قرآنیہ اور رسالہ وصایا ہے ۱۱۳۳ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا امان اللہ بنارسی تحصیل علم مولانا محمد ماہ دیوگامی اور مولانا طیب الدین شمس آبادی سے کی منطق وفلسفہ فقہ واصول اور علم کلام میں شہرہ آفاق تھے عالمگیر نے لکھنو کا مفتی مقرر کیا اور وہیں عمر بسر کی اصول فقہ میں المحکم ۱۱۲۳ھ میں انتقال ہوا۔

تفسیر بیضاوی پر حاشیہ افق المبین اور شرح عقائد دوانی پر حاشیہ لکھا۔

مولانا محب اللہ موضع کرا صوبہ بہار کے رہنے والے عنفوان شباب میں لکھنؤ آئے اور سہالی میں مولانا قطب الدین سے پڑھا۔ تحصیل علم کی عالمگیر کی طرف سے لکھنؤ کے قاضی مقرر ہوئے اور فاضل خاں خطاب ملا مولانا امان اللہ سے بحث و مباحثہ کا بازار گرم رہا منطق میں مسلم العلوم اور اصول فقہ میں مسلم الثبوت بڑی معرکہ کی کتابیں لکھیں جن کی شرحیں ملا محمد اللہ اور قاضی مبارک اور ملا حسن نے لکھیں جو آج تک منطق کے منتہی طلبا کے درس میں ہیں ۱۱۱۹ھ میں انتقال ہوا۔

امیٹھی ضلع لکھنؤ مولانا بڈھن ابن ابو سعید حنفی صالحی ۱۲ صفر ۱۰۸۳ھ کو امیٹھی میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کی اور طریقت میں شاہ میر قادری سے فیض حاصل کیا ۱۱۱۰ھ میں وفات ہوئی۔

مولانا ابو یوسف مولانا ابو یزید کے بیٹے امیٹھی میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی تحصیل علم کے بعد حج و زیارت سے مشرف ہوئے پھر لاہر پور جا کے مولانا مجتبیٰ قلندر سے فیض حاصل کیا ۱۱۰۵ھ کو امیٹھی میں انتقال ہوا جنت یافتہ یوسف مادہ تاریخ ہے۔

مولانا احمد عرف ملا جیون مولانا ابو سعید کے بیٹے منگل کے دن ۱۰۴۷ھ میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کی ان کے بعد مولانا صادق ستر کھی سے پڑھا۔ پھر مولانا لطف اللہ کوڑ دی سے تحصیل کی بائیس برس کے سن میں فارغ التحصیل ہو کے درس و تدریس شروع کی۔ چالیس سال کی عمر میں اجمیر گئے پھر دہلی میں ایک مدت تک رہے اور درس و تدریس میں شہرت حاصل

کی ۔ پچپن برس کے عمر میں حج کی واپسی میں عالمگیر کے ملازمت سے بلند ہونے
اس کے بعد شاہ عالم اور فرخ سیر کے مقربین میں رہے۔ تصنیفات میں تفسیر
احمد اور حسامی، اصول فقہ میں شرح مطالع اور نور الابصار اور شرح مناقب
مناقب اولیا میں لکھی ۱۱۳۰ھ میں دہلی میں انتقال ہوا۔

کاکوری ضلع لکھنو | مولانا محمد غوث مولانا ابوالخیر کے صاحبزادے
۱۰۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ شیخ محمد زمان کاکوری۔ شیخ ابو اعظ بر گامی اور شیخ
قطب الدین سہالوی سے تحصیل علم کی حدیث ہیں مولانا شیخ محمد یعقوب
لاہر پوری سے استفادہ کیا۔ عالمگیر نے فتاوائے ہندیہ کی تدوین میں شریک
کیا اس کے بعد لکھنو میں جزیہ کی وصولی پر مامور کیا۔ ۱۱۱۱ھ میں انتقال ہوا

شعراء واطباء | انہیں علماء میں شاعر وطبیب بھی تھے ان کے حالات
ہیں ان کا ذکر آچکا ہے اور ان کے اشعار بھی پیش کئے جا چکے ہیں۔ اب دوبارہ
ان کا دکشاعر یا طبیب کی حیثیت سے تکرار محض تھی اس لئے اس کی ضرورت نہیں
سمجھی گئی۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ علوم وفنون طب وشاعری کا بھی گہوارہ تھا

تعلیمی نظام

اسی وجہ سے جہانگیر اس کو اپنی مملکت کا شیراز کہتا تھا۔
ان علماء کی درسگاہیں تحقیق جہاں دور دور سے طالبان علم آتے تھے پورا خطہ
علم کی روشنی سے چمک رہا تھا جس کا مرکز لکھنو تھا۔ آزاد بلگرامی نے اس کی یہ حالت
بیان کی ہے۔

سرزمین پورب کہ قدیم الایام سے معدن علم وعلماء ہے اگرچہ تمام صوبجات

ہندوستان حاملان علوم کے وجود کا فخر رکھتے ہیں خصوصاً دارالخلافت کہ جہاں ہر قسم کے صاحبان نے کمال مرجعیت کی وجہ سے علوم عقلی و نقلی کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے لیکن صوبہ اودھ و الٰہ آباد ایک خاص خصوصیت رکھتا ہے کہ کسی صوبہ کو حاصل نہیں پورا صوبہ اودھ اور اکثر صوبہ الٰہ آباد تخمیناً پانچ زیادہ سے زیادہ دس میل پر آبادی شرفاء دیکھا ہے اور مدد معاش کے لئے سلاطین و حکام سے وظائف و زمین حاصل کی ہے خانقاہیں بنوائیں اور مدرسان عصر نے ہر جگہ اہل دانش کے لئے ابواب علوم کھول دیئے ہیں اور طلبہ علوم گروہ در گروہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں جاتے ہیں اور جس جگہ کو موافق مزاج پاتے ہیں وہاں تحصیل علوم میں مشغول ہو جاتے ہیں اور ہر جگہ کے صاحبان مقدرت طلبہ علم کی نگہداشت اور ان کی خدمت کو سعادت عظمیٰ جانتے ہیں صاحب قرآن ثانی شاہجہاں انار اللہ برہانہ کہتے تھے پورب ہمارا شیرازہے اس کتاب کی تحریر تک ..... کہ سنہ ۱۱۵۳ھ ہجری میں علم کا رواج خصوصاً معقولات کا جیسا یہاں ہے کسی جگہ نہیں ہے۔ اس وقت بڑے بڑے علماء جلوہ طراز اور مراتب علم کی بلندیوں پر ممتاز ہیں۔ (تاریخ الکرام ص ۲۲۱)

لکھنو کی سیاسی حالت

شیوخ سیاسی حیثیت سے یہاں کئی صاحب اقتدار گروہ تھے۔ ایک شیخ عبدالرحیم کے ذریات جنکا شیخ محلا اور مچھی بھون تھا۔ دوسرے شیخ مکارم کی اولاد

شیخ عبدالرحیم اکبر کے زمانہ میں اور شیخ مکارم اورنگ زیب کے زمانہ میں تھے شیخ عبدالرحیم کی اولاد دم خم میں شیخ مکارم کی اولاد سے بڑھی چڑھی تھی اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مچھی بھون کا قلعہ ان کے پاس تھا۔ جس کے گھونگھٹ بنہ شاہ پیر محمد کا ٹیلہ تھا اور چاروں طرف قدرتی ٹیلے تھے جس کی وجہ سے کسی پر ان کا حملہ کرنا ممکن نہ تھا مشہور ہے کہ جس کا مچھی بھون اسی کا لکھنؤ اس کا صدر دروازہ شیخن دروازہ کہلاتا تھا جس میں انہوں نے ایک تلوار لٹکا رکھی تھی جو صوبیداران سے ملنے آتا تھا اور اس کا ہاتھی شیخن دروازہ میں داخل ہوتا تھا تو تلوار لٹکنے کی وجہ سے اس کو سر جھکانا پڑتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے خیال میں صوبیدار سے سلامی لیتے تھے۔

شیوخ نہرہ شیخ مکارم کی اولاد بھی اپنے کو کم نہ سمجھتی تھی دونوں میں سخت بٹی داری تھی یہ شیوخ نہرہ کہلاتے تھے ان کی حدود بان سے شروع ہوتی تھی جہاں اب ازیڈنسی کی عمارتیں ہیں۔

رام نگر کے پٹھان پٹھانوں کا ایک گروہ جنوب کی طرف سے آکے آباد ہو گیا ان کی حکومت گولدروازے سے شروع ہوتی تھی۔ یہ رام نگر کے پٹھان کہلاتے تھے

کاکوری لکھنو سے متصل کاکوری کے شیوخ مغلوں سے پہلے جونپور کی شرقی سلطنت کے زمانہ میں بڑے صاحب اقتدار تھے۔

ملیح آباد ملیح آباد کے پٹھان بھی بڑے دبدبے کے لوگ تھے۔

سندیلہ یہاں کے مسلمان زمیندار بھی تھے اور صاحب علم و فضل بھی تھے اُن میں شیوخ و سادات اور پٹھان سب طرح کے لوگ تھے۔

راجہ گونڈہ یہ سب سے زیادہ طاقتور تھا اس کا نام ذنا سنگھ تھا۔ یہ

ریاست جہانگیر کے زمانہ میں قائم ہوئی تھی۔ دتا سنگھ نے اس پاس کے راجاؤں کو بھی اپنا مطیع بنا رکھا تھا اور ایک بڑی طاقت بن گیا تھا۔

راجہ بلرام پور گونڈے سے متصل بلرام پور کا راجہ نرائن سنگھ بھی ایک طاقتور اور سرکش راجہ تھا۔

راجہ ساپور بستی میں ساپور کا راجہ بڑے رعب وداب کا تھا۔ اور کسی صوبہ دار کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔

راجہ پرتاپ گڑھ پرتاپ گڈھ کا راجہ چتر دھاری سنگھ سورج بنسی کو ان اطراف میں بڑی اہمیت حاصل تھی اس کے پاس فوج بھی کافی تھی اور بہت سے چھوٹے موٹے راجہ اس کے مطیع تھے۔

راجہ بیواڑہ راجہ بیواڑہ اودھ کے پرانے حکمران خاندان سے تھا اس کو دعویٰ تھا کہ پورے اودھ پر کسی زمانہ میں ان کی حکومت تھی یہ تمام راجاؤں کو اپنی رعایا سمجھتا تھا اس وقت یہاں کا راجہ جٹ رائے ستیس تھا فوجی اعتبار سے ایک اچھی طاقت تھا۔

راجہ سمرن گڑھ راجہ سمرن گڑھ بھی اودھ کے پرانے حکمران خاندان کی فرد ہونے کے مدعی تھے اور ایک طاقتور حریف حکومت کی حیثیت رکھتے تھے۔

راجہ تلوئی راجہ تلوئی رائے بریلی کے شمال مشرق میں اٹھارہ میل کے فاصلہ پر تھا اس وقت یہاں کا راجہ موہن سنگھ تھا جو حقیقت میں ایک بڑی طاقت تھا اور شاندار اودھ میں سب سے بڑی طاقت تھا اور اپنی سرکشی میں مشہور تھا

راجہ کوڑہ کوڑہ میں بھگونت سنگھ عرف اڑاڑ دنے بڑی طاقت پیدا کر لی تھی اس کی راجدھانی اصل میں غازی پور تھی مگر اس نے کوڑہ پر بھی قبضہ کر لیا

تھا اور یہاں کے صوبہ دار سے برابر جنگ کرتا اور شکست دیتا رہتا تھا۔

چھوٹے زمیندار ان راجاؤں کے علاوہ چھوٹے زمینداروں کے اپنے کچے قلعے بنا رکھے تھے جنہیں وہ گڑھی کہتے تھے انھیں ہر ایک کے پاس فوج اور اسلحے کی کافی مقدار رہتی ان کے قلعے گھنے جنگلوں میں تھے جن کی وجہ سے ان پر فتح حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ ان میں ہر ایک کی مستقل حکومت تھی جن کا عدالتی نظام پنچایت تھا ہر ذات کے لوگ اپنی پنچایت میں اپنے جھگڑے طے کر لیتے تھے۔

یہ زمیندار آپس میں بھی لڑتے رہتے تھے اور حکومت سے بھی جنگ کرتے تھے۔ ان کی حیثیت کے موافق جب کوئی بڑی لڑائی در پیش ہوتی تھی تو یہ نئی فوج بھرتی کرتے تھے۔

بنجارے بستی سے گورکھپور تک کچھ ایک قوم لوٹ مار اور بدامنی پھیلائے ہوئی تھی۔ یہ بنجارے کہے جاتے تھے۔

صوبیدار کسی گنتی میں نہ تھا اتنے بڑے صوبے سے تراسی لاکھ مشکل سے وصول ہوتا تھا یہ حالت ایک مدت سے تھی کوئی صوبیداروں سے سر بر نہ ہو سکا سرکشی اور بد نظمی میں مشہور صوبہ تھا آخر عہد محمد شاہ میں گردھر ناگر بان کا صوبیدار تھا جس کی کمزوری کی شکایت بادشاہ سے ان الفاظ میں کی گئی کہ لوگ اس کو چند یوم سے زیادہ نہیں سمجھتے۔

○

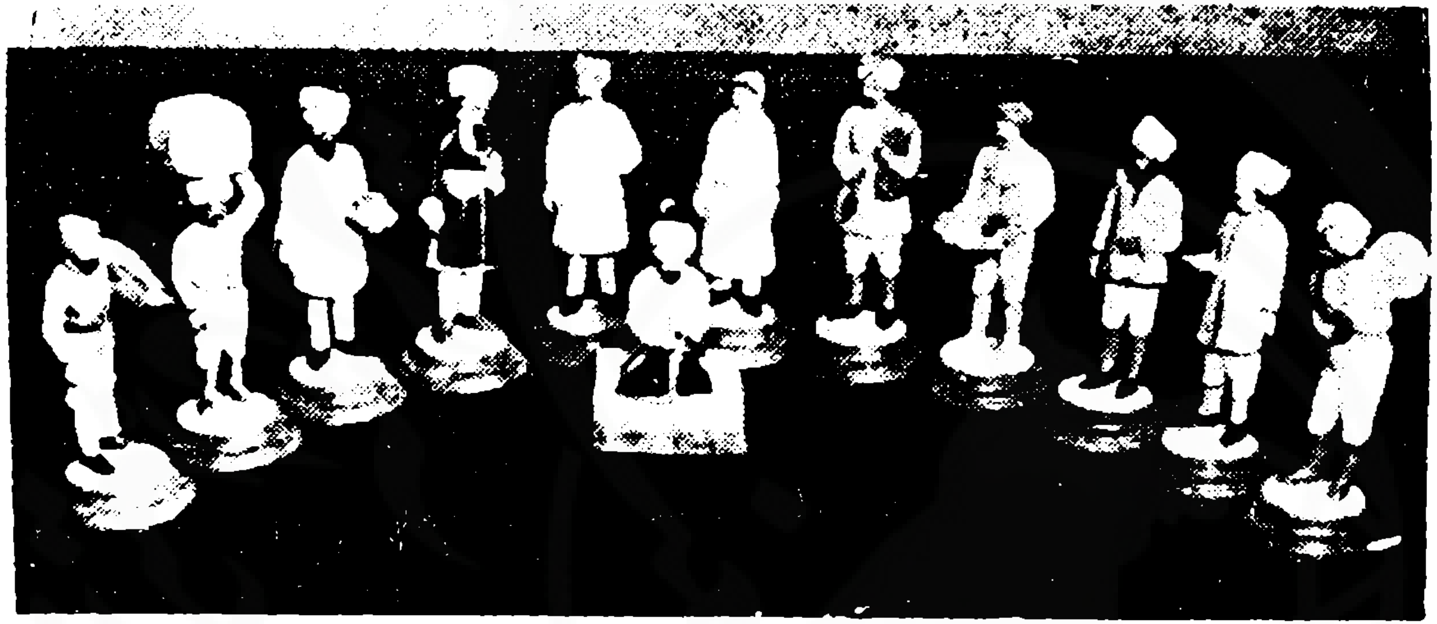

مٹّی کے کِھلونے۔ لکھنؤ کے

تاریخ لکھنؤ

حصّہ دوم

لکھنؤ کے دورِ نوابی کے سو سال

از سعادت تا سعادت

۱۱۳۲ھ تا ۱۲۳۲ھ

۱۷۲۲ء تا ۱۸۱۶ء

نواب سید محمد امین سعادت خاں برہان الملک بہادر جنگ

MAAB 1431
maablib.org

سلطنت اودھ کا قیام

نواب سید محمد امین سعادت خاں برہان الملک بہادر جنگ

بانی سلطنت اودھ

نسب مولانا شمس الدین مجتہد کو شاہ اسمٰعیل صفوی نے ۹۹ھ میں نجف اشرف سے بلا کے قاضی القضاۃ بنایا اور نیشاپور میں بہت بڑی جاگیر دی۔ ان کے کئی بیٹے تھے مگر کوئی عالم نہ ہوا تو بادشاہ نے ان کو اپنی مصاحبت میں لے لیا اور جاگیر بحال رکھی۔

مولانا کے بڑے بیٹے محمد جعفر کے دو بیٹے محمد امین اور سید محمد تھے۔ محمد امین کے دو بیٹے محمد نصیر اور محمد یوسف تھے۔ محمد نصیر کے دو بیٹے محمد باقر اور محمد امین تھے۔ اور دو بیٹیاں تھیں محمد امین ایک بیٹی سے بڑے اور ایک سے چھوٹے تھے۔ یہی برہان الملک بہادر جنگ سلطنت اودھ کے بانی ہوئے۔

تعلیم و تربیت ڈاکٹر سریواستوا کا بیان ہے کہ محمد امین ۱۶۸۰ء میں پیدا ہوئے بچپن سے جوانی تک اعلیٰ تعلیم و تربیت پائی اور علم و شجاعت میں امتیاز حاصل کیا تمام مؤرخین ان کی شجاعت پر متفق ہیں۔ خدا نے ان کو زبردست قوت ارادی خوداعتمادی اور بلند ہمتی عطا کی تھی۔ اعلیٰ تعلیم اور سپاہیانہ تربیت نے ان کو ایک مدبر منتظم اور بہت بڑا جنرل بنا دیا تھا اور کاتب تقدیر نے ان کے مقدر میں لکھ دیا تھا کہ وہ ایک زبردست فرمانروا بنیں۔

محمد نصیر اور محمد باقر ہندوستان میں انقلاب اصفہان میں میر محمد نصیر اپنے بڑے بیٹے محمد باقر کو لے کے سمندر کے راستہ بنگال آئے اور پٹنہ کو ایک پر بہار

مقام دیکھ کے سکونت اختیار کر لی۔ شجاع الدولہ ترک افشار گورنر بہار نے مرشد قلی خان دیوان بنگال کی سفارش پر ان کا وظیفہ معین کر دیا اور یہ دونوں باپ بیٹے اطمینان کی زندگی گذارنے لگے۔ محمد باقر نے یہاں نکاح کیا اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام نثار محمد رکھا۔

محمد امین ہندوستان میں محمد امین کی شادی ان کے چچا محمد یوسف کی بیٹی سے ہوئی تھی وہ بہت دولتمند تھیں۔ کسی بات پر محمد امین کو گھر دامادی کا طعنہ دیا ان کی عزت اس کو برداشت نہ کر سکی اور ہندوستان کا رُخ کیا پٹنہ پہنچے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔

محمد امین دہلی میں بھائی اور بھتیجے کو لے کے دہلی آئے یہ سنہ ۱۱۲۱ھ تھا۔

مورخین کا بیان ہے کہ بعض عمدہ امیروں کے یہاں خدمات انجام دیں مگر نہ کسی امیر کا نام لکھا نہ خدمت۔ یہاں انہوں نے خدیجہ خانم سے نکاح کیا جن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی اس کا نام صدر جہان بیگم رکھا اس کے پیدا ہوتے ہی ان کی ترقی شروع ہوئی اس وجہ سے اس کو مبارک قدم سمجھتے تھے اور بہت چاہتے تھے

محمد امین میر منزل نواب سربلند خان کے یہاں کڑہ مانکپور میں میر منزل کی نوکری کی جب ان کا گجرات تبادلہ ہو گیا تو یہ ان کے ساتھ گجرات چلے گئے کچھ دنوں کے بعد ایک سفر میں نشیب میں خیمے نصب کرا دیئے۔ رات کو بارش ہوئی خیموں میں پانی بھر آیا نواب نے رتھ پر رات گذاری صبح کو انہیں بلا کے کہا کہ آپ کا دماغ ہفت ہزاری ہے اپنے فرض منصبی کی طرف توجہ نہیں انہیں یہ بات ناگوار ہوئی اور خدمت سے معافی مانگ لی دوسرے دن نواب نے بلا کے معذرت کی انہوں نے کہا کر میاں آپ کی زبان مبارک کو فال نیک سمجھتا ہوں۔ اب ہفت ہزاری ہو کے سامنے آؤں گا

یہ کہہ کے دہلی چلے آئے۔

محمد امین ٹھیکیدار | یہاں شہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ لیا اور اپنے حصہ میں سے بھی ایک بڑی رقم شہزادوں کو بھیج دی۔ اتنی رقم کبھی نہیں ملی تھی اس سے ان کی کارکردگی اور ذہانت کا شہرا ہو گیا۔ فرخ سیر اس وقت شہزادہ تھا وہ ان سے متعارف ہو گیا اس کے دل میں ان کی وقعت پیدا ہو گئی۔ مورخین کا بیان ہے کہ ایک عمدہ امیر کے ذریعہ انہوں نے فرخ سیر تک رسائی حاصل کر لی۔ میرا خیال ہے کہ محمد جعفر تقرب خان خانساماں تھے ایرانی ہونے کی وجہ سے ایرانی مہمانوں سے ان کا گھر بھرا رہتا تھا۔ فرخ سیر نے محمد امین کو اپنا مقرب بنا لیا۔

محمد امین سعادت خان | سعادت خان خطاب دیا اور پندرہ صدی ذات کا منصدار بنایا جو شہزادے دیا کرتے تھے۔ اس منصب کو والا جاہی منصب کہا جاتا تھا۔ اور ان کے بھائی محمد باقر کو سیادت خان خطاب دیا۔

محمد امین سعادت خان نائب کروری | جب فرخ سیر بادشاہ ہوا تو اس نے تقرب خان خانساماں کو کروری گنج عطا کی اور ان کو نائب کروری کا عہدہ دیا اس درمیان میں انہوں نے رائے رتن چند سے دوستی پیدا کر لی اور قطب الملک عبداللہ خان سے بھی رابطہ قائم کر لیا۔

محمد امین سعادت خان نامزد گورنر الہ آباد | الہ آباد کے گورنر گردھر بہادر ناگر نے سرکشی اور بغاوت کی۔ رتن چند نے اس کی سرکوبی کے لئے ان کو گورنر بنایا یہ ابھی جانے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے

ایک ناخوشگوار واقعہ | کہ یہ ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا کہ میر جملہ کو قاضی کا عہدہ دیا گیا۔ رائے رتن چند ان کو پروانہ تقرری نہیں دے رہا تھا۔ محمد امین نے

کئی دفعہ اس سے کہا مگر اس نے توجہ نہ کی تو انہوں قطب الملک عبداللہ خان سے اسکی شکایت کی وہ سارا کام رتن چند پر چھوڑے ہوئے تھے ان کی شکایت پر کوئی توجہ نہ کی راے رتن چند کو جب اس شکایت کا علم ہوا تو اس نے الہ آباد جا کے گردھر بہادر ناگر کو تنبہ کر کے اطاعت و فرمابرداری کا عہد لیا اور صوبہ پر اس کو بحال کر کے چلا آیا انکو ملی ہوئی گورنری سے ہاتھ دھونا پڑا ،

محمد امین سعادت خان فوجدار اب رتن چند نے ان کو ہنڈون اور بیانہ کا فوجدار مقرر کیا یہ اٹھارہ لاکھ نکاسی کا علاقہ سرکش زمینداروں اور شورہ پشت جاٹوں سے بھرا ہوا تھا کوئی فوجدار سر بر نہ ہو سکا تحصیل بہت کم ہوگئی تھی رتن چند نے اپنے خیال میں ان کو ناکامی کے حوالہ کر دیا تھا انہوں نے کچھ فوج اکھٹا کی اور کچھ شاہی فوج بخشی سے مستعار لی ۔ کنور رتن سنگھ زخمی نے لکھا ہے کہ آتما رام کھتری کو عہدہ دیوانی اور میرے دادا کیشو رام سکینہ کو عہدہ و رصلباتی نویسی پر رکھ کے ہنڈون و بیانہ چلے گئے اور اس کا انتظام اس خوبی سے کیا کہ تمام مفسد اور سرکش زیر ہو گئے اور مالگذاری وصول ہونے لگی ان کی کارگزاری کا شہرہ ہو گیا اور منصب میں ہزاری کا اضافہ ہوا اسی زمانہ میں انہوں نے مرزا محمد تقی صوبیدار اکبر آباد کی بیٹی سے شادی کی ۱۱۳۱ھ میں سید برادران نے فرخ سیر کا خاتمہ کر دیا یہ بات ان کو بہت کھلی کیونکہ وہ انکا مربی تھا یہ اس سے امید بن باندھے ہوئے تھے اور سید برادران سے رتن چند کی وجہ سے مایوس ہو گئے تھے ۔ کچھ اور لوگ بھی اس بات کو برا سمجھتے تھے کہ اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے اپنے بادشاہ کو ختم کر دیا اسکو نمک حرامی کہا کچھ نے سید برادران کو حق بجانب سمجھا کیونکہ انہوں نے اسکو تخت دلایا تھا اور وہی انکی بیخ کنی میں لگا ہوا تھا ۔ کسی نے کہا

سادات بوے نمک حرامی کردند ۔ کسی نے کہا

سادات دواش اینجا بد کردند

محمد امین ان لوگوں میں تھے جو سید برادران کو نمک حرام سمجھتے تھے۔
خافی خان کا بیان ہے کہ محمد امین کے دل میں فرخ سیر کے خون ناحق کا انتقام جوش مارتا رہتا تھا۔
اب محمد شاہ بادشاہ بن چکے تھے محمد امین کی بلند ہمت فوجداری قناعت نہیں کر سکتی تھی انہوں امیر الامراء محمد امین چین بہادر سے تعلقات پیدا کیے انہوں نے ان کو کارگزار آدمی سمجھ کے اپنا دوست بنا لیا اور دونوں گھل مل گئے وہ سید برادران کے استیصال کی فکر میں تھا محمد امین کو اس نے ہمراز بنا لیا اب محمد امین سعادت خان محمد امین چین بہادر بادشاہ ان کی ماں اور حیدر بیگ خان تک یہ راز مخفی رہا چین بہادر کے بیٹے قمر الدین خان تک چھان نہ ملی۔

آصف جاہ کی بغاوت

آصف جاہ دکن کا گورنر محمد امین چین بہادر کا بھتیجا اس نے چین بہادر کے اشارے سے حسین علی خان کے بخشی دلاور خان کو قتل کر کے اسیر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور سید برادران کے بھتیجے عالم علی کو مار ڈالا جب عبداللہ خان کو خبر ہوئی تو انہوں نے حسین علی خان کو خاندیس سے بلایا دونوں بھائیوں نے بہت غور و فکر کے بعد طے کیا کہ حسین علی آصف جاہ کی سرکوبی کو دکن جائیں اور عبداللہ خان دہلی میں بادشاہ کے پاس رہ کے امور مملکت انجام دیں اس وقت محمد شاہ کا قیام فتحپور سے تینتیس میل کے فاصلہ پر ٹوڈہ میں تھا۔ عبداللہ خان دہلی روانہ ہو گئے ان لوگوں نے دونوں بھائیوں کی جدائی کا موقع غنیمت سمجھا ایک دن حسین علی خان بادشاہ

حسین علی کا قتل

سے رخصت ہو کے اپنے کیمپ جا رہے تھے چین بہادر نے حیدر بیگ خان کاشغری کو تیار کر رکھا تھا اس نے گلال باڑی کے پاس پہنچ کے حسین علی

خان عرضی دکھائی انہوں نے اسکو بلالیا وہ پالکی کا پایہ پکڑے ہوئے ان سے عرض حال کرتا جاتا تھا حسین علی خان عرضی پڑھنے میں مشغول ہوئے تو اس نے خنجر سے پیٹ چاک دیا غیرت خان امیر الامرا کا بھانجا کھانا کھا رہا تھا جب اس کو اس حادثہ کی خبر ہوئی تو وہ دو تین ہزار سواروں کو لیکے بادشاہ کے مقابلہ پر پہنچ گیا اس وقت بادشاہ حرم سرا میں تھے اور ان کی ماں باہر نکلنے سے روک رہی تھیں سعادت خان حسین علی کا سر لیے منہ پر شال ڈال کے حرم سرا سے شاہی میں گھس گئے اور منت سماجت کر کے بادشاہ کو باہر لائے اور کہا کہ جانثاروں کی قیادت کریں اعتماد الدولہ محمد امین حسین بہادر نے بادشاہ کو اپنے ہاتھی پر بٹھایا اور خود خواصی بیٹھ کے سیدوں کے مقابلہ پر آگئے اس وقت آدمی بہت کم تھے حیدر قلی خان میر آتش نے توپخانہ کو ہراول میں رکھا اور سعادت خان اپنی فوج لے کے غیرت خان پر ٹوٹ پڑے غیرت خان مارا گیا اس کا لشکر بھاگ گیا سعادت خان نے اسکا سارا سامان لوٹ لیا جس سے وہ دولتمند ہو گئے ۔

سعادت خان برہان الملک اس بہادری کے صلہ میں بادشاہ نے سعادت خان کو برہان الملک خطاب اور پنج ہزاری ذات کا منصب عطا کیا ۔

ابھی عبداللہ خان دہلی نہ پہنچے کہ بھائی اور بھانجے کے قتل کی خبر سنی انہوں نے رفیع القدر کے بڑے بیٹے محمد ابراہیم کو قید سے نکال کے بادشاہ بنایا ۔ چورامن جاٹ ان کے ساتھ ہو گیا ادھر کے بھاگے ہوئے سپاہی بھی ان کے پاس پہنچ گئے خود ان کی فوج یہ سب مل کے ایک لشکر گران تیار ہو گیا اور وہ بادشاہ کو قتل کرنے کے لئے روانہ ہو گئے ۔

ادھر سعادت خان برہان الملک کی چودہ ہزار فوج تھی راجہ جے سنگھ نے چار ہزار سوار بھیجے محمد خان بنگش تین ہزار فوج لے کے پہنچ گئے عزیز خان روہیلہ اور بایزید خان میواتی بھی چار چار ہزار فوج لے کے بادشاہ کی مدد کیلئے پہنچ گئے کچھ شاہی فوج تھی جس سے ادھر بھی

ایک بڑی فوج تیار ہو گئی۔

عبداللہ خاں سے مقابلہ | جمعرات ۱۴ محرم ۱۱۳۳ھ کو عبداللہ خاں سے شاہ پور کے قریب معرکہ کارزار گرم ہوا شاہ پسند ہاتھی پر بادشاہ میدان جنگ میں موجود تھے۔ عبداللہ خاں کے بھتیجے نجم الدین علی خاں اور دوسرے سادات بارہ نے شاہی فوج پر بے جگری سے حملہ کیا اور درختوں کی آڑ سے گولے برسانا شروع کئے ادھر سے بھی مقابلہ ہوا مگر سادات کا حملہ اتنا شدید تھا کہ شاہی فوج گھبراگئی اور صفوں میں ابتری پیدا ہوگئی۔ یہ دیکھ کر سعادت خاں برہان الملک اور محمد خاں بنگش نے عبداللہ خاں کے لشکر کی کمرگاہ پر حملہ کر دیا۔ سخت جنگ ہوئی نجم الدین علی خاں مارا گیا اور عبداللہ خاں کے بہت سے سپاہی بھاگ نکلے چورامن جاٹ بھی مارا گیا عبداللہ خاں زخمی ہو کے قید ہوئے۔ اس شجاعت کے صلہ میں سعادت خاں برہان الملک کو بہادر جنگ خطاب ہفت ہزاری منصب سات ہزار سوار ماہی مراتب خلعت فاخرہ اکبرآباد کی صوبیداری اور خواص شاہی کی داروغگی عطا ہوئی۔ اوران کے بھتیجے نثار محمد خاں کو شیر جنگ خطاب عنایت ہوا۔

سعادت خاں برہان الملک بہادر جنگ اکبرآباد میں | بادشاہ سے رخصت ہو کے اکبرآباد پہنچے یہاں کے بہت سے سرکشوں نے متھرا کی طرف اور شاہ آباد کے نزدیک قلعے بنا لئے تھے برہان الملک نے انکا محاصرہ کیا اور سخت جنگ کے بعد وہ قلعے ان سے چھین لئے بادشاہ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو خلعت خنجر مرصع اور فرمان ان کی بہادری کی تعریف میں بھیجا صوبہ اودھ کا گورنر گردھر بہادر ناگر تھا اس کی نااہلی اور بد انتظامی کی شکایت تھی سرکش راجہ اور زمینداروں کے آگے کبھی کسی صوبیدار کی نہ چلی تھی مؤلف قیصر التواریخ لکھتا ہے کہ حاسدوں نے برہان الملک کو ناکام بنانے کے لئے بلونتا

کو مشورہ دیا کہ صوبہ اودھ برہان الملک کو دیدیا جاے بادشاہ نے منظور کر لیا۔

برہان الملک صوبیدار اودھ اور ۱۱۳۳ھ میں ان کو اودھ کا صوبہ دار بنا دیا گیا۔

چورامن جاٹ جو عبداللہ خان کی طرف سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا اسکے بیٹوں نے گھنے جنگلوں میں قلعے بنا کے متھرا کے قریب بغاوت کی اس کی سرکوبی کے لئے برہان الملک کو بلایا گیا وہ بلغار کرتے ہوئے پہنچے جاتوں کی سرکوبی کے لئے ان سے کہا گیا مگر گھنے جنگلوں میں ہونے کی وجہ سے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ جے پور کے راجہ جے سنگھ سوائی نے کہا کہ اگر مجھ کو آگرے کا صوبہ دیدیا جائے تو میں اپنی فوج سے جاٹوں کی سرکوبی کر دونگا بادشاہ نے منظور کیا اور آگرہ کا گورنر جے سنگھ کو بنا دیا برہان الملک اودھ جانے کی تیاری کر رہے تھے اور آگرے میں رائے نیلکنٹھ کو اپنا نائب بنا کے آئے تھے اس کو کسی زمیندار نے قتل کرا دیا ان کو جب معلوم ہوا تو آگرے جانا چاہا اس وقت ان کو بتایا گیا کہ آگرہ کا صوبہ جے سنگھ سوائی دیدیا گیا آپ کو وہاں کی دارو غگی اور اودھ کا صوبہ بدستور بحال ہے۔

ان کی فوج اور خزانہ جے سنگھ کے تصرف میں چلا گیا یہ بیدست و پا ہو گئے دوسرا ہوتا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے مگر انہوں نے تدبر سے کام لیا ایرانی اور تورانی سپاہی اور سرداران فوج جو دہلی میں بیکار بیٹھے تھے ان کو جمع کیا اور کہا کہ میرے ہم وطنو اگر اس وقت تم بغیر تنخواہ کے میری رفاقت اور سوکھے ٹکڑوں پر قناعت کرو گے تو آئندہ بلاؤ کی امید بھی رکھو سب کے سب سنتے ہی تیار ہو گئے انہوں نے توپ خانے سے کچھ توپیں لیں اور ایک فوج مرتب کی زیبو زینچ کے بار برداری کے بیل خریدے سپاہیوں نے ایرانی لمبی کالی ٹوپیاں سر پر رکھیں اور تلوار کمر سے باندھ کے نکلے برہان الملک ایک

جب یہ لشکر لیکر روانہ ہوا کبر آباد پہنچے تو وہاں کے گورنر نے دعوت کرنا چاہی انہوں نے کہا کہ بجائے دعوت کے نقد رقم دید یجئے اس نے ایک کثیر رقم پیش کی انہوں نے وہ سب رقم فوج پر تقسیم کر دی اور وہاں سے روانہ ہوگئے بریلی پہنچے یہاں بھی وہی صورت پیش آئی اور نقد رقم لیکر فوج پر تقسیم کر دی بریلی سے فرخ آباد پہنچے وہاں محمد خان بنگش نے پرتپاک استقبال کیا۔ اور دعوت کرنا چاہی انہوں نے ان سے نقد رقم طلب کی انہوں نے بھی ایک کثیر رقم دی جو فوج پر تقسیم ہوگئی اس رقم کے علاوہ انہوں نے بہت مفید مشورے دیئے اور کہا کہ آپ یکایک لکھنو میں داخل نہ ہوئیے شیخ زادے بہت سرکش ہیں اور قصبات کے لوگ انکے دشمن ہیں کیونکہ شیخ زادوں نے ان کو بہت پریشان کر رکھا ہے وہ آپ کے وجود کو غنیمت سمجھ کے آپ کے مددگار ہو جائینگے اسطرح شیخ زادوں کا زور ٹوٹ جائے گا۔

نواب یہاں سے چل کر لکھنو پہنچے اور گومتی کے کنارے قیام کیا۔

برہان الملک لکھنو میں رات کو کشتیوں کا پل بنا کے دریا عبور کرنا شروع کیا بیچ منجدھار میں پہنچے تو ایک مچھلی اچھل کے نواب کی گود میں گری اس کو نیک فال سمجھ کے رکھ لیا یہی مچھلی حکومت اودھ کا مارکہ بنی اور اسکے استخوان احتیاط سے خزانہ داخل ہوئے جو واجد علی شاہ تک محفوظ رہے۔

نواب راتوں رات دریا عبور کر کے توپخانہ کے ساتھ شیخن دروازے پہنچ گئے وہ ہاتھی پر سوار تھے۔ شیخن دروازے پر جو تلوار لٹک رہی تھی۔ اس کو کاٹ کے گرا دیا۔ شیخ زادے نے دفعتاً اپنے سر پر نواب کے آ جانے سے اپنے کو مجبور پاکے سامنے حاضر ہوگئے اور سر اطاعت جھکا دیا نواب نے ان کو مچھی بھون خالی کرنیکا حکم دیا انہوں نے کہا کہ ہمارے لڑکوں کو چیچک نکلی ہے آٹھ دن کی مہلت دی جائے یہ بات منظور ہوئی آٹھ دن کے بعد انہوں نے مچھی بھون خالی کر دیا ذرگاہ دان میں بسنے کے لئے ان کو زمین دی گئی

اور مچھی بھون کا کرایہ پانچ سو روپیہ ماہوار مقرر ہوا جوان کو ملتا رہا نواب نے اس کو مقام فتح سمجھ کے نقارخانہ بنوایا جس میں ۵ وقت نوبت بجتی تھی اور مچھی بھون دارالامارہ قرار پایا شیخ زادوں کو فرمانبردار دیکھ کے شورش نہ ہوا اور پٹھان بھی مطیع ہو گئے لکھنو پر نواب کی گرفت مضبوط ہو گئی فوجوں کے ہر طرف کیمپ قائم ہو گئے صبح شام توپیں سرہونے لگیں۔

لکھنو کو ایک نئی رونق حاصل ہوئی اور حاکم نشین شہر معلوم ہونے لگا۔

لکھنو میں جب ان کے قدم جم گئے تو انہوں نے چاروں طرف کے راجاؤں کو فرمان بھیجا ان سرکشوں حسب معمول اعتنا نہ کی۔

بسواڑہ پر حملہ بسواڑے کا راجہ جیت رائے بڑا طاقتور تھا اسکے پاس بہت بڑی فوج تھی اسکا قلعہ دریاؤں اور جنگلوں سے گھیرا ہوا تھا برہان الملک نے محاصرہ کر کے توپ سے برج قلعہ اڑادی اور چہار دیواری چھلنی کر دی اس نے قلعہ سے باہر نکل کے اپنی فوج کے مختلف دستے بنائے اور برہان الملک پر کئی طرف سے حملہ کر دیا دست بدست جنگ کی نوبت پہنچی ادھر کے بہادروں نے بھی داد شجاعت دی سخت معرکہ پیش آیا راجہ کی فوج کے ہزار جوان مارے گئے ادھر کے بھی پانچو بہادر کام آئے راجہ مادھو رام کھتری نے جان نثار کی۔ آخر راجہ تنہا جنگل کی طرف بھاگ گیا نواب نے اس فتح کی خوشی میں فوج اور سرداروں کو خلعت اور ہاتھی عنایت کئے اور تنخواہ میں اضافہ کیا۔ اور لکھنو واپس آئے۔

تلوئی پر حملہ موہن سنگھ راجہ تلوی نے بھی بہت فوج جمع کر رکھی تھی اور آس پاس کے زادے اسکے مطیع ہو گئے تھے یہ ایک بڑی طاقت بن گیا تھا اور کسی صوبیدار کو دھیان میں نہ لاتا تھا نواب نے اسکے قلعہ کا محاصرہ کیا اور توپ خانہ سے حصار قلعہ پر ایسی آتش بازی کی کہ وہ بغیر لڑے سارا مال و اسباب چھوڑ کے بھاگ گیا نقد و جنس کھانے پینے کی چیزیں ہاتھی گھوڑے سب ضبطی میں آئے یہ دیکھ کر دوسرے سرکش راجہ خود سے مطیع و فرمانبردار ہو گئے۔ اسوقت صوبہ

اودھ کے جنوب میں گنگا شمال میں راپتی اور نیپال کی ترائی مشرق میں عظیم آباد اور مغرب میں شاہ آباد ضلع ہردوئی ملک کی آمدنی ستر لاکھ تھا نواب نے پہلے ہی سال ڈیڑھ کروڑ روپیہ وصول کر کے بادشاہ کو بھیجا۔

اجودھیا کی اہمیت | صوبہ اودھ کا وسطی مقام اجودھیا تھا نواب نے ہر طرف جلد پہنچنے اور باخبر رہنے کے لئے اپنا فوجی کیمپ اجودھیا میں قائم کرنا ضروری سمجھا۔

جب نواب مع فوج کے وہاں پہنچے تو شام کو اذان اور گھنٹے کی آواز ایک ہی جگہ سے سنائی دی انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے اذان اور گھنٹے کی آواز ایک ہی جگہ سے آرہی ہے تو انہیں بتایا گیا کہ یہ ہندوؤں کی مقدس عبادت گاہ ہے اسکے قریب بابر نے ایک مسجد بنوائی ہے مسجد سے اذان کی آواز آرہی اور مندر سے گھنٹے کی انہوں نے کہا کہ یہ کیا کیا اپنی عبادت میں بھی خلل ڈالا اور دوسروں کی عبادت میں بھی اسی وقت حکم دیا کہ یہاں سے تین کوس ہٹ کے پھوس کا بنگلہ اور چہار دیواری تیار کی جائے انہوں نے سوچا کہ یہاں توپوں کا رہنا صبح شام نقارہ بجنا ہندوؤں کی عبادت میں خلل ڈالے گا۔ فوراً تعمیر شروع ہوگئی اور بہت ہی جلد چہار دیواری اور بنگلہ بن کر تیار ہوا نواب اس میں منتقل ہو گئے یہ جگہ بنگلہ کے نام مشہور ہوئی برسات میں وہ لکھنؤ آجاتے تھے اور باقی دنوں بنگلہ میں رہتے تھے ۱۱۳۷ھ میں صوبہ کا انتظام مضبوط کر کے اپنے تمام اہل خاندان کو بلا لیا اور مرزا مقیم کو دہلی طلب کیا اور بادشاہ کے سامنے پیش کیا انہوں نے ہفت ہزاری منصب اور ابو المنصور خان صفدر جنگ خطاب مرحمت فرمایا۔

برہان الملک خواجہ باقر خان کو اپنا نائب بنا کے دہلی گئے تھے انکی نااہلی سے جنگجو راجاؤں نے پرگنوں سے عمال کو ہٹا دیا یہ خبر سن کے نواب صفدر جنگ کو لیکے اجودھیا پہنچا انکی

آمد سے سرکش دبل گئے نواب نے ہرجگہ مستعد اور تجربہ کار عامل معین کئے محاصل آسانی سے خزانہ میں جمع ہونے لگے سپاہ کو انکی مرضی کے موافق کسی کو ماہانہ کسی رسالہ کو پندرہویں دن کسی کو روزانہ تنخواہ ملتی تھی ۔ دائمی جاگیریں اور روزینہ مددمعاش کے لئے معین ہوئے ۔

نواب اپنے بھانجے مرزا مقیم کو اپنا پیش دست بنایا اور ہر طرح کا کام ان سے لیکے مدبر منتظم اور میدان جنگ کا تجربہ کار بنا دیا

صدر جہان بیگم کی شادی | ۱۱۴۲ھ میں صدر جہان بیگم سے شادی منصور جنگ نے کی منشی انعام علی نے اوصاف آصف اس شادی کا انکھوں دیکھا حال یہ لکھا ہے کہ ملنے کی عمارت دولہا دلہن کے رہنے کیلئے تجویز ہوئی بڑے تکلفات کے ساتھ اندر اور باہر سے اسکو آراستہ کیا گیا چھت اور کھمبے طرح طرح سے سجائے گئے ہر کمرہ ۔ چوکی خانہ ، دلوان خانہ ، نوکر خانہ ، الوان فرش فرش سے آراستہ ہوا مخمل دوخوابہ کے کھلاکار اور دریاؤ کمخواب کے پردے اور سہری پردے پڑے ایوان کے ستون مخمل کاشانی سے مزین ہوئے ہر کوشک و کاشانے سے نور برسنے لگا در ودیوار حلیہ خانے سے پائین باغ تک اور وہاں سے دریائے گومتی تک ہزار دں طرح طرح کے درخت اور برج بنائے گئے ۔ شاہ پیر محمد ٹیلے سے راج گھاٹ تک جسکا میلوں کا فاصلہ ہے جگہ ترپولئے اور محرابوں سے آراستہ اور چراغاں سے بقعہ نور بنا ۔ گومتی سے اسطرف اور الفت نگر سے گوندنا گھاٹ تک دیوار چراغاں بنائی گئی جس سے دریا جو کہ کہکشاں بن گیا دریا کے اسطرف دیوار چراغاں اور اس طرف ساکھو کے لٹھو پر مخمل کے پردے لگائے گئے اور محرابوں نے ایک عجیب منظر پیدا ہو گیا ۔ جب دریا اسطرح سجایا گیا تو شہر کی آرائش کا کیا حال ہوگا منشی انعام علی کا بیان ہے کہ صحن دولت خانہ سے پائین باغ تک پھولوں سے بھرا ہوا تھا ۔ ایک طرف آتش بازی سے نور کے پھول برس رہے تھے محفل رقص و سرود آراستہ تھی ایسے ایسے مغنی جمع تھے جنہوں نے تان سین کو بھلا دیا تھا ہاتھ میں دف صف و صف بستہ دست باری

بالا خانہ نازنینان پری پیکر رقص کناں دریا سے کو بان دولہا کے سامنے سے گذر رہے تھے ۔

یہ تمام تفصیل منشی انعام علی نے لکھی پھر بھی بہت کچھ چھوٹ گیا انہوں نے صرف آرائش اور رقص و سرود کے ذکر پر اکتفا کی یہ نہیں بتایا کہ زر و جواہر کتنے لٹائے گئے انعام و اکرام کیا کیا دیا گیا کھانے کیسے پکے اور کس افراط سے پکے ۔ غرض یہ شادی بڑے تزک و احتشام سے ہوئی ۔

۱۱۴۵ھ میں ایک سال کے بعد لکھنؤ میں ولادت فرزند ہوئی اسکا نام جلال الدین حیدر رکھا گیا بہت سے شعرا نے تاریخ ولادت کہی مگر یہ تاریخ بہت پسند کی گئی ہے

دولت خانہ نواب منصور　　　　برآمد آفتاب از مطلع نور

شاعر کو ۵۰۰۰ روپیہ انعام اور پانچ گاؤں انعام ملا نواسے کی ولادت کی خبر سن کے نواب لکھنؤ آئے اور بڑی دھوم سے جشن ولادت منعقد ہوا ۔

بھگونت سنگھ پر حملہ

بھگونت سنگھ اراڑو غازیپور کا راجا اور چکلہ کوڑا کا زمیندار تھا ۱۱۴۶ھ میں اس نے سرکشی پر کمر باندھی اور جانثار خان چکلہ دار کوڑا کو جو قمر الدین خان وزیر اعظم کے داماد تھے قتل کر کے اسکا سارا سامان لوٹ لیا قمر الدین خان اسکی سرکوبی کو آئے تو وہ روپوش ہو گیا برہان الملک بادشاہ سے ملنے دہلی جا رہے تھے کہ قمر الدین خان کا خط ملا ہر گاہ ارادہ بدرگاہ آسمان جاہ دارند اول بھگونت را بردارند برہان الملک اسوقت موہان میں تھے انہوں نے نور محمد پنجابی اور دکھی رائے کھتری کو یہ مہم سپرد کی اور حکم دیا کہ جاجمئو کے راستہ چکلہ کوڑا پہنچیں اور خود بھٹور کے راستہ دہلی روانہ ہوئے راستہ میں بھگونت سنگھ کا خط ملا جس میں رحم کی درخواست تھی نواب نے لکھا ۔

بھگونت بداند باید کہ تہ ماندم ارسیدہ داند او بھٹور سے دہلی روانہ ہو گئے ۔ نور محمد خان پنجابی اور دکھی رائے کا سارا سامان جاجمئو میں تھا کہ بھگونت سنگھ نے لوٹ لیا دکھی رائے نے نواب کی خدمت میں جا کے عرض حال کیا وہ دہلی کا سفر ملتوی کر کے چکلہ کوڑا

روانہ ہوگئے۔ بھگونت سنگھ وہاں سے اپنی اصل راجدھانی غازیپور بھاگ گیا اور قلعہ کو مستحکم کرکے بیٹھ گیا اس کے پاس دس بارہ ہزار فوج بے شمار اسلحہ اور پانچ سوایسے جانباز تھے جو سفر و حضر سیر و شکار اور جنگ و پیکار میں ہمیشہ اسکے ساتھ رہتے تھے اور سب یکتا بہادر تھے بھگونت سنگھ خود بھی بہادری میں یکتائے روزگار تھا نواب اسکے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ اور موضع بھوہ پہنچ گئے جو غازیپور سے بارہ کوس پر ہے دوسرے دن وہاں سے دو کوس جنوب میں پہنچ گئے۔ بھگونت سنگھ نے یہ دیکھ کے فوج طلب کی رسوئی داروں نے کہا رسوئی تیار ہے اس نے کہا میں تُرکوں سے اطمینان کر کے آتا ہوں۔ نواب کی فوج کھانے پینے کی فکر میں تھی جانور پانی پر گئے تھے نواب بھی خیمہ میں تھے کہ اس کی آمد کی خبر سنی وہ ہاتھی پر سوار ہوئے فوج بھی جلد تیار ہوگئی کہ سامنے سے گرد نمودار ہوئی بھگونت سنگھ نے ایک گولے کے فاصلہ پر پہنچ کے فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور تین طرف سے حملہ کر دیا نواب نے زبردست مقابلہ کیا اسکے حملہ کا سارا زور نواب پر تھا ابوتراب خان نے یہ دیکھا تو وہ مقابلہ پر آئے بھگونت سنگھ نے انکے سینے میں نیزہ مارا سینہ توڑ کے باہر نکل گیا نواب کی فوج نے آگے بڑھ کر مقابلہ کرنا چاہا لیکن انہوں نے روک دیا اور کہا کہ قریب آنے دو جب وہ قریب پہنچے تو حملہ کا حکم دیا خود ہاتھی پر بیٹھے تھے۔ کسی نے ان کو تیر مارا جو پاؤں میں لگا انہوں نے وہ تیر نکال کر تیر انداز کو وہی تیر مارا جو اس کے پیٹ میں لگا اور وہ وہیں ٹھنڈا ہوگیا نواب نے تیر کی بارش شروع کر دی راجہ بلرام ہاتھی پر سوار ہو کے آگے بڑھے دست بدست جنگ ہونے لگی دونوں طرف کے سپاہی ایک دوسرے پر بے جگری سے ٹوٹ پڑے لاشوں پر لاشیں گرنے لگیں کشتوں کے پشتے لگ گئے آخر بھگونت سنگھ مارا گیا نواب شیخ عبداللہ کو کوڑہ کا چکلہ دار بنا کے بفتح و فیروزی بادشاہ کی خدمت میں پہنچے سب نے ان کی شجاعت و کامرانی کی تعریف کی اس کے بعد وہ لکھنو واپس آگئے۔

باجی راؤ سے جنگ ۱۱۴۹ھ میں باجی راؤ ایک کثیر فوج کے ساتھ دریائے جمنا کو عبور کر کے دہلی کی طرف بڑھا دربار سے برہان الملک کو حکم ہوا کہ وہ جلد اسکے مقابلہ کو جائیں وہ عیسیٰ بیگ خان کو اپنا نائب مقرر کر کے پچاس ہزار فوج کے ساتھ صفدر جنگ کو لیکے شکوہ آباد کے حدود میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ اسمٰعیل بیگ انکے سردار فوج کو باجی راؤ نے لوٹ لیا نواب نے اکبر آباد سے پانچ کوس کے فاصلہ پر ادمیدپور کے تالاب پر قیام کیا اور صفدر جنگ کو اسکے مقابلہ پر بھیجا وہ جالیسر کے راستہ سے وہاں پہنچ گئے جہاں باجی راؤ خیمہ زن تھا اس نے صفدر جنگ پر کمینگاہ سے حملہ کر دیا انہوں نے بھی مقابلہ کیا جنگ شروع ہو گئی صفدر جنگ ہاتھی پہ قلب میں قائم ہوئے اور اعلان کیا کہ فی سر ایک اشرفی اور لوٹ میں حصہ ملے گا یہ سنتے ہی ایرانی و تورانی سپاہی مرہٹوں پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے دیکھتے نواب کے ہاتھی کے سامنے سروں کا انبار لگ گیا سپاہیوں کی ہمیانیاں اشرفیوں سے بھر گئیں شام تک میدان کا بازار گرم رہا سورج ڈوبتے ہی مرہٹے بھاگ نکلے صفدر جنگ فتح کے نقارے بجاتے برہان الملک کے پاس پہنچ گئے دونوں نواب ادمیدپور سے چل کے خواجہ محرم کی سرئی کے پاس پہنچے جو شکوہ آباد سے دو کوس پر ہے رات وہیں گذاری صبح کو دونوں نواب میدان جنگ کے ملاحظہ کو آئے یہاں مرہٹے مسلح تھے انہوں نے حملہ کر دیا دوبارہ جنگ شروع ہو گئی دوپہر تک سخت لڑائی ہوئی اسکے بعد مرہٹے فرار ہو گئے دونوں نواب بفتح فیروزی واپس ہوئے ۔

باجی راؤ کا عا بہاری کے راستہ دہلی کے پاس کالکا کے مندر تک پہنچ گیا وہاں سالانہ میلا لگا ہوا تھا لاکھوں ہندو مسلمان اور ہر طرح کے دوکاندار جمع تھے یہ آفت ناگہانی کی طرح نازل ہوا اور میلے کو لوٹ لیا ۔

میر حسن جان کوکا جو کی خاص کے منصب داروں کے داروغہ نے پانچ ہزار قلعہ کے اندر

کے سواروں کو لیکے مقابلہ کیا حالات کی نزاکت دیکھ کے امراے دربار نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ
باجی راؤ کو چوتھ وصول کرنے کا پروانہ دیکے بلا کوٹال دیا جائے بادشاہ نے پروانہ لکھ دیا اور
مرہٹے رکن واپس ہو گئے برہان الملک کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے حکم دیا کہ تین دن کی روٹیاں
تیار کرلی جائیں میں بغیر منزل کئے نرمدا تک مرہٹوں کا تعاقب کرونگا دوسرے دن نواب آندھی و
طوفان کی طرح روانہ ہو گئے اور مرہٹوں کی گھ پیادہ ان کی تلوار کا مزہ چکھ چکے تھے اس باختہ ہوگئے
ادھر امراے دربار نے بادشاہ سے کہا کہ مرہٹے جہاں پناہ سے چوتھ کا پروانہ لیکے واپس ہوئے
تھے شاہی حکم کے بغیر ان پر حملہ وقار شاہی کے خلاف ہے فوراً یہ خط برہان الملک کو بھیجا
گیا کہ مرہٹوں کا تعاقب حکم شاہی کے بغیر آداب شاہی کے خلاف ہے برہان الملک نے خط دیکھتے
ہی مرہٹوں سے کہا کہ ہم اس شرط پر تمہیں چھوڑ دینگے کہ یہ لکھ کے دیدو کہ کبھی ادھ کا رخ نہ کروگے
ان کی جان میں جان آگئی فوراً تحریر لکھ دی نواب محاصرہ اٹھا کے دہلی روانہ ہوئے خضر آباد متصل
دہلی قیام کیا اور بادشاہ کی خدمت میں صفدر جنگ کو بھیجا اور ظاہر کیا کہ جانثار سلطنت کی پیٹھ میں
چھوڑا نکلا ہے وہ آداب شاہی بجالانے کے قابل نہیں ہے یہ ترکیب اسلئے کی کہ سر دربار انکو
سرزنش نہ کی جائے دربار آراستہ تھا امرا اپنے اپنے درجوں پر بیٹھے تھے نواب صفدر جنگ حاضر
ہوئے جو دفور شجاعت و تہور سے ترک فلک معلوم ہو رہے تھے حضور شاہی سے خلعت زرنگار
مالاے مروارید و سیف ہندی مرحمت ہوئی اور دونوں نواب لکھنو واپس آئے ۔

نادر شاہ سے جنگ | ۱۱۵۵ھ میں برہان الملک زہر باد میں مبتلا ہوئے وہ موضع
گوپال پور متعلق چکلہ کوڑا میں دریائے گنگا کے کنارے صفدر جنگ کے ساتھ مقیم تھے کہ نادر شاہ
نے حملہ کیا برہان الملک طلب ہوئے زہر بادی کی وجہ سے درد کی شدت تھی مگر وہ اپنی غیر معمولہ
فطری بہادری سے اس کا خیال کئے بغیر ایک جرار فوج اور توپ خانہ لیکے روانہ ہو گئے ادھر
بادشاہ ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ لاہور کی طرف روانہ ہو چکے تھے اور کرنال سے تین میل

کے فاصلہ پر ایک نہر کے پل کے قریب قیام تھا۔ یہی جگہ مورچہ بنانے کے لیے تجویز ہوئی تھی۔ برہان الملک اپنی فوج کے ساتھ خدمت شاہی میں حاضر ہوئے۔ نادر شاہ چھ میل کے فاصلہ پر تھا دوسرے دن میل میل کے فاصلہ پر آگیا ادھر سے گولہ باری شروع ہوئی نادری فوج گولے کے پلہ سے باہر ہٹ گئی اور برہان الملک کی بنگاہ جو ابھی راستہ میں تھی لوٹ لی جب انہیں معلوم ہوا تو وہ ایک جماعت لے کے نادری فوج پر ٹوٹ پڑے اور صفیں الٹتے ہوئے آگے بڑھنے لگے تیس ہزار کے قریب نادری فوج کے دستے کے دستے چقماقی بندوقیں سر کرتے ہوئے میدان میں آئے اور اس زور کی جنگ ہوئی کہ میدان کارزار گرد و غبار سے تاریک ہوگیا برہان الملک نے اس حملہ کو روک کے ایسا جوابی حملہ کیا کہ کشتوں کے پشتے لگا دیئے صمصام الدولہ اور خان دوران خان کو جب معلوم ہوا کہ برہان الملک کا رہائے رستمانہ کر رہے ہیں تو وہ بھی میدان میں پہنچ گئے جنگ نے ایسی شدت اختیار کی کہ خون کا دریا بہنے لگا لاشوں کے انبار لگ گئے منشی انعام علی کہتے ہیں۔

یکے فوج ترکان پر خاش جو　　　یکے لشکر ہندی جنگ جو

ہمہ غلبہ کروند اقلب ۔ ہم　　　بہندوستاں و تیغ و دژم

زوال آفتاب تک اسی شدت سے جنگ ہوتی رہی دوپہر کے قریب ہندوستانی سپاہیوں نے گھوڑوں سے اتر کے دامن سے دامن باندھ کے اس زور کا حملہ کیا کہ نادری خیمہ تک پہنچ گئے اس حملہ میں صمصام الدولہ اور انکے بھائی مظفر علی خان میر کلو میر شرف علی خان جاوید علی خان کوکا اور دوسرے امرائے نامدار پنج و نہ ہزاری و شش ہزاری کام آئے برہان الملک دشمن کی صفیں الٹتے ہوئے آگے بڑھتے رہے ادھر انکے بھتیجے شیر جنگ نادری فوج پر زبردست دباؤ ڈالتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے شیر جنگ کا ہاتھی مست تھا۔ وہ برہان الملک کے ہاتھی سے لڑ گیا اتفاق سے ایسی سخت آندھی آئی کہ آدمیوں کا کھڑا ہونا مشکل ہوگیا کتنے درخت جڑ سے اکھڑ گئے اس پر بھی ہاتھیوں

ریلے دھکیلے جاری رہے برہان الملک کے گرد دشمن کی فوج گھس گئی پھر بھی نواب کے استقلال میں فرق نہ آیا جب زرا آندھی کم ہوئی تو برہان الملک کے پاس تھوڑے سپاہی رہ گئے قزلباشوں نے جب یہ حال دیکھا تو نواب کو گھیر لیا یہ دیکھ کر بچے کھچے جوان جو سمٹ آئے اور پھر تیر و تفنگ خنجر و تفنگ سے میدان گونجنے لگا اور بہادروں کے سر زمین پر گرنے لگے ہاتھی کا میگھ تیروں اور گولیوں سے چھلنی ہو گیا مگر اقبال کی یاوری سے نواب کو کوئی زخم نہیں پہنچا ان کی فوج کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ جب تک سب کٹ نہیں گئے نواب کا ساتھ نہیں چھوڑا جب وہ تنہا رہ گئے تو نادری سپاہیوں نے گھیر لیا اور نادر شاہ کے پاس لے گئے اس نے پوچھا کہ جنگ کی گم ایرانی ہوتے ہم سے اسطرح لڑ رہے ہو اسکا جواب منشی انعام علی کی زبانی سنئے۔

بگفتا جوان مرد فرخندہ بخت — لعیرے و ہندوستان بردہ رخت

بجز حق شناسی چہ آید زمیں — رود گر بمہ دولت و جان و تن

نادر شاہ نے ایک خیمہ میں ان کو قید کر دیا۔ ہندوستانی فوج کو اس شکست سے سخت نقصان پہنچا۔ امرائے عالی مرتبہ مارے جا چکے تھے نادری فوج نے چاروں طرف سے گھیر کے رسد بند کر دی کی نوبت آگئی۔ محمد شاہ نے صمصام الدولہ کے انتقال کی وجہ سے نظام الملک آصف جاہ کو خلعت بخشی گری اول دے کے نادر شاہ کے پاس بھیجا انہوں نے ایک کروڑ روپیہ پر اسکی واپسی طے کر دی محمد شاہ عمدۃ الملک امیر خان اور موتمن الدولہ اسحاق خان شوستری کو لیکے نادر شاہ کے پاس گئے۔ دونوں میں شاہانہ ملاقات ہوئی۔ اور مصالحت ہو گئی دونوں بادشاہ دار الخلافہ روانہ ہوئے۔ بادشاہ نے برہان الملک سے فرمایا کہ طہماسپ خان جلائر (نادری فوج کے سردار) کے ساتھ جائیں اور نادر شاہ کے لئے قلعہ میں ایک جگہ مقرر کی کہ وہاں اسکے قیام کا انتظام کریں دونوں بادشاہ دہلی پہنچے برہان الملک دن بھر مہمانداری کے انتظام میں مشغول رہے مگر زہر باد اس پر زخموں کی اذیت سے غش پر غش آئے جب ہوش آتا تھا تو انتظام میں مشغول ہو جاتے تھے۔

وفات رات ہوئی آصف جاہ عیادت کے لئے آئے اور پہلے سے کہلوا دیا تھا کہ تعظیم کیلئے نہ اٹھیں مگر جب وہ آئے تو نواب سہارا لیکے تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے رات کو قریب صبح انتقال ہو گیا اسوقت ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی جب محمد شاہ کو خبر ہوئی تو بہت افسوس کیا اور ان کے صغیر السن بچے کو باپ کے عہدہ پر سرفراز کر دیا مگر کارفرمائی بدستور سابق صفدر جنگ کے ذمہ رہی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ بعض مورخین نے یہ لکھا ہے کہ برہان الملک نے خودکشی کر لی تھی اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ نادر شاہ سے ایک کروڑ روپیہ پر مصالحت کر کے اس کی واپسی طے کر دی اور نظام الملک کے ذریعہ بادشاہ کو اطلاع دی انہوں نے بادشاہ کو یہ کارگذاری اپنی بتائی جسکے صلہ میں ان کو وزیر اعظم بنا دیا گیا برہان الملک اس کارگذاری کے صلہ میں خود وزیر اعظم بننے کے امیدوار تھے۔ انہیں جب یہ حال معلوم ہوا تو نادر شاہ سے کہا کہ اگر آپ دہلی چلیں تو اربوں کی دولت ہاتھ آئیگی اس طرح وہ اسے چڑھا کے لائے اور دہلی لوٹ ڈالی پھر خیال آیا کہ نادر شاہ کے جانے کے بعد اس غداری کی وجہ سے میں شکنجہ میں مر جاؤنگا تو خودکشی کر لی۔ اگر واقعہ یہ ہوتا تو بادشاہ کو انکے مرنے کا اتنا غم کیوں ہوتا اور انکے نابالغ بچے کو صوبہ دار کیوں بناتے کسی وفادار کو بناتے۔

ان مورخین کو یہ بھی نہیں معلوم کہ نادر شاہ کے دہلی آنے کے بعد پندرہ سولہ گھنٹے کے اندر برہان الملک کا انتقال ہو گیا اور دہلی ان کے کئی دن بعد لٹی افیونچی نے افواہ اڑائی کہ بادشاہ نادر شاہ کو قلعہ کی قلماقنیوں نے قتل کرا دیا اس سے تو لوگوں نے نادری سپاہیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا جب نادر شاہ کو معلوم ہوا تو وہ گھوڑے پر سوار ہو کے نکلا کہ لوگ مجھے زندہ دیکھ کے ہنگامہ ختم کر دیں تو لوگوں نے اس پر بھی گولیاں چلائیں جس سے اسکا ایک محافظ ہلاک ہو گیا اور جگہ جگہ اس نے اپنے سپاہیوں کی لاشیں دیکھیں تو اسکو غصہ آگیا مسجد میں تلوار کھینچ کے بیٹھ گیا اور قتل عام کا حکم دیدیا

سر، سے پہلے دوستانہ فضا میں دونوں بادشاہ دوستار بدل بھائی بنے اگر یہ افواہ نہ اڑتی تو دو چار دن کے بعد نادر شاہ واپس چلا جاتا وہ نہ دہلی لوٹنے کے خیال سے آیا تھا نہ برہان الملک اسے لائے تھے محمد شاہ خود اس سے ملنے گئے اور اپنے ساتھ دہلی لائے اسکے بعد کچھ ہوا وہ اچانک ہوا جسکا تعلق برہان الملک کی ذات سے کچھ نہ تھا وہ تو ابدی نیند سو چکے تھے۔

منشی انعام علی وہاں موجود تھے وہ تصریح کرتے ہیں کہ برہان الملک کا انتقال طبعی موت سے ہوا اور متصل تالاب فیروز شاہ و باغ شیر جنگ مدفون ہوئے اسوقت انکی عمر چالیس سال کی تھی۔

صمصام الدولہ نے آثار الامراء میں لکھا ہے کہ برہان الملک اس لڑائی میں زخموں کی تاب نہ لاکے انتقال کر گئے۔

سیر المتاخرین کے مورخ کا بیان ہے کہ برہان الملک کے پاؤں سرطان تھا جس کی وجہ سے انکا انتقال ہوگیا۔

خزانہ عامرہ کا مورخ کہتا ہے کہ نقرس کے درد سے انتقال ہوا۔ نجم الغنی جنکو شاہان اودھ میں عیب نکالنے کا بڑا شوق ہے وہ بھی کہتے ہیں کہ برہان الملک کے پاؤں میں گلکا نکلا تھا جسکی وجہ سے وہ مر گئے۔

ان تاریخی صراحتوں کے سامنے خودکشی کا افسانہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ پست ہمت بزدل حالات سے بے بس ہو جانے والا خودکشی کرتا ہے برہان الملک بلند ہمت شجاع و بہادر حالات ساز مرد آہن تھے وہ خودکشی کیوں کرتے۔

برہان الملک کے

ذاتی اوصاف

حلیہ ڈاکٹر نریندر بہادر سریواستوا کا بیان ہے کہ سعادت خان کی شخصیت بہت ہی دلکش تھی۔ قد لمبا پیشانی چمکدار آنکھیں خوبصورت اونچی ناک ایرانی وضع کی ڈاڑھی جسم متوازن رہن سہن سادہ اور نسکھ ساٹھ سال کی عمر میں بھی چہرہ پر شکن نہ تھی [1]

اس میں شک نہیں کہ وہ نہایت شجاع و بہادر تھے ہندوستان میں انکے زمانہ میں ان سے زیادہ بہادر کوئی نہ تھا مولف خام جہاں نما کا بیان ہے کہ نادر شاہ کے مقابلہ میں برہان الملک نے جو بہادری دکھائی اس سے زیادہ دنیا سے شجاعت میں متصور نہیں ہو سکتی۔

نادر شاہ بار بار کہتا تھا کہ اتنی استقامت جو برہان الملک سے ظاہر ہوئی بعض لڑائیوں کا مجھے اتفاق ہوا ان میں ایسی شجاعت کسی شخص سے دیکھنے میں نہیں آئی۔

اس شجاعت کی اہمیت اسوقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسکا ظہور اس شدت مرض اور کرب و اذیت میں ہوا جس سے دو دن بعد غش پر غش آنے لگے اور تیسرے دن موت واقع ہوگئی۔

انکے پاس بائیس ہزار سوار اور پچاس توپیں تھیں اسی سے انہوں نے بڑے بڑے معرکے سر کئے اور اپنی ارشمی کی دھاک بٹھادی۔

توپ خانہ بھی ہندوستان میں مشہور تھا جسکی آتش باری سے انکو لوگ سعادت خان بھڑ بھوبجا کہنے لگے۔

سرداران فوج میر مرتضیٰ خان، مرید خان، میر شاہ حسین خان، ابوتراز خان، میر نواز خان اہل توران میں اور ایرانیوں میں۔ خواجہ باقر خان مرشد قلی خان، جعفر یار خان، عیسیٰ بیگ خان، حاجی علی خان، افراسیاب خان، سید حسن خان، محمد علی خان، برز سنگ خان،

وفا بیگ خان، معالیخان، خدا یار خان۔

ہندوستانی سردار | محمد علی خان، حسین علی خان بارہہ کے سالم علی خان افغانی، نور محمد خان پنجابی، میاں جان خان شکوہ آبادی اور ان کے پانچ بیٹے اعظم خان، رحمت خان دلاور خان، انہی میں ہر ایک رسالہ کا سردار تھا۔ اسمعیل بیگ خان، عبداللہ خان بھی سرداران فوج تھے۔

ہندو امرا | راجہ لچھمی نرائن، راجہ بلرام ناگر، راجہ اتمارام، راجہ کیشو رام سکینہ دکھی رائے کھتری، مہانرائن راجہ مادھو رام بخشی

انتظامی قابلیت | انکی انتظامی قابلیت بھی مسلم تھی صوبہ کا نہایت اچھا انتظام کیا انکا زمانہ امن و امان اور خوشحالی کا زمانہ تھا رعایا خوش تھی فوج جانثار تھی زراعت کی طرف بھی انہوں نے خاص توجہ کی۔

وہ نہایت وفادار بردبار سنجیدہ اور پروقار تھے انکا دربار ایرانی نفاست رعب و داب اور ادب و تعظیم کا دربار تھا۔

شاعری | وہ بہت خوش مذاق اور اچھے شاعر تھے یہ مشہور مصرع انہیں کا ہے
دل غمگین بکے دادہ ام و بادم نیست میر عبدالعلی طالع نے اس مصرع کو اپنے مصطع میں نظم کیا ہے
طالع این مصرع نواب دل از دستم برد دل غمگین یکے دادہ ام و بادم نیست علی قلی والہ داغستانی انکا یہ شعر ریاض الفصحا میں لکھاہے نرکدام رہ بیایم کہ بچشم نو لوزیم کہ بگرد چشم مست ہمہ تیرہ سیاہ ست سیلمانہ زندگی غزل میں بھی موجود ہے۔

شعرا | انکے زمانہ میں شاہ فصیح افصح اردو کے بلند پایہ شاعر ایک تکیہ پر درویشی کی زندگی بسر کرتے تھے اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے عبد القادر بیدل سے اصلاح لیتے تھے سنہ ۱۱۹۰ھ میں انتقال ہوا انکا دیوان لکھنؤ کی جگہ موجود ہے اردو میں بہت صاف اور فصیح شعر

کہتے ہیں یہ ملحوظ رہے کہ حاتم و میر سے بہت پہلے کے شاعر ہیں فرماتے ہیں ؎

کیا بلا شوخ کی قامت دیکھی　　ہم نے جیتے ہی قیامت دیکھی
سرمہ چشم جہاں میں ہونا　　خاکساری کی کرامت دیکھی

حیدری ایک بلند پایہ مرثیہ گو تھے جو دہلی سے لکھنؤ آئے یہ پہلے مرثیہ گو ہیں جنہوں نے مسدس میں مرثیہ کہا ہے۔

ڈاکٹر مسیح الزماں نے لکھا ہے کہ حیدری کے متعدد مرثیے ہماری نظر سے گذرے ہیں جو سب کے سب مسدس میں ہیں ایک قلمی نسخے میں انکے نام کے ساتھ متعدد مسدس بھی لکھا ہے[۱] ایک بند ملاحظہ ہو ؎

شام سے جب کربلا میں آئے زین العابدین　　اور سر بابا کا اپنے لائے زین العابدین
دیکھ کر لوگوں کو کہہ کر ہائے زین العابدین　　گر پڑے ماٹی پہ اور چلّائے زین العابدین
کیا کہوں کس سے کہوں یہ غم تو مجھکو کھا گیا
ہائے میں جیتا رہا بابا کا چہلم آ گیا

ہادی مخلص سید جعفر نام زنبیر پور کے رہنے والے تھے لکھنؤ کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ ۱۱۵۴ھ میں انتقال ہوا۔

روح الامین بلگرام کے رہنے والے عربی فارسی میں منتہی خاص طور پر عربی ادب میں بڑا درجہ رکھتے تھے سپہدار خان اور مبارز خان کی ملازمت کے بعد برہان الملک کی ملازمت کی۔ نادر شاہ کی جنگ میں مارے گئے نمونہ کلام یہ ہے۔

شگان جہاں گرہ زلف تو از دل بستند　　چہ کنند ناخن تدبیر کہ مشکل بستند

مرزا عبدالرضا متین اصفہان کے رہنے والے تکمیل علوم کے بعد ہندوستان آئے دکن دہلی میں رہے

---

[۱] مرثیہ کی روایت۔ ص ۳۷

اسکے بعد لکھنؤ آکے برہان الملک کی ملازمت اختیار کی انکے پانچ بیٹے تھے لوگ انہیں خمستین کہتے تھے فن معلے میں بھی بدطولیٰ رکھتے تھے بارہ ہزار شعروں کا دیوان چھوڑا جسکی پہلی غزل کا مطلع ہے

جز حدیثے عشق حرفے نیست در دیوان ما سورۂ یوسف بود سرتا سر قرآن ما

ڈاکٹر نریندر بہادر سریواستوا لکھتے ہیں ۔

میر عبدالعلی طائع، سید محمد عدائی، اور آغا عبدالعلی تحسین بھی انکے دربار سے وابستہ تھے

زبان | یہ علمی اور شاعرانہ فضا تھی زبان یہاں کی اچھی تھی جسے پوربی زبان کہا جاتا تھا ۔ برہان الملک کی آمد سے یہاں مرزایان ہند اور فصیحان اند بھی آتے اور اپنی زبان ساتھ لائے اسطرح یہاں ایک شستہ زبان کی داغ بیل پڑی ۔

تہذیب | برہان الملک کے ساتھ بہت سے ایرانی و تورانی سپاہی اور سرداران فوج لکھنؤ آئے اور جب برہان الملک کا تسلط و اقتدار یہاں قائم ہوگیا تو انہوں نے ایران سے اپنے پورے خاندان کو بلوالیا انکے ساتھ ان کے لواحقین بھی آئے ۔ ان تمام ایرانی سپاہیوں وسرداروں اور حکمران خاندان کے لوگوں سے ایک چھوٹا سا ایران سرزمین لکھنؤ پر آباد ہوگیا اور ایران کی تہذیب نے یہاں اپنا قبضہ جمایا ۔

ازدواج | برہان الملک کی پانچ بیویاں تھیں پہلی بیوی انکے حقیقی چچا کی بیٹی تھیں جن سے خفا ہوکے ہندوستان آئے تھے اور یہی روایت صحیح ہے کیونکہ انہوں نے اپنے تمام خاندان کو لکھنؤ بلوالیا مگر بیوی کو نہیں بلایا ۔ دوسری بیوی خدیجہ خانم صدر جہاں بیگم کی والدہ تھیں تیسری بیوی اشرف علیخان کے خاندان سے تھیں جو لاولد فوت ہوگئیں ۔ چوتھی بیوی طالب علی خان آصف جاہی کی بیٹی تھیں پانچویں بیوی نواب محمد تقی خان صوبیدار اکبر آباد کی صاحبزادی تھیں ۔ مگر پانچوں بیک وقت نہ تھیں ۔

اولاد | اولاد میں پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا جوان کے بعد چیچک میں مر گیا بیٹیوں میں صدر جہان بیگم عرف نواب بیگم ، صفدر جنگ کو بیاہی گئیں اور شجاع الدولہ کی ماں بنیں ۔

باقی پانچ بیٹیاں نورجہاں بیگم، ہما بیگم عرف بندی بیگم، محمدی بیگم اور امہ بیگم نورجہاں بیگم نصرالدین حیدر کو بیاہی گئیں جو برہان الملک کی چھوٹی بہن کے بیٹے تھے ہما بیگم نواب کے بھتیجے سید محمد خان کو منسوب ہوئیں۔

محمدی بیگم نواب محمد قلی خان کے حبالہ عقد میں آئیں جو صفدر جنگ کے بھائی مرزا محسن کے بیٹے تھے آمنہ بیگم سید محمد خان کو منسوب ہوئیں۔

شہر کی رونق و ترقی

برہان الملک جب لکھنؤ آئے تو یہاں شاہ پیر محمد کے ٹیلہ پر اورنگزیب کی بنوائی ہوئی صرف ایک مسجد تھی۔ اسکے سامنے مچھی بھون اور اسکے پہلو میں شخن دروازہ تھا جہاں اب حسین آباد ہائی اسکول کی عمارت ہے اسکے قریب شاہ مینا صاحب کا مزار ہے اس سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر ایک فرانسیسی تاجر کی عالیشان عمارتیں تھیں جو فرنگی محل کے نام سے مشہور تھیں۔ شاہ مینا کے مزار کے بائیں طرف مرزا منڈی تھی۔ اسکے پاس رستوگی گوالہ اور رہبری ٹولہ تھا۔

جہاں اب گول دروازہ ہے اس کے پاس کناری ٹولہ سوندھی ٹولہ اور اسکے آگے جہاں اب بساطیوں کی مسجد ہے شاہ قیام الدین کا مزار تھا آگے بڑھ کے اکبری دروازہ تھا جسکے آگے محمود نگر منصور نگر نولشہ اشرف آباد تھا دریا کے اس پار سکارم نگر تھا۔ یہ اس وقت کا لکھنؤ تھا

برہان الملک نے شخن دروازہ کے سامنے نوبت خانہ بنوایا جس میں اٹھ پہر نوبت بجتی تھی۔

ابو تراب خان، برزن بیگ خان، محمد علی خان نے وفا بیگ خان کے بڑے بنوائے معالیخان نے سرائے تعمیر کرائی۔ مہانرائن نے باغ لگایا اسمٰعیل بیگ نے اسمٰعیل گنج بسایا۔

برہان الملک کے اجودھیا جانے کو لوگوں نے بہت شدومد سے لکھا ہے جس سے دھوکا ہوتا ہے کہ وہ لکھنؤ سے اجودھیا چلے گئے تھے۔ بات یہ ہے کہ اجودھیا صوبے کا وسطی مقام تھا۔

جہاں وہ فوج کے ہاتھ بھوس کے بنگلہ میں رہتے تھے وہاں سے وہ صوبہ کا دورہ کرتے تھے اور ہر جگہ سے باخبر رہتے تھے صرف انکی بیویاں انکے ساتھ رہتی تھیں باقی پورا کنبہ بٹیاں داماد بھانجے بھتیجے لکھنو میں رہتے تھے سال میں کئی دفعہ وہ خود آتے تھے اور برسات بھر نہیں قیام کرتے تھے۔ اسوجہ سے لکھنو میں جو رونق انکے آنے سے پیدا ہوئی تھی اس میں کمی ہونے پائی۔

شیعیت کی ابتدار

ہندوستان میں شیعہ بہت کم تھے ابتدا میں جو شیعہ آئے وہ اپنے مذہبی رواسم انجام نہیں دے سکتے تھے مغلوں کے زمانہ میں یہ دشواری نہیں رہی مگر کوئی شیعہ عالم نہ ہونے سے نکاح طلاق دفن وکفن وغیرہ سب اہل سنت کے طریقہ پر انہیں کے ہاتھ سے ہوتا تھا۔ اور شادی بیاہ بھی انہیں سے کرتے تھے اس فضا میں بہت سے شیعہ اپنے مذہب سے بے خبر ہو گئے اور انکی اولاد آگے بڑھ کر سنی ہو گئی

برہان الملک کے زمانہ میں لکھنو میں ایک بھی شیعہ نہ تھا یہ پہلے شیعہ میں جو حکمران کی حیثیت سے ایرانی تورانی شیعوں کی ایک فوج کے ساتھ لکھنو آئے اسکے بعد ایران سے اپنے تمام خاندان کو بلوا لیا جنکے ساتھ ان کے لواحقین بھی آئے ان سے شیعوں کی ایک خاصی تعداد لکھنو میں ہو گئی یہ صاحب اقتدار لوگ تھے اور صفوی دور کے تھے جو اپنے مذہب میں بہت سخت تھے خاص طور پر مجلس وماتم سے والہانہ دلچسپی رکھتے تھے ان کی وجہ سے یہاں مجلس وماتم کی ابتدار ہوئی اور اس کثرت سے مجلسیں ہونے لگیں کہ ایک مرثیہ خوان کی ضرورت ہوئی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے دہلی کے مشہور مرثیہ گو حیدری لکھنو آئے یہ نہیں معلوم کہ بلوائے گئے یا خود سے آئے ہر یہاں ان کی مرثیہ خوانی خوب چمکی اور وہ آسودہ حال ہو گئے۔

محرم میں دس دن اہل سنت تعزیہ رکھتے تھے اور وہی جلوس نکالتے تھے شیعہ بھی اس میں شریک ہو جاتے تھے۔

برہان الملک نے کسی شیعہ عالم کو ایران سے نہیں بلایا یہیں کے علماء سے اہل سنت کو مفتی و قاضی مقرر کیا اسو جہ سے عید کی نماز شیعہ اہل سنت کے ساتھ پڑھتے تھے اور ہندوستان میں ہر جگہ کی طرح لکھنو میں بھی نکاح و طلاق دفن و کفن شیعوں کے طریقہ پر ہوتا تھا اور شادی بیاہ بھی انہیں سے کرتے تھے۔

خاندان فرنگی محل

لکھنو کے قریب ایک موضع سہالی ہے یہاں انصار کرام کا ایک خاندان آباد تھا ان میں مولانا قطب الدین ایک جوہر قابل ہوئے شیخ دانیال چوراسی اور قاضی گھانسی الہ آبادی تحصیل علم کر کے سہالی میں مجلس درس قائم کی جسکی شہرت دور دور ہوئی اور جوق در جوق طالبان علم انکی درسگاہ میں آگئے ملا محب اللہ بہاری صاحب سلم و مسلم مولانا امان اللہ بنارسی اور مولانا شہاب الدین گوپاموی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا قطب الدین کو زمینداری کے جھگڑے میں سہالی کے زمیندار خان زادوں نے قتل کر دیا ان کے بیٹے مولانا محمد اسعد ایک محضر بنا کے اورنگ زیب کے پاس گئے اور سے کہا کہ اب ہمارے خاندان کا سہالی میں رہنا ممکن نہیں اس نے انکو فرنگی تاجر کا مکان جو لکھنو میں تھا اور فرنگی محل کہلاتا تھا دیدیا اب انکا خاندان لکھنو منتقل ہو گیا ملا قطب الدین کے بیٹے ملا نظام الدین اس وقت کم سن تھے۔ وہ تحصیل علم کے لیے بنارس گئے وہاں ملا علی قلی کی درسگاہ میں شریک ہوئے ملا علی قلی مولانا عبد القادر شیعہ عالم بہادر شاہ اول کے استاد تھے اور عزا ماب کے بزرگوں میں تھے اسطرح خاندان فرنگی محل کی شاگردی کا سلسلہ خاندان اجتہاد تک پہنچتا ہے۔

ملا نظام الدین نے تکمیل علوم کے بعد فرنگی محل میں مسند درس بچھائی اور وہ شہرت حاصل کی کہ ہندوستان میں کسی کو نصیب نہ ہوئی آزاد بلگرامی جوان کے معاصر میں لکھتے ہیں۔

تمام عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے ہوں نے وہ شہرت حاصل

کی ہے کہ اس زمانہ میں اطراف ہندوستان کے علماء انکی شاگردی پر نازاں ہیں اور جو شخص اپنی شاگردی کا سلسلہ ان تک پہنچاتا ہے وہ علماء میں مستند سمجھا جاتا ہے بہت سے لوگ دیکھے گئے کہ تحصیل علم دوسری جگہ کی اور مستند بننے کے لئے سند فراغ مولوی سے حاصل کی۔[2]

مولانا عبدالحئ ندوی نے انکی تعریف ان الفاظ میں کی ہے شیخ الامام، عالم کبیر علامہ شہیر صاحب علوم و فنون ربع مسکوں میں سب سے بڑے عالم استاد الاساتذہ امام الجہابذہ اصول و منطق و کلام میں دنیا میں انکا کوئی نظیر نہ تھا۔[3] انہوں نے ایک کورس بنایا

درس نظامی

صرف :۔ میزان منشعب پنج گنج۔ زبدہ، صرف میر فصول اکبری شافیہ

نحو :۔ نحو میر شرح مائۃ عامل۔ ہدایۃ النحو۔ کافیہ۔ شرح جامی بحث حال تک

بلاغت :۔ المختصر المطول ما انا قلت تک

منطق :۔ صغریٰ کبریٰ۔ ایساغوجی۔ تہذیب۔ شرح تہذیب۔ قطبی۔ میر قطبی مسلم العلوم۔ رسالہ میر زاہد۔ میر زاہد و ملا جلال۔

فلسفہ :۔ شرح ہدایۃ الحکمت۔ صدرا بحث مکان تک۔ شمس بازغہ

ریاضی :۔ خلاصۃ الحساب باب التصحیح تحریر اقلیدس پہلا مقابلہ

تشریح الافلاک :۔ قوشجیہ۔ شرح چغمنی باب اول

فقہ :۔ شرح وقایہ نصف اول۔ ہدایہ نصف ثانی

اصول فقہ :۔ نور الانوار۔ تلویح مقدمات لدیو تک۔ مسلم الثبوت مبادی کلامیہ شرح مبارکیہ

---

[1] سوانحی قلمی مورثہ آل محمد میر جالسی [2] ماثر الکرام

[3] نزہۃ الخواطر

کلام :- شرح عقائد سمعیات تک شرح عقائد دوانی جز اول شرح مواقف میر شریف امور عامہ -

تفسیر :- جلالین و بیضاوی سورہ بقر تک -

حدیث :- مشکواۃ المصابیح کتاب جمعہ تک

مناظرہ :- رشیدیہ

انکے بعد درس نظامی میں کچھ ضمیمہ شامل ہوئیں -

منطق :- حاشیہ غلام یحیی بر میر زاہد ۔ شرح سلم قاضی مبارک تصورات شرح سلم حمد اللہ تصدیقات شرح سلم ملا حسن تصورات ۔ شرح ملا مبین ۔ بحر العلوم بر میر زاہد ۔ حاشیہ ملا مبین بر میر زاہد -

یہ کتابیں بعد کی تصنیفیں ہیں ملا نظام الدین کے زمانہ میں نہ تھیں ۔ وہ عارف کامل اور صوفی صافی بھی تھے مگر جبّہ و دستار سے بے نیاز تھے عام شرفائے لکھنو کی وضع میں رہتے تھے اور یہی طریقہ آج تک انکے خاندان میں چلا آرہا ہے اس خاندان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شیعوں کی رد میں کوئی کتاب آج تک نہیں لکھی گئی ۔ اس خاندان کے علماء کے تعلقات شیعہ علماء رؤسا اور عوام کے ساتھ بھی مخلصانہ تھے کسی طرح کی کشمکش نہ تھی اہل سنت بھی تعزیہ داری کرتے تھے ۔ اور اس میں شریک ہوتے تھے سب گھل مل کے رہتے تھے اس فضا کو مولوی ہدایت رسول چریا کوٹی نے لکھنو آکے مسموم کیا اور پھر تلخی بڑھتی رہی مگر علماء فرنگی محل اس سے دامن بچاتے رہے اور شیعہ سنی اتحاد کی علامت بنتے رہے اور آج تک اس خاندان کا یہی شعار ہے مذہبی معاملات بڑی حد تک شیعوں کے ساتھ رہتے ہیں جب ابن سعود نے جنت البقیع کو مسمار کر دیا تو ہندوستان میں اسکے خلاف بہت احتجاج ہوا خاص طور پر لکھنو میں انگریزی حکومت نے اس پر پابندی لگا دی کہا کہ وہ ہمارے حلیف ہیں ان کے خلاف احتجاج جرم ہے اس کا امام باڑہ آصف الدولہ میں ایک بہت

بڑا احتجاجی جلسہ ہوا جس میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی شریک ہوئے انہوں نے اپنی تقریر اس شعر سے شروع کی ؎

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں ، میرا دل پھیر دو مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا۔

اسکے بعد مولانا نے گھن گرج تقریر کے دوران گپتی کھینچ کے ہوا میں لہرائی اور کہا کہ انہدام جنت البقیع میں ہم اس سے کام لے سکتے ہیں۔

مولانا کی اس گرماگرم تقریر کے بعد تمام مقررین کی تقریریں ٹھنڈی پڑ گئیں یہ ایک یادگار تقریر تھی جو آج تک لوگوں کے ذہنوں میں ہے۔ غرض یہ کہ یہ خاندان اپنے علم و فضل کے ساتھ خلیق و متواضع مرنجان مرنج سنی شیعہ سب کا عزیز و مخلص ہے سب اس کی عزت کرتے ہیں اپنے کو کسی مذہبی جھگڑے میں آلودہ نہیں کیا۔ اسکے برخلاف خاندان اجتہاد ہمیشہ سنیوں کی رد کا علمبردار بنا رہا۔

لکھنو کے دوسرے علماء

مولانا احمد مولانا انقشبند کے صاحبزادے لکھنو میں پیدا ہوئے اپنے والد اور مولانا نظام الدین فرنگی محلی سے تحصیل علم کی فقہ و اصول و عربیت میں شہرآفاق تھے اپنے والد کے جگہ مدرسہ میں مسند درس و تدریس شروع کی سیکڑوں علماء ان سے مستفید ہوئے اپنے وقت کے اکابر مشائخ میں تھے سنہ ۱۱۶۹ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا عبدالحق مولانا محمد سعید کے بیٹے مولانا قطب الدین شہید سہالوی کے پوتے اپنے دادا کی وفات کے بعد ۹ ایا ۲ رجب سنہ ۱۱۰۳ھ میں قصبہ سہالی میں پیدا ہوئے اور پرورش لکھنو میں ہوئی اپنے چچا نظام الدین فرنگی محلی سے تحصیل علم کی اور علوم متداولہ میں شہرت حاصل کی اور اپنے چچا کے سامنے درس و افتا کی مسند پر بیٹھے مصنفات میں شرح سلم حاشیہ میر زاہد حاشیہ شرح حاشیہ شرح مواقف بہت عمدہ کتابیں ہیں ۹ سنہ ۱۱۸۷ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا عبدالعزیز مولانا احمد عبدالحق کے بھائی علم ظاہر و باطن میں سید اسمعیل بلگرامی سے

فنضیاب ہوئے علم و تقویٰ میں مشہور تھے ۱۱۶۵ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا غلام مصطفیٰ مولانا محمد اسعد کے بیٹے مولانا قطب الدین سہالوی کے پوتے دادا کی شہادت کے بعد اپنے چچاؤں کے ساتھ لکھنؤ آکے قیام کیا وہیں نشو و نما پائی اور اپنے چچا مولانا نظام الدین سے تکمیل علوم کی ملا لوال کے قاضی مقرر ہوئے جس قاضی کی جگہ یہ مقرر ہوئے تھے اس نے انکو قتل کر دیا۔

مولانا عبدالرشید جونپور کے رہنے والے لکھنؤ میں قیام کر لیا تھا مولانا نظام الدین فرنگی محلی کے ارشد تلامذہ میں تھے منطق و حکمت اور اصول میں اعلیٰ پایہ کے مالک تھے شاہ پیر محمد کے ٹیلہ کے پر قیام تھا وہیں دفن ہوئے۔

مولانا محمد رضا مولانا قطب الدین شہید کے چھوٹے صاحبزادے باپ کی شہادت کے بعد لکھنؤ چلے آئے اور اپنے بھائی مولانا نظام الدین سے تحصیل کی درس و تدریس میں شہرت حاصل کی مسلم الثبوت کی شرح لکھی اپنے بھائی کے سامنے انتقال ہوا۔

مولانا غلام محمد خان جہان قدوائی کے صاحبزادے لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور رشد و ہدایت کے آثار چہرے سے نمایاں تھے سات برس کے سن میں اسے والد کی شراب نوشی پر عمدہ طریقے سے اجتناب کیا اور انہوں نے توبہ کی اپنے وقت کے علماء سے تحصیل کی اور شہرت حاصل کی عالمگیر نے فوجی خدمت پر مامور کیا اس زمانہ میں بھی امر المعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کرتے تھے جب عالمگیر کو انکے علم و فضل کا حال معلوم ہوا تو فوج کا قاضی مقرر کر دیا مگر انہوں نے قبول نہیں کیا اور ترک ملازمت کر کے سرہند گئے اور حج میں فیضیاب لکھنؤ آئے اور محمود قلندر کے زاویہ میں مقیم ہو گئے سنہ ۱۱۳۰ھ میں رحلت فرمائی۔

ایٹھی ضلع لکھنؤ:۔ مولانا عبدالباسط مولانا احمد کے سب سے چھوٹے بیٹے اپنے وقت کے مشہور عالم اور شاعر تھے معراج المقال ایک مزدوجہ معراج نبی میں لکھا اور بسط باطلی اخبار مشایخ میں ۱۱۶۶ھ

کو انتقال ہوا۔

مولانا عبدالقادر محمد مولانا احمد کے بیٹے امیٹھی میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کی اور امیٹھی میں ایک مدرسہ بنوایا اپنے والد کی کتاب مناقب الاولیا کا تکملہ کیا۔

مولانا عاصم مولانا یٰسین کے بیٹے مولانا عبدالرقیب کے پوتے مشائخ چشتیہ میں تھے اپنے چچا موسیٰ بن عبدالرقیب کے بعد مسند شیخیت پر بیٹھے اربع عناصر ایک کتاب اپنے اجداد کے حالات میں لکھی جسکا سنہ تصنیف ۱۱۵۵ھ ہے۔

مولانا عبداللہ مولانا نظام الدین فرنگی محلی کے شاگرد فقہ و اصول اور کلام میں ید طولیٰ حاصل تھا احمد شاہ کے زمانہ میں فوت ہوئے۔ ملانوان ضلع لکھنو مولانا محمد عظیم ابن مولانا ہبتہ اللہ گوپا موہن پیدا ہوئے۔ شیخ قطب الدین بن شہاب الدین سے تحصیل علم کی اور شیخ محمد عوض خیرآبادی سے معقولات پڑھے حدیث میں شیخ صبغتہ اللہ خیرآبادی سے درس لیا حکمت و فلسفہ و منطق میں شہرت رکھتے تھے شرح سلم طوطیس شرح ہدایتہ الحکمت اور میرزاہد و ملاجلال کے حاشیہ میرزاہد علی مواقف پر حاشیہ لکھا ملانواں میں اختیار کیا اور وہیں درس دیتے رہے

بھٹولی ضلع لکھنو:۔ مولانا افہام اللہ چشتی، شیخ عبدالرشید ماچھروی اور شیخ عبداللہ صفی سے اخذ طریقت کیا ۸ ربیع الاول ۱۱۶۰ھ میں انتقال ہوا۔

سندیلہ ضلع ہردوئی:۔ مولانا حمداللہ ابن شکراللہ سندیلہ میں پیدا ہوئے شیخ کمال الدین اور نظام الدین فرنگی محلی سے تحصیل علم کی ہندوستان کے ممتاز علماء میں تھے احمد شاہ نے فاضل خان خطاب اور معافی میں جاگیر دی تھی مطالعہ کتب سے شیعہ ہو گئے تھے ایک مدرسہ سندیلہ میں بنوایا التعلیقات حاشیہ شمس بازغہ شرح ہدایت الحکمتہ شرح سلم انکی مشہور کتابیں درس میں داخل ہیں شیعہ ہونے کے بعد علامہ بہائی کی زبدۃ الاصول کی شرح لکھی ۱۱۶۱ھ میں دہلی میں انتقال ہوا شیخ کبیر قطب الدین ادیسی کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔

مولانا محمد اعلم سندیلہ میں پیدا ہوئے مولانا تاج الدین فیحذری سے تحصیل علم کی منطق وفلسفہ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے تصنیفات میں حاشیہ شرح ہدایہ دائرۃ الاصول رسالہ فی مبحث تشکیک ۱۱۸۶ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا زین العابدین شیخ قطب الدین شہید سہالوی کے شاگرد معقولات میں فرد فرید صاحب وجد وحال بزرگ تھے۔

گوپامئو ضلع ہردوئی :۔ مولانا ابو سعید ابن علیم اللہ مولانا آدم کی نسل میں تھے ۱۰۸۴ھ میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کی انکے بعد انکی جگہ پر مفتی مقرر ہوئے ۱۱۵۱ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا انورالدین ابن مولانا محمد انور عمری گوپامئو میں پیدا ہوئے اپنے والد سے اکساب علم کیا اور شہرت حاصل کی عالمگیر نے خان کا خطاب اور حیدر آباد کا دیوان خرچ مقرر کیا محمد شاہ کے زمانہ میں کوڑے کے والی ہوئے آصف کے بیٹے ناصر جاہ نے نواب خان جہاں جنگ کا خطاب دلوایا اسکے بھانجے سے کرناٹک کی لڑائی میں شہید ہوئے ۱۱۶۲ھ میں۔

مولانا احمد مولانا ابو منصور خطیب کے صاحبزادے گوپامئو میں پیدا ہوئے اپنے والد اور مولانا سعید سے تحصیل علم کی فقہ واصول وادب میں تبحر حاصل کیا۔ فتاوی ہندی کی تالیف میں مشغول رہے عالمگیر کی طرف وظیفہ ملتا تھا کئی حج کیے۔

مولانا قطب الدین مولانا شہاب الدین کے بیٹے اپنے والد سے تحصیل علم کی علوم حکمیہ اور ریاضیات میں یگانہ عصر تھے تقریباً چار سو شاگرد اطراف ملک میں پھیلے ہوئے تھے ۱۱۶۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا مبارک مولانا دائم کے بیٹے مولانا بدرالدین گوپامئو اور مولانا صفۃ اللہ خیرآبادی کے شاگرد دہلی میں درس وتدریس شروع کی اور شہرت پیدا کی تعلیقات میرزاہد

حاشیہ شرح تہذیب حاشیہ شرح مواقف اور شرح سلم العلوم انکی معرکہ آرا کتابیں سمجھی جاتی ہیں یہ قاضی مبارک کے نام سے مشہور ہیں ۱۱۶۲ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا ضیاء اللہ بن خان محمد بلگرام اور کالپی میں تحصیل علم کی انشاء میں ید طولیٰ رکھتے تھے ۱۱۴۱ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا طیب مولانا نعمۃ اللہ کے بیٹے سید عبداللہ سے تحصیل علم کی اور حدیث میں شیخ مبارک سے فیض حاصل کیا اپنے والد کے بعد مسند شیاخت پر بیٹھے بہت خوش خط اور زود نویس تھے درس میں شہرت تھی جامع طیبی سرت میں ایک کتاب فقہ میں لکھی ۱۱۵۲ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا عبدالجلیل ابن میر احمد ۱۰۷۱ھ پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مختلف علماء سے حاصل کرنے کے بعد علماء اودھ سے فقہ پڑھی آخر میں شیخ غلام نقشبند کی خدمت میں برسوں حاضر اور سند حدیث شیخ مبارک بلگرامی سے حاصل کی عالمگیر کی طرف سے مختلف عہدوں پر رہے ۱۱۳۱ھ میں معزول ہوکے اپنے مکان پر واپس آئے معانی بیان حدیث و سیر تفسیر اسماء الرجال اور تاریخ میں بحر ذخار تھے عربی فارسی ترکی اور ہندی پر کامل عبور تھا۔ ان میں فصاحت و روانی سے گفتگو کرتے تھے ۱۱۳۸ھ میں شوال کے مہینے دہلی میں انتقال ہوا لاش بلگرام لاکے دفن کی گئی۔

مولانا عبدالواحد ابن محمد خلیل ۱۰۹۵ھ میں بلگرام میں پیدا ہوئے مولانا طفیل محمد اترولوی اور دوسرے علماء سے تحصیل کی نہایت زاہد و متقی تھے تمام عمر مطالعہ کتب میں صرف کی ۱۱۶۱ھ میں انتقال ہوا مولانا عظمۃ اللہ اپنے والد سے تحصیل علم کی اور علم میں شہرت حاصل کی مولانا شاعر بھی تھے قصص الانبیا انکی مسوط کتاب ہے اسکے علاوہ گرامی نامہ سفینۂ بحر تذکرہ شعرائے فارسی اور دیوان اشعار ہے انکا ایک شعر ہے

کسے ز بہر دو جہاں ہر کسے ز خویش رود غیوری تو اگر ایں چنیں جناں بگذر

۱۱۴۲ھ میں دہلی میں انتقال ہوا۔

مولانا غلام اخی ابن محی الدین بلگرام میں پیدا ہوئے وہیں تحصیل علم کی اسکے بعد مکہ زیارت کے لئے گئے مصنفات میں غنیۃ العلم فقہ میں اور ترجمہ سراجی فرائض میں ہے ۱۱۶۱ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا آل محمد مولانا برکت اللہ حسنی کے بیٹے جمعرات کے دن ۱۹ رمضان ۱۱۱۱ھ کو بلگرام میں پیدا ہوئے اپنے والد سے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی اور اجازہ شیخ لطف اللہ بلگرامی سے حاصل کیا کتب تصوف کے مطالعہ میں مشغول رہے اتباع شریعت میں بہت سخت تھے ۱۵ رمضان ۱۱۶۴ھ کو مارہرہ میں انتقال ہوا۔

مولانا اسمٰعیل مولانا ابراہیم کے بیٹے علوم ظاہری میں مولانا خلیل محمد اندولوی اور باطنی میں مولانا عبد الرزاق طفیل کے شاگرد تھے اور ان کے بعد ان کی مسند پر بیٹھے اور مسولی گاؤں میں قیام کرلیا مولانا نظام الدین فرنگی محلی بھی انکے شاگرد تھے۔ ۱۱۶۴ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا خان محمد مولانا عبد المعین کے بیٹے مولانا عبد الجلیل کے چچا زاد بھائی گیارہ ربیع الاول ۱۰۸۳ھ کو پیدا ہوئے اساتذہ عصر سے تحصیل علم کر کے شہرت حاصل کی اور تہجد گذار تھے ۱۱۴۹ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا جمال اللہ بلگرام میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی اساتذہ عصر سے تکمیل کی درس و تدریس اور مطالعہ کتب میں مشغول رہے ۱۱۳۷ھ انتقال ہوا۔

مولانا قادری مولانا ضیاء الحسنی کے بیٹے اپنے والد سے تحصیل علم کے بعد امیٹھی جاکے مولانا ابو سعید صالحی سے پڑھا پھر مولانا غلام نقشبند سے لکھنؤ کے تکمیل کی مقامات مقدسہ کی زیارت میں برسوں مشغول رہکر بلگرام واپس آئے اور گوشہ نشین ہو گئے ۱۱۴۵ھ کو انتقال ہوا۔

مولانا کرم اللہ ۱۰۸۷ھ کو بلگرام میں پیدا ہوئے نحو اور نعت میں بے نظیر تھے ۱۱۳۱ھ میں اپنے چچا کے ساتھ تاریخ نبوتیانا لکھی سیالکوٹ میں کفار نے قتل کر دیا۔

مولانا نعمۃ اللہ ابن محمد زاہد بلگرام میں پیدا ہوئے وہیں نشوونما پائی اپنے چچا مولانا عبدالباری سے تحصیل علم کرکے سہالی میں مولانا قطب الدین سے تکمیل کی علوم حکمت میں شہرت رکھتے تھے ۱۱۴۰ھ میں انتقال ہوا۔

پہانی ضلع ہردوئی :۔

مولانا مربی زیدی مختلف شہروں کے علماء سے تحصیل علم کرکے شہرت حاصل کی فرخ آباد کے قاضی مقرر ہوئے شرح سلم حاشیہ میر زاہد اور تاریخ فرخ آباد انکی تصنیف ہے۔

دیوہ ضلع بارہ بنکی :۔ مولانا تاج محمود

ابن احمد الضیاء محمد شاہ کے زمانہ میں دہلی میں قاضی القضاۃ تھے ۱۱۵۵ھ میں انتقال ہوا

خیرآباد :۔

مولانا صفۃ اللہ ابن مدینۃ اللہ رضوی خیرآبادی قطب الدین حسنی اور قطب الدین سہالوی کے شاگرد تھے تین دفعہ حج کیا وہاں محمد طاہر مدنی سے فیض حاصل کیا پہلے معقولات کا درس دیتے تھے پھر اسکو ترک کرکے حدیث کا درس دینے لگے ۱۱۵۷ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا صالح محمد قاضی عبدالرحیم مرادآبادی سے شریعت میں اور مولانا خان محمد سیاح مرادآبادی سے طریقت میں فیض حاصل کیا خیرآباد میں انتقال ہوا۔

مولانا محمد غوث عرف ملا کالی منطق و فلسفہ میں شہرت رکھتے تھے کتب درسیہ پر مفید حواشی لکھے۔

مولانا احمد اللہ مولانا صفۃ اللہ کے بیٹے اپنے والد اور مولانا کمال الدین فتحوری سے تحصیل کرکے وطن واپس گئے اور درس و تدریس میں مشغول رہے فقہ و اصول کلام و ادب میں بے مثل تھے۔ ۱۱۶۷ھ میں انتقال ہوا۔

کنتور ضلع بہرائچ :۔ مولانا امین الدین

مولانا بدیع الدین مداری کے بیٹے مولانا قطب الدین سہالوی کے شاگرد سند حدیث مولوی صفۃ اللہ خیر آبادی سے حاصل کی جس میں اپنے والد کی کتاب فطام الایمان کی شرح لکھی میرے تین بیٹے تھے تینوں عالم ہوئے۔

مولانا بدیع الدین مولانا عطاء اللہ حسنی مداری کے بیٹے اپنے والد سے شریعت و طریقت میں فیض حاصل کیا مشہور عالم تھے ۱۱۶۱ھ میں انتقال ہوا!

امیٹھی ضلع گونڈہ

مولانا طفیل محمد ابن شکر اللہ دیہ بلگرامی اور گجدو کے علماء سے تحصیل کی اور تجر حاصل کیا بلگرام میں سکونت اختیار کرکے درس و تدریس میں مشغول رہے عربی میں خوب شعر کہتے تھے ۱۱۵۱ھ میں انتقال ہوا۔

صفی پور ضلع اناؤ :- مولانا جار اللہ

ابن محمود اپنے زمانہ کے مشہور عالم جامع الشتی انکی مشہور تصنیف ہے جو انہوں نے برہان الملک کے دور میں لکھی۔

مولانا علا صفی بڑے عالم و فاضل ملا نواں ضلع لکھنؤ کے قاضی تھے ۱۱۴۱ھ میں انتقال ہوا

رائے بریلی :- مولانا محمد حکم

مولانا علم اللہ کے بیٹے بریلی میں پیدا ہوئے مختلف شہروں میں تحصیل علم کرکے وطن واپس آئے اور درس و تدریس شروع کی تصنیفات میں محکم التنزیل عربی و فارسی صراح کی تلخیص ملخص اللغات معانی میں رسالہ فقہ میراث میں اور ایک رسالہ نحو میں لکھا ۱۱۵۱ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا محمد عدل مولانا علم اللہ کے بیٹے اپنے بھائی مولانا محمد حکم سے تحصیل علم کی اور اپنے والد سے اخذ طریقت کیا پھر لکھنؤ آئے اور مولانا ابو الحق مولانا ذو الفقار علی دلوی قاضی عبد الکریم اور شیخ یحییٰ جائسی سے پڑھا مشائخ نقشبندیہ میں تھے ۱۱۵۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا محمد مولانا علم اللہ کے چھوٹے بیٹے مگر علم و فضل میں سب سے بڑے تھے۔

شرح کلمات طیبات ۱۱۴۵ھ میں انتقال ہوا۔

سلون ضلع رائے بریلی :۔ مولانا سعد اللہ

مولانا عبد الشکور کے صاحبزادے سلون میں پیدا ہوئے اپنے والد اور دوسرے اکابر سے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کر کے حجاز گئے وہاں شیخ عبد اللہ ابن سالم البصری اور شیخ احمد علی وغیرہ سے استفادہ کیا اور ہندوستان واپس ہوتے بندر سورت میں قیام کر لیا عالمگیر نے دو گاؤں معافی میں دیئے جنکی تحصیل آٹھ ہزار سالانہ تھی وہ ان کی بہت عزت کرتا تھا مولانا معقول و منقول فقہ و اصول سب پر حاوی تھے۔ آخر میں شیعہ ہو گئے تھے تصنیفات میں اثبات مذہب شیعہ اور علامہ مجلسی کی شرح اربعین منہج الاحوط رسالہ در سط حاشیہ ہدایۃ الحکمۃ کشف الحق رد اہل سنت ۲۶ جمادی الاول ۱۱۳۸ھ میں سورت میں انتقال ہوا۔

مولانا محمد اشرف مولانا میر محمد کے صاحبزادے اپنے والد سے تحصیل علم کی اور انکے بعد مسند شیاخت پر متمکن ہوئے صاحب کشف و کرامات اور بلند مرتبہ شیوخ و علماء میں شمار تھا ۱۱۹۰ھ میں انتقال ہوا۔

جائس ضلع رائے بریلی :۔ مولانا سید لطف اللہ۔

ابن مولانا بدیع الزمان متولی اپنے والد سے تحصیل علم کی اور دہلی کے صدر الصدور مقرر ہوئے جائس کے سادات نگمی میں تھے اور اس وقت کے شیعہ علماء میں ممتاز تھے۔

مولانا فیروز یہ جائس کے علمائے اہل سنت کے خاندان سے تھے جو سادات اشرفی کہلاتا ہے فقہ و اصول اور عربیت میں تبحر حاصل تھا تمام عمر جائس میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔

نصیر آباد ضلع رائے بریلی :۔ مولانا عبد الباقی

مولانا ابو حنیفہ کے بیٹے اور مولانا علم اللہ کے پوتے ۱۰۸۰ھ میں پیدا ہوئے اسی سال والد فوت ہو گئے دادا نے پرورش کی۔ سات برس کے تھے کہ دادا نے بھی انتقال کیا ماموں مولانا شیخ

ابراہیم نے اپنے سایہ عاطفت میں لیا اور علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ کیا تقوی اور علم کی تصویر تھے ۱۱۵۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا نور محمد مولانا محمد مفتی کے بیٹے مولانا علم اللہ کے پوتے اپنے دادا کی حیات میں پیدا ہوئے شریعت و طریقت میں ان سے فیض حاصل کیا بڑے مقدس اور صاحب کشف و کرامات تھے ۱۱۹۴ھ میں انتقال ہوا۔

جونپور :۔ مولانا محمد سعید

جونپور کے مشہور شیعہ عالم تھے علم و فضل میں شہرت رکھتے تھے اور نگ زیب کے مقرب تھے قلعہ ستارہ کے محاصرہ میں شیر بکتھے انشاے مادھورام میں انکا ذکر ہے۔ بہت سی کتابوں پر نہایت عمدہ تعلیقات و حواشی لکھے ۱۱۴۳ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا حسن سعید مولانا محمد سعید حنفی کے بیٹے مولانا مبارک کے پوتے فقہ و اصول میں شہرت رکھتے تھے پہلے جونپور کے مفتی پھر قاضی ہوئے ان کے والد کو دہلی میں شاہی قربت حاصل تھی اسوجہ سے وہ دہلی گئے اور ہندوستان کے قاضی القضاۃ ہو گئے ۱۱۶۵ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا محمد پناہ جونپور میں تحصیل علم کر کے دہلی گئے قاضی تاج محمود سے پڑھا اور معقول و منقول میں امتیاز حاصل کیا ایک روایت یہ بھی ہے کہ نادر شاہ کے ساتھ جو اہل علم آئے ان سے مسئلہ قتال پر نادر شاہ کے حکم سے مباحثہ کیا جس سے وہ بہت خوش ہوا مستعد خان خطاب دیا جونپور کا قاضی بنادیا اپنے وطن واپس آئے اور تا عمر اس عہدے پر رہے۔۔

مولانا غلام رشید مولانا محب اللہ کے بیٹے کم سنی میں یتیم ہو گئے دادا مولانا محمد ارشد نے پرورش کی اور علم و فضل سے آراستہ کیا انکے بعد مسند شیاخت پر متمکن ہوئے ۱۱۶۷ھ میں انتقال ہوا۔

الہ آباد :۔ مولانا اسد اللہ

مولانا محمد افضل عباسی کے نواسے اپنے وقت کے مشہور عالم تھے شعر بھی خوب کہتے تھے آزاد

میں یہ شعر لکھا ہے سنہ ۱۱۶۳ھ میں انتقال ہوا۔ روز محشر طہار تربت ما   دامن بوتراب می خواہد۔

مولانا باسط علی قلندر ابن مولانا محمد ماہ کنتور کے رہنے والے الہ آباد کے ایک دیہات بدھ مگدھا میں پیدا ہوئے تھوڑی تعلیم حاصل کر کے شیخ احمد لاہر پوری کی بیعت کی انہوں نے علم حاصل کرنے کا حکم دیا تو خیر آباد جاکے مولانا صفۃ اللہ سے تحصیل علم کی اور سند حدیث لے کے الہ آباد آئے اور معتکف ہو گئے سنہ ۱۱۶۹ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا جار اللہ الہ آباد کے مشہور عالم قضا و افتی کی مسند پر ممکن تھے تفسیر بیضاوی اور مغالطہ عامۃ الورود حاشیہ لکھا۔

مولانا عبد الجلیل مولانا صدر الدین کے بیٹے سنہ ۱۰۹۲ھ پیدا ہوئے صغر سنی میں قاضی طیب کے پاس مئو چلے گئے سو نہیں ملا جمیل الدین ملانوی سے مطولات وغیرہ پڑھی اسکے بعد دوسرے شہروں کے اساتذہ سے علوم حاصل کر کے دہلی گئے وہاں شیخ عبد الحق ابن سیف الدین سیف سے اخذ حدیث کیا وہاں گنگوہ جاکے شیخ محمد صادق سے اخذ طریقت کیا ۳۲ سال تک ان کی خدمت میں رہے الہ آباد واپس آئے مشائخ چشتیہ شمار تھا بڑی شہرت اور مقبولیت پیدا کی بہت سی کتابیں لکھیں جنکی فہرست یہ ہے چہار دہ علمی۔ ہدایۃ الصوفیہ۔ علم الثقات۔ علم الذکات۔ حل المشکلات نقشبند معدن اللآلی اسرار العاشقین منظومہ زاد المشائخ زاد الاداد۔ نعات و حالات سنہ ۱۱۴۰ھ میں انتقال ہوا۔

مراد آباد :۔ مولانا غلام مصطفےٰ

قطب الدین شہید سہالوی اور غلام نقشبند لکھنوی کے شاگرد تھے طریقت میں شیخ عبد الحق ابن سیف الدین بخاری دہلوی اور شیخ جان محمد دہلوی سے استفادہ کیا علاوہ نحو و منطق، کتابت اور فنون حرب میں ید طولیٰ حاصل تھا ہندوستان کی قدیم تاریخ اور ہندی زبان بھی خوب واقف تھے عالمگیری لشکر میں رہے پھر گوشہ نشین ہو گئے شیخ قطب الدین سہالوی کے اصرار سے پھر درس و تدریس میں مشغول ہوئے سنہ ۱۱۲۲ھ میں۔

نواب مرزا مقیم ابوالمنصور خاں صفدر جنگ

نواب مرزا مقیم ابوالمنصور خان صفدر جنگ

برہان الملک کے انتقال اور دہلی لٹنے کے بعد نثار محمد خان شیر جنگ نے نادر شاہ کو عرضی لکھی کہ میں برہان الملک کا بھتیجا ہوں میرا حق ہے کہ اودھ کی صوبیداری مجھے دی جائے لہذا آپ اپنے بھائی محمد شاہ سے میری سفارش کر دیں۔

اودھ کے وکیل راجہ لچھمی نران کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے نادر شاہ کو عرضی لکھی کہ برہان الملک شیر جنگ سے ناراض تھے اس وجہ سے انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی ان سے نہیں کی صفدر جنگ سے کر دی کیونکہ وہ ان سے خوش تھے لہذا آپ اپنے بھائی محمد شاہ سے اودھ کی صوبیداری صفدر جنگ کو دلوا دیں اس شکریہ میں دو کروڑ روپیہ نذرانہ پیش کیا جائیگا

صفدر جنگ صوبیدار نادر شاہ نے محمد شاہ سے اودھ کی صوبیداری کا پروانہ لچھمی نرائن کو دلوادیا اور دو سو قزلباش سوار انکے ساتھ روپیہ لانے کے لئے کر دیئے۔ یہاں خزانہ میں ایک کروڑ اسی لاکھ روپیہ تھا صفدر جنگ نے وہ روپیہ اور بہت سے قیمتی تحائف لچھمی نرائن کو دیئے دہلی میں برہان الملک کی حویلی سے بیس لاکھ روپیہ ملا اسطرح دو کروڑ روپیہ تحائف کے ساتھ نادر شاہ تک پہنچ گیا اور صفدر جنگ اودھ کے صوبیدار ہو گئے۔

صفدر جنگ سے بغاوت دہلی کے انقلاب اور برہان الملک کے انتقال سے شورہ پشت راجا اور سرکش زمیندار جو برہان الملک کے دبدبے کے نیچے دبے پڑے تھے انہوں نے سر اٹھا کے پرگنوں سے عاملوں کو ہٹا دیا اور ہر طرف بغاوت پھیل گئی۔

شیخ فرحت اللہ پر حملہ شیخ رحمت اللہ جو اس گھر کا پروردہ تھا اس نے نمک حرامی پر کمر باندھی رحمت نگر اور ڈونگر پور کے زمینداروں کو اکٹھا کر کے قلعہ رحمت نگر پر قبضہ کر لیا۔ صفدر جنگ کو جب معلوم ہوا تو وہ فوج لے کے موضع کنجریا میں دریا کے کنارے پہنچ گئے

چار پانچ دن وہاں قیام کیا اور شیخ فرحت اللہ کو کئی دفعہ تنبیہ کی مگر وہ سرکشی سے باز نہ آیا ایک دن دوپہر کے بعد جنگ چھڑ گئی اور ساٹھ ہزار سے زیادہ فوج نواب کے مقابلہ میں لے کے آگیا اور بھی توپوں کے دہانے کھل گئے فوج صفدری بے جگری سے ٹوٹ پڑی شیخ فرحت اللہ بندوق کی گولی سے زخمی ہو کے قلعہ میں چھپ گیا آدھی رات تک قلعہ سے بندوقیں چلنے کی آوازیں آتی رہیں نواب کی فوج گرداب کی طرح قلعہ کو گھیرے رہی شیخ فرحت اللہ کسی طرف سے نکل کے بھاگ گیا اسکی عورتوں کو سپاہیوں نے گرفتار کر لیا نواب نے دو ہزار روپیہ دیکے انکے گھر پہنچوا دیا۔

بیسواڑہ پر حملہ فرحت اللہ کی مہم کے بعد نواب بیسواڑہ پہنچے اور سرکشوں کا قلع قمع کر کے لکھنؤ آئے برسات شروع ہو چکی تھی اس وجہ سے وہیں رہے بعد برسات فیض آباد آئے اسکے بعد کسی نے سرکشی نہیں کی لوگوں نے سمجھ لیا کہ برہان الملک زندہ ہیں۔

صفدر جنگ پٹنہ میں ۱۱۵۵ھ میں راگھو گھونسلا دکن سے بنگال آیا الہ وردی خان نے بادشاہ کو کمک کے لئے عرضداشت بھیجی انہوں نے صفدر جنگ کو مدد کرنے کا حکم دیا انہوں نے حضور شاہی میں عرضداست بھیجی کہ لکھنؤ سے جانے کے بعد میرے اہل و عیال غیر محفوظ ہو جائینگے اس لئے مجھے چنار و رتہاس کا قلعہ دیدیا جائے کہ انکو وہاں پہنچا دوں اور باطمینان سے حکم شاہی بجالاؤں عرضداشت منظور ہوئی اور چنار و رتہاس کا قلعہ انکے حوالہ کر دیا گیا وہ اپنے اہل و عیال کو چنار کے قلعہ میں پہنچا کے وہاں کا مناسب انتظام کر کے پٹنہ آئے اور فرنگی باغ میں ٹھہرے صاحب سیر المتاخرین کا بیان ہے کہ پٹنہ کے لوگ صفدر جنگ کی آمد سے دہل گئے کیونکہ نادر شاہ کی دہلی کی فوج کے بیشتر سپاہی صفدر جنگ کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ دہلی میں انکا قتل عام کرنا اور لوٹنا لوگوں کو یاد تھا اس وجہ سے سب سراسیمہ تھے۔ صفدر جنگ کی آمد سے الہ وردی خان بھی خوش نہ تھے انہوں نے مرہٹوں سے

صلح کرلی اور صفدر جنگ ہ ہو گئے انہوں نے نول رائے کو لکھا کہ الہ وردیخان تجھ جنگ پر آمادہ ہیں تم باقی فوج لیکے فوراً میرے پاس آجاؤ الہ وردی خان نے بادشاہ کو بھی لکھا انہوں نے یہ کشمکش مناسب نہ سمجھی اور صفدر جنگ کو واپس ہونے کا حکم دیا ہے انہوں نے الہ وردی خان کے کئی منتخب ہاتھی اور توپوں پر بھی قبضہ کر لیا اور انکے وکیل سے کہا کہ اسکی قیمت لے لو اس نے کہا کہ ہمارا آقا تاجر نہیں ہے لیکن آپکا اور انکا مال دو نہیں ہے آپ جو چاہیں لے لیں تابعدار بغیر انکے حکم کے نہیں دے سکتا صفدر جنگ نے وہ ہاتھی اور توپیں لے لیں اور برہان الملک کے والد کی قبر پر گئے جو شہر اور قلعہ کے بیچ میں تھی وہاں مجاوروں کو زر کثیر تقسیم کیا اسکے بعد عظیم آباد گورکھپور آئے وہاں تین چار دن رہ کے فیض آباد پہنچے۔

صفدر جنگ دہلی میں عمدہ الملک امیر خان قمر الدین خان کی دشمنی کے خوف سے الہ آباد کی صوبیداری پر چلے گئے اور صفدر جنگ سے دوستی پیدا کی ۱۱۵۶ھ میں بادشاہ نے عمدہ الملک کو دہلی طلب کیا انہوں نے ضروری سمجھا کہ صفدر جنگ دہلی آجائیں کہ قمر الدین خان کی سنبش زنی کا مقابلہ ہو سکے انہوں نے بادشاہ کو امادہ کیا کہ صفدر جنگ کو دہلی بلالیں بادشاہ نے بھی مناسب سمجھا اور انکو دہلی طلب کیا وہ عمدہ الملک سے مشورہ کر چکے تھے شاہی طلب پر نول رائے کو اپنا قائم مقام بنا کے اہل و عیال اور فوج و توپخانہ کے ساتھ دہلی پہنچ گئے جمنا کے کنارے پڑاؤ ڈالا ان کی فوج کی بانا تی وردیاں سازو یراق سے ارار تہ گھوڑے ہاتھیوں کے گنگا جمنی ہودے اور زرکار جھولیں دیکھ کے لوگ حیران ہو گئے اس شان کی فوج ہندوستان میں کبھی نہ دیکھی گئی تھی بادشاہ بھی بہت خوش ہوئے ایوان خاص میں انکو باریابی کا۔

صفدر جنگ میر آتش شرف بخشا خلعت مرصع اور مالائے مروارید سے سرفراز کیا ہر روز نواب خدمت شاہی میں حاضر ہوتے تھے بادشاہ نے خوش ہو کے انکو شاہی توپخانہ سپرد کیا جسکی برہان الملک کو تمنا تھی نواب روز سعید میں خلعت پہن کے پیشخانہ میں جلوہ افروز ہوئے اور ہندوستان

یہ تمام قلعے اکبر آباد، الہ آباد، گوالیار، کالنجر، چنار، رہتاس، الور، ... دولت آباد ستارہ کے نئے قلعدار ہوشیار اور کارگزار مقرر کئے اور توپخانہ سے مستحکم کیا شاہجہاں کا قلعہ خالی پڑا تھا اس میں پانچ ہزار سوار مسلح ہر وقت موجود رہنے لگے شاہی توپخانہ جو نادری حملے سے تباہ ہو گیا تھا اسے از سر نو مستحکم کیا سپاہیوں کو ماہوار تنخواہ ملنے لگی وہ سب ایک نئے نظام سے متخاص ہوئے بادشاہ بھی بہت خوش ہوتے فرماتے تھے کہ تمہارے رہنے سے مجھے بہت خوشی حاصل ہوئی ہے۔ جب بادشاہ شکار کو جاتے تو آپ پہلے دروازہ قلعہ پر انکو سلام کرتے اور شکارگاہ پہنچنے سے پہلے خود پہنچ کے مراتب اداب بجالاتے اور بادشاہ کے واپس آنے سے پہلے دروازہ قلعہ پر پہنچ کے کورنش بجالاتے بادشاہ اس خدمت سے اتنا خوش ہوئے کہ کشمیر والہ آباد کی صوبیداری انکے سپرد کی انہوں نے شیر جنگ کو کشمیر بھیجا وہ بسر اللہ خان جو بڑا بہادر اور سرکش تھا اسکو قتل کر کے افراسیاب خان کو اپنا نائب بنا کے دہلی واپس آ گئے الہ آباد کا صوبہ لول رائے کے سپرد ہوا۔

علی محمد خاں روہیلہ سے جنگ | اسی سنہ میں معلوم ہوا کہ محمد علی خاں روہیلہ نے انولہ میں سرکشی پر کمر باندھی ہے سرخ خیمے نصب کر کے بغاوت کا علم بلند کیا ہے نواب نے بادشاہ سے عرض کیا کہ اس کی سرکوبی کے لئے جہاں پناہ خود تشریف لے چلیں بادشاہ ۱۱۵۷ھ کو سخت گرمی کے زمانہ میں امرا اور فوج کے ساتھ روانہ ہوئے گڈھ مکتیشر سے آگے گنگا کے کنارے خیمہ زن ہوئے دو تین دن کے بعد گڈھ مکتیشر سے روانہ ہوئے دونوں کی فوجوں کا سامنا ہوا طرفین سے توپ اور بان چلنے لگے آدھی رات کو اعتماد الدولہ کے خیمہ پر بے پناہ گولے گرے ایک سخت جنگ کے بعد نواب قائم خان والی فرخ آباد کے ذریعہ محمد علی خان نے اطاعت و فرمانبرداری کی درخواست کی وہ انکا ہاتھ رومال سے باندھ کے بادشاہ کی خدمت میں لائے اور معافی کی درخواست کی بادشاہ نے کہا حضور معاف کیا اور بلقیع و فیروزی دہلی مراجعت فرمائی۔

شجاع الدولہ کی شادی | مؤتمن الدولہ نواب اسحاق خان شوستری بادشاہ کے مقرب خاص تھے بادشاہ فرماتے تھے کہ اسحاق خان مجھے ایسے مشورے دیتے ہیں جو کوئی نہیں دیتا انکے انتقال کا بادشاہ کو بہت صدمہ ہوا ایک دن انکے بیٹے کو خلاف دستور شاہی تخت پر اپنے سامنے بیٹھایا اور فرمایا کہ اگر اسکا یہ بیٹا نہ ہوتا تو معلوم نہیں اسکے مرنے سے میرا کیا حال ہوتا اسحاق کی بیٹی امۃ الزہرا کو اپنی بیٹی بنایا اب وہ جوان ہو چکی تھی بادشاہ کو اسکے بیاہ کی فکر ہوئی صفدر جنگ سے پوچھا کہ تم اپنے بیٹے کی شادی کہاں کرو گے انہوں نے کہا کہ وہ میرے ماموں سعادت خاں کی لڑکی سے منسوب تھا مگر اسکی بیٹھ پر ایک منحوس خط ظاہر ہوا ہے اس وجہ سے اسکی ماں راضی نہیں ہیں اسکے بعد والہ داغستانی کی بیٹی سے نسبت ٹھہری مگر وہ کسی کے پیٹ سے تھی اس وجہ سے اس سے بھی اس کی ماں راضی نہیں ہیں بادشاہ نے کہا کہ میں نے اس کی نسبت اسحاق خان کی بیٹی سے قرار دی ہے نواب جھک کے سلام کیا اور کہا کہ جہاں پناہ دونوں کے مالک ہیں۔

۱۱۵۶ھ کو بہار کے موسم میں شادی قرار پائی بادشاہ نے دو کروڑ روپیہ دلہن کے بھائی نجم الدولہ کو شادی انتظام کے لئے دیا یہ شادی بڑی دھوم سے ہوئی کہ منشی انعام علی جو اس شادی میں شریک ہے لکھتے ہیں کہ دارا شکوہ کی حویلی جس میں باون ایوان رفیع الشان تھے۔ طرح طرح کے رنگین کپڑوں سے سجائے گئے چھت۔ کے مسکن ایک وسیع مکان تھا جس میں تین بہت بڑے دالان تھے پائیں باغ میں نہر جاری تھی ان میں رنگین مرغابیاں چھوڑی گئیں ہر دالان میں قالینوں کا فرش تھا ایوانوں کو طرح طرح سے سجایا گیا تھا۔ دروازوں پر بہت پردے لٹکائے گئے دیواریں بھی کے آراستہ کی گئیں انگریزی سنہرے اور لاجوردی پردے لگائے گئے تھے عطر و گلاب ہر طرف یہ ساتھ فوج نہایت عمدہ لباس میں مسلح ہر جگہ کھڑی تھی۔ مچھی بون بھی قصر عدن کا نمونہ تھا اسکے آٹھ برج گوہر و یاقوت سے مرصع کئے گئے تھے

اور چھت آسمانی اطلس اور دیبا سے زرکش سے آراستہ تھی اور در و دیوار آئینہ دکھا رہے تھے امرا سے بلند مرتبہ رونق بخش محفل تھے جگہ جگہ طلائی فانوس کی روشنی موج دریا کی طرح موجزن تھی تمام حویلی اور پائیں باغ میں اس طرح چراغاں ہو رہا تھا کہ زمین آسمان بن گئی تھی اور پائیں باغ جنت نظر آ رہے تھے حرم باغ کی وسعت میں جو بیس بیگھہ جریبی ہے اس میں آتشبازی طرح طرح کی چھوٹ رہی تھی۔

اور ایک نفس کے لئے بھی وہ خاموش نہیں ہوئی تھی تمام صحن میں آتشبازی اپنے پھولوں سے شعبدہ بازی دکھا رہی تھی انار اپنے پھول پریشاں کر رہے تھے انار دانہ کی بلندی آسمان سے باتیں کر رہی تھی بیس ہزار انار دانہ ایک ساتھ چھوڑے گئے۔ چمن گلزار خلیل بنا ہوا تھا آتش بازی کے رنگ رنگ پھول بہار کو شرمندہ کر رہے تھے۔ دارالشکوہ کی حویلی سے نجم الدولہ کے دولتخانہ تک ایک کوس کا فاصلہ ہے چالیس ہاتھ لمبی شہتیروں سے چھتے لکھو د تک اور وہاں سے چوک سعد اللہ خاں تک اور شاہ برج کے نیچے سے ریتی تک اور وہاں سے نجم الدولہ کے مکان تک دونوں طرف بازار کی طرح رونق تھی۔ اور چراغاں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ ابرکی قمقمے رنگین فانوسیں نیچے سے اوپر تک لٹک رہی تھیں اور وہاں سے محمد خاں بنگش کی حویلی تک کہ دو کوس کی مسافت ہے وہاں سے قلعہ شاہی تک یہی عالم تھا نہیں معلوم کتنے چراغاں کے بنگلے جمنا میں ڈالے گئے تھے۔

سطح آب دیوار کہکشاں بنی ہوئی تھی خود بادشاہ سلامت بزرگان شاہی کے ساتھ قلعہ کی عمارت پر بیٹھے سیر دیکھ رہے تھے۔ شادکرہی تھی اور خدمتگار بادلہ پوش ہر طرف ٹہل رہے تھے نور کی لہریں موجیں بنی جا رہی تھیں۔ خلقت لباس زریں سے آفتاب بنی ہوئی تھی۔ زہرہ صورت رقاصاؤں کے رقص سے آسمان گھوم رہا تھا اور مطربوں کے نغموں سے فضا گونج رہی تھی۔ زر و جواہر لٹائے جا رہے تھے کوئی قسمت خوابیدہ نہ تھی نواب انور بادشاہ وامرون

سے رات تک اس شادی کے تزک و احتشام سے لطف اندوز ہوتے رہے شادی کے جلوس میں نواب و امرائے عالیشان پیادہ و سوار لباس طاس زرنگار میں غرق تھے۔ گویا ستاروں کی ایک فوج تھی جو رواں تھی آگے آگے نوبتخانہ اپنی میٹھی راگوں سے سب کو مسرت و شادمانی میں محو کئے ہوئے تھا۔ یہاں تک نجم الدولہ کے دروازے پر پہنچے آتشبازی و نغمہ پردازی کی جلوہ پردازی عجب عالم تھا۔

مورخین کا بیان ہے کہ محفل عقد منعقد ہوئی اور بادشاہ سلامت خود اس میں رونق افروز ہوئے۔ ایسی شادی کسی شہزادے کی بھی نہیں ہوئی تھی۔

احمد شاہ ابدالی سے جنگ ۱۱۶۱ھ میں خبر آئی احمد شاہ ابدالی ایک عظیم لشکر کے ساتھ یلغار کرتا ہوا ہندوستان آرہا ہے۔ نواب منصور امراء وزیر اعظم دربار میں طلب ہوئے جنگ کی تیاری ہوئی راجہ ایشوری سنگھ اور دوسرے راجہ ساٹھ ہزار سوار کے ساتھ آئے شاہی فوج نواب صفدر جنگ کی فوج اور انکا توپخانہ جو دنیا کا مضبوط ترین توپخانہ تھا۔ سب تیار ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کابل پہنچا ناصر خان صوبہ دار کابل اس سے مقابلہ کی طاقت نہ رکھتا تھا وہ دہلی بھاگ نواز ابدالی وہاں سے لاہور آیا شاہ نواز خان سے دو تین جھڑپیں ہوئیں مگر پیش نہ گئیں بادشاہ اسوقت مرض الموت میں مبتلا تھے اعتماد الدولہ نواب صفدر جنگ راجہ ایشوری سنگھ اور دوسرے امرائے نامدار اس مہم پر مامور ہوئے۔ چالیس ہزار سے زیادہ فوج نواب صفدر جنگ کی تھی اپنی ہی وزیر اعظم کی فوج تھی چند رسالے شاہی بھی ساتھ ہوئے اور دار الخلافہ سے کوچ ہوا نواب صفدر جنگ نے دو ماہ کی پیشگی تنخواہ سپاہ اور دوسرے نوکروں پر تقسیم کی دو تین منزلیں طے کر کے سونی پت کے قریب جو دہلی سے ۲۲ بائیس میل ہے پہنچ گئے وہاں یہ رائے ہوئی کہ فوج کی ہمت بڑھانے اور ابدالی پر رعب ڈالنے کے لئے شاہزادہ کا ساتھ ہونا ضروری ہے اعتماد الدولہ قمر الدین خان نے اس رائے کو پسند کیا اور خدمت شاہی میں

پہنچ کے معروضہ پیش کیا بادشاہ نے شہزادہ احمد شاہ کو جانے کا حکم دیا وہ ایک کثیر فوج لیکے روانہ ہوئے اب فوج کی تعداد دو لاکھ ہوگئی وہاں سے کوچ کر کے سرہند پہنچ گئے ابدالی بھی دریائے راوی کو پار کر کے آگے بڑھا لشکر شاہی بھی کوچ کر کے ستلج کے کنارے مچھی واڑہ میں پہنچ گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ابدالی چالیس کوس کے فاصلہ پر ہے شام کو مخبروں نے خبر دی کہ ابدالی کی فوج آرہی ہے قدر جنگ نصیر الدین حیدر خان کے رسالہ کے وہ ماشی کو حکم ہوا کہ وہ خبر لائے ابدالی ستلج کو پار کر کے مچھی واڑہ سے دو کوس مغرب کی طرف سے شہر پہنچا اور وہاں شہر کو آگ لگادی وہ بالشی نے یہ اطلاع بہم پہنچائی نواب سرہند کی طرف روانہ ہوتے دو کوس راہ طے کی آشنا تھا لشکر تمام راہ اب و دانہ سے ناآشنا ہو شام سے سارا لشکر رات بھر کمربستہ میدان میں بیٹھا رہا ایک پیالہ پانی کسی کو نصیب نہیں ہوا نہ گھوڑوں کو دانہ وچارہ ملا لوگ پانی کی تلاش میں ہر طرف دوڑے جہاں چاہ و چشمہ نظر آیا وہاں سے پانی حاصل کیا ابدالی کی فوج بھی سرہند سے پلٹی اور جنگل کے پیچھے مورچ قائم کئے نواب کی فوج کے آدمی جو اب پانی کی تلاش میں گئے تھے ان پر ابدالی کے قراولوں نے حملہ کیا تیغ و خنجر اور گھوڑے چھین لئے گروہ در گروہ حواس باختہ لشکر میں آئے دو لاکھ سوار و پیادے بے شمار دو لاکھ باربرداری کے بیل غلہ یہ سب رات بھر لوٹے کے خطرے سے شخول کے اندیشے سے خلا خدا کر کے رات گذر گئی صبح کو دونوں لشکر کے درمیان پورے دو میل کا فاصلہ تھا ڈھاک کے جنگل کے اس طرف میدان میں ایک گولہ کے بلا سر شاہی توپ اور ٹیکلہ تھا اور جنگل کے پیچھے ابدالی نے اپنا توپ خانہ چھپا رکھا تھا ادھر شاہی لشکر میں ہزاروں بیلداروں اور مزدوروں نے مورچہ کھود کے توپوں کو ایک دوسرے سے ملا کے نصب کر دیا لشکر شاہی چٹیل میدان میں تھا اور فوج ابدالی جنگل کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ طرفین سے توپیں چلنے لگیں جو گولہ شاہی فوج پر گرتا تھا ایک عالم کو ملک عدم پہنچا دیتا تھا۔ اور ادھر سے جو توپیں چلتی تھیں اس سے وہ مجروح ہو کے جنگل میں بھاگ جاتے تھے صبح سے دوپہر تک شاہی توپ خانہ آگ برسا تا رہا دوپہر

کے بعد ایک گھڑی کے لئے جنگ رُکی۔ لوگ کھانے پینے سے فارغ ہوئے پھر ہنگامہ کارزار گرم ہوا۔ نواب منصور تنہا موریچوں پر گشت کرتے رہے کہ لوگ بے خبر نہ ہونے پائیں۔ کنوؤں اور چشموں پر ابدالی کی فوج نے قبضہ کر لیا تھا

صرف ایک بڑا کنواں شہزادہ کی خرگاہ کے پاس تھا جس سے تھوڑا تھوڑا پانی فوج کو ملتا تھا اس قلت کو دیکھ کر لشکر کے بیچ میں لوگوں نے کنوئیں اور جگہ جگہ بڑی بڑی کھوہیں کھودیں امرا نے کچے تہ خانوں کے اندر تہ خانے بنائے۔ چار آنے سیر آٹا، دو آنے سیر دانہ اور روپے سیر گھی فوجیوں کو ملتا تھا۔ شام کو نواب کے باورچی خانے سے ایک مشقاب پلاؤ اور ایک مشک پانی ہر مورچے پر پہنچتا تھا نواب خود بنفس نفیس ہاتھی پر سوار فوجوں کو لڑاتے اور مورچوں پر پہنچ کے ان کو مستعد رکھتے اور انعام دیتے سپاہیوں کی ہمیانیاں اشرفی اور روپوں سے بھر گئی تھیں۔ دشمن گولے اولے کی طرح برسا رہا تھا چودہ دن تک شدت سے جنگ ہوتی رہی۔ پندرہویں دن صبح کو حالت نماز میں قمرالدین خاں وزیر اعظم کے خیمہ پر گولہ گرا اور وہ جاں بحق ہو گئے۔ خواجہ سرئی نے ان کے بیٹے معین الملک کو خبر کی انھوں نے اس کی اطلاع کسی کو نہیں دی۔ باپ کی لاش ہاتھی پر رکھی اور صرف نواب کو خبر کی وہ نہایت دبدبہ کے ساتھ ہاتھی پر بیٹھے۔ توپخانہ مورچوں سے اٹھا کے سامنے لائے اور گولہ باری شروع کی فوجوں کو آگے بڑھایا وہ بندوقیں لے کے بڑے جوش و خروش سے حملہ آور ہوئے ترکش میں تیر رکھ کے آگے بڑھے تمام سوار و پیادے حملہ آور ہوئے۔ فوج کی ترتیب اس طرح تھی، شہزادے کے داہنے پر اعتمادالدولہ وزیر اعظم کی فوج اس کے پہلو میں ناصر خان صوبہ دار کابل کی فوج اس کے برابر راجہ ایشوری سنگھ اپنی فوج کی کمان کر رہے تھے۔ بائیں پر اسد دولہ نصیرالدین حیدر خاں بہادر کی فوج اس کے پہلو میں علی جان خان کی فوج تھی زنبورک اور توپوں کی گرج آسمان تک پہنچ رہی تھی تیر فرسخوں تک جا رہے تھے۔ اور ابھی فوج کچھ ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ ابدالی کی فوج چالیس ہزار کے قریب گھوڑے دوڑاتی چقماقی بندوقیں سر کرتی ایشوری سنگھ کے دستہ کی طرف بڑھی۔

اپنی فوج لے کے میدان سے اس طرح فرار ہوا کہ دور تک نشان نہ ملا۔ دوسرا دستہ نواب کی فوج کی طرف بڑھا ادھر سے توپیں چلنا شروع ہوئیں میدان جنگ گرد و غبار اور دھویں سے سیاہ ہوگیا ایک دستہ اسدالدولہ نصیرالدین حیدر خان کی طرف بڑھا مگر وہ توپخانہ کی زد میں آکر تباہ ہوگیا۔ ایک دستہ قمرالدین وزیر اعظم کی فوج کی طرف بڑھا جس کی کمان ان کے بیٹے معین الملک کر رہے تھے۔ طرفین کے سپاہی جان توڑ کے لڑ رہے تھے لڑائی نے شدت اختیار کی۔ وزیر کی فوج شکست کھا کے بھاگی سب منفرق ہوگئے صرف پانچ ہزار سوار اسدالدولہ کی فوج کے اور پچاس ہزار نواب کی فوج کے سپاہی میدان میں رہ گئے اسدالدولہ نے منشی انعام علی سے کیا کرو۔ حالت جنگ دیکھ کے صحیح پوزیشن بتائیں وہ گھوڑے سوار ہو کے گئے۔ ہنگامۂ تیر و تفنگ عروج پر تھا۔ منشی جی بھی گولی لگتے لگتے بچے نواب کی خدمت میں حاضر ہو کے کیفیت جنگ بیان کی۔ اس وقت شہزادے نے کہا کہ لڑائی ہاتھ سے کی جاتی ہے اور خود ہاتھی پر سوار ہو کے مقابلہ پر آگئے۔ نواب صفدر جنگ اپنی خاصہ کی فوج لے کے آگے بڑھے کچھ سوار ہاتھی کے آگے اور کچھ پیچھے رکھ کے اس زور کا حملہ کیا کہ ہزاروں کو خاک و خون میں غلطاں کر دیا۔ نواب اسدالدولہ کو حکم دیا کہ وہ ابدالی کے باربرداری کے اونٹ چھین لائیں جو شاید سامنے تھے۔

وہ قطار در قطار اونٹ چھین لائے جن کی تعداد دو ہزار تھی۔ جب گرد و غبار بیٹھ گیا اور دونوں طرف کی فوجیں نمودار ہوئیں ہزاروں لاشیں میدان میں پڑی تھیں غروب آفتاب کا وقت تھا۔ گولا باری ہو رہی تھی اُدھر سے جو گولے آتے تھے وہ بے ٹھکانے کرتے تھے اور ادھر کے گولے ٹھیک نشانے پر پڑتے تھے لوگوں نے اسے فالِ ظفر سمجھا رات نے بیچ میں آ کے لڑائی بند کرا دی سارا لشکر تمام

رات چوکس و بیدار رہا صبح کو معلوم ہوا کہ ابدالی کی فوج کا دو فرسنگ تک پتہ نہیں لوگ مطمئن ہو گئے مگر ابھی کسی نے کمر نہیں کھولی تھی کہ ابدالی کی فوج نے چاروں طرف سے حملہ کر دیا نواب صفدر جنگ نے مورچوں پہ جا کے لوگوں کو مستعد کیا۔ دونوں طرف سے تیر و تفنگ کی جنگ شروع ہو گئی۔ صبح سے شام تک شدید جنگ ہوتی رہی شام کو جنگ بند ہوئی ساری رات خبرداری و بیداری میں گذری صبح ہوتے ہی پھر جنگ شروع ہو گئی اور پہلے کی طرح جراءت و مردانگی سے مقابلہ ہوتا رہا۔ دوپہر کو کچھ لوگ اب و دانہ کی فکر میں گئے کسی نے بتایا کہ ابدالی کی فوج نے گھاس کے گٹھر چھین لئے اور ابدالی کی فوج جنگل سے نکل کے اپنے پاس میدان میں دوڑنے لگی۔ ادھر سے توپ خانہ گولے برسانے لگا سارے دن اور رات بھر ہنگامہ کا بازار گرم رہا۔ صبح کو مغل سردار محمد تقی اختہ سے معلوم ہوا کہ ابدالی حیرانی و پریشانی میں مبتلا ہے اور اپنے سرداروں پر غضب ناک ہے کہتا ہے کہتم نے کہا تھا کہ مملکت ہندوستان سرسواری چھین لیں گے وہ بات کہاں گئی۔ سب نے کہا کہ کل ہم پیادہ حملہ کریں گے۔ دوسرے دن دو کوس کے فاصلے سے غبار نمودار ہوا ادھر سے توپ خانہ آگ برسانے لگا۔ شام تک سخت جنگ ہوتی رہی آدمی جانور کسی کو پانی تک نہ ملا۔ شام ہوئی تو لوگ پیاس سے بے چین تھے ساری رات تارے گننے میں گذاری صبح ہوئی نواب صفدر جنگ ہاتھی پہ بیٹھ کے آگے بڑھے۔ فوج ابدالی کالی گھٹا کی طرح نمودار ہوئی توپ و تفنگ سے میدان سیاہ ہو گیا۔ طرفین میں شدید جنگ ہو رہی تھی اسی عالم ابدالی کے دو سردار آئے اور پیام صلح دیا۔ نواب نے کہا یہ میدان جنگ ہے مقام توپ و تفنگ مصالحت کی جگہ نہیں۔ وہ ناکام واپس ہو گئے اور آخری حملہ ستر ہزار فوج سے کر دیا۔ یہی سخت آمالشی کا حملہ تھا ٹڈی دل فوج میدان میں اتر آئی اور ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ خون کا دریا بہنے لگا دن بھر لڑائی ہوتی

رہی سہ پہر کو ابدالی کی فوج نے شکست کھائی اور راہِ فرار اختیار کی اسد الدولہ بہادر نے تعاقب کیا۔ منشی انعام علی کہتے ہیں کہ میں اور دوسرے پانچ سوار نواب کے پاس کھڑے تھے۔

میں نے بر رباعی نذر گزارنی سہ

نواب قضا دست و قدر دستوری ؛ برہم زن ملک قیصری و فغفوری
باحشمت اگر فوج سکندر باشد ؛ نصرت از تست چون ابو المنصوری

نواب نے مجھے اشرفیاں انعام میں مرحمت فرمائیں۔

آج کی رات بھی دانہ پانی کم میسر ہوا لیکن فتح کی خوشی سے سیری حاصل ہوئی اور کوئی غم نہ رہا۔ میدانِ جنگ سے سرہند کی طرف کوچ ہوا جو مشرق کی طرف دو کوس کے فاصلہ پر تھا۔ ستلج سے اتنی ہی مسافت مغرب کی طرف تھی شہزادہ نے لشکر اور امور توپخانہ کے ساتھ بیانہ (شیخ زمان) کے قیام کیا وہاں معلوم ہوا کہ ابدالی پیشاور کے راستے سے ہندوستان سے نکل گیا۔ صفدر جنگ نے معین الملک کو لاہور اور ملتان کا گورنر مقرر کیا اور ایک لاکھ روپیہ ان کو دے کے رخصت کر دیا۔ بیانہ میں دس دن قیام کر کے پانی پت پہنچے۔

محمد شاہ کا انتقال اور احمد شاہ کی تخت نشینی

وہاں ملکہ زمانیہ کا خط ملا کہ محمد شاہ نے فردوس میں آرام گاہ بنائی مرحوم کا تاج شاہی ان کے بیٹے احمد شاہ کے سر پہ رکھا جائے۔ نواب صفدر جنگ نے تاج زر نگار اور تخت زریں کا آراستہ کیا اور صبح طلوع آفتاب کے وقت احمد شاہ کو تخت نشین کر کے نذر گزرانی اور سلطنت ہندوستان کو مبارکباد دی پھر خدم حشم کے ساتھ کوچ کیا منزلیں طے کرتے چاندنی چوک کے راستہ قلعہ شاہجہانی میں نزول جلال فرمایا اور صفدر جنگ کو امور سلطنت انجام دینے کا

حکم دیا۔

صفدر جنگ پر قاتلانہ حملہ

۱۱۶۰ھ کو عید الاضحیٰ کے دن نواب بادشاہ کے ساتھ نماز ادا کرنے گئے وہاں سے واپس ہو کے قلعہ آنے اور بادشاہ کو نذر گذرانی اور گھوڑے پر سوار ہو کے اپنی قیام کو روانہ ہوئے۔ چھتہ نکھو دجو قلعہ بادشاہی اور لاہوری دروازہ سے ایک تیر کے پلہ پر ہے اس سے گذر کے چھتہ آخر میں ایک موڑ ہے وہاں پہنچے تو دفعتہ آگ بھڑکی اور زبردست دھماکہ ہوا۔ گولے اور بان چھوٹنے لگے۔ ایک عالم زیر و زبر ہو گیا منشی انعام علی بھی ساتھ تھے ایک گولا فوراً آپ کے گھوڑا کو لگا وہ اسی وقت گر کے مر گیا کئی آدمی بھی ہلاک ہوئے مگر نواب کو خدا کے فضل سے کوئی گزند نہیں پہنچا اس کا پتہ نہ چل سکا کہ یہ کس کی حرکت تھی۔

صفدر جنگ وزیر اعظم

۱۱۶۱ھ کو بادشاہ نے صفدر جنگ کو وزارت عظمیٰ پر سرفراز کیا اور انہوں نے مہمات سلطنت بحسن وخوبی انجام دینا شروع کیے۔

احمد خان بنگش سے جنگ

۱۱۶۳ھ کو خبر آئی کہ احمد خان بنگش اور افغانوں کے ہاتھ سے راجہ نول رائے مارے گئے اور فرخ آباد سے بنارس تک انہوں نے اپنی حکومت قائم کر لی ہے۔ نواب کو نول رائے کے مارے جانے کا بہت افسوس ہوا۔ بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ وہ یہ خبر سن کر بیہوش ہو گئے بادشاہ بھی ملک کے ایک حصہ پر قبضہ رہنے سے بہت ناراض ہوئے۔ صفدر جنگ ان سے اجازت لے کے ایک بڑی فوج کے ساتھ روانہ ہوئے مارہرہ پہنچے یہاں راجہ بھرتپور اور سورج مل جاٹ بھی اپنی فوج کے ساتھ پہنچ گئے اور

دونوں مئو شمس آباد کی طرف روانہ ہو گئے جب اس کے نواح میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ احمد خان بنگش گوریا گنج میں جو مئو شمس آباد کول اور جالیسر کے درمیان میں ہے مورچے قائم کر دیئے ہیں نواب گوریا گنج پہنچے احمد خان جو ایک کھیت میں چھپ گئے اور جیسے ہی نواب وہاں پہنچے اچانک ان پر حملہ کر دیا اور قندھاری ریلے سیلاب کی طرح اُمنڈ آئے ادھر ابھی لوگ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک غول سورج مل جاٹ ایک اسمٰعیل بیگ ایک غول نجم الدولہ پر حملہ آور ہوا۔ ایک غول نے نواب کو گھیر لیا۔ ادھر سے بھی تیر و تفنگ چلنے لگے سخت جنگ شروع ہو گئی نواب کے داہنے پر نصیر الدین حیدر خان ایک فوج کے ساتھ مستعد کھڑے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ سارا زور نواب کی طرف ہے وہ بڑی بے قراری دشمن پر حملہ آور ہوئے شریف بیگ اور شبدی جواہر بھی ان کی مدد کو پہنچ گئے اور بڑی بے جگری سے دشمن پر ٹوٹ پڑے گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ نجم الدولہ کو ایک تیر لگا جس سے وہ جاں بحق ہو گئے نواب ہاتھی پر تھے۔ ہر طرف سے ان پر گولیاں اور تیر برس رہے تھے علی نقی خان جو خواصی میں تھے مارے گئے اور کئی فیلبان بھی گرے ایک گولی نواب کے جبڑے کو چھیلتی ہوئی نکل گئی اسد الدولہ نصیر الدین حیدر خان بھی جاں بحق ہوئے فوج میں ابتری پیدا ہو گئی نواب نے میدان چھوڑ دیا اور مارہرہ کی راہ لی وہاں پہنچ کے معمولی علاج ہوا اور دہلی روانہ ہو گئے۔

وہاں جب نواب کی شکست کی خبر پہنچی تو احمد خان کے دہلی پر حملہ کرنے کا خطرہ پیدا ہو گیا انتظام الدولہ خان خاناں پسر نواب قمر الدین نے حضور شاہی میں عرض کیا کہ صفدر جنگ کو ان کے غرور کی وجہ سے یہ دن دیکھنا پڑا اگر ان کو فتح حاصل ہوتی تو نہ معلوم کہاں تک نوبت آ پہنچتی اب ان کا حضور شاہی میں حاضر ہونا مصلحت نہیں ہے ان کی جائیداد ضبط کر لی جائے اور انہیں دہلی میں داخل ہونے سے روک دیا جائے اور احمد خان بنگش

کو خلعت اور خوشنودی کا پروانہ بھیج کے اس کو مطیع فرمانبردار بنالیا جائے اس طرح دہلی پر اس کے حملہ کا اندیشہ باقی نہ رہے گا۔ بادشاہ نے اپنی والدہ صاحبہ الزمانیہ سے یہ شورہ بیان کیا وہ بہت غضبناک ہوئیں اور کہا کہ تورانیوں کا خانہ خراب ہو تمہارے باپ ان کے ہاتھ سے کبھی چین کی نیند نہیں سوئے یہ تمہاری خرابی کی فکر میں ہیں ان کی بات پر کان دھرو گے تو طوطے کی طرح پنجرے میں ہوگے۔ صفدر جنگ نے تمہارے ساتھ کیا برائی کی ہے جو ان کا گھر بار ضبط کیا جائے بادشاہ نے جاوید خان خواجہ سرا سے کہا کہ انتظام الدولہ سے کہہ دو کہ وہ اپنے گھر جائیں آئندہ جو رائے ہماری ہوگی اس پر عمل کیا جائے گا۔ انتظام الدولہ یہ سُن کے مغموم و محزون اپنے گھر چلے گئے نواب منزلیں طے کرتے دہلی پہنچے اور اپنی حویلی میں داخل ہوئے پھر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے وہ بہت غمگین وافسردہ ملے۔

ادھر احمد خان بنگش نے کچھ افغانوں کو اودھ پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجا وہاں کی رعایا صفدر جنگ سے بہت خوش تھی فاروقی اور صدیقی شیخ زادے یہاں کی طاقت اور جنگ آزما تھے انہوں نے پٹھانوں کے لڑکے کو نکال دیا اور صفدر جنگ کی حکومت بحال کر دی ان کے سردار معز الدین خان نے صفدر جنگ کو مطلع کیا وہ بہت خوش ہوئے اور ایک خط ان کو لکھا جس میں بہت لطف و عنایات کے ذکر کے ساتھ دو شعر یہ لکھتے۔

خوش کارنامہ ایست کہ آید بروئے کار ٭ این کار از تو آید و مردان چنیں کنند
یا بندو ستا اگر بحیلہ خنجر و کمان ٭ بردست و بازوے تو ہزار آفریں کنند

لکھنؤ میں تو احمد خان بنگش کی حکومت قائم نہ ہو سکی مگر گنگا کے علاقہ پر انہوں نے قبضہ کر لیا پرتھی پت راجہ پرتاپ گڑھ اور بلونت راجہ بنارس ان کے مطیع و شریک

ممد وگار بن گئے اور دہلی پر حملہ کا خطرہ بڑھ گیا۔

عمادالسعادت کا بیان ہے کہ نواب احمد خاں بنگش کے غلبہ سے بہت افسردہ دل رہتے تھے اور روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے عاجز تھے نواب اپنے محل میں زیادہ وقت سونے میں گذارتے تھے ایک دن ان کی بیوی نواب بیگم صاحبہ نے کہا کہ اتنا سونا اچھا نہیں لوگوں کو ہزیمت بھی ہوتی ہے مگر وہ پھر تیاری کر کے دشمن کو شکست دیتے ہیں اگر روپیہ کی ضرورت ہے تو بارہ لاکھ روپیہ اور چار لاکھ اشرفیاں میرے پاس ہیں ان سے سامان جنگ مہیا کیجئے نواب اس پیش کش سے بہت خوش ہوئے۔

صفدر جنگ کا احمد خان سے جنگ کا مشورہ

دوسرے دن صبح کو دیوان خاص میں رونق افروز ہوئے مہاراجہ لچھمی نرائن، راجہ ناگر مل راجہ سورج مل اسمعیل بیگ اور کچھ دوسرے سرداروں کو طلب کر کے مشورہ کیا طے پایا کہ آپا سندھیا اور ملہار راؤ ہولکر کو لے کے احمد خان پر حملہ کیا جائے راجہ رام نرائن کو دونوں کے پاس روانہ کیا انہوں نے ایک کروڑ روپیہ کے معاوضہ پر صفدر جنگ کے ساتھ لڑنے پر معاملہ طے کر دیا اور دہلی آکے نواب کو مطلع کیا۔

احمد خان بنگش پر دوبارہ حملہ

اوائل جمادی الاول ۱۱۶۴ھ کو نواب وزیر نے احمد خان بنگش پر حملہ کرنے کی بادشاہ سے اجازت طلب کی انہوں نے فتح پیچ عنایت کر کے رخصت کیا اب صفدر جنگ شاہی فوج آپا سندھیا اور ملہار راؤ ہولکر کی فوج لے کے روانہ ہوئے ادھر سے احمد خان کے ساتھ نواب سعداللہ خان نواب دوندے خان راجہ پرتھی پت اور راجہ بلونت سنگھ

اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ تھے دو دو لاکھ فوج ہر ایک کے پاس تھی ہم جنگ کے تفصیلات بیان کر کے طول نہیں دینا چاہتے مختصر یہ ہے کہ احمد خان بنگش نے شکست کھا کر گوزر کے ٹیلے پر پناہ لی اس جنگل میں تین طرف سے دشوار گذار خارستان تھا جدھر سے راستہ تھا ادھر افغانوں نے عمیق خندق کھود دی اور برج بنالئے اب یہ مقام بہت مستحکم اور بے گذر ہو گیا جنگل کے وسط میں اپنی لشکر گاہ قائم کی اور توپیں قرینہ سے لگا کے زنجیروں سے کس دیں حفاظتی سامان تو ہو گیا لیکن رسد کا کوئی انتظام نہ تھا جس سے لشکر میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی تھی راجہ کمایوں کے حکم سے دیہاتیوں نے غلہ لاکے بیچنا شروع کیا۔ مگر گوشت ایک سیر فی اشرفی بکتا تھا دو مہینے تک صفدر جنگ محاصرہ کیے رہے۔

ادھر بادشاہ کو معلوم ہوا کہ احمد شاہ ابدالی پٹھانوں کی مدد کے لئے ایک فوج کثیر کے ساتھ آرہا ہے بادشاہ نے مشورہ کر کے صفدر جنگ کو صورت حال سے مطلع کیا اور حکم دیا کہ احمد خان بنگش سے صلح کر کے فوراً واپس آؤ۔

صلح کی بات چیت

صلح کی روئداد بھی بہت لمبی ہے مختصر یہ طے پایا کہ احمد خان بنگش پچاس لاکھ روپیہ تاوان جنگ دیں گے اور پانچ لاکھ سالانہ خراج ادا کرتے رہیں گے اور صلح نامہ مرتب ہو کے طرفین کے دستخط ہوئے صفدر جنگ لکھنؤ آئے اور اپنے بھتیجے محمد قلی خان ابن مرزا محسن کو صوبے کا انتظام پرد کر کے کچھ دن قیام کیا پھر دہلی روانہ ہو گئے۔

جاوید خان کا قتل

جاوید خان خواجہ سرئی جس کو بادشاہ نے نواب بہادر کا خطاب دیا تھا وہ امور مملکت میں دخیل ہو گیا تھا۔ صفدر جنگ جب روہیلکھنڈ گئے تو اس کا اقتدار بڑھ گیا گویا اس نے وزیر اعظم کی جگہ لے لی

بادشاہ اور اُن کی والدہ دونوں اسپر مہربان تھے۔ صفدر جنگ اپنے راستہ اودھ میں تھے۔ احمد شاہ ابدالی کی آمد کی خبر سُن کے بادشاہ نے ان کو لکھا کہ ہولکر اور سیندھیا کو لے کے فوراً آجائیں وہ دونوں کو بہت سا روپیہ دینے کا وعدہ کر کے ساتھ لائے اور دہلی سے باہر جمنا کے کنارے پڑاؤ ڈالے۔ اب معلوم ہوا کہ جاوید خان خواجہ سرا نے لاہور اور ملتان احمد شاہ کو دلوا کے صلح کر لی اس کو صفدر جنگ نے بادشاہ کی بے عزتی سمجھا اور جاوید خان سے بہت ناراض ہوئے۔ مرہٹوں سے جس روپیہ کا وعدہ کیا تھا وہ اس کے طالب ہوئے۔ امیر الامراء نواب غازی الدین خان فیروز جنگ نظام الملک آصف جاہ ناصر جنگ کے بیٹے تھے اور اپنے باپ کا صوبہ چاہتے تھے مگر نذرانہ کیلئے کچھ نہ تھا تو اُنہوں نے کہا اگر مجھے دکن کا صوبہ دے دیا جائے تو میں مرہٹوں کو راضی کر لوں گا۔ بادشاہ نے خوشی منظور کر کے دکن کی صوبیداری کا پروانہ ان کو دے دیا وہ مرہٹوں کو لے کے چلے گئے اور اپنے بیٹے شہاب الدین کو جو سولہ سال کا تھا اور بعد میں عماد الملک ہوا صفدر جنگ کے سپرد کر گئے۔ اب صفدر جنگ کی جان مرہٹوں کے تقاضے سے چھوٹ گئی اور وہ پہلی رمضان کو شہر میں داخل ہوئے۔

ادھر ایک نیا گل یہ کھلا کہ بادشاہ نے اپنی والدہ اور جاوید خان نواب بہادر کے کہنے سے اپنے ماموں مان خان قوال کو شش ہزاری منصب معتمد الدولہ خطاب اور عماد الملک کی حویلی مع سامان امارات اس کو دے دی وہ اس عروج کو پہنچ کر امرا کی برابری کرنے لگا۔ صفدر جنگ کو یہ بات کھلی نواب بہادر امور سلطنت پر حاوی تھا اور بادشاہ کی زبانی جو احکام چاہتا تھا صادر کرتا تھا انہیں دنوں میں عبد المجید خان مجد الدولہ دیوان خالصہ کا انتقال ہو گیا۔ جاوید خان نے اُس کا مال واسباب بحق سرکار ضبط کرنے کا مشورہ دیا۔ صفدر جنگ

چاہتے تھے کہ ایسا نہ ہو مگر ان کی کچھ نہ چلی اور جاوید خان ان کا مال اسباب ضبط کرا دیا یہ بات صفدر جنگ کو بہت کھلی کہ ان کی موجودگی ان کی رائے کی کوئی وقعت خواجہ سرا کے مقابلہ میں نہ رہی انہوں نے نواب بہادر جاوید خان کا قتل ٹھان لیا اور احتیاطاً سورج مل جاٹ کو اپنی فوج کے ساتھ طلب کیا اور ممالک محروسہ کے انتظام کا بہانہ کیا اصل بات یہ تھی کہ اگر جاوید خان کے قتل سے اس کے رفقا کچھ شورش برپا کریں تو اُس کا تدارک ہو سکے ۱۱۶۵ھ کو جمعرات کے دن دارا شکوہ کی حویلی میں جس کا ایک حصہ مچھی بھون کے نام سے مشہور تھا وہاں جاوید خان کو دعوت کے بہانہ بلایا جب وہ آیا تو خود رفع حاجت کا بہانہ کر کے زنانخانے میں چلے گئے علی بیگ خان نسقچی شتاب جنگ کو پہلے سے تیار کر رکھا تھا اس نے جاوید خان کو چھری سے ہلاک کر دیا اس کی سواری کے جلو اور پیادے یہ حال دیکھ کے بھاگ گئے اس کی لاش روضہ شاہ مرداں میں دفن کر دی گئی۔ نواب کے اس فعل سے بادشاہ بہت برہم اور افسردہ ہوئے مگر اس کو ظاہر نہیں کیا بلکہ پہلے سے زیادہ عزت کرنے لگے جو کمزور آدمی کرتا ہے بادشاہ کی ماں بے شک ناخوشی کا اظہار کیا جس کے جواب میں نواب نے کہا کہ مجھے حکیم عبد الشافی خان نے بادشاہ کا یہ پیغام دیا کہ جاوید خان کو قتل کر دو وہ برطرف کر دیئے گئے ان کی جگہ حکیم اکمل خان معالج قرار پائے۔

صفدر جنگ اور غازی الدین خان سے جنگ

احمد شاہ کے دربار میں دو گروہ بن گئے تھے ایک نظام الملک کے بیٹے غازی الدین خان کا دوسرا صفدر جنگ کا۔ جاوید خان خواجہ سرا کے قتل سے بادشاہ صفدر جنگ سے دل میں بہت ناراض تھے انہوں نے غازی الدین کو صفدر جنگ کے استیصال کے لئے اشارہ کر دیا۔ غازی الدین خان نے باقاعدہ

و صفدر جنگ سے جنگ شروع کر دی۔ صفدر جنگ نے جاٹوں سے مدد طلب کی چھ مہینے تک خونریز جنگ جاری رہی آخر میں اس بات پر صلح ہو گئی کہ صفدر جنگ وزارت چھوڑ کے اپنے صوبہ پر واپس چلے جائیں وہ لکھنو آ گئے۔

غازی الدین خان جاٹوں پر اس وجہ سے حملہ کر دیا کہ انہوں نے صفدر جنگ کا ساتھ دیا تھا جاٹ بھی بڑی بہادری سے لڑے غازی الدین خان ان کو زیر نہ کر سکے تو شاہی توپخانہ طلب کیا۔ خانخانان وزیر نے توپیں دینے سے انکار کر دیا۔ غازی الدین خان نے مرہٹوں کو بادشاہ پر چڑھائی کے لیے بلایا بادشاہ نے صفدر جنگ کو خفیہ شقہ لکھا کہ وہ فوج لے کے فوراً آئیں مگر وہ زیر بار میں مبتلا ہو گئے اور دہلی نہ جا سکے غازی الدین خان نے بادشاہ کو قید کر کے آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں۔

صفدر جنگ اپنی بیماری کے زمانہ میں پاپڑ گھاٹ میں مقیم تھے خسرو انگریز ڈاکٹر کا علاج تھا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا تو اس جگہ کو منحوس خیال کر کے پالکی میں حیدری جامہ اور سفید شملہ پہنے تھے جس میں مرصع گوشوارے لٹک رہے تھے ایک کوس کے فاصلہ پر خیمہ و خرگاہ نصب کیا گیا تھا راستہ میں سلام کرنے والوں کو نہایت متانت و متانت سے ہاتھ اٹھا کے جواب دیتے تھے شام کو خیمہ میں پہنچے تھوڑی دیر کے بعد ہائے نواب والے کی آوازیں سنائی دیں لوگ بے اختیار دیوان خانے کی طرف دوڑے منشی انعام علی کہتے ہیں کہ یہ بندہ دیرینہ بھی حاضر تھا کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ جو شخص اس استقامت کے ساتھ پالکی میں بیٹھا ہے وہ شام کو جان جان آفریں کے سپرد کر دے گا۔ میں بھی دیوان خانہ میں پہنچا تو دیکھا کہ صاحبزادے شجاع الدولہ بے اختیار رو رہے ہیں اور اسمٰعیل بیگ ان کو تسلی دے رہے ہیں بارش ہو رہی تھی اس وقت

نواب کا تابوت فیض آباد روانہ ہو رہا تھا۔ صاحبزادہ مرزا یحییٰ عرف مرزا امانی ساتھ ہوئے گلاب باڑی میں دفن ہوئے نواب بیگم نے ان کی قبر پر اعتکاف کیا۔ کچھ دنوں کے بعد میت دہلی لے جا کے دفن کی گئی جہاں شجاع الدولہ نے سنگ سرخ کا نہایت عالیشان مقبرہ بنایا تھا۔ جس میں سنگ مرمر کی سفید دھاریاں تھیں سال بھر کے بعد ان کے استخوان حکیم مرزا بھجو کے ہاتھ کربلائے معلی بھجوائے گئے مگر مقبرہ اب بھی دہلی میں اعلیٰ ترین عمارتوں میں سمجھا جاتا ہے۔

قطعہ تاریخ

ہفتدہم ماہ ذیحجہ	شد چو نافذ دریغ حکم قضا
شد بجنت مقیم صفدر جنگ	شور محشر بخلق شد برپا
دود نزدیک بر عشر بر گشتہ	حسرتا و دریغا و اسفا

سر آہے کشید رضوان گفت

انما جنۃ لہ المثویٰ

۱۱۶۶ھ

صفدر جنگ کے ذاتی اوصاف

حلیہ نواب صفدر جنگ نہایت وجیہہ وشکیل خوش قامت تھے رعب وجلال چہرہ سے نمایاں تھا۔

شجاعت شجاعت میں ان کا مثل نہ تھا ابدالی کی جنگ میں بائیں آنکھ میں تیر لگا اس کو نکال کے پھینک دیا اور اسی طرح فوجوں کو لڑاتے اور توپوں پر دوڑتے رہے جیسے پھرنے کا تماشہ ہو میں نے تو دنیا کے کسی جنرل کو زخم کھاتے اور وہ بھی آنکھ کا

اس طرح لڑتے نہیں دیکھے۔ زہر باکی تکلیف اور حالت نزع میں اس سکون و وقار اور ضبط و تحمل کے ساتھ بیٹھے تھے کہ کسی کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ موت و حیات کی کشمکش میں ہیں کیونکہ نہ کراہتے تھے نہ ہائے وائے کرتے تھے۔ ضبط و تحمل کے ساتھ ان کی انتظامی قابلیت بھی مسلم تھی برہان الملک کے زمانہ سے وہ ان کے نائب کی حیثیت سے انتظامی امور میں شریک رہے ان کی زندگی میں انہوں نے مرہٹوں سے جنگ کر کے ایسی شکست فاش دی کہ ان کی جنگی قابلیت کا لوہا سب مان گئے۔ احمد شاہ ابدالی سے سترہ دن جنگ کر کے ایسی شکست دی کہ ان کو بھاگتے ہی بن پڑا۔

نفاست: وہ نہایت نفاست پسند خوش باش اور شوقین آدمی تھے ان کی فوج کی بانانی اور بان ساز و یراق سے آراستہ سپاہیوں کے گھوڑے ہاتھیوں کے گنگا جمنی ہودے ان پر کارچوبی جھولیں دیکھ کے لوگ عش عش کر جاتے تھے ایسی فوج ہندوستان میں نہ ان کے زمانے میں تھی نہ ان سے پہلے کبھی دیکھی گئی ان کا توپخانہ بھی مشہور تھا۔

علم کی قدر: وہ خود عالم اور علوم و فنون کے قدردان تھے۔ چودہ برس کے سن تک انہوں نے ایران میں تحصیل علم کی تھی۔ مولانا محمد یعقوب فرنگی محلی کو مفتی مقرر کیا مولوی حسن ایک مشہور عالم اہل سنت ان کے معتمد خاص تھے۔ یہ شعر انہیں کے لئے کیا گیا تھا۔

اگرچہ شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

مولوی حمد اللہ کو دستار بدل بھائی بنایا ان کو اپنے برابر کرسی پر بٹھاتے تھے دہلی لے جا کے ان کو فاضل خان کا خطاب دلوایا اور جاگیر دلوائی جس سے انہوں نے سندیلہ میں مدرسہ قائم کیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کو

انہوں نے خط لکھ کے دہلی سے بلوانا چاہا مگر انہوں نے آنا منظور نہیں کیا اجودھیا کے سب سے بڑے پجاری انبھے رام کو جاگیر دی اور صوبہ دار کو لکھا کہ یہ عارف کامل ہیں ان کی ہر طرح سے رعایت کی جائے ان کی دی ہوئی جاگیر آج تک اجودھیا کے پنڈتوں کے پاس ہے۔

وسعت دسترخوان ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا جس پر تکلف کھانے چنے جاتے تھے مورخین نے لکھا کہ ایسا دسترخوان کسی بادشاہ کا بھی نہ تھا۔

سخاوت ان کی سخاوت بھی مشہور زمانہ تھی جس غریب کو دیکھتے تھے اس کو پچاس اشرفیاں عنایت کرتے تھے یہ اصول اُن کا زندگی بھر رہا۔ سپاہیوں کو برابر انعام دیتے تھے وہ خود شاعر اور شاعروں کے قدر دان تھے تذکرہ صبح گلشن میں ان کا یہ شعر لکھا ہے۔

اشک چشم رفتہ رفتہ در گلو زنجیر شد
طفل دامن گیر ما آخر گریبان گیر شد

دہلی میں اپنی وزارت کے زمانہ میں چھتہ نخود کے پاس پہنچے اس چھتہ کے اوپر نہر تھی جس کا پانی قلعہ میں جاتا تھا مرزا عظیما اصفہانی اکسیر تخلص ان کے ساتھ تھے نواب نے کہا کہ اپنا کوئی شعر سناؤ وہ نواب کی نیت کو تاڑ گئے اور برجستہ یہ شعر کہا ۔

قد خمیدہ سدرہ گریہ ام نشد
این آب رفتہ رفتہ ز بالائے پل گذشت

نواب اس برجستہ گوئی سے بہت خوش ہوئے۔ پانچ ہزار روپیہ اور ایک گھوڑا ساز زر براق سے آراستہ عنایت کیا۔

برہان الملک کے زمانہ کے شعراء ان کے زمانہ میں بھی موجود تھے ان کے زمانہ میں زبردست خان وفائی مرزا ابو علی ہاتف ملا مجیدی شوستری شیخ عبدالرضا متین مرزا ابوطالب اصفہانی آغا برشتہ آذر بائیجانی مرزا محمد شفیع بسمل، مرزا محمد رضا اصفہانی، مرزا عبدالمجید اصفہانی، مرزا کاظم علی بیگ ہور؟ مرزا اشرف الدین وفا ایران سے آئے۔

مرزا احمد بیگ بلگرام سے آئے اور ابدالی کی جنگ میں گولی لگنے سے جاں بحق ہوئے۔ شاہ خلیل اللہ بینوا دہلی سے آئے۔ عبدالرشید رشید معقولات میں عالم متبحر تھے اور شعر بھی خوب کہتے تھے۔ برتال حفیظ اللہ علم رمل میں بڑا دخل رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے تخلص رمال رکھا تھا۔ مولوی رفیع الدین سرودی مرزا محمد فاخر مکیں دہلی سے آئے اور تیس برس تک لکھنؤ میں بقید حیات رہے۔

اردو شعراء میں میر ضاحک اور میر حسن دہلی سے آئے۔ یہ تمام شعراء صفدر جنگ کی قدر دانی سے آسودہ حال تھے۔

برہان الملک کے زمانہ کے علماء لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں علمی مسند بچھائے ہوئے تھے۔ جو مقام بنگلے کے نام سے مشہور تھا اس کا نام صفدر جنگ نے فیض آباد رکھا۔ پختہ عمارتیں بنوائیں اب وہ ایک فوجی کیمپ ہی نہیں رہا ایک شہر بن گیا جس کی خصوصیت تھی کہ ہندوستان کے تمام شہروں میں سہ پہر سے بازار بند ہو جاتے تھے۔ بعض جگہ اب بھی یہی ہوتا ہے کہ ایران میں سہ پہر سے آدھی رات تک دن رہتا تھا فیض آباد کی بھی یہی حالت تھی اسی کو شام اودھ کہتے ہیں جو ایک عجیب چیز سمجھی جاتی ہے۔

لال بارہ دری۔ لکھنؤ

مرزا جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ بہادر

نواب مرزا جلال الدین حیدر شجاع الدولہ وزیر الممالک ہزبر جنگ

۱۱۴۴ھ میں پیدا ہوئے علوم مروجہ کی اعلیٰ تعلیم اور فنون سپہ گری میں کمال حاصل کیا ۱۱۵۸ھ میں نواب محمد اسحاق خان شوستری کی صاحبزادی سے شادی ہوئی احمد شاہ نے شجاع الدولہ خطاب اور میر آتشی کا عہدہ دیا۔ ۱۱۶۷ھ کو اپنے والد کی جگہ مسند حکومت پر بیٹھے۔

ایک سازش منشی غلام علی نے عماد السعادت میں ایک نکتہ کی بات لکھی ہے جو ہمارے آئندہ کے بیان کو سمجھنے میں مدد دیگی انہوں نے پہلے یہ سرخی قائم کی ہے اس سرخی کے تحت وہ لکھتے ہیں۔

اسمٰعیل بیگ چاہتا تھا کہ شجاع الدولہ کو صاحبزادوں کی طرح رکھے اور حکومت خود کرے۔ دوسرے سرداران مغلیہ بھی اسکے اثر میں تھے۔ اور ہر ایک اپنے کو شجاع الدولہ کا چچا سمجھتا تھا کسی بات میں انکی موافقت نہیں کرتا تھا یہ لوگ صفدر جنگ کے بھتیجے محمد قلی خان صوبیدار الہ آباد سے ربط رکھتے تھے اور چاہتے تھے شجاع الدولہ کی جگہ انکو مسند نشین کر دیا جائے اور شجاع الدولہ اور صفدر جنگ کے دوسرے خاندان والوں کو جاگیر دیدی جائے۔

میرا خیال ہے کہ شجاع الدولہ کمسنی کے باوجود اتنے نرم آدمی نہ تھے جو اسکی مٹھی میں سما جاتے انکے کڑے تیور دیکھ کے پہلے اس نے یہ

ایک الزام الزام لگایا کہ وہ حسن پرست اور امرد دوست ہیں جو کسی طرح صحیح نہیں بے شک وہ حسن پرست تھے عورتوں پر فریفتہ تھے اس طرح کا آدمی امرد پرست نہیں ہوتا اور امرد پرست عورتوں سے رغبت نہیں رکھتا اسمٰعیل بیگ کو اندازہ ہو گیا ہے کہ شجاع الدولہ اس کا کھلونا نہیں بن سکتے اور محمد قلی خان کو جب اسکے ہاتھ سے حکومت ملے گی تو

وہ اسکی مٹھی میں آجائینگے اس لیئے اس نے نواب پر یہ الزام لگا کے اپنا مطلب نکالنا چاہا۔

ایک حادثہ ابھی وہ اپنے منصوبہ پر عمل نہیں کرنے پایا تھا کہ یہ حادثہ پیش آیا کہ ایک کھتری کے گھر میں ڈاکہ پڑا ڈاکوؤں کے شور وغل سے گھر والے سہم کے چھپ گئے۔ ڈاکو اسکی اٹھارہ سالہ دوشیزہ کو اٹھا لے گئے اور اسکی کلی کو پھول بنا کے چھوڑ گئے صبح کو جب اسکے گھر والوں نے پوچھا کہ رات کہاں تھی تو اس نے بردہ ماجرا بیان کی ان لوگوں نے یہ قیاس کیا کہ امراؤگر اور ہمت بہادر ناگے ہوں گے جو لڑکی کو نواب کے لیئے لے گئے۔ اسمٰعیل بیگ ان دونوں سے بھی جلتا تھا کیونکہ وہ نواب کے مقرب تھے لڑکی نے یہ نہیں بتایا کہ مجھے دو آدمی لے گئے جو برہنہ تھے نہ دو آدمیوں کا شور وغل اتنا ہو سکتا تھا کہ گھر والے سہم جائیں مگر قیاس نے حقیقت کا جامہ پہن لیا۔ وہ کھتری راجہ رام نرائن دیوان کے پاس گیا اور پگڑی پھینک کے رات کا واقعہ بیان کیا راجہ رام نرائن اور اسکے بھتیجے جگت نرائن نے بارہ ہزار ہندوؤں کا جلوس نکالا جو سب ننگے سر اور ننگے پاؤں تھے یہ جلوس کے ساتھ اسمٰعیل بیگ کے پاس گئے اور کہا کہ مالک ملک نے رعایا پر ظلم کی کمر باندھ لی ہے ہم آپ کو صفدر جنگ کی جگہ سمجھتے ہیں اسمٰعیل بیگ کو اپنی دیرینہ خواہش پوری کرنے کا موقع مل گیا اس نے نواب سے کہلوایا کہ امراؤگر اور ہمت بہادر کو ہمارے حوالہ کر دیجیئے نواب نے کہا کہ اگر تم مجھکو اس واقعہ کا ذمہ دار سمجھتے ہو تو مجھے باز پرس کرو امراؤگر اور ہمت بہادر کی طرف کسی نے کڑی نگاہ سے دیکھا تو اسکی آنکھیں نکال لوں گا۔ میں ایسی مسند حکومت سے بوریا بے فقر کو ترجیح دیتا ہوں جو مجھے اس طرح بے بس کر دے تم اپنی کثرت تعداد پر نازاں نہ ہو میں تھوڑے سے آدمیوں سے تمہارا مقابلہ کروں گا۔ اپنی خدمت کے لیئے مجھے بر وقت حاضر جانو۔

محمد قلی خاں کی الہ آباد سے طلبی ان لوگوں نے محمد قلی خاں کو الہ آباد خط لکھ کر بلوایا وہ خط دیکھتے ہی روانہ ہو گئے۔

جناب عالیہ کی مداخلت نواب کی والدہ جناب عالیہ کو جب ان حالات کا علم ہوا تو انہوں نے راجہ رام نرائن کو ڈیوڑھی پر طلب کیا اور پردہ کے پیچھے بیٹھ کے اس سے کہا آفرین صد آفرین نجیب زادوں کا یہی کام ہے کہ آقا اور آقا زادے جسکے باپ سے لاکھوں کی دولت تمہارے ہاتھ آئی ایسا ہی سلوک کرنا چاہیئے صفدر جنگ نے تم لوگوں کی پرورش اسی دن کے لئے کی تھی کہ انکے لڑکے کے دشمنوں سے مل جاؤ میں نہیں جانتی تھی کہ اس گھر کی خرابی کا باعث تم ہو گے۔ مانا کہ محمد قلی خان صفدر جنگ کے بھائی کا بیٹا ہے مگر چلتا ہے نام تو لڑکے سے ..رام نرائن نے عرض کیا کہ اگر فدوی کی جان صاحب زادے کے کام آئے تو دریغ نہیں میں نے اس قدر شورش اسلئے برپا کی کہ آئندہ صاحبزادے سے ایسی حرکت نہ ہو۔ مجھکو محمد قلی خان سے کوئی سروکار نہیں بخدا اگر زمانہ دگرگوں ہوا تو ہم فقیری لے کے بنارس میں بیٹھ جائنگے اور اگر جان فاقہ سے ہونٹوں پر آجائیگی تو سوا شجاع الدولہ بہادر کے دوسرے کے دروازے پر نہ جائینگے ہزار بار مرنا اس سے بہتر ہے میں نے نواب صفدر جنگ کا نمک کھایا ہے۔ میں اس ہندو کو راضی کرلوں گا اب صلاح یہ ہے کہ جس طرح سرکار نے مجھ غلام کو بلا کے تنبیہ کی ہے اسی طرح اسمٰعیل بیگ اور چند سرداران مغلیہ کو بلا کے انکی تعریف کریں کیونکہ وقت ہاتھ سے جاتا ہے جناب عالیہ نے راجہ کی تعریف کی اور رخصتی کا پاندان دیکے سرفراز فرمایا اسکے بعد اسمٰعیل بیگ اور دوسرے مغلیہ سرداروں کو طلب فرمایا اور مصلحت آمیز کلمات سے انکو رام کرلیا آخر برہان الملک کی بیٹی تھیں ریاست و سیاست میں آنکھ کھولی تھی ایسی باتیں کیں کہ ان لوگوں نے شرمندگی کا اظہار کیا پھر کسی کو پاندان اور کسی کو خلعت دیکے رخصت کیا وہ لوگ صفدر جنگ کے احسانات کو یاد کرکے بہت محجوب ہوئے اپنے ارادہ فاسد سے باز آگئے۔ اور محمد قلی خان کو لکھا کہ وہ الہ آباد واپس ہو جائیں وہ آدھی منزلیں طے کرچکے تھے اب الہ آباد واپس جانا مناسب نہ سمجھا اور کہا کہ میں شجاع الدولہ سے ملاقات کے لئے

جارہا ہوں اسطرح انہوں نے اپنے خیال میں بات بنانا چاہی مگر مقصد تو سب کو معلوم تھا وہ نواب کے پاس آئے انھوں نے بھی بمصلحت ان کا استقبال کیا بہت احترام کے ساتھ انکو محل سرئی میں لائے اور انکی دعوت کی انہوں نے اشرفیاں نذر میں پیش کیں مگر شجاع الدولہ نے سمجھ لیا کہ گھر کے اس دشمن سے بے خبر نہ رہنا چاہیے مختصر یہ کہ جناب عالیہ کی مداخلت سے یہ بلا ٹل گئی۔ زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ اسمٰعیل بیگ کابلی مر گیا نواب نے اطمینان کی سانس لی۔ اور نئی فوج بھرتی کرنا شروع کی ناگوں کی ایک پلٹن بنائی۔

بلونت سنگھ راجہ بنارس پر حملہ اودھ کا خزانہ بنارس میں تھا راجہ بلونت سنگھ نے اس پر قبضہ کر لیا تھا ۱۱۶۹ھ کو ایک بہت بڑی فوج کو لے کر بنارس روانہ ہوئے گنگا پر پل باندھ کے چنار گڑھ کے قلعہ کے پاس پہنچے اسکے سامنے ایک بہت بڑا میدان تھا جسمیں فوج نے پڑاؤ ڈالا اسکی تعداد تقریباً پچاس ہزار تھی یہ سب صف باندھ کے تیار ہوئے مگر راجہ کی فوج مقابل میں نہ آئی وہاں سے کوچ کر کے راجہ کی فوجی چھاؤنی کے پاس پہنچ گئے۔ راجہ نے دیکھا کہ نواب اسکے استیصال کی فکر میں ہیں تو اس نے عرضداشت لکھی کہ غلام اس خاندان کا نمک پروردہ ہے اور ہمیشہ بندگی اور جان نثاری کے لئے تیار ہے امید ہے کہ فدوی کی خطا بخش دی جائے۔ خزانہ بھیج رہا ہوں نواب نے اس کی خطا معاف کی اسکو معافی کا پروانہ بھیجا خزانہ لیکے فیض آباد واپس آئے۔ فوج کی تنخواہ جو مہینہ کی باقی تھی سب کو ادا کر دی حکم اور فوج رکھی سب مل کے فوج کی تعداد ساٹھ ہزار ہو گئی۔

لکھنؤ کو دارالامارہ بنایا ہر سال فصل ربیع میں بنارس اور غازی پور جاتے تھے اور لکھنؤ واپس آتے تھے چھ سال اسطرح گذرے۔

شجاع الدولہ اور نواب سعد اللہ خان عماد الملک غازی الدین خان کی وجہ سے صفدر جنگ کو دہلی چھوڑنا پڑی شجاع الدولہ کو ان کی طرف سے کھٹکا لگا رہتا تھا کہ

وہ بادشاہ کے مزاج میری طرف سے برہم کر کے ملک پر قبضہ کر لینگے اور میں مقابلہ نہ کر سکوں گا اس لیے کسی کو اپنا مددگار بنانا چاہیئے یہ سوچ کے انہوں نے خان جہاں کے پوتے غلام رسول کو نواب سعد اللہ خان کے پاس روانہ کیا۔

اور دستار بدل بھائی بننے کی خواہش کی انہوں نے بڑے خلوص سے اسکو قبول کیا طرفین نے اپنی اپنی پگڑیاں بھیج کے بھائی چارہ قبول کیا اور معاہدہ کیا کہ دونوں ایک دوسرے کے مددگار بنیں گے۔

عازی الدین خان کا حملہ احمد شاہ ابدالی نے صوبہ لاہور کو دربار دہلی سے حاصل کر لیا تھا۔ مگر وہاں کے حاکم میر منو پسر قمر الدین خان وزیر اعظم کو اپنے عہدہ پر بحال رکھا وہ ایک دن شکار کو گئے راستہ میں گھوڑے سے گر کے مر گئے تو شاہ درانی نے انکے شیر خوار بچہ کو اسکی ماں کی نگرانی میں لاہور کا حاکم بنا دیا کچھ دن کے بعد وہ بھی مر گیا عازی الدین میر منو کی بیٹی سے شادی رچانے کے بہانے لاہور آیا اور میر منو کی بیوہ کو گرفتار کر لیا احمد شاہ درانی کو جب اس کا علم ہوا تو وہ کابل سے لاہور آیا عازی الدین نے اپنی ساس کو رہا کر دیا اور اسکے ساتھ ابدالی کے پاس پہنچ کے اپنا قصور معاف کرا لیا مگر ابدالی نے اپنے نقصان کا معاوضہ طلب کیا اور اسکو حاصل کرنے کے لیے دہلی پہنچ کر شہر کو لوٹ لیا دس مہینہ تک وہ دہلی میں رہا اور اپنا معاوضہ طلب کرتا رہا عازی الدین خان کہا کہ تیموری شہزادوں کو میرے ساتھ کر دیجئے تو میں لودآبہ کے علاقے سے روپیہ وصول کر لاؤں اس سے اس کا اصل منشاء شجاع الدولہ سے روپیہ وصول کرنا اور انکا اخراج تھا۔ احمد شاہ کے حکم سے ہدایت بخش عالمگیر ثانی اور مرزا بابر داماد عالمگیر ثانی اور افواج درانی جانباز خان کی ماتحتی میں غازی الدین کے ساتھ کر دیئے گئے۔ احمد شاہ نے حافظ رحمت خان کو بھی عازی الدین خان کی مدد کو لکھا وہ فوج جمع کر کے انکا انتظار کرنے لگے۔ احمد خان بنگش نے کچھ گھوڑے ہاتھی اور سپاہی دیئے عازی الدین خان نے گنگا عبور کر کے شجاع الدولہ پر چڑھائی کی اور ان کو لکھا کہ ملک بادشاہی

خالی کر دوں صفدر جنگ کا مال و اسباب میرے حوالہ کرو اور شہزادوں کے لئے پیشکش حاضر کرو شجاع الدولہ یہ پیام سنتے ہی فوج لیکے روانہ ہو گئے اور لکھنؤ سے اسی میل کی مسافت طے کر کے سانڈی پالی پہنچ گئے وہاں سے انہوں نے میر کلے کو نواب سعد اللہ خان کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ غازی الدین خان میری تباہی کے درپے ہیں اب آپ کی مدد کا وقت ہے انہوں نے تیاری کر کے اپنے بھائیوں کو ساتھ لیکے حافظ رحمت خان دوندے خان بخشی سردار خان عبدالستار خان شیخ کبیر ملا محسن اور سید معصوم کی فوج کے ساتھ آنولہ سے کوچ کیا اور شجاع الدولہ کو لکھا کہ جان و مال عزت ناموس اس معاہدہ کی وجہ سے ہمارا آپ کا ایک ہے کسی قسم کا تردد نہ کیجئے ہم بہت جلد پچاس ہزار سوار کے ساتھ پہنچتے ہیں اور کوچ کر کے کودیپور پہنچ گئے۔ اور اعلان کر دیا کہ شجاع الدولہ کا مخالف ہمارا دشمن ہے اسکو چاہئے کہ پہلے میرا سر کاٹے پھر شجاع الدولہ کا۔ اس عرصہ میں عالمگیر ثانی کے متعدد فرمان نواب سعد اللہ خان کے پاس آئے کہ شہزادوں کی اطاعت و فرمانبرداری کریں اور شجاع الدولہ کو اودھ سے نکال کے سارا مال و اسباب ضبط کر لیں اس خدمت کا صلہ ہیں عنایت بادشاہی کے مورد ہوں گے مگر نواب سعد اللہ خان نے ان فرمانوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور عماد الملک غازی الدین خان کو کہلوا بھیجا کہ شجاع الدولہ سے لڑنے کا خیال نہ کریں اور دہلی واپس چلے جائیں ادھر شجاع الدولہ نے عماد الملک کے پاس سفیر بھیج کر صلح کی استدعا کی مگر شجاع الدولہ کی بربادی منظور تھی اس وجہ سے اتنا روپیہ طلب کیا جو شجاع الدولہ نہ دے سکتے تھے اس عرصہ میں طرفین کے فرادلوں میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی شروع ہو گئیں حافظ رحمت خان نے سعد اللہ خان کو کہلوا بھیجا کہ شجاع الدولہ کے پاس جا کے صلح کی بات چیت کیجئے نواب نے شجاع کے پاس جا کے دستار بدلی اور اخوت کی تجدید کر کے واپس چلے آئے حافظ رحمت خان کو جب حال معلوم ہوا تو بہت ناراض ہوئے مگر صلح کو اصلح سمجھ کے عماد الملک کو لکھا کہ سعد اللہ خان نے بخوری سے جو خورد سالی کا نتیجہ ہے شجاع الدولہ سے صلح کر لی ہے جسکا حال آپ نے سنا

ہو کہ شجاع الدولہ اپنے امکان بھر روپیہ دینے کو تیار ہیں اور مجھکو احمد شاہ درانی کا ہی حکم ہے
کہ شجاع الدولہ روپیہ دینے میں عذر کریں اور لڑائی پر آمادہ ہوں تو عماد الملک کی مدد کرو
میری رائے یہ ہے کہ آپ صلح کرلیں ورنہ میں اپنے ملک کو واپس جاتا ہوں اور بادشاہ کو
سارا حال لکھ بھیجوں گا۔ عماد الملک نے اپنا کوئی طرفدار نہ دیکھا تو مجبور ہو کے پانچ لاکھ پر صلح کرلی
نواب سعد اللہ خان نے یہ روپیہ ادا کر دیا جو شجاع الدولہ کے بعد کو ان کے پاس بھیجا۔ شجاع الدولہ
سعد اللہ خان کے بہت شکر گذار ہوئے۔ ۹ شوال ۱۱۷۱ھ کو سانڈی پالی سے کوچ کر کے چار
دن میں لکھنؤ پہنچ گئے۔ اور نواب سعد اللہ خان انولہ چلے گئے اسطرح اس لڑائی کا خاتمہ ہوگیا۔

روہیلہ مرہٹہ جنگ اور شجاع

غازی الدین خان کو روہیلوں کا شجاع الدولہ کے ساتھ
ہو کے ایک معمولی رقم پر صلح کرنے پر مجبور ہونا بہت کھلا اب وہ شجاع الدولہ کے ساتھ
روہیلوں کو بھی تباہ کرنے کی فکر میں پڑ گئے انہوں نے مرہٹوں سے کہا کہ تم پہلے روہیلوں کو تباہ
کر کے روہیلکھنڈ پر قبضہ کرو پھر اودھ پر مرہٹے یہ مژدہ سنتے ہی دکن سے دہلی پہنچ گئے ۱۱۷۲ھ
کو انہوں نے جمنا کو عبور کر کے نجیب الدولہ پر چڑھائی کی وہ مظفر نگر کے قریب سکرتال میں پناہ
گزیں ہو گئے اور نواب سعد اللہ خان۔ حافظ رحمت خان دوندے خان روہیلہ سرداروں سے امداد طلب کی
برسات ہو رہی تھی مگر روہیلے کڑے کڑے کوچ کرتے ہوئے امروہہ پہنچ گئے نواب سعد اللہ
خان نے شجاع الدولہ کو بھی مدد کے لئے لکھا غازی الدین خان نے بھی شجاع الدولہ کو لکھا کہ
آپ ہمارے شریک ہو کے پٹھانوں کو نکال کے سلطنت کا انتظام اپنی مرضی سے کریں۔
انہوں نے علی بیگ خان جارچی کو بھیج کے غازی الدین خان کو حیلہ بہانے میں رکھا کہ وہ انکے
خلاف کوئی قدم نہ اٹھائیں نجیب الدولہ نے شجاع الدولہ کو لکھا کہ ہم نے احمد شاہ ابدالی کو
بلایا ہے ایک سال ادھر وہ شجاع الدولہ پر چڑھائی کر چکا تھا اور روہیلوں کی وجہ سے اسکو ناکامی
ہوئی تھی اب وہ روہیلوں اور شجاع الدولہ دونوں کو تباہ کرنا چاہتا تھا شجاع الدولہ کو خط لکھ کے

اپنے ساتھ ملانے کی کوشش بھی روہیلوں اور شجاع الدولہ دونوں کو کمزور کرنے کی ایک چال تھی شجاع
الدولہ اس چال کو سمجھ گئے اور ایک فوج لے کے ۱۱۷۲ھ کو لکھنؤ سے روانہ ہو کے شاہ آباد ضلع ہردوئی
پہنچ گئے کیونکہ برسات کی وجہ سے گنگا کی طغیانی سکرتال تک پہنچنے سے مانع تھی دتاسندھیا
کو روہیلوں اور شجاع الدولہ کے میل کا پتہ چلا اور گنگا کی طغیانی کچھ کم ہوئی تو اس نے گوبند رائے
بندیلہ کو بیس ہزار فوج دیکے روہیلوں کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا وہ ٹھاکر دوارے کے راستہ
سے جمنا عبور کر کے چاندپور نگینہ پہنچا اور اسکے اطراف کو لوٹنا شروع کیا شجاع الدولہ اوائل ربیع
الاول ۱۱۷۳ھ کو تیس ہزار سوار کے ساتھ شاہ آباد سے روانہ ہوئے اور دو منزلہ سہ منزلہ کرتے
ہوئے نواب سعد اللہ خان کے پاس پہنچ گئے اس درمیان میں مرہٹوں نے تیرہ سو گاؤں اطراف
امروہہ کے لوٹ لئے یہ سن کے شجاع الدولہ اور سعد اللہ خاں چاندپور پہنچ گئے وہاں مرہٹوں کی فوج کم نظر
آئی تو یہ لوگ وہاں سے کوچ کر کے پانچ کوس پر ملدوا آئے تو معلوم ہوا کہ مرہٹوں نے بڑا زور باندھ
رکھا ہے شجاع الدولہ نے انوپ گر گوشائیں اور امراؤ گر گوشائیں کو مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے
ایک طرف بھیجا دوسری طرف اپنے خالہ زاد بھائی نجف خان کو پانچ ہزار سوار کے ساتھ اور محمد باقر
میمونی کو چار ہزار سوار کے ساتھ مرہٹوں کے پڑاؤ پر حملہ کرنے کو بھیجا ان لوگوں نے مرہٹوں
بری گت بنائی خاص کر امراؤ گر اور انوپ گر نے نو سو مرہٹے مارے اور سو کو زندہ گرفتار
کر لائے اور بہت سا مال و اسباب بے شمار گھوڑے چھین لئے مرہٹے گرتے پڑتے گنگا کو عبور کر گئے
کچھ ڈوب گئے کچھ تیرنا نہ جاننے کی وجہ سے دریا میں نہ اتر سکے انکو شجاع الدولہ کے سپاہیوں نے
قتل کر دیا ۲۲ الاول کو شجاع الدولہ ملدوا سے کوچ کر کے نجیب الدولہ کے پاس پہنچ گئے مگر مرہٹے
گنگا پار کا علاقہ تباہ کرتے رہے جب مسلمانوں کی فوج کے سامنے پڑتے تو مارے جاتے۔
سندھیا نے بیس ہزار فوج جو روہیلکھنڈ بھیجی تھی اسکے قید ہونے سے اسکی فوجی طاقت کمزور ہوگئی
روہیلے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دے چکے تھے وہ قندھار سے کوچ کر کے

پہنچ چکے تھے مرہٹوں کو جب اسکا علم ہوا تو انہوں نے شجاع الدولہ اور روہیلوں کے پاس صلح کا پیغام بھیجا ان لوگوں نے بھی لڑائی نہ کرنے کی شرط قبول کر کے صلح کرلی یہ لوگ یہ چاہتے تھے کہ اس وقت صلح کر کے لڑائی کو ٹال دیا جائے اور احمد شاہ ابدالی کے آنے کا انتظار کیا جائے مرہٹے اس صلح سے مطمئن ہو کے روہیلوں کے ملک سے چلے گئے روہیلوں نے شجاع الدولہ کو بہت سی کشتیاں کپڑے، ہاتھی، گھوڑے اور نقد دیکے رخصت کر دیا۔ شجاع الدولہ نے تین ہزار سوار علی بیگ خان کی ماتحتی میں نجیب الدولہ کے پاس ابدالی کی فوج میں شامل ہونے کے لیے چھوڑ گئے۔

عالمگیر ثانی کا قتل

غازی الدین خان عالمگیر ثانی کا وزیر تھا اس نے انکو بہت ستایا تھا۔ اور بہت گستاخیاں کی تھیں جب اس نے ابدالی کے آنے کی خبر سنی تو اسے خیال ہوا کہ بادشاہ میری شکایت اس سے کرینگے تو میری خرابی لگ جائیگی اس نے بادشاہ کو قتل کر دیا اور محی السنۃ پسر کام بخش کو تخت پر بیٹھا کے خود سورج مل جاٹ کے بیان بھرت پور جاکے چھپ گیا۔

میدان باؤلی کی جنگ

دتا سندھیا روہیلوں سے مصالحت کر کے انکی طرف سے مطمئن ہو کر احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ کو روانہ ہو گیا احمد شاہ کوچ کرتے ہوئے سہارنپور پہنچے اور وہاں جمنا پار اتر گئے روہیلوں کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ سکرتال سے چل کے ابدالی کے پاس پہنچ گئے ان سب نے دلی کے قریب میدان باؤلی میں دتا کو گھیر کے اسکو اور اسکی فوج کے دو حصہ ختم کر دیئے۔ ملہار راؤ ہولکر سکندرہ میں پڑاؤ ڈالے پڑا تھا وہ دتا کی تباہی کی خبر سن کے جنبل کی طرف جنوبی ملک میں بھاگنے لگا سیدھی راہ اس نے اسوجہ سے چھوڑی کہ مسلمانوں کی رسد لوٹے مگر یہ خواہش پوری نہ ہوئی پندرہ ہزار درانیوں نے اسکو گھیر کے تباہ کر دیا۔

دکن سے مرہٹوں کی آمد

سندھیا اور ہولکر کی تباہی کی خبر جب دکن پہنچی

تو بھنوا (چچا زاد بھائی جو سدا شیو راؤ بھاؤ کے لقب سے مشہور تھا روہیلوں کے مقابلہ کے لئے
دربار دکن سے مامور ہوا بسواس راؤ اور کار گزار دہ برہمن اور دوسرے مرہٹہ سردار اسکے
ساتھ ہوئے بہت سے راجپوتوں کے گروہ راستہ میں اسکے ساتھ ہوتے گئے سورج مل جاٹ
بھی بیس ہزار سوار کے ساتھ اسکے پاس پہنچ گیا غازی الدین خان بھی سورج مل جاٹ کے ساتھ متھرا
میں بھاؤ سے ملے اب بھاؤ تین لاکھ فوج کے ساتھ دہلی پہنچا وہاں فوج تھوڑی سی تھی معمولی جھڑپ
کے بعد بھاؤ نے قلعہ پر قبضہ کرلیا اور روضہ شاہ مردان کے سونے چاندی کے برتن مقبرہ نظام
الدین اولیا اور محمد شاہ کے مقبرہ کے طلائی اگر سوز اور محفل کی آرائش کے سامان لوٹ لیئے
دیوان خاص کی منبت کار چاندی کی چھت اکھڑوا کے سکہ ڈھلوائے تجویز یہ تھی کہ بسواس راؤ کو ہندوستان
کا بادشاہ بنایا جائے مگر لوگوں کے سمجھانے سے احمد شاہ درانی کے واپس جانے تک اسکو ملتوی
رکھا گیا۔ بھاؤ نے محی السنۃ کو تخت سے اتار کے مرزا جوان بخت پسر شاہ عالم ابن عالمگیر ثانی
کو تخت پر بیٹھایا اور وزارت کا عہدہ غائبانہ شجاع الدولہ کو دیا اس میں چال یہ تھی کہ احمد شاہ
درانی یہ خبر سن کے شجاع الدولہ سے بدگماں ہوجائینگے اور مسلمانوں کا اتحاد انتشار کا شکار ہوجائیگا
بھاؤ نے شجاع الدولہ کو ایک خط بھی لکھا کہ ہم اور آپ ایک کشتی کے بادبان ہیں اور بادشاہ ہندوستان
کے خیر خواہ ہیں پٹھان تمام ہندوستان کی جان و مال کے دشمن ہیں وہ دوسرے مسلمانوں کو ہندؤں
سے بھی بدتر سمجھتے ہیں امرائے ہندوستان میں جن کو ان لوگوں سے دلی نفرت ہے وہ آپ میں باقی
سب آپس میں متفق ہیں احمد خان بنگش کی امارت بادشاہ کی طرف سے ہے مگر وہ ہمقومی کی وجہ
سے پٹھانوں کے ساتھ ہوجائیں گے اگر شاہ افغانستان ہم پر غالب آگئے تو افغانستان کے
ہزاروں امیروں میں آپکی آواز کون سنے گا۔ بادشاہ ہندوستان پھر کیا کرسکیں گے اور کہاں جاکے
بیٹھیں گے ہمارا مطلب پٹھانوں کا استیصال ہے جنکا دماغ احمد شاہ کی وجہ سے آسمان پر
پہنچ گیا ہے۔ ہم امیر تیمور صاحبقران کے مکان کو آباد کرنا چاہتے ہیں ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ

کہ اپنے گھر واپس چلے جائیں ۔ سورج مل نے بھاؤ سے کہا کہ میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے ملک واپس جائے آپ کے لئے رسد بھیجوا تا رہوں اس نے ان کو رخصت کر دیا جب سورجمل چلے گئے تو شجاع الدولہ نے احمد شاہ سے انکو خلعت بھجوایا بھاؤ کو جب اسکی خبر ملی تو انہوں نے بھی سورجمل کو خلعت بھیج کر کہلوایا کہ ہم آپ ایک ہو کے احمد شاہ سے مل جانا جو ہم دونوں کے مذہب کے خلاف ہے ۔ مناسب نہیں اب تم یہ کرو کہ راستوں کی نگرانی اسطرح کرو کہ احمد شاہ کو رسد نہ مل سکے مگر سورج مل نے نہ مسلمانوں کی رسد روکی نہ مرہٹوں کو رسد بھیجی وہ خاموش اپنے گھر بیٹھ رہے ۔

احمد شاہ بارش کی وجہ سے انوپ شہر میں پڑاؤ ڈالے پڑے تھے مگر ابھی برسات باقی تھی کہ انہوں نے چھاؤنی توڑی اور انوپ شہر سے دہلی کی طرف کوچ کیا راستہ میں سنا کہ بھاؤ نبرد آزما سپاہیوں کی فوج لے کے جمنا کے ساحل پر گنج پورہ کی طرف روانہ ہوا ہے ۔ وہ دو منزلہ سہ منزلہ کرتے ہوئے گنج پورہ کے مقابل پہنچے وہاں معلوم ہوا کہ مرہٹوں نے گنج پورہ پر قبضہ کر لیا اور قلعہ بند درانیوں اور روہیلوں کو ختم کر دیا احمد شاہ اس خبر سے بھڑک اٹھے وہ ۲۵ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو دہلی شمال مغرب کی طرف ۱۴ کوس کے فاصلہ پر باغپت پہنچ گئے

پانی پت کی جنگ اور شجاع الدولہ

اور وہاں تو نجانہ شاہلی کے پانی پت میں مورچہ قائم کیا اسوقت احمد شاہ کی فوج کی تعداد ترسٹھ ہزار تھی پندرہ ہزار فوج نجیب الدولہ کے پاس تھی ۔ آٹھ ہزار شجاع الدولہ کی فوج تھی چھ ہزار احمد خان بنگش کی فوج تھی فیض اللہ خان حافظ رحمت خان اور دوندے خان کے ساتھ بھی آٹھ آٹھ دس دس ہزار فوج تھی جو سب مل کے ایک لاکھ کے قریب پہنچتی ہے مرہٹوں کی فوج تین لاکھ تھی ۔

۲۸ ربیع الاول ۱۱۷۴ھ کو احمد شاہ نے مرہٹوں پر حملہ کیا مرہٹے بھی نکلے اور

لڑائی شروع ہوگئی یہ ظہر کا وقت تھا شام ہونے پر لڑائی ختم ہوگئی۔ صبح کو احمد شاہ نے جہان شاہ کو چھ ہزار سوار دے کر جہاد کا حکم دیا کہ مرہٹوں کو گرفتار کرلائے اور شاہ پسند خان کو چھ ہزار سوار دیکے حکم دیا کہ مرہٹوں کے اردگرد پندرہ کوس تک تمام گاؤں تباہ کردے کہ ان کو رسد نہ مل سکے۔

اور بہادر خان کو چھ ہزار سوار دیکے مرہٹوں کی خندق پر تعینات کر دیا کہ مرہٹے رسد کے لئے باہر نہ نکل سکیں۔ انہوں نے مرہٹوں کا نکلنا بند کر دیا احمد شاہ کو مخبروں نے خبر دی کہ گوبند پنڈت دس بارہ ہزار سواروں کے ساتھ بہت بڑا خزانہ اور رسد لے کر جمنا کے کنارے شاہ درے کے پاس دہلی پہنچا ہے اور گنج پورہ کے مقام دریا عبور کرکے بھاؤ کے لشکر میں داخل ہونا چاہتا ہے۔

احمد شاہ نے اپنے وزیر عطائی خان کو پانچ ہزار سوار دیکے حافظ رحمت خان نے عنایت خان کو حکم دیا کہ وہ اپنے پانچ سو سوار دے کے عطائی خان کی رہبری کے لئے روانہ ہو جائیں۔ یہ لوگ عصر کے وقت روانہ ہوئے اور راتوں رات چالیس کوس کی مسافت طے کر کے سورج نکلنے سے پہلے گوبند رائے پر اچانک حملہ کر دیا جس میں گوبند رائے مارا گیا اس کی رسد اور خزانہ پر قبضہ کر لیا۔

ادھر آس پاس کے گاؤں لٹنے سے مرہٹوں کی رسد بند ہوگئی انہوں نے طے کیا کہ بھوکوں مرنے سے لڑکے مرنا بہتر ہے اور ایسا زبردست حملہ کیا کہ ابدالی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے یہ دیکھ کے وہ خود میدان میں اور اپنے سپاہیوں کو پکارا کہ بے غیرتوں کہاں جا رہے ہو ولایت بہت دور ہے ان کی آواز پر سپاہی پلٹے اور جوابی حملہ کیا گرچہ شکست کے آثار ظاہر ہوتے تو شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ نے مرہٹوں کی کمرگاہ پر حملہ کردیا اب وہ دو مورچے نہ سنبھال سکے انکی فوج میں بھگدڑ مچ گئی مگر سردار سب بہادری سے لڑتے رہے اور سب قتل ہوگئے ان کے بچے کچھے سپاہی بھی بھاگ نکلے میدان خالی ہوگیا سات سو ہاتھی ۵۰۰۰۰ گھوڑے دو لاکھ بیل اور ۳۰۰ اونٹ میدان میں کھڑے تھے گولا بارود اور نقد و جنس

جنس بہت کچھ مسلمانوں کے ہاتھ لگا بائیس ہزار مرہٹے گرفتار ہوئے سب مال و متاع شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ نے آپس میں بانٹ لیا پانی پت سے دہلی تک مرہٹوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ بیس ہزار مرہٹے جاٹوں اور راجپوتوں کے ملک میں بھیک مانگتے پھرتے تھے جنکو سورج مل راجہ بھرتپور نے ایک ایک کمبل دو دو روپیہ دیئے تو وہ چپنے پھانکتے ہوئے اپنے گھروں کو پہنچے

وہ حکومت جسکی سرحد شمال میں ہمالیہ اور اٹک جنوب میں جزیرہ نمائے دکن میں سمندر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور آس پاس کی تمام حکومتیں اسکی باجگذار تھیں ایک دن میں تباہ ہو گئی۔ لوگوں کا بیان ہے کہ اس جنگ میں دو لاکھ مرہٹے مارے گئے۔ احمد شاہ ابدالی شاہ عالم کو بادشاہ اور شجاع الدولہ کو وزیر بنا کے اپنے وطن واپس چلے گئے۔ اور شجاع الدولہ مرہٹوں کا چھوڑا ہوا کروڑوں روپیہ کا سامان لیکے لکھنؤ آئے۔

شجاع الدولہ نے شاہ عالم کا خطبہ اور سکہ اپنے ملک میں جاری کیا اور تخت و چتر شاہی تیار کر کے بادشاہ کی خدمت میں عرضی لکھی کہ جہاں پناہ بنگال سے یہاں تشریف لے آئیں، بادشاہ آخر شوال ۱۱۷۵ھ کو گڑھ بندھو کی سے کوچ کر کے مکند پور علاقہ ریواں متعلقہ بندیل کھنڈ میں کچھ دن قیام کر کے الہ آباد پہنچے اور شجاع الدولہ کو طلب کر کے ۱۱۷۵ھ میں خلعت وزارت عطا کیا۔

۱۱۷۶ھ میں میر قاسم بنگال سے آئے اور شجاع الدولہ سے امداد طلب کی وہ خود بھی چاہتے تھے کہ مرہٹوں کی طرح انگریزوں کی قوت کا بھی خاتمہ

کردیا جائے، کیونکہ وہ اپنی طاقت بڑھا رہے تھے، بنگال، اڑیسہ اور بہار پر قابض ہو چکے
تھے، شجاع الدولہ میر قاسم کی مدد کو تیار ہو گئے اور شاہ عالم کو بھی ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔
دوسرے والیانِ ریاست بھی ساتھ ہو گئے۔ انگریز شجاع الدولہ سے مرعوب تھے۔ انھوں نے
پیشکش کی کہ پٹنہ ہم سے لے لیجیے اور جنگ نہ کیجیے۔ شیخ علی حزیں نے بھی ان کو انگریزوں سے لڑنے
سے منع کیا مگر وہ ان کے استیصال پر تلے ہوئے تھے ایک بہت بڑی فوج لیکے پٹنہ پہنچ گئے پہلے
ہی حملہ میں انگریز منتشر ہو کر قلعہ میں محصور ہو گئے۔ شجاع الدولہ نے ان کا محاصرہ کر لیا اور دو مہینے
تک محاصرہ کئے رہے اس کے بعد یہ غلطی کی کہ محاصرہ اٹھا لیا اور بکسر میں مورچے قائم کئے انگریزوں
کو موقع ملا محاصرہ سے نکل کے انھوں نے سازش کے جال بچھا دیئے۔ غلام حسین اور ان کے والد
ہدایت علی انگریزوں کے جاسوس شجاع الدولہ کے لشکر میں تھے اور ان کے معتمد بنے ہوئے تھے۔
انگریزوں نے انھیں کے ذریعہ سے شاہ عالم کو ملا لیا بلونت سنگھ راجہ بنارس کو بھی ہموار کر لیا
شجاع الدولہ کا دیوان راجہ بینی بہادر پہلے سے انگریزوں سے ملا ہوا تھا اور شجاع الدولہ کو
ان کی طاقت سے مرعوب کرتا اور صلح پر آمادہ کرتا رہتا تھا۔

بکسر کی جنگ: پندرہ دسمبر ۱۷۶۴ء کو انگریزی فوجیں مقابلہ کو روانہ ہوئیں شجاع الدولہ
نے اپنے ایک جنرل میر عطاء اللہ کو ان کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ انگریزی فوج نے ان پر
گولہ باری کرکے پیچھے ہٹا دیا۔ شجاع الدولہ نے موشیر لاک اور سمرو کو آٹھ انگریزی توپیں اور
تلنگوں کی آٹھ پلٹنیں دے کے انگریزوں کے مقابلہ پر بھیجا انھوں نے انگریزی فوج پر
ایسے گولے برسائے کہ ہلچل ڈال دی۔ ان کے قدم اکھڑنے ہی والے تھے کہ شجاع قلی خاں
جو پیچھے کی صف میں تھا اس نے خیال کیا کہ اس فتح میں ہمیں بھی شریک ہونا چاہیئے۔ وہ
پیچھے سے نکل کے سمرو اور موشیر لاک کی صف کے آگے آ گیا جس کی وجہ سے وہ شدید
گولہ باری بند ہو گئی۔ بینی بہادر عین موقع پر دس ہزار فوج لے کے فرار ہو گیا۔ میر قاسم نے

بھی لڑنے میں پہلو تہی کی شجاع الدولہ کے بلانے پر بھی نہیں آئے بلونت سنگھ نے اپنا مورچہ انگریزوں کے حوالے کردیا اب انگریزوں نے پوری قوت سے حملہ کیا ہوا ئے جنگ بگڑ گئی اور شجاع الدولہ جیتی ہوئی لڑائی ہار گئے ان کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ انگریزوں نے سارا سامان لوٹ لیا۔ بادشاہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے ان کے کیمپ میں چلے گئے۔ شجاع الدولہ نے بھی میدان چھوڑا اور اپنے معتمدوں کو حکم دیا کہ ہمارے متعلقین اور خزانہ کے محافظ رحمت خاں کے ملک میں جائیں اور بریلی میں ہمارا انتظار کریں خود الہ آباد ہوتے ہوئے فیض آباد آئے ضروری سامان اور ایک فوج لے کے لکھنؤ پہنچے وہاں ایک رات قیام کیا صبح کو بینی بہادر حاضر ہوا اس کو انگریزوں کا آدمی سمجھ کے اودھ کا صوبہ سپرد کردیا اس کی وجہ سے انگریز اودھ پر قبضہ نہ کریں گے اس نے صلح کا مشورہ دیا مگر انھوں نے نامنظور کیا وہ روہیلوں اور مرہٹوں کی مدد لے کے پھر انگریزوں کے کے مقابلہ پر آنا چاہتے تھے

شجاع الدولہ بریلی میں وہ لکھنؤ سے روانہ ہوکر بریلی آئے۔ حافظ رحمت خاں اور دوندے خان حسن پور میں تھے۔ حافظ کا لڑکا عنایت خان موجود تھا اس نے ان کا استقبال کرکے اپنا مہمان کیا شجاع الدولہ اپنے عیال کو سالار جنگ کے سپرد کرکے اپنی فوج کے ساتھ حسن پور پہنچے۔ حافظ رحمت خاں نے دو کوس آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور اپنی فرودگاہ پر لے گئے۔ پھر اپنی ریاست میں واپس آئے شجاع الدولہ نے نجیب الدولہ کو اپنی مدد کے لئے لکھا انھوں نے عذر کردیا۔ اس درمیان میں ایک روہیلہ اور شجاع الدولہ کے ایک سپاہی سے لڑائی ہوگئی۔ سپاہی نے روہیلے کو لکڑیوں سے بہت مارا۔ وہ روہیلوں کے پاس گیا تین ہزار روہیلے مسلح ہوکر شجاع الدولہ سے لڑنے کے لئے آگئے۔ دوندے خاں بھی ان کی حمایت کررہے تھے۔ نواب نے بھی اپنی فوج کو تیاری کا

حکم دیا حافظ رحمت خان کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے روہیلوں کو بہت ملامت کی
اور دونوں سپاہیوں کو بھی سرزنش کی اس طرح یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا مگر حافظ صاحب نے
نواب کو مشورہ دیا کہ آپ کا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ فرخ آباد احمد خاں بنگش کے پاس چلے جائیے
اور خود جا کر ان کو استقبال و مہمانداری پر آمادہ کیا اور وہ استقبال کر کے لائے۔

شجاع الدولہ فرخ آباد میں | شجاع الدولہ نے ان سے مدد چاہی انھوں نے
انکار کر دیا۔ نواب نے ملہار راؤ ہولکر کو اپنی مدد کے لئے لکھا انھوں نے چالیس ہزار روپیہ کوچ
اور بیس ہزار روپیہ مقام پر چالیس ہزار فوج کے ساتھ انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لئے آمادگی
ظاہر کی، نواب نے منظور کر لیا، ہولکر اپنی فوج لے کر آ گئے۔

کوڑہ جہاں آباد کی جنگ | کوڑہ جہاں آباد میں انگریزوں سے مقابلہ ہوا جس میں ہولکر اور
شجاع الدولہ دونوں کو شکست ہوئی شجاع الدولہ جمنا عبور کر کے کالپی کے قلعہ میں محصور ہو گئے پھر ان انگریزوں
نے اس کا محاصرہ کیا قلعہ مضبوط نہ تھا شجاع الدولہ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور فرخ آباد آ گئے۔ ان سے پہلے وہ لکھنؤ

اسوقت کی انگریزی پالیسی | انگریز بہار اڑیسہ اور بنگال پر قبضہ کر چکے تھے مگر ان تینوں صوبوں میں
انگریزی تاجروں نے تجارتی کوٹھیاں قائم کی تھیں اور محصول نہیں دیتے تھے۔ مقامی لوگ بھی سرکشی کرتے تھے
اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ اب ہندوستان کے مزید علاقے فتح نہ کئے جائیں۔ وہ چاہتے
تھے کہ بہار اڑیسہ اور بنگال میں جو بدامنی اور افراتفری پھیلی ہوئی ہے اس کو دور کر کے حکومت کو مستحکم کیا جائے
شجاع الدولہ کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ ہار مان کے چپکے بیٹھنے والے نہیں ہیں ایک طویل جنگ ان کے
پیش نظر تھی جس سے وہ بچنا چاہتے تھے اور صلح کے خواہشمند تھے۔ شجاع الدولہ بھی اپنی ناکامیابی سے مایوس ہو کر صلح چاہتے تھے

دو انگریز جنرلوں کی گرفتاری | اس درمیان میں شجاع الدولہ کے فوجی سردار میر باقر نے راستہ میں انگریزی
فوج کے دو جنرلوں کو گرفتار کر کے شجاع الدولہ کے سامنے پیش کیا انھیں انگریزوں کو نرم کرنا تھا ان فوجی
افسروں کو قید کرنے کے بجائے اپنا مہمان بنا لیا ایک خیمہ میں انکو ٹھہرایا اور بہت خاطر مدارات کی خود ان کے خیمہ میں
جاتے تھے اور تمام ضروریات مہیا کرتے تھے جس میں شراب بھی داخل تھی۔ ان سے کہدیا کہ ہم آپکو اجازت دیتے ہیں آپ جب

چاہیں اپنے لشکر میں چلے جائیں، انہوں نے دو تین دن کے بعد رخصت چاہی نواب نے انہیں آٹھ خاصے گھوڑے چار ہاتھی کشتی جواہر اور دو دو ہزار اشرفیاں، دیکر رخصت کر دیا، انہوں نے لشکر میں پہنچ کے نواب کے حسن اخلاق 'مہمانداری' اور سخاوت کی بہت تعریف کی تمام انگریزان سے خوش اور انکے شکرگذار ہوئے انکے سپہ سالار نے نواب سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا اس وقت انگریزی فوج ہمدری گھاٹ واقع دریائے گنگا پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ نواب بغیر کسی ترک و احتشام کے چند خواصوں کے ساتھ پالکی میں بیٹھ کے روانہ ہوئے دریا کے کنارے پہنچ کے کشتی میں سوار ہوئے انگریزی سپہ سالار کو اسطرح فوج دشمن میں نواب کے آنے پر تعجب ہوا اور اس نے سمجھا کہ وہ ہمارے حسن اخلاق کے بھروسہ پر اسطرح آرہے ہیں، جب نواب کی کشتی کنارے پہنچی تو سب انگریز اپنے خیموں سے نکل آئے اور نواب کا استقبال کیا سلامی کی توپیں سر ہوئیں سپہ سالار بہت اخلاق سے پیش آیا اور بہت خلوص آمیز باتیں کیں دوران گفتگو میں یہ بھی کہا کہ میر قاسم کی بدعہدی سے سرکار کمپنی کو اسکی سزا دہی مقصود تھی آپ اسکی مدد کیلئے مقابلہ پر آگئے، ہم آپ سے صلح کے خواہشمند تھے مگر بدقسمتی سے جنگ و جدل میں وقت ضائع ہوا آپنے ہمارے افسروں کو حالت جنگ میں اپنا مہمان رکھا اور ان پر شاہانہ عنایت کی اس سے تمام انگریز آپکے احسان مند ہیں اب آپ صلح منظور کرلیں، شجاع الدولہ یہ بات دل سے چاہتے تھے۔ فوراً آمادگی ظاہر کردی اور انگریزوں کے مہمان ہوگئے مصالحت کا آخری فیصلہ لارڈ کلائیو پر موقوف رہا، دو تین دن کے بعد نواب، جنرل کارنگ کے ساتھ کلائیو سے ملنے کو روانہ ہوئے بارہ

اگست کو دونوں میں ملاقات ہوئی۔ کلائیو نے انگریز جنرلوں پر نواب کی عنایتوں کا شکریہ ادا کیا، پھر مصالحت کی گفتگو شروع ہوئی اور بنائے مصالحت ان امور پر قرار پائی۔

۱۔ شجاع الدولہ اپنے ملک پر جو پہلے اُنکے قبضہ میں تھا فرمانروائی کرینگے، الہ آباد اور کوڑے کے اضلاع بادشاہ کی مدد معاش کیلئے مخصوص ہوں گے۔

۲۔ شجاع الدولہ پچاس لاکھ روپیہ تاوانِ جنگ اس تفصیل سے ادا کرینگے۔ بارہ لاکھ روپیہ اور آٹھ لاکھ کے جواہرات اسوقت پانچ لاکھ ایک مہینے کے بعد اور پچیس لاکھ باقساطِ مساوی تیرہ مہینے میں ادا کرینگے کلائیو نے یہ بھی کہا کہ نواب اپنے ملک میں انگریزوں کو کوٹھیاں ڈالنے اور تجارتی محصول معاف کرنے کی اجازت دیں، اس پر انہوں نے کہا کہ اس ملک کا امن وامان تباہ ہوجائیگا اور وہی فسادات کھڑے ہوجائینگے جو بنگال اُڑیسہ اور بہار میں ہوتے ہیں کلائیو کا دل بھی اس کے مزے چکھ رہا تھا اس نے بات صحیح سمجھ کے اسکو شرائط صلح سے خارج کردیا

۳۔ آپس میں ایک دوسرے کے دوست رہیں گے، اور دوست کے دشمن کو دشمن سمجھینگے اگر کسی کا اُس کے دشمن سے مقابلہ ہوگا تو دوسرا اسکی اعانت کرے گا۔

راجہ بلونت سنگھ جو بکسر میں انگریزوں سے مل گیا تھا اسکا قصور انگریزوں نے معاف کرادیا اور طے پایا کہ اسکی زمینداری بحال رہے گی اور نواب کو ہر سال مالگذاری بدستور سابق دیتا رہیگا۔ یہ عہدنامہ ۱۹ اگست

۱۷۶۵ء کو الہ آباد میں طرفین کی مہر اور دستخط سے مزین ہوا کلائیونے
انجیل اور نواب نے قرآن ہاتھ میں لیکے اس عہد نامہ پر خلوص دل سے
عمل کرنے کی قسم کھائی، اب نواب کا ملک ان پر بحال ہو گیا۔ اسکے
بعد انگریزوں نے وہ تمام خطوط جو نواب کے ملازموں نے، انکو لکھے تھے
نواب کو دیدیئے کہ وہ اپنے ملازموں کی غداری سے مطلع ہوجائیں
اس صلح نامہ کے چھ روز کے بعد وہ فیض آباد آئے۔ پہلے اپنے ملک
کا دورہ کرکے رعایا کو اپنی آمد سے متاثر کیا پھر فیض آباد کو اپنا
مستقر بنایا ملک پر قبضہ تو ہو گیا مگر فوراً کمپنی کو روپیہ کی ادائی
ممکن نہ ہوئی تو اپنے اعزہ سے روپیہ طلب کیا سب نے کچھ نہ کچھ دیا
ماں اور ماموں نے بڑی رقمیں دیں نوکروں نے بھی اپنی حیثیت
بھر دیا بیوی نے بہت سا روپیہ اپنے زیورات اور انکے نوکروں
نے اپنے زیورات ناک کی نتھ تک اتار کے دیدی، شجاع الدولہ کے
دل میں انکی بڑی جگہ پیدا ہو گئی اور جب تک زندہ رہے،
ضروری مصارف سے جو کچھ بچتا تھا وہ بیگم کو بھیج دیتے تھے۔

فیض آباد کی ترقی انگریزوں سے مصالحت کے بعد ۱۷۶۵ء
میں نواب نے فیض آباد کو اپنا مستقر بنایا برہان الملک کے وقت
کی شہر پناہ کی دیواروں کو از سر نو درست کیا، پختہ قلعہ بنوایا
اور اس میں عمدہ عمارتیں تعمیر کرائیں، مغلوں کے تمام مکانات
گروا دیئے اور اپنے خاص نوکروں کو بھی حکم دیا کہ وہ بھی قلعہ
کے باہر مکانات تعمیر کرائیں قلعہ سے ایک کوس کے فاصلہ پر

ایک وسیع میدان میں خندق کھودی گئی جس کے بیچ میں تمام متعلقین اور رسالہ داروں کو حویلیاں بنانے کا حکم ہوا. اس میں حکومت کے دفاتر قائم کیے بہت جلد یہ وسیع شہر تنگ ہو گیا تو باہر نکل کے لوگوں نے عمارتیں بنوائیں. نواب نے کئی گڑھیاں بھی بنوائیں. ان میں ایک آہنی بڑی تھی کہ اسکا طول و عرض ایک کوس کے قریب تھا اور دوسری گڑھیاں بیرونی احاطہ اور قلعہ کے درمیان تیار ہوئیں انکا طول آدھ کوس تھا اونچی دو گز اونچی دیواریں تھیں اور سات گز چوڑی تھیں. ایک ترپولیا, قلعہ کے چوک میں بنوایا. قلعہ کے جنوبی دروازے سے الہ آباد کے ناکے تک بہت بڑا بازار بنوایا شہر پناہ کی دیواریں گز چوڑی تھی جو اوپر جا کے پانچ گز ہو گئی تھی. یہ سب دیواریں مٹی کی تھیں اسوجہ سے برسات میں انپر چھپر ڈالدیئے جاتے تھے. اور گرمیوں میں آندھی اور آتش زنی کے خوف سے اتار دیئے جاتے تھے. ایک لاکھ چھپر ہر سال تیار ہوتے تھے دو رمنے بنوائے اسکے غربی جانب دونوں طرف پکی دیواریں تھیں اور دو طرف سے دریائے گھاگرا گھیرے ہوئے تھا. اسمیں ہر قسم کے جنگلی چوپائے چھوڑے گئے تھے. دوسرا احاطہ مشرق کی طرف بنوایا تھا جس کی مسافت تین کوس تھی اسمیں پندرہ گاؤں آگئے تھے مگر اس میں جانور چھوڑنے کی نوبت نہیں آئی تھی

شہر میں کئی دلکش باغ بنوائے انگوری باغ قلعہ کے اندر تھا موتی باغ چوک بازار میں بنوایا. لال باغ تمام باغوں سے بڑا تھا. اور نوجوانوں کی تفریح کا مرکز تھا. آصف باغ آصف الدولہ کے نام پر بنوایا, بلند باغ بھی بہت

دلکش تھا یہ سب شہر کے اندر تھے ان باغوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک ہزار مالی نوکر تھے۔

شہر کے عروج کا پانچواں سال تھا یعنی ۱۱۸۳ھ میں جب تاریخ فرح بخش کا مولف فیض آباد پہنچا اسکا بیان ہے کہ جب میں شہر کے مغربی دروازے سے چار میل پہلے ممتاز نگر پہنچا تو، وہاں ایک بازار لگا ہوا تھا۔ اور خرید و فروخت میں لوگ مشغول تھے انواع واقسام کے پکوان، مٹھائیاں، شربت، کباب پراٹھے بھنا ہوا گوشت، پانی کے بتاسے، فالودہ، نان خطائیاں وغیرہ بک رہی تھیں مسافر خریدنے کے لئے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ یہ ہنگامہ دیکھ کر میں نے خیال کیا کہ چوک بازار یہی ہے مگر کسی نے بتایا کہ ابھی تو میں شہر پناہ کے دروازے میں بھی داخل نہیں ہوا جب شہر میں پہنچا تو ہر طرف ناچنے گانے والے طائفے دیکھ کر دنگ رہ گیا صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک فوجوں کے ڈھول باجوں کی آوازیں برابر آتی رہتی تھیں گھڑیالوں کی صدا اور نوبت کی آوازوں سے کان بہرے ہوتے جاتے تھے، گھوڑے، ہاتھی اونٹ خچر، شکاری کتے بیل اور بیل گاڑیاں توپیں لے جاتے والی گاڑیاں شمار سے باہر تھیں شہر کی آبادی اور رونق پر نواب کی خاص توجہ تھی معلوم ہوتا تھا کہ فیض آباد بہت جلد دلّی کی ہمسری کریگا وہ سال کے صرف تین مہینے فیض آباد میں رہتے تھے۔ باقی مہینے وہ ملک کا دورہ اور شکار میں مشغول رہتے۔ ہر سال کے تین مہینے کے قیام نے فیض آباد

کو اس عروج پر پہنچا دیا تھا۔ ہندوستان کا کوئی حکمراں شجاع الدولہ کی طرح شان و شوکت سے نہیں رہتا تھا۔ شہر کی درستی اور خوبصورتی کی طرف خاص توجہ تھی سہ پہر کو روزانہ شہر کے معائنہ کو نکلتے تھے۔ سواری کے پیچھے بیلدار پھاوڑے لئے ساتھ ہوتے تھے جس جگہ اونچا نیچا یا کسی کا چبوترہ دوکان سے بڑھا ہوا یا ٹیڑھا دیکھا اس کو فوراً درست کرا دیا۔

آدمیوں کی کثرت سے شہر میں نکلنا دشوار تھا کندھے سے کندھا چھلتا تھا خاص کر چوک میں بڑی بھیڑ رہتی تھی مال و اسباب دوکانوں میں کثرت سے موجود رہتا تھا ہر ملک کے تاجر اپنے ملک کا بہترین مال لئے موجود رہتے تھے۔ علماء، شعراء، اطباء اور سپاہی پیشہ ور افراد دور دور سے آکے آباد ہو گئے تھے۔ نظام الملک نواب ضابطہ خان ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے وکیل و سفیر اپنے عملہ کے ساتھ شہر میں مقیم تھے۔

ان کو ارباب نشاط سے بہت دلچسپی تھی اس کی شہرت دور دور پہنچی، کشمیر، کلکتہ اور اطراف ہندوستان سے اتنی حسین و جمیل طوائفیں آئیں کہ ان سے فیض آباد کی گلیاں بھر گئیں۔ کسی عورت کو شہر سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی اس حکم میں طوائفوں پر پابندی مقصود تھی وہ اپنے کو قید اور باہر جانے کی ضرورت نہ سمجھتیں۔ اس کے لئے ان پر طرح طرح کی نوازشیں ہوئیں اور بغیر کسی خدمت کے ہر موقع پر انعام و اکرام کا دستور قائم کیا کہ وہ خوش اور مطمئن رہیں ان کے بعد کے فرمانرواؤں کا بھی یہی دستور رہا وہ طوائفوں کو شہر کی رونق سمجھتے تھے۔

فوجی تیاری اس کے ساتھ انھوں نے فوج کو بھی ترقی دی۔ نئی فوج بھرتی کی اور اس کو انگریزی طریقہ پر تربیت دی اسی ہزار سرخ وردی والے اور چالیس ہزار سیاہ وردی والے تھے جنکے افسر مرتضیٰ خان بڑیچ، اسد خان ملکسی، یوسف خان قندھاری امراؤ گر، ہمت بہادر، شیخ احسان بیگ گرجی گوپال راؤ مرہٹہ، رفیع اللہ، جمیل اللہ خان داماد میر حملہ و بتہ بیگ خان اور دوسرے رسالدار تھے جنکے ساتھ ڈیڑھ ہزار سوار تھے۔ توپوں اور بندوقوں کے ڈھالنے کے کارخانے قائم کیے جس میں ایسی ایسی بندوقیں تیار ہوئیں جو بلا توڑے کے فائر کرنے

انگریزی بندوقوں پر سبقت لے گئیں چار سو توپیں ڈھالی گئیں ۔ دو سو فرانسیسی اس کام پر متعین تھے جو فوجوں کو تربیت بھی دیتے تھے ۔

بائیس سو ہرکارے تھے جو آٹھویں دن پونا اور پندرھویں دن کابل سے خبر لاتے تھے تین ہزار گھوڑے فوجیوں کے گھوڑوں کے علاوہ تھے ۔ پانچ سو ہاتھی ایک سو چونسٹھ اونٹ پانچ سو ملاح تھے اس فوجی طاقت کو دیکھ کے کمپنی کے کمانڈر انچیف BARKER نے کمپنی کو ۱۷۶۸ء کو لکھا

شجاع الدولہ نے جو فوجی ترقی کی ہے وہ تصور سے بالاتر ہے اس وقت ان کے پاس ستر پلٹنیں یورپ کے ہتھیاروں سے لیس ہیں ۔ تیس ہزار تربیت یافتہ سوار ہیں ۔ گھوڑوں کی خریداری کے لئے تین لاکھ روپے گجرات بھیجے ہیں اور احمد شاہ ابدالی کے ایک سردار محمد خاں کو ملازمت کی دعوت دی ہے بلوچ کو پانچ ہزار بلوچی بھرتی کرنے کو کہا ہے ۔ ایک سکھ سردار کو پانچ ہزار سپاہی لانے کو کہا ہے ۔ کمپنی نے شجاع الدولہ کو مجبور کیا کہ پہلے معاہدہ کی وضاحت کے لئے اور باتیں بڑھائی جائیں اور ایک نیا معاہدہ نومبر سنہ جس میں ان کی فوج کی تعداد پینتیس ہزار معین کی گئی ۔ مگر انھوں نے اس کی پابندی بس نئی فوج بھرتی کرنا بند کردی ۔ چار سال بعد انھوں نے وارن ہسٹنگز سے مل کے اس معاہدہ کو منسوخ کرا دیا اور نئی فوج بھرتی کرنا شروع کردی ۔

آصف الدولہ کی شادی ۱۱۸۳ھ میں اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کی پوتی شمس النساء بیگم سے شادی کی ۔ منشی انعام علی کا بیان ہے کہ قلعہ فیض آباد فرش گلگوں سے آراستہ تھا دریائے گھاگھرا سے شمال کی طرف ایک میل اور مشرق کی طرف چار میل ایک چمن بنا ہوا تھا ہر خیمہ عطر کی خوشبو سے مہک رہا تھا ۔ امرا نامدارا و راعیان حکومت رسالہ دار جماعدار خیموں میں بیٹھے تھے تین کوس تک آتشبازی چھوٹ رہی تھی ۔ ہزاروں پری پیکر نغمہ و سرود کر رہی تھیں

کو وہ بازار منزل عشق بنے ہوئے تھے۔ شاہ کے سامنے ہزاروں ماہ وش سر سے پاؤں تک آراستہ صدائے ناز اور ادائے دلربائی دکھا رہی تھیں۔ دولہا پر ہر دم بہ دم درہم و دینار نثار کئے جا رہے تھے۔ دس دن تک شادی کا جشن رہا۔ ہر بندۂ خاکسار دعاگو تھا۔

روہیلکھنڈ پر حملہ | پانی پت کی جنگ کے بعد مرہٹوں نے اپنے کو دوبارہ متحد کرکے روہیلوں پر حملہ کیا۔ حافظ رحمت خاں نے شجاع الدولہ کو مدد کے لئے لکھا چالیس لاکھ روپیہ معاوضہ طے ہوا شجاع الدولہ اپنی فوج لے کر پہنچے مرہٹے بھاگ گئے اور شجاع الدولہ روپیہ لئے بغیر واپس آگئے اسکے بعد انھوں نے حافظ رحمت خاں کو لکھا کہ انگریزوں نے نے بڑی طاقت پیدا کر لی ہے اگر آپ ہمارا ساتھ دیں تو ہم ان کا استیصال کر دیں حافظ نے انکار کر دیا۔ بکسر کی جنگ ہار کے جب شجاع الدولہ حافظ رحمت خاں کے پاس گئے اور ان سے مدد چاہی تو وہ راضی نہ ہوئے۔ شجاع الدولہ انگریزوں سے صلح کر کے اپنے ملک پر دوبارہ قابض ہوگئے۔ حافظ رحمت خاں نے شجاع الدولہ اور انگریزوں سے دوستی بڑھتی ہوئی دیکھی تو وہ خط جو شجاع الدولہ نے بکسر کی جنگ سے پہلے ان کو لکھا تھا اسکی تاریخ بدل کے حافظ نے انگریزوں کے پاس بھیج دیا انھوں نے شجاع الدولہ کو وہ خط بھیجا اور لکھا کہ جس معاہدہ پر قرآن انجیل پر ہاتھ رکھ کر دوستی کا پیمان ہوا تھا آپ نے اسکے خلاف کیا۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ یہ خط بکسر کی جنگ سے پہلے کا ہے اسکی تاریخ بدلی ہوئی ہے اس سے انگریز مطمئن ہوگئے مگر حافظ کی اس حرکت پر ان کو بڑا طیش آیا اور ان سے چالیس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا جو مرہٹوں کو نکالنے کے لئے طے ہوا۔ حافظ صاحب نے روہیلوں کو جمع کر کے کہا کہ شجاع الدولہ

ہم جھگڑنے پر آمادہ ہیں بہتر ہے کہ چالیس لاکھ روپیہ انکو دیدیا جائے سب نے انکار کیا اور لڑائی پر آمادگی ظاہر کی حافظ صاحب نے کہا کہ تمہارا تو کچھ نہ ہوگا میری جان جائیگی۔ آخر روپیہ دینے سے انکار کر دیا شجاع الدولہ نے انگریزوں سے دو پلٹنیں مانگیں اور خود اپنی فوج لیکے روہیلکھنڈ پر حملہ کر دیا، ۱۱صفر ۱۱۸۹ھ کو مقابلہ ہوا دو گھنٹہ کی لڑائی میں حافظ رحمت خان مارے گئے اور روہیلکھنڈ پر شجاع الدولہ کا قبضہ ہوگیا۔ وہ اپنے بیٹے سعادت علی خاں کو وہاں کا گورنر بنا کے۔ فیض آباد واپس آئے:۔ بندیل کھنڈ پہلے سے شجاع الدولہ کے پاس تھا ۱۷۷۳ء میں ایک نئے معاہدہ کی رو سے، انہوں نے چالیس لاکھ روپیہ میں الٰہ آباد اور کوڑہ کے اضلاع کا قبضہ لے لیا، اٹاوہ فتح کیا، پٹنہ سے ہاپڑ تک حکومت بڑھائی جہاں سے دہلی تین منزل پر تھی کل رقبہ چودہ کروڑ بیگہ پختہ تھا۔ مگر اس توسیع پر وہ مطمئن نہ تھے کہتے تھے کہ فوج کے اخراجات کو کافی ہے وہ زندہ رہتے تو پنجاب کو فتح کر کے ہندوستان کے سب سے بڑے طاقتور حکمراں بن جاتے مگر موت نے انکو مہلت نہ دی ۱۷۷۵ء میں اپنے خاندانی مرض نمہ باد میں مبتلا ہو کر جمعرات کے دن ۴۴ سال کی عمر میں انتقال کیا، شہر میں کہرام مچ گیا تین دن تک کسی گھر سے دھواں نہیں اٹھا، فرمانروایانِ اودھ میں کسی کے مرنے کا اتنا غم رعایا نے نہیں منایا۔

ڈاکٹر صفدر حسین نے لکھا ہے کہ دو سو کنیزیں اور سات سو محل تھے۔

نجم الغنی نے انکی تعداد دو ہزار لکھی ہے۔ دونوں نے بے حد مبالغہ کیا ہے، اگر دو ہزار بیویاں تھیں تو کم سے کم چار ہزار اولادیں بھی ہونا چاہیئے تھیں، بات یہ ہے کہ دس بارہ سے زیادہ بیویاں نہ تھیں۔ ارباب نشاط سے وہ دل، بہلاتے تھے۔ مگر انکو مستقل بیویاں نہیں کہا جا سکتا۔

شجاع الدولہ کے ذاتی اوصاف

ڈاکٹر صفدر حسین صاحب لکھتے ہیں

شکل و شمائل | شجاع الدولہ دراز قامت شکیل اور توانا انسان تھے بقول الگزنڈو ان کی آنکھیں چمکدار اور تیز تھیں جن سے ذہانت ٹپکتی تھی اور دماغ کی آنچ کا پتہ دیتی تھیں۔ آواز دلکش اور طرز گفتگو پسندیدہ تھا۔

تعلیم | اعلی پیمانہ پر تعلیم ہوئی تھی فارسی پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ عربی کی استعداد بھی اچھی تھی۔ مرہٹی اور ہندی بھی جانتے تھے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتے تھے۔ فارسی صاف رواں اور پر مغز لکھتے تھے۔ ریاضی کا اتنا ملکہ تھا کہ ملک کا سارا حساب خود کرتے تھے۔

اخلاق | ان کے حسن اخلاق کی جارج فوسٹر نے بہت تعریف کی ہے۔

مزاج کی نرمی | صاحب عماد السعادۃ کا بیان ہے کہ جو شخص ان سے ملنے جاتا تھا وہ یہ اثر لے کے اٹھتا تھا کہ نواب وزیر اس کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آئے۔

تمکنت | اسمتھ نے کمپنی کو ایک خط میں لکھا ہے کہ شجاع الدولہ بہت مغرور انسان ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ چھوٹوں سے شفقت اور سیاسی حریفوں سے تمکنت سے پیش آتے تھے۔

ڈاکٹر سری واستوا کا خیال ہے کہ ان کی تمکنت نے انھیں تباہی سے بچالیا ورنہ میر جعفر میرزا نے اور شاہ عالم کا سا حشر ان کا بھی ہوتا۔

سیاست انگریزوں سے معاملہ کرنے میں وہ انکو دبا لیتے تھے۔ اس سے کمپنی کے نمائندے ان سے دب جاتے تھے اور وہ حسب منشاء اپنے معاملات طے کرلیتے تھے۔ انھوں نے گورنر جنرل سے جو خط وکتابت کی ہے اسکی ضخیم جلدیں شاہد ہیں کہ وہ جہاندیدہ اور تجربہ کار سیاست داں تھے۔

وہ زندگی بھر اپنے مقاصد کی تکمیل میں سرگرم رہے۔ ہر صورت میں انھوں نے اپنے لئے بہترین راستہ نکال لیا۔ ان کی آرزو تھی کہ ان کی برائے نام وزارت عملی شکل اختیار کرے اور وہ اپنے کھوئے ہوئے مقبوضات واپس لے لیں اور آس پاس کے علاقے فتح کرکے ایک وسیع اور مضبوط حکومت قائم کرلیں۔ ایک کامیاب ہیرو کی طرح انھوں نے اسکی تکمیل اپنی زندگی ہی میں کرلی۔

حسن پرستی ان کے مزاج کی نرمی ان کی حسن پرستی کی وجہ سے تھی۔ عشق پیشہ انسان زیادہ با اخلاق اور نرم مزاج ہوتا ہے۔ بہو بیگم کے علاوہ سات سو محل تھے۔ ان کی حسن پرستی نے فیض آباد کو ارباب نشاط سے بھر دیا تھا۔ جب وہ کسی مہم پر جاتے تھے اس وقت بھی ارباب نشاط کا جم غفیر ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ صاحب عماد السعادۃ لکھتے ہیں کہ جب وہ روہیلکھنڈ فتح کرکے واپس آئے تو اپنے افسروں کے ساتھ طوائفوں کو بھی ہزاروں روپیہ انعام دیا ہربرٹ نے لکھا ہے کہ ایک بار انھوں نے مینا بازار میں ایک حسین طوائف سے متاثر ہو کے اس سے پوچھا کہ تم گھوڑے پر سوار ہو سکتی ہو؟ اس نے کہا بشرطیکہ وہ گھوڑا مجھے دیدیں شرط منظور ہوئی اس نے

سواری کا مظاہرہ کر کے گھوڑا حاصل کر لیا۔

غرض ارباب نشاط فیض آباد کی زندگی پر اس طرح چھا گئے تھے کہ ایک دفعہ منیر الدولہ کی دعوت کے جشن میں پانچ ہزار ارباب نشاط جمع تھے۔

کھیل تماشے | صرف ارباب نشاط پر منحصر نہ تھا بلکہ کوئی ایسا کھیل تماشا نہ تھا جس کا شوق نواب وزیر کو نہ ہو اور موسیقی میں تو نظریاتی درک رکھتے تھے پتنگ بازی کبوتر بازی کا بھی شوق تھا۔ چڑیا گھر میں ہزاروں کبوتر تھے۔

جانوروں کی لڑائی | جانوروں کی لڑائی کا بھی شوق تھا۔ ۱۷۶۳ء میں انھوں نے منیر الدولہ کو ہاتھیوں کی لڑائی دکھائی۔

سپہ گری | فنون سپہ گری میں کمال حاصل تھا۔ ایک دفعہ قزلباش سپاہی کا بھیس بدل کے مرہٹوں کے لشکر میں چلے گئے اور کہا کہ سپاہی ہوں نوکری چاہتا ہوں پوچھا گیا کونسا ہتھیار اچھا چلانا جانتے ہو کہا نیزہ چار مرہٹے نیزے لے کے مقابل میں آئے انھوں نے چاروں کو مار کے بھگا دیا۔

پہلوانی | ہرچرن داس نے لکھا ہے کہ شجاع الدولہ اپنے وقت کے بہترین پہلوان تھے اور کشتی خوب لڑتے تھے۔

قوت و طاقت | ان میں اتنی طاقت تھی کہ گوسفند کا کلہ چیر ڈالتے تھے ایک وار میں بھینسے کا سر اڑا دیتے تھے اور روپیہ کے حروف چٹکی سے مٹا دیتے تھے۔

پیراکی | پیراک ایسے تھے کہ بھری برسات میں جب گھاگھرا چڑھا ہوتا تھا تو وہ پیر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر پہنچ جاتے تھے۔

شکار ان کا نشانہ بہت اچھا تھا ان کا تیر شیر کی بینانی کو توڑ کے دم کے راستے سے نکل جاتا تھا۔ شکار میں تلوار نیزہ اور بندوق سب ہی سے کام لیتے تھے۔

فیض بخش کا بیان ہے کہ وہ صرف برسات میں فیض آباد میں رہتے تھے باقی دنوں میں ملک کے دورے اور شکار میں مشغول رہتے تھے۔ گلزار بخاعی میں ان کے بعض شکاروں کی تفصیل ہے۔

مارچ ۱۷۶۹ء میں سردی کے زمانہ میں شکار کو گئے تین جنگلی ہاتھی زنجیروں میں جکڑ کے پکڑ لائے۔

فروری ۱۷۷۰ء میں چودہ شیر مارے ایک گولی کھا کے دریا کے اس پار بھاگ گیا۔ نواب نے اس کا پیچھا کیا اور تلوار سے مار لیا۔

ایک دفعہ ان کا سفید ہاتھی مشتعل ہو کے زنجیر توڑ کے بھاگ گیا انھوں نے اس کا پیچھا کیا اور رام کر کے لے آئے۔

مرنے سے کچھ سال پہلے وہ شیر کے شکار کو گئے۔ ایک شیر پر حملہ کیا وہ غضبناک ہو کر نواب کے ہاتھی پر جھپٹا ہاتھی اس کی ہیبت سے ڈر کر دریا کی طرف بھاگا۔ مہاوت نے بہت آنکس مارے مگر وہ بھاگتا چلا گیا اور دریا کے کنارے جا پہنچا۔ دریا چڑھا ہوا تھا کگارے پر اس کا پاؤں پھسلا اور وہ پانی میں جا پڑا۔ موجوں کے تھپیڑوں میں شجاع الدولہ ایک بھنور میں پھنس گئے اس اضطراب میں ہاتھ پاؤں مار کے زرہ اور جامہ کے پرزے کر کے تیرنے لگے اس وقت ایک مگر نے ان پر حملہ کر دیا انھوں نے اس کا کلہ چیر ڈالا

اور کھینچے ہوئے دریا سے نکل آئے۔ ان کی فوج کنارے کنارے ان کو ڈھونڈھ بھی رہی تھی ان کو صحیح وسالم دیکھ کے سب خوش ہو گئے۔ نواب نے اس بلا سے نجات پانے کے شکریہ میں کئی لاکھ روپے خیرات کیے۔

مذہب | ڈاکٹر صفدر حسین نے لکھا ہے کہ شجاع الدولہ مذہب اثنا عشری کے پابند تھے اور اس کے رسوم و فرائض بڑے خلوص سے ادا کرتے تھے۔ پانی پت کی جنگ سے کچھ پہلے جب وہ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ انوپ شہر میں خیمہ زن تھے تو محرم آگیا۔ انھوں نے پورے رسوم عزاداری ادا کئے اسی طرح جب شاہ عالم الہ آباد سے دہلی کو روانہ ہوئے اور نواب کو طلب کیا تو محرم شروع ہونے والا تھا نواب تمام سامان عزا جس میں تعزیے اور علم تھے ساتھ لے کے روانہ ہو گئے وہ اور ان کی فوج دن کو سیاہ اور سبز کپڑے پہن کے چلتی تھی اور شب کو مجلس عزا منعقد کرتے تھے۔ جب وہ اٹاوہ فتح کرکے پلٹے تو راستہ میں محرم آگیا وہ شیعوں کے قصبہ جلالی ضلع علی گڈھ میں ٹھہر گئے اور کپڑے کا امام باڑہ بنا کے عشرہ محرم کیا۔

ذمہ داری کا احساس | ان سب مشغولیتوں کے ساتھ انھیں اپنی ذمہ داریوں کا بھی پورا احساس تھا وہ ملکی انتظام اور فوجی ترقی سے غافل نہ تھے وقت کے نقائصوں کو محسوس کرتے اپنی فوج میں نمایاں اصلاحیں کی تھیں۔ کئی چھاؤنیاں قائم کیں اور آلات حرب بنانے کی کئی فیکٹریاں یورپ کے جدید طرز پر بنوائی تھیں۔

سفارت خانے | مختلف ملکوں اور ریاستوں میں سفارت خانے قائم کئے

اکثر انگریزوں نے ان کے فوجی نظام اور ملکی نظام کی بہت تعریف کی ہے۔

گورنر ولسٹ نے لکھا ہے کہ وہ ہر چیز کا منصوبہ خود بناتے تھے اور خود بس امر کے متعلق احکام جاری کرتے تھے اور خود ہی اسکی نگرانی کر کے تکمیل تک پہنچاتے تھے۔ انھوں نے ۱۷۷۳ء میں جو معاہدہ کیا تھا اس میں بھی تنہا انھوں نے گفتگو کی تھی کوئی مددگار نہ تھا

اقتصادی پالیسی ان کی اقتصادی پالیسی یہ تھی کہ ان کے ملک کی تجارت وصنعت بنگال کے غیر ملکی تاجروں سے شکست نہ کھا سکے غیر ملکی سامان بغیر محصول کے اودھ میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔ نہ سونا چاندی جواہرات اور قیمتی سامان باہر جا سکتا تھا۔

زراعت کی ترقی زراعت کی وسعت اور پیداوار کی فراوانی پر بھی خاص توجہ تھی جس کی وجہ سے اودھ میں ضروریات زندگی کا سامان انگریزی مقبوضات کے مقابلہ میں بہت سستا اور افراط سے ملتا تھا۔

عمارت کا شوق شجاع الدولہ کو عمارت کا بہت شوق تھا انھوں نے پانڈیچری سے ایک فرانسیسی انجینیر بلایا تھا جس نے ایک خوبصورت محل کا نقشہ پیش کیا اسکی تعمیر شروع ہونے والی تھی کہ ان کو مرہٹوں کے مقابلہ پر جانا پڑا اس وجہ سے وہ منصوبہ معطل ہو گیا۔ اسکے کچھ دنوں بعد انھوں نے بنگال گورنمنٹ کی معرفت سوئزر لینڈ سے ایک انجینیر میجر پولس کو بلوایا جس کی نگرانی میں برہان الملک کے قلعہ کی دیواریں دوبارہ تعمیر کرائیں۔ ایک محل اور دو مٹی کے قلعہ بنوائے اور تمام عمارتوں کو رنگین نقش و نگار سے آراستہ کرایا۔

باغوں کا بھی ان کو بہت شوق تھا جس کی تفصیل پچھلے اوراق میں گزر چکی ہے

ملکی انتظام | راجا بینی نرائن کا سکی غداری پر انداھا کرنے کے بعد انھوں نے اپنا کوئی نائب نہیں مقرر کیا۔ تیسرے پہر کو پیش قبض لیکے بیٹھتے تھے اور سارا حساب کتاب خود کر ڈالتے تھے - ایک بڑا کمرہ تھا جس میں ہر نظامت سے ہفتہ وار جو مالیہ آتا تھا اس کے توڑے رکھے جاتے تھے۔

مصارف ملکی سے جو کچھ بچتا تھا وہ بہو بیگم کو بھیجدیا جاتا تھا کوئی خزانہ نہیں بنایا تھا ۱؎

۱؎ بہو بیگم نے خزانہ جمع کیا تھا اس کا نام جو نرا بھونرا رکھا تھا۔ شجاع الدولہ کے بعد انھوں نے اس خزانہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس روپیہ جمع کرایا جسکے سود سے اپنے متعلقین وملازمین کی پشت در پشت تنخواہیں مقرر کرائیں - امام جمعہ وجماعت کی تنخواہ مقرر کی اور ایک عربی کا مدرسہ قائم کیا جس کا نام وثیقہ اسکول ہے یہ سب آج بھی فیض آباد میں موجود ہے - اپنے مقبرہ کے لئے دس لاکھ روپیہ دیا جس سے ایک عالیشان مقبرہ لکھنؤ میں تعمیر ہوا جس میں قرآن خوانوں کے لئے بہت سے مکانات بھی ہیں جو مقبرہ جناب عالیہ کے نام سے مشہور ہے لکھنؤ میں اس سے زیادہ شاندار کوئی مقبرہ نہیں۔ ان کے مرنے کے بعد بچھتر لاکھ روپیہ اور ایک سکہ رکابی برآمد ہوا۔ بہت سا روپیہ روشن لال ناظم نے خورد برد کر لیا۔

عدل وانصاف | شجاع الدولہ عدل وانصاف میں ذرا بھی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ ایک مغل سپاہی کے گھوڑے سے ایک ستر سالہ بوڑھی عورت کچل کے مر گئی اس کا بیٹا اس کی لاش چارپائی پر اٹھا کے نواب کے پاس لا رہا تھا وہ ہوا خوری کو جا رہے تھے۔ دور سے چارپائی پر نظر پڑی۔ پوچھا یہ کیا ہے لوگوں نے واقعہ بتایا حکم ہوا ہماری سواری کے ساتھ آئے اور وہ جگہ دکھائے وہاں پہنچ کے ہاتھی روک دیا حکم ہوا جاسوس جائیں اور اس مغل سپاہی کا پتہ لگا کے گرفتار کرائیں اور خود وہیں رکے رہے جب سپاہی اس کو گرفتار کرنے پہنچے تو اس کے ساتھی مسلح ہو کر کہنے لگے جب تک ہماری جان میں جان باقی ہے مغل نہیں جائے گا۔ نواب صاحب نے ایسی بے انصافی پر کمر باندھ لی ہے کہ ستر سال کی بوڑھی عورت کے عوض نوجوان مغل مارا جائے۔ ہر شخص اپنی قوم کا پاس کرتا ہے مگر نواب کو اپنی قوم کا کچھ پاس نہیں۔ سپاہیوں نے صورتحال عرض کی آتش قہر وغضب بھڑک اٹھی فرمایا میں امیر المومنین کا پیرو ہوں جب تک اس مجرم کو یہاں نہ لائیں گے اس وقت تک نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا۔ چاہے ایک سال گزر جائے۔ آخر مغل گرفتار کرکے لایا گیا اور اس کو قتل کا حکم ہوا۔

ملاح خاں ایک پٹھان بڑا بہادر تھا نواب اس کو بہت دوست رکھتے تھے۔ ایک دن اس نے ایک آدمی کو مار ڈالا اور نواب کے چوبدار پر جھپٹا۔ نواب نے ایک دن کا وقفہ دیکے حبشیوں کو حکم دیا انھوں نے گولیوں سے اس کو چھلنی کر دیا اور اس کا سر کاٹ کے پیش کیا۔

شاعری کا ذوق | شجاع الدولہ کو شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی ان کی ایک بیوی ثنائی بیگم دختر علی نقی والہ داغستانی حسن و جمال میں بے مثال، حاضر جوابی و بذلہ سنجی و شعر گوئی میں مشہور تھیں۔ ایرانی باپ کی بیٹی تھیں گھر کی زبان فارسی تھی اس وجہ سے فارسی میں شعر کہتی تھیں ان کا لڑکا بیمار تھا نواب نے دریافت خیریت کیلئے آدمی بھیجا تو وہ مر چکا تھا بیگم نے یہ شعر لکھ کے بھیجا ؎

از حال ما مپرس کہ دل چاک کردہ ام — لخت جگر بریدہ تہ خاک کردہ ام

سلطان تخلص خدیجہ سلطان نام تھا بیگم کی چچا زاد بہن فارسی میں شعر کہتی تھی ؎

باحسن من آفتاب ہیچ است — اشک من و آفتاب حاضر آفتاب

ان کے کئی بیٹے شاعر تھے۔ ان کا خاص خدمت گار بھولن بیگ شاعر تھا ان کا نقیب محمد جان قرار مرزائی بیگ شاعر و موسیقار مصنف پدماوت ان کے متوسلین میں تھے۔ عطا حسین تحسین شاعر و خطاط ان کے مصاحب خاص تھے انکی

ذوالشو سے تحسین نے چہار درویش کا قصہ اردو میں لکھا ۔ مرصع رقم ان کا خطاب تھا اس مناسبت سے انھوں نے اس کا نام نوطرز مرصع رکھا ۔

شعروسخن سے ان کی دلچسپی کا شہرہ سن کے باہر سے جو شعرا آئے وہ یہ ہیں ۔

دہلی سے سراج الدین علی خاں آرزو مرزا محمد رفیع سودا میر علی اعلیٰ فائق ۔ نزاکی گماں ۔ کاظم علی تمکین ۔ شاہ واقف واقف ۔ مظہر علی راز گدا علی بیگ بسمل گھاسی رام خوشدل، بندرابن راقم ۔ میر ولایت اللہ ولایت ۔ محمد علی خاں مرزا آلی ۔ مرزا احسن علی احسن ۔ میر محمد صبر محمد پناہ نثار ۔ مرزا اسمٰعیل گلشن میر ولایت علی وحشت علی نقی کافر ۔ حفیظ اللہ حفیظ ۔ میر شاہ علی خاں مولوی غلام حسین اور ان کے بیٹے غلام محمد فائق مشہور فارسی گو شاعر ۔

بلگرام سے محمد صدیق سخنبوری ۔ شیخ نظام الدین احمد صالح

کشمیر سے لالہ ٹیکارام ظفر ۔ مرزا علی نقی محشر

اکبرآباد سے شاہ فتح محمد دل شیخ محمد بقا ساگر دحاتم ۔ بھوری سنگھ عشرت

نارنول سے میر شیر علی افسوس

ایران سے میر صدرالدین صدر ۔ مرزا ابوالحسن نوائی ۔ مرزا احمد بیگ قیس محمد رضا متین ۔

فیض آباد ۔ میں جو شعراء پیدا ہوئے ان کے نام یہ ہیں :-

نور خاں آگاہ محمد اعظم اعظم ۔ جان عالم خان نواب محمد تقی ہوس نواب محمد نقی ترقی ۔ حسن علی حسن ۔ نواب احمد علی شوق ۔ سید فخرالدین فخر

میر جیون، قربان شیخ لطف اللہ کامل، میر حسن مشتاق، میر نبی جان، محمد حسن
مرزا محمد بہادر، محمد یار قرار، جسونت سنگھ پروانہ۔ میر برہان علی ذہن، مرزا عبداللہ
راحت، مرزا جعفر رونق، میر مرتضیٰ علی بیگ، ابراہیم بیگ شمار۔ نثار علی قریش۔
کنور سین مضطر۔ یہ فقط شاعروں کی فہرست ہے دوسرے صاحبان علم و فن کتنے
آئے ہوں گے اسی پر قیاس کر لیجئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تمام علوم و فنون کو ترقی ہوئی
جن کا اس وقت شوق یا ضرورت تھی

شعراء کی کثرت آمد نے ان کے مشاعروں نے لوگوں میں شعر گوئی اور شعر فہمی
کی صلاحیت پیدا کی۔

علماء کی کثرت اور ان کے تقدس کا اثر یہ ہوا کہ امرد پرستی شدید عیب
قرار پائی اور اہل دہلی کو یہاں آکے اسے چھوڑنا پڑا۔

اطمینان اور خوشحالی نے ایسی فضا پیدا کی جس سے تہذیب و تمدن کو
ترقی ہوئی۔ تعزیہ داری، سپہ گری، شاعری، خطاطی موسیقی کو عروج ہوا

اہل دہلی کی آمد اس وقت اودھ کی حکومت دولت و ثروت قوت و طاقت
امن وامان اور علم و فن کی قدردانی میں مغل شہنشاہی کی یادگار اس کی جانشین
بلکہ اس کا ایک ٹکڑا سمجھی جاتی تھی۔

شجاع الدولہ کی ماں نواب سید محمد امین صوبہ دار اودھ کی بیٹی اور انکی بیوی
نواب محمد اسحاق خاں صوبہ دار اکبر آباد کی بیٹی تھیں جن کو محمد شاہ نے اپنی بیٹی
بنایا تھا اور شجاع الدولہ سے ان کی شادی کی تھی جسکی تفصیل گزر چکی ہے۔
یہ سب ایرانی تھے۔ مگر ایران واپس جانے کا کوئی خیال نہ تھا۔ دہلی کو اپنا وطن

ثانی سمجھتے تھے لکھنؤ حکمراں کی حیثیت سے آئے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیجیئے کہ جب صفدر جنگ کا انتقال ہوا تو شجاع الدولہ نے ان کی لاش دہلی بھیج کر اسپر عالیشان مقبرہ بنوایا جو دہلی کی مشہور عمارتوں میں ہے۔ یہ سب دہلی والوں سے اور دہلی والے ان سے مانوس تھے۔ جب ہندوستان کی جنگجو فوجوں نے دہلی کو لوٹنا شروع کیا اور حکومت رعایا کی جان و مال کی حفاظت نہ کر سکی تو لوگوں کو اودھ سے زیادہ قریب محفوظ و مامون دولت مند قدردان اور مانوس کوئی خطہ نظر نہ آیا۔ قافلوں پر قافلے روانہ ہونے لگے جنھیں آباد کر کے شجاع الدولہ فخر محسوس کرتے تھے ان میں ہر پیشہ اور ہر فن کے لوگ تھے۔ دہلی والوں کے علاوہ جہاں جہاں بھی صاحب کمال تھے شجاع الدولہ کی قدردانی کی شہرت سن کے فیض آباد آ گئے اور قدردانی کے سایہ میں نہال ہو گئے۔

طوائفوں سے دلچسپی طوائفوں سے دلچسپی میں وہ سلاطین دہلی کے ہم مذاق تھے۔ دہلی میں انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں اور اٹھتی جوانی تک وہیں۔ امرائے دہلی کے تمام ذوق ان میں پیدا ہو گئے تھے۔ ارباب نشاط سے دلچسپی میں شدت پیدا ہو گئی۔ طوائفیں سفر میں بھی ساتھ رہتی تھیں منزل پر پہنچنے کا بھی انتظار نہیں کرتے تھے۔ راستہ ہی میں طلب کر لیتے تھے۔

بے تعصبی | مذہب میں اتنے سخت ہوتے ہوئے ان میں تعصب نام کو بھی نہ تھا سنی شیعہ ہندو سب کو ایک نظر سے دیکھتے تھے بلکہ سنی اور ہندو زیادہ ملازم تھے۔ فرماتے تھے کہ متعصب آدمی انصاف نہیں کر سکتا۔

جدت طرازی | شجاع الدولہ کی طبیعت جدت طراز تھی وہ برابر ملک کا دورہ کرتے تھے اور شکار سے جی بہلاتے تھے آئے دن سفر در پیش رہتا تھا اس میں یہ جدت کی تھی کہ شہر کے خوش باش رئیس امرائے دربار فوج کا حصہ تلنگوں کی ایک پلٹن طوائفوں کے ڈیرے رسد کے لئے ہر طرح کے دوکاندار یہاں تک کہ خوانچے والے بھی ساتھ ہوتے تھے۔ ہر منزل پر بازار لگ جاتا تھا ضرورت کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس بازار میں نہ ملتی ہو۔ طوائفوں کے خیمے لگ جاتے تھے۔ رقص و سرود کی آوازیں شہنائی کا بجنا سودے والوں کی صدائیں ایک سماں باندھ دیتی تھیں۔ تلنگے پہرے پر گشت کرتے تھے اور جنگل شہر بن جاتا تھا۔

تفریحات | چوسر۔ شطرنج۔ مرغ بازی، بٹیر بازی شیر اور ہاتھی کی لڑائی داستان گوئی، نقالی، شاعری اور روسائے دہلی کی تمام تفریحات ان کی دلبستگی کے سامان تھے۔ آئے دن مشاعرے ہوتے تھے جن میں میر حسن میر ضیا ایسے اساتذہ اپنا کلام سناتے تھے۔

علم و فن کی قدر دانی | وہ علم و فن کی قدر دانی میں شہرت رکھتے تھے ہر طرح کے ساربان کمال فیض آباد آئے اور ان کی قدر دانی سے نہال ہو گئے۔

علماء | علماء میں تفضل حسین خاں علامہ اور منیر شمس الدین فقیر دہلی سے

اور مولوی سعد الدین شاہجہاں پور سے اور مولوی عبد الحکیم کشمیر سے آئے۔
خان علامہ منطق و فلسفہ کے علاوہ ہیئت جدیدہ میں بھی درک رکھتے تھے عبرانی فرانسیسی
اور انگریزی زبان کے ماہر تھے موسیقی اور خطاطی میں کمال رکھتے تھے ان کی مصنفات
میں شرح مخروطات ایلونوس شرح مخروطات دیوبنال شرح مخروطات سمسن دو رسالے
جبر و مقابلہ میں اور کتب درسیہ پر حواشی بے مثل تھے جن کا نام صرف کتب تاریخ
میں رہ گیا ہے سنہ ۱۲۱۳ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

میر شمس الدین فقیر کا ادب و شعر میں جواب نہ تھا ان کی کتاب حدائق البلاغہ
کا مثل عربی فارسی کسی زبان میں نہیں ہے

اطباء) حکیم شفائی خاں، ارشد۔ حکیم احمد۔ حکیم ناصر علی حکیم صادق۔ حکیم رضی
حکیم حسین رضا حکیم غلام علی حکیم میر اعظم دہلی سے آئے۔ برہان الملک اور
صفدر جنگ کے زمانہ میں آئے ہوئے اطباء بھی موجود تھے جن میں حکیم مرزا
بھجو ڈھیوڑی خاص کے طبیب تھے۔

فیض آباد کا تمدن

ہر جگہ تہذیب و تمدن کی ترقی علوم و فنون کی ترقی سے ہوتی ہے اور وہ
امن و امان سے وجود میں آتی ہے اور امن و امان خوشحالی سے پیدا ہوتا ہے
جس کو مضبوط حکومت وجود میں لاتی ہے۔ فیض آباد ایک پر رونق اور محفوظ
و مامون شہر تھا۔ شجاع الدولہ علم و فن کے قدردان تھے۔ صاحبان علم و
کمال کے قافلے فیض آباد آئے اور ان کی قدردانی سے نہال ہو گئے۔ ان کی وجہ سے
ہر طرح کے علم و فن نے ترقی کی۔

خطاطی | خطاطی میں منشی سیج بھان اور چند بھان نے لاہور سے آکر
بڑا نام پیدا کیا اور خطاطی کو بڑی ترقی ہوئی سیکڑوں نے ان کی شاگردی اختیار
کی ان کی وصلیاں آج تک لوگوں کے پاس محفوظ ہیں
۱۲۰۳ھ میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

زود نویسی میں منشی غلام رضا نے وہ کمال دکھایا کہ سراج الدین
علی خاں کی لغت سراج اللغات ۲۰ جز کی ایک رات میں لکھ ڈالی
محمد باقر طغریٰ نویس کے بیٹے عطا حسین تحسین نسخ و نستعلیق سے
میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے مرصع رقم خطاب تھا اسی مناسبت سے
انھوں نے خیار درویش کا ترجمہ کیا تو اس کا نام نوطرز مرصع رکھا۔

فنون سپہ گری | شمرو جرمنی اور موشیر لاک فرانسیسی نے بندوقیں اور
توپیں ایسی بنائیں کہ انگریزی بندوقیں مات ہو گئیں۔

رستم علی خاں نے سپہ گری میں وہ کمال حاصل کیا کہ سپہ گری کی ایک شاخ کے موجد ہوئے جو رستم خانی کے نام سے مشہور ہے

منصور علی خاں بنکیت اپنے فن میں یکتائے زمانہ تھے۔ سپاہیانہ بانکپن وضع میں داخل ہو گیا اور فیض آبادی آن مشہور ہوئی

کھانے میں جدتیں | شجاع الدولہ کے سالے نواب سالار جنگ کو کھانے کا بہت شوق تھا اور خوش خوراکی میں ان کی شہرت تھی۔ دور دور سے باورچی کئے اور طرح طرح کے کھانے پکائے۔

انڈے کی زردی میں مشک وزعفران حل کر کے یا جرے میں ملا کے چوزوں کو کھلائی جاتی تھی اور جب جوان ہوتے تھے اور ذبح کئے جاتے تھے تو پکنے کے بعد ان کے گوشت سے مشک وزعفران کی خوشبو آتی تھی اس کا کھانا کوئی اور ہضم نہیں کر سکتا تھا۔ مولانا شرر نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ شجاع الدولہ نے ان سے کھانے کی فرمائش کی انھوں نے اپنے باورچی سے کہا کہ آج ایک آدمی کا کھانا اور پکے گا اس نے کہا میں کسی اور کے لئے کھانا نہیں پکاتا۔ انھوں نے کہا ارے نواب نے فرمائش کی ہے اس نے کہا اچھا پھر سرکار اپنا آبدار خاص ساتھ لیتے جائیں اور نواب صاحب کو دو تین نوالوں سے زیادہ کھانے نہ دیں ایسا ہی ہوا دو تین نوالوں کے بعد سالار جنگ نے ان کو کھانے نہ دیا۔ انھوں نے کہا دو تین نوالوں میں کیا ہو گا مگر سالار جنگ نے اور کھانے نہ دیا گھنٹہ بھر کے بعد پیاس کی دھونکنی لگی اور آبدار خانے سے بار بار پانی طلب کرتے رہے۔ بہت دیر کے بعد طبیعت سنبھلی۔

ارباب نشاط شجاع الدولہ کو طوائفوں سے بڑی دلچسپی تھی فیض آباد کے گلی کوچے ان سے بھرے ہوئے تھے۔ تیسرے پہر سے شہر کی رونق بڑھتی تھی۔ خرید و فروخت کا ہنگامہ، شاہی سواری اور امراء کی ڈھولوں سے شہنائی اور نوبت نقارے کی آوازوں کے ساتھ نغمہ و آہنگ کا سیلاب اور سارا شہر اس میں ڈوب جاتا۔

شام اودھ ہی تھی جو سفدر جنگ کے زمانہ میں پیدا ہوئی۔ شجاع الدولہ کے عہد میں بڑھی اور آصف الدولہ کے ساتھ لکھنؤ آئی اور چوک میں اس کی جوانی نکھری۔

یہ تمام ذوق پورے شمالی ہند میں پھیل گئے۔ ہر جگہ روسا نے انھیں اختیار کر لیا۔ خوش خوراکی، خوش پوشاکی، شاعری، سپہ گری۔ طوائفوں سے اختلاط۔ شان و شوکت کا اظہار۔ سیر چشمی و سخاوت وضع بن گئی۔

چھوٹے درجہ کے روساء نے بھی ان باتوں کو اپنی شان ریاست سمجھا۔

اس کا نتیجہ آمد سے زیادہ خرچ اور اس کا نتیجہ قرض۔ کسی نے اس معاشرے کی یہ تصویر کھینچی ہے۔

چار چیز است بر رئیساں فرض   گڑگڑی پالکی بٹیریا قرض

معاشرہ کی سنجیدگی ارباب نشاط کی کثرت اور ان سے انتی دلچسپی اور نزدیکی میں بھی سنجیدگی و وقار کا لحاظ تھا۔ انھیں ادب و تعظیم کے قاعدوں سے باہر ہونے کی اجازت نہ تھی۔ دوسرے شہروں سے آنے والی طوائفیں ادب و تہذیب کو ایک فن کی حیثیت سے سیکھتی تھیں تہذیب سے عاری طوائف امراء کے دربار کے لائق نہ تھیں۔ یہی معاشرہ کی بڑی خصوصیت تھی۔ سپاہی اپنی انکڑ بکڑ اور بانکپن کے ساتھ ادب و تعظیم سے ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ طوائفوں کے حسن و جمال اور فنی کمال کے ساتھ ان کی سنجیدگی و متانت بجلیاں گراتی تھی۔ ان کے بناؤ سنگار کے ساتھ ان کا سنجیدہ و باوقار رہنا ان کو اور زیادہ پرکشش بنا دیتا تھا اس سے معاشرہ میں چھچھوراپن اور اوباشانہ انداز رؤسا کا تو کیا ذکر طوائفوں کو بھی پسند نہ تھا انھیں اجزاء پر لکھنؤ کے تمدن کی بنیاد قائم ہوئی اور وہاں ترقی کر کے اس نقطۂ عروج پر پہنچی جس کی مثال دنیا میں ڈھونڈھے نہیں مل سکتی۔ اس کا شہرہ دور دور پہنچا اور باہر کے لوگ اسکے دیدار کے مشتاق ہو گئے۔ یہاں مدنیہ تہذیب ایران کے لوگ لکھنؤ کی سیر کو آئے اور اکثر یہیں رہ گئے۔ عارف علی شاہ عارف محمد شاہ بادشاہ ایران کے عمائد میں تھے۔ انھوں نے جوانی میں دنیا ترک کر کے سیاحت اختیار کی۔ لکھنؤ ان کو اتنا پسند آیا کہ یہیں رہ گئے فرماتے تھے:۔

ہندوستان ندیدم موضع دلچسپ چوں لکھنؤ اگرچہ در طرق

مذہبی رواسم | شیعہ سنی کی تفریق نہ تھی۔ بیری مریدی عرس قوالی چادر گاگری
شیخ سدو کا بکرا میراں جی کے گلگلے احمد کبیر کی گائے سید سالار کا جھنڈا مدار صاحب کی نذر
بابا شکر گنج کا کونڈا بڑے پیر کی فاتحہ سنیوں اور شیعوں کے مذہبی رواسم تھے۔
نماز روزہ نکاح طلاق دفن وکفن شیعوں کا بھی اہلسنت کے طریقہ پر انھیں کے ہاتھ سے ہوتا تھا
کوئی مجتہد نہ تھا۔ پڑھے لکھے شیعہ اخباری تھے اس وجہ سے شیعوں کی نماز جماعت
نہ ہوتی تھی۔ عیدین کی نماز شیعہ اہلسنت کے ساتھ پڑھتے تھے۔

محرم میں گنبد براق مچھلی اور جانوروں کے سر نیزوں پر ہوتے تھے جو ماہی
کہے جاتے تھے۔ اس طرح جلوس نکلتا تھا۔ بانک پٹے کے استادوں کے اکھاڑے
ساتھ ہوتے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دور پر رک کے ہر استاد کے اکھاڑے بانک اور پٹے
کا فن دکھاتے اور یا حسین کے نعرے بلند کرتے۔ طبل تاشا روشن چوکی شہنائی جلوس کے ساتھ ہوتی تھی

شجاع الدولہ سیاہ کپڑے پہن کے علم لے کے نوحہ پڑھتے زنی کرتے ہوئے
گشت کرتے تھے۔ یہ طریقہ ان کے ساتھ مخصوص تھا۔

واقعہ خوانی | عام مسلمان سبیلیں بھی رکھتے تھے۔ شربت اور شیرینی پر نذر
دیتے تھے۔ اہلسنت کی مجلسوں میں ایک یا دو آدمی مرثیے کے کچھ بند تخت
پر بیٹھ کے گا کے پڑھتے تھے۔ یہ مرثیہ خوانی کا طریقہ تھا۔ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور
بگڑا گویا مرثیہ خواں کہا جاتا تھا اہلسنت مجلس کو شہادت نامہ کہتے تھے

شجاع الدولہ کی مجلسوں میں کوئی ذاکر مرثیہ اسی طرح پڑھتا یا کوئی حدیث جسے روضہ
خواں کہتے فضائل مصائب بیان کرتا تھا۔ وہ کپڑے اور پھوس کا امام بارہ بنواتے
تھے۔ دس دن کے بعد خزانہ اسے لیجاتے تھے اور محرم ختم ہو جاتا تھا۔

مہاراجہ ٹکیت رائے

نواب مرزا یحیی عرف مرزا امانی آصف الدولہ وزیرالممالک رستم جنگ

maablib.org

نواب آصف الدولہ بہادر

شجاع الدولہ کی خبر وفات سنتے ہی رزیڈنٹ نے فوج ہر طرف تعینات
کر دی ان کی والدہ کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے ایلچ خاں کو طلب کر کے کہا کہ فوج کو
جنگ کے لیے تیار رہنے کا حکم دیدو اور رزیڈنٹ سے جاکے کہو شجاع الدولہ اور
انگریزوں سے جو معاہدہ ہوا تھا کیا وہ اتنا کمزور تھا کہ اس قدر جلد ٹوٹ جائے ہم تو
اس کو قیامت تک کے لیے مضبوط سمجھتے تھے اگر یہ جرأت کلکتہ کے انگریزوں کے حکم سے ہوئی
ہے تو یاد رکھنا چاہیے کہ نواب وزیر مرے ہیں فوج اور بیٹے زندہ ہیں رزیڈنٹ
نے یہ سن کے اپنی فوج ہٹالی اور ایلچ خاں نے ریاست کی فوج ہر طرف تعینات
کر دی۔ دوسرے دن جناب عالیہ نے بہو بیگم سے کہا کہ آصف الدولہ کو نواب اور
سعادت علی خاں کو پیش دست بناؤ کہ انتظام وہ کرے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی تو
کئی ہیں میرا تو ایک ہی ہے یہی سب کچھ ہوگا۔ جناب عالیہ خاموش ہو گئیں۔

تیسرے دن آصف الدولہ مسند نشین ہوئے اور اپنے مصاحب
میر مرتضیٰ عرف آغا جانی کو مختار الدولہ ہیبت جنگ ہفت ہزاری منصب اور ماہی
مراتب دیکے اپنا نائب بنا دیا یہ پست فطرت اور جاہل تھا۔ شجاع الدولہ اور سب
اس کی مصاحبت پر سخت ناراض تھے۔ پرانے کارپرداز ایلچ خاں، راجہ صورت
سنگھ راجا بڑ چند نے شہر چھوڑ دیا۔ جناب عالیہ نے حکم دیا کہ سارا سامان امارت
اس سے چھین لیا جائے اور آصف الدولہ کو سخت سرزنش کی مگر انھوں نے
محل سے نکلے دادی کے حکم کی تعمیل سے روک دیا مختار الدولہ کا دور دورہ ہوا
نواب شراب کے نشے میں رہتے تھے بد انتظامی پھیل گئی آمدنی کم ہو گئی خرچ

بڑھ گیا۔ اس کے بہکانے سے نواب نے کئی دفعہ روپیہ اپنی والدہ سے لیا آخر انھوں نے عاجز آکے انکار کردیا۔ تفضل کارگزار چلے گئے تھے سعادت علی خاں کی طرف سے وہ مطمئن نہ تھا چاہتا تھا کہ روہیلکھنڈ کی گورنری سے ان کو الگ کرکے بے دست و پا کر دیا جائے اس نے نواب کو آمادہ کرکے میجر پھلیر رزیڈنٹ کو نواب کا یہ پیغام پہنچایا کہ سعادت علیخاں میرے پاس رہا کریں میں ان سے بھائیوں کا سا سلوک کروں گا۔ رزیڈنٹ نے کہا کہ شجاع الدولہ انھیں گورنر بنا چکے ہیں کوئی نافرمانی بھی ان سے نہیں ہوئی ان کو کیسے ہٹایا جا سکتا ہے مختارالدولہ نے رزیڈنٹ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ اس کے صلہ میں بنارس جونپور غازی پور اور پٹہ سیرنج کمپنی کو دیدیا جائے گا۔ سعادت علی خاں ہٹا دیئے گئے اور ایک عہد نامہ کے ذریعہ کمپنی کو چاروں ضلعے حوالے کر دیئے گئے۔ سعادت علیخاں کا تین لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ معین ہوگیا اور وہ رزیڈنٹ کے ذریعہ بنارس جا کے درگاکنڈ میں مقیم ہوگئے۔

لکھنؤ میں قیام | مختارالدولہ نے نواب کو لکھنؤ منتقل ہونے کا مشورہ دیا اور وہ ماں اور دادی کی سرزنش سے عاجز تھے اس کو بھی انھیں سے خطرہ تھا دونوں نے فیض آباد چھوڑنا ہی مناسب سمجھا مگر لکھنؤ آکے ان میں ذہنی انقلاب پیدا ہوگیا۔ شراب چھوڑ دی بھنگ پینے لگے دن نکلنے سے دو گھڑی پہلے بیدار ہوکے ملا محمد کوٹھا کے قرآن پڑھتے تھے پھر نماز اس کے بعد صحن میں خاک پر بیٹھ کے سجدۂ شکر کرتے اور بہت خضوع سے بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے بارالٰہا میرے جسم کے نیچے کا حصہ ناقص ہے تو نے مجھے یہ مرتبہ دیا۔ اگر کسی غریب گھر میں پیدا ہوتا تو میرا کیا حال ہوتا تیرا شکر کس زبان سے ادا کروں اسکے بعد ہاتھی پر تفریح کے لئے جاتے اور واپس ہونے پر پرچہ اخبار پڑھتے۔ ملکی انتظام کے لئے بھی وہ مستعد رہتے تھے

اُدھر مختار الدولہ نے رزیڈنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان سے نواب کے خلاف کہنا شروع کیا۔ بعض ہواخواہوں نے نواب کو مطلع کیا مگر وہ تامل کرتے رہے جب سالار جنگ نے سمجھایا کہ اتنی غفلت نہ چاہیئے تو انھوں نے بسنت علی خان سے اسکو قتل کرادیا۔

مختار الدولہ کا قتل

ایلچ خان نے جب یہ سُنا تو نواب کو عرضی لکھی کہ غلام پیر۔ نمک خوار قدیم مشتاقِ قدمبوسی ہے کہاں تک مارا مارا پھرے مالِ دنیا سے جو کچھ ہے وہ حضور کا ہے امیدوار ہوں کہ زیر قدم زندگی گذار دوں نواب ملک کے انتظام کے لئے متردد تھے سمجھے کہ ایسا نائب کہاں ملے گا اسیوقت درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا اور شکوہ آباد کے عامل کو لکھا کہ جب خان مذکور داخل عملداری سرکار ہوں تو بہت احترام سے پیش آنا ایلچ خان منزل بمنزل مہمانی کھاتے لکھنؤ پہنچے پہلے حسن رضا خان استقبال کو گئے پھر نواب نے خود استقبال کیا خواصی میں بیٹھا کے لائے اور ملکی انتظام اُنکے سپرد کیا انہوں نے بہت عمدہ انتظام کیا مگر ایک ہی سال کے بعد فالج میں انتقال ہو گیا، اُنکے بعد مرزا حسن رضا خان قدیمی خیر خواہ ہونے کی وجہ سے نائب ریاست ہوئے اور سرفراز الدولہ خطاب ملا وہ پڑھے لکھے نہ تھے رزیڈنٹ کی سفارش سے مرزا حیدر بیگ اُنکے پیش دست بنائیے گئے اور امیر الدولہ خطاب عطا ہوا ٹکیت رائے کو مہاراجہ کا خطاب ملا اور وہ حسن رضا خاں کے منیب مقرر ہوئے ان لوگوں نے ملک کا انتظام سنبھال لیا، مرزا حیدر بیگ کی سفارش سے تفضل حسین خاں علامہ کو عہدۂ وکالت ملا اور وہ کلکتہ بھیج دیئے گئے، ہر معاملہ میں انگریزوں

کی مداخلت اور طلبِ زر سے آصف الدولہ سخت پریشان تھے انہوں نے کئی
دفعہ ریاست سے دست کشی کا ارادہ کیا۔ جھاؤلال جو اس خاندان کے
قدیمی جاں نثار تھے انہوں نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے
کا منصوبہ بنایا، جس میں آصف الدولہ بھی شریک تھے۔ جھاؤلال نے،
زمان شاہ بادشاہ کابل کو اور ہندوستان میں سندھیا، پٹیل، ہولکر، گائکواڑ
نواب احمد علی خان، بنگال کے نواب شمس الدولہ کو خط لکھا کہ ہم سب مل کے انگریزوں
کو ہندوستان سے نکال دیں، رائے بالک رام ان خطوط کا کاتب تھا۔ کسی
طرح یہ راز انگریزوں پر کھل گیا، اور خطوط رزیڈنٹ کے ہاتھ لگ گئے۔
انہوں نے نواب سے شکایت کی، اور کہا کہ سرکارِ عالی کا دوست ہمارا دوست اور دشمن ہمارا
دشمن ہے اسی طرح ہمارا دوست سرکارِ عالی کا دوست اور دشمن سرکارِ عالی کا دشمن
ہے اور یہ بات ابتداء سے داخلِ عہد نامۂ سرکارین ہے، نواب نے اسکی،،
تصدیق کی رزیڈنٹ نے کہا کہ جھاؤلال اور بالک رام نے ہندوستان سے ہماری
حکومت کے خاتمہ کی سازش کی اسکے خطوط، حاضرِ خدمت ہیں، اب حضور
اس کو ہمارے حوالہ کردیں، ہم اسکو عزت سے رکھیں گے، نواب مجبور ہو گئے اور انگریز
جھاؤلال کا اخراج جھاؤلال اور بالک رام کو پٹنہ لیگئے اور حسبِ وعدہ عزت
واحترام سے رکھا۔ ان دونوں کے اخراج سے شہر میں کہرام مچ گیا، نواب ہر وقت
ہائے جھاؤلال، ہائے جھاؤلال کہتے رہتے تھے وہ انگریزوں کی چیرہ دستی سے اتنا
عاجز ہو گئے کہ حکیم شفائی خان ارشد سے پوچھا کہ کونسا مرض لاعلاج ہے اور وہ
کس طرح ہو سکتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ کھانے کے بعد نہانے کی عادت سے
استسقا ہو جاتا ہے، اور وہ لاعلاج مرض ہے، اسی دن سے نواب نے اسکی مداومت
شروع کردی۔ آخر استسقا ہو گیا اور ۱۲۱۱ھ میں انتقال ہو گیا۔

آصف الدولہ کے ذاتی اوصاف

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ آصف الدولہ لکھنؤ آنے کے بعد وہ نہیں رہے جو فیض آباد میں تھے یہاں انہوں نے کاروبارِ حکومت کارگزار اور ہوشیار لوگوں کے سپرد کیا اور خود اپنی دلچسپیوں کو پروان چڑھانے میں مشغول ہو گئے

لہو ولعب مزاج میں قلندرانہ پن تھا بٹل اڑاتے تھے جس میں مقیش کی جھل جھل پانچ روپیہ قیمت کی ہوتی تھی دل بادل ہاتھی کی شادی بڑی دھوم سے کی جس میں دو سو ہاتھی براتی تھے۔ لاکھوں روپیہ اس میں صرف ہو گیا بسنت اور ہولی کا جشن بڑی دھوم سے مناتے تھے جسمیں چھ لاکھ روپیہ سالانہ خرچ ہوتا تھا، ہر سال سید سالار مسعود غازی کا میلہ دیکھنے جاتے تھے جسمیں خدم وحشم فوج دو کا ندار اور طوائفیں ساتھ ہوتی تھیں، چھ لاکھ روپیہ سالانہ اسمیں خرچ ہوتا تھا،

علم کی قدردانی علوم وفنون کی سرپرستی میں وہ شجاع الدولہ سے آگے تھے علم سیر و تاریخ میں بڑا درجہ رکھتے تھے، حافظہ بلا کا تھا۔ باکمال تیر انداز رقص و موسیقی کے دلدادہ اور سیر و شکار کے شائق تھے۔ سخی و جواد شجاع و بہادر رحم دل، منصف و عادل، خدا پرست، تعمیرات کے شوقین جدت پسند اور منچلے آدمی تھے، لکھنؤ کو ان کی وجہ سے نئی زندگی ملی علوم و فنون، اور تہذیب و تمدن کی رگوں میں خون تازہ دوڑا۔ رعایا اتنی خوشحال تھی کہ بقول سوداؔ سے

رہرو کے اگر بڑا ہو گہر دور ٹھوکر سے کر روان ہوئے

شہر کی وسعت فیض آباد کی آبادی اور دھوم دھام جو شجاع الدولہ کے زمانہ

میں تھی لکھنؤ منتقل ہو گئی اور دہلی سے آنے والے قافلوں کا رخ فیض آباد کے
بجائے لکھنؤ کی طرف مڑ گیا۔ شہر کی وسعت ناکافی ہو گئی تو باہر گاؤں،
ملا کے اس کو وسیع کیا، نئے محلے آباد ہوئے جنکے نام یہ ہیں۔
امانی گنج۔ فتح گنج۔ رکاب گنج۔ وزیر گنج۔ ترمنی گنج۔ بھوانی گنج۔ بالک گنج۔
نوازگنج۔ تحسین گنج۔ علی گنج۔ محبوب گنج۔ عنبر گنج۔ خیالی گنج۔ نخاس۔ خانساماں کا
ہاتا (احاطہ) ٹکیٹ رائے کا بازار۔ حسین الدین خاں کی چھاؤنی۔ صورت سنگھ
کا ہاتا نگریا۔ توپ دروازہ۔ جھاؤلال کا پل، یہ بھی ایک محلّہ ہے، یہ پل دریا
پر نہیں ہے وسطِ شہر میں نشیب پر ہے۔

باغات چار سو ایرانی طرز کے باغ بنوائے جن میں شاندار عمارتیں
حوض فوارے روشیں، کیاریاں، درختوں کی قطاریں، پھولوں کے تختے سبھی کچھ تھا۔

عمارتیں مرزا علی لطف کا بیان ہے کہ آصف الدولہ ہر روز ایک نئی
عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے تھے۔ امراء و اہلِ شہر کو بھی عمارتوں کا شوق
پیدا ہوا، اور لکھنؤ عالیشان عمارتوں کا شہر بن گیا۔

ایک سیاح کا بیان ہے کہ، لکھنؤ کی عمارتوں میں طلائی گنبد اور کھڑکیاں اس
کثرت سے ہیں کہ جب ان پر روشنی پڑتی ہے تو سارا شہر جگمگا اٹھتا ہے۔
مولانا شرر لکھتے ہیں۔۔۔۔ ان دنوں شہر لکھنؤ ایسی رونق پر تھا کہ ہندوستان
ہی نہیں شاید دنیا کا کوئی شہر اسکے اوج و عروج کا مقابلہ نہ کر سکتا ہو گا
شجاع الدولہ جو روپیہ فوج اور جنگی تیاریوں پر صرف کرتے تھے۔ اس کو
آصف الدولہ نے اپنی عیش طلبی اور شہر کی آرائش اور خوشحالی میں
صرف کرنا شروع کیا، اور چند ہی روز میں پوری دنیا کی دھوم دھام اپنے یہاں

جمع کرلی، انکا حوصلہ بس یہی تھا کہ، نظام حیدر آباد ہوں، یا ٹیپو سلطان کسی کے دربار کا کروفر، اور شان و شوکت، میرے دربار سے زیادہ نہ ہو سکے۔ انکی الوالعزمی کی مثال مولانا شررؔ کی زبان سے سنئے

وزیر علی کی شادی | وزیر علی خاں کی شادی میں انھوں نے وہ حوصلہ دکھایا کہ برات کا تزک واحتشام تاریخ ارض کے تمام تکلفات سے بڑھ گیا برات کے جلوس میں بارہ سو ہاتھی تھے دولہا جو خلعت پہنے تھا اس میں بیس لاکھ کے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے، محفل طرب کیلئے دو عظیم الشان شامیانے بنوائے گئے تھے جن میں ہر ایک ساٹھ ساٹھ فٹ بلند تھا اور ایسا نفیس کپڑا لگایا گیا تھا کہ دونوں کی تیاری میں دس لاکھ روپے صرف ہوئے تھے،

شکار | سال میں دو دفعہ شکار کو جاتے تھے شجاع الدولہ کی طرح امرائے سلطنت شہر کے خوش باش امراء اور امیرزادے، فوج، دوکاندار، طوائفیں ساتھ ہوتیں۔

نشانہ | تیر اور بندوق دونوں کا نشانہ بے مثل تھا، ہاتھی، شیر، ارنا بھینے ایک وار میں اپنی جگہ سے نہ ہل سکتے تھے، پچاس پچاس ہاتھی زندہ پکڑ لاتے۔

جدت پسندی | طبیعت میں بڑی جدت تھی، شیر کی کھالوں کا شامیانہ ہاتھی دانت کا مکان شیشہ کا محل بنوایا، کہنی تک کا شلوکہ ایجاد کیا، اور اسکا نام آصف خانی رکھا،

سخاوت | سخاوت اُن میں فطری تھی دینے کا بہانہ ڈھونڈتے تھے کتنے مفلس ایک نگاہ کرم میں دولتمند بن گئے۔ مسلمان آصف الدولہ ولی کہہ کے صبح کو دوکان کھولتے تھے، اور ہنود جو حکمراں کو "دیو" کہتے ہیں کہا کرتے تھے۔ "جسے نہ دے مولا اُسے دے آصف الدولہ"

شجاعت | ان کا آبائی ورثہ تھی، شجاع الدولہ کے ساتھ روہیلکھنڈ کی جنگ میں شریک

تھے، نواب محمد علی خان کو انہوں نے رام پور کا نواب بنایا انکے بھائی محمد خان نے ان
کو قتل کر کے ریاست پر قبضہ کر لیا۔ آصف الدولہ کو معلوم ہوا تو ان پر فوج کشی کی
انہوں نے سرسٹھ ہزار روہیلوں کو اکٹھا کر کے سخت جنگ کی نواب نے ان کو شکست دی اور
رامپور جا کے محمد علی خاں کے بیٹے احمد خاں کو تخت نشین کر کے لکھنؤ واپس آ گئے۔ رعایا نے ان کا
استقبال کیا تمام شہر دولہن کی طرح آراستہ تھا۔ سڑکوں پر تماشائیوں کا ہجوم تھا،
کوٹھوں پر طوائفیں بن ٹھن کے بیٹھی تھیں وہ روپیہ اشرفی لٹاتے شہر میں داخل ہوئے
اور طوائفوں کو انعام تقسیم کرتے محلسرا پہنچے، حکومتِ اودھ کی تاریخ میں یہ آخری جنگ
تھی جو آصف الدولہ نے لڑی اور فتح حاصل کی۔

اس فوج کشی میں آصف الدولہ کے ساتھ جو توپیں تھیں، ان کے نام یہ ہیں،،
دھوں دھکار، جم ڈکار، کڑک بجلی، گھن گرج، ملک میدان، فتح بیکر، شیر بیکر، اجگر،
فتح لشکر، نہنگ، خود پسند، کھنڈ دھاتی، سرجیو، سنگار دل، صف شکن، وزیری
جہانگیری، حیدری، سیماب، پھلجھڑی، فتحیاب، غباری، انگریزبان، گنجنال
شترنال، گھڑنال، ہتھنال۔

شاہ عالم کی مدد

شاہ عالم کو جب ضابطہ خان نے ستایا اور انہوں نے
وہ تاریخی نظم کہی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

آصف الدولہ وانگریز کہ دستور من ارز ۔۔۔ چہ عجب گر بنمایند مددگاری ما

تو ایک رقم اور فوج بھیج کر ان کو نجات دلوائی جس کے صلے میں وزیر الممالک رستم جنگ
خطاب ملا۔ بزدلوں سے نفرت تھی سیما اور نورا بھانڈ نقل کر رہے تھے۔ نواب قاسم
علی خاں (ماموں زاد بھائی) کو تفریح کی سوجھی ایک ہوائی فیر کر دیا دونوں بھانڈ گر پڑے
اور ہائے وائے کرنے لگے۔ اس بزدلی پر دربار سے نکلوا دیئے گئے۔ کھانے کے بھی

بڑے شوقین تھے بائیس سو روپے روز کا کھانا انکے باورچی خانے میں پکتا تھا۔

دینداری دیندار بھی بہت تھے۔ پہلے شراب پیتے تھے، پھر توبہ کر کے بھنگ پینا شروع کی غفرآمآب نے بھنگ کی حرمت بیان کی تو اس کو بھی ترک کر کے افیون پر اکتفا کر لی۔ غفرامآب کی تحریک سے کربلا سے نجف تک نہر نکلوائی جس میں اسّی ہزار اشرفی صرف ہوئی

تعزیہ داری بڑی عقیدت سے کرتے تھے، محرّم میں پا پیادہ گشت کرتے تھے اور شہر کے تعزیوں پر نذر چڑھاتے تھے؛ دوسرے امراء اور اہل شہر بھی محرم میں تعزیوں کی زیارت کو نکلا کرتے تھے۔ اور نذریں چڑھاتے تھے اس کا اثر یہ ہوا کہ کوئی گلی کوچہ ایسا نہ تھا جہاں تعزیہ نہ رکھا جاتا ہو، اور کوئی فرقہ ایسا نہ تھا جو تعزیہ نہ رکھتا ہو دولتمند ہندوؤں نے عالی شان امامباڑے بنوائے جن میں مہاراجہ جھاؤلال راجہ ٹکیٹ رائے، راجہ بلاس رائے، راجہ مہرا اور مہاراجہ میوہ رام کے امامباڑے مشہور تھے، میوہ رام کے امامباڑے کا خرچ تین لاکھ سالانہ تھا۔ یہ مسلمان ہو گئے

خود آصف الدولہ کا امامباڑہ ہندوستان کی مشہور عمارتوں میں ہے جس کا رومی دروازہ۔ باؤلی بھول بھلیاں۔ لداؤ کی چھت عمارت کی وسعت شان و شوکت اور فنی اہمیت سیاحان عالم کو حیران کر دیتی ہے اسکو ایسا آراستہ کیا کہ دیکھنے والے عش عش کر گئے، ایک ایرانی سیاح کا بیان ہے کہ:۔

اس عمارت کے اندر دو رویہ دیوار پر قدِ آدم آئینے سونے چاندی کی گھڑیاں اور جواہرات جڑا ہوا سونے کا آرائشی سامان کثرت سے لگا ہوا ہے۔ چار پانچ سو بلوری جھاڑ زمین پر رکھے ہیں ان میں بے شمار کافوری

شمعیں روشن کی جاتی ہیں اور جب ان کی روشنی مرصع طلائی سامان پر پڑتی ہے تو دریا لہریں مارتا ہے۔ ۱۸۲۲ء میں بشپ ہیبر سیاحت کو آئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔" اس مقدس عمارت میں کثرت سے جھاڑ لٹک رہے ہیں جن کی رو پہلی ڈالو پھل دار ترشی ہوئی قلموں کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ جو جھاڑ بہت وزنی اور لٹکانے کے قابل نہیں ہیں وہ فرش پر رکھے ہیں ان کا نچلا حصہ بہت گھیر دار ہے۔ اوپر کی جانب گاؤدم ہے بیچ میں سنہرے اور رو پہلے تعزیئے آٹھ آٹھ، دس دس فٹ اونچے رکھے ہیں انکے علاوہ نوا بانِ اودھ کے زر بفتی پٹکے جن پر آیاتِ قرآنی کڑھی ہوتی ہیں، لٹک رہے ہیں، بڑے بڑے نقرئی و طلائی علم، ڈھالیں، تلواریں، بھالے، مرصع جن پر آیاتِ قرآنی اور اسمائے الٰہی لکھے ہیں نصب ہیں، مشہور سپہ سالاروں کے عمامے رکھے ہیں اور بڑے بڑے آئینے لگے ہیں۔

مورخین کا بیان ہے کہ سامانِ آرائش کی اتنی کثرت تھی کہ لوگ اندر نہ جا سکتے تھے باہر چبوترے سے زیارت کرتے تھے لاکھوں روپیہ کا سامان آرائش اور سونے چاندی کے تعزیئے یورپ بن کے آئے تھے، اور یہ سب کسی مختصر جگہ میں نہیں بلکہ ساٹھ فٹ چوڑا، ۲۲۰ فٹ لمبا صرف بیچ کا ہال ہے جس میں کوئی ستون نہیں ارد گرد کی صحنچیاں، شہ نشین اور آنگن دالان اسی مناسبت سے لمبا چوڑا اس کے علاوہ ہے یہ سب زمین سے چھت تک بھرا ہوا تھا،

شاعری وہ باکمال شاعر، ہر صنفِ سخن پر قادر اور صاحبِ دیوان تھے اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے، ان کا اردو کا کلام، میر و سودا کے کلام کی طرح مقبول و مشہور تھا سعادت یار خاں رنگین نے مجالسِ رنگین میں لکھا ہے کہ:-

نواب نجف خان نے نواب مرزا جعفر کو کانوڈے سے دہلی بھیجا اور مجھے دو سو سواروں کے ساتھ انکے ساتھ کیا۔ جب ہم ڈیاری پہنچے تو وہاں کے مترسین نے پُر تکلف دعوت کی کھانے

کے بعد محفلِ رقص و سرود گرم ہوتی، نواب نے مغنیہ سے غزل گانے کی فرمائش کی اس
نے وزیر الممالک آصف الدولہ کی یہ غزل گائی ؎

جہاں تیغ اس کی علم دیکھتے ہیں — وہاں مرہم اپنا قلم دیکھتے ہیں

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔
"ہم نواب اسمٰعیل خاں کی فوج کے ساتھ نارنول پہنچے وہاں ایک صاحب
ملنے آئے اور کہا مجھے نواب آصف الدولہ بہادر کے اس شعر کے دوسرے
مصرع کی بہت دن سے تلاش ہے ع نہ لگی آنکھ جب سے آنکھ لگی"
ان دونوں واقعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام دُور دُور مشہور تھا
لوگ اشتیاق سے سُنتے تھے اور محفوظ رکھتے تھے۔ ارباب نشاط ان
کی غزلوں سے محفلیں گرم کرتے تھے اس مقبولیت کی وجہ اُنکے کلام کی
روانی برجستگی اور سادگی ہے ایک رُباعی مشہور ہے

سادگی و پُر کاری میں بے نظیر ہے ؎

اے یار جو کسی کو کلپائے گا — یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پائے گا
اس دارِ مکافات میں سن اے غافل — بیدار کرے گا آج تو کل پائے گا

غزل کی سلاست و روانی دیکھیے ؎

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے — ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے
ہم نے قصہ بہت کہا دل کا — نہ سُنا تم نے ماجرا دل کا
تو اپنے شیوۂ جور و جفا سے مت گھٹے — تری بلا سے مرا دم رہے نہ رہے

انکی بیوی دُلھن بیگم نواب شمس النساء شرم بھی شاعرہ تھیں اور اکثر اُنکے
شعروں کا جواب کہا کرتی تھیں آصف الدولہ کو کا بہت شوق تھا کسی

موقع پر کہا تھا ؎

جہاں میں جہاں تک جگہ پایئے　　عمارت بناتے چلے جایئے

شرمؔ نے اس کے جواب میں کہا

نہ کرو فکر عمارت کی کوئی زیر فلک　　خانۂ دل جو گرا ہو اسے آباد کرو

آصف الدولہ کا شعر ہے ؎

ساقیا مے سے چھلکائے بہکتے جائیں　　برق کی طرح جدھر جائیں چمکتے جائیں

شرمؔ کہتی ہیں ؎

اتنے کم ظرف نہیں ہم کہ بہکتے جائیں　　مثل گل جائیں جدھر جائیں مہکتے جائیں

دونوں کی ہم طرح غزلیں ملاحظہ ہوں ؎

شرمؔ	آصفؔ
خوشی دل میں ہم اپنے کم دیکھتے ہیں	جہاں تیغ اُس کی علم دیکھتے ہیں
اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ہیں	وہاں ہم سر قلم اپنا دیکھتے ہیں
نہ قطرہ کوئی خوں کا باقی ہے دل میں	جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں
نہ آنکھوں میں ہم اپنی نم دیکھتے ہیں	خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں
نگاہِ کرم جس جگہ پر کرے تو	گزرتے ہیں سو سو خیال اپنے دل میں
ہم اس جا پہ باغ ارم دیکھتے ہیں	کسی کا جو نقش قدم دیکھتے ہیں
کرم سے ترے شاد و خرم ہیں سب	جو چاہیں کہ لکھیں کچھ احوال اپنا
مگر ایک ہم ہیں کہ غم دیکھتے ہیں	تو ہاتھوں کو اپنے قلم دیکھتے ہیں
کہاں تاب ہے غیر کو دیکھنے کی	بتوں کی گلی میں شب و روز آصفؔ
اگر دیکھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں	تماشہ خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

شرم کا دیوان ۱۸۹۰ء میں مطبع نامی لکھنؤ میں چھپ چکا ہے مگر اس میں یہ غزل نہیں ہے۔ یہ دونوں غزلیں دیوان جہاں مصنفہ بنی نرائن کے قلمی نسخہ سے ماخوذ ہیں جو لندن کے عجائب خانہ میں ہے۔ میر سوز۔ میر تقی میر۔ مصحفی۔ انشاء۔ جرات رنگین سب لکھنؤ میں جمع تھے۔

آصف الدولہ شعرا کے بہت قدردان تھے۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ مرزا فاخر مکین اور مرزا سودا کے جھگڑے میں لوگوں نے سودا کی توہین کی سعادت علی خان کو معلوم ہوا تو انہوں نے آصف الدولہ سے کہا والد مرحوم نے مرزا صاحب کو برادر مشفق و مہربان لکھ کے بڑی تمنا سے بلوایا تھا تو آصف الدولہ نے کہا کہ وہ میرے چچا ہیں اور انکی حمایت میں فوراً احکام جاری کئے انشاء نے مصحفی کا سوانگ نکالا اور ہجو کہی اس کی شکایت مصحفی نے کی اس پر انشاء شہر بدر کر دیے گئے۔

اس عزت افزائی اور قدر دانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں بھی جس طرح کا کوئی صاحب فن تھا اس نے لکھنؤ کا رخ کیا بقول لطف ایک ایک کمال کا ہزار ہا آدمی آموجود ہوا شعراء کا اتنا مجمع تھا کہ جسکی نظیر کہیں نہیں مل سکی مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:-

اس دور کی مہذب ترین سوسائٹی کے جتنے نامور افراد تھے سب لکھنؤ کے اندر جمع تھے دہلی کی سبھا وہاں سے اکھڑ کے لکھنؤ میں جم رہی تھی اور لکھنؤ میں ایسا جوش قدر دانی تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے گذشتہ لکھنؤ یہاں تک نوبت پہنچی کہ شاہی خاندان کے افراد بھی لکھنؤ

کر آباد ہونے لگے۔ مولف گل رعنا کا بیان ہے کہ :۔ پہلے مرزا جواں بخت شاہ عالم کے ولی عہد لکھنو آئے یہ کچھ دنوں رہ کے بنارس چلے گئے پھر ان کے بھائی مرزا سلیمان شکوہ آئے وہ یہیں رہ پڑے "۔

یہاں ان شعراء کے نام لکھے جاتے ہیں جو اس زمانہ میں دوسرے مقامات سے لکھنؤ آئے

دہلی سے میر محمد تقی میرؔ۔ اشرف علی خاں فغاںؔ۔ صلاح ... پاکباز۔ خواجہ حسین علی روشن شاہ مجنوں مجنوںؔ۔ محمد علی راحمؔ۔ میر حیدر علی حیرانؔ۔ میر ولی اللہ محبؔ۔ میر محمد حسین منشی۔ کاظم علی جوانؔ میر قدرت اللہ رخصتؔ۔ مرزا جعفر علی حسرتؔ۔ میر محمد یعقوب عیاش۔ نواب شمس الدولہ قسمتؔ مرزا قمر علی قمرؔ۔ شیخ عبدالرحیم رعناؔ۔ میر قمر الدین منتؔ۔ میاں عبدالرحیم زیباؔ۔ محمد علی شہرتؔ۔ محمد حیاتؔ بیتاب۔ مرزا اسمٰعیل تپشؔ۔ سعادت یار خاں رنگیںؔ۔ مرزا فاخر مکینؔ۔ محمد علی وہمؔ۔ خواجہ حسن حسنؔ حسن علی یاسؔ۔ میر غلام حسین برشتہؔ۔ مرزا اشرف الدین وفاؔ۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی۔ مرزا محمد حسن قتیل۔ انشاء اللہ خاں انشاءؔ۔ میر امان اسدؔ۔ میر شاہ علی خاں۔

بدایوں سے نواب محبت خاں محبتؔ۔

چاندپور سے قیام الدین قائمؔ۔

بلگرام سے امام علی صاحب قرآن مزاحیہ گو۔ نورتن لعلؔ حج کرکے آئی تو انھوں نے شعر کہا۔

جوبن کو نورتن کے یارو شتاب لوٹو　　آئی ہے حج یہ کرکے دوڑو و تو لوٹو

کشمیر سے سلام اللہ خاں تسلیمؔ اور علی نقی مخترؔ۔

ایران سے محمد خاں آگاہ۔ مرزا صفی الدین۔ مرزا اکبر علی۔ مرزا امامی و اعلیٰ ملا محمد ندیم روضہ خواں۔

لکھنوی شعراء — نواب امین الدولہ (عرف مرزا اینڈھو) امینؔ خلف نواب شجاع الدولہ نواب سیف علیخاں شگفتہؔ خلف نواب شجاع الدولہ میر محمد علی رضاؔ شاگرد ضیاء میر محمدی رضاؔ، میر مستحسن خلیقؔ۔ جلال فیض آبادی۔ نواب قمر الدین خاں قمرؔ۔ ... علی

خاں قنبر (نواب ناظر خواجہ سرا) عبدالرحمٰن احسن ۔ حافظ اشرف اشرف ۔ بھورے خاں آشفتہ ۔ سرفراز علی قادر ۔ معین الدین کرم ۔ نعیم بیگ نعیم ۔ محمد علیخاں اشیم ۔ محمد رضا شکوہ شاگرد قتیل) مرزا محمد رضا رضا (شاگرد سودا) محمد علیخاں ۔ مرزائی محمد ۔ ممتاز مرزا ابراہیم بیگ مقبول ۔

ہندو شعراء ۔ بچھمی نرائن دبیر ۔ موہن لال انیس ۔ سیتل داس مختار ۔ پنڈت جے گوپال لائق ۔ رائے چنی لال حریف ۔ منگلی لال وفا ۔ لال داس حریف مٹھن لال مائل گنگا پرشاد رند ۔ لالہ بھگوان دت برق ۔ روشن لال روشن

ان میں اگر شجاع الدولہ کے زمانہ کے شعراء کو شامل کر لیجئے تو ایک جم غفیر ہو جاتا ہے ۔ یہ شاعرانہ چہل پہل ہندوستان میں کہیں نہ تھی ۔ مصنف شعرالہند کا خیال ہے کہ اس زمانہ میں لکھنؤ کو لسانی مرکزیت حاصل ہو گئی تھی وہ لکھتے ہیں :۔

انھوں (آصف الدولہ) نے نہایت فراخ حوصلگی سے شعراء کی قدردانی کی اور ان کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کیں اس لئے اب بجائے دہلی کے لکھنؤ شاعری کا مرکز بن گیا عام طور پر منتخب اور برگزیدہ لوگوں نے لکھنؤ کا رخ کیا اس طرح یہ مرکزیت جو ان کو حاصل تھی وہ لکھنؤ کو حاصل ہو گئی ۔ شعرالہند صلہ مگر یہ مرکزیت دلی والوں سے پیدا ہوئی تھی علی نقی محشر کے اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت اہل لکھنؤ کو دہلی والوں سے برابری کا خیال پیدا ہو گیا تھا ؎

گفتگو اردو زباں کی کوئی ہم سے سیکھ جائے ؎ کیا ہوا دلی میں محشر اپنی پیدائش نہیں

مگر یہ مقطع کی سخن گسترانہ بات سے زیادہ نہ تھی ۔ اس وقت زبان و شاعری کے مالک وہی لوگ تھے جو دہلی سے آئے تھے ۔ فارسی شاعری کا بھی اچھا خاصہ چرچا تھا فضیل مرزا فاخر مکین، میر شمس الدین فقیر، میر قمر الدین منت، میر تقی میر ایسے فارسی

فارسی شعراء موجود تھے۔ آصف الدولہ خود فارسی کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے ان کا فارسی کلام ان کے دیوان میں موجود ہے۔

موسیقی | رقص و سرود میں سارا شہر ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی گلی اُن سے خالی نہ تھی پانچسو گانے والیاں صرف آصف الدولہ کے محل میں تھیں جن میں مصری، سمندر، بخشی گنار ادھا، باؤلی، منھو رام جنی، رام کلی سرستی، ہیرا۔ نواب جان۔ خورشید جان مہتاب جان نے وہ کمال دکھایا کہ تاریخ میں انکا نام آگیا۔

کریم بخش نواب علی وفا محمد نے طبلہ اور چھمن خاں نے ستار بجانے میں نام پیدا کیا راجہ مہرا نے کہاروں کے ناچ کو اتنی ترقی دی کہ وہ دربار کے قابل ہوگیا۔ ہیرالال عرف ہیرا کتھک نے ایسا ناچ دکھایا کہ کتھک ناچ مقبول ہوگیا۔ رؤسا میں سالار جنگ اور علماء میں تفضل حسین علامہ نے موسیقی میں ایسا کمال پیدا کیا کہ بڑے بڑے گویوں نے ان کے آگے کان پکڑ لیا ۔ معارف النغمات الآصفیہ فن موسیقی میں بے مثل کتاب لکھی گئی۔

بھانڈ | سیما نور ادولھا اور کریلا بھانڈ نے اپنے فن میں شہرت حاصل کی۔

خطاطی | کو بڑا عروج ہوا حافظ نوراللہ اور قاضی نعمت اللہ لاہور سے آئے! در قدردانی سے سرفراز ہوئے۔ حافظ نوراللہ دفتر میں افسر مقرر ہوئے اور قاضی نعمت اللہ کو اتالیقی ملی ان دونوں نے خطاطی میں وہ کمال دکھایا کہ لوگ اساتذہ سلف کو بھول گئے ان کی وصلیاں ایک ایک اشرفی کو بکتی تھیں مشقی وصلیاں ایک روپیہ فی حرف کے حساب سے لوگ خریدتے تھے

حافظ نوراللہ کے بعد ان کے بیٹے حافظ ابراہیم نے ایسا کمال دکھایا کہ آج تک مسجد آصفی اور اس کے کنوئیں کی جگت کے کتبے ماہرین فن کو حیران کردیتے ہیں۔

حافظ ابراہیم خطاطی کے موجد ہوئے انھوں نے دائروں میں بیضاویت پیدا کی جس سے لکھنؤ کی خطاطی کا خاص طرز ہوگیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے حافظ سعدالدین ان کے شاگرد میاں وجہ اللہ محمد عباس، منشی عبدالحمید نے نام پیدا کیا

منشی ہادی علی، پنڈت منسارام، منشی شمس الدین اعجاز رقم، منشی حامد علی مشہور شاعر میر سوز، راجہ اننّدرام مخلص۔ مولوی محمد اشرف اشرف۔ مولوی قل احمد۔ مرزا خیراللہ فرمان نویس کتابت خان، میر سید علیخاں۔ حاجی قاسم۔ حافظ محمد خورشید۔ محمد نصیرالدین۔

محمد ثناء اللہ، میاں محمد ثنا، رائے سرب سنگھ دیوانہ، مرزا خیراللہ کے شاگرد نعمت اللہ، خلیفہ بخش اللہ میر نثار علی مشہور خطاط تھے

خط شکستہ میں مرزا احمد طباطبائی اور تفضل حسین خاں علامہ بھی یگانہ عصر تھے۔ منشی عبدالستار میر احمد حسین، شیخ عبدالرحیم، سرب سکھ لال کو نسخ و نستعلیق، دونوں میں کمال حاصل، مولوی محمد رشید نے خط گلزار و خط شفیعہ و غبار میں چنے کی دال پر سورہ قل ہو اللہ مع بسم اللہ کے بخط واضح لکھ کے لوگوں کو حیران کر دیا۔ مولوی ہادی حسن نے طغری نویسی میں شہرت حاصل کی

میر بندہ علی مرتعش نے پیڑی حلوہ سوہن اور اسکی ٹکیوں پر طغری بنانے میں وہ جدت دکھائی کہ لوگ دنگ رہ گئے

سپہ گری

فن سپاہ گری میں نجم الدین خاں، لنگر باز خاں نے لکڑی کے فن میں استادی کے جوہر دکھائے۔ میر بہادر علی، میر عطا حسین، میر افضل علی، غلام رسول خاں کا لڑکا، گوری پٹے باز میر ولایت علی، فتح یاب خاں اور ولی محمد خاں نے بانک کے فن میں کمال دکھایا فیض بخش باکمال تیر انداز تھے۔

طب یونانی

طب یونانی میں حکیم مرزا محمد علی حکیم سید محمد مرتعش، حکیم بناو غیرہ نے اس فن کو پھیلایا اور اپنی مسیحائی کا لوہا منوایا۔ مصحفی نے تذکرہ ہندی گریاں مرزا کاظم بیگ مبتلا نے تذکرہ گلشن سخن لکھا، سودا نے تذکرہ شعراء لکھا جو مفقود ہے میر نے تذکرہ شعراء مرزا علی لطف نے شعراء کا تذکرہ گلشن ہند لکھا اور میر حسن نے تذکرہ شعراء اور اپنی شہرۂ آفاق مثنوی لکھی۔

درسگاہیں علوم عربیہ کی اتنی درسگاہیں قائم ہوئیں کہ دنیا کے کسی شہر میں نہ تھیں ان کی شہرت
دور دور تک پہنچی اور کابل و کشمیر تک سے طالب علم آئے

بہت سے حدیث خواں ایران سے آئے اور اختلاف طرز سے ان کی مختلف قسمیں
ہوگئیں، حدیث خواں، نثر خواں، واقعہ خواں، روضہ خواں، مگر اس وقت شاعری کا زور
تھا ان چیزوں کو اتنی مقبولیت نہ ہوئی سوز خوانی اور مرثیہ خوانی کو ترقی ہوئی۔

ہندوستان کا ذوق شعری شباب پر تھا ان دونوں چیزوں کا یکجا ہونا
ایسا نہ تھا کہ مرثیہ اپنی پرانی حالت پر باقی رہتا، میر و سودا ایسے استادانِ فن مرثیہ
کہنے لگے، گدا، مسکین، حزیں، غمگین، محمد تقی ناز، نعیم، عاجز، محب، مجنون،
اللہ، صوفی، ایسے بہت سے مرثیہ گو پیدا ہوئے بہتوں نے اسے اپنا خاص فن بنایا، میاں
سکندر نے اس میں ایک نئی روح پھونکی اور اب "بگڑا شاعر مرثیہ گو" نہیں رہا۔

لکھنؤ کا تمدن | شجاع الدولہ کی جنگی تیاریوں اور سپاہیوں کی کثرت نے عام طور
پر لوگوں میں اکڑ تکڑ اور بانکپن پیدا کیا۔ سپاہیانہ وضع عام ہوئی گوٹا پٹھا جو دہلی
میں مرد بھی کپڑوں میں ٹانکتے تھے متروک ہوا اس کے بجائے، قرابین، تپنچہ، ڈھال تلوار
کٹار وضع میں داخل ہوئی اور سپہ گری کا فن عام ہوگیا۔ شعر و شاعری اور رقص و
سرود کا ہر شخص شائق تھا۔ علماء اور اطباء کی قدر و منزلت تھی۔ بڑے بڑے عہدے
ان کو دیئے جاتے تھے۔ خاندانی شرافت ایک جوہر سمجھی جاتی تھی۔ ادب و تعظیم کا لحاظ
تھا، پست طبقہ کے لوگ، شرفاء سے بڑی تعظیم کے ساتھ پیش آتے۔ طوائفوں سے
دلبستگی عام تھی، رؤسا کے دربار میں ان کی حاضری نے انھیں تہذیب کا معیاری نمونہ
بنادیا۔ اس معاشرے میں چھچھوراپن، بازاریت اور اوباشانہ انداز نہیں پیدا ہونے
پائے۔ اطمینان اور بے فکری نے رؤسا، شعراء، علماء، سپاہی، داستان گو

متنوع، دستکار، نقال اور میفروشان حال کا جمگھٹا لگا دیا۔ اس اجتماع رنگ رنگ سے ایک خاص معاشرہ پیدا ہو گیا۔ ہر رئیس کی سرکار سے، طبیب، شاعر، شہسوار سپاہی، داستان گو، اور ارباب نشاط کا وابستہ ہونا ضروری تھا، اور رئیس فقط تماشائی نہ تھا، خود بھی شاعر، سپاہی، شہسوار اور عاشق جانباز تھا امرد پرستی عیب تھی، خوش پوشاکی اور خوش خوراکی عام تھی۔ بانکپن کے ساتھ تواضع فروتنی اور عاشقی کے ساتھ تمکنت و وقار کا دلکش امتزاج تھا۔ اہلبیت سے عقیدت اور مودت ان کے فضائل و مصائب کا بیان بہترین کارِ خیر تھا۔ اس کا اثر زبان و شاعری پر یہ ہوا کہ تصوف غزل سے خارج ہو گیا۔ منقبت کے اشعار غزل میں بھی کہے جانے لگے عاشق مزاجی سے میر و سودا کی آہ و زاری اور دنیا سے بیزاری کم ہو گئی، معشوق کی بانکی ادائیں ان کا بھی دل کھینچنے لگیں سے

اے نکیلے یہ تھی کہاں کی ادا | کھب گئی جی میں تیری بانکی ادا | میر
آنکھیں ملا کبھو تو کب تک کیا کروں میں | دنبالہ گردی تیری اے آہوئے رمیدہ | ،،
سب مزے درکنار عالم کے | یار جب ہمکنار ہوتا ہے | ،،
نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے | پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں | ساری مستی شراب کی سی ہے
کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا | ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
جو غنچہ تو چمن میں بند قبا کو کھولے | پھر گل سے اے پیارے بلبل کبھی نہ بولے

بھونڈی لفظیں اور بھدی ترکیبیں، محسوس ہونے لگیں۔ سجن۔ سریجن۔ موہن۔ پی۔ پیتم۔ پیا۔ پریتم۔ (معشوق) درپن (آئینہ) سیتی (سے) کدھیں

متروک ہوگیا۔ ان اصلاحوں کو دہلی والوں نے بھی قبول کیا۔ کیونکہ اصلاح کرنے والے دہلوی تھے۔ اس طرح دہلی میں لکھنؤ کی اصلاحوں کو قبول کرنے کی بنیاد پڑی۔

شیعیت کی تجدید آصف الدولہ کے دور میں شیعیت کی تجدید ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ جس نے شیعوں کی مذہبی زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اگرچہ اس میں آصف الدولہ کی سعی کو کچھ دخل نہیں۔ مگر ان کے عہد کا واقعہ ہے جو مولانا دلدار علی غفرانمآب کی سعی پیہم اور نواب حسن رضا خاں کی سرپرستی سے وجود میں آیا۔ مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے غفرانمآب کی کوششوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے مگر نواب حسن رضا خاں کو نظر انداز کر دیا ہے یہ بڑی حق تلفی کی بات ہے۔ اس کو بھی تفصیل سے بیان کرنا تاریخی دیانت کے لحاظ سے ضروری تھا۔ اس کمی کو میں نے پورا کر دیا ہے۔

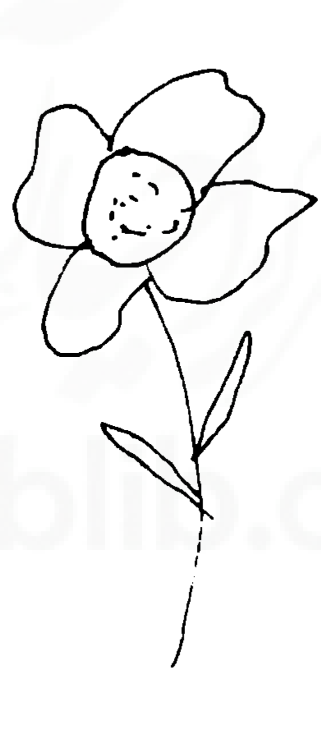

سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خان بہادر

MAAB 1431
maablib.org

جعفر انساب حجت حق آیۃ اللہ . محمد لکھنوی
مہر شرف مجدد اسلام دین پناہ
ندید چشم فلک مثل آن مجدد دین
کر شاہد اند بفضل و بنمودہ گشتہ اعداء

سید ملدار علی بن سید محمد معین بن سید عبد الہادی بن سید ابراہیم بن سید طالب بن سید مصطفیٰ بن سید محمود بن سید ابراہیم بن سید
جلال الدین بن سید زکریا بن سید جعفر بن سید تاج الدین بن سید نصیر الدین بن سید علم الدین بن سید علیم الدین بن سید شرف الدین
بن سید نجم الدین فاتح جائس بن سید علی بن سید ابو علی بن سید ابو یعلی محمد الاکمل الفخار بن سید حمزہ مکی معروف بابو طالب بن محمد بن سید
طاہر بن سید جعفر تواب بن امام علی نقی علیہ السلام

تیرہویں صدی ہجری

عہد آصف الدولہ میں شیعیت کی تجدید

مولانا دلدار علی غفرانمآب

اور

سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں

ہندوستان میں مغلوں سے پہلے شیعہ اپنے کو ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ کے زمانہ میں کچھ رافضی اور ان کی کتابیں پکڑی گئیں، کتابیں سر بازار جلادی گئیں اور رافضیوں کو اس جگہ پہنچا دیا گیا جو ان کے لئے مقدر تھی۔ نقوی سادات کا ایک خاندان محمود غزنوی کے وقت سے جانس میں آباد تھا جو تلولی، سمرن گڈھ سیواڑہ، رسالپور شیاک پورا وراپٹھی ہندو ریاستوں کے بیچ میں تھا یہ ریاستیں اس وقت حکومت دہلی سے آزاد اور خود مختار تھیں اس وجہ سے جائس کے سادات محفوظ رہے۔

مغل حکومت اور شیعہ بابر کے ساتھ شیعہ ہندوستان میں آئے اور امراء کی صف میں داخل ہوئے، پھر انکی آمد کا سلسلہ جاری ہوگیا اور ان کی تعداد بڑھتی رہی، مگر بحیثیت جماعت ان کا کوئی وجود نہ تھا وہ اہل سنت کے ساتھ شادی بیاہ کرتے تھے اور انکے تمام مذہبی رسم بجالاتے تھے کیونکہ کوئی شیعہ عالم نہ تھا نکاح، طلاق، نماز، روزہ، دفن وکفن سب اہل سنت کے طریقہ پر انھیں کے ہاتھوں سے انجام پاتا تھا۔ پیری، مریدی، عرس، قوالی، چادر، گاگر، شیخ سدو کا بکرا، میراں جی کے گلگلے، احمد کبیر کی گائے سید سالار کا جھنڈا، مدار صاحب کی کندوری، بڑے پیر کا فاتحہ اہل سنت میں عام تھی، شیعہ بھی اس میں انکے برابر کے شریک ہو گئے ان حالات میں باہر سے آنے والے شیعہ تو شیعہ رہے مگر ان کی اولاد رفتہ رفتہ اپنے مذہب سے بے خبر اور عام مسلمانوں میں جذب ہوتی چلی گئی

سفر کی دشواری اور رسل و رسائل کے فقدان نے عراق سے کوئی ربط قائم نہ ہونے دیا
ایران سے صرف ادبی رشتہ تھا اور شیعیت کا ایک دھندلا سا نقش پڑھے لکھے لوگوں
کے دماغ میں رہ گیا تھا شیعہ عوام کو اتنا شعور بھی نہ تھا اس پر طرہ یہ ہوا کہ کچھ لوگ
خوف، کچھ موت سے کچھ قرابت داری، کچھ اپنی قلتِ تعداد کو محسوس کرکے اپنے مذہب
سے بے اعتنائی برتنے لگے اور کچھ جان بوجھ کے چھپانے لگے۔ تذکرہ بے بہا فی تاریخ العلماء
میں مولانا محمد حسین صاحب نوگانوی نے لکھا ہے کہ قاضی نوراللہ شوستری زندگی بھر
اپنے مذہب کو چھپاتے رہے، اس طرح ایسی فضا پیدا ہوگئی کہ خاندان کے خاندان
سنی ہوتے چلے گئے۔ جب شیعوں کی آزاد ریاستیں قائم ہوگئیں تو ان میں یہی حالت
رہی کیونکہ کوئی شیعہ عالم نہ تھا علمائے اہل سنت ہی مفتی و قاضی اور امام جمعہ و جماعت
تھے سنیوں اور شیعوں کے تمام مذہبی امور انھیں کے ہاتھوں انجام پاتے تھے، صرف
اودھ کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ فیض آباد میں مولانا رجب علی اور جونپور میں ملا نا
سید عسکری صاحب شیعہ عالم تھے، پانچ سنی عالم اپنی ذاتی تحقیق سے شیعہ ہو
گئے۔ ملا حمداللہ۔ علی اکبر چشتی مودودی، تفضل حسین خاں علامہ، اور مولوی
شمس الدین فقیر۔ میر قمرالدین منت

ملا حمداللہ منطقی آدمی تھے شیعہ ہونے کے بعد انھوں نے علامہ بہائی
کی زبدۃ الاصول کی شرح لکھی

مولانا اکبر علی چشتی مودودی نے خرقہ خلافت اتار دیا اور پیری مریدی
چھوڑ دی۔

تفضل حسین خاں علامہ فلسفی تھے انھوں نے فلسفہ میں کتابیں لکھیں
سفارت تک پہنچنے کے بعد بھی وہ درس دیا کرتے تھے۔ وہ معقولات کے ساتھ اہلبیت

کو سنی فقہ اور شیعوں کو شیعہ فقہ بھی پڑھاتے تھے۔ میر شمس اللہ بن غفیر اور میر قمر الدین منت ادیب تھے ان لوگوں کی شیعیت کا اثر ان کے گھر سے باہر نہیں نکلا۔ لکھنؤ میں شیعیت کا اثر صرف اتنا تھا کہ یہاں کے پہلے فرمانروا برہان الملک نے محرم میں مجلس قائم کی جس میں مرثیہ پڑھا جاتا تھا مگر صرف دس دن باقی دنوں میں مذہبی رواسم وہی صوفیا کی نذر و نیاز تھے برہان الملک کے جانشین صفدر جنگ کے زمانہ میں عزاداری کو کوئی ترقی نہیں ہوئی کیونکہ وہ زیادہ تر دہلی میں رہے۔ شجاع الدولہ کو عزاداری سے بہت عقیدت تھی وہ محرم کے دس دن بڑی دھوم سے عزاداری کرتے تھے اودھ میں صرف جائس و نصیرآباد ایسا خطہ تھا جہاں شیعہ سادات بہت دن سے آباد تھے ان میں علماء و فضلاء بھی پیدا ہوتے رہے یہ لوگ اپنے مذہب سے باخبر تھے اورنگزیب کے زمانہ سے ان کو قضا اور معلمی کے عہدے بھی ملتے رہے۔ غفرانمآب کے بزرگوں میں سید عبدالقادر اورنگزیب کے بڑے بیٹے کے استاد تھے جن کی تعلیم سے وہ شیعہ ہوئے اور بہادر شاہ بننے کے بعد انھوں نے اپنی شیعیت کا اعلان کر دیا جس پر ہنگامہ برپا ہوا تفصیلات تاریخ میں موجود ہیں۔ آخر زمانہ میں ملا نعمت اللہ ملا عصمت اللہ قاضی قربان علی اور قاضی عادل حسین یہاں کے مشہور عالم تھے۔ اپنی سیادت کو محفوظ رکھنے کے لئے آپس ہی میں شادی بیاہ کرتے تھے سنی وہ سب کرتے تھے جو ہندوستان میں ہوتا تھا۔ شیعوں میں صوفیوں کی نذر و نیاز جائز نہیں ہوتی تھی۔ اس خطہ کے علاوہ سارے ہندوستان میں شیعیت کی زبوں حالی حساس دلوں کو پکارتی تھی مگر کوئی لبیک کہنے والا نہ تھا اسی سادات نصیرآباد کے فرزند رشید دلدار علی ۱۱۶۶ھ کو شب جمعہ نصیرآباد میں پیدا ہوئے۔ قدرت نے ان کو حساس دل، دقیق نظر، انقلابی ذہن، آہنی عزم اور برتاثیر زبان عطا کی تھی، وہ بچپنے سے بردبار سنجیدہ اور غور و فکر کے عادی تھے اور

شیعیت کی اس زبوں حالی پر غور کرتے رہتے تھے۔ دیہات کی زندگی، کھیتی باڑی کا مشغلہ تھا۔ اور معمولی تعلیم تھی۔ تاریخ وسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک دن وہ اپنے کھیتوں کے قریب، درخت کے نیچے کھڑے تھے، کہ ایک روشنی پیدا ہوئی اور آواز آئی "دلدار علی! جا اور علم دین حاصل کر" حقیقت میں یہ ان کے دل کی آواز تھی جسے وہ سوتے جاگتے سنا کرتے تھے۔

گھر بار چھوڑ کے نکل کھڑے ہوئے اور ہندوستان کے مشہور علماء سے فلسفہ، منطق، ہیئت، اور ریاضی میں وہ تبحر پیدا کیا کہ علامہ "عبدالحیٔ فرنگی محلی" جو اپنے وقت کے مشہور فلسفی تھے، ان کا یہ قول ا نکے شاگرد سید مرتضیٰ فلسفی نے "معراج العقول" میں لکھا ہے کہ جب میں جناب غفرانمآب کے حاشیۂ صدرا کو دیکھتا ہوں تو متاخرین فلاسفہ پر ان کو ترجیح دیتا ہوں۔

ان کے بیٹے سلطان العلماء سید محمد صاحبؒ کی مشہور کتاب بوارق موبقہ سے انکشاف ہوا کہ جناب غفرانمآبؒ نے تکمیل علوم کے بعد ہندوستان کی سیاحت بھی کی اور مشہور علماء سے مباحثے بھی کئے شاہ جہاں پور کی مسجد میں ملا "عبدالعلی فرنگی محلی" سے ملاقات ہوئی انھوں نے اپنی کتاب شرح سلم میں ملا حمداللہ پر جو اعتراض کئے تھے ان کا جواب غفرانمآب نے دیا تو وہ کوئی شافی جواب نہ دے سکے۔ دہلی کی جامع مسجد میں ملا حسن سے مسئلہ الجزاء و تر پر بحث ہوئی تو ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ علم میں یہ درجہ حاصل کرنے کے بعد وہ لکھنؤ آئے، اس وقت آصف الدولہ حکمران اور حسن رضا خاں سرفراز الدولہ وزیر اعظم تھے، ان کے بیٹوں کے استاد سے غفرانمآب نے ربط پیدا کیا پھر انھیں کے ذریعہ سے وزیر اعظم سے ملے اور اُن سے کہا کہ شیعہ ریاست میں عیدین اور جمعہ کی نمازیں اہلسنت پڑھاتے ہیں، سنی علماء مفتی اور قاضی ہیں

نکاح، طلاق، دفن کفن شیعوں کا بھی سُنی طریقہ سے ہوتا ہے۔ پیری مریدی، عرس، قوالی اور صوفیوں کی نذر و نیاز شیعوں نے اختیار کرلی ہے اور اپنے مذہب سے بے خبر ہوگئے ہیں۔ صرف تعزیہ داری جانتے ہیں، وہ بھی اصلاح طلب ہے۔ ان میں تبلیغ کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے مذہب سے واقف ہوں۔ لوگوں کو دینی تعلیم کی طرف راغب کیا جائے۔ فقہ و اصول، اور کلام و مناظرہ کی کتابیں پڑھائی جائیں اور علماء مبلغین پیدا کئے جائیں، حسن رضا خاں دین دار آدمی تھے انھوں نے کہا آپ یہ امور انجام دیں میں آپ کے لیے سہولتیں پیدا کردوں گا۔ انھوں نے کہا کہ میں علوم دینیہ سے معمولی واقفیت رکھتا ہوں، فقہ و اصول کا درس نہیں دے سکتا جب تک خود علوم دینیہ حاصل نہ کرلوں۔ طے یہ پایا کہ نجف اشرف جا کے علم دین حاصل کریں۔ نواب نے پانچ ہزار روپے ان کو دیئے اور ہندوستان کا یہ فلسفی علم دین حاصل کرنے کے لئے باب مدینہ علم کی طرف روانہ ہوا۔ بمبئی پہنچ کے بادبانی جہاز میں بیٹھے، مشہور ہے کہ پندرہ دن کی مسافت طے کی تھی کہ باد مخالف کا طوفان اس زور سے آیا کہ ناخدا بادبان لپیٹ نہ سکا، مخالف ہوا پھری اور تیسرے دن ساحل بمبئی پر لا کھڑا کیا۔ مگر دلیرانہ ہمت اور جواں مردانہ عزم کف بر وہاں سمندر کو للکار کے پھر اس کے سینہ پر سوار ہوگیا۔ اب کی سمندر مغلوب، اور بیڑا پار تھا۔ نجف اشرف پہنچ کے علامہ سید مہدی طباطبائی اور آغا باقر بہبہانی کے درس میں شرکت کی، اور پانچ برس میں فقہ و اصول کا دورہ مکمل کیا۔ اس وقت نجف اشرف کی یہ خصوصیت مشہور تھی خبز الشعیر لحم البعیر زیارت امیر جو کی روٹی اونٹ کا گوشت اور امیر المومنینؑ کی زیارت

اونٹ کا گوشت تو کبھی کبھی ملتا ہوگا نمک اور رطب سے روٹی کھائی جاتی

تھی، چار پانچ روپیہ ماہانہ کا خرچ تھا کپڑے وغیرہ ملا کے زیادہ سے زیادہ دس روپیہ ماہوار کا صرف ہوتا ہوگا، ان کے پاس ایک ہزار روپیہ سال کے حساب سے روپیہ تھا، جس سے وہ دینی کتابیں خریدتے تھے ان کا مطالعہ کرتے تھے اور اپنے کو تبلیغ کے لیئے تیار کرتے تھے ان کی دلی تمنا تھی کہ انکی تبلیغ کا سلسلہ قیامت تک باقی رہے۔ اس کے ساتھ وہ انسان کی عمر طبعی کی حد بھی جانتے تھے تو دعا کرتے تھے کہ خداوندا میری اولاد میں قیامت تک علم دین باقی رہے۔ اس کا یہ پرلطف واقعہ علامہ کنتوری نے لکھا ہے۔

میرے ایک بزرگ رسول پور کے جناب غفرانمآب کے ہم سفر تھے۔ نجف میں شب قدر کے اعمال کئے، اور ان کو بھی شریک کیا اور فرمایا کہ جب ایک عمود نور قبہ مبارکہ سے آسمان تک نظر آئے تو وہی استجابت دعا کا وقت ہے، جب وہ وقت آیا تو جناب غفرانمآب نے دعا کی. خداوندا بحق صاحب قبر میری اولاد سے قیامت تک علم دین نہ جائے۔ سید صاحب نے دعا کی کہ خداوندا "رسول پور" کی بارہ بٹی میں سوا میرے اور کوئی میرا شریک نہ ہو جناب غفرانمآب نے ان کو ایک دوہتر مار کر کہا اے کمبخت یہ کیا دعا کی سید صاحب نے کہا، تم زمینداری کا مزا کیا جانو ملا آدمی لڑکے پڑھانے کا تم کو مزہ ہے زمینداری کو کیا جانو اس کی جڑ پتال میں ہوتی ہے جیسے دوب کی جڑ (تاریخ العلماء صفحہ ۱۵) جب درجۂ اجتہاد پر فائز ہو گئے تو اپنی کتابوں کا بستارہ لے کے ایران آئے اور کچھ دن قم میں قیام کیا۔ وہاں بھی بہت سی کتابیں خریدیں پھر سندھ کے راستے ہندوستان پہنچے۔ نواب نے ہاتھوں ہاتھ لیا ایک لاکھ کی کتابیں مختلف مذاہب کی دو دفعہ منگوا کے دیں اور وہ سیاسی توڑ جوڑ سے اپنے کو علیحدہ کر کے صرف ایک مقصد کو سامنے رکھ کے بیک وقت تصنیف و تالیف

درس و تدریس اور تبلیغ میں مشغول ہو گئے۔

تصنیف و تالیف تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھا تو سب سے پہلے عماد الاسلام کی پہلی جلد الٰہیات سے شروع کی جس میں حکمائے یونان، فلاسفۂ ہندوستان اور علمائے اُمت کے اقوال کے رد و ابطال میں جو معرکے دکھلائے ہیں اس نے علمائے سابقین و لاحقین کے کارنامے محو کر دیئے

علّامہ عبدالحسین صاحب استاد فلسفہ (جامعہ سلطانیہ) اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

یہ ایک ایسی جامع اور حاوی کتاب ہے جس کی نظیر مذہب امامیہ کے کتب خانہ بلکہ اسلامی کتب خانہ میں ناپید ہے۔ اس کی تعریف کے لئے میدان قلم کوتاہ اور جولانیٔ دماغ ناکافی ہے اس میں ایسے مطالب عالیہ بیان کئے گئے ہیں جن کا سمجھنا خالی از اشکال نہیں چہ جائیکہ ان کی توضیح و تقریر کرنا۔ مرحوم اعلی اللہ درجتہ نے یہ کتاب نہیں لکھی بلکہ درسگاہِ تحقیق اور بزمِ قدس منعقد کی ہے۔ جس میں تمام علماء، حکماء، اور متکلمین اسلام کو مدعو کر لیا ہے۔ اس میں اگر ایک طرف افلاطون الٰہی مع اپنی تحقیقات کے۔ ارسطو مع اپنی آراء کے جلوہ افروز ہے۔ تو دوسری طرف ابوالنصر فارابی، شیخ الرئیس ابو علی بن سینا مع شفاء و اشارات کے زیب دہِ انجمن ہیں۔ ایک طرف اگر بہمن یار مع تجرید کے، میر باقر داماد مع اپنی تصنیفات کے زینت افزائے بزم ہیں تو دوسری طرف علامہ حلّی مع نہایت المرام" کے قوشجی مع شرح تجرید کے شیخ

مفید مع مقالات کے، سید مرتضیٰ علیہ الرحمۃ مع شافی کے سید علی بن طاؤس مع طرائف کے، رونق افزائے محفل ہیں وسط میں اشاعرہ اور معتزلہ کا گروہ مع اپنے تلامذہ اور اتباع کے جن میں جاحظ نظام، ابوالہذیل علاف بلخی وغیرہ وغیرہ موجود ہیں۔ ایک گوشہ میں ملّا صدرالدین شیرازی مع اسفار اور شارح مواقف مع اپنی تصنیفات کے تشریف فرما ہیں، دوسرے گوشہ میں شہید ثالث قاضی نوراللہ شوستری اور علامہ فضل بن روزبہان مع احقاق الحق اور ابطال الباطل کے حاضر ہیں۔

صدر نشین بزم قدس جناب غفران مآب علیہ الرحمۃ ہیں، آپ کے ہاتھوں میں عنانِ کمیت قلم ہے۔ اور وہ اس کو میدان تحقیق میں جولاں کر رہے ہیں آپکی تحقیق اتنی کامل، آپ کی نظر اتنی وسیع ہے کہ آپکے فیصلہ کو تمام علماء مانتے ہوئے ہیں، آپ پر مجال نہیں کہ کوئی اعتراض کرسکے اور آپ کی تحقیق کو رد کرسکے۔ رسالہ مبلغ غفراں مآب نمبر

عراق کے مشہور عالم شیخ الفقہاء شیخ محمد حسن نجفی صاحب جواہر الکلام میں لکھتے ہیں۔

مراۃ العقول (الملقب بعماد الاسلام) جس کے مصنف ہیں۔ اسلام کے رکن اعظم اور خلق خدا پر خدا کی حجت جنھوں نے عقول کو اپنی موشگافیوں سے حیران کردیا اور عقلی شبہوں کو اپنی فکر و نظر کے ستاروں سے روشن کردیا۔ جن کے انواع علوم کی حدیں معین کرنے کے اجناس و فصول قاصر ہیں، اور جنھوں نے تحریر کی مشکل شکلوں کو اپنے بیان کے منطوق کے ذریعہ سے واضح کیا تمام خلق خدا کے مرکز اور عقول عشرہ[1] کے مدمقابل گیارہویں عقل"

---

[1] فلاسفۂ یونان قائل ہیں کہ اللہ کی مخلوق بلا واسطہ عقل اوّل ہے اور عقل اوّل نے عقل ثانی کو پیدا کیا اور عقلِ ثانی نے عقل ثالث کو یونہی دس عقول تک سلسلہ پہنچا اور نو فلک پیدا ہوئے پھر انھیں عقول و افلاک کی حرکت سے تمام کائنات وجود میں آئی۔ ۱۲ [2] نظر محمود کی متعین محی عباس صاحب

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں :۔

بلند مرتبہ علّامہ خدا کی بولتی ہوئی کتاب' جن کی ذات پر اجتہاد ختم ہو گیا.... خدا کی سب سے بڑی آیت اوّلین و آخرین کے اندر" ظل ممدود

علامہ شیخ احمد یمنی شیروانی لکھتے ہیں:

آپکی مہارت علم اصول میں جعفری۔ آپکا احاطہ فروع میں محقق آپکی درایت فہم حدیث میں ذرہ آپکی تحریر تقریر حقائق کی پردہ دار اور دقیق نکتوں کو واضح کرنے والی ہے۔ کون آپ کی ہمسری کر سکتا ہے۔ اگر علامہ حلّی ہوتے تو آپ کی اقتدا کرتے اگر مجلسیؒ اور مفیدؒ آپ کے مفید مجالس درس میں حاضر ہوتے تو بحارُ الانوار کو آپ کے دریائے علم کے پہلو میں حقیر سمجھتے۔ اللہ اکبر کس قدر علوم وفنون میں آپ کا حصّہ بلند اور مقام رفیع ہے"۔ ظل ممدود مرتبہ جناب مفتی میر عباس صاحبؒ

مولانا اعجاز حسین صاحب برادر مولانا حامد حسین صاحب مرحوم شذور العقیان فی تراجم الاعیان میں اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ انھوں نے تلمذ حاصل کیا خدا کی اس نشانی سے جو تمام عالموں کا رب ہے۔ وہ ایسے بزرگ ہیں جنھوں نے مملکت ہندوستان میں دین کو زندہ کیا اور بدعت وجاہلیت کے آثار کو محو (باطل) کیا۔ یعنی مولانا سید دلدار علی نصیرآبادی (منقول از حیات فردوس مکاں) حقیقت میں خدا کو ان سے جو اہم کام لینا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ ان کا علم، ان کا عزم، ان کی ہمت اور ان کی سیرت ائمہ اہلبیتؑ کا پرتو ہو۔ یہی اوصاف ان کے علمی کارنامے کی جان ہیں۔ اگر ان کا علم' ان کی بلند نظر' ان کی تعمق فکر فوق البشر نہ ہوتی تو ہندوستان کی شیعیت کی تاریخ کچھ اور ہوتی ان کی بلند نظر ہر خامی کو دیکھتی تھی خواہ وہ کہیں ہو۔

وہ عراق جاکر وہاں کے علمائے مرعوب نہیں ہوئے اور وہاں سے واپس آئے تو ان کی نقل نہیں اتاری۔ بلکہ

ہندوستان میں اُن طریقوں سے شیعیت کی ترویج کی جو یہاں کے حالات کے لحاظ سے مناسب تھے۔

ہندوستان میں شیعوں کی پہلی نماز جماعت

آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ شیعوں کی نماز جماعت ہندوستان میں کہیں نہیں ہوتی تھی اور ایک نئی بات کی ابتداء کرنے کی نہ کسی کو جرأت تھی اور نہ کوئی نماز پڑھانے والا میسّر تھا۔ پڑھے لکھے شیعہ عموماً اخباری تھے جن کے نزدیک جمعہ و جماعت درست نہیں۔ اس طرح شیعوں کی الگ کوئی اجتماعی زندگی نہ تھی اور بحیثیت شیعہ ایک قوم ہونے کا کوئی تصور کسی کے دماغ میں نہ تھا بلکہ عام طور پر لوگ اس کے اظہار سے کتراتے تھے جس کے نتائج کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

شیعہ قومیت کی تشکیل

اس وقت ضرورت اس کی تھی کہ شیعوں کے مذہبی عقائد انھیں بتائے جائیں ان کی نماز، ان کے مذہبی رواسم الگ قائم ہوں اور ان میں اتنی جرأت پیدا کی جائے کہ وہ بحیثیت شیعہ ایک اجتماعی زندگی اختیار کر کے ایک قوم بن جائیں اس کے لئے جناب غفراں مآب نے نواب حسن رضا خاں کو آمادہ کیا کہ شیعوں کی نماز جماعت شروع ہو نواب کے گھر میں ملا محمد علی فیض آبادی اور شیخ اکبر علی چشتی مودودی نے غفراں مآب کی اقتداء میں چند مخصوصین کے ساتھ نماز پڑھی۔ یہ ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ کی مبارک تاریخ تھی۔ قدسی جائسی کا شعر ہے ؎

شیعیان ہند کی پہلی جماعت کی نماز جس سے عہد آصف الدولہ کو ہے خاص امتیاز

نماز جمعہ کی ابتداء

اس کے بعد انھوں نے بڑی جرأت سے کام لیا اور مذہب میں گویا نئی بات کی ابتدا کی یعنی ۲۷ رجب کو جمعہ کی نماز قائم کی جو عراق و ایران میں ترک ہو گئی تھی اس کے وجوب پر ایک استدلالی کتاب لکھی۔ اس طرح انھوں نے عراق و ایران

کی بھی ایک کمی کو یہاں پورا کیا

موعظہ کی ابتداء نماز کے بعد موعظہ شروع ہوا جس میں رفتہ رفتہ مجمع بڑھتا گیا۔ سرفراز الدولہ آصف الدولہ کو بھی ایک دن کھینچ لائے مگر غفراں مآب سے کہدیا کہ نواب بھنگ کے عادی ہیں اس کے متعلق کچھ نہ کہیئے گا لیکن اس دن کا موعظہ مسکرات ہی کی حرمت پر تھا نواب کا ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا رہ رہ کے اپنی لمبی لمبی موچھوں کو تاؤ دیتے تھے وزیر اعظم کی نظر نواب پر تھی دل میں سوچنے لگے تھے کہ دیکھیئے خدا آج کیا دکھاتا ہے۔ ابھی موعظہ تمام نہ ہوا تھا کہ نواب نے بلند آواز سے کہا کہ باوا جان کے سر کی قسم جو آج سے بھنگ کو منھ لگایا ہو' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زبان میں خدا نے وہ اثر دیا تھا کہ جو قلوب کو پھیر سکتا تھا' اور سینہ میں وہ دل دیا تھا جو سوا خدا کے کسی سے نہ ڈرتا تھا۔

اصلاحی کوشش تحریر کے ذریعہ سے جو انھوں نے اصلاحی کوششیں کیں وہ ہندوستان کی ضرورت کے مطابق تھیں تقلیدی نہ تھیں بلکہ خود ان کی قوتِ اجتہاد کا نتیجہ تھیں اس لئے ان کی اہمیت اور افادیت ہندوستان تک محدود نہیں رہی

تصوف کی مخالفت ہندوستان میں تصوف کا بڑا زور تھا علمائے عراق نے اس پر شیعی نقطہ نظر کی وضاحت نہیں کی۔ علمائے ایران میں علامہ مجلسیؒ نے ایک ہلکی سی روشنی ڈالی اس وجہ سے اکثر علمائے شیعہ کو اس بارے میں مسامحہ ہوتا رہا علامہ محسن فیض صاحب تفسیر صافی نے سماع (قوالی) کو جائز قرار دیا۔ شہید ثالث قاضی نور اللہ شوستری نے اکابر صوفیہ کی تعریف میں اتنی خامہ فرسائی کی کہ ان کی مذہبی حیثیت مشکوک ہوگئی اور صاحب تاریخ علماء کو لکھنا پڑا کہ ان کو بدمذہب سمجھنا درست نہیں کیونکہ انھوں نے صوفیہ کی تعریف کے ساتھ ان کے اقوال کی تاویل کی ہے

اور اس کا کچھ اور مطلب بیان کیا ہے۔ یعنی اس وقت تک کوئی واضح خط صوفیت اور شیعیت کے درمیان نہ تھا۔ جناب غفراں مآب نے معرکۃ آرا کتاب شہاب ثاقب صوفیت کی رد میں لکھ کر ان کے فلسفہ اور عمل و قول کی دھجیاں اڑا دیں۔ اور ایسا قلع قمع کیا کہ شیعوں سے اس کا استیصال ہو گیا۔

اخباریت کی رو ہندوستان کے شیعوں میں عام طور سے اخباریت پھیلی ہوئی تھی، وہ اجتہاد و تقلید کو ناجائز سمجھتے تھے، غفرانمآب نے اس موضوع پر اساس الاصول لکھ کے اخباریت کی جڑ اکھاڑ دی۔ اب ہندوستان میں اخباری نہ ہونے کے برابر ہیں۔

علم کلام میں انھوں نے توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت پر مستقل کتابیں لکھیں اور بڑے شد و مد سے جبر و قدر، رویت باری۔ معصیت انبیاء اور خلافت غیر منصوص کی رد کر کے مذہب اہلبیت کو ثابت کیا، اس سے پہلے عقلی و نقلی حیثیت سے اتنی مدلل، اتنی مفصل، اتنی مکمل بحث کسی نے نہیں کی تھی۔ اس سے ہندوستان میں ایک ہلچل مچ گئی اور شیعہ سنی دونوں نے ان کے خلاف محاذ قائم کر دیا

اخباریوں کی طرف سے اساس الاصول کی رد لکھی گئی تفضل حسین خاں علّامہ نے عماد الاسلام پر اعتراضات کئے۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے تحفہ اثنا عشریہ میں توحید سے لے کر معاد تک شیعہ نقطۂ نظر کی رد کی۔ اس طرح ایک میدان کارزار گرم ہو گیا۔ ایک ایک موضوع پر کتابوں کے انبار لگ گئے اور ایک ایسا ذخیرہ فراہم ہو گیا جو عراق و ایران کو بھی آج تک نصیب نہیں ہوا۔

تعزیہ داری تعزیہ داری کا وجود ہندوستان میں بہت پہلے سے تھا دکن میں عاشور خانے، سندھ میں امام بارگاہ تھی۔ شمالی ہند میں پھونس اور کپڑے کے

امام باڑے محرم میں بنتے تھے۔ دس دنوں کے لئے پختہ عمارت کی کیا ضرورت تھی
مبکی نظمیں تنہا اور چند آدمی مل کے راگ سے پڑھتے تھے۔ موجودہ زمانہ کی سوزخوانی
اسی کی یادگار ہے، اس سے بجز حصول ثواب اور کوئی افادیت نہ تھی
وہ بھی جبکہ حدود شرع میں ہو، جلوس بھی نکلتے تھے جن میں شہنائی، روشن چوکی، طبل،
تاشہ، جھانجھ بجتے اور ماہی مراتب (مچھلی اور چوپاؤں کے سر چاندی اور پیتل کے
بانسوں پر لگے ہوئے) کے ساتھ براق اور گنبد تعزیوں کی جگہ ہوتے تھے، کچھ کچھ دور
پر ٹھہر ٹھہر کے بانک اور پٹے کا فن دکھلاتے اور یا حسینؑ کی آواز بلند کرتے ان رسوم
کی بجا آوری میں سب مسلمان یکساں طور پر شریک تھے۔

غفرانمآب نے روشن چوکی اور شہنائی کو آلات غنا ہونے کی وجہ سے حرام
اور طبل تاشہ کو جنگی باجا ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا، جھنڈیوں، ماہی مراتب
کے بدلے علم، گنبد کی جگہ تعزیئے اور بانک اور پٹے کا فن دکھانے کے بجائے سینہ زنی اور حسین حسین
کو رواج دیا — حاضری مہندی اور نذر و نیاز ایسے رسوم قائم کئے،
محرم کے دس دن میں ہر دن ایک شہید کے ذکر سے مخصوص کیا۔ مجلسوں میں عراق کی
روضہ خوانی کے طرز پر ذاکری شروع کی جس میں اہلبیت علیہم السلام کے فضائل میں
حدیثیں بھی مصائب کے ساتھ بیان کی جانے لگیں، اس طرح مجلس کی افادیت
بڑھ گئی اور اس میں تبلیغی پہلو پیدا ہوگیا اور ان رسوم کو اتنا عام کردیا کہ گھر گھر مجلس
اور گلی گلی تعزیئے اٹھنے لگے اس طرح انھوں نے شیعوں کی تعزیہ داری کو ایک نئی
شکل دیکر عام مسلمانوں سے علیحدہ کردیا اور اس سے مذہبی تبلیغ، قومی تنظیم اور
شیعی تمدن کی تشکیل کی۔

اس سلسلہ میں ایک کمی جو عراق و ایران میں ہے انھوں نے یہاں اسکو

پورا کیا۔ عراق و ایران کے علماء مجلسیں پڑھنا اپنی شان اور مرتبہ کے خلاف سمجھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذاکری جسے وہاں روضہ خوانی کہتے ہیں کم پڑھے لکھے لوگوں کا کام رہ گیا اور اس میں کوئی ترقی نہ ہوسکی۔ ہندوستان میں مجلسوں میں مرثیہ پڑھا جاتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مجلس شاعرانہ کمال دکھانے کی جگہ نہیں ہے اس میں فضائل و مصائب اہلبیت بیان ہونا چاہیئے۔ انھوں نے واقعات کربلا پر معتبر روایتوں کا ایک بڑا ذخیرہ اثارۃ الاحزان کے نام سے پیش کیا اور عاشورہ کے دن عصر کے بعد خود مجلس پڑھنے کی ابتداء کی اس طرح ہندوستان کے علماء میں انھوں نے یہ سنت قائم کی کہ ان کے بعد ان کے جانشین یہ مجلس پڑھتے رہے۔ آج بھی یہ مجلس اسی وقت ان کے امام باڑے میں ہوتی ہے اب یہاں کے علماء کو جو حقیقت میں انھیں کے ذریات تھے اس پر اعتراض اور اس سے احتراز کی کیا ہمت ہوسکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت سے علماء مجلسیں پڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی چوتھی پشت میں بحرالعلوم جناب محمد حسین عرف علن صاحب پیدا ہوئے جنھوں نے ذاکری کے فن میں انقلاب پیدا کیا۔ حدیث و تفسیر اور فلسفیانہ موشگافیوں سے تقریر کو علمی بنا کر موجودہ طرز ذاکری کے موجد ہوئے

درس و تدریس | غفرانمآب نے مجلس درس قائم کی جس میں بقول حضرت سیدالعلماء وہ ایک یونیورسٹی کی حیثیت رکھتے تھے جو تنہا اپنے شاگردوں کو تمام علوم کی تعلیم دے کے جید عالم بنا دیتے تھے اور سب سے بڑا کارنامہ ان کا یہ ہے کہ انھوں نے اپنی سیرت و کردار اور تعلیم سے اپنے شاگردوں کو اتنا متاثر کیا اور ایسی اسپرٹ پیدا کردی کہ وہ کار تبلیغ میں ان کے شریک ہو گئے اور ہندوستان کے جس گوشہ میں جس کو بھیجدیا وہ خدا پر بھروسہ کرکے گھر بار چھوڑ کے روانہ ہوگیا۔ اس طرح ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان کے مبلغین پہونچ گئے۔ وہاں کے شیعوں کو عقائد

کی تعلیم دی اور ان کے دلوں سے خوف وہراس دور کرکے اپنے اعمال کو عام مسلمانوں سے علیحدہ بجالانے کی جرأت پیدا کی۔ جمعہ وجماعت قائم کی۔ مسجد وامام باڑہ بنوایا عزاداری کو رواج دیا بدعتوں سے روکا۔ دفن کفن۔ نکاح۔ طلاق سب شیعوں کے طریقہ پر ہونے لگا۔ اس طرح سارے ہندوستان میں بغیر کسی منصوبہ اور سرمایہ کے انھوں نے تبلیغ کرکے پیغمبری کا کام انجام دیا اور صدیوں سے جو خوف دلوں میں بیٹھا تھا وہ دور ہوگیا اور سارے ہندوستان میں شیعیت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہر جگہ شیعہ بحیثیت ایک قوم کے نظر آنے لگے جن کے نام مذہبی رواسم، اخلاق طرز معاشرت، معیار فکر، زاویہ نظر، تعلیم لٹریچر سب الگ ہوکر ایک مستقل قوم بن گئے اور ہندوستان کی قوموں میں اپنی علمی اور تمدنی حیثیت سے ایک ممتاز درجہ حاصل کرلیا۔

مذہبی معاملات میں اُن کے نقطۂ نظر اور انداز فکر میں تبدیلی ہوگئی وہ رسولؐ کی تعلیم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے انھیں افراد کے دامن سے وابستہ ہوگئے جن کا تعارف رسولؐ کی زندگی کا مستقل مشن تھا اور وہ اوروں کے مذہبی اور روحانی سیادت و قیادت کے قائل نہ رہے جس کے نتیجہ میں شیخ سدو کا بکرا میراں جی، سید احمد کبیر، سید سالار مدار صاحب کا جھنڈا و پیران پیر کی فاتحہ ختم ہوگئی۔ اور جب اہلبیتؑ رسول کے فضائل و مناقب بیان کئے جانے لگے اور فاتحہ وعزاداری نے ایک انقلابی کروٹ بدلی اور دوسروں کی طرف سے اس پر بدعت کے فتوے لگنے لگے تو حاضری نذر ونیاز اور علم و تعزیہ کو بدعت کہنے والوں کو چارہ نہ رہا کہ وہ شیخ سدو کے کلگلے، سید احمد کبیر کی گائے اور سید سالار کے جھنڈے کو بھی بند کرائیں۔ اس طرح اہلسنت کو بھی فائدہ پہنچا اور غفران مآب کی تحریک کی اتنی غیر معمولی کامیابی کو تائید خدا سمجھا گیا۔ شیخ الفقہا شیخ محمد حسن نجفی صاحب جواہر لکھتے ہیں:۔

زندہ کرنے والے مذہبی رسوم کے آباد کرنے والے اس کی منزلوں کے وہ ماہتاب جس کا طلوع گمراہوں کی ہدایت' وہ شہسوار جن کے ہاتھ میں اسلام کا رایت جنگی نگہداری میں اسلام کے ستون سربلند ہوئے"۔ ظل ممدود

مفتی میر عباس صاحب جناب غفرانمآب کے صاحبزادوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں

اے رفعت و بلندی کے مالک' اے ورع و تقویٰ کی جائے پناہ اے ہدایت کے نور اے آفتاب روز آپ کے سبب سے ہماری سرزمین پر شریعت حضرت محمد مصطفٰےؐ ظاہر ہوئی۔ اگر آپ نہ ہوتے اے میرے سرداران ملت تو ہمیں خبر بھی نہ ہوتی کہ ہمارا دین و مذہب کیا ہے۔ کیا کہنا آپ لوگوں کا کہ جو شخص آپ کی زیارت کرے وہ ہدایت پا جائے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے آپ کو کثیر علم کا مالک بنایا ناک رگڑا دینے کو دشمنوں کی۔ میرا فخر ہے کہ میں ہدایت حاصل کرنے والا ہوں اس یگانہ عصر امام سے" رطب العرب ص ۸۲

علامہ کنتوری لکھتے ہیں:۔

بلا تشبیہ ہمارے اس ہادئ دین نے ہندوستان میں وہی کام کیا جو مدینہ میں ان کے جد نامدار نے ...... اس خاندان ہدایت کے دشمن بدخواہ ہمیشہ روسیاہ رہیں گے ..... تمہارے گھروں میں جو چبوترے بھنگ نوشی کے تھے۔ ان پر مصلّے بچھوا دیے تمہاری نذر و نیاز میں جو شیخ سدو کا بکرا۔ شیخ فرید کی شیرنی۔ بابا شکر گنج کا کونڈا۔ شاہ مدار کی کندوری سید سالار کی بیرق جاری تھی اب عمل کو سعدا اور جناب حضرت عباس کی حاضری اور علم و تعزیہ بنام شہدائے کربلا جاری کرائے۔

مولانا محمد حسین صاحب قبلہ تاریخ العلماء میں لکھتے ہیں۔

آپ کا فضل و کمال۔ علوئے مرتبت و اجلال بیان سے باہر ہے۔ فقط

یہی کافی ہے کہ ہندوستان میں دین اسلام آپ ہی کے وجود سے پایا جاتا ہے۔۔ .... اہل علم پر کیا جہلا پر بھی آپ کا احسان ہے۔ جیسے حضرت علی کی تلوار آبدار نے سرکشان عرب کو زیر کردیا اور لات عزیٰ۔ منات تینوں کو طاقہائے حرم سے منہ کے بل گرادیا ایسے ہی ہندوستان میں اگرچہ برائے نام تشیع تھا مگر کہیں نقشہ بھنگ نوشی۔ کہیں احمد کبیر کی گائے کہیں .... یہاں بھی دلدار علی کے سیف قلم نے ہندوستان کو جو کفرستان تھا دار الایمان بنادیا یہ آپ کے خلوص کا اثر ہے جو جا بجا اس زمانہ پرآشوب میں پھر کر دشمنوں میں رہ کر عرب و عجم کا سفر دور دراز کرکے علوم دینیہ حاصل کرکے تحت قبہ ابی عبداللہ الحسین جو دعا مانگی تھی کہ میری اولاد میں تا قیامت علم دین باقی رہے سو بحمداللہ اب تک ہے اور انشاءاللہ باقی رہے گا اور آپ کا خاندان خاندانِ اجتہاد کے نام سے قائم ہوگیا

(تاریخ العلماء ص ۱۴۷)

مولانا اعجاز حسین صاحب برادر مولانا حامد حسین صاحب لکھتے ہیں۔

انھوں نے ہندوستان کے شہروں میں دین کو زندہ کیا اور بدعت و جاہلیت کے آثار کو محو و باطل کردیا۔

اس سے بڑھ کر ان کی خوش قسمتی اور کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے سامنے ہندوستان بھر میں شیعیت سر اٹھا کے کھڑی ہو گئی اور لکھنؤ اس کا مرکز بن گیا جس کے در و دیوار پر شیعیت چھا گئی اور اس طرف عام میلان ہو گیا۔ ہندو تک تعزیہ داری کرنے لگے اور کثرت سے علماء فضلاء اطبا، شعراء اور با فہم افراد شیعہ ہو گئے۔ مرزا جعفر علی فصیح مثنوی نان و نمک میں فرماتے ہیں ؎

حامی دیں ماحی کفر و ضلال سر گروہِ عالمان باکمال

علم سے جسکے عمل توام ہوا ۔۔۔ دین جس کے زور سے محکم ہوا
لکھنؤ اب ہنر دار ہند ہے ۔۔۔ دمبدم افزوں بہار ہند ہے

لیکن وہ حالت پیدا نہ ہونے پائی جو سنّی حکومتوں میں شیعوں کی تھی خاص لکھنؤ میں علمائے فرنگی محل کا ہندوستان میں سب سے بڑا علمی خاندان اور سب سے بڑی درس گاہ (مدرسۂ نظامیہ) اور کثرت سے علماء موجود تھے جمعہ وجماعت و موعظہ سبھی کچھ ہوتا تھا حکومت میں ان کا اتنا اثر تھا کہ اس زمانہ میں قضا اور افتاء کی مسند پر وہی متمکن تھے۔

غفراں مآب نے حکومت سے اپنے کو علیحدہ رکھا۔ ان کا خیال تھا کہ نائب امام کا حکومت کے سامنے جھکنا اور اس کی دربار داری کرنا منصب نیابت کی توہین اور ان مشاغل میں کمی واقع ہونے کا سبب ہے جو اس عہدہ کے فرائض میں داخل ہیں۔ انکی اس علیحدگی اور بے نیازی کی وجہ سے آصف الدولہ کو انسے اور ان کی تحریکوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ معمولی معمولی آدمی خطابات سے سرفراز ہوئے مگر غفرانمآب زندگی بھر مولوی صاحب کہے گئے۔ شعراء کے وظائف معین ہوئے صوفیوں اور ولیوں پر عنایتیں ہوئیں۔ گورکھپور شکار کھیلنے گئے وہاں محرم کا چاند نکل آیا ایک صوفی کو (جو میاں صاحب مشہور تھے) تعزیہ رکھے ہوئے دیکھا ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر دے آئے جو اب تک موجود ہے مگر غفراں مآب ان کے شہر میں تعزیہ داری اور اس کی تبلیغ کرتے رہے اور آصف وہیں بیٹھے لکھ لٹاتے رہے لیکن غفراں مآب پر ان کی چشم کرم کبھی نہ پڑی۔ ہاں آصف الدولہ کو ان کے علمی وروحانی فیوض وبرکات کے بڑھنے سے خلفائے بنی امیہ بنی عباس کی طرح اپنی حکومت کے لئے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا اور ان پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کی بلکہ خود بھی تعزیہ داری وغیرہ بڑے انہماک

یہی کافی ہے کہ ہندوستان میں دین اسلام آپ ہی کے وجود سے پایا جاتا ہے ..

.... اہل علم پر کیا جہلا پر بھی آپ کا احسان ہے۔ جیسے حضرت علی کی تلوار آبدار نے سرکشان عرب کو زیر کر دیا اور لات عزیٰ۔ منات تینوں کو طاقہائے حرم سے منھ کے بل گرا دیا ایسے ہی ہندوستان میں اگرچہ برائے نام تشیع تھا مگر کہیں نقشہ بھنگ نوشی۔ کہیں احمد کبیر کی گائے کہیں .... یہاں بھی دلدار علی کے سیف قلم نے ہندوستان کو جو کفرستان تھا دار الایمان بنا دیا یہ آپ کے خلوص کا اثر ہے جو جا بجا اس زمانہ پر آشوب میں پھر کر دشمنوں میں رہ کر عرب و عجم کا سفر دور دراز کر کے علوم دینیہ حاصل کر کے تحت قبہ ابی عبداللہ الحسین جو دعا مانگی تھی کہ میری اولاد میں تا قیامت علم دین باقی رہے سو بحمداللہ اب تک ہے اور انشاءاللہ باقی رہے گا اور آپ کا خاندان خاندانِ اجتہاد کے نام سے قائم ہو گیا

(تاریخ العلماء ص ۱۴۷)

مولانا اعجاز حسین صاحب برادر مولانا حامد حسین صاحب لکھتے ہیں۔

انھوں نے ہندوستان کے شہروں میں دین کو زندہ کیا اور بدعت و جاہلیت کے آثار کو محو و باطل کر دیا۔

اس سے بڑھ کر ان کی خوش قسمتی اور کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے سامنے ہندوستان بھر میں شیعیت سر اٹھا کے کھڑی ہو گئی اور لکھنؤ اس کا مرکز بن گیا جس کے در و دیوار پر شیعیت چھا گئی اور اس طرف عام میلان ہو گیا۔ ہندو تک تعزیہ داری کرنے لگے اور کثرت سے علماء فضلاء، اطبا، شعراء اور با فہم افراد شیعہ ہو گئے۔ مرزا جعفر علی فصیح مثنوی نان و نمک میں فرماتے ہیں ؎

حامی دیں ماحی کفر و ضلال | سر گروہِ عالمان باکمال

علم سے جسکے عمل توام ہوا　　دین جس کے زور سے محکم ہوا

لکھنؤ اب سبز [a] دار ہند ہے　　دمبدم افزوں بہار ہند ہے

لیکن وہ حالت پیدا نہ ہونے پائی جو سنّی حکومتوں میں شیعوں کی تھی خاص لکھنؤ میں علمائے فرنگی محل کا ہندوستان میں سب سے بڑا علمی خاندان اور سب سے بڑی درس گاہ (مدرسۂ نظامیہ) اور کثرت سے علماء موجود تھے جمعہ و جماعت و موعظہ سبھی کچھ ہوتا تھا حکومت میں ان کا اتنا اثر تھا کہ اس زمانہ میں قضا اور افتاء کی مسند پر وہی متمکن تھے۔

غفراں مآب نے حکومت سے اپنے کو علیحدہ رکھا۔ ان کا خیال تھا کہ نائب امام کا حکومت کے سامنے جھکنا اور اس کی دربار داری کرنا منصب نیابت کی توہین اور ان مشاغل میں کمی واقع ہونے کا سبب ہے جو اس عہدہ کے فرائض میں داخل ہیں۔ انکی اس علیحدگی اور بے نیازی کی وجہ سے آصف الدولہ کو انسے اور ان کی تحریکوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ معمولی معمولی آدمی خطابات سے سرفراز ہوئے مگر غفرانمآب زندگی بھر مولوی صاحب کہے گئے۔ شعراء کے وظائف معین ہوئے صوفیوں اور ولیوں پر عنایتیں ہوئیں۔ گورکھپور شکار کھیلنے گئے وہاں محرم کا چاند نکل آیا ایک صوفی کو (جو میاں صاحب مشہور تھے) تعزیہ رکھے ہوئے دیکھا ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر دے آئے جو اب تک موجود ہے مگر غفراں مآب ان کے شہر میں تعزیہ داری اور اس کی تبلیغ کرتے رہے اور آصف وہیں بیٹھے لکھ لٹاتے رہے لیکن غفراں مآب پر ان کی چشم کرم کبھی نہ پڑی۔ ہاں آصف الدولہ کو ان کے علمی و روحانی فیوض و برکات کے بڑھنے سے خلفائے بنی امیہ بنی عباس کی طرح اپنی حکومت کے لئے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا اور ان پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کی بلکہ خود بھی تعزیہ داری وغیرہ بڑے انہماک

سے کرتے رہے۔ اتنا موقع میسر آتے ہی ایک حقیقی نائب امام نے دنیا کے سامنے ائمہ اہلبیتؑ کی سیرت علمی و روحانی منزلت اور صحیح اسلامی تعلیمات کا اور اپنے گھر والوں کو ایک ایسا نمونہ بنا کے پیش کیا کہ قلوب ان کی طرف جھک گئے اور ایک تازہ انقلاب پیدا ہو گیا۔ دنیا نے مان لیا کہ وہ اپنے علمی تبحر اور سیرت و کردار کی بلندی سے آفتاب ہدایت بن کے طالع ہوئے اور اپنی علمی موشگافیوں سے عقول کو حیران کر دیا دین خدا میں گروہ در گروہ داخل ہوئے جس میں جبر کا کوئی دخل نہ تھا بلکہ آپ سن چکے ہیں کہ حکومت کے معاملات میں علمائے فرنگی محل دخیل تھے یہاں تک کہ آصف الدولہ کا زمانہ ختم ہوا اور نواب سعادت علی کا دور رہا۔ اس وقت بھی حکومت کے حاشیہ پر علمائے فرنگی محل ہی نظر آتے ہیں اور غفراں مآب کہیں دکھائی نہیں دیتے۔

۱۲۳۵ھ میں انھوں نے انتقال کیا۔ ۱۲۰۰ھ سے انھوں نے لکھنؤ میں تبلیغ فروع کی اور پینتیس برس میں شیعی دنیا میں انقلاب پیدا کر کے مذہب شیعہ کی تجدید کی یوں تو ہر صدی میں ایک مجدد مذہب پیدا ہوتا رہا ہے ان لوگوں نے آثار اہلبیتؑ کو جمع کیا اور فقہ مدون کی شیعوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہ کر سکے اور یہ ان کے حالات کے مطابق تھا۔ تیرھویں صدی کے مجدد مذہب غفرانمآب تھے۔ انھوں نے عقلی دلیلوں سے مذہب اہلبیت کو ثابت کیا شیعوں کو شیعہ بنایا اور ان کی تعداد میں بے حد اضافہ کیا۔ ہر جگہ کے شیعوں کو ان کے مذہب سے باخبر کر دیا اور جو بیری مریدی کے مراسم اور نذر و نیاز جاری تھی اس کو بند کرا دیا ان کی زندگی میں ہندوستان میں شیعہ ایک قوم کی حیثیت سے سر اٹھا کر کھڑے ہو گئے اس غیر معمولی کامیابی کو دیکھ حجۃ الاسلام مولانا احمد علی صاحب محمد آبادی مجتہد العصر نے فرمایا ؎

ندید چشم فلک مثل ایں مجدد دیں ... کہ شاہد اند بفضل و بزرگیش اعدا

ان کا فیض ہندوستان تک محدود نہیں رہا وہ کربلا و نجف تک پہنچا انھوں نے اپنے
دوران قیام میں محسوس کیا کہ اہل کربلا و نجف کو پانی کی تکلیف ہے انھوں نے آصف الدولہ
کو آمادہ کر کے ایک نہر کربلا سے نجف تک کھدوائی جس پر اسی ہزار اشرفیاں صرف ہوئیں۔
سنہ ۱۲۳۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ امجد علی شاہ نے ان کو غفرانمآب کہنا اور لکھنا
شروع کیا اس وقت سے وہ غفرانمآب کے نام سے مشہور ہوئے۔ شیعیت کی یہ
تجدید عہد آصف الدولہ کی بڑی خصوصیت ہے جس میں سرفراز الدولہ نواب حسن رضا
خاں نائب الریاست کا بڑا ہاتھ ہے انھیں کی اعانت سے غفرانمآب عراق گئے
اور وہاں سے آئے تو انھیں نے ان کو کتابیں فراہم کیں ان کی کفالت کی اور ان کے
امور میں سہولتیں بہم پہنچاتے رہے۔ تقریباً ایک فرلانگ لمبی اور چوتھائی فرلانگ
چوڑی زمین ناف شہر میں دی جس کے ایک سرے پر انھوں نے اپنا مکان اور
دوسرے سرے پر امام باڑہ بنایا۔ ان کے بعد ان کی اولاد نے اپنے مکانات
بنوائے جس سے بیچ کی ساری جگہ بھر گئی۔ غدر کے بعد وکٹوریا اسٹریٹ نے اس
کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور بہت سے مکانات گرا دیئے گئے۔

قبرستان | لکھنؤ میں شیعوں کا کوئی قبرستان نہ تھا۔ انھوں نے اپنے
امام باڑہ کے آگے ایک بہت بڑا قطعہ زمین قبرستان کے لیئے وقف کیا۔

نواب تفضل حسین خان علامہ

نواب وزیر علی آصف جاہ

نواب وزیر علی آصف جاہ

آصف الدولہ کا کمر کے نیچے کا حصہ چھوٹا اور کمزور تھا۔ شادی کے بعد جب میاں بیوی میں ربط پیدا نہ ہوا تو شجاع الدولہ نے اطبا کو ان کے علاج پر مامور کیا انھوں نے دوائیں دیں مگر وہ ان کا استعمال نہ کرتے تھے کیونکہ ان میں جنسی خواہش نہ تھی بیوی جانماز پکڑ کر عبادت میں مشغول ہوگئیں۔ شاعرہ تھیں شعر سے جی بہلاتی تھیں۔

نواب مسند نشین ہونے کے بعد حاملہ عورتوں کو مول لے لیتے تھے اور جب انکے یہاں بچہ پیدا ہوتا تھا تو وہ اسکو اپنا بیٹا بنا لیتے تھے

وزیر علی ایک ماما کا بیٹا تھا نواب نے اس کو پانچ سو روپے کا مول لیا تھا یہ بہت خوبصورت اور بڑا ذہین تھا نواب نے اس کو اچھی تعلیم دلوائی۔ خوشنویسی میں مرزا محمد علی اعجاز رقم کا شاگرد تھا، فن سپہ گری رستم خاں شکست سے سیکھی تھی۔ تیر اندازی شمشیر زنی۔ تیر اندازی اور چوگان بازی میں اچھی مہارت رکھتا تھا نواب اسے بہت چاہتے تھے۔ گورنر جنرل سے اپنا جانشین منظور کرا لیا تھا۔ نواب کے انتقال کے بعد جب لمسڈن صاحب رزیڈنٹ در دولت پر تعزیت کے لیے آئے تو نواب کی ماں نے ان سے کہا کہ اس وقت میری نظر میں دنیا اندھیر ہے تم جس کو مناسب سمجھو مسند پر بٹھا دو۔ انھوں نے کہا کہ جسکو نواب صاحب مقرر کر گئے ہیں اسکے سوا اور کون ہو سکتا ہے اس وقت وزیر علی بیچ محلا سے بلائے گئے، وہ گریبان پھاڑے زار و قطار رو رہے تھے۔ بیگم صاحبہ نے جواہر علی خاں سے کہا کہ سبز دوشالہ جو نواب کے پلنگ پر رکھا ہے۔ اسکو اڑھا دو یہ گویا بیگم صاحبہ کی طرف سے مسند نشینی کا خلعت تھا۔ اس وقت توپوں کی سلامی کا حکم ہوا، امرا نے نذریں گزرانیں اور وزیر علی مسند حکومت پر متمکن ہو گئے۔ سترہ برس کا سن تھا جوانی جوش پر تھی تیسرے دن محل سرائی میں جلکے چار عورتوں کو اپنے نئے

منتخب کرلیا عیاشی پر کمر باندھی، شراب اور بھنگ پینے لگے، داروغگی دیوان خانہ خواجہ غلام محمد عرف بڑے نواب کو بخشی۔ نیابت فخر الدین احمد خاں کو دی، نئے مصاحب پیدا کیے۔ رستم خاں بنکیت کا شاگرد، مکھو خاں رفیق و ہمدم بنا۔ اور نا شائستہ اعلیٰ عہدے پر سرفراز ہوئے۔ پرانے اہل کار مردود بارگاہ اور نازیبا کلمات کے سزاوار ہوئے اور آصف الدولہ کی طوائفوں پر تصرف کرنے۔ روپیہ پانی کی طرح بہانے لگا۔ تحسین علی خاں نے کہا کہ وہ آپ کی ماں کے برابر ہیں، انسے ادب سے پیش آنا چاہیئے۔

جب وہ چلے گئے تو مصاحبوں نے بھڑکایا۔ وزیر علی کو بھی طیش آیا کہا کہ اس نافرمان کی ناک کاٹ لوں گا۔ اسے خبر ہوئی تو وہ خان علامہ کے پاس چھپ گیا، اور وزیر علی کو معلوم ہوا تو علامہ کے پاس گئے اور کہا کہ تحسین علی خاں کو ہمارے حوالے کیجئے انھوں نے کہا کہ وہ میرے پاس نہیں ہے اور رات کو رزیڈنٹ کے پاس بھیجدیا وزیر علی کو اس کا علم ہوگیا، وہ رزیڈنٹ کے پاس گئے، اور تحسین علی خاں کو مانگا انھوں نے دینے سے انکار کردیا۔ ان حرکتوں سے لوگ متنفر ہوگئے، شہر میں بےچینی پھیل گئی لوگ ان کی معزولی کی فکر کرنے لگے جس میں تفضل حسین خاں پیش پیش تھے آخر ایک محضر تیار کیا گیا کہ وزیر علی حکومت کی لیاقت نہیں رکھتا اس سے حرکات ناشائستہ سرزد ہو رہے ہیں۔ اس کا نسب بھی سب کو معلوم ہے۔ ورثار حقیقی ریاست سے محروم ہیں ان کو ریاست ملنا چاہیئے، یہ محضر گھر گھر گھمایا گیا، بیگمات محل خواجہ سراؤں، افسروں نواب سالار جنگ کے بیٹوں بازار کے مہاجنوں اور چودھریوں نے اپنا اپنا دستخط کیں، اور مہریں لگائیں۔ آصف الدولہ کی بیوی اور دیگر اعیان نے الگ درخواست لکھی کہ وزیر علی آصف الدولہ کا بیٹا نہیں ہے بلکہ ایک فراش

کا بیٹا ہے، نواب نے اس کو متبنیٰ کیا تھا، قوم کا رذیل ہونے کی وجہ سے اس نے لذا نعت کیا۔ شہر میں اسکی حرکتوں سے لوگ پریشان ہیں یہ فرمانروائی کے قابل نہیں ہے۔ اس ریاست کی مستحق شجاع الدولہ کی اولاد ہے۔ یہ سب سرجان شور گورنر جنرل کو بھیجا گیا مگر انھوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ جب وہ دورے پر لکھنؤ آئے تو خان علامہ نے ان سے کہا کہ وزیر علی کو معزول کر دیجئے۔ انھوں نے کہا یہ بات بہت مشکل ہے، نواب خود اس کو اپنا بیٹا کہہ چکے ہیں، علامہ نے کہا اس کو نواب کی ماں اور بہنوں سے دریافت کر لیجئے۔ الماس علی خاں نے اس کا سارا کچا چٹھا بیان کیا۔ آصف الدولہ کی بیوی نے چلمن کے پیچھے سے بتایا کہ نواب سے مجھے زن و شو کے تعلقات کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ نواب کی ماں نے بھی تصدیق کی کہ وزیر علی نواب کا بیٹا نہیں ہے، گورنر جنرل نے بیبیا پور کی کوٹھی میں ارکان سلطنت سے مشورہ کیا، سب نے کہا کہ وزیر علی نواب کا بیٹا نہیں ہے۔ نہ اس میں حکمرانی کی صلاحیت ہے اس مضمون کی ایک تحریر لکھی گئی جس پر سب نے مہر و دستخط کی۔ شام کو گورنر جنرل نے وزیر علی کو بلایا اور نہایت نرمی کی باتیں کر کے وہ کاغذ دکھایا جس میں ان کا اولاد آصف الدولہ نہ ہونے پر ارکان حکومت اور صاحبات محل کی دستخط تھی اور کہا کہ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ جب آپ نواب کے بیٹے نہیں ہیں تو ریاست کے وارث بھی نہیں ہیں۔ اس لئے ہم پر واجب ہے کہ حقدار کو حق دلائیں۔ وزیر علی یہ سن کے چلے آئے۔ اشرف علی خاں نے ان کو جنگ پر آمادہ کیا، سرجان شور کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے وزیر علی کو دوبارہ بلایا۔ کچھ لوگوں نے ان کو جانے سے روکا، کچھ نے جانے کا مشورہ دیا۔ وزیر علی نے جانا مناسب سمجھا اور وہ گورنر جنرل کے پاس گئے۔ جب کمرے میں داخل ہوئے تو چیف سکریٹری نے کہا "اب آپ یہاں قیام فرمائیں"۔ تلنگوں اور گوروں کا پہرہ بٹھا دیا۔ سواری کا جلوس ہٹا دیا، نوابی

فوج نے ہنگامہ برپا کردیا۔ کیونکہ وزیر علی سپاہی اور سپاہی دوست تھا، اس نے فوج پر بے انتہا عنایتیں کی تھیں، انگریزی فوج نے شہر، اور نوابی فوج کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ رات بھر رہا صبح کو فتنہ فرو ہوگیا تو خان علامہ نے ایک اعلان لکھ کر گورنر جنرل کو دیا جو انھوں نے جاری کرایا اعلان کا حصّہ یہ ہے: اب ثقات اور جماعت کثیر نیز بیگم صاحب کے اظہار سے ثابت ہوگیا کہ وزیر علی جناب عالی کی جانشینی کا کوئی حق نہیں رکھتے ملازمان سرکاری کی وفا داری اور حق پرستی سے یقین ہے کہ اس بات کو سنتے ہی کہ شجاع الدولہ کی فوج و رعیت، ان کے فرزند حقیقی کے لئے ہے ایسے اجنبی شخص سے محفوظ رہنا چاہیئے۔ تمام نوکروں، اور قدیم خیر خواہوں کو خوش ہونا چاہیئے کہ اس ملک کے وارث، نواب نواب سعادت علی خاں قرار پائے۔ لہذا اعلان کیا جاتا ہے کہ ملازمان، جناب عالی نواب سعادت علی خاں کی اطاعت و فرمانبرداری بجالائیں گے اور ملازمین سرکار بدستور اپنے عہدے پر قائم اور مورد تفضلات رہیں گے اور جو نمک حلالی کا راستہ چھوڑے گا وہ ملک سے نکال دیا جائے گا۔ یہ چند سطریں اطلاع عام کے لئے لکھی گئی ہیں کہ آئندہ کسی کو عدم اطلاع کا عذر نہ رہے۔ ۳ رشعبان ۱۲۱۲ھ اس کے بعد گورنر جنرل نے حکم دیا کہ دو سو بہلیاں دو سو اونٹ رتھ، ہاتھی اور چھکڑوں پر آٹھ دن تک جو کچھ سامان شتو دریاست ضروری ہو اور سواری، جواہرات، نقد و جنس، جلوس سواری، سب وزیر علی کو دی جائے، ساڑھے بارہ ہزار روپیہ ماہوار گزارے کے لئے اور بنارس میں مادھو داس کا باغ قیام کے لئے تجویز ہوا۔

ان کی مدت حکمرانی چھ مہینے چار دن ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کیا کیا اور ان کا کیا حشر ہوا اس کا تعلق تاریخ لکھنؤ سے نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔

مورخین کی غلط فہمی

جن مورخین نے وزیر علی کو آصف الدولہ کا بیٹا لکھا ہے انھوں نے غلطی کی ہے، اگر وہ نواب کے بیٹے ہوتے تو وہ محضر جس میں اُن کا بیٹا نہ ہونا لکھا گیا تھا اور اس پر ارکان حکومت کے جن میں علماً اور صاحبات محل بھی شامل تھیں دستخط کر دیتے؟ یہ اندھیر کیسے ممکن تھا....؟؟

یہ روایت بھی ہے کہ ایک دن، نواب نے دربار میں کہا ہے کہ میرا ولی عہد سیّد زادہ ہے اس کی شادی کسی سیّد زادی سے ہونا چاہیئے، سرفراز الدولہ حسن رضا خاں نے کہا کہ مولوی دلدار علی صاحب کی صاحبزادی سے بہتر کون سیّد زادی ہو سکتی ہے۔ نواب نے کہا باوا جان کے سر کی قسم بے مثل تجویز ہے، پیام لے جانے کی تیاری کرو سرفراز الدولہ دربار سے رخصت ہو کے خوشی خوشی مولانا کے پاس آئے اور یہ خوشخبری سنائی انھوں نے بہت ناگواری کا اظہار کیا اور یہ فرمایا کہ امراء سے ہمارا پیوند نہیں ہو سکتا۔ ایک تندنی ہوا اس کے لئے نصیر آباد بھیجا اور اپنے ایک عزیز لڑکے کو بلوا کے ان کا نکاح کر دیا، جب نواب کے یہاں سے پیام آیا تو کہا کہ ان کا نکاح ہو چکا ہے۔

نجم الغنی نے تاریخ اودھ میں لکھا ہے کہ، نواب آصف الدولہ کی بیوی نواب شمس النساء تمام زندگی بھر وزیر علی کے سامنے نہیں ہوئیں" کہتی تھیں کہ میں اِس رذیل کے سامنے ہو کے اپنی خاندانی وجاہت کو بٹا نہیں لگاؤں گی۔

آصف الدولہ نے جب ان کو وزیر علی کی شادی میں بلایا تو انھوں نے یہ کہہ کے انکار کر دیا کہ میں ایسے رذیل کی شادی میں شرکت اپنی توہین سمجھتی ہوں، رذیل اس لئے کہا کہ وہ ایک فرّاش کا بیٹا تھا جو ماما کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، باپ سید تھا ان باتوں کی موجودگی میں ان کو آصف الدولہ کا بیٹا اور حکومت سے محرومی کو ظلم کہنا صریحی غلط ہے۔

مرزا سعادت علیخان نواب یمین الدولہ بہادر

Saidut ali Khan

maablib.org

راجہ امرت لال عرض بیگی

نواب مرزا سعادت علی خاں یمین الدولہ

وزیر علی کی معزولی جب طے پا گئی تو نواب سعادت علی خاں کو بنارس سے بلایا گیا ان کا شاہانہ استقبال ہوا اور وزیر علی گرفتار ہوئے۔ گورنر جنرل سے انسے یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ جو کچھ کہیں گے اس سے نواب کو انکار نہ ہوگا۔

۱۲۱۲ھ ۱۷۹۸ء کو ۲۱ جنوری ہفتہ کے دن وہ مسند نشین ہوئے ابھی وہ اپنے ملک کا انتظام بھی سنبھال نہ سکے تھے۔ صرف تیس دن مسند نشینی کو ہوئے تھے کہ ذیل کا معاہدہ ان کی دستخط کے لئے پیش کیا گیا:۔

دفعہ ۱۔ یہ کہ جو صلح، دوستی، اور یک جہتی عرصہ دراز سے دونوں سلطنتوں میں چلی آرہی ہے۔ وہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ نیز یہ کہ ایک کا دشمن دوسرے کا دشمن اور اسی طرح ایک کا دوست کا دوست متصور ہوگا۔ نیز یہ کہ اس سے قبل جتنے معاہدے تحریر ہو چکے ہیں وہ سب قابل پابندی رہیں گے ــــ سوا ان باتوں کے جو اس معاہدہ کے خلاف ہوں۔

دفعہ ۲۔ یہ کہ انگریزوں نے اودھ اور نیز اپنی سلطنت کی حفاظت کے سلسلہ میں فوج کی تعداد ...... اور زیادہ بڑھالی ہے لہٰذا جو رقم تعدادی چھپن ۵۶ لاکھ روپے سالانہ اس امدادی فوج کے خرچ کے لئے دی جاتی رہی ہے، وہ اب چھہتر ۷۶ لاکھ روپے سالانہ مقرر ہوتی ہے

دفعہ ۳۔ یہ کہ چھہتر لاکھ روپیہ کی ادائیگی ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء سے

واجب الادا ہوگی اور ماہ بماہ دی جایا کرے گی۔

دفعہ ۴۔ یہ کہ پہلے معاہدوں کے سلسلہ میں جو فوج کے خرچ کی رقم قابل ادائیگی رہ گئی ہے وہ فوراً بے باق کی جائے گی۔

دفعہ ۵۔ یہ کہ نواب سعادت علی خاں ساڑھے بارہ ہزار روپیہ ماہوار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ سے وزیر علی خاں کو اس وقت تک دیتے رہیں گے جب تک وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حدود میں رہیں گے۔

دفعہ ۶۔ دو لاکھ چار ہزار روپیہ سالانہ جو بیگمات اور شہزادگان کے گزارے کا مقرر ہے اور تیس ہزار چھ سو روپیہ سالانہ فرخ آباد کی پنشن کا خزانہ شاہی سے ادا ہوتا ہے اسی چھہتر لاکھ میں شامل ہے۔

دفعہ ۷۔ یہ کہ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی فوج میں اور اضافہ کرے گی تو اس کا خرچ بھی نواب وزیر کو ادا کرنا ہوگا۔

دفعہ ۸۔ یہ کہ نواب وزیر بسبب دوستی الہ آباد کا قلعہ اور گھاٹ اور اسکے قرب وجوار کی تمام زمین ایسٹ انڈیا کمپنی کو عارضی طور پر سپرد کرتے ہیں اور آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ قلعہ کی مرمت کے لیئے نیز انھیں وجوہ کی بنا پر تین لاکھ روپیہ سالانہ فتحگڈھ کے قلعہ کی مرمت کے لیئے دینا منظور کرتے ہیں۔

دفعہ ۹۔ یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کانپور اور فتح گڈھ سے اپنی فوج ہٹا کر کسی دوسرے مقام پر بنظر حفاظت اودھ منتقل کرے گی تو اس کا کل خرچ نواب موصوف ادا کریں گے اور جو خرچ کنٹونمنٹ ہٹانے میں ہوگا اسکی ادائی بھی نواب وزیر کریں گے

دفعہ ۱۰۔ چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے نواب وزیر کو تخت حکومت پر بٹھانے میں دوڑ دھوپ کی ہے اس کے صلہ میں نواب وزیر بارہ لاکھ روپیہ کمپنی کو دینا منظور

کرتے ہیں۔

دفعہ ۱۱۔ یہ کہ جو رقم کمپنی کی فوج کے صرفہ کے لئے مقرر کی گئی ہے اسکی ادائی نواب وزیر مقررہ وقت پر کرتے رہیں گے اور اگر یہ رقم باقی رہ جائے گی تو اس کے لئے مناسب ضمانت داخل کرینگے۔

دفعہ ۱۲۔ یہ کہ نواب اپنے ملازمین کی تعداد میں کافی کمی کردینگے۔

دفعہ ۱۳۔ یہ کہ نواب وزیر بغیر علم و رضامندی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کسی حکومت یا ریاست سے خط و کتابت نہیں کرینگے۔

دفعہ ۱۴۔ یہ کہ نواب موصوف اپنے حدود میں کسی دوسری مغربی قوم کی فرد کو نہ رکھیں گے نہ آباد ہونے دیں گے۔

دفعہ ۱۵۔ یہ کہ نواب سعادت علیخاں آصف الدولہ کے متعلقین کے لیے مناسب گزارہ مقرر کرینگے۔ اور ان کو اپنی حفاظت میں رکھیں گے۔

دفعہ ۱۶۔ یہ کہ نواب سعادت علیخاں خود اپنی اور اپنے ورثاء کی جانب سے اور سرجان شور ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے یہ وعدہ و اقرار کرتے ہیں کہ فریقین اس معاہدہ پر خلوص اور سچائی کے ساتھ عمل کرتے رہیں گے۔ نیز یہ کہ دونوں حکومتوں کے درمیان تمام معاملات نہایت ہمدردی اور خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رہیں گے۔ نیز یہ کہ نواب وزیر کو اپنے نجی اور انتظامی امور رعایا کے معاملات میں پورے اختیارات حاصل ہوں گے۔

ابھی اس معاہدہ کی روشنائی بھی خشک نہیں ہونے پائی تھی صرف چار مہینے گزرے تھے کہ مارکوئیس ویلزلی گورنر جنرل ہو کے آیا یہ نہایت ظالم و جابر اور سخت مزاج تھا اس کا منشاء تھا کہ تمام دیسی ریاستیں کمپنی کی حکومت میں ضم

ہوجائیں - آصف الدولہ کے زمانہ میں بنارس جونپور اور غازی پور انگریزی حکومت میں شامل ہو چکے تھے۔ فوجی طاقت کو ختم کر کے حکومت اودھ کو انگریز لقمہ تر بنا چکے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اودھ کا نواب ہم سے جنگ کرنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا اس کو جتنا بھی دبایا جائے گا وہ دبتا جائے گا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ کسی بات سے انکار پر ہم ملک سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور بات بالکل صحیح تھی۔

لارڈ ویلزلی نے ۵ نومبر ۱۷۹۹ء کو نواب کے نام ایک خط بھیجا جس میں نواب کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ان کے پاس جتنی فوج ہے اس میں کمی کر کے صرف یہ مال گزاری وصول کرنے اور اشاہی جلوس کے بقدر رکھی جائے اور اسکی جگہ کمپنی کچھ پلٹنیں بڑھا دی جائیں جن کا خرچ چھیتر ۷۶ لاکھ کے علاوہ نواب ادا کریں گے۔

سعادت علی خان اس نئی تجویز کو پڑھ کے حیران ہو گئے۔ ۲۱ فروری ۱۷۹۱ء کے معاہدہ کے مطابق نواب پر کس قدر مالی بوجھ پڑھ گیا تھا اب اور بوجھ لادا جا رہا تھا۔ ۱۲۱۴ھ - ابھی وہ اس تجویز پر غور ہی کر رہے تھے اور خط کا جواب دینا چاہتے تھے کہ ویلزلی نے نواب کے جواب کا انتظار کئے بغیر اسکے علاقہ میں اپنی فوجیں بھیج دیں اور ان کو اس کے اخراجات کی ادائی کا ذمہ دار بنا دیا۔ نواب نے ۱۱ جنوری ۱۸۰۰ء ۱۲۱۴ھ کو رزیڈنٹ کے ذریعہ گورنر جنرل کو خط بھیجا جس میں اپنے خاندان اور انگریزوں کے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:-

اودھ کی فوج کو توڑ دینے کا نتیجہ پرانے وفادار نوکروں کو بے روزگار کر دینا ہوگا جس کا اثر رعایا پر بہت برا پڑے گا اور اس بات سے کمپنی کے اعتبار اور اس کی عزت میں فرق آئے گا اور میری بھی نہ ملک میں عزت رہے گی نہ باہر اور ایک طرح سے میری حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا

مسند نشینی کے وقت میں نے کمپنی سے جو معاہدہ کیا تھا وہ کبھی بال برابر بھی ادھر ادھر نہ ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ کمپنی کا ارادہ بھی اس معاہدہ سے منکر ہونے کا نہیں ہے۔ انھوں نے ۱۷۹۸ء / ۱۲۱۲ھ کے معاہدہ کا حوالہ بھی دیا اور لکھا کہ کمپنی کا موجودہ مطالبہ غیر ضروری اور نامناسب ہے اور ۱۷۹۸ء / ۱۲۱۲ھ کے معاہدہ کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ اور پر زور اپیل کرتے ہوئے لکھا کہ میری مملکت کا انتظام تک میرے ہاتھوں سے چھین لیا گیا کہ میری آبائی حکومت میری فوج اور میری رعایا پر میرا تسلط کہاں رہا۔

ویلزلی کا جواب

ویلزلی کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ —— سعادت علیخاں کا خط اتنے گستاخانہ الفاظ میں ہے کہ گورنر جنرل اس کو لینے سے انکار کرتے ہیں۔ خط نواب کو واپس کر دیا جائے اور اگر نواب نے پھر اس طرح انگریزی سرکار کی انصاف پسندی اور ایمانداری پر شک و شبہ ظاہر کیا تو اسے مناسب سزا دی جائے گی اس کے علاوہ ۲۲ جنوری ۱۸۰۱ء / ۱۲۱۵ھ کو ویلزلی نے نواب کو دوسرا خط لکھا۔

جو نئی پلٹنیں اودھ میں بھیجی گئی ہیں اگر ان کے اخراجات کو نواب ادا نہیں کرتے تو اپنا آدھا ملک کمپنی کے حوالے کر دیں۔ نواب نے اس بے انصافی پر بار بار احتجاج کیا مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

اس کے برخلاف ۲۸ اپریل ۱۸۰۱ء / ۱۲۱۵ھ کو ویلزلی نے لکھنؤ کے رزیڈنٹ کو لکھا کہ اگر نواب وزیر رضا مندی سے اپنا آدھا ملک کمپنی کے حوالے کر دیں تو فوج کے ذریعہ اس پر قبضہ کر لیا جائے اور نواب کی فوجی طاقت کو بالکل ختم کر دیا جائے اور یہ نیا معاہدہ ۱۸۰۲ء / ۱۲۱۶ھ کو نواب کی دستخط کے لئے بھیجا۔

دفعہ ۱ — ہز اکسلنسی نواب وزیر ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنی سلطنت کے

مندرجۂ ذیل حصے ہمیشہ کے لیے اس کے اقتدار اعلیٰ میں دیئے ہیں جس کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ پینتیس لاکھ روپیہ سالانہ ہوتی ہے جس میں انتظام اور مستقل و عارضی انگریزی فوج کا خرچ اور بنارس و فرخ آباد کی پنشن ۔ چکلہ کڑہ اور کوڑہ جہاں آباد چکلہ اٹاوا کھیراگڈھ مئو ناتھ بھنجن گورکھپور بٹول صوبہ الہ آباد چکلہ بریلی اور آصف آباد گلوری نواب گنج کھلی وغیرہ شامل ہے۔

دفعہ ۲ ۔ یہ کہ جو چھہتر لاکھ روپیہ سالانہ نواب انگریزی فوج کا صرفہ دیا کرتے اس کا بار آئندہ نواب وزیر کے سر سے اٹھا لیا گیا۔

دفعہ ۳ ۔ یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نواب وزیر کی سلطنت کی بیرونی اور ملکی دشمنوں سے حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے اور نواب وزیر وعدہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی فوج میں پیادوں کی چار بٹلینیں اور نجیب کی ایک پلٹن اور میواتیوں کے دو ہزار سوار تین سو گولہ انداز رکھیں گے اور باقی فوج کو برخواست کر دیں گے۔

دفعہ ۴ ۔ یہ کہ انگریزی فوج معہ توپخانہ کے ان کی نقل و حرکت کے ساتھ ہوا کرے گی۔

دفعہ ۵ ۔ یہ کہ اس معاہدہ کی دفعہ ایک کی رو سے جو حصص ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیئے گئے ہیں اور ایسٹ انڈیا ان پر بلا شرکت غیرے کمپنی کا اور اس کے افسران کا انتظام و اختیار رہے گا

انڈیا کمپنی اس معاہدہ کی رو سے اقرار واثق کرتی ہے کہ جو حصہ ملک بعد علیحدگی مندرجہ بالا کمپنی اضلاع آئین کے حکومت اودھ کا باقی رہے گا اس پر نواب وزیر اور ان کے ورثاء و جانشینوں کا قبضہ رہے گا اور نواب وزیر اور اس کے ورثا اور جانشینان اس بقیہ حصہ اودھ پر کامل اختیار حکومت رکھیں گے نیز یہ کہ

نواب وزیر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اوران کے صلاح و مشورہ کے مطابق عمل کریں گے۔

اس معاہدہ پر بھی نواب کو دستخط کرنا پڑے جس سے وہ بہت تنگ دل ہوئے ہما بہرحال یہ کہ رزیڈنٹ سے مستقل کشمکش رہنے لگی۔ وہ طرح طرح سے ان کے اقتدار کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کرتا رہا تاکہ وہ رعایا کی نظروں میں سبک ہو جائیں۔

ملکی انتظام

اس فشار ذہنی میں مبتلا رہتے ہوئے انھوں نے ملک کا زبردست نظم و نسق بنایا۔ سارا کام خود کرتے تھے کوئی نائب نہیں رکھا اپنے دو بیٹوں احمد علی خاں شمس الدولہ اور محمد علی خاں نصیر الدولہ کو مہمات ملکی میں شریک کیا معمولی اہلکار نوکر رکھے اور ہوشیار لوگوں کو نظامت دی۔

صبح کا دربار | سورج نکلنے سے پہلے بوچہ برمحل سری سے برآمد ہوتے تھے اس وقت لباس انگریزی ہوتا تھا۔ مغلئی ٹوپی سر پر ولائتی ڈاب کمر میں پہلے مرشد زادوں کا سلام ہوتا تھا ان کے بعد امرائے خاص کا پھر گھوڑے پر سوار ہو کے موسیٰ باغ جاتے تھے واپسی ہاتھی پر ہوتی تھی جس کے ساتھ ڈنکا نشان اور امرائے دولت ہاتھیوں پر سوار ساتھ ہوتے تھے۔ خاص بردار چنور لئے خواصی میں چوبدار آگے آگے ہوتے تھے تیس سوار اور بیس پیدل سواری کا انتظام کرتے تھے۔ ان سب کی نگرانی انتظام الدولہ ظفر علی خاں اور اشرف الدولہ رمضان علی خاں اور مرزا اشرف علیخاں کے سپرد تھی۔ پہرے پر دو سوار اور بیس پیادے تھے امراء در دولت تک آ کے بار رخصت ہو جاتے تھے اور نواب ناشتہ کرتے تھے۔

نو بجے صبح کا دربار | نو بجے صبح کو دیوان خاص میں کرسی پر بیٹھتے تھے میز

سامنے ہوتی تھی۔ مقربان خاص نواب صمصام الدولہ مرزا بچو اور نواب محمد تقی خاں ہوس پہلو میں۔ میکلوڈ صاحب اور ڈاکٹر ملانیست پر بیٹھتے تھے میر انشاء اللہ اور معز زین، خواجہ سرا باریاب ہوتے تھے پہلے مردہا پیش کرتا تھا پھر عرض بیگی سامنے پیش کرکے ادب و قاعدے سے سلام کراتا تھا اسکے بعد خاصہ کا دربار ہوتا تھا جس میں نواب جلال الدولہ مہدی علیخاں۔ رکن الدولہ محمد حسن خاں شریک خاصہ ہوتے تھے اس کے بعد محلسرا میں تشریف لے جاتے تھے۔

بارہ بجے دن کا دربار | بارہ بجے دن کو محل سرا سے برآمد ہو کے جلوس فرماتے تھے۔ نواب محمد علی خاں نصیر الدولہ تمام رپورٹیں بند لفافہ میں پیش کرتے تھے انکے بعد نواب محسن الدولہ اسی طرح بند لفافے میں رپورٹیں پیش کر کے علیحدہ کمرے میں حاضر رہتے تھے۔ معظم الدولہ مہدی علی خاں راجا دیا شنکر راے رتن چند۔ محاسب راے چند عرائض نویس خفیہ منشی لائق علی اور منشی رونق علی اپنے کاغذات میز پر رکھ کے علیحدہ کمرے میں حاضر رہتے تھے۔ استفسار کے لئے بلائے جاتے۔ کاغذات ملاحظہ کے بعد دستخط ہوتے جنکو ضائع کرنا ہوتا ان کو پھاڑ کے تشت میں ڈالدیتے جس میں پانی بھرا ہوتا تھا جن کاغذات پر مہر لگانا ہوتی وہ ظفر الدولہ کے سامنے پیش کئے جاتے پھر نواب کی دستخط ہو کے متعلقہ دفتر میں بھیج دیئے جاتے تھے۔ بچے ہوئے کاغذات رات کو پیش ہونے کے لئے رکھ لئے جاتے تھے۔ اخبار کا پرچہ ہر وقت گزر سکتا تھا۔

تفریح | شام کو گاڑی پر تفریح کے لئے نکلتے تھے۔ سواری کے جلوس میں راجا بختاور سنگھ کا ترک سواروں کا رسالہ ہوتا تھا۔ اکثر منڈی جاکر غلہ کا نرخ دریافت کرتے تھے۔ بقال اسی خوف سے اناج مہنگا نہیں کرتے تھے۔

شام کا دربار: بعد نماز مغرب دربار منعقد ہوتا تھا جس میں ملکی اور مالی امور طے پاتے اور ان کی فوری تعمیل کا حکم ہوتا۔

نئے انتظامات: دیوانی و فوجداری کا مضبوط نظام نافذ کیا۔ سررشتہ عدالت کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ فوجداری کے مقدمات کوتوالی کے سپرد کئے۔ دیوانی علماء کے لئے متعین کی۔ حضرت مولانا محمد ولی فرنگی محلی اور مولانا نجم الدین کو قاضی بنایا۔ مولانا ابوالراحم فرنگی محلی کو مفتی مولانا حکیم الدین اور مولانا علیم الدین کو صدر کا عہدہ دیا اور مولانا خلیل الدین کو سفیر بنا کے کلکتہ بھیجا۔ مولانا مدن ایک عالم اہل سنت ان کے دست راست تھے۔ یہ مولانا مدن کے بیٹے تھے جو صفدر جنگ کے زمانہ میں حکومت کے مقرب خاص تھے۔

رائے جے سنگھ کو واجبل باقی نویسی صاحب رائے کو اخبار کا سررشتہ تفویض ہوا کئی ہزار مخبر رکھے جو گھر گھر کی خبر لاتے تھے۔ ان پر بھی مخبر تھے کہ جھوٹی خبر نہ لائیں۔ باہر کے شہروں کے لیئے اخبار نویس مقرر ہوئے جو روزانہ اپنے شہر کی رپورٹ پیش کرتے تھے۔ یہ لوگ ہر وقت حاضر ہو سکتے تھے۔

رائے رتن چند محاسب اور راجا دیا شنکر فرمان نویس بنائے گئے۔

راتوں کو بھیس بدل کے سڑکوں اور گلیوں میں گشت کرتے تھے اور عوام کے حالات معلوم کرتے آرام بہت کم کرتے تھے امور مملکت میں سارا وقت صرف کرتے تھے۔ کسی عورت کو شہر سے باہر جانے اور مرد کو دس روپے سے زیادہ لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ باہر کے مال پر محصول معاف کر دیا۔ اس سے افراط سے مال آگیا۔ دوکانوں کی رونق بڑھ گئی۔ غلہ کی منڈیاں بنوائیں۔ لوہے کی ترازو ایجاد کی۔ غیر آباد زمینوں کو آباد کیا۔ غلہ کی افراط ہو گئی۔

روپے کا تیس سیر گیہوں ملنے لگا

عدل وانصاف: مستغیث اپنا معاملہ خود پیش کرسکتا تھا۔ اس کے لئے کوئی وقت نہ تھا نواب فوراً انصاف کرتے تھے۔ انصاف کی سخت پابندی تھی۔ نواب کے حقیقی بھائی شجاعت علی خاں نے ایک شخص کی زمین پر قبضہ کرکے اپنا مکان بنالیا اس نے نواب سے فریاد کی۔ نواب نے اُن کا مکان گروا کے زمین پر قبضہ دلوا دیا اور شجاعت علی خاں کو شہر بدر کردیا۔

منشی غلام علی نے عماد السعادۃ میں لکھا ہے کہ:۔

لکھنؤ کے خورد وکلاں انکے سایہ میں آغوش مادر کو فراموش کرچکے ہیں ان کے عہد میں بھیڑ اور بکری ایک ہی برتن میں پانی پیتے ہیں شیر اور شغال ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص فقیر کو حقیر نگاہ سے دیکھے تو نواب کو ایسی تکلیف ہوتی ہے گویا ان کے سینے میں کسی نے برچھی ماردی۔ کسی قوی کا کسی ضعیف پر ہاتھ اٹھانا جیسے بادشاہ کا ہاتھ پتھر کے نیچے دب گیا۔ زمانہ آصفی سے جو مظلوم ظالموں کے ہاتھ سے تڑپ رہے تھے اب اپنا حق پاکر خوش ہیں انصاف نے اپنے مرکز پر قرار پکڑ لیا۔ شہر میں کوتوالی چبوترہ کے علاوہ تین جگہ عدالتیں مقرر ہیں علمائے عدالت پر جاسوس ہیں ان میں ہمت نہیں کہ کسی واقعہ کو بغیر تحقیق کے حضور میں پیش کرسکیں۔ جاسوسوں پر جاسوس ہیں اس انتظام کے ساتھ خود حضور کی فراست ہر آدمی کی پیشانی سے اس کا حال معلوم کرلیتی ہے۔ امیروں پر ہی کیا موقوف متوسط اور ادنیٰ درجہ کے لوگ بھی کھانے کے بعد آرام کرنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن

نواب فراغت چاشت کے بعد بھی ملاحظہ افزادحالی کے سوا کوئی شغل نہیں رکھتے۔ اول وقت سیر کے لئے جاتے ہیں بعض اوقات شام کو بھی جاتے ہیں مگر اس میں زیادہ وقت صرف نہیں کرتے۔ تمام وقت حساب کی دیکھ بھال میں گزرتا ہے —

یہ تمام تکلیفیں اٹھانا ترک۔ راحت کرنا آسائش خلق کے لئے ہے

شہر کی ترقی ؛ ان کے زمانہ میں شہر کی رونق اور ترقی بھی بہت ہوئی۔ عالیشان عمارتیں بنوائیں۔ فرح بخش۔ حیات بخش۔ موتی محل۔ خورشید منزل، نور بخش دل کشا۔ دل آرام۔ لال بارہ دری۔ بیگم کوٹھی۔ ٹیڑھی کوٹھی۔ کنکروالی کوٹھی، رزیڈنسی کی عمارت بیلی گارد۔ درگاہ حضرت عباس۔ نال کٹورے کی کربلا ویسی عمارتیں ہیں۔ فیل خانہ اصطبل۔ شاگرد پیشہ فوج کی چھاؤنی پختہ تعمیر کرائی۔ بارہ دری کے دونوں طرف کلکتہ کی وضع کی دوکانیں بنوائیں۔ بیلی گارد کے قریب کینی بازار بنوایا۔

انگریزیت اور انگریزی طرز کا شہر ؛ بنارس اور کلکتہ میں انگریزوں کے ساتھ ربط ہونے کی وجہ سے ان میں انگریزیت پیدا ہوگئی تھی۔ انگریزی لباس پہنتے تھے میز کرسی پر کام کرتے تھے۔ شہر کے جنوب میں چار کوس تک جنگل کٹوا کے مغربی طرز کا شہر آباد کیا جو سڑکوں، پارکوں اور عمارتوں سے یورپ کا شہر معلوم ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت اب تک باقی ہے۔ اس زمانہ میں نیا اور پرانا شہر کہا جاتا تھا۔ نئے شہر جو حضرت گنج کے نام سے مشہور ہے مغربی طرز کی عمارتیں بنتی ہیں۔ اور پرانے شہر میں اب تک مشرقی طرز کی عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ کیونکہ علماء شعراء اور اطبا جو مشرقی طرز کے دلدادہ ہیں اسی شہر میں رہتے ہیں۔ سڑکیں اور نالے نالیاں

بوائیں خاکروب نوکر رکھے۔ دو سو سقے اور تین سو گھڑے والے دونوں وقت سڑک پر چھڑکاؤ کرتے تھے۔

زندہ دلی | امور مملکت میں دن رات منہمک رہنے کے باوجود ان کے کچھ شغل ایسے بھی تھے جن سے ان کی زندہ دلی کا پتہ چلتا ہے جنھیں ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ مکانوں کی آرائش کا بہت شوق تھا قصر السلطان جس کو فرح بخش بھی کہتے ہیں اس میں ایک نہر تہ خانوں کے اندر اندر لائی گئی تھی جن میں رنگین کوڑیاں بچھائی گئی تھیں۔ اس طرح کہ دو انگل کی اونچائی سے نہر کا پانی ان پر گرتا تھا مخمل اور اطلس کا کے کار چوبی پردے مقیش کی جھالر جھاڑ فانوس کنول گھڑیاں طرح طرح کے ہتھیار قد آدم آئینے نزدیک بین دوربین معکوس بین ہزاروں کی تعداد میں موقع موقع سے لگائے گئے تھے کرسیاں مرصع وسادہ جگہ جگہ بچھی تھیں۔ رنگین اور خوش الحان چڑیوں کے نقرئی اور طلائی پنجرے جگہ جگہ لٹک رہے تھے۔ اردگرد کا باغ ہر قسم کے پھولوں سے بہشت کا نمونہ تھا روشیں اور کناریاں بہت سلیقہ سے بنائی گئی تھیں اور سبزہ لگایا گیا۔ دلکشا شکار کے لئے تھی گرد وپیش کا جنگل درست کرکے چراگاہ بنائی گئی تھی جس میں قسم قسم کے شکاری جانور چھوڑے گئے تھے۔ شاہ منزل شیروں اور چیتوں کی لڑائی دیکھنے کے لئے تھی۔ پنجرے اور مستحکم مامن بنائے گئے تھے۔

حضور باغ دریا پار تھا اس جگہ ہاتھی کی لڑائی ہوتی تھی اور شاہ منزل سے اس کا نظارہ ہوتا تھا۔

شکار | کبھی کبھی شکار سے بھی جی بہلاتے تھے۔ موسم بہار میں شکار کو جاتے تھے حکومت اودھ کے دستور کے موافق ایک شہر ساتھ ہوتا تھا جس میں امراء امیرزادے فوج، طوائفیں اور ہر طرح کے دکاندار ساتھ ہوتے تھے خود یہ جدت کی تھی کہ سفر

ایسے وقت شروع ہوکہ صبح سویرے شکار گاہ میں پہنچ جائیں۔ لشکر میں جابجا اذان کی آواز شہنائی کی راگ خوانچے والوں کی صدائیں۔ مرغان صحرا کے چہچہے ایک سماں باندھ دیتے تھے۔

بارہ سنگھے شیر اور چیتے شکار پر چھوڑے جاتے تھے اور بندوق سے بھی شکار ہوتا تھا۔

گھوڑوں کا شوق | شہسواری میں کمال کی وجہ سے گھوڑوں کا بہت شوق تھا اس کی نسل کشی اور پرورش کا خاص اہتمام تھا۔ ایک رمنہ بنایا گیا تھا۔ جس میں ہزاروں ایرانی، ترکی اور دکنی گھوڑے چھوڑے گئے تھے جہاں وہ آرام سے چرتے تھے۔ رمنہ کے بیچ میں دریائے گومتی بہتا تھا۔ ولایت سے گھاس منگوا کے لگائی گئی تھی۔ خانہ زاد بچھیڑے حاصل کئے گئے تھے جن کو گائے کا دودھ پلایا اور گھوڑوں کو دودھ میں دانہ بھگو کے کھلایا جاتا تھا بھینسیں گائیں اور بیل گجرات سے منگائے گئے تھے۔

ایک رمنہ شکاری جانوروں کا تھا جس میں شیر چیتے ہاتھی، گینڈے اور بہت سے شکاری جانور چھوڑے گئے تھے۔ شکاری باز اور شکاری چیتے ان کے علاوہ تھے۔

رقص وسرود سے دلچسپی | شجاع الدولہ کے زمانہ سے ناچ گانا اور طوائفوں سے دلبستگی فرمانروایان اودھ کی زندگی کا جزو بن گئی تھی سعادت علی خاں الیاس متین، سنجیدہ اور فلسفی بھی اس سے نہ بچ سکا۔ یہاں تک کہ صبح کو اجلاس کے وقت ایک طرف امرا، فوجی افسر ضروری کاغذات لئے حاضر رہتے تھے دوسری طرف طائفے رقص وسرود میں طبلہ نواز طبلہ نوازی اور شہنائی نواز شہنائی نوازی میں مشغول رہتے تھے

نوبت ونقارہ کی آواز اس پر مستزاد تھی۔ ساز وآہنگ سے فضا گونجتی رہتی تھی۔
اور وہ کام کرنے میں اٹھ اٹھ کے کھڑکیوں سے دیکھتے رہتے تھے یہی حالت تمام
امراء کی تھی۔ عوام کو بھی اس سے دلچسپی تھی جس سے طوائفوں کی کثرت ہو گئی ان
کو شہر سے باہر جانے کی ممانعت تھی حکومت اور روسا کی طرف ان کو بغیر کسی خدمت کے
تحائف وانعام ملتے رہتے تھے۔ سعادت علی خاں حسن پرست اور عاشق مزاج بھی
تھے۔ مگر اس معاملہ میں متانت اور سنجیدگی سے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔
سندر طوائف حسن وجمال میں بے مثال اور خیال گانے میں بے نظیر تھی۔
آصف الدولہ کے زمانہ سے ہی شاہی طوائفوں میں داخل تھی۔ سعادت علی خاں
اس پر فریفتہ تھے مگر وہ میر قاسم علی داستان گو پر عاشق تھی اس وجہ سے اس سے
ہمیشہ اجتناب کرتے رہے۔ مگر انعام واکرام سے دریغ نہیں کرتے تھے۔

ہولی | وہ آصف الدولہ کی طرح ہولی بھی کھیلتے تھے اور اس میں یہ جدت
کی تھی کہ حسینوں اور مہ جبینوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے تھے۔ انشاء اللہ خاں
نے دریائے لطافت میں لکھا ہے:۔

ہولی کے زمانہ میں راجہ اندر پریوں کے جھرمٹ میں
زیادہ زیب دیتا ہے یا ولی نعمت حور ویری نژادوں کے
مجمع میں؟

تعزیہ داری | تعزیہ داری بڑے خلوص اور انہماک سے کرتے تھے۔ اس وقت
ملک ہندوستان میں صرف دس دن تعزیہ داری ہوتی تھی انھوں نے چہلم تک
بڑھادی اور پچاس دن کی تعزیہ داری ہو گئی۔

سیاست | ان کے اعلیٰ درجہ کے سیاست داں ہونے پر تمام مورخین متفق

ہیں۔ آدھا ملک نکل جانے کا ان کو بڑا قلق تھا۔ رزیڈنٹ سے مستقل کشمکش رہتی تھی۔ انھوں نے اپنے انگریز مصاحب مسٹر اڈرلی کو لوہے کے پل کی خریداری کے بہانے لندن بھیجا اور حکومت برطانیہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان کی حکومت کا ٹھیکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے ہم کو دیدیا جائے۔ اس وقت انگریزی مقبوضات کا جمع خرچ پینتالیس کروڑ کمپنی سے بجز فاضلات کے اور کچھ نہیں ملتا تھا۔ انھوں نے ایسا حساب بتایا کہ جس سے ایک کثیر رقم دولت برطانیہ کو ملتی۔ تجویز پسند کی گئی اور پچیس کروڑ روپیہ بطور ضمانت طلب کیا گیا۔ لارڈ مائرا اس وقت جارج چہارم کے مصاحب خاص بہت مقروض تھے۔ جائداد نیلام پر چڑھی تھی جس سے وہ بہت پریشان تھے۔ مسٹر اڈرلی نے نواب کو اسکی امداد کے لئے لکھا۔ انھوں نے تین لاکھ روپیہ ان کو بھیجدیا جس سے وہ قرضہ سے سبکدوش ہوگئے ان کی پریشانی خوشحالی سے بدلی۔ اتفاق سے لارڈ مائرا گورنر جنرل بناکے بھیجے گئے۔ انھوں نے نواب کو لکھا کہ میں آپ کی تمام شکایتیں دور کردوں گا۔ مگر بدقسمتی سے جب وہ ہندوستان پہنچے تو نواب کا کام زہر سے تمام ہوچکا تھا۔

فراست فراست بھی ان کی بلا کی تھی۔ انشاء نے لطائف السعادۃ میں لکھا ہے کہ وہ لوگوں کے دل کی بات پیشانی بھانپ لیتے تھے۔ شیر زماں خاں افغانی کو دور سے آتا دیکھ کے فرمایا اس کو دربانوں نے روکا ہے ان کی شکایت کرے گا اور وہی ہوا۔

طبیعت طبیعت میں نفاست بہت تھی اس وقت تک امراء و سلاطین کی سواری کے ساتھ رات کو مشعلیں ہوتی تھیں۔ انھوں نے چاندی سونے کی دس سو لالٹینیں بنوا کر جھڑوں میں لگوائیں جن میں شمعیں جلتی تھیں۔ اس سواری کے جلوس کی رونق بھی بڑھ گئی۔

ادبیت وہ اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز اور بلند پایہ ادیب تھے انشاء اللہ خاں
نے دریائے لطافت میں لکھا ہے کہ منصور کی اردو میں تقریر و تحریر مقامات حریری
کی یاد دلاتی ہے۔ کوئی ایسا فصیح بیان ہوا ہے نہ ہو گا۔ کسی وقت آپکی بات
لطیفہ سے خالی نہیں ہوتی کبھی تجنیس ہے کبھی ہے کبھی توشیح ہے۔ کبھی
محتمل الضدین بظاہر یہ خوشامد معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی ادبیت
کے اظہار کا حق ادا نہیں ہوا۔ حریری نے انشا پردازی کی ہے اور سعادت علی خاں
کی روزانہ کی معمولی بات چیت اور روزمرہ کے احکام ہیں۔ یہ بات حریری کو
کہاں نصیب انشاء نے ان کی بات چیت میں ایک کتاب لطائف السعادۃ لکھی
جو ۱۹۵۵ء میں میسور سے شائع ہوئی مگر وہ نسخہ ناقص معلوم ہوتا ہے اس میں
صرف چھپن ۵۶ لطیفے ہیں وہ لطائف بھی نہیں ہیں جو اور کتابوں میں ملتے ہیں۔
یا لکھنؤ کے پرانے لوگوں کی زبان پر ہیں۔ ان کی باتوں میں ایک فلسفی کا تعقل و
سنجیدگی اور ایک شاعر کی شاعری کا اختصار معنی آفرینی فصاحت و بلاغت سادگی
و پرکاری کا دلکش امتزاج تھا جو ان کے برجستہ فقروں کی جان تھا۔ بیلی صاحب
رزیڈنٹ بڑے صاحب ذوق انگریز فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے جب
ان کو سعادت علی خاں کی یہ خصوصیت معلوم ہوئی تو انھوں نے کہا تو سہی میں ان سے مختصر بات
کہوں اور ان کو طولانی جواب دینا پڑے۔ کچھ مختصر سوالات اپنے ذہن میں مرتب
کئے جن کا جواب ان کے خیال میں بہت طولانی تھا وہ نواب کی ملاقات کو آئے اور
رسمی مزاج پرسی کے بعد پوچھا سرکار کے عجائب خانہ میں کون کون سے جانور ہیں؟ فرمایا
از شیر تا بٹیر۔ پھر پوچھا آپ کی مملکت کے کیا حدود ہیں کہا از سنگ تا گنگ
بیلی صاحب حیران ہو گئے اور پھر کسی سوال کی جرأت نہ ہوئی۔ ایک صوفی حاضر ہوئے

عرض کی ہم فقیر ہیں دعا ہمارا کام ہے فرمایا آپ فقیر ہیں یا فخیر یا فکیر وہ ہکا بکا ہو گئے انشاء اللہ خاں کی طرف دیکھا ان کی بھی سٹی گم تھی کہنے لگے ہم نادان بے علم کیا جانیں سرکار ہی ارشاد فرمائیں فرمایا فقیر جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے الفقیر سواد الوجہ فی الدارین فقر دین و دنیا کی روسیاہی ہے۔ فخیر جو خود کچھ نہ ہو اور باپ دادا پر فخر کرے۔ مختالاً فخوراً فکیر غور و فکر کرنے والا یتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض۔ عرض کی خدا کی قسم آپ لباس وزارت میں قطب زمانہ اور ولیوں کے سرتاج ہیں

آفرین علی خاں درباری امیر رویت ہلال کی گواہی دینے غفران مآب کے پاس پہنچ گئے انھوں نے کہا آپ داڑھی منڈواتے ہیں آپکی گواہی قبول نہیں۔ نواب کو معلوم ہوا جب وہ دربار میں آئے تو کہا۔

تو کار زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

کرنل کارنیلس کو تحفہ میں تلوار دی کھری تلوار ہیرے اٹھالیتی ہے کرنل نے کہا یہ تلوار ہیرے نہیں اٹھاتی۔ فرمایا وہ طماع نہیں ہے۔
انشاء نے کسی بات میں بے جا دخل دیا فرمایا خط غلط معنی غلط املا غلط انشاء غلط۔

موہان کے ایک عالم کو قضا کا عہدہ دینے کے لئے بلایا ان سے کہا کہ کئی قاضی رشوت کے الزام میں نکالے جا چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سرکار عالی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں مگر کھانے میں سب مل جاتی ہیں۔

داروغہ اصطبل نے درخواست دی کہ گھوڑوں کا مہیلا پکانے کے لئے ایندھن کا حکم صادر فرمایا جائے اس پر حکم لکھا:- اخور طویلہ برائے مہیلا
سرکاری وزی نے اضافہ تنخواہ کی درخواست کی حکم ہوا

گر زمیں را با آسماں دوزی نہ دہندت زیادہ از روزی

شراب پینا جرم تھا۔ ہندو ہولی میں شراب پینا ضروری سمجھتے ہیں۔ لالہ مناَ رائے فریاد نے درخواست دی

قرقِ مے ایام ہولی میں کم ہو گیا کیجئے جی میں آتا ہے کہ اس صورت میں کنٹھی لیجئے

کایتھوں کا گر تماشہ دیکھنا منظور ہو شاہ دو دن کے لئے ہم کو اجازت دیجئے

حکم ہوا ؎ محتسب را درونِ خانہ چہ کار

قانون بنایا کہ جس منشی سے املا میں کسی حرف کی غلطی ہو اس حرف کے عدد کے برابر اس پر جرمانہ کیا جائے۔ ایک منشی نے بہر نوع کو بہر نو لکھا۔ اس پر حکم لکھا

منشی نو لفظ نوع را بطرز نو نوشت عین خطا کرد ہفتاد روپیہ جرمانہ

فصاحت | ان کی فصاحت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ملائی کو بالائی کہتے تھے یہ اتنا پسند کیا گیا کہ پھر کسی نے ملائی نہیں کہا

قدر کمال | مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ ان کی ذاتی قابلیت اہل کمال کی قدر دانی پر مجبور کرتی تھی۔ میر تقی میر کا واقعہ مشہور ہے چوک میں تحسین کی مسجد سے متصل سڑک کے کنارے کچھ دوکانیں مسجد سے متعلق ہیں انکی چھت صحن مسجد سے متصل ہے نہیں معلوم کب سے وہاں شعراء شرفا اور فضلا کا مجمع یاران عہد کی طرح سہ پہر کو ہوتا تھا۔ کب سے ہوتا چلا آرہا تھا یہ نہیں معلوم مگر ہمارے زمانہ تک کچھ باقی تھا۔

سعادت علیخاں کی سواری ادھر سے گزری سب تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ میر صاحب اکڑے بیٹھے رہے۔ خفا اس پر تھے کہ آصف الدولہ کے

بعد نئے انتظام میں ان کی تنخواہ رک گئی تھی انشاء خواصی میں تھے نواب نے پوچھا یہ کون شخص ہے۔ کیا میر تقی میر گھر تک پہنچ گئے۔ ایک ہزار روپیہ اور خلعت میر صاحب کو بھیجا۔ انھوں نے واپس کر دیا۔ انشاء اللہ خاں دوبارہ خلعت در روپیہ لے کے آئے اور سمجھایا کہ حکمران وقت سے اتنی سرکشی اچھی نہیں۔ خلعت واپس کرنا گستاخی و توہین ہے۔ وہ بھی سمجھنے کہ دریا میں رہ کے مگرمچھ سے بیر اچھا نہیں۔ اپنی گستاخی کا احساس ہوا۔ خلعت و انعام لے لیا رکی ہوئی تنخواہ جاری ہو گئی۔ دربار میں آمد و رفت شروع ہو گئی۔ نواب اپنے سامنے کرسی پر بٹھاتے تھے اور اپنا پیچوان پینے کو دیتے تھے جو بہت بڑا اعزاز تھا۔

قتیل سے ملنے کی خواہش کی انھوں کہا میں درباری پگڑی باندھ کے نہیں آؤں گا تعظیم کو اٹھنا ہو گا اور حقہ میرے ساتھ ہو گا۔ سب منظور ہوا ایک کمرہ میں بٹھا دیئے گئے۔ جب نواب آئے تو الٹے انھیں تعظیم کے لئے اٹھنا پڑا۔ اتنا لحاظ انھوں نے بھی کیا کہ نواب کے سامنے حقہ کو منھ نہیں لگایا۔

میر سید علی اس دور کے سب سے بڑے موسیقار تھے انھوں نے پہلے پہل صحیح راگوں پر مرثیہ پڑھا جسے سوز باندھنا کہتے تھے اسکی بڑی شہرت ہوئی۔ نواب نے بھی سننے کی فرمائش کی کہا میں سید ہوں کسی کے گھر نہیں جاتا یہ جواب سن کے نواب نے کہا ہاں سید تو ہیں مگر ڈھاریوں کا اختیار کر رکھا ہے میر سید علی کہنے کو تو کہہ گئے مگر

خیال کیا کہ کہیں عتاب نہ ہو اس ڈر سے شہر چھوڑنے لگے۔ انشاء اللہ خاں کو معلوم ہوا تو انھوں نے نواب سے عرض کیا مولوی دلدار علی عروس سلطنت کا جھوا ہیں اور میر سید علی نتھ ہیں جو سہاگ کی علامت ہے وہ سہاگ لٹ رہا ہے پوچھا کیا بات ہے کہا وہ خوف سے شہر چھوڑ رہے ہیں۔ دو سو روپیہ ماہوار گھر بیٹھے ان کا وظیفہ مقرر کر کے انھیں مطمئن کر دیا۔ ؎۱

پرکاش ایک رقاص کوڑیوں اور رتناسوں پر ناچتا تھا نواب اس کا رقص دیکھ کے بہت خوش ہوئے اور پانچسو روپیہ اسکی تنخواہ مقرر کر کے شہر سے باہر جانے کی ممانعت کر دی

یہ قدر دانیاں اور ناز برداریاں وہ ہیں جن کی مثال نہیں ملتی

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ علم و کمال کا گھر بن گیا

عربی شاعری ہندوستان کا ادبی اور تمدنی رشتہ ہمیشہ ایران سے رہا ہے ہر چیز وہیں کی مستند اور تقلید کے قابل سمجھی جاتی تھی۔ عربی ادب سے کوئی خاص لگاؤ

؎۱ اس روایت میں محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اپنی طرف سے یہ اضافہ کیا کہ تفضل حسین خاں عروس سلطنت کا نولکھا ہار ہیں۔ خان علامہ سعادت علی خاں کی تخت نشینی کے چھ مہینے بعد ۱۲۱۱ھ میں انتقال کر چکے تھے۔ اس وقت غفرانمآب کے چھوٹے صاحبزادے تین سال کے تھے۔ یہ واقعہ نواب کی آخری عمر کا ہے

مولانا عبدالحلیم شرر کا بیان ہے کہ غفرانمآب مولانا دلدار علی نے عراق میں تعلیم پائی تھی۔ وہ عربی کا نیا ذوق اپنے ساتھ لائے اور ادبیت میں خاندان اجتہاد کو فرنگی محل والوں پر فوقیت حاصل رہی اور آج تک ہے۔

مولانا دلدار علی غفرانمآب کے شاگرد مرزا محسن مرزا مغل اور مولانا احمد علی محمد آبادی عربی میں بہت اچھے شعر کہتے تھے۔
علمائے اہل سنت میں مولانا حسن رضا عربی کے زبردست شاعر تھے ان کی کتاب مطارح الاذکاران کے کمال فن کی شاہد ہے

فارسی شاعری فارسی شعر و سخن کا تو ہندوستان کا قدیم ذوق ہے لکھنؤ میں فارسی گو شعراء ہمیشہ سے تھے۔ سعادت علی خاں کے دور میں اس کو بڑی ترقی ہوئی ان کے دو بیٹے کرامت علی خاں تجلی اور محب علی خاں۔ فارسی میں شعر کہتے تھے، تجلی کا شعر ہے ۔

دیدار تو سرمایۂ عشق است ولیکن
ایں دولت بیدار نصیب دگراں شد

تمکین کہتے ہیں

غافل چہ شناسد کہ تمکین است خموش است
پیوستہ تمیں بر سر کیں است خموش است

محمد زماں آوارہ باش شاگرد مرزا فاخر کہتے ہیں ؎

دیراں قاتل بدخو سر را ہے مارا
گشت از نیچہ نیم نگاہے مارا

مرزا محمد بہار

گفتم کر یا قت از لب تو عمر جاودیان ز مود عیسیٰ بر فلک جاروبیں زمن

مرزا علی خاں جراح ؎

دلبراں چشم من از گریہ بافسوں . وہ کہ دل چاک نمودند ورہ خوں

ان کے علاوہ باسط علی خاں باسط مولانا اکبر علی اکبر تراب علی تراب امان علی ثمین، فخرالدین احمد معروف مرزا جعفر شیر علی حریق، میر محمد حسین حسین، مرزا محمد اکبر خاور حافظ یار خاں راغب۔ شیخ حسین علی خاں تزئین۔ مولوی عبدالاحد رابط۔ حافظ سعدالدین سعد۔ مرزا آغا جان زائر۔ محمد حسین سامی۔ محمد فتح یاب علی خاں شائر۔ شجاعت علی خاں شجاعت محمد علی شرر معین الدین بسمل۔ شیخ فضل حق عرف غلام منا ساحر نواب صمصام الدولہ عاشق مشہور شعراء تھے اور سب سے بڑھ کے محمد حسن قتیل اور انشاء ایسے استاد فن شہر میں موجود تھے

فارسی گو ہندو شعراء | بھگوانداس بسمل کا شعر ہے ؎

بے خود نمود بسکہ مرا چشم مست او دستے بدل سپردم و بدست او

جسونت سنگھ پروانہ

ازیں نظارہ بازی او ترشد اکھی خودرا تو کارے می کنی اے دل کہ رسوا کنی خودرا

جواہر سنگھ جوہر خلف بختاور سنگھ ؎

کار زمانہ پیش حیا مے نیافتم دنیا سوائے نقش سراب نیافتم

درگا پرشاد بسمل۔ منشی جگل کشور بہار۔ کشن نرائن حیراں جسونت رائے جسونت۔ جواہر لال دبیر، لالہ لچھمی نرائن رفیق

لالہ بھاگ مل رنج۔ بودہ سنگھ شاداں۔ رادھے کشن شائق۔ بھگوان سہائے شہید۔ لالہ بینی پرشاد ثابت مل۔ گربخش ادیب (نواب کے   لالہ صاحب
رائے زیاد لالہ کندن لال اشکی، لالہ بیجنا تھا انس۔ رائے بالک رام صبور نی مشہور ہندو شعرا تھے۔

اردو شاعری | شعر و سخن کا جو چرچا اس زمانہ میں ہوا وہ اس سے پہلے نہ تھا۔ آصف الدولہ کے زمانہ کے شعرا میر تقی میر سعادت یار خان جرأت انشا یہ سب زندہ تھے۔ باہر سے آنے والوں کا سلسلہ جاری تھا۔

دہلی سے قائم علی خاں قائم۔ عظیم الدین خاں آشفتہ۔ میر علی بیگ قاسر جہانگیر بیگ جہانگیر۔ رضی الدین سروری۔

کشمیر سے میر عبد العلی تحسین۔ مرزا قاسم علی راحت۔

مراد آباد سے شیخ مہدی علی ذکی۔ میر اکبر علی عظمت۔

فرخ آباد سے منشی مہر چندر

لاہور سے منشی محمد احمد خاں

سانڈی سے موجی رام موجی

شاہجہاں پور سے حکیم شاہ حاذق خاں

عظیم آباد سے آغا حسین قلی

کڑہ مانک پور سے شاہ کمال الدین

بہار سے راجہ بینی بہادر

بریلی سے۔ میر شاہ حسین حقیقت

امروہہ سے میر عارف علی شاہ

شاہ آباد سے عوض رائے مسرّت

سامانہ سے میر فرزند علی موزوں

اکبرآباد سے رضا علی بیگ آشفتہ۔ محمد فائق۔ خدا بخش موج

بدایوں سے شیخ معین الدین

فتحپور سے پیر بخش مہجور

ایران سے مرزا حاجب اور نواب کی عنایت سے مطمئن اور خوشحال ہو گئے

لکھنوی شعراء:۔

الف:۔ مرزا اشرف الدین اشرف نواب امین الدولہ امیر مرزا جواد علی احقر۔ محمد وارث اظہار۔ مرزا مہدی آخگر مرزا حسین علی ابتر۔ شیخ امان علی اوباش مرزا فصیح۔ مرزا حسن دارخاں احسن۔ شیخ اشرف الدین الہام

ب:۔ لطف علی بیتاب مظہر علی برہان۔ شیخ نبی بخش بیہوش میاں بشارعلی بشارت (خواجہ سرا) محمد علی بیہوش

ت:۔ میر سعادت علی تسکین۔ میر بندہ علی تائب مرزا محمد باقر تدبیر شاہ تراب علی تراب۔ جواد علی تصویر خواجہ محمد علی تمنا محمد اسحٰق تمنا۔ صلاح الدین تمکین۔ محمد عیسیٰ تنہا۔ مرزا عطائی بیگ تپاں

ث:۔ میر شجاعت ثابت اصالت خان ثابت۔ ثابت علیخاں ثابت مرزا علی ثمر

ج:۔ مرزا علی نقی جنون۔ مرزا جعفر جعفر۔ مرزا احمد علی جوہر غلام مرتضیٰ جنوں۔

ح - میر چراغ علی حیف، میر حامد علی حامد، شیخ ولایت حسین حسام لطف علی

طالب، شیخ حیدر علی صاحب

خ :- امام الدین خرم

د - محمد عابد دل۔ فضل علی دانا۔ میر مہدی داغ خلف میر سوز

ذ - ذکاءاللہ ذکاء۔ محمد حسن ذکا۔ میر منعم ذہین میاں بشارت اللہ ذاکر

ر - میر رضا علی رضا۔ میر محمدی رضا۔ مرزا رضی الدین رضی میر ابوالمعالی

رغبت، رفیع الدین خاں رفیع، خان عالم خاں رشید۔ میر شجاع رعب۔

منشی رونق علی رونق (منشی دارالانشاء)

ز - میر حسن عسکری زار۔ خلف میر نقی میر۔ آغا مرزا جان زائر۔

ش - نواب افتخار الدین خاں شہرت

ص - شیخ محمد اشرف صواب - جعفر علی خاں صادق - صادق علی خاں

عرف میر سیتا صادق - انور علی بیگ صادق - منشی میر حسن صابر (منشی

دفتر سرکاری)

ض - جعفر حسین ضمیر۔ میر شاہ حسین ضبط

ط - شمس الدین طالع - خواجہ محمد خاں طاہر محمد علی طور

ظ - منشی ظہور محمد ظہور

ع - طالب علی خاں عیشی - شاہ مظہر عشاق - مرزا محوی عاشق

میر زین الدین عشق - مرزا رضا حسین عیش - مرزا اکبر علی عشرتی - عبدالعلی

عزلت - میر کلو عرش (خلف میر تقی میر)

غ۔ منور خاں غافل۔ مرزا مغل غافل۔ مہر اللہ غفور۔ غضنفر علی غضنفر

ف۔ میر فیض علی فیض (خلف میر تقی) فدا حسین فدا۔ غلام محمد فائق

میر ببر علی فرہاد۔ میر بندہ علی فصاحت۔ مرزا مغل فرہاد۔ مرزا آصف بیگ

فرصت۔ مرزا علی نقی فراق۔ کرامت علیخاں فرخ۔ شیخ مغل فانی

ق۔ حکیم حیات اللہ قلاش۔ مرزا علی بیگ قادر۔ میر فخر الدین قمر سرفراز علی

بیگ قادر۔

ک۔ نواب مہدی علی کوثر۔ مرزا مغل کیواں میر جرأت علی کرامت۔

گ۔ محمد علی گریاں۔ محمد علی گستاخ۔ مرزا اشرف علی بیگ گوہر

م۔ فخر الدین ماہر خلف اشرف علیخاں۔ فغاں۔ مرزا غلام حیدر مجذوب

(خلف سودا) سید احسان حسن مخلوق (خلف میر حسن)۔ مرزا علی مہلت

محمد یار بیگ مائل۔ آغا مرزا حسن علی محنت۔ مرزا کاظم بیگ مبتلا۔ مرزا

مدحت علی مدحت۔ محمد مرزا ملال، میر احسن مشتاق۔ مرزا ابراہیم بیگ مشتاق

مخلص علی خاں مخلص، مقبول نبی مقبول، مظفر علی مظفر، محمد جعفر محمود۔ مرزا

محمد محمود کلو خاں مغموم۔ جلال الدولہ مہدی علی، مہدی۔ شیخ صفی الدین مقبول

منور خاں مہر۔ محمد بخش مسرور۔ محمد بخش مہجور

ن۔ رجب علی بیگ نامی۔ مرزا احسان الدین حیدر نامی۔ مولوی محسن اللہ نامی

مرزا مغل نامی۔ مرزا ناظم علی ناظم۔ شیخ حیدر علی نثار۔ مرزا محمد ناصر ناصر۔ قاسم

علی نزار۔ محمد خاں نالاں۔ نوازش حسین خاں نوازش، مرزا نظر علی نظر۔

و۔ وجیہ الدین وجیہ۔ مرزا اسحٰق وصل۔ مرحمت خاں والہ۔ شیخ حیدر واہب

مرزا محمد علی ولی۔ شیخ کرم علی وحشی، محمد بخش واحد۔ مرزا بہادر علی وفا۔
۵۔ محمد ہاشم ہاشمی۔ مرزا مغل ہنر

ہندو شعراء | گنگا سنگھ نادر۔ گنگا پرشاد رند۔ رام جس مغموم۔ کھیم داس تمنا۔ کرپا شنکر فیض، چنی لال حریف۔ بینی پرشاد ظریف، کنور سین مضطر امرناتھ شعلہ۔ چھنو لال طرب لالہ ٹیکا رام تسلی۔ کانجی مل صبا۔ پنڈت اجودھیا پرشاد وحدت۔ کنور بہادر گریاں۔ منو لال صبا۔ پنڈت نصرت لالہ وارنست لچھمن رام خورسند۔ آسا رام ذوق۔ شیو پرشاد ذوق۔ پنڈت لچھمی رام سرور۔ لالہ شیوا رام شائق۔ پنڈت طالب رائے طالب۔ لالہ بھکاری داس عزیز۔ کنور رتن سنگھ زخمی۔ بنجاب رائے والی۔ لالہ صاحب رائے فرباد لالہ موجی رام موجی۔ جے گوپال نقاد۔ طوطا رام عاصمی صاحب رائے گلشن

شاعرہ عورتیں | عورتوں میں بھی شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ میر تقی میر کی بیٹی بیگم نام بیگم تخلص بہت عمدہ شعر کہتی تھیں ان کا شعر ہے

برسوں سرگیسو ہیں گرفتار نور کھا اب کہنے ہو کیا تم نے ہمیں مار تو رکھا

یہ تو میر تقی میر کی بیٹی تھیں۔ اس زمانہ کے رؤسا کی لونڈیاں شعر کہتی تھیں۔

شاہزادہ سلیمان شکوہ کی کنیز نوبہار دلیل تخلص کا شعر ہے ؎

میں فرشتہ کی بھی سنتی نہیں ناصح کیا ہے اپنی کرتوت پہ جس وقت کہ آجاتی ہوں

تم سے اللہ رکھے اپنی اماں میں تم تو ہم سی پریوں کو بھی دیوانہ بنا دیتے ہو

انشاء اللہ خاں کی کنیز چنبیلی یاسمن تخلص بڑی طباع و ذہین تھی اس کا شعر ہے ؎

غ ۔ منور خاں غافل ۔ مرزا مغل عاقل ۔ مہراللہ عبور ۔ غضنفر علی غضنفر

ف ۔ میر فیض علی فیض (خلف میر تقی) فدا حسین فدا ۔ غلام محمد فائق میر ببر علی فرہاد ۔ میر بندہ علی فصاحت ۔ مرزا مغل فرہاد ۔ مرزا آصف بیگ فرصت ۔ مرزا علی نقی فراق ۔ کرامت علیخاں فرخ ۔ شیخ مغل فانی

ق ۔ حکیم حیات اللہ قلاش ۔ مرزا علی بیگ قادر ۔ میر فخرالدین قمر سرفراز علی بیگ قادر ۔

ک ۔ نواب مہدی علی کوثر ۔ مرزا مغل کیواں میر جرأت علی کرامت ۔

گ ۔ محمد علی گریاں ۔ محمد علی گستاخ ۔ مرزا اشرف علی بیگ گوہر

م ۔ فخرالدین ماہر خلف اشرف علیخاں ۔ فغاں ۔ مرزا غلام حیدر مجذوب (خلف سودا) سید احسان حسن مخلوق (خلف میر حسن) ۔ مرزا علی مہلت محمد یار بیگ مائل ۔ آغا مرزا حسن علی محنت ۔ مرزا کاظم بیگ مبتلا ۔ مرزا مدحت علی مدحت ۔ محمد مرزا ملال، میر احسن مشتاق ۔ مرزا ابراہیم بیگ مشتاق مخلص علی خاں مخلص، مقبول نبی مقبول، مظفر علی مظفر، محمد جعفر محمود ۔ مرزا محمد محمود کلو خاں مغموم ۔ جلال الدولہ مہدی علی مہدی ۔ شیخ صفی الدین مقبول منور خاں مہر ۔ محمد بخش مسرور ۔ محمد بخش مہجور

ن ۔ رجب علی بیگ نامی ۔ مرزا احسان الدین حیدر نامی ۔ مولوی محسن اللہ نامی مرزا مغل نامی ۔ مرزا ناظم علی ناظم ۔ شیخ حیدر علی نثار ۔ مرزا محمد نادر نادر ۔ قاسم علی نزار ۔ محمد خاں نالاں ۔ نوازش حسین خاں نوازش ۔ مرزا نظر علی نظر ۔

و ۔ وجیہ الدین وجیہ ۔ مرزا اسحٰق وصل ۔ مرحمت خاں والہ ۔ شیخ حیدر واہب

مرزا محمد علی ولی۔ شیخ کرم علی وحشی، محمد بخش واحد۔ مرزا بہادر علی وفا۔
۵۔ محمد ہاشم ہاشمی۔ مرزا مغل ہنر

ہندو شعراء | گنگا سنگھ نادر۔ گنگا پرشاد رند۔ رام جس مغموم۔ کھیم داس تمنا۔ کرپا شنکر فیض، چنی لال حریف۔ بینی پرشاد ظریف، کنور سین مضطر امرناتھ شعلہ۔ چھنو لال طرب لالہ ٹیکا رام تسلی۔ کانجی مل صبا۔ پنڈت اجودھیا پرشاد وحدت۔ کنور بہادر گریاں۔ منو لال صبا۔ پنڈت نصرت لالہ وارفتہ۔ لچھمن رام خورسند۔ آسا رام ذوق۔ شیو پرشاد ذوق۔ پنڈت لچھمی رام سرور۔ لالہ شیوا رام شائق۔ پنڈت طالب رائے طالب۔ لالہ بھکاری داس عزیز۔ کنور رتن سنگھ زخمی۔ بخاب رائے والی۔ لالہ صاحب رائے فرہاد لالہ موجی رام موجی۔ جے گوپال نقاد۔ طوطا رام عاصی صاحب رائے گلشن

شاعرہ عورتیں | عورتوں میں بھی شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ میر تقی میر کی بیٹی بیگم نام بیگم تخلص بہت عمدہ شعر کہتی تھیں ان کا شعر ہے

برسوں سر گیسو ہیں گرفتار نو رکھا   اب کہنے ہو کیا تم نے ہمیں مار تو رکھا

یہ تو میر تقی میر کی بیٹی تھیں۔ اس زمانہ کے رؤسا کی لونڈیاں شعر کہتی تھیں۔
شاہزادہ سلیمان شکوہ کی کنیز نوبہار دلیل تخلص کا شعر ہے

میں فرشتہ کی بھی سنتی نہیں ناصح کیا ہے   اپنی کرتوت پہ جس وقت کہ آجاتی ہوں
تم سے اللہ رکھے اپنی اماں میں تم تو   ہم سی پریوں کو بھی دیوانہ بنا دیتے ہو

انشاء اللہ خاں کی کنیز چنبیلی یاسمن تخلص بڑی طباع و ذہین تھی اس کا شعر ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت

نواب محمد تقی ہوس کی دو بیٹیاں حیا و پارسا شاعرہ تھیں۔

پارسا کا شعر ہے ؎

یہ قصر لاجواب بنا اور بگڑ گیا تن سورت حباب بنا اور بگڑ گیا

حیا کہتی ہیں ؎

چشم خونبار ترے ہاتھ سے دم ناک میں ہے دل میں اک بوند تو رہنے دے لہو کی میرے

ان پڑھ شعراء | ذوقی فقیر الٰہی بخش ناداں، شیر علی نالاں، احمد علی زوراں پڑھ تھے اور ایسے شعر کہتے تھے کہ مصحفی حیرت سے لکھتے ہیں

الٰہی بخش کا مشق سخن جاری رہی تو وہ بڑے بڑوں سے سبقت لے جائے گا۔

احمد علی زور کے متعلق لکھتے ہیں۔

باوجود بے علمی کے اس کے کلام میں فنی غلطیاں نہیں ہوتیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ معاملہ زبان عروض و قوافی اور مصطلحات شعراء اتنے عام اور زبانوں میں اس طرح بسے ہوئے تھے کہ جہلا بھی انکے استعمال پر قادر تھے

نواب سعادت علیخاں کے خاندان کا کہار گر بخش ادیب پڑھا لکھا تھا۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ کبھی کبھی نواب بھی اس کے شعر سنتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے۔ اس وقت لکھنؤ اہل کمال کا مرکز تھا اور ہر طرف سے لوگ دوڑے چلے آرہے تھے۔

انشاء اللہ خاں کا بیان ہے کہ

دہلی کے جتنے صاحب سلیقہ مرد و زن لکھنؤ آگئے ہیں خود دہلی میں نہیں رہے۔ سپاہی و مصاحب پیشہ داستان گو اور بذلہ سنج مطرب و قوال و قصہ خوان سب دہلی سے آئے ہیں (دریائے لطافت)

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

لکھنؤ دوسرے شہروں پر شرف و ترجیح رکھتا ہے اور دہلی کی جان ہے۔

ہے، کیونکہ فصحاو سلیقہ شعار جو شہر کی جان ہوتے ہیں سب یہاں جمع ہو گئے ہیں اور دہلی ایک بے روح جسم اور لکھنؤ اس کی جان ہے"

مصحفی ریاض الفصحا کی وجہ تصنیف یہ بیان کرتے ہیں :-

"اس کا سبب تصنیف کثرت شعرائے لکھنؤ ہے کہ دہلی کی آبادی اسکے پاسنگ کو نہیں پہنچتی"۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان نے ایک ہزار سال تک علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا جو سرمایہ اکٹھا کیا وہ سب کھنچ کے لکھنؤ آگیا اور اہل لکھنؤ نے اس میں اضافہ کیا اور ہر بات میں دلی سے آگے بڑھ گئے اس کا احساس دونوں کو ہوا۔ دہلی کی لسانی اور تمدنی مرکزیت ختم ہو گئی اس پر تفوق و برتری کی بحثیں چھڑ گئیں اور دہلی والوں کو اقرار کرنا پڑا کہ اہل لکھنؤ تہذیب وتمدن اور حسن بیان میں ہم پر فوقیت رکھتے ہیں۔ انشاء اللہ خاں کہتے ہیں :-

"دہلی میں ہر شخص کو فصاحت نصیب نہیں بلکہ گنتی کے لوگوں میں منحصر ہے جیسا کہ خود میرا تجربہ ہے کہ کوئی محلہ فصیح آدمی سے خالی نہیں۔ کہیں دو کہیں تین کہیں چار فصیح موجود ہیں ممکن کوئی محلہ خالی بھی ہو لیکن زیادہ تر ایسا ہی ہے۔ چند محلے... ایسے ہیں جن کے در و دیوار سے فصاحت ٹپکتی ہے"۔ اس کے مقابل میں لکھنؤ کی یہ حالت بیان کرتے ہیں

"اس شہر کا ہر محلہ فصحاء کا محلہ ہے اور اس سے انکار بے عقلی ہے"

دوسری جگہ پر دہلی پر لکھنؤ کی برتری کی وجہ یہ بتلاتے ہیں

لکھنؤ والوں نے دہلی والوں سے جو حاصل کیا اس میں وہ انکے برابر ہیں

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

نواب محمد تقی ہوس کی دو بیٹیاں حیا و پارسا شاعرہ تھیں۔

پارسا کا شعر ہے

تن سورت حباب بنا اور بگڑ گیا　　یہ قصر لاجواب بنا اور بگڑ گیا

حیا کہتی ہیں

دل میں اک بوند تو رہنے دے لہو کی میرے　　چشم خونبار ترے ہاتھ سے دم ناک میں ہے

ان پڑھ شعراء | ذوقی فقیر الٰہی بخش نانی، شبیر علی نالاں، احمد علی زدران پڑھ تھے اور ایسے شعر کہتے تھے کہ مصحفی حیرت سے لکھتے ہیں

الٰہی بخش کا مشق سخن جاری رہی تو وہ بڑے بڑوں سے سبقت لے جائے گا۔

احمد علی زدر کے متعلق لکھتے ہیں۔

باوجود بے علمی کے اس کے کلام میں فنی غلطیاں نہیں ہوتیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ معانی بیان عروض و قوافی اور مصطلحات شعراء اتنے عام اور زبانوں میں اس طرح بسے ہوئے تھے کہ جہلا بھی انکے استعمال پر قادر تھے

نواب سعادت علیخاں کے خاندان کا کہار گنج بخش ادیب پڑھا لکھا تھا۔ اردو فارسی دونو زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ کبھی کبھی نواب بھی اس کے شعر سنتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے۔ اس وقت لکھنؤ اہل کمال کا مرکز تھا اور ہر طرف سے لوگ دوڑے چلے آرہے تھے۔

انشاء اللہ خاں کا بیان ہے کہ

دہلی کے جتنے صاحب سلیقہ مرد و زن لکھنؤ آگئے ہیں خود دہلی میں نہیں رہے۔ سپاہی و مصاحب پیشہ داستان گو اور بذلہ سنج مطرب و قوال و قصہ خوان سب دہلی سے آئے ہیں (دریائے لطافت)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

لکھنؤ دوسرے شہروں پر شرف و ترجیح رکھتا ہے اور دہلی کی جان ہے۔

ہے کیونکہ فصحاو سلیقہ شعار جو شہر کی جان ہوتے ہیں سب یہاں جمع ہو گئے ہیں اور دہلی ایک بے روح جسم اور لکھنؤ اس کی جان ہے"

مصحفی ریاض الفصحا کی وجہ تصنیف یہ بیان کرتے ہیں :۔

"اس کا سبب تصنیف کثرت شعرائے لکھنؤ ہے کہ دہلی کی آبادی اسکے پاسنگ کو نہیں پہنچتی"۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان نے ایک ہزار سال تک علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا جو سرمایہ اکٹھا کیا وہ سب کھنچ کے لکھنؤ آ گیا اور اہل لکھنؤ نے اس میں اضافہ کیا اور ہر بات میں دلی سے آگے بڑھ گئے اس کا احساس دونوں کو ہوا۔ دہلی کی لسانی اور تمدنی مرکزیت ختم ہو گئی اس پر تفوق و برتری کی بحثیں چھڑ گئیں اور دہلی والوں کو اقرار کرنا پڑا کہ اہل لکھنؤ تہذیب وتمدن اور حسن بیان میں ہم پر فوقیت رکھتے ہیں۔ انشاء اللہ خاں کہتے ہیں :۔

"دہلی میں ہر شخص کو فصاحت نصیب نہیں بلکہ گنتی کے لوگوں میں منحصر ہے جیسا کہ خود میرا تجربہ ہے کہ کوئی محلہ فصیح آدمی سے خالی نہیں۔ کہیں دو کہیں تین کہیں چار فصیح موجود ہیں ممکن کوئی محلہ خالی بھی ہو لیکن زیادہ تر ایسا ہی ہے۔ چند محلے ... ایسے ہیں جن کے درودیوار سے فصاحت ٹپکتی ہے"۔ اس کے مقابل میں لکھنؤ کی یہ حالت بیان کرتے ہیں

"اس شہر کا ہر محلہ فصحاء کا محلہ ہے اور اس سے انکار بے عقلی ہے"

دوسری جگہ پر دہلی پر لکھنؤ کی برتری کی وجہ یہ بتلاتے ہیں

لکھنؤ والوں نے دہلی والوں سے جو حاصل کیا اس میں وہ انکے برابر ہیں

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

نواب محمد تقی ہوس کی دو بیٹیاں حیا و پارسا شاعرہ تھیں۔

پارسا کا شعر ہے:-

تن صورت حباب بنا اور بگڑ گیا　　یہ قصر لاجواب بنا اور بگڑ گیا

حیا کہتی ہیں:-

دل میں اک بوند تو رہنے دے لہو کی میرؔ　　چشمِ خونبار ترے ہاتھ سے دم ناک میں ہے

ان پڑھ شعراء | ذوقی فقیر الٰہی بخش نانی، شیر علی نالاں، احمد علی زور ان پڑھ تھے اور ایسے شعر کہتے تھے کہ مصحفی حیرت سے لکھتے ہیں

الٰہی بخش کا مشق سخن جاری رہی تو وہ بڑے بڑوں سے سبقت لے جائے گا۔

احمد علی زور کے متعلق لکھتے ہیں۔

باوجود بے علمی کے اس کے کلام میں فنی غلطیاں نہیں ہوتیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ معانی بیان عروض وقوافی اور مصطلحات شعراء اتنے عام اور زبانوں میں اس طرح بس گئے تھے کہ جہلا بھی انکے استعمال پر قادر تھے

نواب سعادت علیخاں کے خاندان کا کہار گز بخش ادیب پڑھا لکھا تھا۔ اردو فارسی دونو زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ کبھی کبھی نواب بھی اس کے شعر سنتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے۔ اس وقت لکھنؤ اہل کمال کا مرکز تھا اور ہر طرف سے لوگ دوڑے چلے آرہے تھے۔

انشاء اللہ خاں کا بیان ہے کہ

دہلی کے جتنے صاحب سلیقہ مرد و زن لکھنؤ گئے ہیں خود دہلی میں نہیں رہے۔ سپاہی و مصاحب پیشہ داستان گو اور بذلہ سنج مطرب و قوال و قصہ خوان سب دہلی سے آئے ہیں (دریائے لطافت)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

لکھنؤ دوسرے شہروں پر شرف و ترجیح رکھتا ہے اور دہلی کی جان ہے۔

ہے کیونکہ فصحا وسلیقہ شعار جو شہر کی جان ہوتے ہیں سب یہاں جمع ہو گئے ہیں اور دہلی ایک بے روح جسم اور لکھنؤ اس کی جان ہے"

مصحفی ریاض الفصحا کی وجہ تصنیف یہ بیان کرتے ہیں :۔

"اس کا سبب تصنیف کثرت شعرائے لکھنؤ ہے کہ دہلی کی آبادی اسکے پاسنگ کو نہیں پہنچتی"۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان نے ایک ہزار سال تک علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا جو سرمایہ اکٹھا کیا وہ سب کھنچ کے لکھنؤ آگیا اور اہل لکھنؤ نے اس میں اضافہ کیا اور ہر بات میں دلی سے آگے بڑھ گئے اس کا احساس دونوں کو ہوا۔ دہلی کی لسانی اور تمدنی مرکزیت ختم ہو گئی اس پر تفوق و برتری کی بحثیں چھڑ گئیں اور دہلی والوں کو اقرار کرنا پڑا کہ اہل لکھنؤ تہذیب وتمدن اور حسن بیان میں ہم پر فوقیت رکھتے ہیں۔ انشاء اللہ خاں کہتے ہیں :۔

"دہلی میں ہر شخص کو فصاحت نصیب نہیں بلکہ گنتی کے لوگوں میں منحصر ہے جیسا کہ خود میرا تجربہ ہے کہ کوئی محلہ فصیح آدمی سے خالی نہیں۔ کہیں دو کہیں تین کہیں چار فصیح موجود ہیں ممکن کوئی محلہ خالی بھی ہو لیکن زیادہ تر ایسا ہی ہے۔ چند محلے ... ایسے ہیں جن کے در و دیوار سے فصاحت ٹپکتی ہے"۔ اس کے مقابل میں لکھنؤ کی یہ حالت بیان کرتے ہیں

"اس شہر کا ہر محلہ فصحاء کا محلہ ہے اور اس سے انکار بے عقلی ہے"

دوسری جگہ پر دہلی پر لکھنؤ کی برتری کی وجہ یہ بتاتے ہیں

لکھنؤ والوں نے دہلی والوں سے جو حاصل کیا اس میں وہ انکے برابر ہیں

اور جو خود بنایا سنوارا اس میں وہ انسے بہتر ہیں۔ مختصر یہ کہ لکھنؤ والے دہلی والوں سے تہذیب و تمدن میں بہتر اور فصیح تر ہیں"۔ (دریائے لطافت)

یہ ایسے شخص کا بیان ہے جس نے لکھنؤ میں دہلی کی زبان اور تہذیب کو آتے اور سنورتے دیکھا تھا دہلی میں وہ اپنے اصلی رنگ پر پائی تھی۔

ناسخ نے اپنی اصلاحوں سے زبان شاعری کو فصاحت و بلاغت اور تہذیب و شائستگی کی اعلیٰ منزل پر پہنچایا انکا طرز بہت مقبول ہوا یہاں تک کہ اساتذہ تک ان کی پیروی کرنے لگے۔

اس زمانہ میں لکھنؤ میں دو طرح کے شعراء تھے۔ ایک تو خاص دہلوی جس میں میر مصحفی، انشاء، جرأت، رنگین کا اساتذہ میں شمار تھا۔ مصحفی کا کوئی اسلوب نہ تھا۔ وہ میر و سودا کے رنگ میں بھی کہتے تھے اور انشاء و جرأت کے رنگ میں بھی اور ناسخ کے رنگ میں بھی۔ انشاء جرأت و رنگین کا وہی رنگ تھا جو اس وقت دہلی کا اسلوب تھا یعنی مبتذل اور اوباشانہ مضامین اور انداز بیان اور غیر مہذب ہجو۔

ادا جان لیتی ہے جانی تمھاری — غضب ڈھا رہی ہے جوانی تمھاری

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا — چمپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا جرأت

دو تین دن تو ہو چکے اب پھر جلو ویں — فیروزہ کی لاٹ کے اس جو تھے کھنڈر پر انشاء

منظور ایک بات اگر ہو تو آئیے — گلشن میں اس کنارے ہے چمپا کا جھاڑ خوب جرأت

بھلا آپ شرمائے کس واسطے — کبوتر کا جوڑا جو باہم لگا انشاء

ایسے اشعار لکھنؤ کے کسی شاعر کے نہیں پیش کئے جا سکتے

مصحفی انشا کی ہجو میں کہتے ہیں ع

والله کہ شاعر نہیں تو بھانڈ ہے بھڑوے

دوسرے لکھنوی شعراء تھے شاگردانِ میر و سودا ان میں کسی کو استادی درجہ حاصل نہ تھا مگر ان کا اسلوب ان سے بالکل مختلف تھا ؎

پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر
چار دن اور ہوا باغ کی کھالے بلبل — محمد جعفر مخمور

چرخ کو کب یہ سلیقہ تھا ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں — رائے منولال صفا

شغل شب تنہائی ہم کس سے کہیں اپنا
دو چار گھڑی رو کے بہلاتے ہیں غم اپنا — نواب محمد تقی ہوس

رنجش کا انھوں نے بھی کیا وقت نکالا ہے
وہ مجھ سے بگڑتے ہیں جب خوب بنے ہیں — ،، ،، ،،

پیدا ہوئے جب سے آہ و زاری میں رہے
بجلی کی مثال بے قراری میں رہے — محمد اعظم

آوے ہے مسیحا مری بالیں پہ تو کیا ہو
بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو — غلام حیدر مجذوب

حاصل مرا شوق دو جہاں آرزوئے دل
گر یک نگاہ ناز تو افتد بسوئے دل — کرکشن ادیب

صدمے اٹھائے ایسے جہان خراب میں
سب خون دل سے اٹھ گیا ردِ حساب میں — نواب محمد تقی ترقی

رکھ قفس دور چمن سے مرا صیاد کہیں
کان میں گل کے نہ پہنچے مری فریاد کہیں — بھیرو داس تمنا

میں ہوں گو کہ یار سے ہم زباں یہ یقیں مجھے نہیں دوستاں
ہیں نصیب ایسے مرے کہاں یہ تو زعم اپنا گمان ہے — چنی لال حسرت

تا آخر شب شور مرا کم نہیں ہوتا
جلتا ہوں جو مانند چراغ اول شب سے — احمد علی

غضب تو یہ ہے نہیں نیند رات کو آتی
وگرنہ خواب ہی میں اس سے گفتگو کرتے — محمد صابر شمیم

بہار اللہ دکھاؤں گا باغباں تجھ کو
بھرے ہیں لخت جگر میں نے آستینوں میں — نواب جعفر علی

جی ہی جی میں تری باتیں جو کیا کرتے ہیں
دل کی ہم اپنے تسلی تو ذرا کرتے ہیں — شکیب خلف شجاع الدولہ

یہ دل صد پارہ شکوہ یار کا کرتا نہیں
ٹوٹ کر بھی یہ مرا شیشہ صدا کرتا نہیں — میر اکبر علی شرق مفتر

اور جو خود بنایا سنوارا اس میں وہ انسے بہتر ہیں۔ مختصر یہ کہ لکھنؤ والے دہلی والوں سے تہذیب و تمدن میں بہتر اور فصیح تر ہیں" (دریائے لطافت)

یہ ایسے شخص کا بیان ہے جس نے لکھنؤ میں دہلی کی زبان اور تہذیب کو آتے اور سنورتے دیکھا تھا دہلی میں وہ اپنے اصلی رنگ پر پائی تھی۔

ناسخ نے اپنی اصلاحوں سے زبان شاعری کو فصاحت و بلاغت اور تہذیب و شائستگی کی اعلیٰ منزل پر پہنچایا انکا طرز بہت مقبول ہوا پرانے اساتذہ تک ان کی پیروی کرنے لگے۔

اس زمانہ میں لکھنؤ میں دو طرح کے شعراء تھے۔ ایک تو خاص دہلوی جس میں میر مصحفی، انشاء، جرأت، رنگین کا اساتذہ میں شمار تھا۔ مصحفی کا کوئی اسلوب نہ تھا۔ وہ میر و سودا کے رنگ میں بھی کہتے تھے اور انشاء و جرأت کے رنگ میں بھی اور ناسخ کے رنگ میں بھی۔ انشاء جرأت و رنگین کا وہی رنگ تھا جو اس وقت دہلی کا اسلوب تھا یعنی مبتذل اور اوباشانہ مضامین اور انداز بیان اور غیر مہذب ہجو۔

ادا جان لیتی ہے جانی تمہاری
غضب ڈھا رہی ہے جوانی تمہاری

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چمپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا — جرأت

دو تین دن تو ہو چکے ایسے چلو ہیں
فیروزہ کی لاٹ کے اس جو تھے کھنڈر پر — انشاء

منظور ایک بات اگر ہو تو آئیے
گلشن میں اس کنارے ہے چنیا کا جھاڑ خوب — جرأت

بھلا آپ شرمائے کس واسطے
کبوتر کا جوڑا جو باہم لگا — انشاء

ایسے اشعار لکھنؤ کے کسی شاعر کے نہیں پیش کئے جا سکتے

مصحفی انشا کی ہجو میں کہتے ہیں ع

واللہ کہ شاعر نہیں تو بھانڈ ہے بھڑوے

دوسرے لکھنوی شعراء تھے شاگرد ان میر و سودا ان میں کسی کو استادی درجہ حاصل نہ تھا مگر ان کا اسلوب ان سے بالکل مختلف تھا ؎

پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر — چار دن اور ہوا باغ کی کھالے بلبل — محمد جعفر مخمور

چرخ کو کب یہ سلیقہ تھا ستمگاری میں — کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں — رائے منولال صفا

شغل شب تنہائی ہم کس سے کہیں اپنا — دو چار گھڑی رو کر بہلاتے ہیں غم اپنا — نواب محمد تقی ہوس

رنجش کا انھوں نے بھی کیا وقت نکالا ہے — وہ مجھ سے بگڑتے ہیں جب خوب بنے ہیں — ، ، ،

پیدا ہوئے جب سے آہ و زاری میں رہے — بجلی کی مثال بے قراری میں رہے — محمد اعظم اعظم

آوے ہے مسیحا مری بالیں پہ تو کیا ہو — بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو — غلام حیدر مجذوب

حاصل مرا شوق دیکھ کہاں آرزوئے دل — گر یک نگاہ ناز تو افتد بسوئے دل — کرم بخش ادیب

صدمے اٹھائے ایسے جہان خراب میں — سب خون دل سے اٹھ گیا رد حساب میں — نواب محمد تقی ترقی

رکھ قفس دور چمن سے مرا صیاد کہیں — کان میں گل کے نہ پہنچے مری فریاد کہیں — بھیروداس تمنا

میں ہوں گو کہ یار سے ہم زباں پہ یقیں مجھے نہیں — ہیں نصیب ایسے مرے کہاں یہ تو زعم انکا ہے — جنی لال حرم

تا آخر شب شور مرا کم نہیں ہوتا — جلتا ہوں جو مانند چراغ اول شب سے — احمد علی ندرت

غضب تو یہ ہے نہیں نیند رات کو آتی — وگرنہ خواب ہی میں اس سے گفتگو کرتے — محمد صابر شمیم

بہار اللہ دکھاؤں گا باغباں تجھ کو — بھرے ہیں لخت جگر میں نے آستینوں میں — نواب اصغر علی

جی ہی جی میں تری باتیں جو کیا کرتے ہیں — دل کی ہم اپنے تسلی تو ذرا کرتے ہیں — شکیب خلف شجاع الدولہ

بکھ دل صد پارہ شکوہ یار کا کرتا نہیں — ٹوٹ کر بھی یہ مرا شیشہ صدا کرتا نہیں — میر اکبر علی شرق و مضطر

وصال یار سے دونا ہوا عشق | مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی | میر کلو عرش
وہ نقاشِ ازل کی صنعتیں | جس نے دیکھا اس کو حیرت ہو گئی | و مضطر
برگ گل لائی ہے کیا کوئی صبا گلشن سے | اک قیامت قفس مرغ گرفتار پہ ہے | منور خاں غافل
کون دریائے محبت سے اتر سکتا ہے پار | کشتی فرہاد آخر کوہ سے ٹکرا گئی | " "
خوبی عضو بدن کونسی ہے جو کہ نہ تھی | بول اٹھنا ہی تو باقی تری تصویر میں تھا | " "
سحر زلفوں میں ہے اور معجزہ گفتار میں ہے | فتنہ آنکھوں میں ہے محشر تری رفتار میں ہے | شیخ مخلص ناجی
وائے حسرت قفس سے باغ میں ہم | چھٹ کے جب آئے جب خزاں آئی | میر احسان مفتون
پوچھا تب اس نے حالِ دل میرا | جب زباں میں رہی نہ گویائی | " "
اسرار عشق جس پہ کھلا رہ گیا خموش | یعنی زباں کو یاں نہیں یارا کلام کا | " "

یہ شاگردان میر و سودا ہیں۔ مگر ناسخ کا آفتاب کمال طلوع ہو چکا تھا انھوں نے زبان و شاعری میں ایسی ایسی اصلاحیں کیں جس نے میر و سودا کے کلام پر خطِ نسخ کھینچ دیا اور پرانے مشاق شعراء نے ان کی تقلید کی۔

دہلی کی شاعری کا اسلوب جداگانہ تھا اہل لکھنؤ نے اسے قبول نہیں کیا جرأت و رنگین جب تک زندہ رہے اسے نباہتے رہے اور انھیں کے ساتھ دفن ہو گیا ناسخ کی شاعری پورے ملک پر چھا گئی مگر دہلی والے ناسخ کا تتبع کرتے ہوئے جرأت و رنگین کو بھی زندہ کئے رہے اس کو ان کی دہلویت سمجھنا چاہیئے۔

بانکے | بانکے اس عہد کی خاص چیز ہیں۔ بانک سپہ گری کا ایک فن ہے۔ اور قیاس کہتا ہے کہ اس کے جاننے والے بانکے کہے جاتے ہوں گے محمد شاہ رنگیلے کی فوج میں بانکوں کی بھی ایک پلٹن تھی یہی بانکے زوال دہلی کے زمانہ میں اور فنون

کے جاننے والوں کی طرح، لکھنؤ آئے مگر کچھ دنوں کے بعد ان کا انداز بدل گیا ان میں خصوصیتیں پیدا ہو گئیں اور لفظ بانک کا فن جاننے والے بنکیت کہے جانے لگے۔ مولانا شرر ان کے متعلق لکھتے ہیں :۔

جتنے بانکے تھے اتنی ہی وضعیں تھیں۔ کوئی صاحب دو دھارا تیغا ہاتھ میں رکھتے جو ہر وقت برہنہ اور ہوا سے لڑتا رہتا۔ کوئی رستم و نریمان کے زمانہ کا وزنی گرز اٹھائے پھرتا۔ کوئی صاحب تبر کاندھے پر رکھے نظر آتے اور ساری دنیا کو اپنی نظر میں ہیچ خیال کرتے۔ ہر ایک پر کڑے تیور ڈالتے۔ قیامت یہ تھی کہ ان لوگوں کا تبختر۔۔۔ سب چیزوں کی حالت یہ تھی کہ دیکھتے ہی انسان کو بے اختیار ہنسی آ جائے مگر کس کی مجال جو ان کی طرف دیکھ کے مسکرا بھی دے۔

لکھنؤ کے اکثر بانکوں کی وضع یہ تھی کہ شربتی رنگ کے باریک انگرکھے کے سوا کوئی کپڑا نہ پہنتے، اور لڑائی میں زرہ پہننا یا ڈھال سے کام لینا بزدلی خیال کرتے نتیجہ یہ ہوتا کہ حریف کا سامنا ہو تو اسکی تلوار گویا سینے پہ لیتے چرکے پر چرکے کھاتے اور اُف نہ کرتے۔

اسی طرح چلّوں کا جاڑا، اسی شربتی رنگ کے انگرکھوں پر گزرتا اور کیا مجال کہ کانپیں یا تھرائیں یا سُو سُو کی آواز نکلے۔ بعض اس پر یہ قیامت کرتے کہ باریک لباس پر باسی پانی چھڑکواتے اور جوں جوں سردی معلوم ہوتی اور اکڑ جاتے (گزشتہ لکھنؤ)

یہ اکڑ تکڑ یونہی نہ تھی ان کے کچھ فن بھی تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے انکے کمالات یہ بیان کئے ہیں :۔

وصال یار سے دونا ہوا عشق — مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی — میر کلو عرش

وہ نقاشِ ازل کی صنعتیں — جس نے دیکھا اس کو حیرت ہو گئی — و مفتون

برگِ گل لائی ہے کیا کوئی صبا گلشن سے — اک قیامت قفسِ مرغِ گرفتار میں ہے — منور خاں غافل

کون دریائے محبت سے اتر سکتا ہے پار — کشتیِ زہاد آخر کو وہ سے ٹکرا گئی — 〃 〃

خوبی عضوِ بدن کونسی ہے جو کہ نہ تھی — بول اٹھنا ہی تو باقی تری تصویر میں تھا — 〃 〃

سحر زلفوں میں ہے اور معجزہ گفتار میں ہے — فتنہ آنکھوں میں ہے محشر تری رفتار میں ہے — شیخ مغل علی فانی

وائے حسرت قفس سے باغ میں ہم — چھٹ کے جب آئے جب خزاں آئی — سید احمد حسین مخلوق

پوچھا تب اس نے حالِ دل میرا — جب زباں میں رہی نہ گویائی — 〃 〃

اسرارِ عشق جس پہ کھلا رہ گیا خموش — یعنی زباں کو یاں نہیں یارا کلام کا — 〃 〃

یہ شاگردانِ میر و سودا ہیں۔ مگر ناسخ کا آفتابِ کمال طلوع ہو چکا تھا انھوں نے زبان و شاعری میں ایسی ایسی اصلاحیں کیں جس نے میر و سودا کے کلام پر خطِ نسخ کھینچ دیا اور پرانے مشاق شعراء نے ان کی تقلید کی۔

دہلی کی شاعری کا اسلوب جداگانہ تھا اہل لکھنؤ نے اسے قبول نہیں کیا جرأت و رنگین جب تک زندہ رہے اسے نباہتے رہے اور انھیں کے ساتھ دفن ہو گیا ناسخ کی شاعری پورے ملک پر چھا گئی مگر دہلی والے ناسخ کا تتبع کرتے ہوئے جرأت و رنگین کو بھی زندہ کئے رہے اس کو ان کی دہلویت سمجھنا چاہیئے۔

بانکے بانکے اس عہد کی خاص چیز ہیں۔ بانک سپہ گری کا ایک فن ہے۔ اور قیاس کہتا ہے کہ اس کے جاننے والے بانکے کہے جاتے ہوں گے محمد شاہ رنگیلے کی فوج میں بانکوں کی بھی ایک پلٹن تھی یہی بانکے زوالِ دہلی کے زمانہ میں اور فنون

کے جاننے والوں کی طرح، لکھنؤ آئے مگر کچھ دنوں کے بعد ان کا انداز بدل گیا ان میں خصوصیتیں پیدا ہوگئیں اور نفظ بانک کا فن جاننے والے بنکیت کہلانے لگے۔ مولانا شرر ان کے متعلق لکھتے ہیں :-

جتنے بانکے تھے اتنی ہی دھجیں تھیں۔ کوئی صاحب دودھارا تیغا ہاتھ میں رکھتے جو ہر وقت برہنہ اور ہوا سے لڑتا رہتا۔ کوئی رستم و نریمان کے زمانہ کا وزنی گرز اُٹھائے پھرتا۔ کوئی صاحب تبر کاندھے پر رکھے نظر آتے اور ساری دنیا کو اپنی نظر میں ہیچ خیال کرتے۔ ہر ایک پر کڑے تیور ڈالتے۔ قیامت یہ تھی کہ ان لوگوں کا تبختر۔ سب چیزوں کی حالت یہ تھی کہ دیکھتے ہی انسان کو بے اختیار ہنسی آجائے مگر کس کی مجال جو ان کی طرف دیکھ کے مسکرا بھی دے۔

لکھنؤ کے اکثر بانکوں کی وضع یہ تھی کہ شربتی رنگ کے باریک انگرکھے کے سوا کوئی کپڑا نہ پہنتے، اور لڑائی میں زرہ پہننا یا ڈھال سے کام لینا بزدلی خیال کرتے نتیجہ یہ ہوتا کہ حریف کا سامنا ہوتو اسکی تلوار گویا سینے پر لیتے چرکے پر چرکے کھاتے اور اُف نہ کرتے۔

اسی طرح چلّوں کا جاڑا، اسی شربتی رنگ کے انگرکھوں پر گزرتا اور کیا مجال کہ کانپیں یا تھرائیں یا سُو سُو کی آواز نکلے۔ بعض اس پر یہ قیامت کرتے کہ باریک لباس پر باسی پانی چھڑکواتے اور جوں جوں سردی معلوم ہوتی اور اکڑ جاتے (گزشتہ لکھنؤ)

یہ اکڑ تکڑ کچھ یونہی نہ تھی ان کے کچھ فن بھی تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے انکے کمالات یہ بیان کئے ہیں :-

فن سپہ گری میں یہ لوگ کامل ہوتے تھے اور اس میں ایسے ایسے کمال دکھاتے تھے کہ عقل حیران ہو جاتی تھی مثلاً روہو اُچھالا اور چو رنگ کر دیا، لیمو پر نشان لگایا اور تلوار سے اڑایا تو نشان کے پاس سے دو ٹکڑے کسیرو اُچھالا اور پانچ چھ واریں جھیل ڈالا، چراغ جلایا اور کھانڈا پھینکتے پھینکتے گل کاٹ ڈالا، لوا لگ بتی الگ پیالہ میں دس کوڑیاں رکھیں دو پر نشان لگایا اور دونوں کو پیالہ میں تلوار سے کاٹ دیا۔ باقی کوڑیاں نلوہ بچ گئیں، لکڑی ٹیکی اور چھت پر پہنچ گئے۔ گتکے کا ذرا اشارہ کیا اور بیس ہاتھ اڑ گئے۔ چالیس چالیس آدمیوں نے گھیرا اور صاف نکل گئے، پلنگ کے نیچے ایک جنگلی کبوتر چھوڑ کر اس کو نکلنے نہ دیا۔ (فسانہ آزاد)

سعادت علی خاں کے زمانہ میں مرزا جہانگیر بیگ اتنے پر پرزے نکالے کہ سعادت علی خاں کو توجہ کرنا پڑی۔ عبدالحلیم شرر ان کے متعلق لکھتے ہیں :۔

" نو عمری کا زمانہ تھا، باپ نواب صاحب کے دربار میں تھے۔ جہانگیر بیگ کی شورہ پشتی کی خبر کئی بار سن کر خاموش ہو رہے۔ مگر آخر کار ایک دن بہت برہم ہوئے اور ان کے والد سے کہا آپکے صاحبزادے کی شورہ پشتیاں حد سے گزری جاتی ہیں انھوں نے سارے شہر میں ادھم مچا رکھا ہے ان سے کہہ دیجئے گا اپنے اس بانکپن پر نہ بھولیں۔ ناک نہ کٹوا لی ہو تو سعادت علی خاں نام نہیں۔ باپ خود بھی بیٹے کی حرکتوں سے عاجز تھے گھر گئے اور بی بی سے کہا ــــ ماں نے کہا بیٹا خدا کے لئے اپنی حرکتیں چھوڑ دو، تمہارے ابا بہت پریشان ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا۔ میرا کچھ قصور بھی بتائیے ــــ باپ نے کہا کوئی ایک قصور ہو تو بتایا جائے ــــ آج نواب کہتے تھے کہ اپنے صاحبزادے سے کہہ دینا کہ میں سعادت علی خاں نہیں جو ناک نہ کٹوا لی ہو،

باپ سے اتنا سنتے ہی مرزا صاحب کو جو طیش آیا تو کمرے سے پیش قبض نکال خود ہی ناک کاٹ کے باپ کی طرف پھینکدی اور بولے بس اسی ناک کاٹنے کی نواب صاحب دھمکی دیتے ہیں؟ یہ لیجئے یہ ناک انھیں لے جا کے دیدیجئے۔ یہ دیکھتے ہی ماں باپ دونوں سناٹے میں آگئے اور جب باپ نے بیٹے کی ناک نذر کے طریقہ پر نواب صاحب کے سامنے پیش کی تو وہ بھی دم بخود رہ گئے۔" (گزشتہ لکھنؤ)

جہانگیر بیگ کی اس جرأت سے سعادت علی خاں دب گئے اور پھر انھوں نے ان کی شورہ پشتی تسلیم کر لی جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کریلا بھانڈ جب نواب کے یہاں آتا تو ان پر کچھ نہ کچھ چوٹ کر جاتا۔ ایک مرتبہ نواب نے کہا کہ تو مجھے جو چاہتا ہے کہہ جاتا ہے جب جانوں کہ مرزا جہانگیر بیگ نکلے تو کچھ کہہ دے اس نے کہا کہ یہ کونسی بڑی بات ہے جہاں پناہ —— دریا کے کنارے ان کا مکان تھا سامنے مونڈھے پر بیٹھے تھے کہ کریلا دریا سے نکل کے سامنے آیا اور بہ ادب سلام کیا انھوں نے جواب دیکے پوچھا کیا حال ہے، اس نے کہا آدھی کٹ گئی ہے آدھی باقی ہے وہ بھی کٹ جائے گی۔ جہانگیر بیگ کو اس کی تاب کہاں سنتے ہی جھپٹے وہ دریا میں کود یہ جا وہ جا، نظروں سے اوجھل ہو گیا اور نواب صاحب کے یہاں جا کے چھپ گیا۔ دن بھر ان کے آدمی اس کو ڈھونڈتے رہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سعادت علی خاں پر ان کی دھاک بیٹھ گئی تھی اور وہ سمجھ چکے تھے کہ یہ دبانے سے دب نہیں سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سارے شہر پر چھا گئے، اس کا اندازہ سرشار کے اس بیان سے ہوتا ہے

..... چنّت دار انگرکھے پہنے نُکّے دار ٹوپیاں سر پر جائے چُست گھٹنے ڈانڈے آنڈوے پڑے۔ ڈانٹے باندھے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ تینچے کی جوڑی کمر سے لگی ہوئی، دو دو دولائیاں چڑھی ہوئی۔ قرابچہ بیش قبض، کٹار، سروہی، شیر پنجہ سب سے بس خاصے او بنکے بنے ہوئے ایک بانکے کو دیکھ کے دو کاندار ہنس پڑا انھوں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ وَن سے تینچہ داغ دیا۔ مگر حسن اتفاق سے خالی گیا۔ لوگوں نے پوچھا کیوں آغا کیوں بگڑ گئے تیکھے ہو کر فرمایا۔ ہم کو دیکھ کے بجاجی مسکرائے تھے ہم نے گولی لگائی کہ دانت پر پڑے اور اس جواب دنداں شکن سے ان کے بھی دانت کھٹے ہو جائیں (فسانۂ آزاد)

یہ شورہ پشتی ان کی بڑھتی رہی۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں کچھ دنوں کے لئے سختی ہوئی تھی۔ پھر وہی حالت ہو گئی شہر جس پر چاہتے تھے اس پر تلوار یا تینچہ کا دار کر دیتے تھے اور گلی کوچوں میں برابر وارداتیں ہوتی رہتی تھیں اور کوئی کچھ نہ بولتا تھا گویا ان کے کمال کا اس طرح اعتراف تھا اس سے ہمیں وہ زمانہ یاد آتا ہے جب سپاہی اپنے مقابل کو زیر کر کے اسکی جان لے لیتا تھا، اور حکومت اس فعل کو اس کا حق سمجھتی تھی

موسیقی | آصف الدولہ کے زمانہ سے سیکڑوں ارباب نشاط شہر میں موجود تھے۔ اس زمانہ میں دامڑی طوائف گانے میں سب پر سبقت لے گئی تھی۔ پرکاش نے بتاسے اور کوڑی پر ناچ کے حیران کر دیا۔ بخشو نے ایسا طبلا بجایا کہ پکھاوج کا دم بند کر دیا۔

خطاطی | خطاطی میں خواجہ حسن مودودی شیخ رحیم الدین اور رونق نے شہرت حاصل کی۔

maablib.org

قرأت آغا محمد علی تبریزی نے قرأت میں کمال پیدا کیا اور اس فن کو بھی اس زمانہ سے لکھنؤ میں ترقی ہوئی۔

صنعتیں زری بادلہ چاندی سونے کے زیور مٹی کے برتن نہایت خوبصورت اور نازک بنائے گئے۔ اچار چٹنیاں مربے اور پھلوں کے شربت بھی عمدہ بنتے۔

تمدن سپاہیانہ بانکپن، عشق و عاشقی، رقص و سرود شعر و شاعری علوم و فنون اور خاندانی شرافت کی قدر، مجلس و ماتم، نفاست و شائستگی تمدن کی خاص چیزیں تھیں۔ سعادت علی خاں کے زمانہ میں ان کو بہت ترقی ہوئی زبان میں بڑی صفائی اور ادبیت پیدا ہوئی۔ ان کا طرز گفتگو بہت مقبول ہوا اور روزمرہ کی بات چیت بھی ایہام و توجیہ سجع و قافیہ استعارہ اور کنایہ میں ہونے لگی۔ وضع قطع اور لباس میں بھی تبدیلی ہوئی گھڑی دار پگڑی گھیردار جامہ اور پٹکا، پرانے وضعدار لوگوں میں باقی رہا، انگرکھا چوگوشیہ ٹوپی اور بڑے پائینچے کے پاجامے کا رواج ہوا اس وقت لکھنؤ علماء کی کثرت سے خطہ یونان تھا۔

فرنگی محل مولانا حبیب اللہ سنہ ۱۲۱۶ھ مولانا عبدالنافع سنہ ۱۲۲۲ھ مولانا عبدالعلی سنہ ۱۲۳۰ھ، مولانا محمد متین سنہ ۱۲۲۵ھ مولانا احمد حسین، مولانا محمد احمد۔ مولانا انوار الحق سنہ ۱۲۳۶ھ مولانا سراج الدین سنہ ۱۲۴۲ھ مولانا عبدالرب مولانا امین الدین سنہ ۱۲۲۱ھ مولانا محمد اصغر سنہ ۱۲۵۹ھ اس خاندان کے علماء تھے

خاندان اجتہاد مولانا دلدار علی صاحب ابھی زندہ تھے سما دران کے پانچ بیٹے مولانا سید محمد مولانا سید علی، مولانا سید حسن۔ مولانا سید مہدی مولانا سید حسین

اپنے والد کے ساتھ درس و تدریس تصنیف و تالیف اور تبلیغ میں انکے شریک تھے سب سے بڑے بیٹے مولانا سید محمد اور سب سے چھوٹے بیٹے مولانا سید حسین نے علم و فضل میں شہرت حاصل کی۔ انشاء کا قول کہ مولوی دلدار علی عروس سلطنت کا جھومر ہیں اور ان کے دونوں بیٹے گوشوارے ہیں[۱] مولانا سید حسین ۱۲۱۱ھ میں پیدا ہوئے اور سعادت علیخاں نے ۱۲۲۹ھ میں انتقال کیا۔ اگر انشاء نے یہ بات نواب سے ان کی زندگی کے آخری سال بھی کہی تھی، اور اس وقت مولانا سید حسین صاحب سولہ برس کے تھے، اس عمر میں یہ علمی وقار پیدا کر لینا غیر معمولی ذہانت و صلاحیت کا ثبوت ہے:۔

ان خانوادوں کے علاوہ لکھنؤ میں اس وقت یہ بلند پایہ علماء تھے۔

مولانا محمد ابراہیم، مولانا اکبر علی، مولانا امام الدین، مولانا اعظم علی، مولانا میر علی اخباری، مولانا مرزا محمد اخباری، مولانا سید مرتضیٰ اصولی، مولانا فخرالدین مولانا مخدوم، مولانا مرزا حکیم علی شریف، مولانا مرزا زین الدین عرف مرزا محسن، مولانا مرزا مغل، مولانا سید علی مولانا سید محمد بن باقر شاہ کشمیری، مولانا مرزا مہدی، مولانا مرزا محمد ذکی۔ مولانا محمد رضا طباطبائی۔ علم الدین، مولانا مخدوم، مولانا محمد اشرف مولانا حسن ابراہیم، مولانا محمد رفیع۔ مولانا احمد علی محمد آبادی مجتہد۔ مولانا مرزا کاظم علی، مولانا مرزا حسن علی خافی، مولانا سید صفدر۔ مولانا مرزا غازی

باہر سے آنے والے علماء

ایران سے :- مولانا احمد بہبہانی، مولانا سید حسن مرعشی، مولانا سید مہدی مازندرانی

کشمیر سے :- مولانا حکیم محمد یعقوب، مولانا سید علی

دہلی سے :- مولانا حکیم سید محمد مرتعش۔ مولانا حکیم معالج خان

بریلی سے :- مولانا حکیم حیدر حسین، مولانا غلام علی۔ مولف عماد السعادۃ مولانا ابواللیث۔ مولانا کرامت حسین

گوپامئو سے :- مولانا فتح الدین

نصیر آباد سے :- مولانا امین الدہر۔

غازی پور سے :- مولانا شیخ صادق علی

بلگرام سے :- مولانا محمد اسلم

مرادآباد سے :- مولانا محمد اسمٰعیل لندنی

کیرٹھور سے :- مولانا امام بخش

فرخ آباد سے :- مولانا حکیم مہدی

زید پور سے :- مولانا غنی تقی

جھریا کوٹ سے :- مولانا کرامت اللہ

سندیلہ سے :- مولانا احتشام اللہ، مولانا جعفر علی، مولانا وارث علی مولانا کریم الزماں

اطراف لکھنؤ کے علماء

کاکوری :- مولانا حمید الدین ۱۲۱۵ھ مولانا کاظم علی ۱۲۲۳ھ مولانا حمایت علی م ۱۲۳۶ھ مولانا محمد مستعان م ۱۲۲۷ھ مولانا شمس الدین م ۱۲۴۵ھ مولانا امام الدین م ۱۲۵۳ھ،

ملیح آباد :- مولانا احمد حسین م ۱۲۵۴ھ، مولانا محمد علی صدر پوری م ۱۲۱۵ھ

سندیلہ :- مولانا شیخ احمد، مولانا عز الدین م ۱۲۵۶ھ مولانا اکبر علی م ۱۲۲۵ھ مولانا حیدر علی مولانا حکیم بقاء اللہ، مولانا خادم حسین م ۱۲۶۵ھ مولانا ذاکر علی۔ مولانا عبد العلی م ۱۲۷۰ھ مولانا عزت علی۔ مولانا غلام ۱۲۶۳ھ مولانا غلام نجف م ۱۲۶۵ھ، مولانا فقیہ اللہ م ۱۲۳۶ھ، مولانا قاسم علی مولانا نجف علی ۱۲۵۵ھ۔

امیٹھی :- مولانا امیر علی شہید ۱۲۷۳ھ، مولانا خدا بخش ۱۲۳۶ھ، مولانا علم الہدیٰ ۱۲۱۲ھ۔

چریا کوٹ :- مولانا احمد م ۱۲۹۶ مولانا غلام علی م ۱۲۸۴ھ مولانا غلام مخدوم م ۱۲۰۵ھ

نگرام :- مولانا عبد الکریم ۱۲۸۴ھ، مولانا علیم اللہ م ۱۲۵۶ھ

بچھراس :- مولانا عبد الکریم ۔۔۔ھ

دیوہ :- مولانا احسان اللہ الانامی ۱۲۷۰ھ مولانا برہان الدین عبد الباقی مولانا نظام الدین م ۱۲۱۶ھ، مولانا ذوالفقار علی،

زید پور :- مولانا غلام حسین م ۱۲۱۱ھ مولانا علی تقی

سید نپور :- مولانا عبد الجامع مولانا حکیم قدرت اللہ م ۱۲۴۰ھ

فیض آباد :- مولانا اسد علی خاں م ۱۲۹۱ھ مولانا شیخ صفدر علی خیمی م ۱۲۵۳ھ،

مولانا عبد العلی، مولانا مرزا احمد، مولانا محمد علی کشمیری،

بہرائچ :- مولانا نجف علی م ۱۲۵۴ھ مولانا بشارت اللہ م ۱۲۵۸ھ

خیرآباد :- مولانا فضل امام م ۱۲۴۲ھ، مولانا محمد علی م ۱۲۶۶ھ، مولانا تراب علی م ۱۲۸۲ھ

کنتور :- مولانا امداد علی خاں (راجہ)

پیہانی :- مولانا قاضی مربیؒ

بھلور :- مولانا خرم علی ۱۲۷۱ھ

صفی پور :- مولانا شیخ احمد م ۱۲۶۲ھ مولانا عبد الرحیم صاحب منتہی الارب

نیوتنی :- مولانا فضل اللہ۔

موہان :- مولانا آلِ حسن م ۱۲۸۵ھ مولانا حکیم ببر علی

رائے بریلی :- مولانا محمد بن عرفان ۱۲۳۶ھ مولانا احمد بن عرفان شہید ۱۲۴۶ھ

مولانا محمد اسحٰق، مولانا غلام جیلانی، مولانا قطب الہدیٰ م ۱۲۲۶ھ، مولانا گل محمد ۱۲۵۶ھ

مولانا محمد حسن، مولانا محمد عوض م ۱۲۲۰ھ

نصیرآباد :- مولانا خواجہ احمد ۱۲۸۹ھ، مولانا احمد علی م ۱۲۴۶ھ عبد العزیز ۱۲۷۶ھ

مولانا محمد کاظم، مولانا سید محمد ۱۲۸۶ھ مولانا محمد تقی م ۱۲۷۰ھ مولانا نجم الہدیٰ ۱۲۹۶ھ

مولانا ہادی علی م ۱۲۵۳ھ مولانا اسلم۔

سلون :- مولانا پناہ عطا م ۱۲۶۵ھ مولانا کریم عطا م ۱۲۴۸ھ

دلمئو :- مولانا شیخ جعفر علی م ۱۲۳۳ھ

گوپامئو :- مولانا فتح الدین، مولانا قدرت اللہ - مولانا قاضی علی، مولانا غلام محمد ۱۲۱۲ھ

جونپور :- مولانا شجاعت علی، مولانا غلام حسین - مؤلف زیچ بہادرخانی مولانا فتح علی، مولانا فتح محمد م ۱۲۱۴ھ مولانا فصیح الدین -

مچھلی شہر :- مولانا محمد لطیف م ۱۲۶۰ھ، مولانا محمد علی م ۱۲۳۱ھ، مولانا محمد حسین جعفری ۱۲۱۲ھ

بھیرہ :- مولانا ابو اسحاق م ۱۲۳۴ھ
ماہل :- مولانا حسن علی م ۱۲۵۰ھ } مفصلات اعظم گڑھ
بستی :- مولانا جعفر علی م ۱۲۵۰ھ

لاہرپور :- مولانا عصمت اللہ م ۱۲۱۴ھ، مولانا شیخ خادم م ۱۲۱۴ھ

مرادآباد :- مولانا کفایت اللہ م ۱۲۷۳ھ

سنبھل :- مولانا ثناء اللہ، مولانا محمد علی ۱۲۱۴ھ مولانا قدرت اللہ م ۱۲۱۴ھ

مولانا محبوب علی

امروہہ :- مولانا نور الحسن، مولانا عبد الصمد، مولانا محمد عسکری، مولانا محمد عباد

مولانا محمد سیادت ۱۲۶۵ھ

رامپور :- مولانا کبیر الدین - مولانا حبیب الٰہی م ۱۲۶۱ھ، مولانا رشید النبی ۱۲۷۰ھ مولانا سراج احمد م ۱۲۲۱ھ، مولانا عبد القادر ۱۲۶۵ھ، مولانا عبد الرشید، مولانا عرفان، مولانا عمر الحنفی ۱۲۵۶ھ مولانا عمران، ۱۲۷۰ھ - مولانا غفرانی ۱۲۶۰ھ - مولانا عیاض مصنف دستور المبتدی، مولانا قاضی محمد، مولانا علی، مولانا نصیر الدین، مولانا عبد الرزاق، مولانا عبد العزیز، مولانا نور الدین، مولانا مفتی نذر محمد ۱۲۱۶ھ، مولانا سعید م ۱۲۷۰ھ

مارہرہ :- مولانا آل محمد ۱۲۲۵ھ، مولانا آل احمد ۱۲۳۵ھ - مولانا آل رسول ۱۲۹۵ھ مولانا بزرگ علی م ۱۲۶۱ھ (نولب) مولانا قاضی صدیق ۱۲۰۰ھ مولانا نصر اللہ ۱۲۵۵ھ

بدایوں :- مولانا شیخ عبدالمعالی - مولانا حسن علی، مولانا ظہور اللہ ۱۲۵۶ھ
مولانا شیخ عبدالمجید ۱۲۱۵ھ، مولانا عبدالمجید ۱۲۶۳ھ، مولانا عماد علی مولانا فیض محمد ۱۲۲۶ھ
مولانا محمد لبیب ۱۲۰۱ھ مولانا مردان علی - مولانا ولی اللہ - مولانا قاضی ابوالحسن -

بانس بریلی :- شاہ نیاز احمد ۱۲۲۵ھ

شاہجہاں پور :- مولانا قاضی احمد معروف بہ احمد جان، مولانا حبیب اللہ
مولانا شیخ عبدالجبار، مولانا غلام نبی، مولانا قاضی یوسف ۱۲۴۰ھ
مولانا سید علیم الدین مولانا شیخ محمد اکرم، مولانا علیم اللہ

فرخ آباد :- مولانا خردمند ۱۲۴۱ھ (نواب) مولانا دلیر ہمت خان (نواب ۱۲۱۱ھ) مولانا رحم علی سکندری ۱۲۲۶ھ

اٹاوہ :- مولانا حکیم احسان علی مؤلف طب احسانی وغیرہ -

قنوج :- مولانا عبدالباسط ۱۲۲۳ھ مولانا علیم الدین ۱۲۱۱ھ مولانا غلام حسین ۱۲۵۳ھ مولانا نعیم الدین، مولانا سید احمد بخاری ۱۲۲۳ھ مولانا

بلگرام :- مولانا مفتی امیر حیدر ۱۲۱۷ھ، مولانا جمیل، مولانا غلام نبی، مولانا سید مرتضیٰ،

راج گیر :- مولانا لطف اللہ

سہارنپور :- مولانا عبدالرحیم ۱۲۴۶ھ مولانا وجیہ الدین -

سہسوان :- مولانا ظہور احمد ۱۲۶۳ھ، مولانا مفتی نذر محمد ۱۲۳۶ھ - مولانا کمال الدین، مولانا آل حسن

الہ آباد :- مولانا شیخ عبدالمعالی، مولانا خیرالدین، مولانا رضی الدین

مولانا روح الفیاض ۱۲۳۰ھ، مولانا زین العابدین، مولانا عبداللہ، مولانا جعفر علی ۱۲۱۱ء
مولانا علی کبیر م ۱۲۴۰ھ مولانا غلام حسین دکنی مولانا غلام حیدر م ۱۲۶۰ھ مولانا محمد فضل مولانا شاہ
احمد م ۱۲۰۰ھ مولانا علیم م ۱۲۲۰ھ مولانا کریم قلی جونپوری، مولانا نصیر الدین
کڑہ :۔ مولانا شیخ احمد الحسینی م ۱۲۰۷ھ مولانا مظہر علی م ۱۲۸۰ھ مولانا سید معز الدین م ۱۲۳۵ھ
ہنسوہ :۔ مولانا سید مہدی م ۱۲۲۱ھ مولانا ابوالقاسم م ۱۲۰۶ھ
بنارس :۔ مولانا اکرم علی م ۱۲۵۰ھ مولانا حکیم سلامت اللہ، مولانا شیخ عمر م ۱۲۴۸ھ مولانا فائق علی
مولانا مفتی ابراہیم م ۱۲۵۳ھ مولانا سخاوت علی مولانا واحد علی

تصنیف و تالیف اس عہد میں نہایت بلند پایہ کتابیں لکھی گئیں انشاء اللہ خاں نے دریائے لطافت، حکیم محمد بخش مہجور نے شہزادہ مہر افروز اور ملکہ ماہ پرور کی داستان لکھی اور اس کا نام گلشن نوبہار رکھا۔ یہ کتاب ۱۲۵۸ء میں لکھنؤ میں چھپ چکی ہے۔ اسکے علاوہ انکی دو کتابیں نورتن اور انشائے چار چمن ہیں، احمد علی یکتا نے دستور الفصاحت اور مصحفی نے ریاض الفصحا لکھی
مولوی دلدار علی نے علم کلام میں عماد الاسلام پانچ ضخیم ہیں کارنامہ ہے۔ اسکے علاوہ انھوں نے صوارم الٰہیات حسام الاسلام ذوالفقار تحفہ اثنا عشریہ کے جواب میں اور شہاب ثاقب صوفیا کی رد میں اور اساس الاصول اخباریوں کی رد میں زر ورد ار کتابیں لکھیں اور کتب معقولات

سعادت علی خاں پر ایک نظر

۱۱۶۵ھ میں پیدا ہوئے، ذہانت و دانائی کے آثار دیکھ کے شجاع الدولہ نے انکی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی
مولانا عبدالحکیم کشمیری اور مولوی سدن تعلیم پر اور تفضل حسین خاں علامہ

ہوئے ان کی نگرانی میں علوم مروجہ کی تحصیل کی اور خط شکستہ لکھنے میں مہارت حاصل کی

بارہ برس کی عمر میں خیر آباد کے ناظم مقرر ہوئے کچھ دنوں کے بعد شاہ عالم کے دربار میں

شجاع الدولہ کی نیابت کی جہاں انھوں نے خلعت اور یمین الدولہ وزیر الممالک ناظم الملک بہادر

جنگ کا خطاب پایا

چار سال تک نجف خاں کے ساتھ رہے۔ میدان جنگ کا اور ہندوؤں کی فوجداری

سے ملکی و مالی معاملات کا تجربہ حاصل کیا۔ روہیلکھنڈ کی جنگ میں وہ شریک تھے۔ اور فتح

کے بعد وہاں کے گورنر مقرر ہوئے اس وقت وہ بیس برس کے تھے۔

شجاع الدولہ کی دلی خواہش تھی کہ اُن کے بعد سعادت علی خاں کو حکومت ملے۔

ایک دن انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ بیگم اگر تم سعادت علی خاں کے سر پر ہاتھ رکھو گی تو وہ

تمہارے دوپٹے کا پہرا لہرائیگا۔

ان کے بعد ان کی ماں نے بھی بہو کو مشورہ دیا کہ آصف الدولہ کو مسند نشین کر لو اور

انتظام سعادت علی خاں کے سپرد کرو۔ مگر انھوں نے کچھ سوتیلے پن اور کچھ مامتا کے جوش میں

مصلحت بینی سے کام نہ لے کے آصف الدولہ کو مسند نشین کر دیا

اس میں شک نہیں کہ آصف الدولہ علم و فن کی قدردانی، شہر کی رونق اور ترقی میں

شجاع الدولہ سے پیچھے نہیں رہے مگر ملکی انتظام اور فوجی نظام اور سیاست سے کوئی واسطہ نہ تھا

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "بنارس" جونپور اور غازی پور کا علاقہ کمپنی کو دیدیا۔ اودھ میں اسکی فوج

کی ایک بڑی تعداد آگئی جس کے اخراجات کا بار پڑ گیا، جس سے آخر میں وہ بہت پریشان رہنے

لگے اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اگر شجاع الدولہ کے بعد سعادت علی خاں کو حکومت ملتی تو شجاع الدولہ کا زمانہ باقی رہتا

مگر بدقسمتی سے نہ ہوا، اور آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں کو حکومت حاصل کرنے کے لیے انگریزوں کو بہت کچھ دینا پڑا، جس پر وہ مجبور تھے، یہاں تک کہ آدھا ملک نکل گیا رزیڈنٹ سے مستقل کشمکش رہنے لگی۔ ان باتوں نے ان کو پریشان کر رکھا مگر ان حالات میں بھی انھوں نے ملک کا بہترین انتظام کیا۔ اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لینے کی فکر میں رہے انھوں نے روپیہ جمع کرنا شروع کیا ان کا خیال تھا کہ انگریزوں کو نقد روپیہ دے کے اپنا علاقہ واپس لے لیں گے جس طرح شجاع الدولہ "کڑہ" اور الہ آباد انگریزوں سے لے چکے تھے انھوں نے سترہ کروڑ روپیہ جمع کر لیا تھا، اگر وہ زندہ رہتے تو اپنے منصوبہ میں کامیاب ہو جاتے کیونکہ انگریزوں نے "برما" اور نیپال سے جنگ شروع کر دی تھی جس کے لئے ان کے پاس، روپیہ نہیں رہ گیا تھا، وہ "اودھ" کا تھوڑا علاقہ واپس کر کے برما اور نیپال کا بہت بڑا علاقہ حاصل کر لیتے۔

یہ روایت بھی ہے کہ وہ حکومت برطانیہ سے ہندوستان کی حکومت کا ٹھیکہ لینا چاہتے تھے، جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ یہ بھی اپنا علاقہ واپس لینے کی ایک تدبیر تھی مگر وقت نے انھیں کسی منصوبہ پر عمل کرنے کی مہلت نہ دی اور ۱۲۲۹ھ کو کا کام تمام کر کے اودھ کو ایک بیدار مغز فرمانروا سے محروم کر دیا۔

ان کی مدت حکومت سترہ سال ہے"۔ ان کے بعد "برما" اور نیپال کی لڑائی میں انگریزوں نے غازی الدین حیدر سے روپیہ قرض مانگا۔ ان میں اتنی سوجھ بوجھ نہ تھی کہ وہ ان سے کھوئے ہوئے علاقہ کے عوض میں روپیہ دینا منظور کرتے، انھوں نے قرض دیدیا۔

تاریخ لکھنؤ

حصہ سوم

لکھنؤ کے دورِ شاہی کی اکتالیس سال

۱۲۳۲ھ تا ۱۲۷۳ھ

۱۸۱۶ء تا ۱۸۵۶ء

maablib.org

نواب غازی الدین حیدر صاحب سنہ ۱۲۳۵ ہجری سے حضرت شاہ زمن

۳۸۹

نواب معتمد الدولہ آغا میر

ابو المظفر شاہ زمن غازی الدین حیدر

سعادت علی خان کے سب سے بڑے بیٹے تھے مگر علمی کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ حکومت کے معاملات سے سروکار نہ تھا اس وجہ سے لوگوں کا خیال تھا کہ ان کے چھوٹے بھائی احمد علی خاں شمس الدولہ مسند نشین ہوں گے کیونکہ وہ نائب الریاست کی حیثیت سے باپ کی زندگی میں کام کر رہے تھے۔ رزیڈنٹ کا رجحان بھی انہیں کی طرف تھا۔ نواب سعادت علی خان کے انتقال کی خبر سن کے وہ تلوار کمر سے باندھ کے مرنے مارنے والے جوانوں کو لے کے باپ کی لاش پر لے گئے۔ راجہ بختاور سنگھ مرزا جعفر اور مرزا حاجی اور آغا میر بھی کسی طرف سے آ گئے۔ رزیڈنٹ ڈاکٹر کو لے کے آئے اس نے ان کی موت کی تصدیق کر دی۔ غازی الدین حیدر نے رزیڈنٹ کا ہاتھ پکڑ کے اپنے استحقاق کے متعلق یہ کہا کہ میں اولاد اکبر ہوں۔ قانوناً جانشینی اولاد اکبر کا حق ہے اگر آپ نے میرے سوا کسی کو نصب کیا تو آگے سے وہ بھی معزول ہو سکتا ہے۔ مرزا حاجی نے بھی تقریباً یہی بات کہی اب رزیڈنٹ کا خیال بدل گیا۔ انہوں نے اپنے عملے سے مشورہ کر کے ان کی جانشینی کا فیصلہ کر لیا۔ اور ان سے پوچھا کہ اب ان تمام معاہدات پر عمل کریں گے جو کمپنی سے ہو چکے ہیں انہوں نے اقرار کیا۔

مسند نشینی — ۱۲۲۹ھ کو بسنت کے دن کوٹھی فرح بخش میں مسند حکومت پر جلوہ افروز ہوئے سلامی کی توپیں سر ہوئیں ارکان حکومت نے نذریں پیش کیں۔ ان کے بعد بھائیوں کی نذریں گذریں اسی دن ایک عہد نامہ لکھا گیا کہ حکومت اودھ در

کمپنی سے جو معاہدے ہوئے ہیں وہ برقرار رہیں گے۔ مرزا نصیر الدین حیدر کو ولی عہدی کا۔ آغا میر کو نیابت کا خلعت ملا۔ میا کرشن کو راجہ کا خطاب اور واصلباقی نویسی کا عہدہ ملا ان کے علاوہ اور بھی خواہوں کو بھی حسب مراتب خلعت عطا ہوئے۔

خوش قسمتی سے لارڈ مائز (لارڈ ہیٹنگز) گورنر جنرل ہو کے آئے جو سعادت علی خاں کے بندۂ احسان تھے۔ وہ ان سے ملنے آئے اور کہا کہ میں آپ کے معاملات کی درستی کے لئے آیا ہوں۔ اور جب تک وہ رہے کمپنی سے خوشگوار تعلقات رہے۔

شاہی کا اعلان انھیں کے مشورے سے غازی الدین حیدر نے اپنا سکہ ڈھلوایا اور شاہی کا اعلان کیا۔

دو کروڑ میں تاج و تخت اور گنبد زرنگار تیار ہوا گنگا جمنی تخت کے گرد چار حاشیے لعل و زمرد یاقوت فیروزہ اور پکھراج کے اس طرح بنائے گئے تھے کہ تاروں بھری رات کے بہار دکھاتے تھے۔

تخت پر مخمل سرخ کی مسند زربفت کا شامیانہ موتی اور مقیش کی جھالر سونے چاندی کی چوبیں، کلابتوں کی ڈوریاں تھیں سامنے چالیس گز لمبا بیس گز چوڑا ایک اور شامیانہ تھا جس کی تیاری سلمے ستارے اور مقیش سے ہوئی تھی۔

اٹھارہ ذی الحجہ ۱۲۳۳ھ کو تخت سلطنت پر جلوس فرمایا سلطان العلماء سید محمد صاحب مجتہد العصر نے تاج سر پر رکھا اور شاہی قلم سے پہلا حکم کچھ سادات کی تنخواہ کا صادر ہوا۔ زر و جواہر نثار ہوئے ریذیڈنٹ کو لاکھوں کے تحائف

یلے امراو اور اہلکار گرانبہا خلعت سے سرفراز ہوئے ابوالمظفر شاہ زمن لقب اختیار کیا۔

آغا میر معتمد الدولہ کو وزارت، مولوی خلیل الدین کو سفارت، جمیعت رائے کو ٹکسال، کنور رتن سنگھ زخمی کو کلکٹری۔ سیدی نام علی کو کوتوالی علاقے زنگی محل کو عقد وافتاد کی مسند ملی دارالانشاء، دارالاجراء صدرالصدور کچہری سلطانی دفتر نظامت دفتر جنرلی اور دفتر دیوانی قائم ہوا۔

تعلقداروں نے مبارکباد کی عرضیاں بھیجیں۔ حسب مراتب راجا، نواب اور رائے کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

علمی ذوق

بشپ ہیبر نے لکھا ہے کہ انہیں مطالعہ کا بڑا شوق ہے وہ میشن اور علم کیمیا سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں مشرقی علم لسانیات اور فلسفے کے وہ ایک فاضل ہیں۔ میری دوسری ملاقات مسٹر ریکس رزیڈنٹ کی شادی کے موقع پر ہوئی تھی۔ اس دعوت میں وہ پہلے سے بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے۔ موضوع گفتگو ایک بھاپ کا انجن تھا۔ اسی سلسلے میں ایک ایسے جہاز کا بھی ذکر آیا جس کی سطح پر ایک کھینے والا پہیہ لگا ہوا تھا اور جسے اُن کے ولایتی انجنیئر نے تیار کیا تھا۔ انہوں نے شیراز کے ایک زلزلے سے متعلق بھی جس کی اطلاع اُنہیں پہنچی تھی بہت سے اسباب بیان کیے۔ انہوں نے بعض ایسی انگریزی کتابوں کا بھی ذکر کیا جن سے اُن کی انگریزی دانی کا اظہار ہوتا تھا۔ ولایتی انجنیئر کے علاوہ اُن کے دربار میں کئی اور انگریز بھی مختلف خدمات پر مقرر تھے جن میں سے چار کا اخراج رزیڈنٹ بیلی نے کرادیا تھا لیکن ایک لاجواب انگریزی مصور مسٹر ہوم آخر تک موجود رہے۔ وہ

بادشاہ اودھ کے لیے نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہیں۔ یہ مصور سعادت علی خان کے زمانے میں مدراس سے بلائے گئے تھے۔

علمی کام ان کے زمانے میں بہت سے علمی کام ہوئے جن میں سے ایک مدرسۂ علوم مشرقی کا قیام تھا اور دوسرا چھاپہ خانہ تھا۔ جس سے بہت سی علمی کتابیں شائع ہوئیں جن میں سے بعض مثلاً محامد حیدریہ وغیرہ اب بھی ملتی ہیں۔ اسی عہد کی مطبوعہ کتابوں میں تاج اللغات بھی ہے۔ خود بادشاہ نے دو سال کی مسلسل محنت سے علم لغت پر ایک مبسوط کتاب ہفت قلزم ترتیب دی تھی جس کا دیباچہ مولوی قبول محمد نے لکھا تھا۔ وہ شاعر بھی تھے نعت و منقبت زیادہ رکھتے تھے۔ غزل کم کہتے تھے مگر اتنا کہا تھا کہ صاحب دیوان تھے

رفاہ عام کے کام کچھ امور خیر انجام دیئے جانے کے لیے کئی لاکھ روپیہ کمپنی کو دیا جس کے سود سے آج تک وہ امور انجام پا رہے ہیں ایک نہر کھدوائی اور اس میں پانی لانے کے لئے انجن منگوایا۔ کنواری لڑکیوں کی شادی کا حکم قائم کیا۔ جس سے ہر سال ہزاروں لڑکیوں کی شادی ہوتی تھی اور لاکھوں روپیہ صرف ہوتا تھا۔

تعمیرات نجف اشرف قدم رسول سعادت علی خان کا مقبرہ مبارک منزل عالیشان عمارتیں بنوائیں۔ حیدر آباد اور بادشاہ نگر دو محلے آباد کئے۔

جدت طرازی ان کی طبیعت جدت طراز تھی۔ مندیل کی طرح ٹوپی ایجاد کی۔ گینڈے کو گاڑی میں جوتا اور اس پر ہودا رکھ کے سواری کی۔

نقرئی وطلا کار کشتیاں ایسے انداز کی بنوائی تھیں کہ کوئی مچھلی کی صورت تھی۔ کسی میں گھوڑے وغیرہ کی صورت بنی ہوئی تھی۔ بادشاہ کو سواری

بحر و بیر دیلے سے بہت شوق تھا۔ خیمہ اس طرح کا ایجاد کیا کہ بغیر طنابوں اور بمبوں کے پل کی طرح کھڑا رہتا اور ہوا سے نہ گرتا۔ شکاری حوضہ اس طرح کے بنوائے کہ شکاری جس طرف متوجہ ہو اُسی طرف حوضے کا رُخ پھر جائے۔ عمارات میں روشنی کے شیشہ و آلات نصب کیے۔ "دہی" کا نام "دیہی" رکھا۔ اور تختے کا نام "حسنِ محفل"

اپنے دربار کی آراستگی، خوش سلیقگی، علم موسیقی، اور ایجاد پسندی کے سلسلے میں بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اپنی طبیعت کی پاکیزگی اور ذوق کی نفاست کے لحاظ سے بھی اُن کا مرتبہ بلند تھا۔

قدردانی خاندانی شرافت کی بہت قدر کرتے تھے۔ شاہ ولی خاں وزیر احمد شاہ ابدالی کے بیٹے منصور علی خاں تلاش معاش میں لکھنؤ آئے اور وظیفہ یاب ہوئے میر والدولہ ناظم کے بیٹے عباس علی خاں لکھنؤ آئے اور کئی ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔

تصنیفات شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ حمد۔ نعت اور مرثیہ زیادہ کہتے تھے۔ غزل بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

علماء اور شعراء کے قدردان تھے قاضی محمد صادق خاں اختر کو بنگال سے بلوا کے ایک ہزار روپیہ ماہوار پر تصنیف و تالیف کے لئے رکھا۔ انھوں نے فارسی میں کئی کتابیں لکھیں محامد حیدریہ غازی الدین حیدر کے حالات میں لکھی۔

علامہ شیخ احمد یمنی مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے لکھنؤ آئے اور دربار سے وابستہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے ہلکے پھلکے طرز انشاء میں کئی کتابیں لکھیں جن میں مناقب حیدریہ خاص غازی الدین حیدر کے حالات میں ہے۔

ایک عربی لغت مولانا اوحد الدین بلگرامی مولانا فنی نقی زید پوری، مولانا اسمٰعیل لندنی اور مولانا سعد اللہ مراد آبادی سے لکھوائی۔ یہ نہایت بلند پایہ لغت ہے۔ یہ ولی عہد سلطنت نصیر الدین حیدر کے نام سے ہے۔ اس کا نام تاج اللغات ہے۔

علمائے فرنگی محل نے معقولات اور فقہ و حدیث میں اور علمائے خاندان اجتہاد نے معقولات و مناظرہ فقہ و اصول میں گرانقدر کتابیں لکھیں۔

خطاطی | مرزا علی نے فن خطاطی میں شہرت حاصل کی میر امیر علی رضوی پنجہ کش کے استاد مولانا غلام محمد ہفت قلم دہلی سے آئے اور قدردانی سے سرفراز ہوئے۔

سپہ گری | اگرچہ مسلمانوں کی ملک گیری کا زمانہ ختم ہو چکا تھا مگر لکھنؤ میں سپہ گری ترقی کر رہی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عام طور پر وضع میں داخل ہو گئی تھی۔ علما، شعرا، اطبا، روسا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو اس میں مہارت نہ حاصل کرتا ہو خاندان اجتہاد کے علما اس کو اپنا خاندانی فن سمجھتے تھے۔ بانک، پٹہ، کشتی، بنوٹ، برچھا، بانا، تلوار، کٹار، تیراندازی، شہسواری کے بڑے بڑے ماہر موجود تھے۔ کتنے آدمی اپنے فنی اختصاص کی وجہ سے بکیت، برچھیت، پھنکیت وغیرہ لقب سے مشہور تھے۔ سوائے علما کے ہر شریف آدمی تلوار ضرور باندھتا تھا۔

میر عطا حسین لکڑی کے استاد تھے۔

پٹھے باز خاں اپنے فن میں اتنے کامل تھے کہ سپہ گری کی ایک شاخ کے موجد ہوئے۔

میر رستم علی کے سینے میں دوہری باڑھ تھی سیکڑوں آدمیوں کا گھیرا توڑ کے نکل جاتے تھے۔

شیخ محمد حسین دونوں ہاتھ سے پٹہ ہلاتے تھے۔ ایک دن غازی الدین حیدر

اور ریزیڈنٹ کے سامنے اپنا کمال دکھایا لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔

میر ولایت علی ڈنڈا توڑ مشہور تھے ان کے مقابل کے ہاتھ میں کتنا ہی مضبوط ڈنڈا کیوں نہ ہو اسے توڑ ڈالتے تھے۔

محمد غلامی خاں طاقت اور شجاعت میں مشہور تھے امتحاناً شیر سے ان کا مقابلہ کرایا گیا انھوں نے کوڑوں سے مار ڈالا اس پر اسد الدولہ خطاب ملا۔

وہ اہل علم کی دل سے قدر کرتے تھے۔ سعادت علی خاں کے تمام دان کا کہار کر بخش ادیب پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اردو فارسی دونوں میں شعر کہتا تھا۔ حمائی اس کے رتبہ کے خلاف سمجھ کے گوہٹہ کے خزانہ عامرہ کے عملہ میں تقرر کیا۔

کھانوں میں جدتیں: اکرم علی رکابدار نے مصری کی روٹی، اور چار حصوں میں چار مزے کی روٹی پکائی۔ روپیہ اشرفی کا مربہ ایسا بنا تا تھا کہ اس کے صرف تک باقی رہے ۱۸۱۸ء میں کلکتہ کی نمائش میں پیش ہوا تو لوگ حیران ہو گئے اور رکابدار کو تمغہ ملا انعام

ایک باورچی نے شب رنگ اور نان آفتاب ایجاد کی۔

ایک رکابدار نے ایک من کی ایک روٹی پکائی۔

ان کی قدر دانی اور سخاوت کی عام شہرت تھی دور دور سے اہل کمال کھنچے چلے آرہے تھے نفیر محمد خاں گویا اسی زمانہ میں آئے اور امراء کی صف میں داخل ہوئے یہ سپاہی شاعر اور خطاط تھے۔

نواب محمد تقی خاں ہوس علم و ادب کے سرپرست شعراء کے مربی اور باکمال شاعر تھے نواب محمد تقی خاں ترقی باکمال شاعر یہ دونوں فیض آباد میں رہتے تھے اس زمانہ میں لکھنؤ چلے آئے تھے معتمد الدولہ آغا میر شعر و سخن کے دلدادہ اور ناسخ کے قدردان تھے ان کو خلعت و انعام دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کو ایک لاکھ روپیہ نذر کیا انکی بیٹی سلطان بیگم

زبردست شاعرہ تھیں ان کا شعر ہے

ملتے ہی آنکھ بندھ گیا میں کیسے ہائے دل … تھی وہ نگاہ یا کوئی ناوک کا تیر تھا

نواب سید محمد خاں رند بھی بڑے سپاہی تھے [illegible] فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے۔ خواجہ حیدر علی آتش [illegible] فیض آباد میں [illegible] نظام الدین حیدر کی کشش انھیں بھی کھینچ لائی [illegible]

[illegible] علی خلیل [illegible] شیخ [illegible] شاہ آباد لکھنؤ آئے آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے زمانہ کے سیکڑوں شاعر [illegible] ناسخ و آتش کی معرکہ آرائیاں [illegible] [illegible] ہندوستان میں [illegible]

[illegible]

مشاعرے

شاہزادہ سلیمان شکوہ، نواب قمر الدین [illegible] آغا میر، نواب محمد تقی ترقی، نواب محمد تقی [illegible] [illegible] عربی اور فارسی شاعری کا بھی بڑا چرچا تھا۔ [illegible]

[illegible]

مصوری: مرزا غلام حسین مہتمم عدالت دیوانی و فوجداری نے اس میں کمال حاصل کیا
مسٹر ہیوم نے جرمنی سے آگے سراج تک پہنچایا۔ غازی الدین حیدر کی تصویر ایک مصور
نے ایسی بنائی کہ پادری ہیبر نے اسے دیکھ کے کہا کہ اگر یہ مصور یورپ میں ہوتا تو
بڑا نام پیدا کرتا۔

بھانڈ اور بھانڈ ایسے نقال ہیں وہ شہرت حاصل کی جو اس سے پہلے کسی
بھانڈ کو نصیب نہیں ہوئی۔

موسیقی سرسے حیدری موسیقی میں اپنے کمال رکھتے تھے کہ ان کے بعد ایسا موسیقار
پیدا نہیں ہوا۔

شیخو شہر دہلی جب یہ غزل گاتی تھی تو محفل پر عالم طاری کر دیتی تھی

اے نسیم سحری آرام گہہ یار کجاست

غازی الدین حیدر کی بیوی حضور کی جنت والی بیگم پر ایک انگریز میں تھی تارحب
علی اور نخشل علی خیالی گانے میں تھے تو سننے والے تصویر بنے رہ جاتے تھے۔ ہلال جی اور
دیالوجی نے رقاصی میں حیرت انگیز کمال دکھایا۔

تعزیہ داری تعزیہ داری کو بڑا عروج ہوا۔ روضہ حضرت علی کی نقل
بہت شاندار تعمیر کرائی۔ امام حسین کے روضہ کی نقل سبز بلور کی لندن سے بنوا کے
منگوائی اس کا جلوس بڑے اہتمام سے نکلتا تھا اور بادشاہ خود سر و پا برہنہ ساتھ
ہوتے تھے۔

اولوالعزمی سیر چشمی اور اولوالعزمی کا یہ حال تھا کہ بادشاہ پیسے کو تو کوئی
ادنیٰ تک داد و دہش اپنی توہین سمجھتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات میں لاکھوں کے وارے
نیارے ہو جاتے تھے۔ معتمد الدولہ آغا میر کی مصاحبت میں بندہ علی جان اپنے سے چارہ

برس میں چودہ لاکھ کمائے۔

محمد خاں خدمتگار کو آٹھ مہینے کی خدمت کے صلہ میں چالیس ہزار یکمشت دیئے۔

ناسخ کو حق اُستادی میں سوا لاکھ بطور نذر پیش کئے۔

روشن الدولہ نے سمدھی کو شربت پلائی میں سولہ لاکھ دیئے۔

جو باکمال آیا وہ آسودہ حال گیا۔ غالب، میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں "لکھنؤ کا کیا کہنا اللہ اللہ وہ سرکار امیر گر تھی، وہ ہندوستان کا بغداد تھا جو بے سروپا وہاں پہنچا امیر بن گیا۔"

سپاہیانہ آن بان شعر و شاعری عشق و عاشقی خوش پوشاکی، خوش خوراکی خوش اخلاقی اور ہر بات میں نفاست و شائستگی لازمۂ انسانیت سمجھی جاتی تھی۔ شاہی اعلان کے ساتھ آئینِ تعظیم و تکریم بھی سخت ہو گئے سرو قد کھڑے ہو کے آدھے دھڑ سے جھک کے سات سات تسلیمیں بجالانا خندہ پیشانی سے پیش آنا تہذیب میں داخل تھا۔

غازی حیدر کا عہد لکھنؤ کی تہذیب و تمدن اور زبان و شاعری علوم و فنون کی ترقی کا درخشاں عہد ہے۔ اپنے مختصر دور میں انھوں نے علم و ادب کی جو خدمت کی اسے تاریخ نظر انداز نہیں کر سکتی۔

یورپین سیاح پادری ہیبر کا بیان ہے کہ سارا ملک آباد، سرسبز و شاداب اور رعایا خوشحال ہے۔

مولانا قبول محمد نے "ہفت قلزم" کے دیباچہ میں اس وقت کے لکھنؤ کی جو کیفیت بیان کی ہے اس کا آزاد ترجمہ طولانی القاب اور مکررات حذف کر کے

پیش کیا جاتا ہے۔

"بائیس رجب ۱۲۳۳ھ سہ شنبہ کے دن غازی الدین حیدر نے مسند حکومت پر قدم رکھا اور پالکی نالکی ہاتھی گھوڑے خلعت و منصب جاگیر و درماہہ انعام و اکرام سے سرداروں سپاہیوں امیروں اور رعایا کو نہال کر دیا اس کے بعد نئے اور پرانے شہر کی آبادی اور مکانات تمام و ناتمام کی تعمیر پر توجہ کی اور اپنی ایجادوں اور اختراعوں سے ایسی تجدید و آرائش کی کہ دیکھنے والے حیران ہو گئے طرح طرح کے نشیمن باغوں اور باغیچوں سے مکانوں کو جنت بنا دیا دولتخانہ (مبارک منزل) ایسا وسیع و شاندار بنوایا کہ قصر قیصر اور ایوان کسریٰ کو مات کرتا ہے۔ خاص بازار و جوہری بازار کی کیا تعریف کروں عمارتوں کی ترتیب نثر کے مقفیٰ فقروں کی طرح متوازن دو رویہ آبادی شعر کے مصرعوں کی طرح موزوں عمارتیں کشادہ گلیاں چوڑی، مکان صحن باغ سے بازار تک آراستہ دوکانیں سلک جواہر کی طرح درخشاں دوکانیں معشوقوں کے ابروؤں کی طرح پیوستہ شہرۂ سخاوت نے گرد ہا گروہ آدمی روم و ایران و ہندوستان کے جمع کر دیئے ہیں جو نئے اور پرانے شہر میں سکونت اختیار کر کے شاہی بذل و عطا سے عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس وقت لکھنؤ کیسا آباد ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے سیاحانِ ممالک کہتے ہیں کہ ایسا شہر روئے زمین پر نہیں دیکھا استنبول تخت گاہ روم اپنی عظمت میں مشہور ہے لیکن

اس شہر کے برابر نہیں۔ قزوین و اصفہان . . . . دارالسلطنت ایران لطف و خوبی میں شہرت رکھتے ہیں مگر اس کے مقابل ہیچ ہیں۔ اس شہر کی ناچنے اور گانے والیوں کا کیا حال بیان کروں ہر ایک حسن میں یکتا، چاند سا چہرہ کالے کالے بال پھول سے گال سرو کا قد حور کی صورت پری کی خصلت ہرن کی چیل بل چکور کی چال مور کی طرح مست تارے کی طرح چمکتی بوٹیوں پھول جھپٹنے اور جان لینے کو بیٹھتی ہیں۔

خوبی نگہاں کرشمہ کوشاں ؛ ہم خنجر و ہم نمک فروشاں

چوک میں ملک ملک کی نفیس اور نادر اشیاء کی خرید و فروخت کا ہنگامہ گرم ہے لعل بدخشاں، یاقوت درخشاں گوہر غلطاں اسلحے، خشک و تر میوے، کوہ پیکر ہاتھی باد رفتار گھوڑے باربردار اونٹ اور دوسری چیزوں سے بائع و مشتری ہزاروں کماتے ہیں ہر طرح کا اتنا سامان موجود رہے کہ پوری سلطنت کا ساز و سامان ایک دن میں خریدا جا سکتا ہے اور پوری فوج کا اسلحہ بے توقف مہیا ہو سکتا ہے ایک گھڑی دن رہے عجیب سماں ہو جاتا ہے

ایک طرف گھنگھروں پہ رقص و آہنگ کا دریا موجزن دلفریبی و دلبری کا بازار گرم ہے۔ دوسری طرف ظرفاء اپنے لطیفوں سے اعلیٰ ذہانت کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہیں قصہ گو انتہائی فصاحت

کے ساتھ قصہ بیان کر رہا ہے کہیں بازیگر اپنے کرتب اور نٹ رسی پر اپنے ہنر دکھا رہا ہے۔ کہیں رزم و بزم کے مرقعے ہاتھی گھوڑوں کی تصویریں عاشق معشوق کے راز و نیاز پہاڑوں آبشاروں کے مناظر دیواروں پر نصب کئے اپنی نمائش کر رہا ہے تماشائیوں کا ہر طبقہ ہجوم ہے دُنیا میں جتنے بھی کمال ہیں سب کھنچ کے آگئے ہیں اب کسی ملک میں برائے نام ہی کوئی رہ گیا ہوگا۔

غزنی میں محمود غزنوی کے زمانے میں ایک ہزار مدرسے تھے۔ ہم بے تکلف کہہ سکتے ہیں کہ اگر لکھنؤ میں گنے جائیں تو اس سے بہت زیادہ نکلیں گے

سلطان حسین نے بڑی کوشش سے اپنے شہر میں ایک سو چودہ شاعر جمع کئے تھے ہم بغیر کسی شبہ کے کہہ سکتے ہیں کہ لکھنؤ کے ہر محلے میں اس سے زیادہ شاعر موجود ہیں۔

سلطان ابراہیم عادل شاہ نے کثیر رقم خرچ کر کے اہل نغمہ و سرود کو جمع کیا جن کی تعداد مرد عورت سب ملا کے نو سو تک پہنچی اسی مناسبت سے اس شہر کا نام نورس پور رکھا اس شہر میں صرف ایک فلاں بیگم محل کے گرد و پیش اگر شمار کیا جائے تو اس سے زیادہ نکلیں گے اس پر دوسرے صاحبان کا ہنر قیاس کر لیجیے۔

سنہ ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۷ء) میں ان کا انتقال ہوا اور اپنے بنوائے ہوئے امام باڑہ (شاہ نجف) میں دفن ہوئے۔ لالہ صاحب رائے فریاد نے تاریخ کہی

حیدر بہ نجف مقام بگرفت

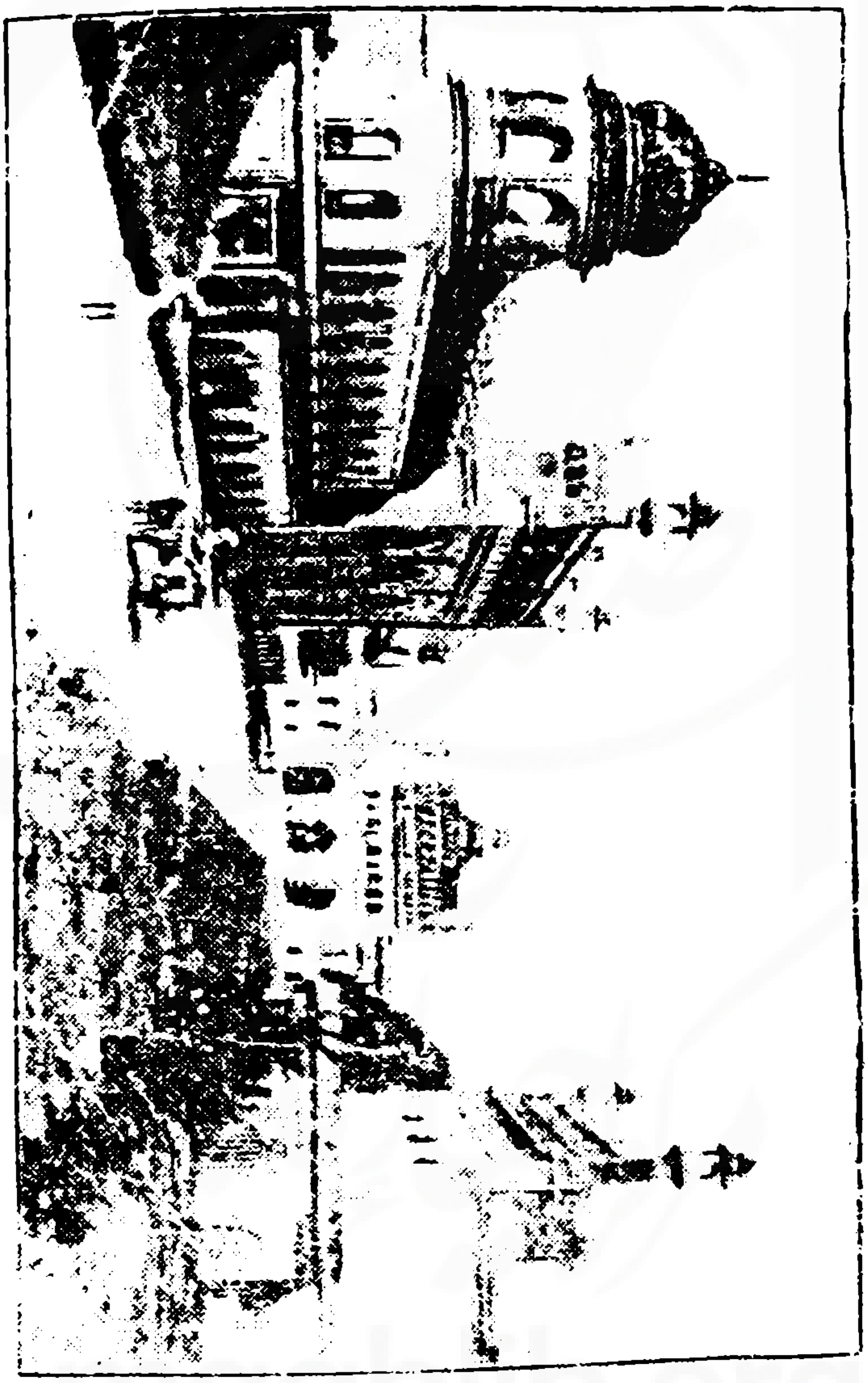

شاه زمان نصیر الدین حیدر

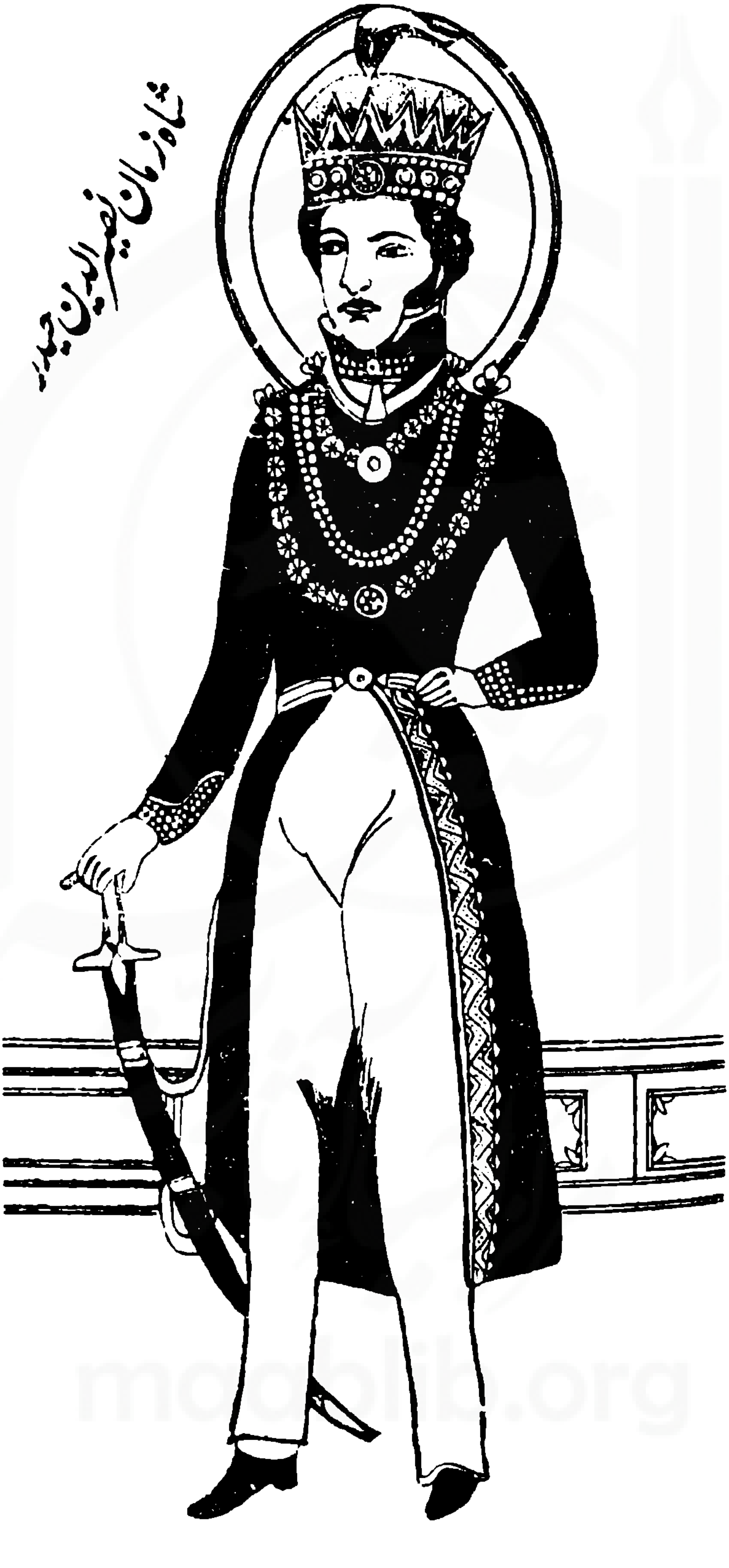

شہ نصیر الدین حیدر سلطان عالم

نصیر الدین محمد حیدر غازی الدین [illegible] تے بیٹھے ۱۸۲۷ء/۱۲۴۳ھ میں باپ کے تخت
وتاج کے مالک ہوئے [illegible] وشکیل [illegible] ہی چہرے سے نمایاں اعلیٰ درجے
کے شہ [illegible] اور بہت اچھے [illegible] گو [illegible] تھے بادشاہ تخلص تھا۔

وہ طبعاً ایرانی [illegible] نفاست بہت تھی خوشبو سے
بڑی رغبت تھی عطر اور [illegible] سے کیا۔ عورتوں سے
بہت دلچسپی تھی۔ علم [illegible] دلدادہ اور مذہب کے
شیدا تھے جو کچھ انہوں نے [illegible] سے [illegible] کا۔ تاریخ میں ان
کا زمانہ لکھنؤ کا عہد شا [illegible]

حکیم نجم الغنی [illegible] میں لکھتے ہیں

"[illegible] نے جو لباس پہن [illegible] مغل اعظم کی ملکہ اور
شہزادیوں کو نصیب نہیں ہوا۔ کہاریوں اور [illegible] وں کا ایک ایک ڈوپٹہ
چلنی چار ہزار کی [illegible] ت کا ہوتا تھا۔"

[illegible] لکھنؤ کو انھوں نے [illegible] بنا دیا
چار سو [illegible] سال [illegible] نہایت [illegible] فراہم کیں جو پر تکلف
[illegible] غازہ [illegible] اور عطر [illegible] رتیں ڈولی اور [illegible]
وہ مہرباں ان کی افسر [illegible] افضل [illegible] ان کا [illegible] جب بادشاہ محل
سرا میں جو میلوں تک پھیلی ہوئی تھی ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تو ہوادار میں
ان کو اٹھا کے لے جاتیں معلوم ہوتا کہ تخت سلیمان کو پریاں لئے جا رہی ہیں۔ ایک

زنانہ فوج الگ تھی جس میں عورتیں بھرتی کی جاتی تھیں جماعت خواصوں کی تھی جن کے حسن وجمال میں بادشاہ دلہا بن کر چار چاند لگا دیتے تھے۔

یہاں اُن مسکے ڈوم بلکہ ہزاروں پری جمال رقاصاؤں اور بہت سی مغنیوں کے علاوہ تھیں۔ [illegible] جب علی بیگ سرور سے ان کے چشم دید حالات سنیے:

"ستائیسویں ماہ ربیع الاول یوم پنجشنبہ ۱۲۴۳ھ مطابق اکتوبر ۱۸۲۷ء تھی کہ مرزا نصیر الدین حیدر نے بعمر [illegible] جلوس میمنت مانوس سریر سلطنت پہ کیا۔ اس سن و سال میں بادشاہی ہاتھ آئی۔ سلطنت کی [illegible] کو جس کی تمنا رہی میسر آئی۔ جوان بخت و جوان دولت جوان سال پچیس برس کا سن عین شباب جوانی کی ترنگ [illegible] مزے کے دن تھے۔ جو تاج و تخت بہ سبب جبت ہاتھ آیا زمانہ کی کیفیت و حکومت کا لطف خوب اُٹھایا۔

جلسے میں وہ ہر وقت پیش نظر رہا جو محمد شاہ کو خواب میں میسر نہ ہوا۔ ہزار ہا پری پیکر، حور وش، سیم تن، گلبدن، نازک اندام، خوش خرام، طاؤس رفتار، کبک [illegible] جبیں، لعبت چین غیرت حور، نازنین گلچہرہ [illegible] پری رو، ترک چشم مریخ خشم تنگ دہن [illegible] دستہ دستہ حلقہ در حلقہ۔ گلاب کیوڑے کا عطر جمع ہے۔ عطر کی نہریں بہیں۔ مکان اور باغ ہر ایک بہشت کا نمونہ تیاری میں گلشن شداد سے دونا اشرفی اور روپیہ [illegible] گنج بے رنج

خالی کر دیئے محتاجوں کے گھر بھر دیے، پھولوں کا یہ صرف تھا کہ
دیکھا نہ سُنا، ہزارہا باغ سرکاری عجیب روش عزیب تیاری کے
تھے، اُس پر کئی ہزار روپے کے پھول روز کے بازار سے آتے
تھے۔ صبح کو فراشیاں باسی ہار پھول جو پھینکتی تھیں۔ چاندی کے
ڈھیر ان کے ہاتھ لگ جاتے تھے۔

جلسے والیاں نادر زمانہ شہرۂ آفاق گائنیں پری چہرہ موسیقی میں
یکتا، دلبری میں طاق۔ ان کے علاوہ ہزاروں مہ سیما، رشک مہر،
کم سن اُبن کے جیپے، لااُبالیاں، اُمنگ کے دن، کہاریاں پریوں
کی صورت کی ہمیشہ ہوا وار مثل تخت حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا
پر رہا، نازو انداز نے بر سرزمین اُن کا پاؤں نہ لگنے دیا۔ اکثر سہ پہر
کو چمن بندی گل اور فواروں کی ہوتی تھی۔ دیکھنے والوں کا دل باغ
باغ ہوتا تھا عندلیب خوش الحان جان کھوتی تھی اس تختہ گل
فام پر لالہ داغ دکھاتا تھا۔ یاسمن کا منہ سفید ہو جاتا تھا۔ سنبل کو
ان کی زلف مسلسل دیکھ کر پریشان دیکھا۔ سرو کو مقابلۂ قامت
میں پا بہ گل پایا، شمشاد کو قد رعنا کے روبرو پشیمان دیکھا، خجل
پایا۔ مستی کی دھڑی دیکھنے سے رخ سوسن کبود ہوا۔ سوزبان سے
مدح وثنا کو موجود ہوا۔ نرگس اُن نشیلی آنکھوں پر ٹکٹکی باندھے
رہتی تھی، دیدۂ آہو سے خجلت سے اشکوں کی ندی بہتی تھی، زنخدان
دیکھ کر سیب کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ بہی کا مزہ ہوتا دھبا
لگ جاتا تھا۔

سو طائفہ شہر کا چیدہ اور سو دیہات کا پسندیدہ نو کر تھا۔ پہر دن رہے یہ سب حاضر ہوتے بچیس بچیس طائفے نے ایک ایک رنگ کے جوڑے عنایت سرکار، باغ و بہار، پہنے اور اسی میل کے گہنے معلوم ہوتا تھا کہ چمن رواں ہے بلکہ پھولوں میں یہ نزاکت و لطافت روش رفتار، تکلف گفتار، غمزہ و ناز کا انداز کہاں ہے اور بھان متی چرنے والیاں، ڈومنیاں، نٹنیاں، حسین، جو سج دھج کی نرالیاں قوال، بین کار، ربابیے، سردیے یہاں تک کہ ریچھ والے قلندر، بجرا اور بندر بھی ہوتا۔

کمرے میں سامان عیش تیار، انگریزی میز ایک سے ایک تحفہ، نادر روزگار سبز و سرخ کاشانی مخمل سے منڈھی، گز بھر کی جھالر نقرئی طلائی بادلے کی لٹکتی جہاں تک سیاح نگاہ جائے گلدستوں کا سبحان اللہ چمن نظر آئے۔ ان کے گرد کنٹر بادۂ ارغوانی و گلنار و زمرد فام کے چنے۔ قریب گزک کا سامان، جہاں کے فواکہ اور طشتریوں میں پستے بادام بھنے، متصل اس کے سب نعمت غیر مترقبہ پلاؤ ہر طرح کے، دوپیازے متعدد، طرحدار بھون حساب سے باہر، بورانی، بھرتے، اچار ہر گلدستے کے تلے کہ ہاتھ بڑھانے کی نوبت نہ آئے۔ جس چیز کی خواہش ہو وہیں پائے کمرہ دلہن کی صورت سجا، جھاڑ، جھابے، کنول، فانوس، ہوش ربا پردے وہ جن میں کھلا ہوا سیروں بنت، گوکھرو، لچکا ٹنکا، فرش سے تا سقف و جدار آئینہ بندی۔ سکندر اگر دیکھتا حیرت آتی

اپنی سلطنت حضرت سلیمان کو بھول جاتی، جدھر آنکھ اُٹھاتے
قدرتِ خدا کا مشاہدہ ہو جاتا تھا۔

اِدھر خود بدولت رونق افروز ہوئے اُدھر پریوں کا گانا ناچ ہونے
لگا۔ کمرے کے باہر انگریزی باجے بجنے لگے، قوال، ہمن کار، … اپنے
ساز بلا بجنے لگے۔ جو جس کام کا حاضر تھا اپنے شغل میں مشغول ہوا۔
خود بدولت اکل و شرب کی طرف متوجہ ہوتے۔ کسی سے آنکھ نہ ملاتے
تھے۔ آنکھوں میں ایک آئینہ سے سب کے لطف نظر آتے تھے اب
جس کا بخت مددگار اور طالع یار ہوا اس کو قریب بلایا کچھ کھلایا۔
اور جو اختلاط منظور ہوا، تو اس کا دلدر دور ہوا۔ ایک دم میں
نہال کیا، دولت دنیا سے مالا مال کیا۔ ایک ایک دن میں ہزار ہزار
جوڑے مفت اور پانچ پانچ سو جوڑی کڑے جواہر نگار … تھے
… بٹتے … کے نرم نرم ہاتھوں میں پڑ گئے
آدھی رات جب گذری … برخاست ہوئی۔ وہ حلیم
والیاں اور محل کی گائنیں، پری پوش، نغمہ نوش، مرقع پوش آئیں،
دھیمی دھیمی باتیں کوئی تلوے سہلانے لگی کوئی بہ ہوا خواہی سے پنکھا
ہلانے لگی کسی نے کہانی شروع کی، کوئی پہیلی کہانی، کسی نے …
شعر پڑھا کسی کا دل پاؤں چپی کے واسطے ہاتھ بڑھا۔ اب اس
… جس کا نصیبہ جاگا، وہ اپنا حصہ لے بھاگا۔
غرض … ظل سبحانی بیدار ہوا، مکان … تازہ سامان پھر
سے تیار ہوا۔ غرض کہیں … رات جو دن تھا، محرم کے

[illegible] تھی بہر دم جلیس و ندیم [illegible] تھی۔ [illegible]
[illegible] تھی جو [illegible] الملک [illegible]
[illegible] تھا [illegible] تھا [illegible]
رات دن [illegible] تھا یعنی وہ الماس تھا جس کی قیمت ہو نہ سکتی
تھا۔ الماس جیسا قیمتی و نادر [illegible] گم ہو گیا تھا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] گیا [illegible]
[illegible] علیہ [illegible]
[illegible] جان [illegible]
[illegible] اللہ [illegible]
دھوم [illegible]
میں [illegible]
میں [illegible] تشریف [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] گیا [illegible]
ڈھیر نہیں دیکھا فوراً محل میں [illegible] ہو گیا [illegible]
اگر [illegible]
[illegible]

راگنی جس صورت و پوشاک سے دیکھی وہی صحبت ٹھہری۔ ایک ٹھمری کے جلسے میں پان سو عورت دلہن کا لباس پہنے، ہاتھوں پاؤں میں مہندی لگی، چوڑی سہانی، سر سے پاتک جواہر کا زیورا ایک راگنی کی صحبت تیس دن ہوتی تھی۔ اندر کی سبھا کی آبرو ڈھوتی تھی۔ انصاف شرط ہے کیسا وہ جلسہ ہوگا اور کیا صرف ہوا ہوگا۔

مکّا خیاط کی قطع سب سے نرالی رہی، ہردم عیش و عشرت لاابالی رہی۔ ہزار روپے روز گرمی کی پوشاک کے مقرر تھے۔ صبح نواب کی خدمت میں آیا۔ صورت دیکھ کے توڑا منگایا۔ اور جاڑے کی پوشاک کے سوا لاکھ لاکھ لاکھئے اس نے کئی لاکھ روپے کی عمارت اپنی ویران بستی میں بنائی۔ اور لکھنؤ میں گنج، سرا، مسجد تعمیر کی۔ خوش دماغی میں اگر تانا شاہ پر طعنہ زن ہوں تو بجا ہے کہ ممدوح میرا نازک دماغ ایسا ہے۔ ایک دن لخلخے کی ہانڈی میں دھوکے سے بیلے کا تیل پڑ گیا گو وہ بھی ہوتیا کے عطر سے کم نہ تھا، مگر طبیعت رسا کمدر، دماغ پریشان ہوا۔ خوشبو ساز ہر ایک حیران ہوا کہ گردش تقدیر سے کیا سامان ہوا۔ بعد تحقیقات ثابت ہوا۔ واقعی میل تھا، بیلے کا تیل تھا۔ لخلخہ ساز نے اس وقت شامہ پر ہوش، کھو خطا کا اقرار کیا۔ مزاج میں یہ راست پسندی تھی کہ قصور معاف ہوا دل صاف ہوا۔

مغلانیاں ہزار پانچ سو روپے ماہواری کی نوکر تھیں۔ گوٹے پٹھے، کرن کی کترن اتنی پاتی تھیں کہ سونے چاندی کی اینٹیں گر ڈھلواتی

تھیں۔ خاصے والیوں نے مشک وعنبر و زعفران، لونگ والا ئچی کے خاصے خاصے محل اٹھائے۔ چکنی ڈلیاں دورخی جن پر دل پھسلے۔ ان کے انبار لگائے جو گھرڑے کی وہ الائچی کہ چھوٹی بڑی کی تمیز نہ آئے۔ اگر شب کو پائے۔ غرض ہر شے کا صرف بے حساب رہا۔ کارندوں نے جو لکھا دے لیا۔ گلوری، گز بھر جس کا عرض وطول، جہاں سے تراش کر کھلائے۔ مصالحہ برابر پائے سرخروئی حصول شہر کے تنبولی اس الیسٹھ میں بیٹھ ہو گئے۔ ہو بے اور گھر میں پان نہ رہے۔ پان بنا کر جو کھلاتی تھی۔ گلوری بازدہ پر ناز کہلاتی تھی، ہر دم سرخروئی سے کیا کیا انعام پاتی تھی۔ ایک دن پانچ توڑے اشرفی کے اور کئی ہزار روپیہ کی چادر جو اس وقت زیب دوش انور تھی۔ عنایت کی۔ اس کے کچھ خاطر میں نہ آئی بلکہ توڑے کئے۔ منہ بگاڑ کر بنایا، تیوری چڑھائی۔ اب گھر لٹنے کے بعد مزے اڑاتی ہے۔ دل کی ہوس نکالتی ہے۔ چاندنی راتوں میں سونا اچھالتی ہے۔

گھوڑے ایسے کہ ادہم صبا نے ہمسری میں منہ کی کھائی۔ گرد تک خاک نہ پائی۔ پیرو زہ نام ایک خوشخرام تھا، انسان کی خصلت تھی۔ گھوڑے کا نام تھا، وہم بشر خیال رفتار سے عاجز۔ پیک گمان تصور میں لنگ سطح غبرا اس کی گردش کو تنگ۔ رخش رستم، شبدیز خسرو، گرد تھا۔ ایسا سریع السیر جہاں گرد تھا۔ ہاتھی ایسے کہ دکن کی جان، پیل گردوں سے زیادہ رفعت و شان! اگر

سر اُٹھائیں، ماتھے آسمان سے رگڑ جاتیں۔ اس پر سبک رو، پھول اتنے کہ جب نمو پائیں، حشرات الارض زیر پا آزار نہ پائیں۔ ہزاروں جامہ وار گراں بہا زربفت و تمامی مطلا، گردنی و جھول کے واسطے قطع ہوئی کہ کشمیر سرد ہوگئی۔ ہودے اور زین سونے چاندی کے اتنے بنے کہ زین سفید اور زرد ہو گئی۔ بجز طلائے مہر و نقرۂ ماہ چاندی سونا نظر نہ آتا تھا۔ اُسے بھی گردونِ گرداں خوف سے دن رات چھپاتا تھا۔ جس طرف خیال آیا اُسے انتہائے کمال کو پہنچایا۔

اس عیش پسندی پر عشرۂ محرم میں یہ حال تھا کہ راہ چلتوں کو مسکرانا محال تھا۔ روز و شب غم اہلبیتؑ میں رونا ارلعین تک زمین پر سونا، لباس آبی یا سیاہ، ہر دم لب پر نالہ و آہ، ہزارہا روپیہ اور جہان کی نعمت، مرثیہ خوان اور سید محتاج آب و نان پاتے تھے۔ تکمیل حسنات و ثواب فرماتے تھے۔ دوازدہ امام کی درگاہ، صاحب الامر کا غار، بنوایا، لاکھوں روپے کا اسباب چڑھایا۔

بیٹھے بیٹھے طبیعت جو لہرائی، گنگا سے نہر منگائی، منظور ہوا کہ چشمہ خوشگوار جاری ہو، جو بحر ہستی میں یادگار رہو، سرسبز ہر ایک کاشت کار ہو، مزدور غریب غربا نہال ہو گئے۔ کارندے صاحب مال ہو گئے۔

گرمی کی فصل میں گلدستوں کا چمن بنتا تھا، پھولوں کا شامیانہ تنتا تھا۔ مسہری رشک گلزار، باغ و بہار بچھتی تھی۔ گردحوض

چادر، جواہر نگار، مد مرصع کار و دو چینی کے پر منقش و نگار، عطر سے بریز۔ بوتے فتنہ خیز فوارے کی جادر خت بنے تھے۔ پھول اور گلی سے فوارے چھٹتے تھے۔ اور چینی کے حوضوں میں درختوں پر جانور تھے، وہ کریال کرتے، آواز دیتے تھے، ہر شام یہ سامان تیار ہوتا، صبح کو وہ بدلا جاتا، تازہ ماجرا دیدہ آتا۔"

رجب علی بیگ سرور فسانہ عبرت کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"ہزار بارہ سے چلنے والی حوردش، برق کردار، کبک رفتار نغز گفتار، انرپا تا فرق دریائے جواہر میں غرق دست بستہ روبرو کھڑی رہی۔ جہاں کی نعمت سامنے پڑی رہا۔ . . . . . ہر وقت راجہ اندر کا جلسہ رہا، نہروں میں عطر بہا، مکان اس طرح کے بنوائے کہ فلک گرداں نے صدقے ہو کر چکر کھائے۔ اور اس گلشن ارم کہ ایسا باغ اور اس طرح کی کوٹھی چشم دگوش عالم نے دیکھی نہ سنی . . . . . اور اس میں عطر کا حوض چھلکتا رہا، تمام شہر مہکتا رہا۔"

مرقع خسروی کے مصنف محمد عظمت علی ناکی نصیر الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں موجود تھے انھوں نے اس بادشاہ کی نفیس مزاجی اور عیش پسندی کے بیان میں بہت کچھ وہی لکھا ہے جو آپ سرور کی زبان سے ابھی سن چکے ہیں۔ اس بیان کے دو مختصر ٹکڑے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

"عالی دماغی کی وجہ سے گلاب وکیوڑے سے حسن کی ٹٹیاں چھڑکی جاتیں[1]"

"سترہ سو جلسے والیاں نادرۂ زمانہ . . . . . ملازم ہوئیاں اور بارہ سو گائیں . . . . .

فن موسیقی میں یکتا . . . . . باریاں بھریاں[2]"

یہی مصنف ایک جگہ لکھتا ہے :

"گیارہ سو سامیاں صرف جلسے والیاں اور ڈومنی والیاں عیش محل کی تھیں[3]"

اور نواب قدسیہ محل کی سخاوت کے سلسلے میں کہتا ہے۔

"ایک ایک دن میں لاکھ لاکھ روپے جلسے والیوں کو اس نے دیدیئے

ان کے مصاحبوں میں پانچ انگریز بھی تھے۔ ایک انگریزی پڑھاتا تھا۔ دوسرا باڈی گارڈ کا کپتان تھا۔ تیسرا خاصہ تراش تھا وہ سیاحت کے لئے آئے تھے۔ مصاحبت میں داخل کر لئے گئے تھے۔ یہ دونوں کچھ دنوں کے بعد نکال دیئے گئے۔ ان میں سے ایک نے انگلینڈ جا کے اپنی چشم دید واقعات میں ایک کتاب "لائف آف این ایسٹرن کنگ" شائع کی۔ اس کے اردو ترجمہ "شباب اودھ" سے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

"بیس برس اُدھر میں لکھنؤ گیا تھا اس وقت نصیر الدین حیدر فرمانروا تھے۔ میں نے کلکتہ میں لکھنؤ کی عجیب داستانیں سنی تھیں۔ یعنی وہاں ایک عظیم قوش خانہ ہے۔ باشندے قدرتی طور پر بہادر اور جنگجو ہیں۔

---

[1] مرقع خسروی۔ نوٹ: مرقع خسروی اور اس کے متعلق عبارت پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب کی کتاب لکھنؤ کا شاہی اسٹیج سے منقول ہے

گلی کوچوں میں مہیب صورت لوگ ڈھال تلوار بندوق اور پستول سے مسلح نظر آتے ہیں۔۔۔۔ یہاں میں نے جو کچھ دیکھا وہ میرے وہم و گمان سے بھی زیادہ تھا۔ پہلے تو مجھے ایوان شاہی دیکھ کر حیرت ہوئی کیونکہ یہ گنجینۂ محلات و قصور تھا جس کا سلسلہ دریائے گومتی کے کنارے دور تک چلا گیا ہے۔۔۔۔

دوسری جانب وسیع رمنہ تھا جس میں شاہی توشہ خانہ تھا اس میں اس قدر کثیر اور مختلف اقسام کے جانور تھے جن کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ صد ہا ہاتھی گینڈے، تیندوے، چیتل، پاڑھے ہرن، ایرانی بلیاں، چینی کتے کچھ کھلے بندوں کچھ کٹہروں میں بند۔

اہلِ لکھنؤ کی سپاہیانہ زندگی بشپ ہیبر صاحب نے ڈرلیڈرن اور دوسرے سیاحوں نے لکھنؤ کو ماسکو سے مشابہ بتلایا ہے مگر میرے نزدیک لکھنؤ کی ایسی عجائب روزگار چیزیں کہیں نظر نہ آئیں گی اولاً لکھنؤ کے ایسے ہتھیار بند آدمی ان شہروں میں کہیں دکھائی نہ دیں گے ماسکو کے باشندے صرف چھری باندھتے ہیں اور قاہرہ کے لوگوں کے ہاتھ میں کبھی کبھی کچھ ہتھیار دکھائی دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے لکھنؤ کے باشندے بالعموم، بچے بنے نظر آئیں گے اُن کے پاس ڈھال تلوار اور بندوق یا پستول ضرور ہوگی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو کاروبار روزمرہ کرتے ہیں وہ بھی تلوار ضرور باندھتے ہیں اور کوچہ و گرد جب سیر و گشت کو نکلیں گے تو کمر میں پیچھے کی جوڑی اور ڈھال دونوں لگائے ہوں گے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے مہیب صورت راجپوت

اور پٹھان اور سیاہ داڑھی والے مسلمان ڈھال تلوار سے لیس تنے ہوئے نظر آتے ہیں اور اہلِ لکھنؤ کے پندار خود پسندی و جوش نبرد آزمائی کو بخوبی عیاں کرتے ہیں۔

یہ امر کہ اہلِ لکھنؤ بالعموم سپاہیانہ وضع رکھتے ہیں تعجب خیز نہیں ہو سکتا اس لئے کہ کمپنی کی فوج میں اودھ کے تربیت یافتہ بکثرت ہیں اور علاقہ بنگال کی تمام تر فوج یہیں کے باشندوں سے مملو ہے۔

باشندگانِ لکھنؤ میں اسلحہ کا مذاق بچپنے سے پیدا کر دیا جاتا ہے تیر برچھے یہاں کے لڑکوں کے معمولی کھلونے ہیں اور جس طرح انگریز دائیاں بچوں کے ہاتھوں میں جھنجھنے دے دیتی ہیں اسی طرح یہاں چھوٹے چھوٹے تیغے اور کاٹھ کی تلواریں کھیلنے کو دی جاتی ہیں۔ اس شہر کے گلی کوچے میری نظر میں بالکل انوکھے معلوم ہوئے گویا عالم رویا میں میرا گذر ایسے ملک میں ہوا ہے جہاں خواص و عوام پہلوان پیدا ہوتے ہیں جن کے چہرے سے جنگجوئی ٹپکتی ہے جس کا تذکرہ میں نے لڑکپن میں قصہ کہانی کی کتابوں میں پڑھا تھا۔"

تقریب ملاقات بادشاہ کے سامنے ہم پیش ہوئے ..... وہ ڈریس کوٹ، سیاہ گلوبند اور سیاہ وارنش کا بوٹ پہنے ہوئے تھے ..... کھانے کے کمرے میں جب ہم سب لوگ جا کے بیٹھے تو عجیب سماں نظر آیا۔ مغربی اور دیسی سامان ملا ہوا تھا۔ بادشاہ ایک زرنگار کرسی پر بیٹھ گئے۔ جو زمین سے کچھ اونچے پر رکھی تھی۔ ہم لوگ اُن کے دونوں پہلوؤں میں بٹھائے گئے۔ میز کا دوسرا رُخ بالکل خالی تھا اس

خزمن سے کہ ملازموں کو رکابیاں پلیٹیں اٹھانے میں آسانی ہو اور جو کھیل تماشے اس شب کے واسطے مہیا ہوئے تھے انھیں بادشاہ سلامت بآسانی ملاحظہ فرماسکیں۔

ہم لوگ آئے بیٹھے ہی تھے کہ نصف درجن اعلیٰ درجہ کی حسینہ وجمیلہ خواصیں ملبوس زرزیب تن کیے کمرے کے ایک گوشے سے پردہ اُٹھا کے برآمد ہوئیں چونکہ آگاہ کردیا گیا تھا کہ ان کی طرف ہرگز نگاہ نہ اُٹھانا۔ میں نظر بچا کر کنکھیوں سے ان کا نظارہ کرتا رہا۔

یہ پری جمال عورتیں بہت ہی خوبصورت تھیں۔ ہلکا ہلکا گلابی رنگ کالے کالے گھونگھر والے بالوں کی لٹیں جن کی چوٹی گندھی ہوئی تھی جن میں زرتار موباف کی بندش اور مرصع سیس پھول چمک رہے تھے۔ گورے گورے چہروں پر سجاوٹ بہت ڈھا رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ رخساروں سے خون چھلک رہا ہے اور شوخی وشنگی ٹپک رہی ہے۔ باریک آب رواں کا ڈوپٹہ بے ساختگی کے ساتھ کپڑوں پر پڑا ہوا شانوں کے نیچے لٹکتا تھا۔ ڈوپٹوں پر زری کا کام تھا اور کپڑوں کی باریکی شانوں اور بازوؤں کی چمک دکھا رہی تھی ان عورتوں کے ہاتھوں میں مور کے پروں کی مورچھل تھی اور جب بادشاہ کی پشت پر مگس رانی کرتیں تو اُن کے آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کی ادا غضب تھی سینوں کا اُبھار اور ہر جنبش پر کمر کو لھوں کا جھونک قیامت کا سامنا تھا اُن کا جسم زیریں پائجاموں سے پوشیدہ تھا جو زرد سرخ چمکدار رومی اطلس کے تھے، ان پر زرق برق

زر دوزی کے کام کی پیٹی کسی ہوئی تھی اور زرا اوپر کرتی کی گوٹ باریک ڈوپٹے سے اپنا جھلکڑا دکھلا رہی تھی۔

بادشاہ کی پشت پر یہ عورتیں چپ چاپ مودب کھڑی ہو گئیں نہ بادشاہ نے ان سے کچھ کہا اور نہ لوگوں میں کوئی ان سے مخاطب ہوا یہی معمولی دستور روزمرہ کے کھانے کے وقت کا تھا۔ ان عورتوں کے ہاتھ بازو تک برہنہ تھا اور ان کا لطف اس وقت نظر آتا تھا جبکہ دو دو باری باری بادشاہ کے پشت مورچھل ہلانے میں اپنی نازک کلائیوں کو آہستہ آہستہ جنبش دیتی تھیں۔

کھانا: انگریزی بہت لذیذ تھا کیونکہ ایک اعلیٰ درجہ کا فرانسیسی کا بدار شاہی باورچی خانہ کا مہتمم تھا۔ شراب اعلیٰ درجہ کی کلارٹ مڈیرا شامپین گرمیوں میں برف لگا کے آتی تھی جس سے سرد اور بڑھ جاتا تھا۔ کھانے کے بعد پیا پے دور چلتا تھا۔ اس کے بعد تر و تازہ میوے آتے تھے۔ پھر کھیل تماشے شروع ہوتے۔ نٹ، بازیگر اور مسخرے، جگت لڑنے والے سپیرے جادوگر کٹھ پتلی کا تماشا مرغ، بیٹر اور تیتر کی بازیاں ہوتیں ساتھ ہی ایک طرف طوائفوں کا ناچ اور ان کی سنگیت میں ہر طرح کا ساز چھڑا رہتا ان طوائفوں کی صورتیں ایسی دلکش نہ تھیں جیسی ان خواصوں کی تھیں لیکن ان کا ڈیل ڈول موزوں اور چھب تختی غضب کی تھی۔ شوخی و شنگی چستی و چالاکی کم نہ تھی۔ ایک گوشہ میں گاج کا پردہ پڑا ہوا تھا ادھر دیکھنا آداب دربار کے خلاف تھا کیونکہ وہاں حرم شاہی

تماشا دیکھنے بیٹھتیں۔ عیش ونشاط کی لے بڑھی ناچ گانا ہو رہا ہے اور بادشاہ شراب سے سرشار ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ وہ بالکل بدمست ہو گئے آخر کار خواصوں اور خواجہ سراؤں نے سہارا دے کر محل سرا میں پہنچا دیا۔

پرستان: دوسرے دن ایوان شاہی دیکھ نذرنگار آئینے بیش بہا شیشے کے آلات سے سجا ہوا تھا۔ اس کے ایک حصے کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی یہ ایک مصنوعی جھیل تھی جو تمام باغ کو گھیرے ہوئے تھی۔ بیچ میں ایک خوبصورت سی بارہ دری تھی اس میں باہر کی طرف نہایت نفیس رنگ آمیز گلکاری اس پر چھوٹے چھوٹے نکیلے اور خوبصورت تھے اور مینارے تھے جھیل کا پانی ایسا صاف شفاف تھا کہ تہ کی سب چیزیں نظر آتی تھیں اس کے اندر بڑی بڑی سنہری روپہلی مچھلیاں تیرتی تھیں۔ بارہ دری تک پہنچنے کے لئے بجرا تھا اس پر ہم دونوں اس پرستان میں داخل ہوئے درکمرے متوسط طول وعرض کے تھے اور دونوں بے حد آراستہ تھے بڑی بڑے دنگل اور کوچیں دیواروں سے لگی ہوئی تھیں بارہ دری میں کھڑے ہو کر صاف شفاف پانی کا نظارہ کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ پرستان میں گزر ہو گیا ہے جھیل میں مچھلیوں کا سیماب دشتی سے تیرنا ڈوبنا اور ابھرنا بجرے کی سجاوٹ سواحل پر رنگ برنگی پھولوں کی گوٹ اور اردگرد لابنی گھاس اور گھنی گھنی جھاڑیاں جن میں پھول چھپے ہوئے تھے اور جن کی وجہ سے

گرد و پیش کی عمارتیں چھپ گئی تھیں۔ یہ سارا سماں بے حد دلفریب تھا

شکار ایک مرتبہ کھانے پر شکار کا ذکر چھڑا کہ چند میل پر ایک جھیل میں شکار بہت ہے فرمایا ہاں ہم نے بھی سُنا ہے۔ اچھا چلو شکار کھیلیں قرار پایا کہ ہم لوگ ان عمارات میں جو جھیل کے کنارے واقع ہیں دوسرے روز مجتمع ہوں ایک عمارت جس کا نام دلکشا ہے شہر سے چند میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ دوسرے دن ہم لوگ وہاں پہنچ گئے۔ اور اس خیال سے کہ شام تک شکار سے واپس آجائیں گے کسی نے شب باشی کا سامان نہیں لیا جب وہاں پہونچے تو دیکھا کہ بادشاہ سلامت مع اپنے خدم وحشم کے تشریف فرما ہیں ہم لوگ سمجھتے تھے کہ پہنچتے ہی جھیل پر چلنے کے لئے طلب فرمائیں گے مگر کسی نے خبر بھی نہ لی۔ رات کو نو بجے کھانے پر طلبی ہوئی یہ عرض کرنے کی جرأت نہ تھی کہ شکار کیوں ملتوی ہوا کھانے پینے اور رقص وسرود میں آدھی رات گذر گئی جب بادشاہ نشہ میں چُور ہو گئے تو فرمایا کہ بس اب کل شکار کھیلیں گے یہ کہتے ہوئے محلسرا میں چلے گئے جاتے وقت پہلے تو ہم لوگوں سے فرمایا کہ آپ کا جی چاہے تو ناچ گانا موقوف نہ کیجئے گا۔ پھر طوائفوں کے قریب سے جب گزرے تو فرمایا کہ تم لوگ ناچے گاتے جاؤ۔ وہ وقت بھی خوب تھا۔ لق دوق کمرہ جہاں ہر قسم کی قندیلیں ہانڈیاں جھاڑ فانوس دیوار گیریاں روشن تھیں ہو کا عالم تھا۔ بادشاہ گئے ان کے ساتھ ہی ان کی خواصیں پیش خدمتیں بھی داخل ہو گئیں۔ اب ہم چند نفس اور بے چاری ناچنے گانے والیاں کیا خاک جی لگتا۔ ہم نے ان کو رخصت کیا۔ میز

پر سے اُٹھے اور گرد گھومنے لگے۔ یہ کل عمارت ہماری چہل قدمی کے
واسطے وقف تھی شاہی خواب گاہ البتہ مستثنیٰ تھی کیونکہ اس کے سامنے
ہندوستانی عورتیں باہیانہ وردی میں کاندھوں پر بندوقیں رکھے
آہستہ خرامی سے پہرہ دے رہی تھیں دوسرا دن ہوا وہ بھی پہلے
دن کی طرح گزر گیا پوچھنے سے معلوم ہوا کہ بادشاہ اپنی ایک نئی حرم سے
جو بہت ہی کمسن اور خوبصورت ہے اور جسے ہم نے دو دن
پہلے دلکشا میں دیکھا تھا مشغول عیش ہیں۔ ایک ہفتہ گزر گیا
اس کے بعد ہم لوگ جھیل کی طرف روانہ ہوئے جھیل اور اس کے
گرد کے سامان کو دیکھ کر ہم لوگوں کو سخت تعجب ہوا جھیل دو میل
لمبی ایک میل چوڑی تھی بجز اس رخ کے جس طرف سے ہم پہنچے تھے
ہر طرف گھنا جنگل تھا جس کے درختوں کی شاخیں پانی پر سایہ فگن
تھیں۔ جدھر جنگل تھا اُدھر کا کنارا ذرا بلند تھا اور اس پر سرسبز
و شاداب مرغزار دور تک نظر آتا تھا اسی میں بڑے بڑے خیمے
راوٹیاں چھولداریاں نصب تھیں بیچ میں شاہی خیمے تھے جن کے
گرد قنات کھڑی ہوئی تھی۔ خاص شاہی خیمہ زرتار بادلے کا تھا
جس میں قرمزی دھاریاں عجیب حسن دکھا رہی تھیں۔ اس کے
گرد زرنگار جھنڈے لہرا رہے تھے قنات کی پشت پر شاہی محلات
و بیگمات ان کی پیش خدمتیں خواصیں زنانہ پہرے والیوں، ڈومنیوں
وغیرہ کے خیمے ترتیب وار نصب تھے۔ بادشاہ کے خیمے کے داہنی جانب
رزیڈنٹ کے لئے ایک خوشنما خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ دوسری جانب

کچھ فاصلے پر ہم یورپین ملازمین کا خیمہ تھا۔ ان خیموں کے علاوہ وزیران کے صاجزادے سپہ سالار جنرل صاحب یعنی پولیس کے افسرِ اعلیٰ اور دیگر عہدیداروں کے خیمے تھے ان میں سے بعض کے ہمراہ بہت کچھ خدم وحشم تھا اس چھوٹے سے شہر میں ہاتھی گھوڑے خچر بھی تھے کہیں ہاتھیوں کے ہودے نظر آتے تھے کہیں پالکیاں اور ہوادار اور پھر انھیں کے ساتھ طرح طرح کی بند سواریاں شاہی مخدرات کے لیے تھیں .... بادشاہ تین دن شکار کھیلتے رہے .... اس کے بعد بازوں سے شکار ہوا ان سے ایسے ایسے کام لیے گئے۔ جو ان کی سمجھ سے بہت بعید معلوم ہوتے تھے۔ پہلے ہزاروں جانوروں کو دانہ ڈال کر جھیل کے کنارے جمع کیا گیا اور چار پانچ باز چھوڑے گئے بندوقیں لے کے ہم لوگ کچھ جھیل کے کنارے کچھ کھلے میدان میں کھڑے ہو گئے اور کچھ کشتیوں پر سوار ہو گئے اسی دوران میں ہزارہا جانور پانی سے اُڑ کر ہوا میں بلند ہوئے اور بازوں نے تلے اوپر سے ان کو گھیر کر ایک مقام پر قائم کر دیا نہ بلند ہونے دیتے نہ زمین پر اُترنے دیتے اور ہم لوگ بندوقوں کا نشانہ بناتے رہے عجیب چہل پہل اور زندہ دلی تھی .... بادشاہ کو شکار کا ایسا لطف ملا کہ انھوں نے آگے بڑھ کر درندوں کے شکار پر رغبت ظاہر کی .. حسب الحکم جھیل کے کنارے سے خیام شاہی اکھاڑے گئے اور شمال کی جانب کوچ بول دیا گیا۔ اس لاؤ لشکر کے ساتھ قطع منازل بآسانی ممکن نہ تھا۔ سامانِ شکار میں باز بھی تھے کیونکہ ابھی ان کے ذریعے

شکار کھیلنا منظور تھا۔ چیتے بھی تھے بارہ سنگھے بھی تھے سب چھکڑوں
پر بند گاڑیوں میں لدے چلے جا رہے تھے ان کے ہمراہ ان کے
محافظ بھی تھے۔ شاہی حرم سرا بھی تھیں جن میں خاص بیگمات اور
بہت نظر کردہ شاہی تھیں، رنڈیاں ڈومنیاں خواصیں پیش خدمتیں
اور پہرہ دارنیاں سب بند سواریوں میں سوار ایک فوج کی فوج
تھی۔ باڈی گارڈ کا رسالہ بھی موقع نیلگوں وردی میں سجا ہوا
تھا۔ ہاتھی بھی تھے اونٹ اور سانڈنیاں بھی تھیں کچھ بار برداری
کے لئے کچھ ہرکاروں کی سواری کے لئے گھوڑے بھی ریل پیل تھے
ان سب میں ہمارے جلوس کا اضافہ کرنا چاہیئے جس میں ہاتھی گھوڑے
پالکیاں تھیں۔ اتنے بڑے لاؤ لشکر کا سفر کچھ آسان نہ تھا۔ کسی طرح
یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ صرف سادے طور پر شکار کھیلنے جا رہے ہیں
بلکہ خیال ہوتا تھا کہ کوئی ہندوستانی راجہ تیار فوج لے کر کسی ملک پر
چڑھائی کرنے چلا ہے اور شاہانہ فوج و سامان سے چلا ہے۔۔۔۔
غرض اس لشکر کا ورود ایک دوسری جھیل پر ہوا جو پہلی جھیل سے
۴۵ میل کے فاصلے پر تھی اور پہلی جھیل سے دوگنی، صحرائیت میں
بدرجہا زیادہ جوں جوں ہم شمال کی طرف بڑھتے جاتے تھے کہ کوہ
ہمالیہ کا برفیلا سلسلہ نظر آتا تھا۔۔۔ لشکر کا پڑاؤ جھیل سے کچھ
فاصلے پر ڈالا گیا۔۔۔ بادشاہ حسب قاعدہ تنہا شکار میں مشغول ہوئے
۔۔۔ باز کے شکار کی نوبت آئی۔۔۔ جوں ہی باز کو چھوڑتے
وہ تیر کی طرح ہوا میں جاتا پھر آہستہ آہستہ شکار کے گرد گھومتا اور

پھر اوپر اُڑ کر بجلی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتا اور پنجوں میں پکڑ کے
اُس کو گھائل کر دیتا اسی حالت میں پنجوں میں دبائے گڈمڈ زمین پر
گر پڑتا .... جب ہم لوگ دیکھ لیتے کہ باز نے شکار کو دبوچ
لیا ہے فوراً اس کے تعاقب میں گھوڑے دوڑاتے ... بادشاہ
شہسوار بہت اچھے تھے شکار کے تعاقب میں ان کو خاص لطف
آتا .... شکار کے بعد ہم لوگ کھانا کھاتے ہر قسم کا سامان جو لکھنؤ
میں ہوتا تھا بدستور مہیا رہتا ... طرح طرح کے الوان نعمت بڑے
بڑے شمعدان بیش بہا ظروف چینی و نقرئی شاہی خواصیں پیش
خدمتیں مور کے پنکھوں سے مصروف مگس رانی ارباب نشاط سرگرم
رقص و سرود یہ سب جنگل کو منگل بنائے ہوئے تھا اور ہرگز یہ
قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ ہم لوگ کسی ایسے مقام پر ہیں جو لکھنؤ سے
پچاس میل کے فاصلے پر ہے اور جس کے گرد جنگل ہی جنگل ہے چونکہ
اس جنگل میں بنڈیلے سور اور شیر نہ تھے اس لئے ان کے شکار کو آگے
جانا پڑا ... اس جنگل میں ہرن بہت تھے لہٰذا تجویز ہوا کہ پہلے ہم
لوگ بارہ سنگھوں سے پھر چیتوں سے پھر خود گھوڑے پر اور پیدل
ان کا شکار کریں۔ کیونکہ بادشاہ بندوق اور باز کے شکار سے اُکتا
گئے تھے ..... بڑے بڑے کار آزمودہ ہنکوالے بھیجے گئے وہ
ہرنوں کے غول کے جن کی سربراہی نر کرتا ہے بغیر شور و غل مچائے
اور منتشر کئے کھُلے میدان میں ہنکالائے۔ شاہی لشکر کے بارہ سنگھے
چھوڑ دیئے گئے وہ جنگل کے کنارے میدان میں سبک خرامی سے جاتے

لگے۔ ہرنوں کے گلوں کے نگہبانوں کی نگاہ ان پر پڑی۔" ان میں جو دلیر تھے آگے بڑھے۔۔۔۔ گتھم گتھا شروع ہو گئی۔ کلہ بکلہ شاخ بشاخ دست بدست بڑی بے جگری سے زور لگانے لگے۔۔۔۔ ہم لوگ کھلے میدان میں گھوڑوں پر لڑائی دیکھنے اُمڈے ہوئے۔ ہرن تو سب رفوچکر ہو گئے۔ صرف لڑنے والے میدان میں جمے رہے اتنے میں ایک گروہ آہستہ آہستہ ان کے قریب پہنچ گیا اور بڑے بڑے چاقوؤں سے ان کو گھائل کرنے لگا جس سے وہ تھرتھرا کے زمین پر گر پڑے۔۔۔۔ بارہ سنگھے واپس بلالئے گئے اور وہ محافظوں کی آواز پر کتوں کی طرح سر جھکائے واپس چلے آئے۔۔۔۔ ایک روز ہرن کے شکار کے لئے چیتے چھوڑے گئے۔۔۔ شکار کے سامنے چیتوں کا لے جانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ چیتے پالنے والے ان کے گلے میں کتوں کی طرح زنجیریں ڈال کے لے جاتے ہیں تھوڑی دیر تک وہ خوشی خوشی چلا جاتا ہے لیکن جہاں کہیں کسی چیز پر نظر پڑھی یا جنگل کی طرف سے کوئی آواز آئی یا زمین سے کسی قسم کی بو اس کے دماغ میں پہنچی بس وہ ٹھٹھک کے بھونچکے پن سے سر اُٹھا کے دیکھنے لگتا ہے اور پھر چند ہی منٹ میں بے تاب ہو جاتا ہے اس موقع پر اس کو رام کرنے کے لئے لکڑی کے دستہ میں لگا ہوا پُر از نمک ناریل نگھایا جاتا ہے جس کے اثر سے اس کے دماغ سے وہ کیفیت دور ہو جاتی ہے اور وہ سیدھی چال چلنے لگتا ہے جتنی مرتبہ علامات وحشت نظر آتی ہیں اتنی ہی بار یہ تدبیر کی جاتی ہے۔۔۔۔ جب چیتا شکار کے

سامنے پہنچ جاتا ہے اس وقت اس کی اُچھل کود اور بیتابی قابلِ دید ہوتی ہے ادھر ہرن بے تحاشا چوکڑیاں بھرنے لگتا ہے۔ اونچا نیچا کھائی خندق کچھ نہیں دیکھتا۔ بڑے زوروں سے طرارے بھرتا ہوا میں اُڑتا نظر آتا ہے۔ ادھر چیتا بے اختیار زقندیں بھرتا کبھی درختوں کی ڈالیوں کو پھاندتا کبھی پانی میں گرتا۔۔۔۔ شکار کا پیچھا کرتا ہے یہ ساری کیفیت دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے ایسی صورت میں جو سوار اس کے پیچھے دوڑتے ہیں ان کی کارگزاری کوئی آسان امر نہیں باوجودیکہ ہزار کوششیں کی گئیں کہ بادشاہ بآسانی اس شکار کا تماشہ ملاحظہ فرمائیں۔۔۔۔ پھر بھی نظر جمائے رہنا آسان نہ تھا۔ ہم لوگوں کی سواری میں نہایت تیز اور جاندار گھوڑے تھے ریتلی زمین دلدل اور جھاڑیوں سے ان کا آسانی سے گزرنا ممکن نہ تھا لیکن گھوڑے دوڑے چلے جا رہے تھے کسی کو یہ تاب نہ تھی کہ بادشاہ کے آگے گھوڑا نکال لے جائے بدحواسوں کی طرح آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے معلوم ہوتا تھا کہ چیتا ہوا پر اُڑا چلا جا رہا ہے کہ دفعتًا ایک کھلے میدان میں پہنچ گئے۔ اب گھوڑے بھی طرارے بھرنے لگے لیکن ہرن تھک گیا تھا اور چوکڑی بھول چکا تھا سامنے جنگل تھا ایک جھاڑی کے قریب پہونچتے ہی چیتے نے اس کو دبوچ لیا۔ اس پر بادشاہ سلامت بہت محظوظ ہوئے کیونکہ حضرت سلامت عین موقع پر پہنچ گئے تھے۔

اس شکار کے وقت ہم لوگ موضع معرکھ کے شمالی جانب چند میل

کے فاصلے پر دریائے گومتی کی شاخ لُٹنا ندی کے درمیان خیمہ زن تھے۔ ایک بار ہم لوگ چیتے کے تعاقب میں ایک چھوٹے سے جزیرے پر پہنچے جس کے کنارے چمکدار اور شوربالو تھی نوسادر کی ایسی تیز۔ خوش قسمتی سے اس وقت ہوا اتنی تیز نہ تھی ورنہ ہم لوگ آنکھوں سے معذور ہو جاتے پھر بھی جتنی گرد اُڑی اس کا اثر اتنا ہوا کہ آنکھ ناک اور جسم میں چیونٹیاں سی لگ گئیں گھوڑوں پر بھی اثر تھا وہ زور زور سے کھانسنے لگے اس واقعے سے ہمارے شکار کے خاتمے کی بنیاد پڑ گئی کیونکہ اس کا اثر بادشاہ سلامت کی آنکھ ناک پر ایسا ہی ہوا غصہ کی حالت میں ان کی زبان سے کلمات ناملائم اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں نکل رہے تھے۔۔۔۔ شام کو جب ہم لوگ خاصے پر حاضر ہوتے اس وقت بادشاہ سلامت پر تکلیف کا اثر تھا۔ آنکھ ناک میں ریزہائے خاک کھٹک رہے تھے طبع معلیٰ مکدر تھی اور بات چیت اُکھڑی اُکھڑی تھی اس شب کو اعلیٰ حضرت ہم لوگوں سے مخاطب نہیں ہوتے۔ خاصہ تراش کا مسخرہ پن مصاحبوں کے لطائف وظرائف ناچ گانے کسی سے غنچۂ خاطر شگفتہ نہیں ہوا۔ ان کو غصہ اس پر تھا کہ پہلے سے ان کو بتایا کیوں نہیں گیا۔۔۔ وہ بے کیف خلاف معمول سویرے حرم سرا میں داخل ہو گئے۔۔۔ ہم لوگ جیسے ہی پلنگ پر لیٹے کہ دفعتاً بڑی گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار مینہ برسنے لگا اور ہم لوگ ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھے۔۔۔۔ آدھی رات آگئی تھی ہوا کی سنسناہٹ

دیوغراں کی طرح سُنائی دیتی تھی۔ خیمہ سر بسجود ہوا جاتا تھا۔ چوبیں کبھی جھکتی تھیں کبھی اُٹھ جاتی تھیں۔ ۔ جب ذرا گرج کڑک کم ہوتی تو گھوڑوں کا ہنہنانا اونٹوں کا بلبلانا ہاتھیوں کی چنگھاڑ آدمیوں کا شور غوغا سُنائی دیتا۔ ہم لوگوں نے کہا کہ شاید کچھ جانور چھوٹ گئے ہیں ایسا نہ ہو کہ ہاتھی خیموں کی رسیوں میں اُلجھ جائیں۔ آدھی رات گزر چکی تھی مگر جانوروں کی چیخم دھاڑ آدمیوں کا غل غپاڑہ اور بھی زیادہ ہو رہا تھا اس کی وجہ سے سونا مشکل ہو گیا اتنے میں شاہی چوبدار نے آکر کہا کہ باڈی گارڈ کے کپتان کو فوری طور پر حاضری کا حکم ہے یہ سنتے ہی ہم سب اُٹھ بیٹھے خیال ہوا کہ ایسا ہی کوئی اہم امر ہے جو اس طوفان کی حالت میں کپتان کی طلبی ہوئی ہے۔ عقل آرائیاں ہونے لگیں کہ نواب وزیر جن کے سپرد خیام شاہی کا اہتمام تھا۔ ان کی گرفتاری اور قتل کا حکم تو نہیں ہوا کپتان صاحب روانہ ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ چونکہ ابھی پانی جھاجھم برس رہا تھا اس لئے خیمہ سے باہر نکلنے کی جرأت نہ ہوئی اتنے میں کپتان صاحب واپس آئے اور کہنے لگے ہم جاتے ہیں جہاں پناہ نے لکھنؤ کوچ کا حکم بول دیا ہے ان کی کل فوج محلات شاہی ساتھ ہوگی بادشاہ بہت برہم ہیں ہمیں نواب وزیر کے ساتھ آنے کا حکم تھا صبح کا انتظار کرنے لگے اتنے میں گھوڑوں کی ہنہناہٹ پالکی کے کہاروں کی داہنے بائیں کی آواز ہاتھیوں کے بھاری بھاری کی چاپ سُنائی دینے لگی اور کچھ دیر کے بعد مدھم پڑنے لگی۔ یہاں تک کہ سناٹا

ہو گیا بادشاہ سلامت کا حکم نادری ہوتا تھا۔ ادھر منہ سے بات نکلی اور ادھر تعمیل ہوئی لہٰذا سواری چلی تو بس رکنے کا کیا ذکر۔

زنانہ پلٹن حرم شاہی کے نوادر میں جو چیز یورپ کو عجیب معلوم ہوگی وہ وہاں کی زنانہ فوج ہے۔ میں نے خود ان مردنما پایوں کو زنانی ڈیوڑھی پر طلایہ کرتے دیکھا ہے۔ مجھے عرصہ تک ان کے عورت ہونے کی خبر نہ تھی ان کو پست قد مرد سمجھتا تھا..... یہ اپنے لانبے بالوں کا جوڑا سر پر رکھ کے پگڑی سے چھپا لیتی تھیں باقی وردی وہی تھی جو مردوں کی ہوتی ہے۔ وہ مردوں کی طرح ہتھیار بند بھی ہوتی تھیں۔ ہاتھ میں سنگین چڑھی ہوئی بندوق، کمر میں پیٹی، شانے پر کارتوسوں کا پرتلا بقیہ وہی وضع جو احاطہ بنگال کی فوج کی ہوتی ہے چونکہ ان عورتوں سے حرم شاہی کے پہرے کا کام متعلق تھا میں نے خود اُن کی صفوں کو در دولت کے صحن میں پرا جمائے دیکھا ہے۔ ایک ہندوستانی افسر شاہی فوج کا آتا اور قواعد سکھاتا۔ عورتیں پوری طرح بندوق تاننے، آگے بڑھنے، پیچھے ہٹنے اِدھر اُدھر گھومنے بندوق بھرنے نشانہ باندھنے سنگین چڑھانے کا کام اسی ترتیب و قواعد کے ساتھ کرتی تھیں جیسے بارکوں میں ہوتے ہیں..... بادشاہ سلامت ان عورتوں کو دیکھ کر محظوظ ہوتے اور انعام دلا دیا کرتے تھے..... ان میں اکثر شادی شدہ تھیں زمانۂ حمل میں چند روز کیلئے علیحدہ ہو جاتی تھیں یہ احکام نہایت تہذیب کے ساتھ بہت ہی بند الفاظ میں ہوتے ان کے محعوذہنی معنے ایک اور پیرائے میں

ادا کیئے جاتے ان کی دو کمپنیاں تھیں میرے زمانۂ قیام میں بادشاہ نے ان کو اپنی سوتیلی ماں کے مقابلہ میں لڑنے کے لیئے بھیجا تھا انھیں ایک مکان سے دوسرے مکان میں تبدیل ہونے کا حکم دیا انھوں نے انکار کر دیا تو یہ زنانہ فوج بھیجی گئی انھوں نے بھی اپنے سپاہیوں کا مقابلہ کا حکم دیا۔ طرفین میں خوب جنگ ہوئی زنانہ فوج کو شکست ہوئی مگر بیگم صاحب کے پندرہ سولہ آدمی مارے گئے۔

کہاریاں لکھنؤ کے حرم شاہی میں کہاریوں کا گروہ بھی قابلِ ذکر ہے ان کے ذمہ یہ خدمت تھی کہ جب بادشاہ سلامت یا کوئی بیگم صاحبہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں جائیں تو ان کی پالکی اپنے کندھوں پر لے جائیں ان کی قواعد پیمانہ انداز میں ہوا کرتی تھی۔۔۔۔ بیگمات کی خدمت کے لیئے بہترین پیش خدمتیں بھی ہوا کرتی تھیں ان میں کچھ تو قدیمی خانہ زادیں ہوتی تھیں اور کچھ غریب والدین سے بوجہ حسن وصورت یا سلیقہ وخدمت گزاری خریدی جاتی تھیں ان کی حسن خدمت کا معیار اچھا گانا اچھی داستان کہنا اور اچھی طرح بات چیت کرتا تھا۔ لونڈیوں کی طرح کم از کم ڈیڑھ سو خواجہ سرا تھے ان سب کا افسر بادشاہ بیگم (جو دہلی کی شہزادی تھیں) کی ڈیوڑھی پر رہتا تھا اور ملک اودھ میں بڑے پایہ کا آدمی سمجھا جاتا تھا۔

بیگمات اور ان کا لباس پائجامہ ساٹن کمخواب یا کسی اور ریشمی کپڑے کا کمر کو یوں پھنسا لیکن نیچے پہنچ کے خوب پھیلا

ہوا۔ بڑے پائنچوں کے ڈھیر زمین پر پڑے ہوتے جو آگے سے اُٹھا
کے ناف کے پاس گھرس لئے جاتے۔ ان پر سنہری روپہلی پٹیاں
لگی ہوئی سامنے کی طرف زرتار ازار بند لٹکتا اُس کے پھُندنے
زانوں پر پڑے ہوتے جگہ جگہ جواہرات اور موتی ٹنکے ہوتے...
سینہ پر محرم یا سینہ بند اکثر کسی نازک کپڑے کی جس سے سینہ کا اُبھار
پوری طرح نظر آتا ... گردن سے نیچے تک اور کوڑیوں میں
بیل بنت سلمی ستارے کا نہایت نازک کام بنا ہوا محرم پر ایک کُرتی کمر
تک اکثر جالی کی ایسی کہ اس سے محرم کا جوبن زیورات کی آب و تاب
نیفہ اور پیٹی کا حسن چھپ نہ سکتا تھا ان پر کرتی کا زرق برق مسالا اور
بھی حسن دکھاتا تھا۔ اس پوشاک پر ایک ہلکا سا دوپٹا بھی اوڑھا جاتا
تھا جو سنہری روپہلی بادلے کا ہوتا تھا لیکن ان پر بھاری کامدانی
کڑھی ہوتی تھی اور پھر نہایت بھاری بھاری آنچل بھی ان پر لگائے
جاتے تھے یہ دوپٹا سر سے نیچے کی طرف پڑا ہوتا ہے اور دونوں
شانوں سے اس کے آنچل لئے جاتے ہیں اس کے اوڑھنے کی
وجہ ایسی پیاری ہوتی ہے کہ بدصورت عورت بھی اوڑھ لیتی
ہے تو پری معلوم ہونے لگتی ہے نہ کہ خود بھی پری جمال ہو تو اور
چار چاند لگ جاتے ہیں... اب ذرا اپنے تخیل میں ایک ایسی
عورت کا نقشا جس کا بوٹا سا قد کھلا ہوا رنگ ہاتھ کی ہتھیلیاں
انگلیوں کی پوروں سے ناخن تک مہندی سے گلنار نوکدار جوتا
پہنے آنکھیں ایک تو یونہی شرمیلی اس پر سرگیں اور بھی جادو بن

گئیں ابرو کے بال احتیاط سے برابر جمائے ہوئے کہ کہیں اونچ نیچا نہ معلوم ہو پورے قوس کی شکل کڑی کمان کی طرح تنی۔۔۔۔ چکنی چکنی بلند پیشانی کتابی چہرے پر کالے کالے بالوں کی لٹیں چنبیلی کے عطر میں مہکتی ہوئی کچھ تو سامنے پڑی ہیں۔ باقی موباف کے پیچوں میں آگئی ہیں اور چوٹی بن کے پشت پر لہرا رہی ہیں۔ کانوں میں مرصع بالیاں ناک میں بڑی سی نتھ جس میں دو چمکدار موتیوں کے بیچ میں یاقوت پڑا ہے خیال کرو اس شکل وصورت کی عورت اس سج دھج اور بناؤ سنگار کے ساتھ نہایت زیب ناز و کرشمہ و انداز سے اوپر کا جسم باریک دوپٹے سے نیم وا اور نیچے کا جسم ایک رزق برق رنگین جامہ پنہاں کئے ہوئے تمہارے سامنے کھڑی ہے اب تخیل کامل ہے تو یقیناً دربار اودھ کی ایک بیگم کا نقشہ تمہاری نظر میں پھر جائے گا۔

سواری کا اہتمام

اب ان کی سواری کا تزک و احتشام دیکھیے کہ وہ درگاہ کس شان سے جاتی تھیں ان کی سواری کے آگے باڈی کا رسالہ نیلی وردی میں جن پر روپہلا کام زردوزی سے بنا ہوا جھنڈیاں لہراتا بینڈ بجاتا اس کے پیچھے دو پلٹنیں پیدلوں کی، جھنڈی اور باجے کے ساتھ ان کے بعد علم بردار وں کی ایک کمپنی جن کی وردیاں سفید اور علم بھی چاندی کے ہوتے تھے جو پیدل پلٹن کی ارغوانی رنگ کی وردیوں کے مقابلے میں بہت ہی خوشنما معلوم ہوتی تھیں ان کے بعد کچھ لوگ سفید لباس پہنے

نقرئی جھنڈیاں ہاتھوں میں لیے ہوتے تھے۔ ان پر سلطنت اودھ کا شاہی مارکہ کڑھا ہوا ان کے بعد چاندی کی پالکی پر پوشش پڑی ہوئی تھی جس میں بادشاہ بیگم صاحبہ ہوتی تھیں بیس کہار اس کو اٹھائے ہوتے تھے اور ہر دو فرلانگ پر بدل جاتے تھے۔ کہار تنگ قد چست لباس پہنے ہوتے تھے اوپر ڈھیلی قبائیں گلنار جن پر کارچوبی کا کام ان کے سر کی پگڑیوں میں سنہری روپہلی مچھلیاں ٹنکی ہوتی تھیں اور ان مچھلیوں میں طلائی زنجیریں اور پھندے ہوتے تھے۔ جو شانے پر لٹکے تھے۔ کہاروں کے پیچھے مہریاں (کہاریاں) ہوتی تھیں جو کہاروں سے پالکی لے کے اندر جاتی تھیں۔ ان کے پیچھے ایک بھیڑ طلائی اور نقرئی عصابرداروں کی ہوتی تھی۔ یہ لوگ بیگم صاحبہ کے نام کا کڑکا بولتے چلتے تھے اور فقراء کو سواری کے قریب آنے سے روکتے تھے۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر روپیہ اور اشرفی لٹایا جاتا تھا عصابرداروں کے بعد خواجہ سراؤں کا افسر اعلیٰ (نواب ناظر) ہاتھی پر سوار ہمراہ ہوتا تھا۔ اس کی پوشاک نہایت مرق زرتار و جواہر نگار ہوتی تھی اس کے سر پر ایک نفیس جگمگاتا شملہ کاندھے پر اعلیٰ درجے کا کشمیری دوشالہ اس کے بعد بیگم صاحبہ کی خواصیں اور پیش خدمتیں کچھ پالکیوں کچھ چنڈولوں کچھ ہاتھیوں پر ان سب کے ساتھ سپاہی برق انداز علم بردار عصابردار بے حد شمار ہوتے ان بیگموں کی تعداد دو سو تک ہوتی تھی۔ . . . اس شان و شکوہ اور انبوہ کثیر اور بے حد شور و غل کے ساتھ بادشاہ بیگم کی سواری متبرک

مقام کو زیارت کیلئے نکلا کرتی تھی۔

کھیل تماشے : دربار اودھ میں کھیل تماشوں کے شوق میں سکھائے ہوئے پرندوں اور درندوں کی لڑائی کا چرچا بہت تھا ان میں تیتر، مرغ اور بیٹر کی لڑائیاں عموماً کھانے کے بعد اسی منبر پہ ہوتی تھیں۔ بارہ سنگھوں کی لڑائی شاہی باغ کے احاطہ میں ہوتی تھی بادشاہ سلامت برآمدہ میں بیٹھ کر دیکھتے تھے یہ بڑے بڑے سینگ والے جانور ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے تھے وہ حالت قابلِ دید ہوتی تھی ......

جب چیتے لڑائے جاتے تھے تو کئی دن تک بھوکے رکھے جاتے تھے بادشاہ کے یہاں ایک چیتا لگرا بڑا گراں ڈیل تھا اور کئی لڑائیاں جیتے ہوئے تھا میں نے اس سے بڑا چیتا کہیں نہیں دیکھا.... ایک بار خبر ملی کہ ایک بڑا زور آور اور تنومند چیتا ترائی میں پکڑا گیا ہے رائے ہوئی کہ لگرا سے لڑایا جائے .... اس کی لڑائی بہت ہنگامہ خیز ہوئی۔

لکھنؤ میں اونٹ بھی لڑائے جاتے ہیں۔ چونکہ قدرت نے اس کو صلح جو پیدا کیا ہے اس لئے اس کو لڑانے میں بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے اس کی تبدیلی فطرت کی لاحاصل سعی بڑی مضحکہ خیز ہوتی ہے۔ کوہ آتش فشاں کی طرح اونٹ اپنے حریف پہ جھاگ کی بوچھار کردیتا ہے اور پیٹ بھر کے جھاگ اڑاتا ہے۔ اور یہ چیز بڑی خطرناک ہوتی ہے جب ایک اونٹ اپنے حریف کا لمبا لمبا ہونٹ سفاکی سے دانتوں میں دبا کر کھینچتا ہے۔

گینڈا بھی خلقتہً "صلح پسند جانور ہے۔ مگر اونٹ کے مقابلے

میں لڑائی کے لیے موزوں ہے۔ اس کا فرادلی سینگ اس کی فولاد سے زیادہ مضبوط کھال بھاری بھرکم ڈیل اس کے قوی دست وبازو ایسی چیزیں ہیں جن کے بل پر وہ بڑے بڑے جانوروں کا مقابلہ کرتا ہے اور ان کے لیے ہیبت ناک ہوتا ہے.... میرے زمانہ میں شاہی فوش خانہ میں پندرہ بیس گینڈے تھے۔ ان کی لڑائیاں کھلے سبزہ زار میں ہوا کرتی تھیں جن کے گرد بڑے بڑے مضبوط ستون قائم کر کے پیان باندھے گئے تھے۔ بلاًمدے کی طرح اسی پر بھیڑ کے یہ لڑائی دیکھی جاتی تھی۔ ہاتھیوں کی طرح مخصوص موسم میں گینڈوں کو مقوی اور منشی چیزیں کھلا کر تیار کرتے اور آمنے سامنے ہنکا دیتے وہ اپنی گردن نیچی کر کے جھپٹ پڑتے اور سور کی طرح اپنی خاردار پیشانی بڑھا دیتے....

گینڈے اور ہاتھی کی لڑائی بھی بہت سخت ہوتی ہے طرفین سے سخت زور آزمائی ہوتی ہے ہاتھی اپنی سونڈ اٹھا کے گینڈا اپنی سینگ جھکا کے مقابلہ کو جھپٹتا ہے.... گینڈے اور تیندوے کی لڑائی بھی بڑی جاندار اور گرما گرم ہوتی ہے شیر سے بھی اس کی لڑائی بڑی سخت ہوتی ہے اور نہایت پامردی اور اطمینان سے لڑتا ہے.... شیر شیر سے اور ہاتھی ہاتھی سے بھی لڑائے جاتے ہیں ڈیڑھ سو ہاتھی صرف لڑائی کے لیے تھے۔ ان میں ایک ہاتھی بڑا زور آور اور کوہ پیکر تھا سو مرتبہ لڑائی میں فتح حاصل کر چکا تھا اس کا نام ملیر تھا۔

جس زمانہ میں کمانڈر انچیف دولت برطانیہ لکھنؤ میں تشریف فرما ہوئے اتفاق کی بات کہ اس زمانہ میں ملیر مست تھا اور ایک اور ہاتھی بڑا زبردست مست ہو گیا۔ دونوں کا جوڑ ا بدا گیا۔۔۔۔ ہاتھی کی گردن پر اس کا مہاوت بیٹھا ہوتا ہے سوا مہاوت کے اور کسی کو اس کے قریب جانے کی مجال نہیں ہوتی ایک مضبوط رسی ہاتھی کی گردن سے کردم تک باندھ دیتے ہیں۔ لڑائی کے وقت اسی کو تھامے ہوئے مہاوت اس کی گردن پر جما بیٹھا ہوتا ہے اور نہایت ہوشیاری سے اس پر گھومتا پھرتا ہے۔۔۔ دونوں ہاتھی چھوڑے گئے ملیر اپنے حریف کے مقابل میں زیادہ گراں ڈیل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اپنی اپنی دم اور سونڈ اُٹھا کے بے تحاشہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے۔۔ جھنکھاڑ اور گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ دونوں میں زور کی ٹکر ہوئی مستک سے مستک اس زور سے لڑی کہ دھماکے کی آواز آدھ میل تک سنائی دی۔ دونوں نے منہ سے منہ اور دانت سے دانت ملا کر زمین پر مضبوط قدم جما دیئے سونڈیں اوپر کو اٹھی تھیں دھکم دھکا ریل پیل شروع ہوئی پیٹھیں زور کرتے کرتے کبھی خم ہو جاتی تھیں کبھی تن جاتی تھیں جس سے ان کے زور لگانے کا اندازہ ہوتا تھا۔ دونوں کے مہارت ان کی گردنوں پر بیٹھے انکسوں کے ہولے زور زور سے لگاتے اور چلا چلا کے اپنے ہاتھی کو جوش دلاتے ہر شخص سناٹے کے عالم میں تھا۔۔۔۔ ملیر اپنے حریف پر قابو پانے لگا اس کے مہارت نے بے تکان شور مچانا شروع کر دیا اور

اس کے سر برا نکس سار نا شروع کیا۔ ۔ ۔ ۔ دونوں، ہاتھی گھاٹ سے چند گز کے فاصلے پر تھے دوسرا ہاتھی کھسکتا ہوا دریا کے کنارے پہنچ گیا اور پچھلے پاؤں سے جست کر کے دریا میں کود پڑا۔ ۔ ۔ ۔ اور پیرتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا غیر غصہ کی حالت میں چاروں طرف دیکھنے لگا کہ کس پر حملہ کرے مہاوت اس کو قابو میں لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہاتھی گھوما! مہاوت کا آسن اکھڑا اور وہ دھم سے زمین پر آ رہا ہاتھی نے ایک پاؤں اس کے سینے پر رکھ دیا ہڈیوں کے چٹا چٹ ٹوٹنے کی آواز ہمارے کانوں تک آئی اس نے سینے پر پاؤں رکھے ہی رکھے اپنی سونڈ سے اس کا ہاتھ شانے سے اکھاڑ کے پھینک دیا پھر دوسرا ہاتھ بھی اسی طرح خون میں لتھڑا ہوا ہوا میں نظر آیا ہیبت ناک سماں تھا۔ دیکھنے والے تھرا اٹھے کہ ہم نے دیکھا کہ ایک عورت بڑے زور سے چیختی ہوئی غیر کی طرف آ رہی ہے اس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ بھی ہے یہ دیکھ کر ہم لوگ اور زیادہ مضطرب ہو گئے کمانڈر انچیف بے تابی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے جہاں پناہ خون ہوا چاہتا ہے للہ خبر لیجئے ۔ ۔ ۔ ۔ بادشاہ سلامت نے کہا کیا کیا جائے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ عورت اسی مہاوت کی معلوم ہوتی ہے۔ سانٹے مار تیزی سے ہاتھی کی طرف چلے مگر وہ عورت دلیری سے اس کے پاس پہنچ گئی اور چلائی غیر بے درد غیر چلا غیر دیکھ تو سہی تو نے یہ کیا غضب ڈھایا ہے اب پورے گھر کا ناس کر دے مدت تک اس کا ایک ایک

جس زمانہ میں کمانڈر انچیف دولت برطانیہ لکھنؤ میں تشریف فرما ہوئے اتفاق کی بات کہ اس زمانہ میں ملیر مست تھا اور ایک اور ہاتھی بڑا زبردست مست ہو گیا۔ دونوں کا جوڑ بدا گیا۔۔۔۔ ہاتھی کی گردن پر اس کا مہاوت بیٹھا ہوتا ہے سوا مہاوت کے اور کسی کو اس کے قریب جانے کی مجال نہیں ہوتی ایک مضبوط رسی ہاتھی کی گردن سے لے کر دم تک باندھ دیتے ہیں۔ لڑائی کے وقت اسی کو تھامے ہوئے مہاوت اس کی گردن پر جما بیٹھا ہوتا ہے اور نہایت ہوشیاری سے اس پر گھومتا پھرتا ہے۔۔۔ دونوں ہاتھی چھوڑے گئے ملیر اپنے حریف کے مقابل میں زیادہ گراں ڈیل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اپنی اپنی دم اور سونڈ اُٹھا کے بے تحاشہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے۔۔۔ جھنکار اور گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ دونوں میں زور کی ٹکر ہوئی مستک سے مستک اس زور سے لڑی کہ دھماکے کی آواز آدھ میل تک سنائی دی۔ دونوں نے منہ سے منہ اور دانت سے دانت ملا کر زمین پر مضبوط قدم جما دیئے سونڈیں اوپر کو اٹھی تھیں دھکم دھکا ریل پیل شروع ہوئی پیٹھیں زور کرتے کرتے کبھی خم ہو جاتی تھیں کبھی تن جاتی تھیں جس سے ان کے زور لگانے کا اندازہ ہوتا تھا۔ دونوں کے مہاوت ان کی گردنوں پر بیٹھے انکسوں کے ہولے زور زور سے لگاتے اور چلا چلا کے اپنے ہاتھی کو جوش دلاتے ہر شخص سناٹے کے عالم میں تھا۔۔۔۔ ملیر اپنے حریف پر قابو پانے لگا اس کے مہارت نے بے تکان شور مچانا شروع کر دیا اور

اس کے سر پر انکس سارنا شروع کیا۔۔۔۔ دونوں، ہاتھی گھاٹ
سے چند گز کے فاصلے پر تھے دوسرا ہاتھی کھسکتا ہوا دریا کے کنارے
پہنچ گیا اور پچھلے پاؤں سے جست کر کے دریا میں کود پڑا۔۔۔
اور پیرتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا میر غصہ کی حالت میں چاروں
طرف دیکھنے لگا کہ کس پر حملہ کرے مہادت اس کو قابو میں لانے کی
کوشش کر رہا تھا کہ ہاتھی گھوما! مہادت کا آسن اکھڑا اور وہ
دہم سے زمین پر آ رہا ہاتھی نے ایک پاؤں اس کے سینے پر رکھ دیا
ہڈیوں کے چٹا چٹ ٹوٹنے کی آواز ہمارے کانوں تک آئی اس نے
سینے پر پاؤں رکھے ہی رکھے اپنی سونڈ سے اس کا ہاتھ تانے سے
اکھاڑ کے پھینک دیا پھر دوسرا ہاتھ بھی اسی طرح خون میں لتھڑا
ہوا ہوا میں نظر آیا ہیبت ناک سماں تھا۔ دیکھنے والے تھرا اُٹھے کہ
ہم نے دیکھا کہ ایک عورت بڑے زور سے چیختی ہوئی میر کی طرف
آ رہی ہے اس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ بھی ہے یہ دیکھ کر ہم
لوگ اور زیادہ مضطرب ہو گئے کمانڈر انچیف بے تابی سے اُٹھ
کھڑے ہوئے اور کہنے لگے جہاں پناہ خون ہوا چاہتا ہے للہ خبر لیجیے
۔۔۔۔ بادشاہ سلامت نے کہا کیا کیا جائے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ
عورت اسی مہادت کی معلوم ہوتی ہے۔ سانٹے مار تیزی سے ہاتھی
کی طرف چلے مگر وہ عورت دلیری سے اس کے پاس پہنچ گئی اور
چلائی میر بے درد میر چلا دمیر دیکھ تو یہی تو نے یہ کیا غضب ڈھایا
ہے اب پورے گھر کا ناس کر دے مدت تک اس کا ایک ایک

لفظ کان میں گو بجتا رہا ہم لوگوں کو یقین ہوگیا کہ مہادت کی لاش سے
ہٹ کے اب وہ اس بیوہ اور یتیم کا خون کرے گا لیکن اس کے
برعکس ملیر کا سارا غصہ فرو ہوگیا یہ سماں بھی عجیب دردناک تھا عورت
ہائے وائے کا غل مچاتی ہاتھی کے گرد پھر پھر کے اس کو صلواتیں سُنا
رہی تھی اور وہ سناٹے کے عالم میں غمگین نظروں سے اس کی طرف
دیکھ رہا تھا۔۔۔۔

محرم یکم محرم کو اکثر مسلمانانِ لکھنؤ ایسے مغموم نظر آتے ہیں گویا
دنیا کے تمام کاروبار اور عیش و راحت سے محروم کر دیے گئے ہیں
گلی کوچے سنسان پڑ جاتے ہیں ہر شخص اپنے گھر میں سوگوار ہو جاتا ہے
دوسری تاریخ کو گلیوں میں بھیڑ نظر آتی ہے اور لوگ ماتمی لباس پہنے
تعزیوں کے جلوس میں دکھائی دیتے ہیں جگہ جگہ تعزیے نظر آتے
ہیں اور ان کے ساتھ خلقت کا مجمع ہوتا ہے۔۔

بادشاہ سلامت کا تعزیہ غازی الدین حیدر کے زمانہ میں
انگلستان سے بن کے آیا تھا سبز بلور کا ڈھلا ہوا اس پر سنہرا مینا کیا
ہوا تھا۔۔۔ امام باڑوں کی بے انتہا روشنی میں کارچوبی کام کی
چیزوں کی اس قدر چمک دمک ہوتی ہے کہ نظر خیرہ ہو جاتی ہے
طلائی و نقرئی پنجوں کی جگمگاہٹ بھاری بھاری ٹیکوں کی سجاوٹ
زردوزی کے کام پر گنگا جمنی کرن کی جھالر در و دیوار کی آب و تاب
بس سارا امام باڑہ بقعۂ نور ہو جاتا ہے رات کو دن نظر آنے لگتا
ہے اس آرائش و زیبائش میں اونچی پگڑیاں باندھے لانبی داڑھیاں

پھٹکار سے ادب و سکوت سے لوگوں کا چلنا ان کی غمگین صورتوں سے
صد درجہ رنج و غم ظاہر ہونا ایسا سماں ہوتا ہے کہ بقول مسز حسن علی
دربار اودھ کو دیکھ کر وہ طلسمی الوانات میری آنکھوں میں پھر
گئے جو الف لیلیٰ کی داستانوں میں پڑھ کے ہمارے ذہنوں میں
منقش ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شب و روز میں دو مرتبہ مجلس ہوتی
شام کی مجلس میں مجمع بہت ہوتا بادشاہ سلامت ماتمی لباس پہنے
مور کے پروں کا تاج سر پر رکھے واقعہ خوان کے روبرو بیٹھتے ہیں
دو دو کی قطار باندھے گردنیں جھکائے نظریں نیچی کئے غمگین
صورت بنائے لوگ امام باڑے میں داخل ہوتے ہیں ۔ اور بادشاہ
کے پیچھے بیٹھ جاتے ہیں جھاڑوں اور موی شمعوں کی تیز روشنی میں
یہ سماں اور سکوت کا عالم قابلِ دید ہوتا ہے ۔ اس کو واقعہ خوان
اپنی دردناک آواز سے توڑتا ہے اور سامعین سراپا مغموم ہمہ تن
گوش سنتے ہیں اس وقت روشنی کی تابش بڑی بڑی بگڑیوں کی
شان امام باڑے کے سامان کی چمک دمک زرنگار علموں کی آب وتاب
اور سنہرے ٹیکوں کی تڑپ معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف آگ لگی ہے واقعہ
شہادت سنتے سنتے لوگ دھاڑیں مار کر رونے لگتے ہیں ۔ ۔ ۔
آخر میں سینہ کوبی کرتے ہیں پہلے آہستہ پھر زور سے سارا امام باڑہ
گونج جاتا ہے دس منٹ تک یہی حالت رہتی ہے ۔ پھر یکا یک
سکوت اور سناٹے کا عالم ہو جاتا ہے اور شربت کا دور چلتا
ہے بادشاہ سلامت اور ارکان خاندان شاہی حقہ نوش فرماتے

ہیں .... پھر دوبارہ واقعہ خوانی ہوتی پھر سارا مجمع کھڑے ہو کر سلام پڑھتا خود بادشاہ سلامت کو بے حد انہماک تھا وہ عشرے اور اربعین تک سوگ مناتے صرف مرد اعزہ واحباب کے مجمع میں رہا کرتے شراب اور دعوتیں ترک کر دیتے تھے۔ عیش و عشرت کے جن سامانوں کے بڑے دلدادہ تھے ان سب کو چھوڑ دیتے تھے

بیگمات شاہی کے امام باڑے محلات کے اندر علیحدہ علیحدہ تھے وہاں کی مجلسوں میں عورتیں حدیث خوانی کرتی تھیں ... شیعہ صرف مجلس ہی نہیں کرتے بلکہ اپنے نفس پر اور بھی جبر کرتے ہیں۔ تکلیفیں سہتے ہیں کھری چارپائی یا چٹائی پر سوتے ہیں۔ موٹا جھوٹا کھاتے ہیں عورتیں اپنے زیورات بڑھا دیتی ہیں بناؤ سنگار کی تمام چیزیں بالائے طاق رکھ دیتی ہیں۔

محرم کی پانچویں تاریخ بڑے جلوس کے ساتھ لکھنؤ کے علم درگاہ حضرت عباس میں چڑھائے جاتے ہیں ایوان شاہی سے درگاہ پورے پانچ میل کے فاصلہ پر ہے اس کی عمارت بہت شاندار ہے پانچویں محرم کو ہر حیثیت کے لوگ اپنے اپنے علم لے کے جوق در جوق درگاہ جاتے ہیں شاہی امام باڑے سے جو علم جاتا ہے اس میں سب سے آگے چھ ہاتھی ہوتے ہیں جن پر مغرق جھولیں پاکھریں پڑی نقرئی و طلائی ہودے عماریاں کسی کے گلے میں نقرئی و طلائی ہیکلیں لٹکتی ہوئی ہر ایک ہاتھی پر کچھ لوگ جواہر نگار علم ہاتھوں میں لئے سوار ہوتے تھے ان کے پیچھے سپاہیوں کا ایک گاردان کے پیچھے

ایک شخص بانس کی ایک چھڑ سیاہ کپڑے سے منڈھی ہوئی اور ایک اُلٹی کمان میں دو تلواریں لٹکی ہوئی اس کے پیچھے خود بادشاہ سلامت ان کے گرد و پیش خاندان شاہی کے افراد اور مقرب علماء ان کے پیچھے ایک عربی گھوڑا جسے دلدل کہتے ہیں بڑے قد و قامت کا اس کے سر دار پہلو سرخ رنگے ہوئے پشت پر نہایت زرتار مغرق جواہر نگار زین جو گھوڑے کے نقرئی رنگ پر بہت کھلتا تھا ساز و یراق سب ٹھوس سونے کا زین پر عربی عمامہ ایک کمان اور تیروں سے بھرا ہوا ترکش اس کے جلو میں نہایت زرق برق وردیاں پہنے خدام ہاتھوں میں چنور لیے مگس رانی کرتے تھے اس کے پیچھے خلقت کا انبوہ کثیر۔۔ صبح سے شام تک علم چڑھائے جاتے اس سال پچاس ہزار علم چڑھائے گئے۔۔۔

ساتویں تاریخ کو مہندی نکلتی ہے غریبوں کی مہندیاں امراء کے امام باڑوں میں جاتی تھیں نواب اور وزیر اعظم کی مہندی شاہی امام باڑہ میں چڑھائی جاتی ہے اس رات کو امام باڑوں میں غیر معمولی سجاوٹ اور روشنی ہوتی ہے اور خلائق بے روک ٹوک وہاں جاتی ہے بعض تو بڑے بڑے رنگا رنگ جھاڑوں کی بہار دیکھنے جاتی ہیں جس میں ہزار ہا شمعیں روشن ہوتی ہیں مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے گنا تھا تو ایک جھاڑ میں سو کنول چڑھے تھے بعض خوش رنگ اور باغ و بہار کنول مردنگ دیکھ کر دنگ ہو جاتے تھے بعض ضریح اور آرائش کھڑے دیکھا کرتے تھے

جن کے سامنے ایک بڑے شیر کی تصویر ایک جانب دو مچھلیاں جن کے سر باہم ملے اور ایک دوسرے کی جانب جھکے ہوتی ہیں۔ ایک طرف طلائی و نقرئی علموں کے زرنگار و جواہر نگار پنجے اور پٹکے لہلہا رہے ہیں انہیں کے پاس خانہ کعبہ۔ امام حسین کے خیمے اور قبہ مبارک واقعہ کربلا کے نقرئی نقشے ایک چاندی کی میز پر رکھے ہوتے ہیں جن کو دیکھ کے دل پگھلنے لگتے ہیں ایک طرف دیواروں میں طرح طرح کے نفیس و نادر اور عجب ساخت کے ہتھیار لٹکتے ہوتے ہیں جن کے دیکھنے سے دلوں میں جوش دغا پیدا ہوتا ہے۔

جس وقت باہر سے توپوں کے سر ہونے کی آواز سنائی دیتی اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اب مہندی قریب پہنچ گئی شاہی نقیب و چوبدار راستہ کی صفائی کے لئے آجاتے ہیں اور امام باڑے سے لوگوں کو باہر کر دیتے ہیں اب سناٹا ہو جاتا ہے۔ باہر کا مرلع صحن جس میں ہر طرف روشنی ہوتی ہے چشم منتظر بنا ہوا ہے لیجئے مہندی کا جلوس آنے لگا ہاتھی اونٹ گھوڑے پھاٹک کے باہر رہ گئے سپاہی جلوس بردار اور باجے والے صحن تک آئے ان کی تعداد اتنی ہے کہ تل دھرنے کی جگہ نہ رہی یہ لوگ داہنے بائیں پرا جما کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور بیچ میں راستہ چھوڑ دیتے ہیں جس پر پہلے تو مہندی کا اصلی سامان آنا شروع ہوتا ہے نقرئی کشتیوں میں ہر طرح کی مٹھائی خشک میوے پھولوں کے ہار گجرے چھپر کھٹ گلدستے زرق برق

پوشاکیں پہنے ہوئے ملازمین ہاتھوں اور سروں پر لئے ہوئے ہیں اس وقت نہایت نفیس آتش بازی چھوٹتی ہے اس کے بعد نقرئی پالکی اس کے آگے بہت بھڑک دار وردی پہنے ہوئے مشعلچی مشعل لیئے ہوئے پھر مشعلوں کی روشنی میں باجے والوں کی چوکیاں یہ لوگ باجے بجاتے تمام سامان لیئے امام باڑہ میں گشت لگاتے ہیں پھر سارا سامان تعزیہ پر چڑھا دیا جاتا ہے اور فوراً عزاداروں کا ایک گروہ سر جھکائے ماتمی لباس غمگین صورت امام باڑے میں آتا ہے اس کے بعد حضرت قاسمؑ کا تابوت چند خادم لاتے ہیں جس کے پیچھے عزاداروں کا مجمع ہوتا ہے ان کے بعد گھوڑا ہوتا ہے جس پر زرتار پگڑی کمان خنجر تیروں سے بھرا ہوا ترکش اس پر شاہی نشان یعنی چتر و آفتابہ سایہ کناں یہ گھوڑا اس متانت سے امام باڑے میں گشت کرتا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ دیکھتا ہی رہے اس کے بعد مجلس ہوتی ہے۔

اب باہر کا حال سنئے وہاں ایک مخلوق جمع ہے روپیہ پیسہ لوٹنے کے انتظار میں کچھ دیر میں روپیہ اور چاندی کے چھوٹے سکے لٹتے جانے لگے اس سیر چشمی سے جسے دیکھ کر یورپین حضرات دنگ رہ جاتے ہیں اس تمام سامان پر لاکھوں روپیہ صرف ہوتا ہے اگر یہ رکھ لیا جائے اور ہر سال کام میں لایا جائے تو اخراجات میں بہت تخفیف ہو سکتی ہے لیکن یہ کوئی نہیں کرتا عزاداری کے خاتمہ پر سارا مال غریبوں کو تقسیم کر دیا جاتا ہے۔۔۔

تعزیئے دفن کرنے کے واسطے بڑی بڑی عالیشان کربلائیں
بنائی گئی ہیں۔ تڑکے تڑکے بے شمار مخلوق وہاں پہنچ جاتی ہے
جلوس میں جھنڈیاں بیرقیں پھر ہرے پرچم ہوا میں اُڑتے ہوئے
بینڈ باجے بجتے ہوئے رزمیہ گیتیں بجاتے ہوئے ان کے پیچھے سپاہی
اُپکی بنے ہوئے بندوق اور پستول داغتے ڈھالیں رکھے تلواریں
ہلاتے نکلتے ہیں امراء کے تعزیوں کے پیچھے غرباء کے تعزیئے ہوتے
ہیں آخر میں ہاتھیوں کی قطاریں ہوتی ہیں جن پر مستعد اور معتمد ملازمین
راستہ بھر روپیہ پیسہ اور روٹیاں غرباء کو تقسیم کرتے چلے جاتے
ہیں کیونکہ شہر کے مختلف راستوں سے برابر تعزیئے نکلتے ہیں اس وجہ
سے تمام گلی کوچے توپ بندوق پستول کی آواز اور حسن وحسین کی
صدا سے گونج جاتے ہیں کربلا پہنچ کے تعزیئے دفن کر دیئے جاتے ہیں۔
محرم کے زمانہ میں ہم لوگوں کو حضوری شاہ کی عزت کبھی حاصل نہیں
ہوئی تمام ملکی اور مالی کام ملتوی ہو جاتے ہیں:

حکیم نجم الغنی تاریخ اودھ میں لکھتے ہیں:

بادشاہ نے فرح بخش میں زنانے محل کے قریب ایک عالیشان مکان
تعمیر کرایا تھا جس میں بارہ دروازے تھے اور بارگاہ دروازہ
امام نام تھا زربفت کے شامیانے موتیوں کی جھالر چاندی کے طلائی
ستون پر کلابتوں کی ڈوریوں سے استادہ تھے جھاڑ میں چالیس کنول
روشن ہوتے تھے۔ نفیس فرش تھے اور قد آدم آئینے لگے تھے سونے
چاندی کی مرصع کرسیاں رکھی تھیں ہر امام کی ولادت پر اس میں جلسہ ہوتا تھا

اور شہادت پر مجلس ہوتی تھی۔

محرم میں ایک بارہ دری صرف پھولوں کی تیار ہوتی تھی۔ باغات سلطانی میں جتنے پھول ہوتے تھے ان کے علاوہ پانچ ہزار روپیہ نقد کے پھول بازار سے آتے تھے بارہ دری کا طول ننو قدم اور عرض بیس قدم ہوتا تھا پنج میں طلائی اور نقرئی منقیش اور ستاروں اور بادلے کی جھالریں پھولوں کی جگہ کام میں لائی جاتی تھیں عطریات سے مکان لسا یا جاتا تھا۔ چہلم تک تعزیہ داری میں سارا کام خود کرتے تھے باہر کا آدمی جانے نہیں پاتا تھا شربت مٹھائی اور میوے پر چار پانچ لاکھ روپیہ صرف ہوتا تھا۔ محرم میں سو پچاس تعزیئے اپنے سر پر رکھ کے لے جاتے تھے۔ ہر مرتبہ کے آنے جانے میں کئی کوس زمین طے ہوتی تھی پاؤں میں کنکریاں چبھ جاتی تھیں بادشاہ بیگم اور ملکہ زمانی وغیرہ طلائی زنجیریں گردن اور کمر میں پہناتیں۔ جن کا وزن کئی سیر ہوتا چہلم کے بعد یہ غرباء پر تقسیم ہو جاتیں۔ تمام راتیں بیداری میں کاٹتے تھے شام سے صبح تک ہر محل میں خود مرثیہ پڑھتے سال کے چھ مہینے انہیں کاموں میں مشغول رہتے دنیا کا کوئی کام نہیں کرتے تھے۔

بادشاہ صرف لہو ولعب اور مذہب کے دلدادہ نہ تھے بلکہ علوم وفنون اور صاحبانِ کمال کے قدر دان بھی تھے۔ ان کے عہد میں بہت سے مفید کام بھی ہوئے اور علوم وفنون تہذیب وتمدن کو ترقی ہوئی

رفاہ عام گومتی پر لوہے کا پل بنوایا انگریزی اور یونانی شفاخانہ

قائم کیا محتاجوں اور اپاہجوں کے لئے بلعور خانہ بنوایا چھتر منزل کے پاس ایک امام باڑہ

اور گومتی پار کربلا تعمیر کرائی۔ پردہ فروشی کو ممنوع قرار دیا۔

۱۸۲۳ء میں چار روپیہ سیکڑہ سود پر تین لاکھ روپیہ کمپنی کو دیا اور معاہدہ ہوا

کہ رقم سود ہر ماہ مساکین شہر پر تقسیم ہوا کرے گی اس کا نام سخاوت نصیرالدین حیدر

ہوگا اور آئندہ کسی حکمران کو روپیہ واپس لینے یا اس کا کوئی اور مصرف تجویز کرنے کا

حق نہ ہوگا یہ سخاوت آج تک جاری ہے۔ اور غربا کو ماہ بماہ وظیفہ ملتا ہے پہلے تین روپیہ ماہوار

ملتا تھا اب سود بڑھ جانے سے زیادہ ہوگیا ہے

غازی الدین حیدر نے ڈھائی کروڑ کمپنی کو قرض دیا تھا اس کے متعلق معاہدہ

ہوا کہ اس کا سود دس ہزار کئی سو روپیہ طلباء اور ہندی زائرین مقیم کربلائے معلیٰ پر

تقسیم ہوا کرے گا۔ اس کا نام خیریہ اودھ قرار پایا یہ خیر ابھی تک جاری ہے۔

علمی کام رسد خان سلطانی کپتان ہربرٹ کی نگرانی میں قائم کیا لاکھوں روپیہ

عمارت و سامان پر صرف ہو کر اعلیٰ درجہ کی رسد گاہ قائم ہوئی۔ اور مولانا رستم علی

سنبھلی نے زیج سلیمان جاہی لکھی لیکن اس کی تکمیل سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا مولانا

امام الدین دہلوی نے مکمل کیا مولانا عبدالحیی منصف گل رعنا نے نزہۃ الخواطر میں

لکھا ہے کہ یہ زیج میں نے لکھنؤ میں شاہزادہ ہمایوں قدر تیموری کے پاس دیکھی تھی۔

خطاطی و طباعت مسٹر آرچر کو پانچ سو روپے ماہوار پر ملازم رکھا

اور ان کی نگرانی میں لیتھو کا چھاپہ خانہ مطبع سلطانی قائم کیا، جس سے بے شمار کتابیں

شائع ہوئیں اور لکھنؤ نے کتابت و طباعت میں بڑی شہرت حاصل کی ہندوستان میں

کہیں ایسی عمدہ کتابیں نہیں چھپتی تھیں مرزا غالب نے ایک خط میں لکھنؤ کی کتابت

و طباعت کا جن الفاظ میں ذکر ہے اس سے وہاں کے معیار کتابت و طباعت کا

اندازہ ہو سکتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے جس کا دیوان چھپا اس کو آسمان پر چڑھا دیا حسن خط سے الفاظ کو چمکا دیا لی پر اور اس کے چھاپے پر اور اس کے بانی پر لعنت"

لالہ شنکر سہائے ہفت قلم نے خطاطی میں شہرت حاصل کی۔ ایک خطاط نے ۲۴+۱۲ انچ کی تختی پر پورا قرآن ایسا خوشخط لکھا کہ جس کے صلہ میں تیس ہزار روپے انعام پایا۔ یہ قرآن وکٹوریہ میموریل کلکتہ میں موجود ہے۔

ڈرامے کی ایجاد ڈرامے کی بنیاد اسی عہد میں پڑی جس کی ترقی یافتہ شکل سینما ہمارے سامنے ہے قصہ کو آنکھوں سے دیکھنے کی خواہش کوئی نئی بات نہیں ہے بچے کھیل میں اچھا خاصہ ڈرامہ کرتے ہیں نقالی اسی کی ابتدائی شکل ہے اور داستان گوئی کا فن اسی خواہش کا نتیجہ ہے جس میں صورت شکل لباس زیور اور مقامات کی تصویر کشی کی جاتی تھی قصوں میں بادشاہوں اور پریوں کے افسانے ہوتے تھے جن میں پرستان کا ذکر بھی ہوتا تھا۔ ان سب کو آنکھوں سے دکھانا ممکن نہ تھا مگر جب انھوں نے پریاں اور پرستان بنا دیا تو یہ مشکل آسان ہوگئی اس طرف توجہ یوں ہوئی کہ کسی نے راگ مالا ایک کتاب نذر دی جس سے رقص و سرور کی محفلیں منعقد ہوئیں جس کے متعلق پروفیسر مسعود حسن صاحب کی تحقیق یہ ہے۔

نصیر الدین حیدر کے عہد میں ڈرامے کے باقاعدہ کھیل کا حال تو نہیں کھلتا مگر ایسے جلسوں کا پتہ لگتا ہے جن میں ڈرامائی شان ایک حد تک موجود بھی ضرور رکھتے ہیں۔

"کسی نے راگ مالے کی کتاب نذر دی فرمایا اس کا جلسہ ہو جو راگنی جس صورت و پوشاک کی دیکھی وہی صحبت ٹھہری ایک پیڑیں

کے جلسے میں پانچ سو عورت دلہن کا لباس پہنے ہاتھوں پاؤں میں مہندی لگی، چوڑی شہانی، سر سے پاؤں تک جواہر کا زیور۔ ایک راگنی کی صحبت تیس دن ہوتی تھی۔ اندر کی سبھا کی آبرو کھوتی تھی:

راگ مالا سرور کی اس عبارت کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے کچھ باتیں ذہن میں موجود ہونا چاہئیں راگ مالا ایسی کتاب کو کہتے ہیں جس میں راگوں راگنیوں کی تصویریں بنی ہوتی ہیں ایسی کتابیں موسیقی کے شوقینوں نے مرتب کر کے مختلف مصوروں سے تیار کروائی تھیں۔ راگ مالا کا وہ نسخہ جو نصیر الدین حیدر کے نفیس مزاج بادشاہ کو نذر کر دیا گیا تھا۔ بلاشبہ بہترین تصویروں پر مشتمل ہوگا۔ میں نے فن موسیقی کی ضخیم کتاب نادِ نود گمنتھ کے ایک مطبوعہ نسخے میں راگوں اور راگنیوں کی ادنیٰ درجہ کی تصویریں اور ان تصویروں کا بیان دیکھا ہے۔ اس کتاب سے چند تصویروں کا بیان اپنے لفظوں میں بیان کرتا ہوں۔

راگ اور راگنیاں انسانی روپ میں — راگ مرد

مارو راگ : سولہ برس کی عمر میں ایک ہاتھ میں نیزہ دوسرے میں تلوار جس سے دشمن پر وار کر رہا ہے۔

نائکی کانہرا : کم عمر، زرد لباس، تال ٹھونکتا ہوا۔ عورتوں نے گھیر کر پکڑ لیا ہے اور وہ دھوکا دے کر نکل جانا چاہتا ہے۔

جیت راگ : بڑا بہادر تیر کمان ہاتھ میں گھوڑے پر سوار، دشمن پر فتح پا کر گا کر اور روپیہ لٹاتا ہوا۔

بھٹیار راگ : سانولا رنگ، بازوؤں پر بازوبند بندھے ہوئے ایک بہت بڑے پہلوان کو خم ٹھونکتا ہوا اکھاڑے میں پھر رہا ہے۔

راگنیاں (عورتیں)

اسیری ٹوڈی راگنی نہایت حسین نشیلی آنکھیں، گلابی پوشاک، سر پہ دودھ گھڑے رکھے ہوئے ٹھوکر سے دامن اٹھاتی ہوئی، دودھ دہی بیچنے کے بہانے سے اپنے سوامی کو ڈھونڈنے نکلی ہے۔

للتا گوری راگنی : شام کے وقت سنگار کر کے اپنے باغ میں ٹہل رہی ہے طوطے کا پنجرہ ہاتھ میں ہے ایک سہیلی ساتھ میں ہے اس کے بچے کو گود میں لئے اس سے ہنستی ہے اور پیار کرتی ہے۔

جھنجھوٹی راگنی نشے میں جھوم رہی ہے۔ اپنے شوہر کو دوسری عورتوں سے باتیں کرتے دیکھ کر خفا ہو گئی ہے مگر وہ ضدی عورت ہے سب کو اپنے پاس سے ہٹا دیتی ہے۔

کانی راگنی لال رنگ میں بھیگی ہوئی اپنے شوہر کے ساتھ ہولی کھیل رہی ہے رنگ کے مقمقے شوہر کو مارتی ہے، عبیر اور گلال اڑاتی، پھولوں کے گیند مار کر چھپ جاتی ہے اپنی سہیلیوں کو بلا کر اپنی اور اپنے شوہر کی چھب دکھاتی ہے۔

راگوں اور راگنیوں کی تصویروں کا یہ بیان اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ نصیر الدین حیدر کے حکم سے راگ مالا کا جلسہ جو تیار ہوا تھا اور راگنیوں کے جلسے ہوتے تھے ان میں ایک ڈرامائی کیفیت پائی جاتی تھی۔ (اودھ کا شاہی سٹیج ص۴۰)

حسن علی موسیقار اور پیر بخش دھاڑی نے گانے میں کمال پیدا کیا چھجو خان اور غلام رسول کلاونت نے ٹپہ ایجاد کیا۔ رجب علی نے ستار بجا کر لوگوں کو محو حیرت کر دیا۔

منور جان جادی جان اور نفوا جان حسن و جمال میں بے مثال ہونے کے

ساتھ ساتھ گانے کے فن میں بھی بے نظیر تھیں۔

نقالی اللہ والے بھانڈ نے نقالی میں شہرت حاصل کی۔

داستان گوئی غلام مہدی اور احمد حسین قمر مصنف طلسم ہوشربا نے داستانگوئی کو ایک فن بنادیا۔ اور اس پر کتابیں لکھیں۔

مصوری مسٹر ہابیرٹ جرمنی نے فن مصوری کو بڑی ترقی دی۔

سپہ گری محمد علی خان ساکن گڑھ بزن بیگ نے لکڑی کے فن میں جدتیں پیدا کیں ذوالفقار بیگ بنوٹ میں کامل تھے رستم نگر محمود نگر، منصور نگر وغیرہ فن سپہ گری کے مراکز تھے جہاں بہت سے اڈے قائم تھے۔

پیراکی پیراکی کا فن اس عہد کا خاص امتیاز ہے۔ میر مچھلی نے اس فن میں کمال حاصل کیا اور لکھنؤ میں یہ بھی ایک فن بن گیا نصیرالدین حیدر خود اعلیٰ درجہ کے پیراک اور میر کے شاگرد تھے۔

جل بانک فن سپہ گری کے عام رواج نے جل بانک کا فن ایجاد کیا یعنی پانی کے اندر لکڑی سے جنگ جو اہل لکھنو کے ذوق جنگجوئی کی انتہا کا ثبوت ہے اس فن کے موجد میر مچھلی تھے۔ یہ لکھنؤ کا خاص فن ہے۔

شاعری شعر و شاعری کا ذوق عام تھا نصیرالدین حیدر خود بھی شاعر اور شعرا کے قدردان تھے یہ مصرع جو ضرب المثل کے طور پر زبان زد ہے انہیں کا ہے۔

ع جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے ـ ناسخ و آتش کی معرکہ آرائیاں تھیں مشاعروں کی دھوم تھی در و دیوار سے شعر برس رہے تھے۔

مرثیہ میر ضمیر نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کو ایک فن بنادیا چہرہ سراپا منظر شدت رزم و بزم کے مضامین سے اس میں وسعت پیدا کی اور اردو شاعری نے زلفوں کی کمند نظر کے تیر مژگان کے نیزے ابرو کی کمان تبسم کی بجلیاں اللہ

معشوق کی گلیوں سے نکل کر میدان جنگ میں فوجوں کی یلغار دیکھی سپاہیوں کی للکار۔ تلواروں کی جھنکار سنی تیروں کو لپکتے دیکھا اور کمانوں کو کڑکتے تیروں کو سنسناتے دیکھا۔

جسم زخموں سے چور سرکٹی لاشیں میدان سے آتے دیکھیں وارثوں کے بین سُنے پسماندوں کو اسیر اور تشہیر ہوتے دیکھے یہ وہ مناظر تھے جنہیں لکھنؤ کی سپاہیانہ زندگی نے پہلے پہل پیش کیا۔ سوز خوانی اس کے تنوع کا تحمل نہیں کر سکتی تھی اس لئے تحت لفظ کا طریقہ ایجاد کیا اور ہر بات کو اسی ٹھاٹ سے منبر پر ادا کیا۔

سوز خوانی یار خاں۔ میر حسن علی اور میر بندہ حسن نے سوز خوانی کو عروج کر دیا۔

حدیث خوانی میر اکبر علی نے حدیث خوانی میں کمال حاصل کیا اور ایک کتاب ضیاء الاخبار لکھی

کھانے میں جدتیں پیر علی رکابدار نے سموسے میں جدتیں دکھائیں کوئی زندہ جانور اس میں بند کر دیتا، لال اور جیرکوے وغیرہ

اس رکابدار نے شکر کا ایسا انار بنایا جس میں دانہ اور پردہ تک تھا۔

مٹھائیاں حسینی نے حلوہ سوہن۔ دودھیا۔ حبشی حلوہ پپڑی حلوہ سوہن بنانے میں کمال دکھایا۔ نورا نے بالائی بلور کی طرح شفاف بنائی۔

تمباکو پٹھانا نے پینے کا تمباکو ایسا ایجاد کیا کہ آج تک لکھنؤ کا تمباکو اپنی لطافت میں بے مثال ہے

رنگریز رنگریزوں نے کپڑوں پر رنگ کے پھول بنانے میں کمال دکھایا

نئے قسم جوتا اور کپڑا پیر علی نے خود دنو کا جوتا بنایا۔ مکا درزی نے

انگیا کرتی سینے میں کمال دکھایا اور لاکھوں روپے کا انعام حاصل کرکے لکھ پتی بن گیا۔

بڑے پائچوں کا پائجامہ اور چوگوشیہ ٹوپی ایجاد ہوئی اور خود نصیرالدین حیدر نے پنج گوشیہ ٹوپی ایجاد کی جوان کی زندگی تک کوئی اور نہیں پہن سکتا تھا لکھنؤ اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ شباب پر آیا تہذیب و تمدن میں اپنا مخصوص انداز پیدا کیا مولوی عبدالحئی گل رعنا میں لکھتے ہیں۔

لباس: وضع قطع لباس خورد و نوش اور ماند و بود غرض کہ زندگی کے ہر شعبے میں تراش و خراش نے نئے انداز پیدا کئے گنبد نما دستار کی جگہ ہلکی نوکیلی ٹوپی جامہ و نیمہ شلوار کی جگہ کلی دار عزارہ یا چوڑی دار یا جامہ سلیم شاہی کی انی دار کفش یا بے نوک کا لکھنؤ جوتا اسی طرح ہر چیز پر قیاس کرو زمین نئی آسمان نیا ہوگا صفحہ ۴۳۹

شہر کی رونق: شہر کو بھی انہوں نے ایسا آراستہ کیا کہ باہر کے آنے والے اسے طلسمات کا شہر کہتے تھے نجات حسین خاں عظیم آبادی لکھتے ہیں:

سجان اللہ چہ شہریست دلپذیر وچہ مقامے است بے مثل و بےنظیر جائے است دلفریب و مکانے است مطبوع منظرہ از نقص و عیب بلند است پس دلچسپ و خوش سواد و دوکانہا بس مملو و آباد و مجموعہ است از اقسام و انواع چیز ہا (روزنامچہ نجات حسین خان سوانح لکھنؤ بزمانہ نصیر الدین حیدر)

سید فضل علی دہلوی نے جو اسی زمانے میں لکھنؤ آئے تھے اپنی کتاب فوائد عجیبہ میں لکھنؤ کی تعریف نظم و نثر میں بہت کچھ کی ہے۔ اس کے آخری فقرے یہ ہیں۔

اگر فردوس بر روئے زمیں است ٭ ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

ہر ایک کوچہ فرحت افزا اور ہر ایک راہ دلکشا شہر ہے یا طلسمات ہے۔

نصیرالدین حیدر نے لکھنؤ کو اس عروج پر پہنچا کر ۱۲۵۳ھ میں زہر سے انتقال کیا۔

فریدون بخت رفیع الدین حیدر مناجان

غازی الدین حیدر کی بیاہتا بیوی بادشاہ بیگم سے ایک لڑکی پیدا ہوئی اس کے بعد کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ غازی الدین حیدر کا تعلق ایک خواص صبح دولت سے ہوگیا جب اس کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو بادشاہ بیگم نے پوچھا کہ یہ لڑکا کس کا ہے۔ اس نے کہا غازی الدین حیدر کا۔ بادشاہ بیگم نے اس کو مار ڈالا مگر اس کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنالیا۔ نصیر الدین حیدر نام رکھا اور بہت ناز و نعم سے پالا جب وہ جوان ہوا تو اس کا تعلق ایک خواص سکھ چین سے ہوگیا کئی برس بعد اس کو وہ ریاحی مرض پیدا ہوا جس میں عورت حاملہ معلوم ہوتی ہے عورتیں اس مرض کو ہوسک کہتی ہیں۔ سات مہینے کے بعد وہ مرض جاتا رہا اور وہ اپنی اصلی حالت پر آگئی بادشاہ بیگم کو اس کا بہت افسوس ہوا اور خیال کیا کہ دوران حمل کی تمام رسمیں بہت دھوم سے منائی تھیں اور حمل کی شہرت ہوگئی تھی اب سب سے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ انھوں نے یہ بات چھپا ڈالی اور ایک حاملہ عورت کی تلاش کی کہ اس کا بچہ سکھ چین کے سر منڈھ دیں۔ مینا کٹنی ایک حاملہ دھوبن کو لائی اور ڈیڑھ سو روپے پر ان کے ہاتھ میں بیچ ڈالا۔ معتمد ولہ کو ان سے پرخاش تھی حاملہ دھوبن کے غائب ہونے اور حمل میں بکنے کا حال انھیں معلوم ہوگیا۔ انھوں نے غازی الدین حیدر کہہ دیا انھوں نے ایک حکیم اور ایک ڈاکٹر کو سکھ چین کے معائنہ کے لئے بھیجا۔ بادشاہ بیگم نے معائنہ نہیں کرنے دیا۔ غازی الدین حیدر نے کہلوایا کہ بچہ ہماری بہنوں، پھپھیوں اور خاندان بیگمات کی موجودگی میں ہونا چاہیئے جو اس خاندان کا دستور ہے۔ بادشاہ بیگم نے یہ بھی نہیں کہا جب بچہ پیدا ہوا تو انھوں نے بادشاہ سے کہلوایا کہ پوتا مبارک ہو انھوں نے کہا کہ وہ ہمارا پوتا نہیں ہے۔ معتمد ولہ نے

اس کو ہوا دی بات رزیڈنٹ تک پہنچ گئی انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ حضور نے ہم کو پوتے کی ولادت کی اطلاع نہیں دی ہم لوازم تہنیت بجالاتے انھوں نے کہا کہ وہ ہمارا پوتہ نہیں ہے ایک حاملہ دھوبن پچیس دن سے شہر سے غائب ہے اور حمل سے ہے یہ بچہ اس کا ہے۔ بادشاہ بیگم نے فریب کیا ہے جان منگٹن صاحب رزیڈنٹ نے یہ حال گورنر جنرل کو لکھا وہاں سے حکم آیا کہ اس کی تحقیق کی جائے کہ آئندہ جانشینی میں جھگڑا نہ پیدا ہو۔ رزیڈنٹ نے بادشاہ کو لکھا کہ حضور بچہ کے نسب کی تحقیق کر کے مطلع فرمائیں انھوں نے مہتاب دائی کو بلا کے پوچھا اُس نے کہا میں خداوند سلطان کے سامنے جھوٹ نہ بولوں گی مجھے بچہ نال کاٹنے کے لئے دیا گیا تھا سکھ چین پر زچگی کے آثار نہ تھے۔

رزیڈنٹ سے بادشاہ نے کہا تھا کہ ایک حاملہ دھوبن پچیس دن سے شہر سے غائب ہے یہ بچہ اس کا ہے۔ انھوں نے اپنے منشی کو حکم دیا کہ اس دھوبی کا پتہ لگایا جائے جس کی بیوی غائب ہے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اسکا نام پیرا ہے اس کو بلوا کے پوچھا تو اس نے کہا کہ میری بیوی کا نام منا ہے سترہ برس کا سن ہے آٹھ مہینے کا حمل تھا۔ سات ذی قعدہ ۱۲۳۵ھ کو پرورش علی کے یہاں کپڑے دینے گئی تھی جب شام تک وہ گھر نہیں آئی تو میں پرورش علی کے یہاں گیا انھوں نے کہا کہ وہ اسی وقت میرے گھر سے چلی گئی۔ میں نے تلاش کی تو پتہ چلا کہ پرورش علی کی شرکت سے مینا کٹنی نے اس کو فروخت کر دیا۔ میں اس کے گھر گیا اس کے بیٹے نے کہا کہ وہ دو دن سے گھر نہیں آئی ہے تیسرے دن میں نے اس کو پایا اور کوتوال کے پاس لیجا کے تمام حال بیان کیا انھوں نے اس کو قید کر دیا۔ چوتھے دن اس نے میری بیوی کو حاضر کرنے کا وعدہ کیا کوتوال نے اس کو ضمانت پر چھوڑ دیا مگر اس نے حاضر

نہیں کیا۔ میری ساس نے معتمد الدولہ کے یہاں نالش کی انھوں نے کوتوال کو تلاش کرنے کا حکم دیا۔ دوسرے دن میں کوتوال کے پاس گیا تو انھوں نے کہا کہ وہ رنگ محل میں ہے اور وہاں کوتوالی کا حکم نہیں چلتا میں ناامید ہو کے بیٹھ رہا رزیڈنٹ نے یہ سارا حال گورنر جنرل کو لکھا۔ ۱۲۴۳ھ کو غازی الدین حیدر نے انتقال کیا اور نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے ۱۲۴۷ھ کو کرنل جان لو صاحب رزیڈنٹ ہو کے آئے انھوں نے تیرے سے منّا جان کے نسب کی تحقیقات شروع کی منظم الدولہ سے پوچھا انھوں نے تاج الدین حسین خان کے سامنے رزیڈنٹ سے کہا کہ کیوان جاہ اور فریدون بخت نصیر الدین حیدر کے بیٹے نہیں ہیں رزیڈنٹ نے یہ بیان گورنر جنرل کو بھیجدیا وہاں سے حکم آیا کہ خود بادشاہ سے اس کی تحقیق کی جائے۔ رزیڈنٹ منظم الدولہ کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عرض کی گورنر جنرل حضور کے دل سے خیرخواہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ حضور اپنی زبان سے فریدون بخت کے بارے میں ارشاد فرمائیں انھوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ فریدون بخت اور کیوان جاہ دونوں میں سے کوئی میرا بیٹا نہیں ہے آپ یہ بات گورنر جنرل کو لکھ بھیجیں اور خود بھی ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ میں لاولد ہوں رزیڈنٹ نے یہ خط اور بادشاہ کی زبانی گفتگو گورنر جنرل کو لکھ کے بھیجدی وہاں سے حکم آیا کہ اسکا اشتہار ہونا چاہیئے۔ بادشاہ نے فارسی میں ایک طولانی اشتہار شائع کیا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

جناب والدہ ماجدہ نے فریدون بخت کو میری فرزندی سے منسوب کیا۔ مابدولت کے نزدیک یہ بات اس خاندان رفیع الشان کے لئے قبیح ہے خلد مکان نے بھی متواتر تحقیقات کے بعد اس کو میرا بیٹا ہونا قبول نہیں کیا یہ ایک دھوبن کا لڑکا ہے لہٰذا برائے اطلاع خاص وعام یہ اشتہار پیش گاہ جاہ وجلال سے شائع کیا جاتا ہے کہ اس دولت عظمیٰ کے عمائد وامرا ورعایا و برایا بھی اس لڑکے کی نسبت حضور اقدس واعلیٰ کی طرف

دل میں نہ لائیں

اس اشتہار کے بعد گورنر جنرل نے رزیڈنٹ کو لکھا نصیرالدین حیدر کے بعد سعادت علی خان کے کسی بیٹے کو تخت نشین کر دیا جائے یہ حکم رزیڈنٹ کے دفتر میں محفوظ کر لیا گیا اس کے کچھ مہینے کے بعد نصیرالدین حیدر کا زہر سے آدھی رات گذرنے کے بعد انتقال ہو گیا۔ رزیڈنٹ کو اطلاع ہوئی وہ اسی وقت کوٹھی فرح بخش میں آئے اور محمد علی خاں نصیرالدولہ کو بلوا کے تخت نشینی کی مبارکباد دی اور ایک کمرہ میں ان کو ٹھہرا کے انگریزی کیمپ سے دو پلٹنیں بلوا کے پہرہ بٹھا دیا اور اپنے اسسٹنٹ لفٹنٹ شیکسپیر کو وہاں تعینات کیا اور بیگم کے بھائی مرزا علی خاں کو ان کے پاس بھیج کر کہلوایا کہ آپ الماس باغ میں قیام پذیر رہیں فریدون بخت جانشین نہیں ہوں گے۔ محمد علی خاں کو حکومت ملے گی۔ آپ کے لیے پہلے زیادہ رعایتیں دلوا دوں گا۔ یہ سب انتظام کر کے رزیڈنٹ چلے گئے کہ صبح تخت نشینی ہوگی۔

صبح ہوئی تو بادشاہ بیگم نے سواری طلب کی اور آدمیوں کو جمع کیا رزیڈنٹ کو خبر ہوئی وہ کوٹھی فرح بخش میں آئے اور خدا بخش جو بداز کو بیگم کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ فریدون بخت کو ریاست نہیں ملے گی۔

اسکے وارث محمد علی خاں نصیرالدولہ ہیں مگر انھوں نے کچھ نہیں سنا پالکی میں فریدون بخت کے ساتھ بیٹھیں اور دو ہزار کی بھیڑ لے کے کوٹھی فرح بخش کی طرف روانہ ہو گئیں۔ رزیڈنٹ نے مرزا علی خاں کو پھر ان کے پاس بھیجا کہ آپ الماس باغ واپس چلی جائیے آپ کا وظیفہ مقرر کرا دوں گا مگر ان کے مشیروں اور فریدون بخت نے اصرار کیا اور وہ کوٹھی فرح بخش کے دروازہ پر پہنچ گئیں۔ رزیڈنٹ کہا کہ کوٹھی فرح بخش کا دروازہ بند کرا دیں۔ امام بخش نے ہتھنی سے دروازہ تڑوا دیا صورت سنگھ اور بیگم پیچھے سے پہنچ گئیں امام بخش فریدون بخت لاتا بر شاہ

نے زیدون بخت کو تخت پر بٹھا دیا نذریں گزرنے لگیں طائفے ناچنے لگے شادیانے بجنے لگے۔ بیگم پالکی کے اندر سے احکام جاری کرنے لگیں۔ روشن الدولہ کو گرفتار کرو معتمد ولہ کو قید کرکے لاؤ۔ رزیڈنٹ خود آئے اور کہا کہ اب فریدون بخت کو حکومت نہیں مل سکتی۔ انھوں نے کہا کہ ریاست ہماری موروثی ہے کسی کو اس میں دخل دینے کا حق نہیں ان کے ساتھیوں نے رزیڈنٹ پر یورش کی کہ فریدون بخت کی تخت نشینی کا اعلان کریں انھوں نے نامنظور کیا تو ان پر حملہ کر دیا۔ مرزا علی خان ان کو بچاکے نکال لائے اور بارہ دری کے صحن میں پہنچ گئے۔ اس وقت انگریزی کیمپ سے دو پلٹنیں اور تین توپیں آگئیں اتنے میں بارٹن صاحب اول اسسٹنٹ آئے اور اپنا خون آلودہ چہرہ دکھایا جو بیگم کے آدمیوں نے زخمی کر دیا تھا۔ رزیڈنٹ نے کہلوایا کہ اگر آدھ گھنٹہ کے اندر تخت نہ خالی کر دیا تو ہم فوجی کارروائی کریں گے۔ اس پر بھی بیگم نے اعتنا نہ کی۔ آدھ گھنٹہ کے اندر دو دفعہ آگاہ کیا کہ اب چند منٹ باقی رہ گئے ہیں اس پر بیگم نے توجہ نہ کی۔ آخر رزیڈنٹ کے حکم سے توپ چلی۔ عمارت کا کچھ حصّہ منہدم ہوا اس پر بھی بیگم کو ہوش نہ آیا رزیڈنٹ نے گولیاں چلانے کا حکم دیا گولیاں برسنے لگیں۔ چالیس آدمی مارے گئے سیکڑوں زخمی ہوئے۔ طائفے بھاگے۔ باجے والے بھی جان بچاکے نکل گئے۔ رزیڈنٹ بھی فرح بخش پہنچے دھوئیں سے ایک عالم تاریک تھا۔ تلنگے گھس آئے شیشہ آلات توڑ ڈالے اور تخت سے جلدی میں جواہرات اکھاڑ لئے۔ رزیڈنٹ نے فریدون کو سخت سست کہہ کے تخت سے گھسیٹا اور بیگم کے ساتھ پالکی میں بٹھلا کے قید کر دیا۔ فرح بخش سے لاشیں اٹھوا کے گومتی میں ڈلوا دیں اور پہرے کے ساتھ بادشاہ بیگم اور فریدون بخت کو چنار گڈھ بھیج دیا اور ایک ہزار روپیہ مہینہ ان کے ارسے کے لئے مقرر کر دیا جہاں ۱۲۶۳ھ کو بیگم نے ۱۲۶۴ھ کو فریدون بخت نے انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

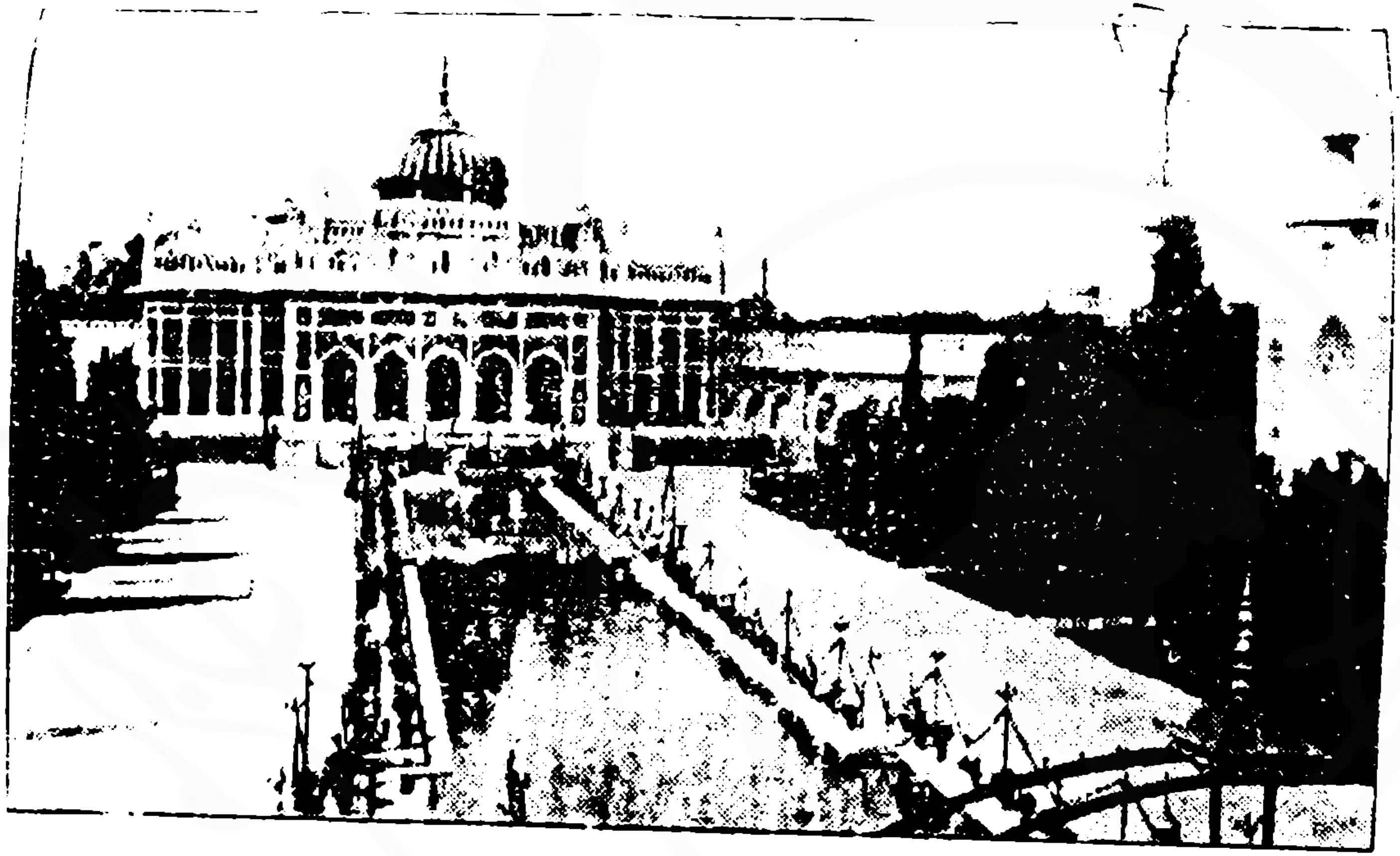

حسین آباد، لکھنؤ

حضرت سلطان زمان محمد علی شاہ

ابوالفتح معین الدین محمد علی شاہ

بادشاہ بیگم اور منا جان کی گرفتاری کے دوسرے دن آٹھ جولائی ۱۸۳۷ء محمد علی شاہ
سریر آرائے سلطنت ہوئے مجتہد العصر سید محمد صاحب نے تاج شاہی سر پر رکھا
سلامی کی توپیں سر ہوئیں نذریں گذریں ابھی وہ حکومت سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ بائیں
دن کے بعد ریزیڈنٹ نے ایک نیا عہدنامہ دستخط کے لئے پیش کیا جس میں دو باتیں اہم تھیں ایک
یہ کہ فوج اور کم کردی جائے دوسری یہ کہ اگر ملک کے کسی حصہ میں بدنظمی پائی گئی تو کمپنی اس
پر قبضہ کرے گی اور اس وقت تک اپنے قبضہ میں رکھے گی جب تک مناسب سمجھے گی۔
شجاع الدولہ کے زمانہ سے یہ صورت پیدا ہوگئی تھی کہ یا انگریزوں کی شرطیں منظور
کردیا حکومت سے ہاتھ دھوئے برگشتہ تقدیر رتابہ تپ راضی شوی کی بنا پر سب انگریزوں کی
شرطیں منظور کرتے رہے۔ محمد علی شاہ نے بھی دستخط کردی تریسٹھ برس کی عمر تھی امراض نے
گھیر لیا تھا بینائی کم ہوگئی رعشہ اتنا تھا کہ اپنے ہاتھ سے کھا بھی نہ سکتے تھے مگر سوجھ بوجھ اور
انتظامی صلاحیت جوان تھی سعادت علی خاں کے زمانہ میں امور سلطنت میں شریک تھے حکیم
بندہ مہدی کو وزارت سپرد کی علمائے فرنگی محل کو قضا و افتیٰ کی مسند پر بحال رکھا نئے
دفاتر اور نئے قاعدے جاری کرکے نظام مملکت کو چست و درست کیا ہر طرف واہ واہ
ہونے لگی۔ امور مملکت اور عقبیٰ کے سوا کسی طرف توجہ نہ تھی۔ ایک عالیشان جامع مسجد
کی بنیاد رکھی جو نقشہ کے لحاظ سے دہلی کی جامع مسجد سے وسعت اور شان میں بڑھی
ہوئی تھی نصف تک بننے پائی تھی کہ انتقال ہوگیا۔
جمنیا باغ میں حسین آباد کا امام باڑہ نہایت خوبصورت تعمیر کرایا اس کے
دونوں پہلوؤں میں چار سو مکانات شہر کے بے گھر ناداروں کے لئے بنوائے ایک محلہ کا نام

شریف منزل اور دوسرے کا رئیس منزل ہے رئیس منزل میں وہ لوگ رہتے ہیں جو برائے نام کرایہ دے سکتے ہیں غریب منزل کا کرایہ نہیں ہر مکان میں پختہ کمرہ دالان صحن پیخانہ اور باورچی خانہ ہے۔ بمبئی میں حجاج وزائرین کے لیئے مسافر خانہ تعمیر کرایا چار روپیہ سیکڑہ سود پر پچاس لاکھ روپیہ ان سب کے مصارف اور دیگر امور خیر کے لیئے کمپنی کے پاس جمع کیئے۔

سید حسین صاحب مجتہد العصر سید العلماء (خلف غفرانماب) نے نہر آصفی کے جابجا سے بیٹ جانے اور زائرین و مجاورین کربلا و نجف کو پانی کی تکلیف سے مطلع کیا اور اس کی درستی کا تخمینہ ڈیڑھ لاکھ بتایا انھوں نے وہ رقم فوراً ان کے حوالے کی جو رزیڈنٹ کے ذریعہ ہائی کمشنر بغداد کو بھیجدی گئی کہ وہ آقا سید ابراہیم صاحب صواب الاصول کو دیدیں اس وقت وہ عراق کے سب سے بڑے عالم تھے ان کو لکھا۔

ابو الفتح معین الدین محمد علیشاہ خلد اللہ ملکہ مقرونہ بالعز والجاہ حیث ان رغبۃ الی خدمات المشاہد الکریم سلام اللہ علی اعقابہا وعلی من حل بتر ابہا لما سمع اخبر اختلال النہر الحسینی الطف طاب عسہ الی تعمیر و تصفیہ و ترمیمہ ۔ فحاً لمغفرۃ السائرین وحلیا لمسرۃ الزائرین فامر تسدّ ان خزانۃ العامرہ واشارۃ بانا ملہ الماصرۃ الی ارسال مائۃ وخمسین روبیہ لکھنویہ وحعل امرۃ وتولیۃ الیہ بالتماس اقل البریہ وھا ھی مرسلۃ الیک بوساطۃ الانکلیسیہ

ابوالفتح معین الدین شاہ نے بہ سبب انتہائی رغبت کے جو انھیں مشاہد متبرکہ کی خدمت کے ساتھ ہے جب نہر حسینی کے خلل پذیر ہونے کی خبر سنی تو اس کی درستی کے لئے خزانہ شاہی سے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ سکہ لکھنؤ بھیجنے کا حکم دیا اور میری التماس سے اس کی نگرانی آپ کے متعلق کی انگریزی حکومت کی وساطت سے یہ رقم آپ کو بھیجی جاتی ہے

نقل [illegible] صاحب

تیس ہزار روپیہ روضہ حضرت عباس کے نقرئی دروازوں کی تجدید اور ایوان طلائی تعمیر کے لئے بھیجے یہ روپے اور خط پہنچنے کے بعد آقا سید ابراہیم نے رسید کا جو خط بھیجا اس کا ایک ٹکڑا یہ ہے :-

ثم لا یخفی علی جنابکم ان المبلغ الذی
لطف باحماله وتلطف بارساله
وتحمل بفضله وتجمیل بسره وجوده و
طوله الملک الافخم والسلطان الاحتشم
الاکرم امیر الامراء العظام ظهیر العلماء
الفخام حامی الشریعۃ الغراء ونصیر الفرقۃ
الحقۃ المحققۃ شیعۃ الائمۃ النقباء
علیهم الالف التحیۃ والثناء مد الله
فی اطناب ظلاله علی مفارق المسلمین
وعمر الله عمود ملکه الشریف مدارس
علمائه الاطیبین لاصلاح ما انکسر
من روضۃ مربی الناس الی الفضل
العباس علیه السلام والخیه وهو
ثلثون الف روبیه قد وصل ومضی
مدۃ اشتغل باصلاح خالصۃ المحل
کما رقم السلطان الاجل ولعمر الله لنعم
ما فعل وحبذا ما اهتدی فدل

مخفی نہ رہے جناب پر کہ وہ رقم جو
بنظر مرحمت واحسان روانہ کی
بادشاہوں کے بادشاہ علماء کے
پشت و پناہ شریعت غرا کے
حامی فرقہ شیعہ کے مددگار
خدا ان کا سایہ قائم رکھے
روضۂ حضرت عباس کی شکست
وریخت اصلاح کے لئے وہ تیس
ہزار روپے پر مشتمل تھی وصول
ہوئی اور کچھ مدت سے میں حضور
بادشاہ کی تحریر کے بموجب اپنی
نگرانی میں اس کام کو انجام دلا
رہا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ ممدوح
نے یہ بہترین خدمت انجام دی ہے
جس سے ان کا نام قیامت تک باقی رہے
گا میں نے اسکی رسید بغداد میں بالیوز کے سپرد کردی
ہے غالباً انھوں نے بھیجی ہوگی نیز وہ رقم

فانه اسم يبقى والسنين والاعوام
الى قيام القيام لازال فى توفيق الله
وعنايته هفضى المنى بحمايته
وقد تسلمت فيبقى وصول المبلغ المرسل
فى بغداد المستند الاخيار البالوف
لعله ارسل ووصل ايضا المبلغ
الذى ارسلتموه من باب اللطف
والاحسان لاهل الفقه
والايمان سيما الهنديين القاطنين
فى هذه المطان وهو ثلثه الاف
وثلاثمائه وثمان وستون روپيه
رائجته العراق فجعلته نصفين
وراعيت فى ادائه على الفريقين ما
امرت قاصداً امنه ابراء ذمته
ذالك المويد الموفق تريد مجدة
وتوفيقه من المستحقين وستصل الى
جنابكم مع هذه الذريعه
فيوضة كما وصل اليهم فيوضه
والذى امر به سلطان الاعظم
دام الله احسانه للمومنة الهنديه

جو آپ نے ازراہ لطف واحسان فقراء
اور اہل ایمان کے لیے عموماً اور ہندوستانیوں
کے لئے خصوصاً جو ان اطراف
میں مقیم ہیں اور وہ تین ہزار تین
سو اڑسٹھ روپیہ سکہ رائج الوقت
عراق ہیں وہ بھی وصول ہوئے اور میں
نے اس کو آپ کی ہدایت کے بموجب
ہندوستانیوں اور غیر ہندوستانیوں کے
لحاظ سے دو حصوں پر برابر تقسیم کردیا ہے
اور اس کی رسید بھی آپ کو پہنچے گی
نیز بادشاہ معظم نے ایک ہندوستانی
مومنہ سکینہ خانم کے لیے جو آٹھ سو
بیالیس روپے ہمارے سکے سے
روانہ کئے ہیں وہ بھی پہنچے میں
نے ان مومنہ تک اسے پہنچا دیا
اس کی رسید بھی آپ کو مل
جائے گی۔

المسماۃ سکینہ خانم و ھو ثمان مائۃ و اثنان و اربعون ۸۴۲ و فیہ برنجا
نقد وصل ایضاً و اصلہ الیھا و سیصل الیکم قبض الوصول۔ (ظل ممدود)

سامرہ میں امام حسن عسکریؑ کے روضہ کی چہار دیواری بنوائی اور گنبد پر سونا چڑھوا دیا اور ایک مسافر خانہ فردوس کے نام سے بنوایا۔ حضرت حر کی قبر پر ایک خوبصورت عمارت بنوائی۔

خطاطی | فن خطاطی نے اس زمانہ میں بڑا عروج حاصل کیا خود ملکہ جہاں (زوجہ محمد علیشاہ) اس فن میں کمال رکھتی تھیں انھوں نے پورا قرآن لکھ کے پندرہ پارے حضرت علیؑ اور پندرہ پارے امام حسینؑ کے روضہ پر چڑھائے جناب سیدہ کی سوانحعمری دو ڈھائی سو صفحے کی لکھی۔

سید مرزا انس اور جیا لال گلشن نے اس میں کمال حاصل کیا۔

رقاصی | ٹھاکر پرشاد اور درگا پرشاد نے رقاصی میں نام پیدا کیا۔

شاعری | ناسخ نے اس عہد میں انتقال کیا اب میدان سخن میں صرف آتش تھے اور وہ بھی چراغ سحری۔ دونوں شاگرد گروہا گروہ تھے۔ شعر و سخن کا چرچا عام تھا۔ میر ضمیر اور ان کے شاگرد مرزا دبیر کا مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں شہرہ تھا۔ میر انیس فیض آباد میں رہتے تھے کبھی کبھی لکھنؤ آکے اپنا سکہ بٹھا جاتے۔

منشی لطف علی نے مومی ضریح بنائی جس کا کام نہایت نازک ہے اور شدید گرمی میں ہزاروں شمعوں کے بیچ کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ ضریح بہت پسند کی گئی اور محمد علی شاہ نے اپنے امامباڑہ کو اس سے زینت بخشی۔ حقیقت میں یہ عجیب و غریب ضریح ہے جس کو دیکھ کے حیرت ہوتی ہے تقریباً بارہ فٹ اونچی ضریح ہر سال تیار ہوتی ہے۔ یہ صنعت اس خاندان میں اب تک محفوظ ہے دوسروں نے نقل کی بہت کوشش کی مگر کامیاب

نہیں ہوئی۔ شہر کی زینت و آرائش میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے لکھا ہے کہ

شہر کی ترقی | پھر زینت شہر کا جو خیال ہوا، مزدور ہر ایک مالا مال ہوا دل کشا سے تا در سید الشہداء کہ حسین آباد میں امام باڑہ بنا ہے۔ ایسی نادر سڑک بنوائی کہ ناظرین آنکھیں بچھاتے ہیں، افسردہ دل بشاش ہو جاتے ہیں یہ کیفیت بھی ہزاروں برس زمانے میں یادگار رہے گی، خلق خدا دیکھ کے سبحان اللہ کہے گی۔ شرق سے غرب تک، ہند سے عرب تک اس کا مذکور ہوگا معمورۂ خراب آباد میں یہ شہر مشہور ہوگا۔ واہ کیا شستہ و رفتہ و مصفا ہے اگر صفائے عارض خوباں سے مثال دیجئے تو ناروا ہے۔ وہ عارضی ہے، اس کو قیام ہے۔ یا شیشۂ حلب سے نسبت کیجئے تو بیجا ہے، کہ بقول مشہور وہ شیشہ باشد ہے، یہاں استحکام ہے۔ عجب راہ ہے تنہا چلے جاتے ہیں، دو نظر آتے ہیں ہمزاد کی صورت کوئی ہمراہ ہے۔ اس قدر شفاف اور مصفا ہے کہ عکس خط استوار صفحہ دنیا پر ہو یا ہے۔ دل گرفتہ اور خاطر فسردہ کو تفریح ہوتی ہے اس کی سیر حزن و ملال کھوتی ہے۔ کیسا ہی خفقان ہو دور ہو، جگر کو طاقت، دماغ کو فرحت، آنکھوں میں نور، دل کو سرور ہو۔ مریضوں کی دوا ہے۔ سڑک نہیں بیت الشفا ہے۔ گرمی کی فصل میں سہ پہر کو چار طرف سڑک پر آب پاشی کے باعث فضا ہوتی ہے۔ گرد کسی کے گرد نہیں پھٹکتی، وہ ہوتا ہے اور ٹھنڈی ہوا ہوتی ہے۔ راہ راست جو سنتے تھے، بدولت سلطان زماں تنگ نائے وسعت کے سرگشتوں نے پائی۔ باب امید و کامیابی کی سیدھی راہ ہاتھ آئی۔ لولے لنگڑے بے تکلف چلے آتے ہیں

اندھے بھی خانۂ مراد تک بے منتِ غیر پہنچ جاتے ہیں۔ دو رستہ بازار سڑک پر تیار ہے۔ روم و شام کی اشیاء نادر کا ہر صبح جابجا انبار ہے۔ اور دکانوں کا وہ ڈھنگ ہے کہ عقل رسا دنگ ہے، انداز نیا، جہاں نیا، طرز جدا جدا جس سقف و جدار کو دیکھا رنگا رنگ ہے۔ کسی جا چاہِ عمیق مثلِ فکر عقلاء نخشب کے کنوئیں سے تحفہ، کہیں غلہ کا انبار اور بن چکی ہے۔ پچ کے کام سے آبروئے ریختہ ریختہ، جو شے ہے پکی ہے۔ بازار بے آزار، ہوا سرد و سیر ہے جو وہاں نہ پہنچا اس کی قسمت کا پھیر ہے۔

بابِ امید و کامیابی کا جو پتہ ہے وہ کیا ہے۔ یعنی اِدھر تو در دولتِ ابد مدت اور اُدھر حسین آباد کے امام باڑے کی بنا ہے۔ سڑک سے مثال ہلال عید نمایاں ہے۔ جل جلالہ، کیا شوکت و صولت ہے! پھچ طلائی خورشید نمط درخشاں ہے۔ رفعت والان، شکوہ گنبد مطلا، پر مرغ زریں جناح کنگرۂ چرخ پر ساو صباح نثار ہوتا ہے، صدقے گردون دوّار ہوتا ہے۔ شوکت و بلندی سپہر بریں ساکنان زمین کی نظروں سے گر گئی۔ نیر تاباں کے منھ پر خجالت سے زردی پھر گئی۔ دمِ نظارہ یا طوافِ امام باڑہ دیدۂ و دل دولتِ کونین حصول کرتا ہے۔ ایسی ہی بنا بانئ ارض و سما مقبول کرتا ہے۔ درِ اجابت بروے حاجب مندان وا ہے ماتم خانۂ شاہ شہدا ہے۔ جس دم ضریح پاک نظر آئی، دل خون، دیدہ جیحون ہوا، چھاتی بھر آئی۔

شیشہ آلات اس قدر ہے کہ حلب والے حسرت سے منھ تکتے ہیں۔ حیران ہیں جھاڑوں کی یہ کثرت ہے کہ ساکنان فرنگ ہاتھ جھاڑ بیٹھے۔ سر در گریباں ہیں۔ قندیل بے عدیل سونے چاندی کی ظاہر نگار، ہزار در ہزار

علمہائے نادر، جن کے دیکھے الم آلِ عبا ہو۔ خلاصہ یہ کہ امام باڑہ ہو تو ایسا ہو صحن میں حوضِ مصفا، پانی سے ملتب بھرا، تشنگی اہلِ بیت کی لہروں سے یاد دلاتا، ڈبڈبائی آنکھ سے کم نہیں۔ کس چیز کو حسین علیہ السلام کا غم نہیں۔

عیش باغ میں بنائے آصفی موتی جھیل ہے، اس عزاخانے میں بانی جس کا محمد علی شاہ ہوا، یہ نہر رشکِ کوثر، نمونۂ سلسبیل ہے۔ موجوں سے غمِ خامسِ آلِ عبا پیدا ہے، چشمۂ فیض چھلک رہا ہے۔ سنگ ریزہ اس کا گوشِ حور کا آویزہ فخرِ دریکتا ہے، پانی پانی اس کے رشک سے دریا ہے۔ مختصر سا اُس میں پُل ہے صناعی میں بالکل پری کی صورت ایک جہاز ہے۔ دمِ رفتار ثابت ہوتا ہے کہ سرگرم پرواز ہے۔ نہر کے دونوں طرف مقبرے ایسے رفیع نظر آتے ہیں کہ دیکھنے والے روضۂ تاج گنج کو بھول جاتے ہیں۔ بسکہ روزِ مرگ پیشِ نظر ہے، یہ آرام خانہ تا بہ محشر ہے۔ صحن سبزہ زار ہے، باغ سے زیادہ بہار ہے۔ روشوں پر جانوروں کے گھر عجیب ہیں، طائرانِ غریب ہیں۔

رومی دروازے کی نقل جلو خانے کا وہ نادر تر بولیا ہے، جو اس خمسہ بشر کھوتا ہے دروں کو دیکھ کے انسان ششندر ہو، جس دم مدِ نظر ہو، مقابلے میں رومی دروازہ چشمِ حیرت کی طرح وا ہے، بہ نظرِ حسرت اُسے تکتا ہے سہ پہر کو وہاں سیر گزری نظارہ ہر رہ گزری ہے۔ مینا بازار کا جلسہ روز صبح ہو جاتا ہے، ایک جہان لینے دینے کو آتا ہے کسی جا کبوتر گرہ باز، شاہ جہاں پور کے بلند پرواز، کہیں شیرازی گلی نگار، ایک طرف مکھی نیلے، بھورے، سیماب برے، بھورے، گنڈے دار، کوئی نیم کی پتی ٹکلی یا کوڑی اچھال کر بیا سے منگواتا ہے کسی کا یہ دل گردہ ہے کہ بیلسے توپ چھڑواتا ہے، کہیں تو تا بیٹھی

جلتی ہلاتا ہے، صنعت دکھاتا ہے۔ کہیں مینا پھڑک رہی ہے، نیل کنٹھ چھوٹتا ہے، کوئی معقول الگ تماشے کے مزے لوٹتا ہے۔ کہیں بٹیر بازوں کا غول ہے کہیں لوے تیتر کا مول تول ہے۔

کسی جا ٹینی مرغیاں، کہیں اصیل، کسی طرف انڈے لڑتے، جال میں کوے چیل۔ خوش رو جوان جھمکڑے کے گھوڑوں پر سوار، ایک سمت فیل نشینوں کی قطار۔ باہم گفتگو ہے کہ یہ مرغ سالار جنگی ہیں، ان میں کوٹھی والوں کا میل ہے، ان کی کھول موند جدا ہے۔ دانے پانی کا کھیل ہے، کہیں اچھت دلّی والے ہیں، ہٹی سنگھ کی زیر بندی، ان کے گلے کھیل کی لاتوں کے عالم نرالے ہیں کچھ ٹکڑے اور چھٹتے ہیں۔ مرغ بازان کے کانٹوں کی بوچھار سے خار کھاتے ہیں، کاری کے خون سے خونِ جگر پیتے ہیں۔ کسی طرف کابکیں اور کھانچے ہیں، ٹھاٹھر اور ڈھانچے ہیں، کہیں بربری بکریاں بکتی ہیں، ایک اولوک ہے، خریداروں کے باہم نوک جھوک ہے۔

کسی جا سن رسیدہ عورتیں برقع پوش کرتی، ازار بند، گڑیاں، بجلیں لئے موجود کسی کے روبرو آستین کٹوری، ہتھیلی مسّی سے کبود۔ ایک طرف میوہ فروشوں کی صدا، کہیں سقّوں کے کٹورے کا کھنکنا۔ گرمی کی فصل میں فالودے والے غل مچاتے ہیں، بے فکرے برف کی قفلیاں کھاتے کھلاتے ہیں۔ کسی جگہ کورے گھڑوں میں فریہ کی گھاس، گرد اس کے مفلسوں کی ٹھنڈی سانس۔ بانس گڑا، نٹ نٹنی پر گھڑا ایسے چڑھا کوئی سانپ اور نیولا لڑانے کو بڑھا۔

ایک جا قصہ خواں امیر حمزہ و عمرو کی داستان۔ نقال جا بجا کھونے مسخرا پن کرتے ہیں۔ ہر ایک پیٹ کے واسطے ظاہرا اپنا اپنا فن کرتے ہیں۔ کہیں

لونگ چڑے والے، دال موٹھ کے خوانچوں پر جوبن نرالے۔ ایک طرف مچھلی کے
پھڑ پھڑاتے کباب، ان کی ماہیت کے جملے بے حساب پر سیندور کا رنگ، اور کلیجی
کے کباب میں مرچ کا تڑاقا، ترشی کا ڈھنگ۔ طرح طرح کی آبدار مٹھائی ہرا بر برابر
خوانچوں میں رکھی۔ کھٹے چٹے پر مزہ بنے۔ ریوڑی کو منہ لگایا ادھر میں آیا، دہن
معطر ہوا، حلوہ سوہن کا مزا پایا۔ بزازوں کی دکانیں جدا۔ بنارس، ڈھاکہ، چین
گجرات کا بیزا کم مایہ اپنا بقچہ گٹھری لیے گزی، گاڑھا، سوسی، دھوتر کا بیوپار کرتے
ہیں۔ دلال اکوائی چھبتے، کٹورے کی تکرار کرتے ہیں۔

صرافوں کے سامنے اشرفی روپے کا ڈھیر ہے، بھاؤ کی گفتگو، پرکھوں
کا مقابلہ، ہزاروں لاکھوں کا معاملہ۔ گھن، کلدار، سکہ چیں اور ملتے میں فرق
بڑا۔ زرق برق جوہری بچے گھیردار جامے پہنے، پگڑی سر پر، کمر پھولی بندھی، مونگا
موتی، الماس، زمرد۔ یاقوت، پکھراج، نیلم لئے آپس میں عجب طرح کی گھوت
سے ٹہلتے ہیں۔ تماشائیوں کے دل بہلتے ہیں۔ لین دین سے گرم بازاری ہے
گلِ مہندی کا تختہ کھلا، محمد شاہی طرحداری ہے۔ کوئی بیلے کی بہار دیکھ کے
ہار چکا تا ہے۔ کوئی چنبیلی جوہی کی بھینی بو باس سے بے چین ہوا جاتا ہے۔
کوئی لکڑ والے کو بلا کے سُلفے کے دم لگاتا ہے۔ کوئی گانجا چرس کے دھوئیں
اڑاتا ہے غرض کہ جہان کا سازوسامان بدولتِ سلطان عادل مہیا ہے
مصر کا بازار سرد ہو گیا ہے۔ شہر میں امن وامان، ہر ایک خوش گزران، راست
باز، آسودہ، خوش وخرم ہیں۔ کج رفتار سیدھے ہو جاتے ہیں، ہوش گم ہیں۔
جس کی طینت میں دغابازی، دل میں نطفہ حرامی ہے۔ اس کا سرکوب نظرِ ناز
امامی ہے۔

وہ جو کارداں سرا نمونۂ سرائے ہستی ہے، ہموار بہ تزئین بے شمار بلندی ہے نہ پستی ہے۔ لطف کوچ، مقام کا آرام، اُس مقام سے ملتا ہے۔ غنچۂ سربستہ دل دیکھنے سے کھلتا ہے۔ مکانات خوش قطع، مستحکم خوب، صحن وسیع شستہ رُفتہ مرغوب،

گنبد خانہ اس طرح کا بنا، گوئے سبقت فلک سے لے گیا اور نو کھنڈے کی کرسی غیرت چرخ بریں ہے، ایسا مکان زیر آسمان بروئے زمین دوسرا نہیں ہے مسجد رفیع، صحن جس کا وسیع

اللہ تعالیٰ اس بنا کے بانی کو تا قیام قیامت قائم رکھے، سایہ اس کا خلق کے سر پر دائم رکھے۔

جلوس کے دن سے جو کام کیا وہ خیر کا، مکان جو بنایا وہ سیر کا۔ اور کارپرداز بھی خیرخواہ، جاں فشاں، منہدم بنائے شر، فدیۂ سلطان۔

محمد علی شاہ نے چھ سال تک بڑی خوش اسلوبی سے حکومت کی ۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء میں انتقال ہو گیا۔ سب کو بے حد صدمہ ہوا۔ مجتہد العصر مولانا سید محمد صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں ریزیڈنٹ بھی شریک ہوئے تلقین مجتہد العصر کے چھوٹے بھائی سید حسین صاحب نے پڑھائی جس وقت انھوں نے پکار کے کہا اِسمع اِفہم یا محمد علی بن سعادت علی تو دنیا کی جاہ و جلال کی بے حقیقی کی تصویر کھنچ گئی۔

حضرت خاقان زمان امجد علی شاہ

Amjud Ali Shah,

For Oudh Royal Family Association.

امجد علی شاہ ثریّا جاہ

محمد علی شاہ کے بعد ان کے بیٹے امجد علی شاہ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء ۴۵ برس کے سن میں تخت پر بیٹھے۔ ان کا مختصر دور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ بڑے متقی پرہیزگار اور عابد شب زندہ دار تھے۔ مذہب امامیہ میں حکومت امام کا حق ہے اور زمانۂ غیبت میں نائب امام یعنی مجتہد کا۔ امجد علی شاہ نے مالک تخت و تاج کے ہونے کے بعد سید محمد صاحب مجتہد العصر کی خدمت میں حاضر ہو کے تخت و تاج پیش کیا۔ انھوں نے ان کو اپنا نائب مقرر کر کے ان کی حکومت کو شرعاً جائز کر دیا۔ ایران میں سلاطین صفویہ بھی یہی کرتے تھے۔

انھیں مجتہد العصر سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کے گھر پر ملنے جایا کرتے تھے نام لینا بے ادبی سمجھتے تھے۔ بڑے قبلہ و کعبہ اور ان کے چھوٹے بھائی سید حسین صاحب مجتہد العصر کو چھوٹے قبلہ و کعبہ کہتے تھے۔ نام لینے کی ممانعت تھی اور یہ خطاب دیا

مجمع علوم دین مرجع سادات و مومنین حافظ احکام الٰہ مورد اعتقادات حضرت امجد علی شاہ سلطان العلماء قبلہ و کعبہ مجتہد العصر مولانا سید محمد صاحب ابن المرحوم مولانا سید دلدار علی غفر انمآب۔

ان کے چھوٹے بھائی سید حسین عرف میرن صاحب کو یہ خطاب دیا تھا۔

حاوی علوم دین حامی سادات و مومنین حافظ احکام الٰہ مورد عنایات حضرت امجد علی شاہ سید العلماء مجتہد العصر مولوی سید حسین ابن المرحوم سید دلدار علی غفر انمآب

مجتہد کو قبلہ وکعبہ، سب سے پہلے امجد علی شاہ نے کہا۔ سلطان العلماء اور سید العلماء کی زندگی تک کوئی اور قبلہ وکعبہ نہیں کہا گیا۔ ان کے انتقال کے بہت دنوں کے بعد عام ہوا۔ [1]

امجد علی شاہ نے سلطان العلماء سے حکومت میں اصلاحات کی خواہش کی جس سے وہ بالکل شرعی ہو جائے۔ انھوں نے محکمۂ شرعیہ کی تجویز پیش کی، جس کے ذمہ عدلیہ، فوجداری، آبکاری، امور خیر اور مہمات پر پابندی تھی۔ یہ تجویز منظور ہوئی اور انھیں کی نگرانی میں محکمۂ شرعیہ قائم ہوا اور حکومت کی بالادستی اس پر نہ رہی۔ دیوانی ان کے بڑے بیٹے مولانا محمد باقر کے سپرد ہوئی۔ منصف الدولہ شریف الملک خطاب ہوا۔ فوجداری انکے دوسرے بیٹے محمد مرتضیٰ کے سپرد ہوئی خطاب قتل وقصاص و ابکاری خود سلطان العلماء نے اپنے پاس رکھی۔

نجم الغنی رام پوری لکھتے ہیں کہ شہر سے پانچ کوس تک کہیں شراب کا نام نہ تھا۔ دوا بڑی مشکل سے دستیاب ہوتی تھی۔ اس زمانے کے مشہور ظریف شاعر میاں مشیر نے شعر کہا ہے

شراب جو نہ پیئے آج کل وہ ناری ہے : جناب قبلہ وکعبہ [2] کو آبکاری ہے

[1] غالب نے اپنے بعض خطوط میں سرفراز حسین اور ان کے چھوٹے بھائی میرن صاحب کو لکھا ہے اللہ اللہ اب تو تم پانی پت کے سلطان العلماء مجتہد العصر ہو گئے۔ کہو تم کو وہاں کے لوگ قبلہ وکعبہ کہنے لگا یا نہیں یہ انہیں دونوں بزرگوں کی طرف اشارہ ہے چونکہ آگے بہت سے نام آنے والے ہیں۔ ان کی وضاحت کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ غفرانمآب کے پانچ بیٹے تھے۔ اس ترتیب سے محمد علی، حسن، مہدی، حسین سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے بیٹے نے عظیم شہرت حاصل کی۔ بڑے بیٹے سید محمد یہی اودھ کی تاریخ میں سلطان العلماء بڑے قبلہ وکعبہ مجتہد العصر، رضوان مآب اور چھوٹے بیٹے سید حسین سید العلماء چھوٹے قبلہ وکعبہ علیین مکان ہیں۔

[2] یہ قدیم ترکیب ہے فلاں کو کو توال ہے۔ اب کوئی جگہ کی بولتے ہیں۔

عدلیہ سلطان العلماء کے دوسرے بیٹے سید مرتضیٰ صاحب کے سپرد ہوا اور خلاصۃ العلماء خطاب ملا۔ قضیٰ وافتی سلطان العلماء کے بھتیجے (سید مہدی صاحب کے بیٹے) سید ہادی صاحب کے سپرد ہوا اور عمدۃ العلماء خطاب عنایت ہوا۔

ہر نظامت پر قاضی مقرر ہوتے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اودھ میں شیعہ، مفتی وقاضی مقرر ہوئے۔ علمائے فرنگی محل قضا وافتیٰ کی مسند پہ بحال رہے۔ جو اہلسنت کے معتقدات یعنی کی رو سے کرتے تھے۔ مگر اب وہ خاندانی اجتہاد کی ماتحتی میں آگئے۔ ہندوؤں کیلئے بھی فاضل برہمن قاضی کے عہدے پہ سرفراز کیے گئے۔ ہم نے پرانے کاغذات میں مفتی دیا شنکر کا نام دیکھا تھا۔

زکوٰۃ کا محکمہ سید العلماء کے چھوٹے صاحبزادے سید علی نقی صاحب کے سپرد ہوا زبدۃ العلماء معین المومنین خطاب دیا گیا۔

خزانہ پر زکوٰۃ عائد ہوئی زبدۃ العلماء تقسیم زکوٰۃ میں بہت محتاط تھے۔ ہندیں آدمیوں کو رکھا۔ اور مزید احتیاط سے جیسا نظام تقسیم قائم کیا کہ زکوٰۃ لینے والے کو بارہ جگہ نام لکھوانا پڑتا تھا۔ اس پر کسی نے جل کے کہا ۔

سید نقی کا ظلم وجفا وا مصیبتا
بارہ مصدی ایک گلا وا مصیبتا

اہم مقدمات کا فیصلہ سلطان العلماء نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ صاحب تذکرہ بے بہا نے تاریخ العلماء نے لکھا ہے کہ امجد علی شاہ نے کسی تاجر سے زرد دو جواہر نگار سنتیکیہ بیزہ لاکھ روپیہ کا خریدا۔ عملے نے سات لاکھ دبالیا وہ بہت دن تک دوڑتا پھرا آخر محکمۂ شرعیہ میں دعویٰ دائر کیا بادشاہ کو جواب دہی کا حکم ہوا مقدمہ کی سماعت ہوئی اور بادشاہ کے خلاف فیصلہ ہوا تاجر کو روپیہ کی ادائی ہوئی حکومت کے عدلاد

انصاف کی دھوم مچ گئی۔ اس سے متاثر ہو کے مرزا دبیر نے ایک مرثیہ میں بادشاہ کی تعریف کی یہ دفتر ماتم جلد اول کا پہلا مرثیہ یہ ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

طغرٰیٔ نویس کن فیکوں ذوالجلال ہے

چند بند ملاحظہ ہوں ؎

خار جفا سے راستوں کو صاف کر دیا — نوشیرواں کو قائل انصاف کر دیا
بس عین عدل قاف سے تا قاف کر دیا — دنیا نے دوں کو تابع اشراف کر دیا
چہرۂ ستم کا ہے نظرِ اہلِ دید میں
اب ظلم چھپ کے بیٹھا ہے قبرِ یزید میں

ہر شب ہے روز عید عجب روزگار ہے — انصاف سربلند ہے کیا تاجدار ہے
اقبال یارِ شہر ہے کیا شہریار ہے — اس لطف پر یہ رحمت پروردگار ہے
عالم وہ ہیں کہ قدرت رب آشکار ہے
ہاتھوں سے جن کے مذہب حق پایدار ہے

اول جناب مجتہد العصر والزماں — بسم اللہ صحیفۂ آیاتِ عز و شاں
خضر زمانہ مرجع سادات و مومناں — سلطان عالمان سند سنی و بیاں
چشم و چراغِ مجلس عالم جہاں میں
خاص الخلاصۂ بنی آدم کمال نیں

بانش علی و ختم رسل جد امجد است — اسمش جناب حضرت سید محمد است
در راستی چو حرف نخستیں ابجد است — بالا نشینِ منبر و ایوان و مسند است
ایمن شد است شہر ز طور جمالِ او
اے من فدائے نور چراغ کمال او

ناجی وہی ہے ان سب جسے اعتقاد ہے　　وہ اعتقاد شیعوں کو زاد المعاد ہے
ارشاد وہ بجا ہے کہ اللہ شاد ہے　　خیر العباد ان کے لئے اجتہاد ہے
شیعوں کو کہتے قبلہ شناس اس بیان سے
کہتے ہیں ان کو قبلہ و کعبہ زبان سے

بعد ان کے سید العلماء مجمع علوم　　خاصان ذوالجلال میں کالبدر فی النجوم
اک طبع پاک اور شغل نیک کا ہجوم　　اس پر بھی ہے وفور نوازش علی العموم
دنیا کے فخر دین کے بھی زیب و زین ہیں
وجہ حسن یہ ہے کہ سمی حسین ہیں!

معنی حلم و لفظ حیا آیۂ کرم　　تقویٰ و زہد و عدل و ورع سر سے تا قدم
انصاف کھا رہا ہے مرے قول پر قسم　　مطلوب واد نظم ہے نے شہرۂ رقم
واقف ہے کبریا کہ دروغ و ریا نہیں
مطلب کوئی رضائے خدا کے سوا نہیں

اس کے بعد تقریباً سولہ بند اور ہیں :۔

طوائفوں کو حکم ہوا کہ وہ توبہ کر کے صالح مردوں سے نکاح کرالیں۔ ہیجڑوں اور زنانوں کو شہر سے باہر نکال دیا گیا۔ شرعی قوانین نافذ ہوئے۔ جن میں تعزیرات بھی شامل تھی۔

ائمۂ اہلبیت کی ولادت وفات کی تعطیلیں معین ہوئیں۔

مدرسۂ سلطانی قائم ہوا اس کے صدر مدرس سید العلماء کے بڑے صاحبزادے سید محمد تقی صاحب مجتہد العصر بنائے گئے اور ممتاز العلماء فخر المدرسین خطاب ہوا ان کی ماتحتی میں مولوی حامد حسین صاحب (مصنف عبقات) مفتی میر عباس صاحب مولانا

احمد علی صاحب محمد آبادی مولانا الشیخ علی اظہر ایسے یکتائے روزگار مدرسی پر معین ہوئے۔ اس کا افتتاح خود بادشاہ نے ایک پُرتکلف دعوت میں کیا۔ مرزا محمد ہادی صاحب عزیز مرحوم نے "تجلیات" میں لکھا ہے کہ:

"۲ رجمادی الاول ۱۲۶۹ھ جناب سلطان العلماء سید العلماء مع اولاد واصحاب شہر کے تمام فضلاء اور طلباء کو لے کے مہمان سلطانی میں تشریف فرما ہوئے دیر تک بادشاہ سے باتیں رہیں آخر میں انعام[ل] واکرام سلطانی پر فائز ہوئے۔ یہ دعوت بہت پُرتکلف تھی۔"

مفتی میر عباس صاحب نے اس کے افتتاح کی جو تاریخ کہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ امین الدولہ امداد حسین خاں وزیر اعظم کی توجہ دہانی سے قائم ہوا[ل]

کرد تحریک در آں امر حسن شام و سحر — پیش نواب فلک رتبہ وزیر اعظم
شد بنا مدرسۂ تازہ بامداد حسین — پس ہمیں مصرع تاریخ رقم کرد قلم

سید العلماء کی تحریک سے نجف میں نہر حسینی نکال گئی۔ حضرت مسلم وہانی کی قبر مطہر پر عمارت نہ تھی۔ مسجد کوفہ خستہ ہو گئی تھی اور کوئی مینار نہ تھا ان سب کے لئے ایک کثیر رقم شیخ محمد حسین نجفی صاحب جواہر الکلام کو سید العلماء کی وساطت سے بھیجی۔ انہوں نے جب ان کی تعمیر شروع کی تو اپنے شاگرد اور باکمال شاعر شیخ ابراہیم قطفان آل یحییٰ العاملی سے ایک قصیدہ کہلوایا۔ جو بادشاہ سلطان العلماء سید العلماء کی مدح اور نہر و عمارت کی خصوصیات پر مشتمل تھا۔ قصیدہ بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں[ل]

[ل] انعام واکرام سلطانی پر فائز ہونا صحیح نہیں ہے خاندان اجتہاد کے علماء کو سلاطین اودھ سے جو کچھ دیا وہ نذرانہ کے طور پر پیش کیا خلعت و انعام کے طور پر نہیں۔

ان سلطان السلاطین الوری	بادشاہ بادشاہان خلق
فخر ارباب المعالی والدول	فخر ارباب بلندی و دولت
ذو النھی امجد علی شاہ الذی	دانشمند امجد علی شاہ
منہ التاج و بالملک استقل	جنہیں قدرت نے تاج عطا کیا اور مستقل سلطنت کے مالک ہوتے۔
اصل کم من ملک سامی الذری	ایسے بلند رتبہ کہ نہیں معلوم کتنے بلند درجہ بادشاہ
فی کمی ظل معالیہ استظل	انکے سایۂ اقبال میں پناہ لیتے ہوتے ہیں۔
وملیک دین آل المصطفیٰ	ایسے بادشاہ جن کے زمانہ میں دین نبی نے عزت
عز فی ایامہ والکفر ذل	پائی اور کفر ذلیل ہوا۔
واعتلاح فی افلاکہ	ایسے روشن چہرے والے کہ جن کے آسمان میں دو
کوکب فضل بدا من غیر کل	ستارے علم و عمل کے چمکے۔
مولانا المولویان ومن	ہماری مولا و آقا دونوں آقایانِ کرام
کل فضل حریا من غیر کل	جنھوں نے ہر فضیلت کو بغیر کسی مشقت کے حاصل کیا
اوردا منہل العلم الذی	انھوں نے بادشاہ کو پہنچا دیا علم کے اس گھاٹ
شربا من عذبہ نھلا وعل	پر جس کے شیریں پانی سے وہ خود بارہا سیراب ہو چکے تھے۔
فجری جریا الیہ فی العلی	ان کا فیض بلندی میں جاری ہوا
والحیا من فیض کفیہ سھل	اور چشمے ان کے دست کرم سے اُبل پڑے
رمق الدنیا فلما ان رای	انھوں نے دنیا کی طرف نظر ڈالی
رواح الفضل بکر فان اضمحل	اور جب دیکھا کہ فضیلت و شرف کا محل کو ذمیں

بذل الاموال لله وما	کمزور ہو گیا ہے۔
راح الا وهو في من بذل	تو انھوں نے خدا کی خوشنودی کے لئے اموال
حط نهرا بين اكناف الحمى	صرف کئے اور ہر شخص سے زیادہ سخی ثابت ہوئے
فان بالبشرى لذ بد من نهل	انھوں نے بنا دقائم کی ایک نہر کی نجف کے اطراف
كوثر في جنة حل بها	میں جو سیراب کرنے کی ضامن ہے۔
حيدر سادات الملك	وہ ایک کوثر ہے۔ اس جنت میں جہاں قیام کئے
وسبيل واضح للخير بل	ہوئے ہیں۔
سلسبيل غلل الصادين بل	امیر المومنین سید السادات خلق
ما اهتدى يوماله خط امرئ	اور وہ ایک واضح راستہ ہے جو پیاسوں کی
غير سلطان اذا قال فعل	پیاس بجھانے والا ہے۔
اي نهر عم نفعا بالحمى	یہ ایسی خدمت کی جو کسی کو نہ سوجھی سوائے
وحما من فيه فيه دار نحل	اس بادشاہ کے جو اپنی بات پر عمل کرنے والا۔
مان من كرفان الغاط الما	کیا کہنا اس نہر کا جس کا نفع اس شہر میں عام
كان صرفا كل حزف وحل	ہو گیا ہے اس نے حفاظت کی حاضر و مسافر کی
كم همام رمام ذا الصنع وما	جان کی۔
مد باعا نحره حتى نكل	اس نے محفوظ کر لیا کوثر کے ایسے محل کا جو
ما انثنى عن نيل مرتد يا	خوف کا مرکز تھا۔
حل العجز وايه اوالكسل	کتنے بلند مرتبہ لوگ ایسے تھے جنہوں نے اس
هكذا فليعمل العامل لو	کے بنوانے کا ارادہ کیا۔
فليقف من دون غايات العمل	اور ہاتھ بڑھانے کے لئے پہلے ہی قدم پیچھے

مشاد من ارکان اعلام الھدیٰ	ہٹالیا عاجزی کی چادریں اوڑھ کے ۔
وعلامات المعالی ما منزل	بے شک اس طرح کام کرنا چاہیئے کام کرنے والے کو نہیں تو ہوس ہی نہ کرے ۔
وبنی فی الکوفته الغرا اما	
طال فخرا وعلی لشعری اطل	انھوں نے مضبوط کیا ہدایت کے ارکان کو
حضرة القدس التی فی ضمنها	اور رفعت کے ستونوں میں سے اس کو جو
مسلم بل مروحته الاسلام حملی	نیچے گر گیا تھا ۔
ناصر السبط وراعیه ومن	اور بنیاد قائم کی کوفہ میں اس عمارت کی
کان له حاما لا یخل	جو فخر میں ستارہائے فلک سے بلند ہے ۔
واستنار الافق من مادنته	وہ مقدس بارگاہ جس میں حضرت مسلم دفن
قد تسامت وبها الحسن اکتمل	ہیں بلکہ اسلام کا دل ۔
کبر الذکر فیها واحد أ	بلکہ سبط پیغمبر کا مددگار وہ جو دین کے لئے نہ
احد فرد أکبیرم یزل	کند ہونے والی تلوار تھا ۔
وعذا یلهج فی تاریخهاد	اور افق آسمان روشن ہو گیا ۔ ایسے مینارے
علنا حی علی خیر العمل	جو بلند ہوا اور اس سے حسن کامل ہو گیا ۔
	اس میں مؤذن عظمت کا اظہار کرتا ہے اس
	واحد کی جو فرد ہے اور ہمیشہ سے ہے ۔
	اور وہ اس کی تاریخ میں کہتا ہے "علنا حی علی
	خیر العمل" ۱۲۶۰ھ

منقول از ظل ممدود مرتبہ مفتی میر عباس صاحب

سید العلماء سے انہوں نے ۱۲۶۰ھ فارسی میں علم کلام کی ایک کتاب لکھنے کی فرمائش

انہوں نے حدیقہ سلطانیہ کے نام سے وہ معرکہ آرا کتاب پانچ جلدوں میں لکھی جس کا
مثل ونظیر نہیں ہے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا سید علی صاحب سے اُردو میں تفسیر
قرآن لکھوائی یہ آٹھ جلدوں میں مطبع شاہی سے شائع ہوئی اس
غفرانمآب کے تیسرے بیٹے مولانا سید حسن نے اُردو میں
اصول دین کی ایک کتاب باقیات الصالحات لکھی۔ سلطان العلماء کے بڑے بڑے
بیٹے محمد باقر منصف الدولہ نے علم کلام میں تشیید مبانی الایمان فارسی میں لکھی اس
زمانہ میں علمائے فریقین کی اتنی کثرت تھی جن کا شمار ممکن نہیں حدیث وتفسیر کلام ومناظرہ
میں فلسفہ ومنطق میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔

احمد حسین سحر نے تذکرہ بہار بے خزاں اور سعادت ناصر خان ناصر نے خوش
معرکہ زیبا لکھا۔ اس دور کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ نصیر الدین حیدر نے جو رصد خانہ
میجر ہربرڈ کی نگرانی میں قائم کیا تھا۔ اور اس وقت تک حکومت کے بیس پچیس لاکھ
روپیہ اس پر صرف ہو چکے تھے میجر موصوف کی محنت سے ایک نادر کتاب تیار ہوئی
اس کی اشاعت کے لئے سات ہزار روپیہ خزانہ سے منظور ہوا۔ اسی اثناء میں ہربرڈ
کا انتقال ہو گیا۔ اور یہ کام کرنل ولکاکس کے سپرد ہوا زیڈنٹ کو ان سے دشمنی
تھی۔ انہیں یہ گوارہ نہیں ہوا کہ ایسے عظیم الشان کام میں ولکاکس کی شرکت ہو انہوں
نے ایسی ترکیبیں کیں کہ تمام سرمایہ تلف ہو گیا لاکھوں کا نقصان ہوا اور حکومت کا وہ
کارنامہ جو رہتی دنیا تک سلاطین اودھ کا نام روشن رکھتا اور دنیا اس سے فیض
حاصل کرتی برباد ہو گیا۔

شہر کی رونق میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے سعادت علی خاں کے بسائے
ہوئے شہر میں ایک نیا محلہ حضرت گنج آباد کیا یہ لکھنو کا سب سے زیادہ بارونق

بازار ہے شام کے وقت یورپ کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ برصغیر میں ایسا پرفضا اور شاندار بازار میں نے نہیں دیکھا۔

کشمیر میں راجہ نے مسلمانوں پر ظلم کیا امجد علی شاہ نے ان کو ترک وطن کرکے لکھنو چلے آنے کا پیغام بھیجا سینکڑوں خاندان وہاں سے چلے آئے بہت سے مقبرہ جناب عالیہ کے مکانات واقعہ گولا گنج میں آباد کئے گئے ان کی نسلیں آج بھی وہاں آباد ہیں ایک کثیر تعداد کو منصور نگر اور کاظمین کی طرف بسایا گیا اور کشمیری محلہ آباد ہوا۔

لکھنو سے کانپور تک پختہ سڑک بنوائی۔ غازی الدین حیدر نے انگلستان سے ایک لوہے کا پل منگوایا تھا۔ مختلف زمانوں میں اس پر کچھ کچھ کام ہوا مگر تمام تک نہ پہنچ سکا امجد علی شاہ کی توجہ سے پایۂ تکمیل تک پہنچا۔

امین الدولہ نے امین آباد بسایا۔ منصف الدولہ خلف سلطان العلماء نے روضۂ امام حسینؑ کی نقل بنوائی جو دیانت الدولہ کی کربلا کے نام سے مشہور ہے عاشورہ کے دن شہر کے تعزیئے وہیں دفن ہوتے ہیں۔

شرف الدولہ نے روضہ کاظمین کی نقل تعمیر کرائی۔

بادشاہ کے زہد وورع اور تقدس کا یہ اثر تھا کہ سارا شہر عبادت گزار بن گیا ہاتھ میں تسبیح وضع میں داخل ہوگئی۔ چند روز کے لئے آنے والا بھی مذہب کے سانچے میں ڈھل جاتا تھا۔ نماز روزہ کے ساتھ تعزیہ داری بہترین کار ثواب سمجھی جاتی تھی ہر شخص مجلس و ماتم اور تعزیہ داری کرتا تھا ہندو بھی مستثنیٰ نہیں تھے اب تک ہندوؤں کا تعزیہ عاشور وچہلم کو لکھنو میں اٹھتا ہے۔

سپہ گری یہاں کی قدیم وضع تھی لائف آف این ایسٹرن کنگ کا مصنف لکھتا ہے

"بازاروں میں سب سے نرالی بات یہ ہے کہ لوگ مسلح رہتے ہیں یہ بات کہیں اور نہیں پائی جاتی ــــ گلیوں میں ایک ادنیٰ سی بات پر تلوار چل جاتی ہے جب اس قسم کی ہنگامہ آرائی ہوتی ہے تو لڑنے والوں کے شور وغل سے دور تک خبر پہنچ جاتی ہے ــــ اکثر اوقات بہت سخت خونریزی ہو جایا کرتی ہے. یہی حالت اس وقت بھی جب میں ۱۸۳۵ء میں لکھنؤ میں تھا اور اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی ۱۸۵۲ء میں لکھنؤ کی یہی حالت ہے ایک یورپین سیاح کو ــــ لکھنؤ کے بھک منگوں کی یہ ادا مزید متحیر کر دے گی کہ جس قدر فقیر ہیں سب ہتھیار بند ہیں ــــ یہ فقیر ڈھال تلوار سے مسلح ہوتے ہیں ــــ میں نے ایک نامی فقیر کا نام سنا ہے جس کے پاس ایک ہاتھی بھی تھا اور وہ اسی پر سوار ہو کے روزانہ شہر کا چکر لگاتا تھا"

ہندو مسلمان سب شاعری کے دلدادہ تھے معمولی طبقہ کے لوگ بھی شاعر اور سخن فہم تھے. سعادت ناصر خاں تذکرہ "خوش معرکہ زیبا" میں لکھتے ہیں کہ:

"قادر علی مجرم اگرچہ دلال بازار جفت فروشاں ہے لیکن اس کے قالب طبع میں شعر خوب ڈھلتے ہیں"

نظر علی تیلی بھی شاعر تھا۔

میر انیس اس زمانہ میں فیض آباد سے مستقل طور پر لکھنؤ چلے آئے اب مرزا دبیر اور میر انیس مد مقابل تھے سارا شہر دو گروہوں میں بٹ گیا تھا۔ انیسیے اور

دبیرؔ سے ہر صحبت میں دونوں کے حامی نکل آتے تھے اور ہر جگہ اسی کا چرچا رہتا تھا مرثیہ خوانی کی مجلسیں محرم تک محدود نہ تھیں سال بھر سلسلہ رہتا تھا۔

یہ دونوں باکمال ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے تھے جب کسی نے کوئی نیا مضمون باندھا دوسرے نے اس کا جواب کہا انیسؔ نے تلوار کی کاٹ میں یہ مبالغہ کیا۔

قبضہ تو رہا دست جناب شہ دیں میں
اور تا سر دنبالہ در آئی وہ زمیں میں

دبیرؔ نے جواب میں کہا :-

قبضہ تو رہا تیغ کا دست شہ دیں میں
پھل جا کے لگا شاخ سر گاوزمیں میں

دبیرؔ نے گرمی کی یہ شدت دکھائی۔

ع ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب

انیسؔ نے کہا۔ ع ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

مرزا صاحب نے جناب عباسؑ کا خیمہ سے نہر پر جانا یوں نظم کیا ع

علیؑ کا سر دردار جو ترائے بار میں پہنچا
ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار میں پہنچا

میر صاحب نے اس کے جواب میں کہا ع

کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

کبھی کبھی نہایت مہذب اور لطیف نونک جھونک بھی ہو جاتی تھی جب میر صاحب نے کہا ع

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار ٭ خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

مرزا صاحب نے فرمایا ؎

خلاقِ معنیٔ مضموں کا ہے دعویٰ سب کو ٭ کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

غزل گو شعراء میں بھی آتش زندہ تھے مگر ناسخ کے بعد مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔

پیری نے بصارت زائل کر دی تھی گھر میں پڑے رہتے تھے۔

دونوں کے شاگرد میدان سخن میں ہنگامہ آرائیاں کر رہے تھے۔ ناسخ کے شاگردوں میں نواب عاشور علی خاں عاشور میر علی اوسط رشک سید مرزا انس فتح الدولہ برق مفتاح الدولہ درخشاں خواجہ وزیر بڑے باکمال تھے ان کے ہزاروں شاگرد تھے نواب عاشور علی خان میر علی اوسط رشک اور سید مرزا انس کی مسند بہت دنوں تک قائم رہی اور ان کے جانشین استادی کا نقارہ بجاتے رہے۔

آتش کے شاگردوں میں دیا شنکر نسیم۔ نواب سید محمد خان رند میر دوست علی خلیل میر وزیر علی صبا آغا حجو شرف بڑے خوش گو تھے۔

مصحفی کے شاگردوں میں مظفر علی اسیر استادی کی مسند پر متمکن تھے ان کا سلسلہ بھی بہت دنوں تک چلتا رہا۔ ہم ان تمام سلسلوں کا ذکر مناسب مقام پر کریں گے مرثیہ گویوں میں میر انیس اور مرزا دبیر کا خاندان تھا۔ عربی شاعری میں مفتی میر عباس صاحب نے علم امتیاز بلند کیا ان کے بہت سے شاگرد عربی شاعری میں استادی کا درجہ رکھتے تھے۔

خطاطی حسام الدولہ نواب محمد تقی خان شاہی خطاط تھے۔ لالہ شنکر

سہائے ہفت قلم تھے۔ لالہ سندر لال خط گلزارہ نستعلیق میں یکتا تھے۔ لالہ جے سکھ رائے مقبول زمان نویس بڑے کامل خطاط تھے یحییٰ علی خان خط شکست دلفاً خانی کے اُستاد تھے یہ شاعر بھی تھے ثابت علی خان خط شکست میں یکفنی کا درجہ رکھتے تھے۔ غلام محمد خان نے ناخن نویسی کا فن ایجاد کیا جو لکھنؤ کی مخصوص پیداوار ہے۔

مانی رقم خان، عاشق علی محبوب علی خط نسخ وطغریٰ میں بے مثل تھے۔

مصوری مصوری میں غلام محمد خان اور لالہ دُرگا پرشاد بہزار وقت تھے

موسیقی چھوٹے خاں فن موسیقی کا ایک باکمال شخص دہلی سے لکھنؤ آیا۔

سپہ گری میر علی پھکیت اصالت خان بنکیت خلیفہ ملیے پیٹ نے فنون سپہ گری میں شہرت حاصل کی۔

اس زمانہ کے لکھنؤ کی علمی، ادبی اور تمدنی کیفیت امیر احمد صاحب علوی مصنف یادگار انیس کی زبان سنیئے۔

"جب سقراط نے ہوش سنبھالا اور آنکھیں کھولیں تو یہ وہ زمانہ تھا کہ خطۂ یونان میں علم وہنر پھٹ پڑا تھا بڑے بڑے دانشمند، حکیم، فلاسفر، مورخ، شاعر اس وقت دارالسلطنت میں موجود تھے۔ اور کسی علم کے سیکھنے کے لئے باہر جانے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف بازاروں اور سیر گاہوں میں چہل قدمی کرنا۔ تہذیب اور انسانیت سکھانے کے لئے کافی تھا۔ اس طرح یہ دارالسلطنت (لکھنؤ) بھی شاعری اور نثاری کا معدن فصاحت وبلاغت کا معیار، زبان ومحاورات کی ٹکسال، شائستگی وتہذیب کا گھر، دولت وثروت کا سرچشمہ اور حشمت وجاہ وجلال کا خزانہ یا یوں کہو کہ اُودھ کی مستجل دولت کا دلکش مستقر تھا۔ جس کے شیدائی دعوے سے کہتے تھے سے

گو دلی جنت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ۔ چونکہ اُٹھتا ہوں میں ہر دم کہہ کے ہائے لکھنؤ یہ وہ مبارک عہد ہے کہ رئیس و فقیر، امیر و وزیر، شاہ و گدا غرض جس کے دل میں ذرا سا بھی سوز و گداز کا جوہر موجود ہے وہ سخن فہم اور قدردان سخن ہیں ان کی ہمت افزائیوں سے مسرور اور مضامین و خیالات کے اُن گراں بہا انبار سے جو متقدمین۔ اپنے نشان قدم پر چلنے والوں کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ مستفید ہو کر ناسخ، آتش، خلیق، صبا، وزیر، شیم، انیس و دبیر وغیرہ نظم اردو کو معراج کمال پر پہنچانے اور زبان لکھنؤ کو قید دہلی سے آزاد کرنے کا بیڑا اُٹھاتے ہیں۔

رند کھل جاتا ہے یاں کھوٹے کھرے کا پردا
لکھنؤ اہل ہنر کے لئے ٹکسال ہے آج کو

اللہ اللہ کیا بابرکت عہد تھا اور کیسے کیسے متبرک نفوس تھے جنہوں نے اپنی قیمتی عمریں اصلاح زبان اور اصلاح سخن اور اصلاح مضامین کی نذر کر دیں غرض اس وقت قدیم ایتھنس کی طرح علم و ہنر کا بحر مواج جوش زن تھا اور زبان دانی اور مضمون آفرینی کا یہ شہر ایسا مرکز ہو رہا تھا کہ اس کی دلکش سیرگاہوں اس کے دلچسپ منظروں اس کے دلچسپ میلوں ٹھیلوں کی بہار دیکھنا بھی انسان کو تہذیب سکھانے کے لئے کافی تھا ــــ اس وقت یہاں کی خاک پاک علم و فضل بانٹتی نہیں بلکہ کوڑیوں کی طرح لٹاتی تھی۔

سنا رضوان بھی جس کا خوشہ چیں ہے
وہ بے شک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

یہ اُس وقت کہا گیا تھا اور حسب حال تھا۔

مولانا عبدالحلیم شرر تحریر فرماتے ہیں۔

زبان اور شاعری کے کمالات کے ساتھ لکھنؤ نے علم و فضل میں بھی ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ ترقی کی۔ اگر سچ پوچھیے تو علوم کے اعتبار سے لکھنؤ ہندوستان کا بغداد اور قرطبہ اور اقصائے مشرق کا نیشاپور و بخارا تھا ....

علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی اس ہمہ گیری سے معمولی درجہ کے لوگ بھی سخن سنج اور ادیب بن گئے۔ سعادت ناصر خاں تذکرہ خوش معرکہ زیبا میں لکھتے ہیں کہ وہ لکھنؤ بھی کیا نستعلیق شہر ہے کہ بیرونجات کے رئیس۔ مرزا منش یہاں کے اہل حرفہ کی فصاحت پر کف افسوس ملتے ہیں۔

لکھنؤ کی فضا ایسی ہوگئی تھی کہ بقول سرور چار دن کے لئے آگے رہ جانے والا دیہاتی کندۂ ناتراش چھل چھلا کے آدمی بن جاتا ہے۔

فرمانروایان اودھ میں سعادت علی خان محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ مُجزر مشہور تھے مگر ان لوگوں نے شان و شوکت، تفریحات اہل کمال کی قدر دانی شہر نا پرستی شہر کی رونق اور امور خیر پر روپیہ خرچ کرنے میں دریغ نہیں کیا اس سے ہر زمانے میں لکھنؤ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون رونق آبادی میں ترقی کرتا رہا۔

سعادت علی خان کو تو رقص و سرور سے بھی دلچسپی تھی طائفے نوکر تھے ہر وقت ناچ گانا ہوتا رہتا تھا۔

محمد علی شاہ نے ارباب نشاط کی ہمت افزائی نہیں کی مگر اس کا کوئی بڑا اثر لکھنؤ کی موسیقی پر نہیں پڑا کیونکہ اس کا م رواج ہو چکا تھا۔ رؤسا کے دربار اس طرح کے لوگ وابستہ تھے۔ عوام بھی ان سے وابستگی رکھتے تھے۔ شجاع الدولہ کے زمانہ سے ان کو انعامات مختلف موقعوں پر بغیر کسی خدمت کے بھی دینے کا

رواج تھا روُسا شادی بیاہ میں اور مصارف کے ساتھ شہر کی طوائفوں کو بھی انعامات تقسیم کرتے تھے۔ نصیر الدین حیدر نے ایک سنار کی کاریگری کی تعریف سُن کے دو ہزار مرصع کڑوں کا آرڈر دیا۔ جب بن کے آئے تو حکم ہوا کہ شہر کی طوائفوں کو بانٹ دیئے جائیں۔

امجد علی شاہ بہت محتاط اور عبادت گذار تھے ان کے زمانے میں سلطان العلماء نے طوائفوں کو حکم دیا کہ وہ توبہ کر کے صالح آدمیوں سے نکاح کر لیں وہ روُسا کے گھروں میں بیٹھ گئیں۔

اس صورتحال کے علاوہ کھانے پینے شان و شوکت اور تفریحات میں جانوروں کی پرورش و پرداخت میں سیر و شکار میں جو لاکھوں صرف ہوتا تھا اس میں کوئی کمی کسی زمانے میں نہیں ہوئی۔ نجم الغنی رامپوری نے ایک دعوت کی کیفیت جو بیان کی ہے وہ سُننے کے قابل ہے۔

نواب فرخ آباد صمصام الدولہ بادشاہ سے ملنے آئے۔ حسن باغ میں ٹھہرائے گئے دوسرے دن ملاقات کو گئے بطریق تحفہ یا نذر ایک تھالی سنگ یشب کی مرصع مع انگورے کے پیش کی بادشاہ نے اس کو قبول کر کے بہت تعریف کی دوسرے دن ان کی دعوت ہوئی ایک عالیشان مکان جھاڑ فانوس کنول مردنگ اور آئینوں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا دعوت کا کمرہ اتنا بڑا تھا کہ تیس گز لمبی اور بارہ گز چوڑی میز کے گرد ایک سو پندرہ کرسیاں تھیں بادشاہ شہزادے ارکان سلطنت ریزیڈنٹ اور کچھ ممتاز انگریز جلوہ افروز ہوئے میز پر چنگیر گلدان حوض فوارے جا بجا رکھے تھے اور سب سنگ یشب کے جواہر نگار۔ کھانوں کی تعریف ہی کیا ہو سکتی ہے صمصام الدولہ اور ریزیڈنٹ دیکھ کر حیران ہو گئے تین دن تک یہ دعوت رہی

ہر روز تمام سامان نگ یشب کا مرصع کار ہوتا تھا اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ برتن وہ نہیں وضع اور کام میں تمام برتنوں کے ہر روز فرق ہوتا تھا صمصام الدولہ بہت شرمندہ ہوئے یہ دعوت مجد والدولہ کے انتظام میں ہوئی تھی بادشاہ بہت خوش ہوئے اور خلعت فاخرہ عنایت کیا انھوں نے کہا کہ اقبال بادشاہ سے ایک مہینے تک ایسا ہی سامان مہیا کیا جا سکتا ہے، اس پر دوسرا خلعت عطا ہوا۔

حکومت کے پاس یشب کا اتنا جڑاؤ سامان موجود تھا کہ تین دن تک نئے نئے سامان سے کمرہ سجا جاتا ہو اور تیس دن تک سجا جا سکتا ہو تو قیاس سے دور ہے یا تو روز سا سامان تیار ہوتا تھا یا اسی سامان میں ہر روز تغیر کر دیا جاتا تھا کہ دوسرا معلوم ہوتا تھا دونوں حالتوں میں لکھنؤ کی یہ صنعتی معراج ہے کہ صرف یشب کے اتنے کاریگر تھے جو دن بھر میں اتنی بڑی دعوت کا سامان تیار کر دیتے تھے اگر اتنا سامان موجود تھا تو اور بھی حیرت کی بات ہے اور اس موقع پر مسز حسن علی کا یہ قول یاد آتا ہے کہ الف لیلیٰ کی داستانوں اور قصہ کہانیوں میں جو باتیں عجائبات اور طلسمات کی سنی تھیں وہ دربار اودھ میں آنکھوں سے دیکھیں۔

گڈی اس زمانہ میں لکھنؤ میں گڈی ایجاد ہوئی دہلی میں پہلے پتلا اڑایا جاتا تھا اس کے بعد تکل بنی بانس کی چار تیلیوں کے دو چوکھٹے بنا کے آڑی کھپچیوں سے جوڑ کے کاغذ منڈھ دیا جاتا اس میں چراغ رکھ کے اڑاتے تھے اس کے بعد تنگ ایجاد ہوا یہ اکہرا چوکھٹا تھا جو تکل سے بہت ہلکا تھا امجد علی شاہ کے زمانہ میں ایک ٹھڈے اور ایک کانپ سے نو زات نما گڈی تیار ہوئی یہ فضا میں ہر طرف دوڑتی اور حریف کی طرف بڑھتی تھی ڈور ملنے کے بعد ڈھیل چلتی تھی اور کسی منزل پر کوئی ایک کٹ جاتی اس کا شوق بہت بڑھا یہ تحقیق

مولانا عبدالحلیم شرر کی ہے مجھے اس کی صحت میں اشک ہے کیونکہ میرزا سودا کے کلام میں گڈی کا ذکر موجود ہے ؎

اڑاتا گڈی وہ باہر نہ آوے
کہیں مجھ کو نہ وہ گڈا بناوے (سودا)

یہ ہو سکتا ہے کہ امجد علی شاہ کے زمانہ میں جو لوا زمات نما گڈی ایک کانپ اور ٹھڈے کی بنی ویسی دہلی میں نہ بنتی ہو اس طرح اس کو گڈی کی ایک ترقی یافتہ شکل کہنا چاہیئے۔ غرض لکھنؤ کے بے فکروں نے اس میں جدتیں کیں اس کے شوق میں ترقی اس زمانہ سے شروع ہوئی۔

امجد علی شاہ نے چھ برس حکومت کی اس مختصر مدت میں لکھنؤ کی رونق شان و شوکت اور مذہبیت میں قابل ذکر اضافہ ہوا۔ ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں بعارضہ سرطان انتقال ہوا۔

امجد علی شاہ کے ذاتی اوصاف

امجد علی شاہ کے حالات سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ وہ بڑے متقی پرہیز گار اور علم پرور اور علماء کے پرستار تھے۔ علوم و فنون نے ان کے زمانہ میں ترقی کی شہر کی رونق اور اسکی آبادی بڑھی۔ وہ اتنے محتاط تھے کہ جب رزیڈنٹ کی دعوت میں جاتے تھے تو ان کا رکابدار ساتھ جاتا تھا جو ان کو چائے پیش کرتا تھا اور جب گانا شروع ہوتا تھا تو وہ اٹھ کے چلے آتے تھے۔ ان کے گرد علماء اور صاحبان کمال کا مجمع رہتا تھا اور ہر ایک کو اسکی صلاحیت کے موافق عہدہ دیتے تھے۔ علمائے فرنگی محل میں مفتی محمد یعقوب اور مفتی محمد یوسف ان کے مقرب خاص تھے۔ پنڈت دیاشنکر نسیم فوج کے بخشی تھے اور بہت سے ہندو امراء منسلک تھے جن کی فہرست طویل ہے ہم واجد علی شاہ کے حالات میں اس کو پیش کریں گے۔

مولانا میر حسن علی لندنی کو سفارت کا عہدہ دیا۔ محمد ابراہیم خاں کو برطرف کر کے امداد حسین خاں کو وزیر بنایا۔ مرزا رجب علی بیگ سرور محمد ابراہیم خاں کے حاشیہ نشینوں میں تھے انھوں نے فسانۂ عبرت میں امجد علی کے انتظام پر بڑی خوشی کا اظہار کیا ہے سب پر تنقید کی ہے۔ میر حسن علی لندنی کو خاص طور پر ہدف بنایا ہے ان کے علم و فضل سے تو انکار نہ کر سکے مگر ان کے بڑھاپے کا مذاق اڑایا ہے اور ان کی انگریزی دانی پر پھبتی کسی ہے جو محض جہالت کی بات ہے۔ دوسرے مورخوں نے بھی ان کے حالات بتانے میں کوتاہ قلمی سے کام لیا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ مولانا کے مختصر حالات لکھ کے آئندہ کے مورخوں اور سیرت نگاروں کو انکے سمجھنے میں آسانی پیدا کر دی جائے۔ وہ علمائے لکھنؤ

ہیں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ ان کے دادا سید محمد کربلائی لودھیانے میں قاضی تھے
ان کے والد میر حاجی شاہ سکھوں کی حکومت سے دل برداشتہ ہو کے حج و زیارت
کے لئے چلے گئے۔ کربلائے معلیٰ میں ایک عرب خاتون سے عقد کیا جو ان کی
دوسری بیوی تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد وہ لکھنؤ آئے ان کے بیٹے میر حسن علی
ان کے ساتھ تھے اور جوان تھے۔ یہ شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ میر حاجی شاہ
الماس علی خاں کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد میر علی اپنے والد سے
ناراض ہو کے کلکتہ چلے گئے۔ وہاں کچھ برطانوی افسروں کو عربی پڑھانے کی نوکری
کر لی اور وہیں انگریزی پڑھی۔ کچھ دنوں کے بعد لندن چلے گئے ۱۸۱۰ء میں معروف مستشرق جان شیکسپیئر
(JOHN SHAKES PEAR) جو ملیٹری کالج ایڈیس کا ہے (MILITARY COLLEGE,
ADDISCOMBE) میں ۱۸۱۰ تا ۱۸۲۰ء تک پروفیسر برائے ہندوستان زبان تھے ان کے نائب
مقرر ہو گئے وہ اس منصب پر چھ سال تک فائز رہے۔ جان شکسپیئر کی علمی کاموں میں معاونت کے علاوہ
انہوں نے GOSPEL OF ST. MATTHEW کا ترجمہ بھی کیا۔ انہوں نے انگلستان میں دوران قیام
ایک انگریز خاتون سے شادی بھی کی جو ان کے ساتھ لکھنؤ چلی آئیں۔ میر حسن علی لندنی کو غازالدین حیدر
کی طرف سے مصلح الدولہ کا خطاب بھی ملا۔ بعض شہادتوں کے مطابق وہ برطانوی ریذیڈنٹ کے میر منشی
بھی رہے۔ ۱۸۶۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی بیوی ہندوستان میں تقریباً بارہ سال رہیں۔
اس قیام کے دوران انہوں نے دہلی کا بھی سفر کیا اور مغل بادشاہ اکبر ثانی اور ان کی ملکہ کی خدمت میں
باریاب ہوئیں۔ ان سے میر حسن علی لندنی کی کوئی اولاد نہ تھی۔ انہوں نے اپنی یادداشتیں مسلمانانِ ہند۔ ایک
جائزہ (AN OBSERVATION ON THE MUSSALANUS OF
INDIA) کے عنوان سے قلم بند کیں جو ۱۸۳۲ء میں ہمفرے ملفورڈ آکسفورڈ
یونیورسٹی پریس برطانیہ نے شائع کی۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن انڈین سول سروس

کے دبلوکروک کے تعلیقات وحواشی کے ساتھ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب
پاکستان میں پہلی مرتبہ ۱۹۷۳ء اور پھر ۱۹۷۸ء میں بھی آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی نے شائع
ان کے اخلاف میں حسین انجم صاحب ان کی علمی یادگار ہیں۔ موصوف اردو و فارسی میں ایم اے ہیں
نظم ونثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور ایک ادبی رسالہ طلوع افکار نکالتے
ہیں۔ مشاعرے کرتے ہیں جن میں مہمانوں کی ضیافت کا انتظام بھی ہوتا ہے۔
کراچی میں ان کی ذات سے ایک ادبی چہل پہل ہے۔

maablib.org

عہد امجد علی شاہ میں شیعیت کا عروج

اور

خاندان اجتہاد

دورِ امجد علی شاہ کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس عہد میں خاندان اجتہاد کو بہت عروج حاصل ہوا۔

مفتی محمد عباس صاحب سلطان العلماء سید محمد صاحب کے متعلق فرماتے ہیں

ان کی سربلندی سے دینِ الہٰی سربلند ہوا اور بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ وقت نے ان کے آگے سرِ عقیدت خم کر دیا اور شاہی اقتدار کا ایک حصہ ان کو سونپ دیا انہوں نے اسلامی آئین نافذ کیا اور بہت سے دینی کام کیے جس کا دائرہ عراق تک پھیلا۔ مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اس کے یہ اسباب ہیں۔

اس وقت اس خاندان میں علماء کی کثرت۔ ایسی کتابوں کی تصنیف جس سے دین میں روح تازہ دوڑ گئی۔ اعلیٰ روحانیت۔ سیرت و کردار کی بلندی بادشاہوں کی طرف رخ نہ کرنا اور حق پر قائم رہنے میں ان کی مخالفت کرنا ان باتوں نے ان کا وقار بہت بلند کر دیا عام لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے بادشاہ دیندار تھے۔ انہوں نے بھی عقیدت کا سر جھکا دیا۔ ان باتوں کو ہم مختصر طور پر پیش کرتے ہیں کہ اب عروج کا اصل راز سمجھ لیں۔

علماء کی کثرت اس وقت اس گھر میں چودہ متبحر عالم موجود تھے۔

(۱) سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب (۲) مفسر قرآن مولانا سید علی صاحب

(۳) فقیہ اہلبیت مولانا سید حسن صاحب (۴) سید العلماء مولانا سید حسین صاحب پسران غفرانمآب (۵) صفوۃ العلماء منصف الدولہ شریف الملک مولانا محمد باقر صاحب (۶) خلاصۃ العلماء مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب (۷) مولانا محمد صادق صاحب (۸) مولانا سید عبداللہ صاحب (۹) ملک العلماء مولانا بندہ حسین صاحب (۱۰) مولانا سید علی اکبر صاحب پسران سلطان العلماء (۱۱) عمدۃ العلماء مولانا سید محمد ہادی صاحب نبیرہ غفرانمآب (۱۲) زین العلماء عضد الدین مولانا علی حسن صاحب (۱۳) ممتاز العلماء فخر المدرسین مولانا محمد تقی صاحب (۱۴) زبدۃ العلماء مولانا علی نقی صاحب پسران سید العلماء سید حسین صاحب۔

اتنے عالموں کا وجود ایک گھر میں دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتا۔ اور ان سب کے لئے بے شمار شاگرد جو ان لوگوں کو اپنا روحانی باپ سمجھتے تھے۔ اور یہ بھی ان کے مربی و سرپرست تھے علم کے ساتھ معاش بھی مہیا کرتے تھے قیام کے لئے مکان دیتے تھے اور دینی کتابیں لکھنے کی فرمائش[1] کرتے تھے۔ اس دور کے علماء میں کوئی ایسا نہیں جو دینی کتابوں کا مصنف نہ ہو۔

---

[1] ایک دلچسپ واقعہ ہے غفرانمآب نے مفتی محمد قلی صاحب کو تحفہ اثنا عشریہ کے ایک باب کی رد لکھنے کی فرمائش اس کا خاکہ بتایا اور کچھ کتابیں دیں۔ کچھ لکھ کے لاتے اور کچھ کتابیں اور مانگیں غفرانمآب نے فرمایا کہ کتاب کا فائدہ عارضی ہوتا ہے اہل علم کو کتاب اپنے پاس رکھنا چاہیے وہ محصل کی علم اور مصنف کا آلہ ہے جیسے حداد وہ نجار بغیر اوزار کے کچھ نہیں کرسکتے اسی طرح مصنف کتابوں کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا اور روپیہ ان کو دیئے کہ اس سے کتاب خرید کے کتب خانہ قائم کیجئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر دو روپیہ لے ایک روپیہ کی ایک کتاب خرید کے کتب خانہ کا افتتاح کیا اور ایک روپیہ برکت کے لئے صندوقچہ میں رکھا جو برکت کے روپیہ کے نام سے ان کا خاندان میں برسوں رہا اس نے کیا برکت دکھائی یہ تو نہیں معلوم مگر اس ایک روپیہ کی کتاب کی برکت سے رفتہ رفتہ وہ کتب خانہ عظیم الشان بن گیا اور آج تک موجود ہے۔

عنفران مآب کے وقت سے سارے ہندوستان کے شیعہ لکھنؤ کو اپنا دینی مرکز سمجھتے تھے۔ علم دین حاصل کرنے والے یہیں آتے تھے۔ یہیں کے علماء باہر بلائے جاتے تھے۔ اس وقت ان باتوں میں ترقی ہوئی اور ایک نئی بات یہ ہوئی کہ یہاں کی دینی کتابیں سارے ہندوستان میں پھیل گئیں جن میں بچوں کے پڑھنے کی کتابیں بھی تھیں اور اوسط و اعلیٰ استعداد کے لوگوں کے لئے بھی تھیں ان میں بارقہ ضیغمیہ۔ ضربت حیدریہ۔ بوارق موبقہ۔ طعن الرماح سلطان العلماء نے ایسی کتابیں لکھیں جن کا مثل نہیں ہے ان کی خصوصیت یہ ہے کہ قرآن و حدیث سے استدلال کے ساتھ عقلی اور فلسفیانہ استدلال اتنے مضبوط ہیں جو ذہن انسانی کی معراج ہیں ان کتابوں نے لوگوں کو حیران کر دیا۔ علماء کہتے ہیں کہ یہ عقل انسانی سے بالاتر ہیں۔ غفران مآب کی کتابیں بھی اس میں شامل ہیں۔

مفتی محمد عباس صاحب فرماتے ہیں:

ان کی علمی جلالت کا اندازہ ان کی تصنیفوں سے کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے شریعت محمد مصطفیٰ کی مدد کی ان کی وجہ سے اس کی تجدید ہوئی وہ حکمت الٰہیہ جاننے والوں کے مقتدا اور مجتہدین کے نقطۂ آخر ہیں

(اوراق الذہب)

مولانا میر حامد حسین صاحب لکھتے ہیں:

علمائے متکلمین میں سب سے افضل فقہائے مجتہدین میں سب سے اکمل سارے اور تمام مومنین کے مولا و آقا وقت کے نزد خدا کی تائید ان کے ساتھ ہے۔ (رسالہ تقیہ)

عراق کے مشہور عالم حجۃ الاسلام مولانا علی نقی طباطبائی ان کی کتابوں سے متأثر

ہو کے لکھتے ہیں۔

دائرہ عقل کے مرکز۔ آسمان علم کے قطب ارباب فضل کے راس واثیس زمانہ میں یکتا اور وحید ظل ممدود حجۃ الاسلام سید علی حائری مصنف ضوابط الاصول فرماتے ہیں۔ ملک اسلام کے قطب۔ دائرہ عزت واحترام کے نقطہ بد تمام احکام شرعیہ کا دارومدار ان کی ذات پر ہے مسائل حکمیہ کو انہوں نے زندہ کر دیا اور علم و کمال میں روح پھونک دی شریعت کی بنیادوں کو قائم کیا اور ہدایت کے راستوں میں چراغ روشن کر دیئے" ظل ممدود

شیخ الفقہا شیخ محمد حسن نجفی مصنف جواہر الکلام فرماتے ہیں:

ایسے علامہ جن کا نظیر نہیں معقول ومنقول فروغ واصول جن کی ذات میں جمع ہیں فقہا و مجتہدین کے فخر اسلام کے مددگار عراق وایران وہندوستان کے مومنین کے آقائے اعظم ظل ممدود

ان بیانات سے ان کتابوں کی عظمت کا اندازہ کیجئے۔

روحانیت روح کی بالیدگی عبد و معبود کے راز و نیاز پر ہے جس کو عبادت سے تعبیر کیا جاتا ہے نماز وظائف مناجات اسی کی شکلیں ہیں لیکن اس کی روح خضوع وخشوع ہے۔ ابا بر الفاظ جاری کر لینا کو خیر نہیں سلطان العلماء اور سعد العلماء کی عبادت خضوع وخشوع کا اعلیٰ معیار تھی۔

علامہ سید محمد حسین تذکرہ بے بہا فی تاریخ العلماء میں لکھتے ہیں:

بعض فضلائے اہل سنت جب شیعہ ہو گئے اور ان کی خدمت میں حاضر رہنے لگے آپ کے حالات دیکھتے تو حیران ہو کے

کہتے کہ آپ طاعت وعبادت میں مثل علی بن ابی طالب کے ہیں

تاریخ العلماء لکھتے ہیں:

ایک بزرگ زائر ائمہ اظہار فرماتے ہیں کہ آپ کو اور علماء سے وہی نسبت جو بشر کو فرشتہ سے ہے زائرین کا قول ہے کہ اگر کوئی بلاد وامصار کی سیر کرے اور علماء کی صحبت میں رہے تو آپ کی قدر معلوم ہو۔

اس کے بعد لکھتے ہیں۔

اگر آپ عہد رسول میں ہوتے تو آپ کے فضائل میں کوئی آیت ضرور اُترتی اور ابوذر وسلمان پر آپ فضیلت دیتے آپ کے تمام افعال وعادات عبادت تھے۔

یہ مفتی میر عباس صاحب کی عبادت کا ترجمہ ہے وہ اوراق الذہب میں لکھتے ہیں

لوکان فی ومن جدہ رسول اللہ لا ینزل اللہ فی مدحہ شیئاً من القرآن و بلفضلناہ جدہ علی ابی ذر و سلمان۔

اسی کتاب میں دوسری جگہ فرماتے ہیں:

خدا نے ان کے چہرہ میں جب کلام میں نمک اور الفاظ میں فصاحت عطا کی ہے ان کی صحبتیں مثبت ہیں جہاں لغو اور غیر مشروع باتوں کا گذر نہیں ان کی عادت میں حسن اخلاق و مزاح ہے مگر کوئی شخص ان کے سامنے دم نہیں مار سکتا ان میں سختی و نرمی جو خدا نے عطا کئے ہیں۔

ان میں تن تنہا قیام دنفود میں وہ ہمت ہے جو بادشاہوں کو

فوج و لشکر کے ساتھ میسر نہیں وہ جناب باوجود قوت قلب کے رحم دل اور بندوں پر مہرباں ہیں۔ شجاعت میں شیران کے سامنے سے فرار کرتا ہے۔ موعظہ کے وقت پتھر اگر احساس کرے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے بالخصوص جب وہ جناب منبر پر موت اور قبر کا تذکرہ کرتے اور ابر باز ندہ کی طرح روتے ہیں خدا کے راستہ میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے خدا کی رضا کے طالب رہتے ہیں۔

حق پر استقامت غفرانمآب کے بعد ساری ذمہ داری سلطان العلماء پر آپڑی ان لوگوں نے کبھی امراء و سلاطین کی طرف رُخ نہیں کیا بس اتنا ربط رکھا کہ نکاح کیلئے بلایا تو چلے گئے۔ نماز جنازہ، نماز جماعت پڑھادی۔ مسجد میں بادشاہ کے آگے اور وہاں سے نکل کے بادشاہ پیچھے نہیں ہوتے۔ اس روش نے غازی الدین حیدر کے زمانہ میں ایک حادثہ سے دوچار کردیا

اودھ کی تاریخوں میں تو صرف اتنا لکھا ہے غازی الدین حیدر اپنے بیٹے نصیر الدین حیدر سے خفا ہو گئے اور اپنے نواسے محسن الدولہ کو اپنا جانشین بنانا چاہا مگر کتب سیر میں یہ ہے کہ انھوں نے محضر نبار رکھا جس میں نصیر الدین حیدر کی ابنیت سے انکار تھا۔ سب نے بادشاہ کے خوف سے دستخط کر دی جب سلطان العلماء کے پاس آیا تو انھوں نے اسپر لکھا از عمل غیر صالح اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بادشاہ یہ عمل غیر صالح ہے یہ بھی ہو سکتا ہے نصیر الدین حیدر عمل غیر صالح ابنت سے انکار نہیں ان کا یہ فعل مزاج شاہی پر گراں گزرا اور زندگی بھر ناراض رہے۔

غازی الدین حیدر کے بعد نصیر الدین حیدر رجعت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

سلطان العلماء کی بڑی آؤ بھگت کی ولی عہدی کے زمانے سے اپنی طرف مائل سمجھ کے۔ مگر تخت پر بیٹھتے ہی ان سے ٹکر ہوگئی ایک عورت سے (جسے اس کا شوہر چھوڑ چکا تھا مگر شرعی طور پر طلاق نہیں ہوا تھا) نکاح پڑھنے کے لئے طلب کیا انھوں نے صاف کہہ دیا کہ شوہر اول سے افتراق شرعی طور پر ثابت نہیں اس لیے میں نکاح نہیں پڑھوں گا۔ بادشاہ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا اور آپ لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہہ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

حضور شاہی میں یہ جرأت اور زیادہ برہمی کا باعث ہوئی۔

اس کے بعد شراب کے جواز کا فتویٰ اس صورت سے چاہا کہ طبیب حاذق نے بادشاہ کی زندگی کا انحصار شراب پینے میں تجویز کیا ہے اس صورت میں حکم شرع کیا ہے۔ سلطان العلماء جانتے تھے کہ اس بہانے سے شراب نوشی مقصود ہے جس طرح جان بوجھ کے طبیب حاذق کی غلط تجویز ہے۔ اسی طرح مفتی کا فتویٰ غلط ہوگا۔ مگر صورت مسئلہ میں طبیب حاذق کی رائے سے مخالفت کی گنجائش مفتی کو نہ تھی۔ انہوں نے اپنی خداداد ذہانت سے کام لیا اور لکھ دیا لا شفاء فی الحرام اس سے پہلے کسی نے اس محل پر اس حدیث کو پیش نہیں کیا تھا۔ نصیر الدین حیدر کی تندمزاجی مشہور ہے یہ دوسری جھڑپ تھی۔ اب رعب شاہی سے کام لینا چاہا اور ایک مسئلہ پوچھنے کے بہانے سے بلوایا۔ ایک کرسی پر خود بیٹھے اور ایک پر قلمدان رکھ دیا اور ارادہ کیا کہ جب سلطان العلماء آئیں گے تو تعظیم نہ کروں گا مگر جب وہ دروازے کے پاس پہنچے تو عربی قاعدے سے بلند

آواز میں اللہ کہے اور اندر داخل ہو گئے بے اختیار بادشاہ تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے اور وہ قلمدان اٹھا کے بیٹھ گئے۔ بادشاہ دیر تک سناٹے میں رہے۔ آخر میں پوچھا کہ اسلام سے پہلے اگر جسم میں نجاست لگ جاتی ہے تو اس جگہ کاٹ دیتے تھے۔ فرمایا خون نجس نہ ہوگی یہ کہہ کے چلے آئے۔ مصاحبین خاص نے پوچھا تو کہا جب وہ کمرے میں آئے معلوم ہوا کسی نے بغلوں میں ہاتھ دے کر کھڑا کر دیا مفتی میر عباس صاحب نے اوراق الذہب میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے چہرے میں تنہا وہ رعب جلال ہے جو بادشاہوں کو لشکروں کے ساتھ نصیب نہ تھا۔ اس واقعہ سے سلطان العلماء سمجھ گئے کہ بادشاہ کو مخالفت پیدا ہو گئی ہے اور وہ توہین پر آمادہ ہیں دوسری دفعہ جب بلائے گئے تو جانے سے انکار کر دیا۔ نصیر الدین حیدر اس کی تاب کہاں لا سکتے تھے آگ بگولا ہو گئے حکم دیا کہ اس کا مکان توپ سے اڑا دیا جائے شہر میں ہلچل مچ گئی۔ رات کو یہ حکم ہوا تھا کہ بجلی کی طرح سارے شہر میں خبر دوڑ گئی۔ امرائے دربار دوڑے آئے کہ سلطان العلماء معافی مانگ لیں۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ رات لوگوں نے آنکھوں میں کاٹی صبح ہوئی شاہی فوج کے کپتان الدولہ نے توپ خانے سے دو توپیں نکلوائیں۔ ایک سلطان العلماء کے مکان پر چڑھ گئی۔ دوسری محل سرائے شاہی پر بادشاہ کی آنکھ کھلی معلوم ہوا شاہی محل پر توپ چڑھ گئی حواس جاتے رہے پوچھا یہ توپ کیوں اور کس نے چڑھائی ہے؟ معلوم ہوا کہ شاہی فوج کے کپتان نے۔ وہ کہتے ہیں میری غیرت قبول نہیں کرتی کہ بادشاہ دین کا مکان توپ سے اڑا دوں اور بادشاہ دنیا کا محل کھڑا رہے اس لیے میں اپنی دین ودنیا دونوں آج ختم کیے دیتا ہوں۔ احساس مذہبی نے بادشاہ کو چونکا دیا نشہ اتر چکا

تھا شرمندہ ہوتے۔ کپتان کو اُن کے جوش ایمانی پر گراں بہا خلعت عنایت کیا مگر سلطان العلماء سے زندگی بھر صفائی نہ رہی مگر مذہبی امور کی انجام دہی انھیں کے ہاتھوں ہوتی رہی۔ (تاریخ العلماء)

نصیر الدین حیدر کے بعد محمد علی شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ انھوں نے جامع مسجد بنوائی اور سلطان العلماء سے نماز پڑھانے کی استدعا کی۔ انھوں نے کہا اس میں کچھ زمین نعیم خان کی شامل ہوگئی ہے اس لیے میں نماز نہیں پڑھاؤنگا یہ بادشاہ نہایت متدین اور بیدار مغز تھے انھوں نے سلطان العلماء ہی کے سپرد اس کی تحقیقات کی اور کہا کہ شرعی حیثیت سے جواز کی صورت آپ نکال دیں انھوں نے نعیم خان کو بلوا کے زمین کے معاوضہ پر راضی کرلیا اور بادشاہ سے معاوضہ دلوا کے نماز پڑھائی۔

امجد علی تو ان کے معتقد تھے ان سے کوئی اختلاف پیدا ہوا۔ واجد شاہ کے زمانہ میں ہنومان گڑھی کے واقعہ میں تمام علمائے اہل سنت نے حکومت کے موافق سلطان العلما کے حکومت کے خلاف ہوئی۔

نجم الغنی نے تاریخ اودھ لکھا ہے کہ ہنومان گڑھی کے واقعہ میں علمائے اہل سنت نے بادشاہ کے موافق اور سلطان العلماء نے بادشاہ کے خلاف فتویٰ دیا۔ انھوں نے اپنے علماء کو گالیاں لکھ دیواروں پر چسپاں کیں اور اپنی نماز پڑھ کے شیعوں کی مسجد میں آ کے سلطان العلماء کا موعظہ سنتے تھے۔

غدر میں باغیوں کے سردار احمد اللہ شاہ جو ڈنکا شاہ کے نام سے مشہور تھے۔ سلطان العلماء کے پاس آئے اور کہا کہ انگریزوں سے جہاد کا فتویٰ دیجئے انھوں نے کڑے تیور ڈال کر کہا علمائے فرنگی محل سے فتویٰ لیجئے ہما سے ب

عینیت امام میں جہاد نہیں۔

غدر کے بعد ان پر بغاوت کا مقدمہ قائم ہوا مگر ان کے اعزاز کا اتنا لحاظ کیا کہ گرفتار نہیں کیا اور گھر پر مقدمہ کی سماعت ہوئی وکیل نے پوچھا کہ نوین گرا کو پلی گارڈ پر حملہ کا حکم آپ نے دیا تھا۔ فرمایا عینیت امام میں ہمارے یہاں جہاد جائز نہیں اس نے کہا اگر امام آ جائیں اور آپ سے لیکن کہ انگریزوں کا قتل عام کرو تو آپ قتل کرنا شروع کر دیں گے۔ فرمایا ان کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ بھی ہونگے انگریزوں نے بغاوت سے انکو بری کر دیا۔ جائیداد واپس کر دی اور دو ہزار روپیہ ماہوار کے لئے مقرر ہو گئی۔

ملکہ وکٹوریا نے حکومتِ ہند کو لکھا کہ کیسے شخص ہیں جو کسی سے نہیں ڈرتے ہم ان کی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں حکومت نے ان کی تصویر بنوا کے ہاتھی دانت کے چوکھٹے میں بھیجی۔ ایک تصویر رزنڈنسی میں تھی جو بعد کو عجائب میں رکھی اس کی نقل جو لوگوں کے پاس اور اس کتاب میں ہے۔

سیرت و کردار کی اس بلندی نے ایک دنیا کو ان کا معتقد بنا رکھا تھا امجد علی شاہ مذہبی آدمی تھے انہوں نے سر عقیدت خم کر دیا اور اپنے اقتدار کا ایک حصہ ان کو سونپ دیا اور بقول راجہ درگا پرشاد پر ان کا حکم جاری ہو گیا اور اس سے دینی فوائد ہوئے۔

عزاداری عزاداری فرمانروایان اودھ نے قائم کی اور اس کو بام عروج تک پہنچایا۔ بانی سلطنت اودھ برہان الملک نے لکھنؤ میں مجلسوں کی بنیاد قائم کی۔ شجاع الدولہ نے محرم میں کپڑے کا امام باڑہ بنایا اور سیاہ نمد کپڑے پہن کے سروں علم لے کے کرتے ہوئے گشت کیا۔

واجد علی شاہ اختر

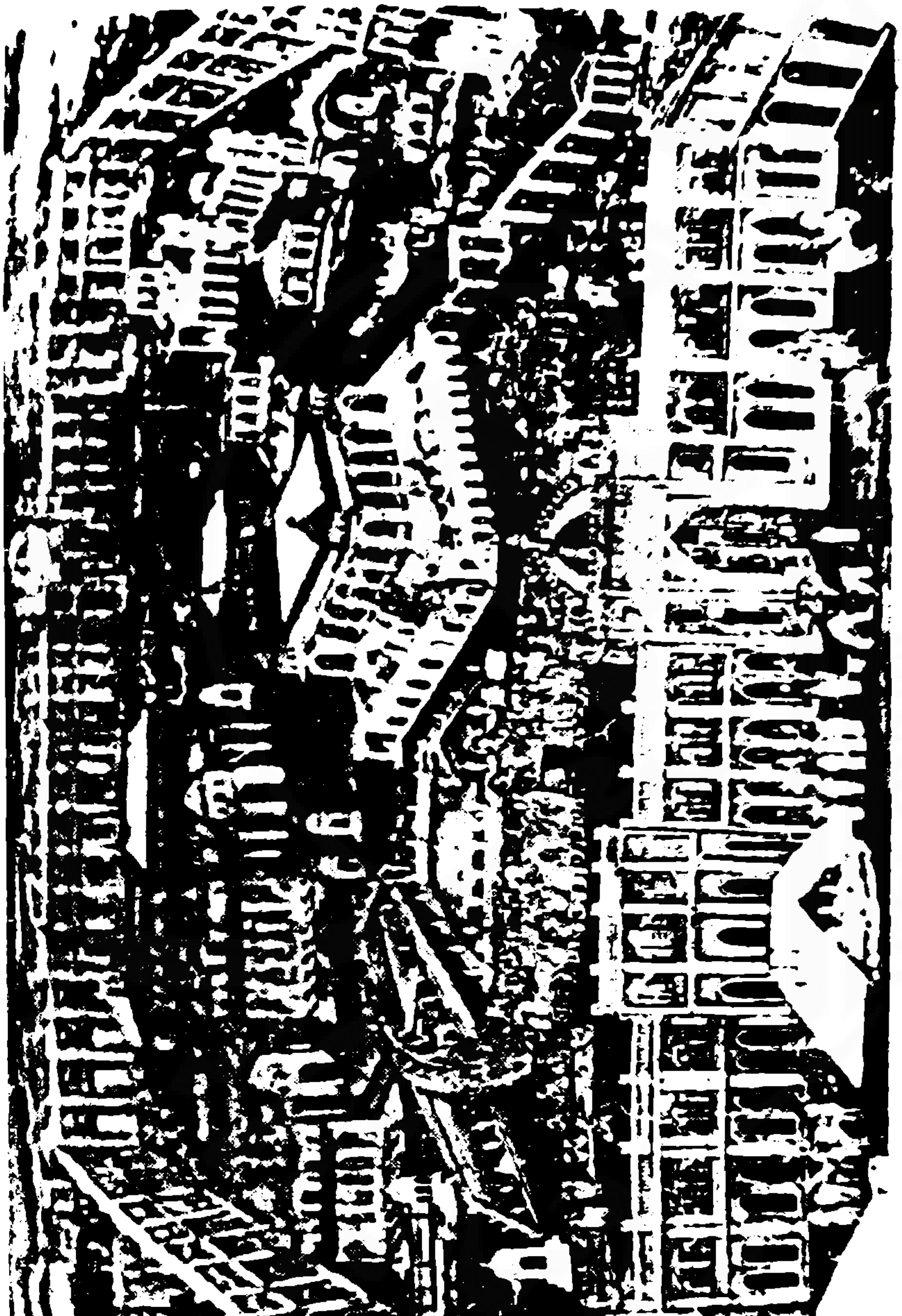

قیصر باغ - لکھنؤ

سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اختر

دس ذی قعدہ ۱۲۳۷ھ تین جولائی ۱۸۲۲ء کو منگل کے دن پیدا ہوئے۔

ان کے دادا محمد علی نصیر الدولہ ۱۲۵۲ھ ۱۸۳۷ء میں بادشاہ ہوئے تو انھوں نے ان کو ناظم الدولہ خورشید حشمت خطاب دیا اس وقت ان کا سن پندرہ برس کا تھا۔ سولہ برس کے سن میں ۱۲۵۳ھ کو ان کی شادی عالم آرا بیگم بنت نواب علی خاں خلف اشرف الدولہ احمد علی خاں ابن یوسف علی خاں صمصام جنگ و زیر السلطنت سے ہوئی اور واجد علی شاہ کی شاہی میں ملکہ عظمیٰ عالم آرا بیگم نواب بادشاہ محل عرف خاص محل کے خطاب سے سرفراز ہوئیں

۱۲۵۸ھ میں محمد علی شاہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے انھوں نے اپنے بڑے بیٹے مصطفیٰ علی حیدر کو ان کے گھر میں نظر بند کر کے معمولی وظیفہ مقرر کر دیا کہ وہ خوشحالی کی زندگی نہ بسر کر سکیں کیونکہ وہ اپنے دادا محمد علی شاہ کو اپنے باپ امجد علی خاں کی طرف سے بھڑکاتے رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ دادا کے بعد حکومت انھیں ملے باپ محروم رہیں اس کی سزا انھیں ملی اور دوسرے بیٹے واجد علی خاں خورشید حشمت کو اپنا ولی عہد بنا کر ابوالمنصور سکندر جاہ سلیمان حشم صاحب عالم بہادر خطاب دیا اور قلمدان کی خدمت سپرد کی۔ اب وہ امور مملکت میں شریک ہو گئے اور ہر روز صبح کو تین گھنٹوں تک داد خواہوں کی عرضداشتیں سنتے اور ان پر احکام صادر کرتے تھے پرچہائے اخبار سنتے اور بازار کا نرخ معلوم کرتے۔

اپنے وظیفہ سے تیس عورتیں اور پچاس ترک سوار نوکر رکھے اور ان دونوں کو فوجی تربیت دے کے اسلحہ سے لیس کیا اور ایسا مشاق بنا دیا کہ انگریزی فوج بھی ان پر رشک کرنے لگی ان دونوں کا افسر محمد شریف خاں کو بنا کر جانباز

سرکاری ولی عہد بہادر کرنیل خطاب دیا انھوں نے ان پر قواعد میں اتنی محنت کی کہ دونوں دستے سیسہ پلائی ہوئی دیوار معلوم ہوتے تھے۔

۱۲۶۳ھ ستائیس صفر ہفتہ کے دن امجد علی شاہ نے انتقال کیا اور ۱۸۴۷ء ابو المنصور سکندر جاہ سلیمان حشم صاحب عالم بہادر واجد علی خاں تخت پر بیٹھے مہاراجہ بالکرشن نے فرمان جلوس پڑھا

مابدولت و اقبال نے باعانت و امداد سرکار کمپنی انگریز بہادر وراثت آبائی تخت سلطنت پر جلوس کیا۔

مجد الدولہ کشتی میں تاج لائے سلطان العلماء سید محمد صاحب مجتہد العصر نے ان کے سر پر رکھا۔ رزیڈنٹ نے انگریزی میں اعلان کیا

اب واجد علی شاہ اودھ کے بادشاہ ہوئے

مہاراجہ جے گوپال ثاقب نے سکہ کیا

سکہ زد بر سیم و زر از فضل و تائید الٰہ

ظلِ حق واجد علی سلطان عالم بادشاہ

سلامی کی توپیں سر ہوئیں نذریں گزریں اور دربار برخواست ہوا۔

اس وقت اُن کی عمر شمسی حساب سے چوبیس برس ساڑھے چھ مہینے اور قمری حساب سے پچیس برس ساڑھے تین مہینے تھی ابو المنصور سکندر جاہ بادشاہ عادل قیصر زماں سلطان عالم محمد واجد علی شاہ لقب اختیار کیا۔

امجد علی شاہ کی نماز جنازہ سلطان العلماء سید محمد صاحب مجتہد العصر نے پڑھائی اور میڈو جان رسالہ دار کی چھاؤنی میں دفن ہوئے۔

دوسرے دن صبح کو سلطان عالم تخت سلطنت پر بیٹھے اور شاہی

قلم سے پانچ اسمائے الٰہی لکھ کے ایک فرمان جاری کیا جس کا ترجمہ یہ ہے :۔

فرمان بنام عمال

"شاہی فرمان صادر کیا جاتا ہے کہ ہر اہل کار پوری دلجمعی اور اطمینان کے ساتھ اپنے عہدہ پر قائم رہ کے احتیاط اور ہوشمندی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے کسی مفسد و سرکش کو سر نہ اٹھانے دے سرکاری واجب مال وصول کر کے بھیجتا رہے اس صورت میں اس پر عنایت کی نظریں پڑتی رہیں گی"۔ [۱]

مصنف اسرار واجدی کا بیان ہے

بعض شاہی ملازمین کے خطاب منصب اور تنخواہ میں اضافہ کیا صرف فوج کے چند نا اہل افسروں کو برخواست کر کے ان کی جگہ مستعد مستحق اور کار آزمودہ ارباب پیکار کو مقرر کیا۔ انصاف سے دیکھو کہ جو لوگ فوج میں مقرر ہوئے کیسے جوان وجیہ قوی اور مستعد کارزار ہیں اہل کاروں میں سے اگر کسی سبب سے کسی سے کام نکال بھی لیا گیا تو اس کی تنخواہ اور عزت برقرار رکھی گئی [۲]

زائر حسین حسینی لکھتے ہیں :۔

جلوس کے تیسرے دن اپنے والد مرحوم کے فاتحہ سوم کی تقریب کے بعد بادشاہ معدلت پروری و دادرسی رعایا پر متوجہ ہوئے عدالت نوشیروانی کی سرسبزی خیال مبارک میں ہوئی

آگے لکھتے ہیں :۔

اہل دربار شاہزادگان و امراء کو حکم ہوا کہ اتوار کو صبح کے وقت

---

[۱] احسن التواریخ [۲] اسرار واجدی قلمی

دربار کے سب لوگ کوٹھی فرح بخش میں حاضر ہوا کریں

روزانہ نو بجے صبح امین الدولہ۔ مہاراجہ مدبر الدولہ۔ دبیر الدولہ اور اہل دفتر خاص در دولت پر دولت خانہ قدیم میں حاضر ہونے لگے۔ وقت ملاحظہ کاغذات ہر ایک حاضر ہوتا تھا بعد دوپہر کے جب نوبت زوال شمسی کی بجتی تھی تو دربار برخواست ہوتا تھا اس کے بعد صحبت خاص مضربان قدیم کی ہوتی تھی۔[1]

منشی رام سہائے جو اس زمانہ کے آدمی ہیں بیان کرتے ہیں:۔

بادشاہ بتعمیل قواعد عدالت طلوع صبح سے آدھی رات تک ایک دم استراحت [illegible] فرماتے اور بملاحظہ عرضداشت [illegible] عملان [illegible] واہل معاملات مرفوعات ارباب حاجات وقراطیس ووقائع بلاد وقریات بسماعت روئداد [illegible] عرض بیگمان وخواہش مندان بحضور خاص بے تعرض وتعلق متوسلان اجرائے احکام وداد [illegible] دہی مستغیثان وتعزیر [illegible] مجرمان وتنقیح مقدمات ملکی ومالی وتقرر وظائف امانی وامالی معروف رہتے ہیں[2]

جلوس کے تین مہینے بعد ۲۲ رجب ۱۲۶۳ھ کو امین الدولہ معزول ہوئے اور انتیس پارچہ کا خلعت وزارت نواب علی نقی خاں کو ملا۔ سفارت کا عہدہ محمد خاں کو تفویض ہوا۔

مشغلۂ سلطانی | مظلوموں کی دادرسی کے لیئے چاندی کے دو صندوق تیار ہوئے ایک پر مشغلۂ سلطانی دوسرے پر عدل نوشیروانی لکھا تھا یہ دونوں صندوق بادشاہ کی سواری کے ساتھ چلتے تھے اور دادخواہ بے روک ٹوک اپنی عرضی اس میں ڈال دیتے تھے۔ بادشاہ خود ان کو کھولتے اور عرضیوں پر

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص۸۲
[2] حسن التواریخ ص۴۳

مناسب احکام لکھتے جن کی تعمیل بلا تاخیر کی جاتی تھی اس سے بد دیانت اہل کاروں کی قلعی کھلنے لگی تو انھوں نے اس میں فتنہ انگیز باتیں لکھ کے ڈالنا شروع کیں جو طبیعت پر گراں گزرنے لگیں اور مجبور ہوکے اس کو بند کرنا پڑا۔

نظام حکومت میں تبدیلی | تاریخ نادر العصر کا مؤلف لکھتا ہے۔

بادشاہ جب تخت نشین ہوئے تو یہ منظور تھا کہ تمام علاقہ جات امانی ہو جائیں تمام تعلقہ دار و زمیندار زر آمدنی خزانہ سلطانی میں داخل کیا کریں۔ ناظم اور چکلہ دار موقوف ہو جائیں کہ وہ رعایا سے زیادتی کرتے ہیں اس سے رعیت تباہ اور سرکاری نقصان ہوتا ہے لیکن اہل کاروں نے اس حکم کو جاری نہ ہونے دیا۔

ملک کا آئین | بادشاہ نے ملک کا ایک آئین مرتب کیا اور اس کا نام دستور واجدی رکھا یہ ظاہر ہے کہ نہ کوئی کونسل تھی نہ کوئی مجلس مشاورت نہ ان کے پاس ایسے بیدار مغز آدمی تھے جن کی اس کو ضرورت تھی۔ انھوں نے ہر کام اپنی طبیعت سے کیا ملک کا آئین بھی ان کی بیدار مغزی رعایا پروری عدل و انصاف اور حکمرانی کی صلاحیت کا مظہر ہے جو چھپا ہے دفعات پر مشتمل ہے اس کا نام دستور واجدی ہے اس کو پورا لکھنا طوالت سے خالی نہیں صرف فہرست پیش کی جاتی ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے یہ دستور کتنا عدل و انصاف رعایا پروری اور ملک کے نظام کی چستی و درستی کا ضامن ہے ملک کے بہترین انتظام کا کوئی گوشہ چھوٹا نہیں ہے۔ اگر کوئی تفصیل دیکھنا چاہے تو وزیر نامہ ملاحظہ کرے

دستور واجدی

دستور اول متضمن فائدہ کثیر در فاہ حال ہر صغیر و کبیر

دستور دوم	درباره مستروان و استیصال بنیان ظلم و فساد
دستور سوم	حکم بنام عاملان و داروغگان درباره عجلت تصفیه مقدمات
دستور چهارم	درباره رفع مقدمات مستغیثان علی الخصوص انگریزی و بنام امنا
دستور پنجم	طلب فهرست ہای مقدمات منفصله و غیر منفصله
دستور ششم	مقدمه منع قبض و تحصیل زر متعلق داران پیش از شگون
دستور ہفتم	درباره تقرر تحصیل‌داران امانی و دستور برای ایشان
دستور ہشتم	درباره تصفیه مقدمات بلا رعایت و حکم بنام استاد و مفتیان
دستور نہم	درباره رفع تعدیہای مردم فوج جنگی و نظامت و حکم بنام افسران فوج
دستور دہم	درباره امتناع اجرای قبالجات را بحکام محکمه سوای عدالت العالیه
دستور یازد	درباره انتظام و منع رشوت و دیگر ہدایات
دستور دوازدہم	درباره قانون ہولی و منع ہزل و یاوه سرائی ۔
دستور سیزدہم	درحال منع ستی شدن ہندو زنان ۔
دستور چہاردہم	درباب آسائش رعایا و عامه برایا حکم بنام کارکنان سلطنت
دستور پانزدہم	درباب آسائش رعایا و تسہیل گذشتن عرائض و حکم بنام ارکان دولت
دستور شانزدہم	درباره استکشاف حال فوج ظفر موج و حکم بنام وزیر اعظم
دستور ہفت دہم	درباب رفع تکرار معروضات و موقوفی اخبار غیر ضروری
دستور ہژدہم	متضمن رفع عذرات مستغیثان انگریزی و حکم بنام متوسط
دستور نوزدہم	درباب آداب شناسی دربار معلی و حکم بنام داروغه دیوان عام
دستور بستم	مشعر ارزانی غله که رفاه خلائق در آن ست و طلب نرخہا از نواح
دستور بست و یکم	به مضمون صدور ورود حکم بنام کوتوالان وغیره

دستور بست و دوم	متضمن سرعت تعمیل احکام و تعزیر [illegible] و وصول جوابات علی الفور در مقدمات انگریزی
دستور بست و سوم	در باب ممانعت بیع و شری زمین داری و نانکار بے حکم۔
دستور بست و چهارم	مشعر رفع خلاف امر خستگی و منع رسید بے وصول زر۔
دستور بست و پنجم	متضمن تنبیه راجپوتان تبه کار که دختران نوزاد را می کشند۔
دستور بست و ششم	انتظام میله و اهل میله و ممانعت محصول غیر واجبی۔
دستور بست و هفتم	بمقدمه سزا و رفاه رعایا و حکم بنام شرف الدوله بهادر۔
دستور بست و هشتم	درباره تدارک وزدان ییلی و نهاری و حکم بنام حسنه بیت السلطنت لکهنؤ۔
دستور بست و نهم	محتوی انتظام در بخشی گری و رفاه مردم فوج و امتناع رشوت
دستور سی ام	درباره انتظام و حفاظت مسافرین از دست هرکارگان و جراییان
دستور سی و یکم	مشعر تهدید رصینه داران که امور دولت خواهی فروگزاشت نسازند و حکم بنام عاملان
دستور سی و دوم	محتوی انتساق واسته راک وارادت و مطالیفت آن از اخبار۔
دستور سی و سوم	حکم بنام کوتوال جهت خالی نداشتن مکانی تا دزدان مخفی نه نشینند۔
دستور سی و چهارم	متضمن رفع بدعات زمین داران و گذربانان۔
دستور سی و پنجم	درباب محصول باغات جدید و منع اغراس۔
دستور سی و ششم	درباب رفع تکلیف بیوپاریان و اجازت رفتن بهر گنجینه که بهتر دانند
دستور سی و هفتم	مشعر رفع شکایت صاحب ریزیڈنٹ بهادر بابت هرکارها۔
دستور سی و هشتم	درباره مستغیثان کاذب و مفتریان باطل ستیز۔

دستور سی و نهم	بمقدمۂ ممانعت تعرض از تھانہ داران عمل کمپنی انگریز بہادر
دستور چہلم	درباب منع رشوت ستانی و انتظام فوج ۔
دستور چہل و یکم	دربارۂ انتظام عشرۂ محرم الحرام و ہدایت ۶ اداری ۔
دستور چہل و دوم	بمضمون صدر ۔
دستور چہل و سوم	برائے اضافی سرحدی مشتمل بر دوازدہ دفعہ
دستور چہل و چہارم	دربارۂ نظم و نسق و حکم بنام عاملان
دستور چہل و پنجم	درباب رفاہ رعایا و ہدایت بعاملان
دستور چہل و ششم	درباب سرعت ارسال جوابات مستغیثان
دستور چہل و ہفتم	دربارۂ منع آبرو ریزی و قطع اعضا بعد قید و حکم بنام عاملان
دستور چہل و ہشتم	دربارۂ رفاہ و دادرسی رعایا ۔
دستور چہل و نہم	دربارۂ تحقیق امور حضور تحصیل و انکشاف غائلہ جمع
دستور پنجاہم	دربارۂ اسلحہ بستن و روش و آمد و رفت سپاہیان سلاح بند ۔
دستور پنجاہ و یکم	دربارۂ انتظام فوج و حکم بنام میر بخش ۔
دستور پنجاہ و دوم	دربارۂ رفع نالش ہائے بے اصل ۔
دستور پنجاہ و سوم	دربارۂ امنائے سرحد و دستورات مشتمل بر چند فصل ۔
دستور پنجاہ و چہارم	دربارۂ اقرارنامہ
دستور پنجاہ و پنجم	ہدایت نامہ برائے عاملان ۔
دستور پنجاہ و ششم	جہت انتظام ملک و حکم بنام ناظمان
دستور پنجاہ و ہفتم	ضمیمۂ دستور پنجاہ و پنجم بے شمار مذکورہ دربارۂ قبولیت و تحریر آں ۔
دستور پنجاہ و ہشتم	رفع متنازع بطور سرسری

دستور پنجاہ و نہم — بمقدمہ اخبار و اخبار نویسان

دستور شصتم — دربارۂ حال میلہ و انتظام آں مع دیگر کوائف

دستور شصت و یکم — دربارۂ رہن نامہ و بیع نامہ سلطانی و اشتہار بقیہ میعاد سہ ماہ

دستور شصت و دوم — ہدایت نامہ سنہ دوم جلوس میمنت مانوس مطابق ۱۲۶۵ھ

دستور شصت و سوم — دربارۂ مال گزاران نادہند۔

دستور شصت و چہارم — بمقدمۂ انضباط دستور پوشاک و لباس۔

دستور شصت و پنجم — دربارۂ موقوف کردن سائبان پیش دکاکین۔

دستور شصت و ششم — دربارۂ منع کبیر خوانی و آبرو ریزی

عسکری نظام

پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب نے واجد علی شاہ پر ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے جس کا نام واجد علی شاہ ہے اس میں ان کی فوجی سرگرمیوں کے متعلق لکھتے ہیں

بادشاہ ہونے کے بعد سب سے پہلے فوج کی درستی کی طرف توجہ کی۔ لوگ رشوت دے کر فوج میں ملازمت حاصل کر لیا کرتے تھے۔ بادشاہ نے تخت نشینی کے پہلے ہی سال ۱۸۴۷ء کے آخر میں سخت احکام نافذ کیے کہ اگر کسی فوجی افسر نے یا دفتر بخشی گری کے کسی اہل کار نے ایک حبہ بھی رشوت میں لیا تو اس کو ایسی سخت سزا دی جائے گی جس سے دوسروں کو عبرت ہو اسی سال فوجیوں کو جدید اسلحہ اور عمدہ وردیاں دی گئیں۔[1]

---

[1] بھٹناگر ص ۱۳۴

بادشاہ نے کئی نئی پلٹنیں اور رسالے بھرتی کیئے۔ جلوس کے تیسرے سال ۱۲۶۶ھ میں جو شاہی رسالے اور بٹالینیں وغیرہ تھیں ان کے نام یہ ہیں:۔

رسالے ۔ سلطانی، غازی، منصوری، غضنفری، اسدی، دکھنی، بانکا، ترچھا، حسینی، حیدری، بادشاہی، خاقانی خسروی اور رسالہ یکہ ہا۔

نجیبوں کی بٹالینیں: داؤدی۔ عباسی، جعفری، ذوالفقار، شمشیر حسام، رفعت، ظفر عنایت، کاظمی، قیصری، فتح جنگ علی غول صفدری جرار، فتح عیش، ناصری، فغفوری، ساونت، بھرمار

تلنگوں کی بٹالینیں: تاص دل، گھنگھور، جاں نثار، فتح مبارک، سروری، جانباز اکبری، سکندری، خاقانی، سلیمانی، جہاں شاہ، گلابی، ظفر مبارک

توپ خانے:۔ توپ خانہ خسروی، توپ خانہ کلاں۔ توپ خانہ باغ براون، توپ خانہ قصر سلیمان، توپ خانہ بالک گنج، توپ خانہ عنایتی۔ توپ خانہ جہاز سلطانی اور ایک توپ خانہ جس کے میر آتش مہدی قبول تھے۔ تفصیلات تزوک شاہی سے ماخوذ ہیں۔ اسی کتاب میں فوج کے مختلف منصوبوں پر فائز ناٹمی افسروں کے نام بھی دیئے ہوئے ہیں[۵۲] جو طوالت کی وجہ سے نظر انداز کیئے گئے۔

وزیر نامہ کے مصنف نے واجد علی شاہ کی فوجی سرگرمیوں کا آنکھوں دیکھا حال جو فارسی نثر و نظم میں تفصیلات اور تمثیلات کے ساتھ بہت طول دے کر بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیم فوجوں کی ترتیب و تنظیم کے بعد کئی نئی فوجوں کا اضافہ کیا اور ان کے نام زبان اردو میں بانکا، ترچھا، گھنگھور، اختری نادری وغیرہ رکھے

---

[۵۲] تزوک شاہی ص ۹۰۶

ان کی تعلیم کے لیے قواعد کے الفاظ و احکام فارسی میں خود اختراع کیے۔ سپاہیوں کے لیے رنگ رنگ کی بانات اور مخمل کی وردیاں بنوائیں۔ ان کے ساز و سلاح آئینوں کی طرح چمکتے تھے۔ زر نگار و رنگین علموں سے میدان کارزار رشکِ بہار معلوم ہوتا تھا۔ خود بدولت نماز صبح پڑھ کے جنگی لباس پہن کے گھوڑے پہ سوار ہو کے فوج کا معائنہ فرماتے اور سپاہیوں کو قواعد کرواتے تھے۔ آفتاب کی تپش اور میدان کے گرد و غبار میں تین تین چار چار گھنٹے مردانہ سرگرمیوں میں عرق ریزی کرتے تھے اور تفنگ آزمائی، نیزہ بازی، شمشیر زنی اور گولہ اندازی کی ورزشیں ملاحظہ فرماتے تھے۔ جن نوجوانوں کا کام امتحان کی کسوٹی پر پورا اترتا تھا ان کو شاہانہ انعامات اور مناسب القاب و خطاب سے نوازتے تھے۔[1]

آفتاب اودھ کا مصنف عہد واجدی میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ وہ بادشاہ کی معزولی کے بعد لکھتا ہے :-

> "حضرت بادشاہ کے مزاج میں شوق ایجاد ہائے تازہ بہت تھا جیسے کہ پوشاک و لباس و عمارات اور ان کی آراستگی میں ایسے عمدہ عمدہ ایجاد کیے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ ویسے ترتیب فوج بھی بہ آئین تازہ ہوئی تھی یعنی قواعد زمرہ زبانِ فارسی میں ایجاد ہوئے تھے اور بانکے دو رسالے ترک سواروں کے اور اخگری اور نادری دو پلٹنیں تلنگوں کی بموجب ہدایت اور تعلیم خاص بادشاہ کے اسی قانون کے موافق کام کرتی تھیں خود بدولت ہر روز قواعد کا کام لیتے تھے اور بول چال سکھاتے تھے۔"[2]

---

[1] روزنامہ ص ۱۱۔۲۲۔۱۲ [2] آفتاب اودھ قلمی

فوجی قواعد کی چند فارسی اصطلاحیں یہ تھیں راست رو دست چپ بگرد برخ[1]

ایک واقف حال مصنف جس کی کتاب کا نام معلوم نہیں ہو سکا اس کا بیان ہے

"جو سپاہ حاضر رکاب رہتی تھی اُس کو نیزہ بازی، تفنگ اندازی، آتش خانہ اور صفوں کی آراستگی کے قواعد سکھانے میں بذات خود متوجہ ہوئے اور شدید گرمی اور انتہائی سردی میں دو دو پہر کھڑے رہ کر بیا و برو بزن و بکش کے لفظوں سے جدید طریقے تربیت کی ہے۔ اور خود بھی بہ نفس نفیس فنون سپہ گری یعنی شہسواری چوگان بازی، تلوار، بندوق، تیر اور نیزے کے کام میں یکتائے روزگار ہیں"۔[2]

واجد علی شاہ کی فوجی سرگرمیوں کے بارے میں ایک اہم بیان اور پیش کیا جاتا ہے۔

"جب امجد علی شاہ بادشاہ لکھنؤ نے ۱۸۴۷ء میں انتقال کیا تو واجد علی شاہ ان کے جانشین ہوئے۔ جو فوج کی تنظیم میں ہمہ تن منہمک ہو گئے۔ احکام صادر کئے گئے کہ نماز صبح کے بعد ۵ بجے لکھنؤ کی تمام رجمنٹوں کو روزانہ پریڈ کرنا ہوگی۔ بادشاہ کا معمول تھا کہ وہ جنرل کی وردی میں فوج کو روزانہ چار پانچ گھنٹے قواعد کراتے تھے۔ مزید برآں انھوں نے یہ حکم صادر کیا کہ اگر سلطنت کی فوج کے علاوہ وہ پریڈ میں غیر حاضر ہوں تو ان پر دو ہزار روپیہ جرمانہ کر کے فوج میں تقسیم کر دیئے جائیں اور اگر کوئی رجمنٹ پریڈ میں وقت پر

---

[1] کتاب گم نام مطبوعہ [2] گزشتہ لکھنؤ ص ۶۷

نہ پہنچے تو اس پر بھی اتنی ہی رقم جرمانہ کی جائے۔ پیادوں کے دو دستوں اور سواروں کے ایک رسالے کو مزید سزا کے طور پر دن بھر مسلح رہنا پڑا تھا

" بادشاہ کے اس انہماک سے بدگمانی پیدا ہوئی۔ انگریز ریذیڈنٹ نے فوج مہیا کرنے میں اتنی جاں فشانی کرنے کا سبب دریافت کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ اگر بادشاہ کو اپنے ملک کے تحفظ کے لیے فوج کی ضرورت ہے تو ان کو انگریز سپاہی رکھنا چاہئیے، جن کی تنخواہ اودھ کے محاصل سے دی جائے " [۱۵]

فوجی اصلاحات کے معاملے میں بادشاہ کی پرجوش سرگرمی نہ ریذیڈنٹ کو پسند تھی نہ انگریزی حکومت ہند کو۔ حکومت ہند کے سکریٹری برائے امور خارجہ نے ریذیڈنٹ کو ہدایت کی کہ وہ بادشاہ کے ذہن نشین کر دے کہ وہ فوجی مصارف جو مالیات کو تباہ کر رہے ہیں ان میں تخفیف کرنا کتنا ضروری ہے [۱۶] اس کے کچھ دن بعد گورنر جنرل نے بادشاہ کو لکھا کہ اودھ میں اتنی بڑی فوج رکھنا ۱۸۰۱ء کے معاہدہ کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس کے مطابق صرف چار بٹالین پیادے ایک بٹالین نجیب اور میواتی، تین سو گولہ انداز اور مناسب تعداد میں پولیس رکھی جا سکتی ہے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ اب اودھ میں چار سو توپیں، پانچ ہزار توپچی، چار ہزار سوار اور چوالیس ہزار پیادے ہیں [۱۷]

بادشاہ چار سو سواروں کا ایک حفاظتی دستہ مقرر کرنے کا انتظام کر رہے تھے تو ریذیڈنٹ نے ایک سخت نوٹ لکھا کہ مجھے آپ سے بتاکید کہنا پڑتا ہے کہ اپنی فوج میں اضافے کا خیال ترک کر دیجیے کیوں کہ اس سے آپ کے مالیات میں دشواری ہو رہی ہے [۱۸]

I. C. T. METCALFE: TWO NATIVE NARRATIVES OF THE MUTINY IN DELHI

۱۵ بھٹناگر ص ۴۳

۔ بادشاہ ریذیڈنٹ اور حکومت ہند کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے فوجی سرگرمیاں ترک کر دیں۔

انگریز اودھ پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھے۔ وہ اودھ کی فوجی طاقت بڑھتے ہوئے کیوں کر دیکھ سکتے تھے۔ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ رزیڈنٹ کی مخالفت کے باعث واجد علی شاہ کو فوجی سرگرمیاں ترک کرنا پڑیں۔ آفتاب اودھ کے مصنف کا بیان ہے

"ایک روز نواب علی نقی خاں بہادر وزیر اعظم نے عرض کیا کہ قبلۂ عالم یہ آراستگی فوج خلاف مزاج صاحب رزیڈنٹ بہادر کے ہوتی ہے چونکہ ہر طرح اطاعت سرکار انگریزی ملحوظ خاطر شاہی تھی، لہٰذا اس روز سے بالکل اس طرف سے کنارہ کیا۔"

احسن التواریخ، نادر العصر اور بعض دوسری تاریخیں بھی اسی مضمون کو دہراتی ہیں۔ واجد علی شاہ ص ۳۵ تا ۳۹

بادشاہ نے خود کہا ہے :-

ابتدائے سلطنت میں میرا جی چاہتا تھا کہ اپنی افواج کی حالت درست کروں اور ان کی نگہداشت کروں اور میں نے اپنے محافظ دستے کی ترتیب بھی شروع کر دی تھی مگر چونکہ یہ کرنل رچمنڈ کو ناگوار گزرا اس لئے میں نے اس سے کلیتاً ...

واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے وقت کمپنی کو اودھ پر قبضہ کرنے کا خیال نہ تھا۔ اس کا پنجاب کے وسیع علاقہ پر دانت تھا۔ ۱۸۴۹ء میں اس نے سکھوں کو زیر کر کے پنجاب پر قبضہ کر لیا اور اودھ کا سرسبز علاقہ ڈیڑھ کرور کی نکاسی کا کمپنی کی حکومت کے بیچ میں آگیا۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ خطہ کمپنی کو مل جائے تو اس کی حکومت کے بیچ میں کوئی حکومت نہ رہے گی اس کا رقبہ بڑھ جائے گا اور کمپنی کی آمدنی میں ڈیڑھ کرور کا ...

ہو جائے گا۔

واجد علی شاہ فروری ۱۸۴۷ء میں تخت نشین ہوئے ابھی صرف دس مہینے گذرے تھے کہ نومبر ۱۸۴۷ء لارڈ ہارڈنگ پنجاب سے لکھنؤ آیا اور بادشاہ سے کہا کہ آپ کی حکومت میں بد نظمی پھیل ہوئی ہے اور دو برس کے اندر آپنے ملک کا انتظام درست نہ کیا تو کمپنی اس پر قبضہ کرے گی۔ تین مہینے کے بعد بادشاہ نے کرنل رچمنڈ رزیڈنٹ سے کہا کہ کمپنی کے مقبوضات میں جو نظام ہے وہ مجھ کو لکھ کے دیدیجئے وہی نظام میں اپنے ملک میں نافذ کروں گا۔

رزیڈنٹ نے اپنے اسسٹنٹ کپتان برڈ کو آگرے بھیج کے مسٹر تھامسن لفٹنٹ گورنر کے مشورے سے ایک نظام مرتب کیا اور وزیراعظم علی نقی خاں کو دکھایا انھوں نے اس کو بغیر کسی ترمیم کے منظور کر لیا۔ رزیڈنٹ نے اسکی منظوری کے لیئے سپریم ایلیٹ کرٹیری گورنمنٹ کو بھیج دیا۔ ۱۸۴۸ء میں لارڈ ہارڈنگ لندن چلا گیا ڈلہوزی جو پہلے سے آچکا تھا گورنر جنرل ہوا اب وہ نظام جو کرنل برڈ اور لفٹنٹ گورنر تھامس کے مشورے سے بنا تھا اور علی نقی خاں نے منظور کر لیا تھا اس کے سامنے منظوری کے لئے پیش ہوا اس نے اس کو نامنظور کردیا اور اودھ پر قبضہ کا منصوبہ بنایا۔

کرنل سلیمن انگریزی حکام میں ٹھگوں اور ڈاکوؤں کو گرفتار کرکے ایک کارگذار افسر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکا تھا۔ ڈلہوزی نے اس کو لکھا

مقام گورنمنٹ ہاؤس

تاریخ ۱۱ ستمبر ۱۸۴۸ء

میرے پیارے سلیمن

اب میں ایسے انتظام کی تجویز پیش کرتا ہوں جو نہ صرف آپ کی طبیعت کے

موافق ہوگی بلکہ آپ کی خدمات کو کمپنی کے لیے مفید ثابت کرے گی گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ نے جو خط اکتوبر ۱۸۴۷ء میں شاہ اودھ کو لکھا تھا اس میں بتا دیا تھا کہ اگر دو برس کے اندر انھوں نے سلطنت کی حالت درست نہ کی تو انتظام سلطنت ان کی طرف سے برٹش گورنمنٹ اپنے ہاتھ میں لے لیگی۔

اس کی بہت کم امید ہے کہ اکتوبر ۱۸۴۹ء تک کوئی اصلاح ہو سکے ایک وسیع زرخیز اور مظلوم ملک کے داخلی نظم ونسق کو از سر نو درست کرنا اس افسر کا کام ہے جسکے سپرد یہ خدمت کی جائے باوجود دقت طلب ہونے کے نہایت ہی اعلیٰ فریضہ ہے اور گورنمنٹ نے ایک بہترین افسر کو اس کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ میں آپ کو لکھنؤ کے رزیڈنٹ کے عہدے کی پیشکش کرتا ہوں۔ خاص طور سے ان عظیم تبدیلیوں کے پیش نظر جو عنقریب ہونے والی ہیں۔

آپ کا صادق الوداد ڈلہوزی

۱۸۴۹ء میں کرنل سلیمن رزیڈنٹ ہو کے لکھنؤ آیا اس وقت بادشاہ امراض دماغی وقلبی میں مبتلا تھے۔ طبیبوں نے حکومت کے کاموں سے روک دیا تھا۔ سلیمن بادشاہ کی بیماری کا حال برابر لکھ کے بھیجتا رہا اور یہ بھی زیر غور آیا کہ بادشاہ کی حالت اگر اور بگڑے تو انھیں پاگل قرار دیدیا جائے اور اگر بادشاہ مرجائیں تو کیا انتظام کیا جائے اور اگر وہ صحتیاب ہوجائیں تو اودھ کے انتظام کے لیے ایک بورڈ بنایا جائے۔ سلیمن یہی نہیں چاہتا تھا کہ بورڈ بنا دیا جائے جس کا صدر میں ہوں اس طرح اودھ کا مقتدر اعلیٰ بن جاؤں ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ ڈلہوزی نے دوسری جنگ برما چھیڑ دی اور اودھ کی طرف سے اسکی توجہ ہٹ گئی اس عرصہ میں دو برس کے بعد بادشاہ کو صحت ہوگئی اور انھوں نے انتظام سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

مملکت کا نظم و نسق

عدالتی نظام | اکسٹھ عدالتیں قائم کیں اُن پر مفتی مقرر کئے عدالتوں کے ماتحت بہتر آمین تھے جو معاملات کی تحقیقات اور فیصلوں میں مدد کرتے تھے کہ کوئی مقدمہ میں خلاف انصاف فیصلہ نہ ہونے پائے۔ انصاف میں یہ اہتمام کسی زمانہ میں دنیا میں کہیں نہ تھا۔

خاص لکھنؤ میں کئی عدالتیں قائم تھیں اٹرم نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے

عدالت عالیہ سب سے بڑی عدالت ہے جو سلطان العلماء مجتہد العصر کی ہے۔

دیوانی کی تمام عدالتیں سلطان العلماء کے بڑے بیٹے محمد باقر الدولہ کی ماتحتی میں تھیں۔

عدالت شاہی بادشاہ کی ہے مگران کے نمائندے نجم الدولہ فیصلہ کرتے ہیں

عدالت دیوانی وزیر السلطنت کے ذمہ ہے مگران کی جانب سے وزیرخاں کام کرتے ہیں۔

عدالت خفیفہ میں قرضوں کے چھوٹے چھوٹے مقدمات فیصل ہوتے ہیں

عدالت مخصوصہ معتمد راجہ کندن لال کے سپرد ہے مگر پورن چند ان کی مدد کرتے ہیں۔

تین عدالتیں علی واجد محمد امین اور محمد حیات کے ماتحت ہیں ان میں مقدمات کی سماعت ہوتی ہے جن میں ایک فریق سرکار برطانیہ کا ملازم ہوتا ہے۔

ان سب عدالتوں کی اپیل مجتہد العصر سلطان العلماء کے سامنے

پیش ہوتی ہے۔ ادنیٰ درجون کی عدالتوں کا ذکر ضروری نہیں سمجھا گیا۔
مرأۃ الاوضاع کے مصنف کا بیان ہے :۔

اخذ محصول بیع و شری، ایں مکانات انفصال مقدمات قرضہ جات تنازع مکانات و تقسیم ترکہ کے مقدمات عدالت عالیہ سے متعلق ہیں اس کے لئے قاضی مذہب اثنا عشریہ اور حنفیہ کے صاحب مراءۃ الاوضاع نے یہ ہے لکھا ہے

قاضیوں کا مخصوص محکمہ تھا جن کے سربراہ عمدۃ العلماء مولانا سید محمد ہادی سلطان العلماء کے بھتیجے تھے انھوں نے سنی شیعہ اور ہندو مفتی قاضی مقرر کئے تھے جو اپنے فرقہ کے مذہب کے مطابق فیصلے کرتے تھے

محکمۂ اخبار | ایک سپرنٹنڈنٹ کی نگرانی میں اخبار نویس تھے جو مختلف محکموں کی کارکردگی اور حکام کے نیک و بد کی اطلاع دربار میں پہنچاتے تھے۔ اضلاع میں بھی ہرکارے مقرر تھے کوئی سرکاری سررشتہ ایسا نہ تھا جس پر ہرکارے معین نہ ہوں یہ اپنی رپورٹیں دارالاخبار کے افسر اعلیٰ کے پاس پہنچاتے رہتے تھے اور وہ حضور شاہی میں پیش کرتے تھے اس طرح ملک کے چپہ چپہ سے بادشاہ باخبر رہتے تھے۔

ان اخبار نویسوں کی تعداد چھ سو تھی جو اہم خبریں براہ راست فوراً بادشاہ تک پہنچاتے تھے۔

اس کے علاوہ تمام نظامتوں تحصیلوں اور تھانوں سے روزنامچوں کی کی نقلیں دفتر اعلیٰ میں پہنچتی تھیں اور وزیر کے سامنے پیش ہوتی تھیں اور وہ سزاؤں اور صلحناموں کو تحقیقات کے لیئے اپنے نائبوں کے پاس بھیجدیتے تھے کسی قسم کے

مقدمہ کی سماعت کی فیس نہ تھی نہ کسی جرم کا کوئی جرمانہ تھا

پولیس کا محکمہ | ہر نظامت میں پولیس ناظم کے ماتحت تھی لکھنؤ میں پولیس کوتوال شہر کے ماتحت تھی پولیس کا کام صرف مجرموں کی گرفتاری ہی نہ تھا بلکہ وہ تحقیقات کے بعد سزا بھی دے سکتی تھی ایک سرحدی پولیس بھی تھی جس میں سات سو سپاہی اور ڈیڑھ سو سوار تھے ان کا کام ان چوروں اور ٹھگوں کو گرفتار کرنا تھا جو واردات کر کے انگریز عملداری میں بھاگ جاتے تھے یا انگریزی عملداری میں واردات کر کے اودھ میں بھاگ آتے تھے۔ پولیس کا یہ شعبہ اپنی اعلیٰ کارکردگی میں مستعد تھا۔

محاصل کی وصولی | ملک امانی کر دیا گیا تھا ہر ماہ کی تیرہ تاریخ کو مالیہ کی قسط جمع ہوتی تھی اور اہل کاروں کی کاہلی برداشت نہ تھی۔

فوج پر انگریزی فارغ کر چکا تھا پھر بھی اس کی وردی اسلحہ اور قواعد کا انتظام تھا

کہاروں کا انتظام | سیکڑوں کہار تھے ان کی باناتی وردیاں سر پر پگڑی ایک سیر سونے کی زنجیر اس زنجیر میں چھوٹی چھوٹی لڑیاں اس میں سونے کی مچھلیاں لٹکتی تھیں

فیل خانہ کا انتظام | دو سو ہاتھی بادشاہ کی سواری کے تھے جن پر گنگا جمنی ہودے اور زربفت کی جھولیں تھیں۔ فیل بانوں کی سنہری وردیاں کمر میں سبز پٹیاں تھیں۔

گھوڑے | دو ہزار گھوڑے ساز و یراق سے آراستہ تھے۔

کبوتر خانہ | ڈیڑھ لاکھ عمدہ قسم کے کبوتر تھے۔

شاہی کتبخانہ | بادشاہ کو تصنیف و تالیف کا غیر معمولی ذوق تھا اس کے لئے کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ دو لاکھ کتابیں کتب خانہ میں موجود تھیں اس پر بھی ان کے نزدیک کم تھیں جلوس کے پہلے سال انھوں نے اشتہار جاری کیا ـــ

کتب فہرست مفصلہ ذیل کا ہر نسخہ ذی قعدکی چوبیس تاریخ تک محمد حسین مہتمم مطبع سلطانی تک پہنچا دیا جائے بشرط پسند قیمت خاطرخواہ دی جائے گی۔ کتبخانہ کے عملہ پر ہزاروں روپیہ صرف ہوتا تھا۔

بادشاہ کے ذاتی اوصاف

عدل وانصاف | مورخین متفق ہیں کہ واحد علی شاہ عدل وانصاف میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے ان کے عدل کے واقعات ایسے اہم ہیں کہ دوسرا اہل اکثر اس منزل میں ثابت قدم نہیں رہ سکتا تھا مگر وہ ہمیشہ آزمائش پر پورے اترے۔

۲۷ صفر ۱۲۶۷ھ کو بادشاہ کے حضور میں پرچہ اخبار گزرا کہ نواب نشاط محل کے عزیز میر محمد باقر کے حکم سے ان کے نوکر نے ایک ہندو کے سر پر تلوار کا قبضہ مارا جس سے وہ مرگیا۔ پرچہ پر حسب ضابطہ وزیراعظم نے حکم لکھا تھا کہ مصلح السلطان صحیح حالات تحقیق کرکے پیش کریں۔ بادشاہ نے کہا کہ وزیراعظم اور داروغہ دیوانخانہ نشاط محل کے توسل کی وجہ سے انصاف نہ کریں گے میں خود اس مقدمہ کا فیصلہ کروں گا نشاط محل نے یہ سنا تو حضوری کی اجازت چاہی جو نامنظور ہوئی اور فرمایا کہ روبکاری کے بعد حکم شرع جاری ہوگا۔ مقتول کی عورتیں بڑی خاطر اور عزت کے ساتھ نشاط محل کے پاس لائی گئیں انھوں نے ان کے قدموں پر سر رکھ کر معافی کی درخواست کی محل کی تمام عورتیں یہ دیکھ کے لرز گئیں انھوں نے بھی ان کے قدموں پر سر رکھ دیئے ان عورتوں نے آٹھ سو روپیہ لے کر راضی نامہ لکھ دیا۔ یہ راضی نامہ بادشاہ کے

ملاحظہ کے لیئے پیش کیا گیا اور یقین دلایا گیا کہ تلوار کا قبضہ قتل کے ارادے سے نہیں مارا گیا تھا اس کی موت اتفاقی ہے۔ ارشاد ہوا کہ جو حکم شرع ہے وہ ضرور جاری ہوگا اور کسی کی سفارش نہ سنی جائے گی اس واقعہ کی اتنی اہمیت لوگوں کی نظر میں ہوئی کہ اسکی تاریخ عدالت خاقانی نکالی گئی جو اس واقعہ کے غیر معمولی ہونے کی دلیل ہے۔

اس طرح کا ایک دوسرا واقعہ ہے ایک موضع میں ابراہیم خاں اور جہانگیر خاں کا ایک باغ ان کا ذریعہ معاش تھا۔ بادشاہ نے وہ موضع خسرو محل کی جاگیر میں دیدیا ان کے داروغہ نے اس باغ پر قبضہ کر لیا اور کچھ درخت بھی کٹوا لیئے۔ ان دونوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر کسی نے ان کی فریاد نہ سنی آخر تنگ آ کے بادشاہ کی خدمت میں درخواست لکھی۔ خسرو محل کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے بادشاہ سے بہت منت سماجت کی وہ بادشاہ کی منظور نظر تھیں مگر ارشاد ہوا کہ امور عدالت میں تمہاری رعایت نہیں کی جائے گی اور تحقیق کے بعد ان کا باغ واپس کرنے کا حکم دیا

ایک دن بادشاہ باغ کی سیر کر کے واپس آ رہے تھے کہ ایک بڑھیا نے اپنے کو گھوڑے کے سموں میں ڈال دیا۔ بندگان شاہی نے دریافت حال کر کے عرض کیا کہ اسکی ایک نوجوان لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ گاؤں کا زمیندار اس کے گھر میں گھس کر لڑکی کو اٹھا لے گیا۔ یہ سُن کر بادشاہ غصے سے کانپنے لگے زبان میں لکنت پیدا ہو گئی اسی وقت اس کی گرفتاری کا حکم ہوا وہ گرفتار ہو کے آیا اس کو سخت سزا دی اور اس کے گھر میں آگ لگوائے اس کو منہدم کر دیا اور لڑکی کو اسکی ماں کے سپرد کر دیا۔

ولی عہد کے نکاح کی شب کو بادشاہ دولہا کے ساتھ دلہن کے یہاں جا رہے تھے راستہ میں لوہے کے پل کے پاس ایک ہاتھی کے دھکے سے ایک حلوائی کی دوکان کا سونا گر گیا۔ بادشاہ نے سواری روک لی۔ عرض کیا گیا کہ نکاح کی ساعت نکلی جاتی ہے اس تنگ وقت میں توقف مناسب نہیں حلوائی کو راضی کر لیا جائے گا مگر بادشاہ نے سماعت نہیں کی حلوائی کی دکان پر سواری کو پہنچایا اور اس کو مالا مال کیے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھایا۔

حضرت عباس کی درگاہ جا رہے تھے راستہ میں کمہار نے صدائے فریاد بلند کی سواری روک دی گئی اس نے کہا قائم علی مصاحب وزیر اعظم نے میرا مکان گرا کے زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ علی رضا بیگ کوتوال کو حکم ہوا کہ قائم علی کا مکان گرا دیا جائے اور مستغیث کا مکان پانچ ہزار میں بنوا دیا جائے۔

خورد محل ان کی ایک محبوبہ ہوتی تھیں جن کے متعلق انھوں نے خود کہا ہے ؎

یہاں تک دل و جاں سے مفتوں تھا ؛ کہ لیلیٰ تھی میں مجنوں تھا

بن خورد محل کے مکان اور باغ میں ایک ہندو کی زمین زبردستی شامل کر لی گئی اس نے عرض گزرانی اسی وقت زمین کی واپسی کا حکم ہوا اور منتظمین عقوبت میں گرفتار ہوئے۔

<u>ہنومان گڑھی کا واقعہ</u> اس کو مسلمان مورخوں نے غلط رنگ دیا ہے اصل واقعہ یہ ہے کہ اجودھیا میں ہندوؤں نے ایک مسجد کو گرا کے قرآن کو پارہ پارہ کر دیا اور موذن کو قتل کر دیا۔ یہ خبر مشہور ہوئی بادشاہ نے تحقیقات کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا مولوی امیر علی ساکن امیٹھی نے اعلان جہاد کیا اور مسلمان مجاہدین ان کے

جھنڈے تلے جمع ہو گئے ادھر ہندو مسلح ہو کے اجودھیا میں جمع ہو گئے۔

بادشاہ چاہتے تھے کہ طرفین کا یہ جوش کم ہو تو واقعہ کی تحقیق کر کے مناسب حکم صادر کیا جائے مولوی امیر علی چاہتے تھے کہ یا ہندؤں کے قتل کا حکم ہو یا ہم کو جہاد کی اجازت دی جائے یہ دونوں باتیں ممکن نہ تھیں بادشاہ کی تحقیقات کو وہ ٹال مٹول سمجھتے تھے انھیں مختلف تدبیروں سے روکا گیا مگر وہ نہ مانے اور کوچ کے لئے بول دیا۔ شاہی فوج کو ان کے محاصرہ کا حکم ہوا۔ انھوں نے شاہی فوج پر حملہ کر دیا۔ معمولی جنگ کے بعد مولوی امیر علی اور ان کے ساتھی خاک و خون میں غلطاں ہو گئے۔ مسلمانوں نے اس واقعہ پر غم و غصّہ کا اظہار کیا مگر دوسری قوموں نے اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ رزیڈنٹ جو بادشاہ کا سخت مخالف تھا اس نے گورنر جنرل کو لکھا کہ ہندوستان میں ایسا انصاف کبھی نہیں ہوا۔

صاحب بہارستان اودھ لکھتے ہیں :-

اس عدالت نوشیروانی کا ایسا نیک نتیجہ نکلا کہ اشرار و جرائم پیشہ لوگ اپنی سرکشی و غرور سے تائب ہو کے گوشۂ گمنامی میں چھپ گئے اور عروس سلطنت نے رونق تازہ سے چہرہ حال کو آراستہ کیا۔ عدالت کے علاوہ سخاوت میں بھی بے عدیل تھے دراں ملک قارون بر رفتے دلیر قارون کہ شہ دادگر بود و درویش سیر [1]

رحم دلی | نجم الغنی نے تاریخ اودھ میں لکھا ہے :-

یہ بادشاہ اس قدر رحمدل اور رقیق القلب تھا کہ باوجود اس سلطنت اور زور و زر کے کسی پر طیش اور بے رحمی نہیں کی بلکہ گالی تک زبان پر نہیں آئی یہ کسی

---

[1] بہارستان اودھ ص۱۵۵ ۵ھ

مخالف و موافق کو کبھی ستایا — باوجود اس سلطنت اور جاہ وحشمت اور شباب کے بادشاہ میں غرور و نخوت جس سے ہزاروں میں کوئی امیر خالی ہو نام کو نہ تھی۔

دینداری مرزا محمد تقی آفتاب اودھ میں لکھتے ہیں

اگرچہ عین شباب میں سلطنت ملی مگر خیال مے نوشی بلکہ جملہ مسکرات وغیرہ امور منہیہ شرعیہ کا پیرامون خاطر خواہ نہ رہا، پابندی صوم وصلوٰۃ میں کبھی فرق نہ آیا" [۳]

عظمت علی نامی کاکوردی کا بیان ہے

"واللہ کہ حضرت کو صوم وصلوٰۃ کی سر دست پابندی اس قدر کہ اللہ اکبرات کو پہر بھر سُکھ کرتے اس پر بھی نور کے تڑکے بلانا غہ نماز پڑھنے کو اُٹھتے نہیں تو بہ جبر اُٹھائے جاتے۔ ماہ رمضان میں روزہ عبادت اور خیر کا شغل رہتا۔ شام کو روزہ کھولتے اور کھلواتے۔ غرض تیس دن صوم سے خالی نہ جاتے" [۴]

صغیر بلگرامی کا بیان ہے۔

"ہمارا بادشاہ گیتی پناہ ... مقید صوم وصلوٰۃ، دہندۂ خمس وزکوٰۃ، اس دولت اس ثروت پر خدا کی یاد ہر وقت یاد خدام کو ہر دم یہ ارشاد کہ جب وقت نماز آئے جو کوئی موجود ہو بے خوف و خطر جگائے تا طاعت خدا میں خلل نہ پڑے،

[۲] جلد پنجم ص ۱۳۶ [۳] آفتاب اودھ قلمی [۴] مرقع خسروی قلمی ورق ۱۱۸۵

کہیں مہر منیر خلوت کدہ مشرق سے نکل نہ پڑے۔ مناہی
ہے خسب و روز مسکرات سے بمرتبہ نفور"۔ [۱]

مرزا رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں

"تقوی ذات اقدس سے تقویت رکھتا ہے۔ زہد و ورع
کو بعد نیاز دار ہے۔ عین شباب میں سلطان عالم مقید
روزہ و نماز ہے"۔ [۲]

سرور سلطانی میں خسب زندہ دار لکھا ہے۔

مولوی عبدالحلیم شرر فرماتے ہیں :۔

"موسیقی کے سوا اور تمام حیثیتوں سے بادشاہ بڑے
متقی و پرہیزگار اور پابند شرع تھے۔ نماز کبھی قضا نہ ہوتی
تھی۔ تیسوں روزے رکھتے تھے۔ افیون، شراب فلک سیر
یا کسی اور قسم کے نشے سے زندگی بھر احتراز رہا۔ محرم کی
عزاداری نہایت خلوص عقیدت سے بجا لاتے تھے [۳]

"عہد شاہی کے واجد علی شاہ کو میں نہیں جانتا۔ مٹیا برج کے
واجد علی شاہ کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ تو اتقاء
و پرہیزگاری، خداترسی اور خداپرستی کی مجسم تصویر تھے

---

[۱] صبح خنداں پردۂ اوّل پرستان خیال ترجمہ بوستان خیال [۲]
سرور سلطانی (دیباچہ) [۳] گزشتہ لکھنؤ ص ۶۵

..... کوئی غیر منکوحہ اور غیر ممنوعہ عورت خدمت گزاری اور ذلیل خانگی کاموں کے لئے بھی حضوری تک نہ پہنچ سکتی تھی۔“[۵]

پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب لکھتے ہیں۔

ماہ رمضان میں زیادہ وقت عبادت اور تلاوت میں صرف کرتے تھے۔ ماہ رمضان ۱۲۸۶ھ میں ایک دن قرآن مجید کی تلاوت کے دوران میں بادشاہ کے دل میں آیا کہ اس طرح کی آیتیں تلاش کی جائیں جن میں خدا کو لفظ رب سے خطاب کیا گیا ہے ایسی چھہتر آیتیں نکال کر ان کو حروف تہجی کی ترتیب سے مع ان کے معنی کے لکھ کر ایک کتاب میں درج کیا اور صحیفۂ سلطانیہ اس کا نام رکھا۔ تین برس کے بعد یہ کتاب ۱۲۸۹ھ میں مطبع سلطانی، کلکتہ میں چھپی۔

ان کو تعزیہ داری سے بڑی عقیدت تھی۔ مولوی شرر کا چشم دید بیان ہے کہ بادشاہ محرم کی عزاداری نہایت خلوص عقیدت سے بجالاتے تھے“۔

انھوں نے بادشاہ ہوتے ہی اپنے والد امجد علی شاہ کی قبر پر ایک عظیم الشان امام باڑہ سبطین آباد کے نام سے دس لاکھ روپے کے صرف میں تیار کیا۔ قیصر باغ میں ایک بہت وسیع شان دار بارہ دری پتھر کی بنوا کر قصر العزا' اس کا نام رکھا۔ یہ بھی حقیقت میں امام باڑہ تھی، جس کو بادشاہ کی جدت پسند طبیعت نے امام باڑوں کے روایتی طرز تعمیر سے بالکل مختلف صورت دی

سید مہدی حسن بیس برس سے کربلائے معلیٰ میں مجاور تھے۔ وہ پنجشنبہ ۲۶ شعبان ۱۲۷۰ ہجری (مئی ۱۸۵۴ عیسوی) کو خاک پاک کی ایک ضریح لے آئے

---

[۵] حزن اختر مقدمہ ص۱۱

اور دیانت الدولہ کی کربلا میں اترے۔ بادشاہ کو خبر کی گئی تو حکم دیا کہ سب ارکان سیاہ پوش ہو کر ضریح کے استقبال کو جائیں۔ حسب الحکم شاہ زادے امراء اور ولی عہد روضہ کاظمین میں جمع ہوئے۔ ۹ بجے رات کو ضریح ایک صندوق میں مقفل زیر شامیانہ روانہ ہو کر آدھی رات کو در دولت پر پہنچی۔ بادشاہ نے دروازے تک استقبال کیا اور ضریح کو قیصر باغ کی سنگی بارہ دری میں رکھوا دیا اور ضریح لانے والے سید صاحب کو خلعت اور زر نقد عطا کیا"۔[۵۹]

روضہ امام حسین کے ایک خادم سید صالح کربلا سے بادشاہ کے لئے ایک عبا لے کر آئے۔ مالک الدولہ صولت نے تاریخ لکھی۔ مادّے کا مصرع یہ ہے۔ 'پاک حلّہ پے اختر آیا' سید صاحب نے عرض کیا کہ امام حسین نے مجھے حکم دیا کہ عبا لے کر واجد علی شاہ کو ہماری طرف سے دو۔ بادشاہ نے وہ عبا سر پر رکھ لی اور سید صاحب کو بہت کچھ اس کا صلہ دیا۔ واپسی کے وقت انھوں نے کہا کہ ناصر الدین شاہ ایران کی طرف سے ایک جھاڑ کربلا میں روشن کیا جاتا ہے میں چاہتا ہوں کہ حضرت کی طرف سے جھاڑ روشن ہوا کرے استدعا قبول ہو گئی۔ جھاڑ کو روشنی کرنے والے کے لئے ماہانہ تنخواہ کا حکم ہو گیا۔ پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب جن کی کتاب واجد علی شاہ سے ہم نے یہ واقعات لکھے ہیں لکھتے ہیں۔

راقم الحروف ۱۹۳۳ء کربلا کی زیارت سے مشرف ہوا تو بادشاہ کا نذر کیا ہوا جھاڑ روضہ امام حسین میں دو ہزار اور بادشاہ کا بنوایا ہوا چاندی کا دروازہ بھی تھا۔

۵۹۔ قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۰۰۔۱۰۱

مٹیا برج میں شاہی محلات کے امام باڑے مدرسۂ قیصریہ کے افتتاح کے موقع پر منعم الدولہ نے اپنی تقریر میں کہا۔

اس چھوٹے سے مقام پر ہر سال محرم میں سوا لاکھ روپے صرف ہوتے ہیں۔ محافل میلاد اور عیدین میں بھی ہزاروں روپے صرف ہوتے ہیں۔ ہمارے آقا اور بادشاہ کی فیاضی کیا کم ہے کہ کربلائے معلیٰ میں ایک شفاخانہ مختصر سا ہنوز طبیب اور مصارف علاج کے لیئے قائم فرمایا ہے جس کی نظیر اس وقت تک نہیں ملتی۔ مدینہ منورہ میں ایک مدنی کو سو روپیہ ماہوار سبیل کا خرچ دیا جاتا ہے۔ یہ معزولی کے زمانہ کا حال ہے۔

بے تعصبی مذہب کا اتنا پابند ہونے کے بعد ان میں تعصب نام کو نہ تھا۔

پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب لکھتے ہیں :۔

اس معاملہ میں ذاتی واقفیت رکھنے والے شاہدوں کے بیانات درج کئے جاتے ہیں۔

مولانا شرر لکھنوی کا بیان :۔

”بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے۔ مگر مزاج میں تعصب مطلق نہ تھا۔ ان کا پرانا مقولہ تھا کہ میری دو آنکھوں میں سے ایک شیعہ ہے اور ایک سُنّی ہے بے تعصبی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہوگا کہ سارا انتظامی کاروبار سنیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وزیر اعظم منعم الدولہ بہادر سنی تھے۔ منشی السلطان جو ایک زمانے میں سب سے زیادہ مقرب اور سارے جانور خانے، کل اہل قلم اور کئی اور محکموں کے افسر اعلیٰ تھے سُنّی تھے۔ بخشی امانت الدولہ جن کے ہاتھ سے کل ملازموں حتیٰ کہ محلوں اور شاہزادوں

تک کو تنخواہ ملتی تھی سُنّی تھے۔ عطار والدولہ اور داروغہ معتبر علی خاں جو آخر میں سب سے بڑے عہدہ دار اور کل کاروبار کے مالک تھے دونوں سُنّی تھے۔ اس سے بڑھ کے کیا ہوگا کہ امام باڑہ سبطین آباد اور محل کے خاص امام باڑے۔ بیت البکا کا انتظام اور مجلسوں اور مذہبی تقریبوں کا انصرام بھی سنیوں کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں کبھی کسی نے اس کو محسوس ہی نہیں کیا کہ کون سُنی ہے اور کون شیعہ ہے"۔ لے

شرر کا دوسرا بیان :۔

" بادشاہ نے جانور خانہ مرزا رمضان بیگ کے سپرد کیا جو لکھنؤ کے ایک ہندو رئیس رائے دلارام کے بیٹے تھے۔ رمضان بیگ کو منشی السلطان بہادر کا خطاب تھا۔ تمام اہل قلم اور محرر جا ہے کسی دفتر میں کام کرتے ہیں انھیں کے ماتحت تھے اور ان کی برطرفی و بحالی ان کے سپرد تھی۔ وہ سُنی المذہب بڑے دین دار، روزے نماز کے پابند اور بڑے لسان اور بذلہ سنج تھے۔ بادشاہ کو ان کی باتوں میں بڑا مزہ آتا۔ رات کو گاڑی پر سوار ہوکر اپنی کوٹھیوں کے باغوں میں گشت لگاتے تو منشی السلطان کو خواصی میں بٹھا لیتے" ٢ے

مولوی عبدالرزاق مصنف البرامکہ مٹیا برج کے چشم دید حالات

لے گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۷۱ ٢ے جان عالم صفحہ ۲۴

کے بیان میں لکھتے ہیں :

اعلیٰ عہدہ دار اکثر سنی تھے اور یہ بادشاہ کی بے تعصبی کی دلیل تھی۔[1]

عہدِ واجدی کے ہندو منصب دار

یہی بے تعصبی کا برتاؤ دوسرے برادران وطن صاحبان ہنود کے ساتھ بھی تھا۔ وہ بڑے ذمہ دار بڑی تنخواہوں والے منصبوں پر فائز تھے چند ہندو منصب داروں کے نام مہاراجہ گوپال تفتہ کی تاریخ اودھ "زبدۃ الکوائف" سے یہاں درج کئے جاتے ہیں :

"مشیر الدولہ مؤید الملک مہاراج ادھوراج بال کرشن بہادر جسارت جنگ ابن راجا دیا کرشن، غازی الدین حیدر کے عہد سے واجد علی شاہ کے عہد تک دیوانی کے منصب اعلیٰ پر ممتاز رہے۔

مہاراجہ بہاری لال بہادر ابن افتخار الدولہ مہاراجہ شیو رام بہادر برادر زادۂ مشیر الدولہ بہادر مذکور الصدر و اصل باقی نویس ملک محروسہ۔

راجا کندن لال بہادر محمد علی شاہ سے واجد علی شاہ کے عہد تک امیر بیت الانشاء یعنی منشی رہے۔

بابو پورن چند کار پرداز سررشتہ دستخط عرائض و پرچہ اخبار مدبر الدولہ منشی الملک راجہ جوالا پرشاد بہادر محکم جنگ سرد فتر دفتر خاص کنور راج بہادر مہتمم بیت الاجرا مہتمم بیت التعمیل عرف دفر بنارسی۔

---

[1] واجد علی شاہ اور ان کا عہد ص ۱۰۵

بخشی الملک راجا لال جی بہادر مہتمم کچہری بخشی گری بخشی الملک راجا الفت رائے بخشی الملک کنور دھنپت رائے بنسی دھر مردری نائب بخشی۔

پنڈت بشن نرائن مہتمم سررشتہ نظارت یعنی تقسیم تنخواہ محلات و شاہزادگان و اعزا و اقربائے شاہی۔

راج ادھراج، پیشوا پردھان راجہ امراؤ سنگھ مہتمم بیت القرب سلطانی۔ گنگا پرشاد رند سررشتہ دار خزانہ جواہر راجہ بہادر سنگھ منصرم املاک سلطانی واقع دہلی

رعایا پروری | شاہی کے زمانہ میں انھوں نے جو رعایا پروری کی وہ کوئی تعجب کی بات نہیں بیسیہ تھا رحمدل تھے مہربان تھے تعجب کی بات یہ ہے کہ جب وہ قید فرنگ میں تھے مقررہ وظیفہ تک نہیں ملتا تھا اس عالم میں جب انھیں معلوم ہوا کہ غدر کے بعد انگریزوں نے لکھنؤ کو لوٹ لیا، رعایا پر ظلم ڈھایا جا رہا ہے لوگ بدحال ہیں انھوں نے جو کچھ جواہرات بچے کھچے موجود تھے اور لاکھوں روپیہ جو اس وقت تحویل میں تھا سب لکھنؤ بھیجدیا اور خود مقروض ہو گئے ایسی مثال تاریخ میں نہیں مل سکتی

علمی استعداد | مولانا شرر کا بیان -

"واجد علی شاہ کا علمی مذاق نہایت ہی پاکیزہ اور اعلیٰ درجے کا تھا۔ ان کی علمی استعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ عربی کے تو عالم نہ تھے، مگر فارسی میں . . . . دم بھر میں دو دو چار چار بند کی نثریں لکھ ڈالتے جو مشہور و نامور نثاران فارسی کے کمال کو یاد دلا دیتیں رفعت الدولہ اور لائق الدولہ کے ایسے صاحب کمال نثر نگار

وابستۂ دامن دولت تھے۔ ممکن تھا کہ وہ لوگ جدوجہد اور تکلف کے بعد ان سے اچھی طرح لکھ لیں، مگر جس خوبی کے ساتھ قلم برداشتہ واجد علی شاہ لکھ دیتے، میرے خیال میں کسی سے ممکن نہ تھا یہی حالت نظم کی تھی۔ جانِ عالم ص۶

راجا درگا پرشاد سندیلوی لکھتے ہیں۔

"مثل او بادشاہے باین جمعیت علوم و فنون بر سرزمین ہند برنخاستہ چنیں فرماں روائے باچندیں فضل و کمال در فضائے مملکت ہندوستان علم بادشاہی نہ افراشتہ۔ بیشتر اوقات شریف بہ تذکرۂ علمی می گزرانند: اگر بجہت گل گشت حدائق و تفرج باغات سواری می فرمایند، خدام صندوق ہائے تصنیفات و کتب ہائے اساتذہ ہمراہ می دارند۔ چراکہ اکثر اوقات دریں حالت تفرج باخدام و مقربان خدمت اکثر تذکرۂ سخن می شود و اتفاق ملاحظۂ تصنیفات اساتذہ می شود"۔ ۹۱

سرزمین ہند میں کوئی بادشاہ ایسا نہیں پیدا ہوا جو سو سے زیادہ کتابوں کا مصنف ہو

حکیم محمد کاظم سوانح عمری میں لکھتے ہیں:۔

"در ذکاوت طبع و ذہانت بے عدیل و در اکثر فنون مثل شاعری و تواریخ دانی و موسیقی عدیم النظیر"۔ ۹۲

۹۱ بوستان اودھ ص۱۸۳۔۱۸۴ ۹۲ سوانح عمری ص۳۳

ناسخ کلکتوی کہتے ہیں :-

"علاوہ تحصیل کمال بہ انواع فنون فاضل فنون مفرطہ نادرۂ فن

وشعر وسخن دارند۔

صغیر بلگرامی کا بیان ہے :

" ہر علم میں کامل بہ قوت طبع دراکہ ہر فن میں حرفاً حرفاً کمال حاصل

خواجہ بادشاہ صفیہ لکھنوی لکھتے ہیں :-

فن جو عمدہ جہاں میں ہیں مشہور　　حد سے افزوں ہے ان فنون میں عبور

دیکھو انصاف کی نظر سے اگر　　مثل ان کا نہیں ہے کوئی بشر

پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب لکھتے ہیں -

بادشاہ کی قلم برداشتہ فارسی تحریر کی مثال کے لیئے ایک طولانی تحریر کے چند ٹکڑے درج کیئے جاتے ہیں - واجدی عہد میں شاہی دارالانشائے میر منشی ظہیرالدین ظہیر بلگرامی نے معزول بادشاہ کی خدمت میں ایک فارسی قطعہ اور ایک عرضداشت مٹیا برج بھیجی، جس میں بادشاہ کی سوانح عمری لکھنے کے لیئے ان کی تصنیفات اور روزنامچہ اور سوانح مانگی - بادشاہ اس وقت فورٹ ولیم میں نظر بند اور جسمانی اور روحانی اذیت میں مبتلا تھے - انھوں نے معذرت کے ساتھ تقریباً تین ہزار روپیہ نقد عنایت فرمائے اور پچاس روپے ماہوار تنخواہ مقرر کردی اور عرضداشت کے جواب میں تحریر فرمایا :

شعاع آفتاب کلامش چنان مرزرہ دلم تابید کہ سرتا پا محو حیرت گشتم... صفائے بندش وحسن کلامش کہ دریا فتم ہر دو دست دل گرفتہ ماندم بخدا کہ ہرگز قابل ولائق چنیں تحریر

بے نظیر نہ بودم ۔ لطف وکیفیت وجدانی از لب نمی خیزد مگر آنچہ
از دل خیزد و بر دل ریزد ..... وہر آنچہ دربارہ رسائل تصنیف
راقم در فنون جداگانہ مع دیگر روزنامچہ و سوانح عمری
عرض داشت، صورتش برایں گونہ کہ تالیفات و تصنیفات
عمدہ را سیل غارت باغیان ہم چو خس و خاشاک در امواج
تاراج چناں غرق ساختہ کہ اثر حرفے ازاں باقی نیست ۔
در روزنامچہ و سوانح جوز آہ جگر و درد دل اختر یا شام زنداں
یا صبح غریباں ..... حالا دگر چیست"۔

بادشاہ کی فارسی نثر کا ایک نمونہ اور پیش کیا جاتا ہے:

"درعالم یاس وقید و ہراس کہ از شومی بخت نارسیدہ
بجائے سیاہی آب دیدہ صرف نمودہ در فرط بے قراری و حالت آہ
وزاری کہ نصیب دشمناں باد یعنی در زندان فرنگستان
کہ موسوم بہ قلعہ ولیم فورڈ کلکتہ است ہر قدر تحفہ کہ برائے
مبتدیان نزد خود داشت بے تکلف از نوک خامہ ریختہ"

بقول شرر بادشاہ عربی کے عالم نہ تھے لیکن عربی سے نابلد بھی نہ تھے ۔ ان کی بعض کتابیں ان کی عربی دانی کا ثبوت پیش کر رہی ہیں ۔ ان کی دو مختصر عربی تحریریں ھدایت السلطان ۔ ارشاد السلطان کے نام سے تھیں جن کی نہایت مبسوط بڑی عالمانہ اور فاضلانہ شرحیں منشی امیر احمد مینائی نے دو کتابوں کی صورت میں لکھیں جو شاہی دربار میں ان کی رسائی کا ذریعہ ہوئیں ۔

بادشاہ نے فارسی اور اردو شاعری کا وسیع مطالعہ کیا تھا ۔ اپنی ایک

کتاب میں بھانڈوں کے لیئے جو نقلیں لکھی ہیں ان میں ایک نقل مشاعرے کی ہے، جس میں فارسی اور اردو کے چھبیس[26] چھبیس[26] شاعر آتے ہیں اور اپنا ایک ایک مطلع سناتے ہیں ان کے لیئے باون غزلوں کے مطلع لکھ دیئے ہیں - اپنا یہ مطلع لکھا ہے ؎

ایک حسرت طور پر بھی بہر موسیٰ رہ گئی ؛ ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تمنا رہ گئی

گیت | بادشاہ کو اودھ کی دیہاتی بولیوں پر کافی عبور تھا - ان کے گیت زیادہ تر انھیں بولیوں میں ہیں - انھوں نے خیال ماگنی بھٹیاری کی مثال میں اپنا یہ گیت پیش کیا ہے -

آستائی - آج مورے گھر کاج مندیلا باجے مائی ری -

انتر - گلیوں گلیوں ہُن برست ہے دھلکت ہے نگارا اختر پیا ملک اودھ پرا جے مائی ری

ایک گیت کی آستائی ہے

اتنا جائے کہو ہمری اودھ سے ہر سوں کر جور جور بیگ داس دیجیے برمن پیا کل تر بت سہو نہ جات بچھرن کو دکھ بھاری

رام چیرا کنھیا سے پوچھتا ہے -

راجن کے راج ادھراج مہاراج شیو پردھان چھتر پتی بتاؤ تو کیا ہوا

ذیل کا شعر ٹھیٹھ دیہاتی زبان میں ہے

بلا یوں ان کا مورے گھر بیچ توہئے تمھرے لگاڑ ہوئی

بسے نہ دیہوں تہار پر واجو مور بستی اُجاڑ ہوئی

یہ سب اقتباسات پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب کی کتاب واجد علی شاہ سے نقل کئے گئے ہیں -

حقیقت میں گیت بھی شعر ہے اس میں کسی حد تک وزن بھی ہوتا ہے

اور قافیہ بھی اور شاعرانہ انداز بیان بھی مگر اس کے بنانے والے کم علم دیہاتی ہوتے ہیں وہ اپنی زبان میں الفاظ و حروف کو کھینچ کر کبھی کمی و زیادتی کرکے ایک ناقص وزن پیدا کرتے ہیں جس میں عروضی وزن نہیں ہوتا۔ گانے سے اتار چڑھاؤ پیدا کرتے ہیں فقرے بھی چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ ہندی اردو اور فارسی کے جن شعراء نے گیت بنائے انھوں نے اس نمونہ کو سامنے رکھا اس وجہ سے اس کا معیار بلند نہ ہو سکا۔ واجد علی شاہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عروض و قافیہ کے اصول سے گیت بنائے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کا بیان ہے کہ :-

کسی بنانے والے کے انترے میں چار پانچ فقرے ہیں تو آستائی کے بیس بول ہیں سیکڑوں گنجلک ہزاروں طرح کے جھول ہیں جتنے نامور گوئیے ہوئے عروض و قافیہ میں کسی کو دخل نہ ہوا کون شاعر تھا؟ سانچے میں ڈھلے ہوئے انترے اور آستائی کس نے بنائی تقطیع میں پورے بول کس کے اتر آتے ہیں۔

سرور کا یہ خیال صحیح نہیں کہ لوک گیت بنانے والے عروض و قافیہ سے واقف نہ تھے سب ایسے نہ تھے اور امیر خسرو نے بھی گیت بنائے ہیں مگر ان کے سامنے گیتوں کا جو نمونہ تھا اسی کے موافق انھوں نے گیت بنائے۔ اپنی طرف سے کوئی اصلاح و اضافہ نہ کر سکے اس وجہ سے اس کا معیار وہی رہا جو پہلے تھا۔

واجد علی شاہ کی جدت پسند طبیعت نے گیت کے اس معیار کو بلند کیا مگر اس کی تقلید دیہاتیوں کے امکان میں نہ تھی عام طور پر گیتوں کا معیار وہی رہا صرف واجد علی شاہ کے گیت منفرد اور عام گیتوں سے بلند ہیں اور وہ بھی کم نہیں ہیں دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں اور دنیا کے سامنے پیش کئے جانے کے قابل ہیں۔

شاعری کا ذوق واجد علی شاہ قادر الکلام شاعر تھے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل کے کچھ شعر ملاحظہ کیجئے۔

پردہ نشیں سمائے دل ناشناس میں
آتی نہیں یہ بات ہمارے قیاس میں

اندھیرا بزم میں تھا تو جو انجمن میں نہ تھا
چمن اداس تھا اے گل جو تو چمن میں نہ تھا

غنچۂ دل کھلے جو جا ہو تم
گلشن دہر میں صبا ہو تم

تری یاد کا دل میں وہ جوش ہے
غم دین و دنیا فراموش ہے

سوز دل جب گداز کرتا ہے
برق کو بیقرار کرتا ہے

غنچے کھلتے ہیں اے گل خنداں
باغ میں تیرے مسکرانے سے

کون سے ساقی کی چشم مست کا دھیان آگیا
بزم مے میں ہو گئے بیزار جام جم سے ہم

بلا خانۂ صیاد نہ گل مرجھائے
اب نہ کچھ ہو گا ان آہوں کا اثر دیکھ لیا

تم سا ہنسنے والا ہے نہ ہم سا رونے والا ہے
نہیں تم باغ عالم میں تو میں جان گل و شبنم

ذرے جو چمکا کرتے ہیں خورشید کی طرح
صدا ہوئے ہیں صاحب حسن و جمال خاک

پھول کھلتے ہیں مگر بوئے وفا دیتے نہیں
جن کو گل سمجھے تھے گلشن میں وہی سب خار ہیں

بادشاہ کے درباری شعراء فتح الدولہ برق۔ مہتاب الدولہ درخشاں۔ مرزا میتا عیش۔ مرزا امداد علی یاور۔ منظفر علی ہنر۔ گلشن الدولہ مرزا علی بہار۔ مالک الدولہ صولت۔ حامد اللہ برتر۔ صادق علی مائل۔ جہاں مرزا اسحاق جاہ انجم حامد علی مرزا کوکب۔ مدبر الدولہ۔ منشی منظفر علی اسیر۔ فقیر محمد خاں گویا۔ میر دوست علی خلیل۔ منشی امیر احمد مینائی۔ آفتاب الدولہ آغا بیجو شرف ان کو شرف مصاحبت بھی حاصل تھا۔ بادشاہ کے سمدھی تھے عالی خاندان تھے پڑھے لکھے نہ تھے مگر شعر عروض و قافیہ اور معانی بیان کی غلطی سے پاک تھا۔ نہایت رواں اور

سلیس شعر کہتے تھے ۔ یہ شعر میر کے نام سے مشہور ہے ؎

جھٹپٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا ؛ صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

اپنے اوپر کچھ پابندیاں بھی عائد کر رکھی تھیں ۔ دیر و بتکدہ، صنم، برہمن، ناقوس قشقہ، تسبیح و زنار۔ مصلیٰ و زاہد و واعظ و شیخ، خانقاہ و میخانہ، پیمانہ و میخانہ ساقی و پیر مغاں جام و صراحی و مینا کا ذکر نہیں کرتے تھے کہتے تھے کہ آخر اس کے معنی کیا کہ شراب سے نفرت واعظ سے عقیدت اور پھر اس کی تعریف اور اس کی مذمت اس قسم کے شعر غیر واقعی ہوا کرتے ہیں ۔

راجا امیر حسن خاں صاحب (راجہ محمود آباد) کی توجہ سے دیوان چھپ گیا ہے

ان شعرا کے علاوہ میر علی اوسط رشک ۔ شیخ امداد علی بحر ۔ میر وزیر علی صبا خواجہ وزیر ۔ شیخ امان علی سحر ۔ آغا حسن امانت ۔ نواب مرزا شوق ۔ سید مرزا انس شعرا میں تھے ۔

میر کلو عرش میر کے فرزند ہونے کی وجہ سے ہر طبقہ میں محترم اور اساتذہ کی صف میں داخل تھے ۔

رؤسا میں نواب عاشور علی خاں عاشور ۔ نواب سید محمد خاں رند ۔ نواب طالب علی عیشی ۔ نواب حسین علی خاں اثر ۔ نواب مہدی حسین آباد ۔ نواب ہزبر علی خاں ہزبر نواب کیواں جاہ کیواں ۔ نواب حیدر علی خاں اعجاز ۔ نواب آغا علی رضا عالی ۔ نواب محمد علی خاں شمس ۔ نواب امیر مرزا خاں گل ۔ نواب محمد تقی خاں حسام ۔ نواب حسین علی خاں ممتاز ۔ نواب آسماں قدر ۔ نواب آغا علی خاں مہر اور ان کے بھائی نواب سید علی خاں سید ۔ نواب سلیمان شکوہ سلیمان (واجد علی شاہ کے سوتیلے بھائی) کا شمار اساتذہ میں تھا ۔

شہر کے ممتاز شعراء شیخ رضا علی آبر۔ حسن یار خاں افضل۔ حسین علی آزاد
اسد خاں اسد۔ مرزا محمد رضا آرزو۔ شیخ بہادر علی ایجاد۔ اکرام حسین اکرام۔ سید ابو تراب انسخ۔ میر ابو طالب انسب۔ سید محمد آشنا۔ آغا حسن ازل۔ محمد جعفر امید۔ اسحٰق مرزا اسحٰق۔ آ مہدی حسن آلم۔ مرزا حسن علی اوج۔ مولوی ہادی علی اشک۔ میر وزیر علی اخگر

ب :۔ صادق علی بدر۔ مرزا علی بہادر۔

ت :۔ کاظم حسین تنویر۔ عبد الوہاب تائب۔ مولوی تجمل حسین تجمل۔ عابد علی تمنا۔ محمد بیگ تحریر۔ تصدق حسین تصدق مصنف نوشیروان نامہ وغیرہ۔ شیخ حسن جان تعوکر

ث :۔ مرزا مہدی ثاقب۔ مولوی نجم الدین ثاقب۔ مرزا علی ثمر۔ محمد رضا ثروت

ج ۔ احمد حسین خاں جوش۔ میر مہدی حسن جزا۔ میر وارث علی جوش۔ مرزا واجد علی خاں جلا۔ میر سرفراز علی جری۔

ح ۔ حمید الدین حمید۔ حکیم عطاء اللہ حکیم۔ عبد الکریم حنا۔ حکیم امیر علی حشم۔ مرزا بندہ علی بیگ حقیر۔

خ ۔ خوش وقت علی خاں خورشید۔ بہادر مرزا خرد

د۔ دانش علی خاں دانش

ذ۔ محمد ذکی خاں عرف نواب بہادر ذکی۔

ر :۔ مرزا رضا علی رضا۔ رفیع الدین رفیع

ز :۔ محی الدین زور

س :۔ اللہ یار خاں سحاب۔ میر مہدی سپہر۔ میر مصطفےٰ بخش سالک۔ امراؤ مرزا سقیم مرزا عسکری سالم۔ میر وارث علی سیفی۔ نواب علی خاں سحر (راجہ محمود آباد) مرزا علی سروش

ش :- شیخ جان محمد شاد۔ میرا عانت حسین شیدا۔ میر محمد علی۔ میر نسیم اللہ شاعر۔ مرزا علی خاں شفق۔ شیخ داد علی شکر۔ میر عباس علی شاد۔ محمد بخش شہید آغا حسن شرر۔ میر رضی شوق۔

ص ۔ میر صدر الدین صدر۔ میر اسد صبر خواجہ محمد صولت۔ محمد صادق علی خاں صادق۔ مرزا صفدر حسین صفدر (مصور شاہی)

ط ۔ مرزا بندہ حسن طاہر۔ میر حسین علی طوفان۔ محمد رضا طور۔

ظ۔ شیخ ظفر علی ظفر

ع ۔ میر بندہ حسن عالی۔ تفضل حسین عزیز۔ میر جمال الدین عارف۔ آغا رضا عشق۔ خواجہ عبداللہ خاں عالی۔ علی رضا علی۔ منشی فدا علی عیش۔ واجد علی خاں عدم۔ شیخ محمد حسن عقیل۔ مرزا رضا عیش۔

غ :۔ منشی رحمت اللہ غیور۔

ف :۔ میر بہادر حسین فلک۔ میر کمال الدین فقیر۔ خواجہ بہادر حسین فراق۔ میر بند علی فوق۔ وارث علی فہیم۔

ق :۔ شیخ کاظم علی قیس۔ میر فدا حسین قانع۔ مرزا جنون قربان۔

ک :۔ کاظم علی کاظم۔ شیخ فضل احمد کیف۔ مرزا مہدی کوثر۔

گ :۔ حیدر علی گرم۔

م :۔ میر نواب موزوں۔ امیر علی ملال۔ محمد رضا ملال۔ منشی اسمٰعیل حسین منیر محمد رضا معجز۔ حکیم محمد علی مسیحا۔ بادی حسن مخمور۔ میر محسن علی محسن۔ واجد علی خاں موجد۔

ن :۔ علی نقی خاں نقی۔ ابو محمد ناصر۔ میر وزیر علی نور۔ میر مہدی نمو۔ اصغر علی خاں نسیم

مرزا عسکری نادر۔ عبدالکریم نحیف۔ میر نقش علی نقش۔

و:۔ میر محمود علی وصف۔

ہ:۔ حیدر علی ہاتف۔ مرزا مغل ہنر۔ میر ہدایت علی ہدایت۔ محمد علی ہوشیار۔

نواب برادر نواب عاشور علی خاں۔

ی:۔ میر جان خان یکتا۔ یوسف خان یوسف۔

ہندو شعراء: لالہ شادی لال امیر۔ راجہ الفت رائے الفت (بخشی) دیا کشن ریحان...... کالی پرشاد اخلاص، لال چند انس۔ گرسنگھ بریا۔ گنگا پرشاد بدر (سررشتہ دار خزانہ جواہر)..... مکھن لال تمنا۔ مہاراجہ جے گوپال سنگھ ثاقب راجہ جواہر سنگھ جوہر، میکو لال رفعت، رام سہائے رونق، بختاور سنگھ راقم۔ بنڈلال زار، ہیرا لال سرشار (بخشی) رائے بنسی دھر سروری، رام دیال سخن۔ راجہ درگا پرشاد مہر، سیورام شائق، فتح چند شائق، منشی کشوری لال شور، جنگل کشور ظہور گوبند پرشاد فضا، پنڈت سندر لال فہم، مٹھو لال مضطر، لالہ رام بخش مطیع۔ کالکا دین ممتاز، شیو پرشاد محبت۔ کالکا پرشاد موجد، لالہ جگناتھ مصنف رامائن (منصدی) لالہ دھنپت رائے ناطق، شیو غلام ندیم، شیو سنگھ ہندو، پنڈت سنگم لال واحد جوالا پرشاد وقار (منشی الملک) دولت رام شوق

باہر سے آنے والے شعراء: بندہ علی خاں باسطی (شیر افگن خاں)، کرامت علی اظہر محمد تقی رسا دہلی سے۔ میر شمس الدین لطف۔ بندر گاہ صورت سے عارف علی شاہ عارف ایران سے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ یہ شاہ ایران کے عمائد دولت میں تھے۔ سیاحت کے لئے ہندوستان آئے تھے۔ لکھنؤ پہونچ کے انھوں نے جو کچھ دیکھا اس نے پھر لکھنؤ سے باہر نکلنے نہ دیا وہ خود کہتے تھے ؎

ہندستان ندیدم موضعے دلچسپ چوں لکنو   اگرچہ درطریق سیرتا جنابش رفتم

شاعرہ عورتیں | شہر کی بہت سی شریف زادیاں شعر کہتی تھیں ان میں حکیم نورشں کی بیٹی ضیائی بیگم ضیا بڑی عالمہ وفاضلہ تھیں۔ عربی، فارسی، اردو تینوں میں شعر کہتی تھیں۔ نظرن، قیصر بیگم نشتر، قمرالنساء قمر۔ زوجہ اشرف علی خاں مسرار منجھو خانم کنیز دختر طیب الدولہ بارہ برس کے سن سے شعر کہتی تھیں۔ کنیز فاطمہ کنیز دختر نواب نصرت الدولہ، امیر بیگم امیر، سلطانی بیگم سلطانی دختر نواب معتمدالدولہ شعر گوئی میں بہت مشہور تھیں۔ بادشاہ کی اکثر بیویاں شاعرہ تھیں۔

اکثر طوائفیں بھی شعر کہتی تھیں، ان میں چھوٹی بیگم شرم بہت عمدہ شعر کہتی تھی۔ یہ کلکتہ بھی گئی تھی۔ عبدالغفور نساخ نے اس کو دیکھا تھا۔ تیرہ وحید ۱۲۹۳ھ تک زندہ رہی۔ گوہر لعل بے بہا بڑی پختہ مشق تھی۔

عربی شاعری | عربی شاعری وانشاپردازی میں مفتی میر عباس صاحب اور ان کے شاگرد محمد مہدی ادیب نے شہرت حاصل کی اور عربی میں قصیدہ گوئی کے ساتھ مقاصدے کا رواج ہوا۔

مرثیہ | مرثیہ گوئی میں مرزا جعفر علی فصیح، مرزا دبیر، میر انیس، میر مونس میر انس، میر عشق اور تعشق کا شمار اکابر میں تھا، ان کے علاوہ بہت سے مرثیہ گو اور مرثیہ خوان تھے۔

ریختی | ریختی اردو میں اور اصناف سخن کی طرح دکن سے شروع ہوئی اس کے بعد شعرائے دہلی نے اس میں داد سخن دی لکھنؤ میں یہ صنف انھیں کے ساتھ آئی اور بہت سے شعراء نے اس میں شہرت حاصل کی۔ آخر میں میر یار علی جان نے وہ کمال دکھایا کہ متقدمین ومتاخرین سب ان کے سامنے ہیچ ہو گئے۔

مزاحیہ گوئی | مزاحیہ گوئی میں میاں مشیر اور شیخ باقر علی چرکین نے ایک نیا اسلوب پیش کیا۔

واسوخت | یہ بھی ایک صنف سخن ہے اور نہایت لطیف ہے مگر اس کو قبول عام حاصل نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ غزل کی طرح ہلکی پھلکی نہیں ہے جو مشاعروں میں پڑھی جا سکے۔ نہ مرثیے کی طرح اس کا پڑھنا ثواب ہے کہ مخصوص مجلسیں منعقد کی جائیں اس لئے اس کا مصرف نہ ہوسکا نہ اس میں مثنوی کی سی دلچسپی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ صنف سخن متروک ہوگئی مگر امانت کی واسوخت اپنی خوبیوں میں کسی صنف سخن سے کم نہیں اب تک نقادان فن اور صاحبان ذوق کی تفریح خاطر کرتی رہتی ہے واجد علی شاہ نے بھی واسوخت کہی ہے ان کے علاوہ بھی اس زمانے کے اکثر شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے مگر امانت کی واسوخت تک کوئی نہ پہنچ سکا۔

اندر سبھا | امانت نے اندر سبھا لکھ کے اصناف سخن میں ایک اضافہ کیا ایک مدت تک شعرا اس انداز کی نظمیں اندر سبھا کے نام سے لکھتے رہے۔ مگر امانت کی اندر سبھا کی مقبولیت اور شہرت تک کوئی نہ پہونچ سکی اس کا ترجمہ ہندوستان کی ہر زبان میں اور یورپ و جرمنی میں ہوا۔ لندن کے انڈیا آفس میں تقریباً چالیس ایڈیشن اس کے موجود ہیں۔ ایک مدت تک اسٹیج پر یہ کھیلا گیا۔ اس سے زیادہ دلچسپ کوئی کھیل نہیں تھا۔ ادبی حیثیت سے اس کو بڑا درجہ حاصل ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن کی رائے ہے کہ:-

"اندر سبھا کو اولیت اور ادبیت دونوں لحاظ سے اردو منظوم ڈراموں میں سب سے اونچا درجہ حاصل ہے۔ آج بھی جس طرح وہ ہماری ادبی روایات میں اور ہمارے شعور میں رچ گئی ہے کوئی دوسرا اس

نام اور خطاب | واجد علی شاہ نے جو نام رکھے یا خطاب دیئے وہ بلاغت کی جان ہیں ایسے مناسب خطابات کوئی اور نہ دے سکا۔

مصور الدولہ	شاہی مصور
خازن الدولہ	خزانۂ شاہی کے مہتمم
ریحان الدولہ	مکانات اور باغات کے نگراں
ترصیع الدولہ	فرمان نویس۔ یہ اپنے وقت کے مشہور خطاط زمرد رقم کہے جاتے تھے۔
منصرم الدولہ	عام امور کو انجام دیتے تھے۔
ہاتف الدولہ کوکب الملک	شاہی منجم
آب رساں بیگم	آبدست کے لیئے پانی لے جانے والی۔
مصفا بیگم	طہارت کرانے والی

بلبل کے سینتالیس نام رکھے جو مکان رقص وسرود کے لیئے تھا اس میں دو کمرے بادشاہ کے بیٹھنے کے لیئے تھے۔ ایک کا نام روح افزا دوسرے کا چشمۂ حیوان تھا۔ تمباکوئے خوردنی۔ حقہ۔ لبِ معشوق، رضائی سب خوابی۔ شراب حرام۔ حولی آرام بائی تکیہ عضو تناسل کا نام عضو مخصوص رکھا۔ دوپلی ٹوپی لباس میں اور ٹھمری موسیقی میں ان کی ایجاد ہے۔

موسیقی کا شوق | موسیقی غور و فکر میں غرق اور دنیا کی لذتوں سے دور رہنے والے فلسفیوں کی ایجاد ہے۔ انسان کے دہن سے نکلنے والی بیشمار آوازوں میں سے سات آوازیں سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی کو منتخب کرنا اور ان کی تالیف سے نغمات پیدا کرکے ان میں زیر و بم سے جان ڈالنا فلسفیوں کے سوا کس کے امکان

میں ہے۔

یونان میں کوئی فلسفی اس وقت تک کامل نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کہ موسیقی میں بھی کمال نہ حاصل کرے۔

مسلم فلاسفہ میں ابوالنصر فارابی کا درجہ ارسطو کے بعد ہے معلم ثانی کہا جاتا ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کا موسیقار اور الغوزہ کا موجد ہے۔

ہندوستان میں امیر خسروؒ ایسا علامہ روزگار اور صاحبِ معرفت صوفی موجودہ موسیقی کا موجد ہے اس نے ہندی اور عجمی موسیقی کے امتزاج سے ایک طرز نو ایجاد کیا۔ بہت سے سُر ایجاد کئے۔ غارا۔ سرپروا۔ زیلفہ وغیرہ۔

لکھنؤ میں تفضل حسین خاں علامہ جن کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کا قول ہے کہ ابوالفضل اور سعد اللہ خاں شاہجہانی کے بعد اگر کسی کو علامہ کا خطاب زیب دیتا ہے تو وہ تفضل حسین خاں ہیں۔ یہ اعلیٰ درجہ کے مغنی تھے فلسفہ اور فقہ کا درس بھی دیتے تھے۔ خود مولانا ابوالکلام آزاد با کمال نے نواز تھے۔ غبارِ خاطر میں انھوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔

مردِ مومن حضرت اقبال ستار خوب بجاتے تھے۔

موسیقی کی غایت | یہ ایک لحن موزوں ہے اسکی غرض۔ تخلیق بات کو موثر بنانا ہے کیونکہ اس سے طبیعت کو فرحت وسرور حاصل ہوتا ہے نفوس اس کو بہت جلد قبول کر لیتے ہیں اور دلوں کے مخفی راز باہر آجاتے ہیں۔ خدا رسی کے لئے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں۔

حکماء کہتے ہیں کہ اگر موسیقی اپنی   میں کامل ہو تو فضائل سے نزدیک اور رذائل سے دور کر دیتی ہے اور یہی اسکی غرض ایجاد ہے فلسفیوں

نے اسے رزائل کے لیۓ نہیں ایجاد کیا ہے ۔

قدیم ہندوستان میں عورتیں مندروں میں معرفت کے ترانے گاتی تھیں.
جن سے جذبات معرفت بھڑک اٹھتے تھے اور وہ ایک بڑی عبادت سمجھی جاتی تھی ۔

مسلمانوں میں صوفیا اسے غذائے روح کہتے ہیں ۔ سماع کی محفلوں میں معرفت کے ترانے انھیں بے چین کر دیتے ہیں اور جذبات معرفت کے چشمے ان کے سینوں سے ابلنے لگتے ہیں ۔ مخفی راز ان کے سینوں سے باہر نکلنے لگتے ہیں حق ہے حق ہے ہو حق ہو حق کہتے اور بقدر ظرف ہر ایک پر ایک عام کیف و مستی طاری ہو جاتا ہے کوئی وجد میں آکر جھومنے لگتا ہے کوئی بے اختیار ہو کے ناچنے لگتا ہے کسی کی آنکھوں میں آنسو آبلنے ہیں اور بعض شدت مودت میں واصل بحق ہو جاتے ہیں ۔

۱۲۷۶ء کا واقعہ ہے کہ مولانا سماء الدین پر ایک محفل سماع میں ایسی غشی طاری ہوئی کہ وہ رفیق اعلیٰ سے جا ملے ۔

۱۲۶۰ء میں مولانا ابو الفتح ایک محفل سماع میں بیٹھے تھے ۔ مغنی غزل گا رہا تھا جب اس نے یہ شعر گایا ؎

جاں بجاناں دہ وگرنہ از تو بستاند اجل ∴ خود تو منصف باش اے آنکو یا این نکو

مولانا بے قرار ہو گئے اور ان نکو ان نکو کی تکرار کرتے کرتے جان سپرد جاناں کر دی اس صورت میں موسیقی وہ بہترین عبادت ہے جو واصل بحق کر دیتی ہے۔ اس کو حکماء نے کہا ہے کہ یہ خدا رسی کا ذریعہ ہے ۔

اکثر فقہائے اہل سنت اس کے جواز کے قائل ہیں اور اس پر استدلالی رسالے لکھے ہیں ۔

بعض فقہائے شیعہ بھی نغمات معرفت کا سننا جائز سمجھتے ہیں اور بعض شادی کے موقع پر جوازِ غنا کے قائل ہیں۔

آنحضرتؐ جب مدینہ تشریف لائے تو انصار کی لڑکیاں طَلَعَ البدرُ علینا کا ترانہ گاتی ہوئی گھروں سے باہر نکل آئیں اور پیغمبر خدا نے ان کو منع نہیں کیا۔ کیونکہ یہ اُن کے دلی جذبات مسرت تھے جو غنا کی صورت میں ان کے دل سے نکل رہے تھے اور ان کو فضائل سے نزدیک کر رہے تھے۔

خاتون جنت جب رخصت ہو کے علیؑ کے گھر جانے لگیں تو ان کی سواری کے آگے جوانان بنی ہاشم علم لئے ہوئے پیچھے انصار و مہاجر عورتیں ازواج رسول اور بنی ہاشم خوشی کے ترانے گا رہی اور خدا کا آخری پیغمبر ساتھ تھا

ہاں اوباشی کی باتیں عیاشی کی غرض سے گانا اور سننا حرام اور موسیقی کی غرض تخلیق کے خلاف ہے مگر اس وجہ سے اس کو بالکل ممنوع قرار دینے سے اس کی افادیت سے بھی محرومی ہو جائیگی۔

اکثر عمل کے اچھے بُرے جائز ناجائز دونوں پہلو ہوتے ہیں اگر ناجائز پہلو کی وجہ سے اس کو قطعی طور پر منع کر دیا جاتا تو اس کا جائز فائدہ بھی ختم ہو جائیگا

لہ اس وقت عرب کی موسیقی اسی حد تک تھی۔ حضرت عثمان کے زمانہ سے اسکو ترقی ہوئی اور ہارون الرشید نے اس کو بام عروج پر پہنچایا یہاں تک کہ اسکی محل سرائی میں بھی گانا ہوتا تھا اور وہاں کی گانے والیوں کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ البرامکہ ص ۳۲

جماع جائز و ناجائز دونوں طرح سے ہوتا ہے ناجائز کے نتائج نہایت ہولناک ہیں۔ زانی و زانیہ دونوں سنگسار ہوتے ہیں اولاد معاشرہ میں حقیر اور باپ کی میراث سے محروم ہو جاتی ہے۔ اگر اس قباحت شدید کی وجہ سے اس کو بالکل روک دیا جائے تو نسلِ انسانی ختم ہو جائے گی۔

نفع و ضرر کے دو پہلو خود قرآن نے انہی خصوصیت کی بنا پر بتائے ہیں۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا

بہتیرے اس سے گمراہ ہوتے ہیں اور بہتیرے ہدایت پاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ غلط مفہوم سمجھنے والے گمراہ ہوتے ہیں اور صحیح مفہوم پانے والے ہدایت پاتے ہیں کیا گمراہی کے اندیشے سے قرآن کا پڑھنا اور سمجھنا حرام قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہی صورت موسیقی کی بھی ہے اس کا صحیح مصرف عبادت اور غلط معصیت ہے۔ معصیت کی وجہ سے اس کو کلیتہً حرام قرار دینا اس کے افادی پہلو کو جو ایک بڑی عبادت ہے ختم کر دینا ہے جو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کے لحاظ سے یہ فن لطیف ہے اس کی بقا و ترقی کی کوشش فن کی سرپرستی ہے اور قابل ستائش ہے۔

واجد علی شاہ نے اسے ایک فن شریف کی حیثیت سے اختیار کیا تھا اور اسکی ترقی کے خواہاں تھے۔ پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب لکھتے ہیں۔

ناچ گانے سے واجد علی شاہ کو حظ نفس مقصود نہ تھا ان کے نزدیک اچھے گانے کا معیار رُلا دینا تھا جس کا ذکر انھوں نے اپنی کتابوں میں بارہا کیا ہے کلکتہ میں ناچنے گانے والوں کے جو جلسے انھوں نے مرتب کئے ان میں سے دو کے متعلق لکھتے ہیں:۔

راہ معاملہ والیوں اور سلطان خانے والیوں پر ایسی ایسی محنتیں کیں کہ
صبح کا کھانا شام کو اور شام کا صبح کو نصیب ہوا مگر آخر کاران صاحبوں نے
بسبب تاثیر صحبت شبانہ روزی ڈوم ڈھاڑیوں کا سا مزاج پیدا کیا.....
علم کی طرف توجہ نہ کی مزے کی طرف رجوع ہوئیں سلہ

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ موسیقی کو مزے کے لئے
نہیں بلکہ علم کی حیثیت سے سیکھنا چاہتے تھے وہ اس کے لئے خود بھی بڑا ریاض کرتے
اور دوسروں سے بھی اسکی توقع رکھتے تھے ڈوم ڈھاڑیوں کا سا مزاج ان کو
بہت ناپسند تھا.......

ہندوستان کی پیچیدہ اور مشکل کلاسیکی موسیقی کو آسان اور عام پسند
بنانا ان کا خاص کارنامہ ہے اور لکھنوی ٹھمری اور بھیرویں کی مقبولیت انھیں کی
مرہون منت ہے........"

(لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ص ۱۹ تا ۲۱)

انھوں نے اس فن کے کتنے باکمال جمع کئے تھے ان کی صحیح تعداد بتانا مشکل
ہے ایک معمولی سا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک لاکھ روپیہ پنشن پانے
کے بعد مٹیا برج میں ان کے ساتھ اس فن کے جاننے والے تین سو تریسٹھ تھے جن کی
تفصیل خود انھوں نے اپنے قلم سے لکھی ہے اب لکھنؤ میں ان کے ساتھ کتنے ہوں گے
اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

انیس الدولہ، رضی الدولہ وغیرہ سب بڑے فنکار تھے۔ پریاں اور رہس
والیاں جن کی بہت سی ٹولیاں تھیں سب موسیقی و رقاصی میں کمال رکھنے والوں
کے گروہ تھے جنھیں بڑی محنت سے یہ فن سکھایا گیا تھا۔ اور اسی کے ساتھ انھیں

علم دین کی تعلیم بھی دی گئی تھی جس کے لیے مولوی مرزا احسن کو مامور کیا گیا تھا وہ ایک الگ مکتب میں ان سب کو پڑھاتے تھے جہاں موسیقی کی تعلیم ہوتی تھی دربار انہیں بیٹھتے تھے۔

خاندان نائیکن کے پانچ باکمال پیارے خان۔ جعفر خاں۔ حیدر خان۔ باسط خان۔ محمد علی خان موجود تھے۔

نعمت اللہ خاں شاگرد باسط خان بھی بڑے باکمال تھے۔ واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج چلے گئے تھے نظام الدین احمد خاں استاد الکل کہے جاتے تھے۔

چھوٹے خاں دہلوی عہد امجد علی میں دہلی سے آئے انیس الدولہ خطاب ملا یہ بھی واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتے چلے گئے۔

حیدر علی خاں اور چھجو خاں دھرپد اور خیال گانے میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے۔ دولے خاں دھرپد گانے میں مشہور تھے

لکھنؤ میں

بینی پرشاد کتھک موسیقی میں کامل ہونے کے ساتھ ناچنے میں کمال رکھتا تھا۔

ٹھاکر پرشاد اور درگا پرشاد محمد علی شاہ کے زمانے سے دربار سے منسلک تھے اور ناچنے میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔

مغل جان طوائف ناچنے میں چٹے کا ہاتھ دکھاتی تھی دور دور اسکی شہرت تھی۔

خدا بخش طوائف حسن و جمال میں بے مثال اور ناچنے میں

بے نظیر تھی۔

طبلہ نواز۔ محمد حسین خاں عرف محمد طبلہ بجانے میں کمال رکھتا تھا۔ یہ شعر اس کے طبلہ سے صاف سنائی دیتا تھا۔

ترے پر سے جھڑنے لگے شرر نہ تڑپ تو بلبل زار بس
جلے گا قفس، جلے گا قفس جلے گا قفس، جلے گا قفس

مردنگ نواز:۔ پنڈت بھیرو دت مردنگ بجانے میں کمال رکھتے تھے بڑے بڑے طبلہ نوازان کا ڈھول سننے آتے تھے بڑا کمال ان کا یہ تھا کہ ہر ساز کی آواز ڈھول سے پیدا کرتے تھے۔

پکھاوجی۔ مہدی حسن خاں پکھاوج کے استاد تھے بڑے بین کاروں کو انھوں نے ہرا دیا۔

سارنگی نواز۔ شرعی طوائف ستار بجانے میں استاد حسین بخش کی شاگرد کوئل کی طرح کوکتی اور بلبل کی طرح چہکتی۔

ستار نواز:۔ سورج دین کتھک ستار بجانے میں یکتائے زمانہ تھا۔ غلام محمد خاں ستار بجانے میں ایسا کمال رکھتا تھا کہ ہاتھ میں گلے کا انداز پیدا کیا تھا۔

یہ سب چوٹی کے استاد فن تھے جن کے شاگرد ہزاروں کی تعداد میں لکھنؤ میں موجود تھے

رؤسا میں نواب گیتی آرا بیگم۔ حضور عالم۔ نواب علی نقی خاں
کی صاحبزادی جلترنگ خوب بجاتی تھیں اور ان کے بھائی
نواب عنایت الدولہ سجاد علی خاں سرسنگار اور پیانو بجانے
میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے۔

ایک عجیب شخصیت | نواب ضیغم الدولہ سید زین العابدین خاں انگریزی۔ فرانسیسی۔ جرمنی روسی اور فارسی زبانیں خوب جانتے تھے اردو ان کی مادری زبان تھی علم جفر سے واقف تھے شاعر تھے خطاط تھے اور اتنے زود نویس کہ ایک منٹ میں ایک صفحہ کے حساب سے لکھتے تھے بنوٹ میں کمال تھا موسیقی کے سمندر کہے جاتے تھے فارسی پنجابی اور بنگالی گیت خوب جانتے تھے انگریزی راگ راگنیوں اور دھنوں کو اس طرح گاتے تھے کہ لوگ پھڑک جاتے تھے۔

سرسنگھار۔ سارنگی۔ طبلہ۔ پکھاوج۔ بانسری۔ پیانو۔ ہارمونیم۔ بین بجانے میں کمال تھا۔ ایسی جامع کمالات شخصیت دنیا میں کم پیدا ہوئی ہوگی۔

ڈرامے کی ترقی | واجد علی شاہ کے کچھ تفریحی مشاغل بھی تھے جنھیں بظاہر لہو لعب سمجھا جاتا ہے جیسے ڈراما۔ رہس۔ میلے مگر اس کے ادبی اور سیاسی فوائد بھی ہیں

مغل شہنشاہ اکبر اعظم دسہرہ کا جلوس نکالتا تھا۔ ہولی اور دیوالی کا تہوار مناتا تھا۔ نوروز کا جشن منعقد کرتا تھا۔ عیدین کا دربار ہوتا تھا۔ مینا بازار لگاتا تھا۔ اس کی اصل غرض رعایا کو اپنے سے نزدیک اور ان کے دلوں میں گھر کرنا تھا۔

اودھ کے اکثر حکمراں بھی ہولی اور دیوالی کے تہوار بڑی دھوم سے مناتے تھے اور عیدین کا دربار بھی منعقد کرتے تھے۔ ان سب میں ہندو و مسلمان

برابر سے شریک رہتے تھے۔

واجد علی شاہ کو بھی یہ باتیں میراث میں ملی تھیں مگر انھوں نے اپنے پیش روؤں سے بہت زیادہ کیا ان سے بہت زیادہ ہر دلعزیزی بھی حاصل کی وہ ڈرامے اور میلے کرتے تھے اگر صرف تفریح مقصود ہوتی تو وہ اپنے مخصوصین کے ساتھ جشن منا لیتے مگر وہ اپنی رعایا کو بھی مدعو کرتے تھے۔ قیصر شاہی ان کے لئے کھل جاتا تھا۔ بادشاہ ان کی دعوت کرتے تھے اور اس کے انتظام میں خود شریک ہو جاتے تھے۔ رعایا میں اس طرح گھل مل جاتے تھے کہ رعایا اور ان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا تھا۔ اس نے رعایا کو ایسا جاں نثار بنا دیا تھا کہ دنیا میں کسی رعایا نے اپنے بادشاہ کو اتنا محبوب نہیں رکھا جتنا واجد علی شاہ کو ان کی رعایا محبوب رکھتی تھی جس کے مظاہر سلطنت کی ضبطی کے بعد سامنے آئے اس کے علاوہ ڈرامے سے ایک ادبی صنف زندہ ہو گئی یہ معمولی بات نہیں ہے اس کے متعلق پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب نے ایک تحقیقی کتاب لکھنؤ کا شاہی اسٹیج لکھی اس کے بعض ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

ناٹک کے فن پر ان کا احسان موسیقی سے بھی زیادہ ہے۔ یہ فن ہمارے ملک میں بالکل ذلیل ہو چکا تھا اور صرف ادنیٰ طبقوں میں بہت بگڑتی ہوئی صورت میں باقی رہ گیا تھا۔ واجد علی شاہ نے اس کو ذلت کے گڑھے سے اٹھا کر عزت کے سنگھاسن پر بٹھا دیا اور گلی کوچوں سے نکال کر شاہی محل میں پہنچایا۔ فنون لطیفہ کے اس عظیم سرپرست نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا اس کی تفصیل تو آئندہ ورقوں میں ملے گی یہاں صرف ایک بات کہنا ہے واجد علی شاہ سر سے پاؤں تک پکے ہندوستانی تھے انگریزوں سے انھیں مطلق انس نہ تھا اور ان کے دربار

میں انگریزوں کا ذرا سا بھی دخل نہ تھا کلکتے اور بمبئی میں انگریزی طرز کے اسٹیج مدت سے قائم تھے اور اس کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرلینا ان کے لیے کچھ بھی مشکل نہ تھا مگر انھوں نے لکھنؤ میں جس اسٹیج کی بنیاد ڈالی وہ خالص ہندوستانی تھا اس میں ہندوستان کے قدیم اسٹیج کی پیروی قدم قدم پر نظر آتی تھی۔ .... واجد علی شاہ کے زمانے تک اردو میں ڈرامے کا وجود نہ تھا اس اہم صنف ادب کی بنیاد ڈالنے کا فخر ان کے لئے اٹھ رہا تھا۔

ڈرامے کا خیال کیوں پیدا ہوا سال بھر سے زیادہ بیمار رہنے کے بعد ۱۲۶۶ء میں بادشاہ کو امراض سے نجات ملی ..... انہیں دنوں دو بیٹوں اور ایک بھانجی کی شادی رچائی ان میں سے ایک بیٹی نے مانجھے سے فراغت پاکر عین رخصتی کے دن انتقال کیا اس شہزادی کی والدہ عزت محل جو دق وسل میں مبتلا تھیں اس صدمے کو برداشت نہ کرسکیں اور بیٹی کا چالیسواں بھی نہ ہوا تھا کہ انھوں نے انتقال کیا اسکے بعد تھوڑے ہی دنوں میں ایک مدخولہ عجائب خانم کا انتقال ہوگیا۔ ان پیہم صدموں سے وہ بہت متاثر ہوئے اور غم غلط کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے اس سلسلہ میں وہ خود فرماتے ہیں

یہ صدمے کہاں تک بھلا جھیلیے ۔۔۔ لگے جس میں دل کھیل وہ کھیلیے
تعشق کا دریا جو ہے مثنوی ۔۔۔ عجائب تماشا ہے جو مثنوی
ہوا مجھ کو الہام یہ ناگہاں ۔۔۔ کہ ہو نقل سے اصل یہ داستاں

یہ مثنوی دریائے تعشق کو نقل سے اصل کردینے یعنی اس کا ڈرامہ بناکر کھیل تیار کرنے کا خیال ۱۲۶۶ھ میں پیدا ہوا ... اس نئے کھیل کو کرشن کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں مگر یہ بھی رہس قرار پایا .... اس نئے جلسے کا

تیاری میں تین لاکھ روپیہ ماہوار صرف ہوتا تھا ....

نواب اقتدارالدولہ واجد علی شاہ کے پھپھا تھے اور رہس کے جلسوں میں برابر شریک ہوا کرتے تھے انھوں نے جلسوں کا آنکھوں دیکھا حال تفصیل سے بیان کیا ہے یہاں وہ بیان کسی قدر اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے انگریزی باجے بجتے ہوئے اور روشن چوکی پھنکتی ہوئی آئی اس کے پیچھے کوئی ڈیڑھ سو حسین عورتیں رنگ برنگ کے بہت بھاری پر زر جوڑے پہنے ہوئے آئیں بعض کے ہاتھوں میں گلدستے اور بعض مقیش کی چھڑیاں لئے تھیں کوئی سوا سو طبلے دو سو سے اوپر سارنگیئے اور اتنے ہی تال کی جوڑی دار ان کے ساتھ تھے وہ سب عورتیں مجمع کے سامنے کھڑی ہوگئیں ساز بجنے لگے اور وہ جھومر کا ناچ ناچنے لگیں ایک ادھر سے گلدستہ ہاتھ میں لئے ہوئے ناچتی ہوئی چلی اور ادھر سب کے بیچ سے نکل گئی وہ سب ناچتی جاتی تھیں اور چھڑیوں کی مار کرتی اور گلدستوں کی بہار دکھاتی جاتی تھیں اس وقت کا پرستانی سماں بیان سے باہر ہے۔ کوئی چار گھڑی جھومر کا ناچ ہوتا رہا اسی کے بعد وہ سب عورتیں حضرت کا آداب بجالاکر ایک جگہ کھڑی ہوگئیں اور ایک ایک عورت ناچنے لگی۔

جب یہ ناچ ختم ہوا تو ایک کارچوبی مسند لاکر بچھائی گئی اور ایک شخص بادشاہ بن کر اس پر آکر بیٹھا اور سب عورتیں یہ گانے لگیں۔ جان عالم رہس مبارک جان عالم رہس مبارک۔ پھر اس بادشاہ کا وزیر اور امیر امرا حاضر ہوئے، بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ میرے یہاں اب تک کوئی اولاد نہیں ہوئی میرے بعد اس تاج و تخت کا مالک کون ہوگا۔ وزیر نے عرض کیا غلام نجومیوں اور پنڈتوں کو بلاتا ہے۔ حضرت ان سے دریافت فرمائیں۔ وزیر کے حکم سے ایک

چوبدار کیا اور نجومیوں اور پنڈتوں کو لاکر حاضر کیا بادشاہ کے دریافت کرنے پرانھوں نے اپنے اپنے علم میں بچار کر کے عرض کیا کہ کسی درویش کی دعا سے آپ کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوگی وہ سب حسب مرتبہ خلعت پاکر رخصت ہوئے۔

اب وزیر بادشاہ کے حکم سے کسی صاحب کمال درویش کی تلاش میں نکل کر صحرا بہ صحرا چلا تو اس رہس میں ایک صحرا بھی بنا ہوا تھا اور اس میں ایک چبوترہ تھا سنگ مرمر کا اس پر ایک بہروپیئے سے ایک درویش بنوا کر بٹھایا تھا۔ اس چبوترے کا زینہ تلوار کی دھار کا تھا وہ درویش اس پر پاؤں رکھ کے چڑھتا اترتا تھا وزیر یہ کیفیت دیکھ کر واپس آیا اور درویش کی کرامت بادشاہ سے بیان کی بادشاہ وزیر کے ساتھ درویش کے پاس گیا وہ بڑی بے نیازی سے پیش آیا اور بہت منت سماجت کے بعد ملاقات ہوئی بادشاہ نے اس کے قدموں پر سر رکھ دیا اور اپنا مطلب عرض کیا اس نے کہا کہ وہ سامنے جو سیب کا درخت ہے اس سے ایک پھل توڑ لاؤ پھر کچھ پڑھ کر اس سیب پر دم کیا اور بادشاہ کو دیا کہ آدھا تم کھانا اور آدھا ملکہ کو کھلانا خدا کی عنایت سے تمہارے یہاں اولاد ہوگی بادشاہ سیب لے کر "درویش کا آداب بجالاکر" اپنی جگہ پر واپس آیا قریب ہی ایک مصنوعی محل تھا وہ اس محل میں داخل ہوا اور درویش کی ہدایت پر عمل کیا جب دو مہینے اس بات کو گذر گئے تو خواجہ سرا نے ملکہ کے حمل کی خوش خبری سنائی بادشاہ نے شکر کا سجدہ کیا اور دو رکعت نماز ادا کی بادشاہ کے حکم سے اس خوشی میں توپیں چھوٹیں وزیر اور خواجہ سرا کو خلعت عنایت ہوئے۔ حمل کے ساتویں مہینے ستوانسے کی رسم ادا کی گئی اور نو مہینے کے بعد غزالہ پیدا ہوئی اس کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا۔

دوسرے دن پھر اسی طرح واجد علی شاہ شہ نشین پر اور سب عزیز

شہزادے اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے اُسی طرح رہس مبارک آیا اور اسی طرح پہلے عورتوں کا ناچ ہوا اس کے بعد اسی طرح بادشاہ مسند پر بیٹھا اور سب وزیر و امیر حاضر ہوئے وزیر نے بادشاہ سے عرض کیا کہ آج غزالہ کی چھٹی آرہی ہے بادشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ پھر چھٹی بڑی دھوم سے آئی آگے آگے گھوڑوں پر نوبت بجتی ہوئی اسکے بعد عملہ، چوبدار، برچھی والے، بھالے والے، بان دار، خاص بردار کوئی ہزار نفر اس کے بعد ایک جھولا پالنا ایک کارچوبی اوقچے کی چھوٹی سی طلائی پلنگڑی اور کوئی سو کشتیاں جن میں ہنسلی کڑے بیکل سب طلائی جواہر نگار اور مینا کار جھنجھنے اور کھلونے سب طلائی اور جواہر نگار بادشاہ اور زچہ کے واسطے خلعت اور غزالہ کے لیئے بھاری کرتے اور ٹوپیاں تھیں اتنا جلوس تھا کہ کوئی چھ گھڑی رات گئے چھٹی کی آمد شروع ہوئی اور دو پہر رات گئے وہ آکے پہنچی اسکے بعد زچہ گود میں بچہ لئے ہوئے تارے دیکھنے نکلی اس طرح کہ بہت سی عورتیں ننگی تلواروں کا سایہ کئے ہوئے ہاتھوں میں قرآن لیئے ہوئے اور دائی ایک طلائی سینی میں چومک لئے ہوئے زچہ نے طلائی چوکی پر کھڑے ہوکر تارے دیکھے اور بادشاہ زچہ کے چپر کھٹ پر ایک پیر رکھ کر کھڑا ہوا ادھر زچہ تارے دیکھ کر پھری اور چھپر کھٹ پر بیٹھی ادھر بادشاہ نے مرگ ماری ہزار روپے مرگ مارنے کے ملے۔

اس کے بعد جلسہ برخواست ہوگیا۔

رہس کے پہلے دن ارباب نشاط کی داروغہ حیدری طوائف نے زچہ کا پارٹ کیا تھا اور آج بھی وہی زچہ بنی تھی جو عورتیں تلواروں کا سایہ کئے ہوئے اور قرآن ہاتھوں میں لئے، زچہ کے ساتھ تھیں وہ سب رہس والیاں تھیں۔

پھر شام کو روشن الدولہ کی کوٹھی قیصر منزل میں جلسہ ہوا ...... آج کی صحبت

رہس والیاں پریاں بنیں ان کے پر سلمہ ستارے کے کارچوبی تھے۔

دوسرے دن شاہ زادے معشوق منزل میں جمع ہوئے۔

لکھنؤ کا شاہی اسٹیج صفحہ

مختلف مقامات پر اس قصہ کے مختلف ٹکڑوں کی نقل کی گئی اور ہر جلسے میں نقل اصل معلوم ہوتی تھی برات کا آنا ساچق مہندی وغیرہ تمام رسمیں اسی طرح ہوئیں جیسے شاہی محل میں ہوا کرتی تھیں غالباً ساتویں دن اس ڈرامے کا وہ حصہ کھیلا گیا جس کی نقل بہت اہم ہے یعنی دو بادشاہوں میں اس طرح خونریز جنگ ہوئی کہ کہیں سے نقل معلوم نہ ہوتی تھی اسکی کیفیت بھی پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب کے الفاظ میں سنیئے :۔

"دوسرے دن سب شاہ منزل کے سامنے جمع ہوئے واجد علی شاہ زرہ بکتر، چارآئینہ خود اور دستانے پہن کر سب ہتھیار لگا کر تخت شاہی پر بیٹھے شاہی فوج میدان میں پرا جما کر کھڑی ہوئی ایک طرف سے لال شاہ اپنی فوج کے ساتھ ہاتھی پر سوار آیا دوسری طرف سے استبرق شاہ آیا لڑائی شروع ہوئی اور تلوار چلنے لگی آخر لال بادشاہ کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کر قلعہ بند ہو گیا۔ استبرق شاہ نے قلعہ پر دھاوا کر دیا اور قلعہ پر سے بھی مار پڑنے لگی آخر استبرق شاہ فتحیاب ہوا اور قلعہ میں جا کر لال شاہ کا سر قلم کر دیا اس کے لشکر میں شادیانے بجنے لگے۔ لال پری باپ کا سر اپنے سامنے رکھ کر روتی رہی اور سر کو اپنے ساتھ لئے ہوئے اپنے مکان کی طرف چلی گئی کوئی دو گھڑی دن رہے جلسہ ختم ہوا قلعہ کاغذ کا ایسا بنایا تھا کہ بالکل اصلی معلوم ہوتا تھا فصیلوں پر توپیں چڑھی ہوئی تھیں گولہ انداز مستعد کھڑے تھے اور تیر انداز تیر کمان سے

لیس کھڑے تھے کچھ ایسی تدبیر کی گئی تھی کہ لڑائی میں جب کسی پر تلوار پڑتی تھی تو خون نکلتا تھا۔ قلعہ کی جنگ بالکل سچ مچ کی معلوم ہوتی تھی۔

جلسے کا اجمالی بیان سرور کی زبانی :۔ رہس کے نئے جلسے کے متعلق رجب علی سرور لکھتے ہیں۔

رہس مبارک بے مشورہ غیرے ایجاد ہو چکا ہے صدہا ملازمین کو فیض تعلیم سے آراستہ کرنے سے اس کا کام یاد ہو چکا ہے۔ بڑے دھوم دھام کے اژدھام کے جلسے رہے صبح و شام کے جلسے رہے ناچ نرالے تال سر سے متاثر ہر مست ناز ہے۔ جو ساز و سامان ہے نرالا ہے لاکھوں روپیہ خرچ ہو گیا جو چیز ہے نادر ہے متفق اللفظ سب کا کلام ہے اس سے بہتر اللہ کا نام ہے۔

رہس کے جلسے کا تفصیلی حال بیان کرنے کے بعد اقتدار الدولہ لکھتے ہیں کہ ایک مہینہ دس روز یہ سب سامان رہا لیکن انھوں نے صرف چودہ صحبتوں کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحبتیں روز نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان کے درمیان کچھ کچھ وقفہ بھی ہوتا رہتا تھا آخری صحبت خود ان کے بیان کے مطابق پچھلی صحبت کے دو دن بعد ہوئی تھی۔ . . .

بمبئی کے پارسیوں نے جب ناٹک کمپنیاں قائم کرکے اردو ڈراموں کے لئے ایک نئی طرح کا اسٹیج قائم کیا اور اس اسٹیج کے لئے نئی طرح کے ڈرامے لکھے جانے لگے تو واجد علی شاہ کی مثنوی دریائے تعشق سے بھی بہت کچھ رد و بدل حذف و اضافہ کرکے چند ڈرامے تیار کئے گئے ایسے دو ڈرامے میرے علم میں ہیں ایک کا نام نیرنگ قاف معروف بہ عزالہ ماہ رو جس کو زمانے میں مشہور ڈرامہ نگار منشی محمد الف خاں حباب رامپوری نے تالیف کیا اور چار سال بعد ۱۹۰۰ء میں محمد وزیر

مالک مطبع گلزار محمدی لکھنؤ نے شائع کیا اس کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیٹھ نوروزجی کی اوریجنل وکٹوریہ ناٹک کمپنی بمبئی نے یہ کھیل اس خوبی سے دکھایا کہ دیکھنے والوں کو برسوں یاد رہا اس کا آخری سین جس میں لال پری کا خنجر مارنا اور زہر پینا دکھایا گیا تھا بہت ہی پراثر تھا اس ڈرامے کا ایک مطبوعہ نسخہ راقم کے کتب خانے میں موجود ہے دریا کے تعشق پر دوسرا ڈرامہ اس وقت کے ایک ایکٹر سید نذیر حسن شفیق اکبرآبادی عرف چھوٹے میاں نے ترتیب دیئے کر جون ۱۹۰۱ء میں شائع کیا۔ یہ ڈرامہ میری نظر سے نہیں گزرا لیکن مذکورہ بالا ڈرامے کے سرورق کی پشت پر جو فہرست کتب درج ہے اس میں اس کا لمبا سا بے ڈھنگا نام اس طرح لکھا ہوا ہے "غزالہ ماہ رو دخلیق معروف بہ حیرت افزا"۔

اس کے بعد انھوں نے اپنی دو اور مثنویاں افسانۂ عشق اور بحرالفت کا ڈرامہ تیار کیا۔

جوگیا میلہ | اس میلے کے متعلق پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب لکھتے ہیں:۔

"واجد علی شاہ کی پیدائش کے وقت جوتشیوں نے زائچہ دیکھ کر بتایا تھا کہ اس بچہ کی قسمت میں جوگی ہوا ہے طالع کی یہ نحوست اسی طرح دور ہو سکتی ہے کہ یہ بچہ ہر سال گرہ کے موقع پر جوگی بنا دیا جایا کرے۔ جوتشیوں کی اس ہدایت کے موافق بچہ کی والدہ ہر سال اس کی پیدائش کے زمانے یعنی ساون کے مہینے اس کو جوگی بنایا کرتی تھیں۔ جوگی بننے کی یہ رسم محل کے اندر ہر سال ادا کی جاتی تھی۔ اور غالباً اس موقع پر کوئی جشن یا جلسہ نہیں کیا جاتا تھا۔۔۔۔۔۔

حضور باغ | ولی عہد بہادر نے کئی باغ بہت پر فضا کئی کئی لاکھ روپے کے صرف سے تیار کئے تھے ان میں سے ایک کا نام حضور باغ[1] تھا اس میں دو نہریں بہت

---

[1] حضور باغ کا تفصیلی حال خود واجد علی شاہ نے لکھا ہے دیکھیے عشق نامہ فارسی صـ ۱۲۹

بہت خوشنما تھیں ایک کا نام چشمۂ شیریں دوسری کا نام چشمۂ فیض تھا۔ نہروں کے چاروں طرف فوارے تھے جگہ جگہ سنگ مرمر کے مجسمے، چینی مرتبان اور پتھر کے گلدستے رکھے تھے بڑے بڑے گنجان درختوں کے نیچے سنگ مرمر کی چوکیاں بچھی ہوئی تھیں۔ شہتوت کا بہت ہی بڑا اور چھتنار درخت تھا اتنا بڑا درخت کہیں دیکھنے میں نہیں آتا اس کے نیچے سنگ مرمر کا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ ہر جمعہ کو اس درخت کے نیچے پریوں اور گوپیوں کا مجمع ہوتا تھا[۵۸] اس باغ میں ہر محفل کے لئے ایک نہایت آرام دہ مکان بنایا گیا تھا جاڑوں کے لئے شہنشاہ منزل گرمیوں کے لئے خاص مکان اور برسات کے لئے ایک بنگلہ۔ فلک سیر نام باغ کے بیچوں بیچ میں تھا اسی حضور باغ میں ولی عہد نے اپنے جوگی بننے کی سالانہ رسم کو ایک جشن اور ناچ گانے کے جلسے کی صورت دے دی پہلی مرتبہ یہ جشن جس طرح منایا گیا تھا اس کا تفصیلی بیان خود واجد علی شاہ نے فارسی میں لکھا ہے اس بیان کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جوگی بننے کا جشن | ایک مرتبہ جبکہ چاروں طرف گھٹائیں گھری ہوئی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی حضور باغ حسین وجمیل عورتوں سے پرستان بنا ہوا تھا اس عالم میں ولی عہد بہادر اس شان سے جوگی بنے کہ جوگی سا زو سامان بدن پر زرنگار سا ڈوپٹا کمر میں لپٹا ہوا سچے موتیوں کی راکھ چہرے پر لگی ہوئی جوگیانہ اور موتیوں کا کنٹھا گلے میں بیراگن ہاتھ میں "اودیا سو" کا نعرہ زبان پر معشوقۂ خاص اور سکندر بیگم جوگنیں بنیں

---

[۵۸] سنسکرت کی قدیم کتاب ہری رنس میں ہے کہ جنگل میں گھومتے پھرتے ایک دن سری کرشن اور ان کے ساتھ کے لڑکوں نے برگد کا ایک بہت بڑا درخت دیکھا جو ایک وسیع رقبے میں پھیلا ہوا تھا اس دن سے کرشن اس عظیم الشان درخت کے نیچے روز لڑکوں کے ساتھ طرح طرح کے کھیل کھیلا

(باقی اگلے صفحہ پر)

ان کی یہ تھیں کہ سبز رنگ کی بنارسی چادروں کی کاتیاں بدن پر لپٹی ہوئی ہے موتیوں کی معطر راکھ چہروں پر ملی ہوئی سر کے بال کھلے ہوئے گوشوارے اور موتیوں کی لڑیاں چاند سے چہروں پر پڑی ہوئی سازندوں نے طرح طرح کے ساز چھیڑے اور مطربوں نے نغمے کی آواز آسمان تک پہنچائی، کوئی آنکھ نہ تھی جو نم نہ ہو کوئی دل نہ تھا جو بیتاب نہ ہو اتنے میں جوگی جی جوگنوں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے اس ساز و آواز کے ہنگامے میں سے گزرے راگ رنگ ہوا سے برس رہا تھا دیکھنے والوں کو ایک پرستانی طلسم نظر آرہا تھا۔ بے خودی کا عالم طاری تھا یہ حالت تھی کہ

شجر مست گل مست ہر خار مست زمیں مست، در مست، دیوار مست [۱۵]

یہ مجمع اسی بے خودی کے عالم میں پہروں رہے رہے روانہ ہوا اور شام کے قریب باغ کے ایک کنج کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ سحر طراز مغنیوں نے بھیرں کی راگنیوں اور جنگلے میں ناگر کا خیال گانا بجانا شروع کیا

کر سانولا سے یاری ہیں جو کسی بھئی رسے" [۵۰]

کرتے تھے (حیات و تعلیمات سری کرشن ص ۱۵-۱۵)

کچھ عجب نہیں کہ واجد علی شاہ نے اس بات کو نظر میں رکھ کر پریوں کے ہفتہ وار اجتماع کے لئے شہتوت کا یہ عظیم الشان درخت منتخب کیا

[۱] ایک طوائف اچھے صاحب نام جو والی کہلاتی تھی (محل خانہ شاہی ص ۵۹)

[۲] ایک طوائف امراؤ نام جو عمدہ خانم والی کہلاتی تھی محل خانہ شاہی ص ۶۶ لکھنؤ کا سکندر باغ کا سکندر بیگم کے نام سے موسوم ہے۔

[۵] عشق نامہ منظوم ۵۴ اس مقام کو عشق نامہ منظوم میں یوں لکھا ہے

مسرت جو تھی مطربوں کو کمال یہ اس وقت ناگر کا گایا خیال

ہوئی ریت پھر سانولا سے نئی میں جوگن بھئی رے میں جوگن بھئی

کبھی راگ جنگلے کا گانے لگے بیابانِ وحشت دکھانے لگے

عشق نامہ منظوم ص ۳۳۸

پھر جوگی جی بیراگن کو بغل کے نیچے اور داہنا پیر بائیں ران پر رکھ کر شیر کی طرح بیٹھ گئے۔ ان کی رانوں کی تیاری، سینے کا ابھار، شانوں کی گولائی اور رخساروں کی چمک بیان سے باہر تھی۔ جوگنیں اس طرح ناچ گانے میں مقابلہ کر رہی تھیں کہ دیکھنے والوں پر بیخودی کا عالم طاری تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے

جب شام ہوگئی اور چاند نکل آیا تو جوگی جی نے اٹھ کر رفعت منزل کے قریب نہر پر قیام کیا مہتابیاں روشن ہوئیں اور آتش بازیاں چھوٹنے لگیں۔ ایک گھڑی رات گزری تھی کہ جوگی جی پر کنھیا کی حالت نمایاں ہوئی اور وہ طرح طرح کے جلوے دکھانے لگے پہلی جھانکی کی صورت یہ تھی کہ جینئی رنگ کا زرنگار رسالے دار دوپٹہ کمر سے لپٹا ہوا اور اس کا ایک آنچل بائیں شانے پر سے بغل کے نیچے لٹکا ہوا اور دوسرا آنچل منھ پر جس سے پھول سے رخسار نمایاں، داہنا ہاتھ سر پر اور بایاں ہاتھ خم کیا ہوا کمر پر دوسری جھانکی اس کے برعکس تھی دوپٹے کا ایک آنچل داہنی جانب بغل کے نیچے لٹکتا ہوا دوسرا منھ پر بایاں ہاتھ سر پر داہنا ہاتھ کمر پر خم کیا ہوا۔ یہ جلوے دیکھ دیکھ کر سب بے خود ہو رہے تھے۔ پری پیکر حسینائیں ناچنے گانے میں مصروف تھیں۔ جب آدھی رات گذر گئی تو یہ محفل برخواست ہوئی۔ کئی سال ساون کے مہینے میں یہ راگ رنگ کی محفل منعقد ہوتی رہی اور ہر سال نیا لطف اٹھتا رہا۔

شاہی کے زمانے میں واجد علی شاہ جوگی بننے کی سالانہ رسم اور زیادہ دھوم سے منانے لگے انھوں نے اپنی کتاب عشق نامہ ۱۲۶۶ھ میں لکھی۔ اس میں لکھا ہے کہ سال گزشتہ دبیوستہ جوگی بننے کی رسم میں معشوقہ خاص کے عوض قیصر بیگم اور سکندر محل کے عوض گلزار بیگم

۵۹ عشق نامہ فارسی ص ۱۲۶ - ۱۴۴

۶۰ ایک طوائف حسن باندی نام جو حسینی والی کہلاتی تھی محل خانہ شاہی ص ۱۳۰

۶۱ امیر بخش طوائف کی بیٹی کریم بخش - محل خانہ شاہی ص ۱۲۹

ان کی یہ تھیں کہ سبز رنگ کی بنارسی چادروں کی کاتیاں بدن پر لپٹی ہوئی ہے موتیوں کی معطر راکھ چہروں پر ملی ہوئی سر کے بال کھلے ہوئے گوشوارے اور موتیوں کی لڑیاں چاند سے چہروں پر پڑی ہوئی سازندوں نے طرح طرح کے ساز چھیڑے اور مطربوں نے نغمے کی آواز آسمان تک پہنچائی۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو نم نہ ہو کوئی دل نہ تھا جو بیتاب نہ ہوا تنے میں جوگی جی جوگنوں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے اس ساز و آواز کے ہنگامے میں سے گزرے راگ رنگ ہوا سے برس رہا تھا دیکھنے والوں کو ایک پرستانی طلسم نظر آرہا تھا۔ بے خودی کا عالم طاری تھا یہ حالت تھی کہ

شجر مست گل مست ہر خار مست — زمیں مست، در مست، دیوار مست[۱۵]

یہ مجمع اسی بے خودی کے عالم میں پہروں رہے رہے روانہ ہوا اور شام کے قریب باغ کے ایک کنج کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ سحر طراز مغنیوں نے بھیرں کی راگنیوں اور جنگلے میں ناگر کا یہ خیال گانا بجانا شروع کیا

کر سانولا سے یاری میں جو کسی بھئی رے"[۱۵]

کرتے تھے (حیات و تعلیمات سری کرشن صہ ۱۰۵)

کچھ عجب نہیں کہ واجد علی شاہ نے اس بات کو نظر میں رکھ کر پریوں کے ہفتہ وار اجتماع کے شہوت کا یہ عظیم الشان درخت منتخب کیا

سہ ایک طوائف اچھے صاحب نام جو والی کہلاتی تھی (محل خانہ شاہی صہ ۵۹)

سہ ایک طوائف امراؤ نام جو عمدہ خانم والی کہلاتی تھی محل خانہ شاہی صہ ۶۶ لکھنؤ کا سکندر باغ اسی سکندر بیگم کے نام سے موسوم ہے۔

---

۵ عشق نامہ منظوم ۵۲ اس مقام کو عشق نامہ منظوم میں یوں لکھا ہے

مسرت جو تھی مطربوں کو کمال — یہ اس وقت ناگر کا گایا خیال
ہوئی ریت پھر سانولا سے نئی — میں جوگن بھئی رے میں جوگن بھئی
کبھی راگ جنگلے کا گانے لگے — بیابانِ وحشت دکھانے لگے

عشق نامہ منظوم صہ ۳۲۸

پھر جوگی جی بیراگن کو بغل کے نیچے اور داہنا پیر بائیں ران پر رکھ کر شیر کی طرح بیٹھ گئے ۔ ان کی رانوں کی تیاری، سینے کا ابھار، شانوں کی گولائی اور رخساروں کی چمک بیان سے باہر تھی ۔ جوگنیں اس طرح ناچ گانے میں مقابلہ کر رہی تھیں کہ دیکھنے والوں پر بیخودی کا عالم طاری تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے

جب شام ہوگئی اور چاند نکل آیا تو جوگی جی نے اٹھ کر رفعت منزل کے قریب نہر پر قیام کیا مہتابیاں روشن ہوئیں اور آتش بازیاں چھوٹنے لگیں ۔ ایک گھڑی رات گزری تھی کہ جوگی جی پر کنھیا کی حالت نمایاں ہوئی اور وہ طرح طرح کے جلوے دکھانے لگے پہلی جھانکی کی صورت یہ تھی کہ چمپئی رنگ کا زرنگار رسالے دار دوپٹہ کمر سے لپٹا ہوا اور اس کا ایک آنچل بائیں شانے پر سے بغل کے نیچے لٹکا ہوا اور دوسرا آنچل منھ پر جس سے پھول سے رخسار نمایاں، داہنا ہاتھ سر پر اور بایاں ہاتھ خم کیا ہوا کمر پر دوسری جھانکی اس کے برعکس تھی دوپٹے کا ایک آنچل داہنی جانب بغل کے نیچے لٹکتا ہوا دوسرا منھ پر بایاں ہاتھ سر پر داہنا ہاتھ کمر پر خم کیا ہوا ۔ یہ جلوے دیکھ دیکھ کر سب بے خود ہو رہے تھے ۔ پری پیکر حسینائیں ناچنے گانے میں معروف تھیں ۔ جب آدھی رات گذر گئی تو یہ محفل برخواست ہوئی ۔ کئی سال ساون کے مہینے میں یہ راگ رنگ کی محفل منعقد ہوتی رہی اور ہر سال نیا لطف اٹھتا رہا ۔

شاہی کے زمانے میں واجد علی شاہ جوگی بننے کی سالانہ رسم اور زیادہ دھوم سے منانے لگے انھوں نے اپنی کتاب عشق نامہ ۱۲۶۳ھ میں لکھی ۔ اس میں لکھا ہے کہ سال گزشتہ (پیوستہ) جوگی بننے کی رسم میں معشوقہ خاص کے عوض قیصر بیگم اور سکندر محل کے عوض گلزار بیگم

ے عشق نامہ فارسی ص ۱۲۶ ۔ ۱۲۴

ۓ ایک طوائف حسن باندی نام جو حسینی والی کہلاتی تھی محل خانہ شاہی ص ۱۳۰

ۓ امیر بخش طوائف کی بیٹی کریم بخش ۔ محل خانہ شاہی ص ۱۱۲۹

جوگن بنی تھیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۶۳ھ اور ۱۲۶۴ھ میں یعنی بادشاہ ہونے کے پہلے اور دوسرے سال میں بھی واجد علی شاہ نے جوگی بننے کا جشن دھوم سے منایا تھا۔

نجم الغنی رامپوری نے لکھا ہے کہ اس میں سارے شہر کو شرکت کی عام اجازت تھی شرط یہ تھی کہ سب گیروے کپڑے پہن کر آئیں۔ بادشاہ کی طرف سے سارے شہر کو تین دن تک کھانا بھی کھلایا گیا سرورؔ نے اس میلے کا یہ حال لکھا ہے :۔

سرورؔ کا بیان ۱۲۶۹ھ ۱۹ شوال کی تھی کہ قیصر باغ میں میلہ مقرر ہوا گیروی پوشاک کا حکم گھر گھر ہوا مگر جو رنگین کپڑے پہنے وہ میلے کی سیر دیکھنے قیصر باغ میں آئے، جس کے کپڑے سفید ہوں وہ نکالا جائے ...... اتنا سیندور شہاب صرف ہوا کہ دوا کو میسر نہ ہو سکا۔ امیر، فقیر، جوان، پیر ایک رنگ میں ڈوبا نظر آتا تھا قیصر باغ یہ بہار دیکھ کے پھولا نہ سماتا تھا .... تین دن میلہ رہا۔ بڑا جھمیلا رہا اس روز حضرت جوگی بنے۔ رفقا رخاص بروگی بنے وہ جو بڑے بانکے ترچھے شہر کے وضعدار تھے جوگی جی کے چیلے بنے روبرو والے حضار تھے[1]

نامی کاکوروی کا بیان ایسی تیاری کا قیصر باغ اور اس میں جان عالم سا پیارا شہریار عالی دماغ۔ چنانچہ شوال کے مہینے ۱۲۶۹ھ میں رہس کا جوگیا میلا حضرت نے ...... مقرر کیا تمام اہل شہر اور چھ چھ کوس کا آدمی اسے دیکھنے کو آیا۔ چھوٹا، بڑا، اعلیٰ، ادنیٰ، ملازم و رعایا۔ اندر باہر، دکاندار اہل پیشہ امیر و غریب

---

[1] محل خانہ شاہی ص ۱۳۰

منقول از لکھنؤ کا شاہی اسٹیج

[1] فسانۂ عبرت ص ۸۲-۸۱

بھائی بند عزیز و بیگانے، صاحب و مصاحب، کل ارکان دولت و اعیانِ ملک، بھٹیاریاں اور نٹنیاں، ہیجڑے، زنانے، کہاریاں، رنڈیاں، کتھک کشمیری وغیرہ کل تماشائیوں کی ایک رنگ شنگرفی پوشاک تھی اور کل سامان شنگرفی دھانی اور شہر کی رنڈیوں کا جابجا جھرمٹ اور سب کمروں پر محلات و بیگمات کا جمگھٹ۔ جگہ جگہ افیمیوں اور خوش طبعوں کا جلسہ اور کہیں کہیں ہر قسم کے تماشائی یکجا۔ کہیں پر پونڈے چھلتے اور کہیں حقے اور گزک کے مزے اڑتے کوئی اپنی دھن گاتا اور کوئی بیٹھا سرود ستار بجاتا کہیں پر دائرہ اور دف تھا اور کہیں کل تماشا چاروں طرف تھا۔

الحاصل تین روز برابر یہ رنگ رہا اور مہینوں دل سے مزہ نہ گیا جو تھے ان حضرت چاند کی صورت جلوۂ حسن و جمال سے شاد و خرم مثال ماہ شب چہاردہم رہس منزل کے کمرے پر علانیہ اور بے محابہ خلق اللہ کے دیکھنے اور دکھانے کو سامنے رونق افزا ہوئے اور تا دیر مصروف تماشا رہے برابر حضرت کے سب شاہزادے اور بھائی بند مخلع بالطبع ہم رنگ اور کمرہ مغرقِ مشکیں و عطر نایاب مشکیں کی بو سے گچا ہوا۔ نافۂ مشک ختن جس کے پاسنگ کٹہرے سے ملے ہوئے کرسئ زرنگار پر حضرت جلوہ فرما چار سو ظل اللہ کا سایہ جھکا ہوا اس وقت ایک ہجوم عام تھا۔ عجیب لطف کا اژدہام تھا ہر کوئی نقش تصویر بنا ہوا حضرت کا جمال با کمال دیکھ کر محو حیرت تھا (کذا) اور ہر ایک دل بے اختیار یہ چاہے کہ انھیں کو دیکھا کرو۔ بمصداق مصرعہ استاد با صفا

"وہ تماشے کو جو نکلا خود تماشہ ہو گیا"

ہزاروں پری زاد زن و مرد شہری بلکہ ہر قسم کا اچھا آدمی وہاں اس جلسہ میں تھا مگر بادشاہ سا یکتا دوسرا نہ دیکھا۔" پھر اسی شب کو حضرت اس کی نقل جوگی بن کر

آڑ میں چھپ گئے جو گئیں ڈھونڈنے نکلیں مل گئے تب صد ہا توپیں سلامی کی چھوٹیں آتشبازی کی سوزشیں رہیں شادیانے ساون کے بجے ناچ گانے کے سماں بندھے کر ماہ پیکر شاہ زادہ کامیاب مقصود اپنے ملک میں گھر کو واپس آیا ماں باپ نے جس کا جشن منایا . . . الغرض پانچویں روز یہ جلسہ برخواست ہوا اور لطف سال بھر دل میں رہا۔

پرستان | نصیرالدین حیدر کے حالات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ انھوں نے ایک پرستان بنایا تھا مگر اس میں ایسی پریاں نہ تھیں واجد علی شاہ نے پریاں اور پرستان دونوں بنا دیا ایک بہت بڑے ہال میں چالیس گز لمبا اور بیس گز چوڑا حوض سنگ مرمر کا اس کے چاروں طرف تخت اس پر ایک مرصع پلنگ پورا مکان جھاڑ فانوس کنول مردنگ سے آراستہ پھولوں کے گلدستے افسانوں اور داستانوں کے بیان کے مطابق پریاں بازوؤں پر جواہر لگا پر لگائے ہوئے رقص و سرود میں مشغول بیچ میں جان عالم راجہ اندر کی طرح رونق افروز باہر ترک سوارنیاں پہرے پر مامور۔

پریوں کے حسن و جمال کیا کہنا ان کا انتخاب ہی اس نظر سے ہوا تھا کہ پری کہنا ان پر کھپ سکے رہی سہی کسر لباس زیور اور پروں نے پوری کر دی۔ یہ پریاں ناچنے اور گانے میں ماہر تھیں۔ کچھ کو حسن و جمال میں بے مثال ہونے کی وجہ سے پریوں میں داخل کر کے رقص و سرود کی تعلیم دی گئی اور بعض ان میں طوائف تھیں جو کمال و حسن دونوں میں یکتا تھیں ان ہزاروں پریوں میں ممتاز پریاں تھیں اندر پری۔ شہنشاہ پری، وزیر پری، رشک پری، یاسمن پری، سلیمان پری، عزت پری، دلربا پری اسکی بہن سلطان پری، ماہ رخ پری، معشوق پری، سرفراز پری، حور پری، بلقیس پری، شیشہ پری ان پریوں کو خطاب بھی دیئے گئے . . . رشک پری کا

خطاب ماہِ تمام تھا۔ شہنشاہ پری حُسن آرا دلربا پری بزم افروز تھی۔

باغ ارم | باغ ارم ساون کے مہینے میں تیار ہوتا لاکھوں روپے اس پر صرف ہوتے پورا ایک سال اس کی تیاری میں لگتا۔

ولی عہد کی شادی | ولی عہد حامد علی خاں کی شادی ۱۸۵۳ء میں ہوئی مرزا رجب علی سرور نے اس شادی کا حال فسانہ عبرت میں یہ لکھا ہے۔

مورخاں بزم طرب و محفل شادی' محرران جلسۂ عروسی و دامادی' اس طرح بیان کرتے ہیں' اس گنبد بے در کی نیرنگیاں عیاں کرتے ہیں یوں تو بہت شادی بیاہ ہوئے کے جلسے آنکھوں سے دیکھے مگر سن بارہ سو سٹھ ہجری ماہ ذی الحجہ میں جو شادیاں مرشد زادہ ہائے آفاق کی ہوئیں راست راست بے کم و کاست یہ صحبتیں بھی اتفاق کی ہوئی۔ فیض جہاں کو' فائدہ زمانے کو ہوا خلعت و انعام یگانہ و بیگانے کو ہوا۔

مانجھے کے دن سے وہ روشنی کا سامان ہوا کہ آسمان جس کو دیکھ کے حیران ہوا۔ مہر و ماہ کے چراغ گل تھے۔ محو حیرت جزو کل تھے۔ در دولت سے تا حسن باغ دربہ نور کے ٹھاٹھر گڑے تھے۔ جا بجا ترپولیے بنے' شامیانے تنے ان میں ناچ ہوتا دور روشنی کو کھڑے تھے ٹھاٹھروں کے تلے دو طرفہ تیل کی نہریں جاری۔ واہ رے کارخانے اللہ ری تیاری جن کے گھر میں برسوں چراغ نہیں جلا وہ گھڑوں تیل لے گئے۔ بے بوتلوں سے انڈیل لے گئے۔ تیل کی وہ ریل پیل تھی کہ شام کو تیلیوں نے کوڑیوں کے مول لیا صبح کو پھر سرکار میں روپے لے کے تول دیا۔ تماشا میں چراغاں کے مزے اڑاتے تھے نابینا دور سے آتے اور دیکھتے چلے جاتے تھے۔

ساچق کے دن اتنے مزدور نزدیک و دور سے بلائے کہ شہر کی گرد و نواح کی بستیاں ویران ہو گئیں۔ دہقانی فریاد کو آئے' زمینداروں کے کام درہم برہم ہوئے

اس پر بھی حساب میں بہت کم ہوئے جو روکے مزدور تک ۔بیگار میں گرفتار ہوئے
بورئیے نہ پڑے جب شمار ہوئے ۔ پہر دن رہے سے تا صبح جو گھڑے چاندی سونے
کے گنگا جمنی اور تخت آرائش کے فرمائش کے اُٹھے اس پر سب جا نہ سکے ۔

مہندی کا بھی یہی رنگ ہوا، کشتیاں، خوان، مزدور اٹھا نہ سکے ۔ یہ
کش مکش اور ایسی بھیڑ تھی کہ ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ سرِ شام
گھر کا راستہ بھول گئے ۔ جو اس میلے میں آیا مزدوروں کے ریلے میں آیا ۔ دلہن کے
گھر تک پہنچایا ۔ دولہا کے در تک پہنچایا ۔ ارباب نشاط کی ایسی کثرت تھی کہ فقط سلام
کی بار میں رات تمام ہوئی مجرا کرنے کی سب کو حسرت تھی ۔

۲۶ ذی الحجہ چہارشنبہ کا دن جب گزرا برات کی رات آئی ۔ آتشبازی
چھوڑنے کا حکم پہنچا، دھوم مچی کہ شب برات آئی گو سرِ شام سے دولہا کے چلنے کا
اہتمام ہوا ۔ پر باتوں باتوں میں رات کا بکھیڑا تمام ہوا یہاں تک کہ سلطان مشرق
یہ خبر سن کے جلوس دیکھنے کو آیا فلک پر شفق کا شامیانہ تنوایا ۔ آسمان سے محو نظارہ
ہوا، صحبت میں نہ گزارا ہوا ۔ کسی کو شوق دید فرط خوشی سے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ کہاں
رات گئی اور کدھر سحر ہوئی ۔ پہر دن چڑھے تک چراغوں کا جلسہ بدستور رہا ۔ فرط نور
سے سارا شہر کوہ طور رہا ۔

دفعتاً فوج شاہی سجی سجائی نمودار ہوئی غل ہوا کہ وہ برات آئی
خلقت دیکھنے کو تیار ہوئی ۔ سبحان اللہ کوئی فوج تھی یا بحر حشمت کی موج تھی پیادہ
دسوار ہزار در ہزار نقیب، چوبدار دہنے بائیں قطار در قطار نوبت نشان ماہی مراتب
اور جلوس کا سامان جب گزرا تو ایک ابر سیاہ اس کے پردے میں کچھ مہر و ماہ دور
سے نظر آئے گمان ہوا کہ ارم کا قافلہ اترا بچشم زدنی وطلسم تازہ نزدیک آ پہنچا

غور کرکے جو دیکھا تو ایک جگمگی تھی بشکلِ جہاز۔ مگر سر تا پا نرالا ساز، نیا انداز اس پریوں کا غول، لباس پُر زر نہایت شُمشول پہ پرداز لبعد انداز لگائے درجہ بدرجہ زینے سے نگینے جمائے، دفعتاً بجلی سی چمک گئی نگاہ ساتھ نہ دے سکی ٹھٹھک گئی۔ سبحان اللہ کا شور بلند رہا مردمِ دیدہ نظارہ میں بند رہا۔۔۔ جگمگی آنکھوں سے نہاں ہوئی دیکھنے والوں کو سیرِ پرستاں ہوئی۔۔۔

پھر ہاتھیوں کے دل ہودج و عماریاں گنگا جمنی ہر شخص بالباس گلنار سب کے سب لالہ زار، سرخ سرخ جامے، زر لبفت کے پاجامے، چغہ، کلغی، سرپیچ، گوشوارے، دریائے جواہر میں غرق ماہ پارے سب اسباب عنایت سرکار سے آگے پیچھے بائیں دہنے۔ بیچ میں فیل فلک رفعت، اس پر قدر قدرت نوشاہ کو گود میں بٹھلائے، دستِ گوہر بار اٹھائے اشرفیاں لٹاتے روپے کا مینہ برساتے اس شان سے تشریف لائے باد بہاری نے کہا حضرت سلیمان آئے۔ یہ شادی دیکھنے کے قابل تھی عجیب کیفیت ناظرین کو حاصل تھی۔

چھوٹے مرشد زادے کی شادی اس کے بعد چھوٹے مرشد زادے جو جرنیلی کے عہدے پر مامور ہیں نواب مشتاق محل صاحبہ کی دلبند مشہور ہیں۔ ان کا مانجھا رچایہ نوشاہ کو چڑھا۔ نقاشِ نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول۔ اس سے بڑھ کر ولی عہد بہادر کی شادی میں نواب خاص محل صاحبہ کا اہتمام تھا دوسری شادی میں نواب معشوق صاحبہ کا نام تھا پہلا رنگ مٹا نیا رنگ جما جو لوگ رنگ کی مشکیں اور گھڑے لئے ملازم نوشاہ تھے کشتیوں میں جوڑے کہاروں کے سر پہ زر سرخ سفید کے توڑے لیے ہمراہ تھے جو غریب محتاج بھگونے میں رنگ لاتا محتاجی کا حال سناتا پہلے تو اس کو خمخانہ میں تر کیا پھر جواہر سے دامن بھر دیا۔

اس پر بھی حساب میں بہت کم ہوئے جو روکے مزدور تک بیگار میں گرفتار ہوئے بوڑھے نہ پڑے جب شمار ہوئے۔ پہر دن رہے سے تا صبح جو گھڑے چاندی سونے کے گنگا جمنی اور تخت آرائش کے فرمائش کے اُٹھے اس پر سب جا نہ سکے۔

مہندی کا بھی یہی رنگ ہوا، کشتیاں، خوان، مزدور اٹھا نہ سکے۔ یہ کش مکش اور ایسی بھیڑ تھی کہ ہاتھ پاؤں بھول گئے۔ سرِ شام گھر کا راستہ بھول گئے۔ جو اس میلے میں آیا مزدوروں کے ریلے میں آیا۔ دلہن کے گھر تک پہنچایا۔ دولہا کے در تک پہنچایا۔ ارباب نشاط کی ایسی کثرت تھی کہ فقط سلام کی بار میں رات تمام ہوئی مجرا کرنے کی سب کو حسرت تھی۔

۲۶ ذی الحجہ چہارشنبہ کا دن جب گزرا برات کی رات آئی۔ آتشبازی چھوڑنے کا حکم پہنچا، دھوم مچی کہ شب برات آئی گو سرِ شام سے دولہا کے چلنے کا اہتمام ہوا۔ پر باتوں باتوں میں رات کا بکھیڑا تمام ہوا یہاں تک کہ سلطان مشرق یہ خبر سن کے جلوس دیکھنے کو آیا فلک پر شفق کا شامیانہ تنوایا۔ آسمان سے محو نظارہ ہوا، صحبت میں نہ گزارا ہوا۔ کسی کو شوق دید فرط خوشی سے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ کہاں رات گئی اور کدھر سحر ہوئی۔ پہر دن چڑھے تک چراغوں کا جلسہ بدستور رہا۔ فرط نور سے سارا شہر کوہِ طور رہا۔

دفعتاً فوج شاہی سجی سجائی نمودار ہوئی غل ہوا کہ وہ برات آئی خلقت دیکھنے کو تیار ہوئی۔ سبحان اللہ کوئی فوج تھی یا بحر حشمت کی موج تھی پیادہ و سوار ہزار در ہزار نقیب، چوبدار دہنے بائیں قطار در قطار نوبت نشان ماہی مراتب اور جلوس کا سامان جب گزرا تو ایک ابر سیاہ اس کے پردے میں کچھ مہر و ماہ داد سے نظر آئے گمان ہوا کہ ارم کا قافلہ اترا بچشم زدن و طلسم تازہ نزدیک آپہنچا

غور کرکے جو دیکھا تو ایک بگھی تھی بشکلِ جہاز۔ مگر سرتاپا نرالا ساز، نیا انداز اس پر پریوں کا غول، لباس پُر زر نہایت ٹھٹول پر پرداز بصد انداز لگائے درجہ بدرجہ قرینے سے نگینے جمائے، دفعتاً بجلی سی چمک گئی نگاہ ساتھ نہ دے سکی ٹھٹھک گئی۔ سبحان اللہ کا شور بلند رہا مردم دیدہ نظارہ میں بند رہا...... بگھی آنکھوں سے نہاں ہوئی دیکھنے والوں کو سیر پرستاں ہوئی...

پھر ہاتھیوں کے دل ہودج وعماریاں گنگاجمنی ہر شخص بالباس گلنار سب کے سب لا صدا، سرخ سرخ جامے، زربفت کے پاجامے، چغہ، کلغی، سرپیچ، گوشوارے، دریائے جواہر میں غرق ماہ پارے سب اسباب عنایت سرکار پہنے آگے پیچھے بائیں داہنے۔ بیچ میں فیل فلک رفعت، اس پر قدر قدرت نوشاہ کو گود میں بٹھلائے، دست گوہر بار اٹھلائے اشرفیاں لٹاتے روپے کا مینہ برساتے اس شان سے تشریف لائے باد بہاری نے کہا حضرت سلیمان آئے۔ یہ شادی دیکھنے کے قابل تھی عجب کیفیت ناظرین کو حاصل تھی۔

چھوٹے مرشد زادے کی شادی اس کے بعد چھوٹے مرشد زادے جو جرنیلی کے عہدے پر مامور ہیں نواب مشتاق محل صاحبہ کی دلبند مشہور ہیں۔ ان کا مانجھا رچا یہ نوتذکرہ ہوا۔ نقاشِ نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول۔ اس سے بڑھ کر ولی عہد بہادر کی شادی میں نواب خاص محل صاحبہ کا اہتمام تھا دوسری شادی میں نواب مشتاق صاحبہ کا نام تھا پہلا رنگ مٹا نیا رنگ جما جو لوگ رنگ کی مشکیں اور گھڑے لئے ملازم نوشاہ تھے کشتیوں میں جوڑے کہاروں کے سر پر زر سرخ سفید کے توڑے لیے ہمراہ تھے جو غریب محتاج بھگونے میں رنگ لاتا محتاجی کا حال سنایا پہلے تو اس کو نہلانے میں تر کیا پھر جواہر سے دامن بھر دیا۔

قبلۂ عالم کی بدولت دولہا کی ماں نے اپنی نوک رکھ لی جو بات کی خاص محل سے
سوا کی اس بات پر خاص محل صاحبہ کو غصّہ آیا ترپولئے جا بجا جو بنے تھے ان کو
نچوا کر پھنکوا یا کہ سردست کچھ نہ بن آئے گا سارا کھیل بگڑ جائے گا یہ نہ سمجھیں سرکار
سلطان عالی ہے ان کی دو لی نمود ہونے والی ہے۔ یہ سن کر حضرت نے ارشاد
کیا کہ بانات کے طاقوں کا جا بجا انبار ہو، جو بدار متعین ہوں سب سامان اسی
آن تیار ہو۔ ترپولئے سرخ بانات سے منڈھ جائیں۔ دروازے لال بارہ دری
نظر آئیں حکم کی دیر تھی سب کچھ مہیا ہو گیا خلق خدا کو اچنبھا ہو گیا ٹھاٹھروں
کے ہر خانے میں سرخ سبز گلاس پاس پاس لگائے۔ برج، بنگلے، ترپولئے
جا بجا بنوائے۔

لب دریا کوسوں تک آتشبازی نئے انداز کی تازی گڑ رہی تھی، کشتیوں
پر خلق خدا تماشا دیکھنے کو کھڑی تھی اور بیچ میں مینا بازار تھا۔ ہر شے کا انبار
تھا۔ یہ خبر سن کر کنجڑے، نانبائی، حلوائی بے بلائے آئے۔ قرینے سے دکانیں لگائیں
خوانچے جمائے، پیڑا، برفی، امرتی، گلاب جامن، بالوشاہی کی وہ آب و تاب کہ
دیکھ کے دل للچائے۔ افیونیوں کے منہ میں پانی بھر آئے۔ تنبولیوں کی دکانوں پر
پستئی پانوں کا جوبن تھا کہیں نقلی پستہ بادام، کہیں جوزی حبشی دودھیا
حلوہ سوہن تھا، کہیں دال موٹھ، سیو کرارا، ایک طرف بھنگڑ میں ماہ پارہ
غضب کا نکھار بات بات میں شوخی و شرارت آشکار تھے، حقے دل کش دھواں
دھار کہیں چیکارا تھا کہ دی ٹیپ کوئی ٹھمری او بچیا

کہیں نقّال، کہیں قصّہ خواں فصاحت سے گرم بیان، کہیں بزم شاہ
اودھ کی حکایت، کہیں کابل کی رزم کی داستان، ایک طرف خسرو شیریں کی روایت

ذار رستم، فسانۂ سیستان۔ کسی جا کباب گرما گرم پھڑ پھڑاتے، عجیب بو باس لونگ چڑھے والے پاس۔ نان بائیوں و دکانوں پر آبدار شیرمال، تافتاں لال لال، بقول قائل :۔

گرسنہ جو آئے نہ کچھ دیر ہو دکاں کا نظارہ کرے سیر ہو

کہیں پھولوں کا زیور، بیلی چنبیلی کے ہار، نوخیز گل رو خریدار۔ افیونوں کے جلسے، چنکی کا دور، غنودگی کا مزہ ملتا، فرنی کے خوانچے موجود، ببتی کا لبونڈا جھلتا مدک کے حقّے دھواں دھار کم سنوں کے چہروں پر بسنت کا نکھار۔ جدھر دیکھا آدمیوں کا ریلا تھا۔ برات کیسی دھوم دھام کا میلہ تھا۔ سڑک پر پر تکلف فرش بچھا آدمیوں کا غنچہ جابجا رنگین لباس سے لالۂ نافرمان کا تختہ کھلا، فنس میانے جھپیلے زنانی سواریوں کی بولی ٹھٹھولیاں، بگھی سیج گاڑی، کھلی و بند ڈولیاں ہر طرح کی خلق کھڑی تھی میدنی سی پڑی تھی۔ سرراہ کوٹھوں پر یہ جمگھٹ تھے۔ آدھا ہر آدمی ڈٹا ڈٹ تھے۔ جھتیں ہلتی تھیں کڑیاں کڑکتی تھیں۔ مردوں کو کیا کہیے لڑیاں نہ سرکتی تھیں۔ دن عید رات شب برات تھی شہر والوں کی سیر پر اوقات تھی القصہ تین دن رات جلسہ بدستور رہا، کوچہ بکوچہ سرور رہا۔ اگر ساچق و مہندی کا بیان ہو۔ امیر حمزہ کی داستان ہو مختصر یہ ہے کہ ساچق کا اتنا سامان تھا کسی نے اٹھایا مجبور ہو کے راہ چلتوں کو لٹایا۔ مہندی کا بھی یہی رنگ ہوا چھوٹا بڑا دیکھ کے دنگ ہوا جو مزدورنی دیکھ کے پاس سے گزری، گویا ختن کی ہرنی تھی، اس بو باس سے گزری۔ بٹنے تیل کی خوشبو سے بسی بسائی جھولی میں میوہ یا پینڈی نظر آئی، مہینوں آپ کھایا یاروں کو بھی کھلایا، چین سے گھر بیٹھ کر مزہ اڑایا۔

سمجھ میں نہ آیا کب دن گیا کب رات آئی یکایک شور ہوا کہ سحر عید ہے یا شب برات آئی شہر کیا نزدیک و دور سے مزدور ہاتھ نہ آئے۔ فرط خوشی سے تماشبینوں نے ٹھاٹھروں کے چراغ جلائے۔ پہلی شادی میں دلہن کا مکان حسن باغ تھا۔ اب کی سارا ٹھاٹھ تا گؤ گھاٹ باخاطر فراغ تھا در دولت سے پختہ تین کوس کا میدان تھا وہاں تک دورویہ یہی سب سامان تھا۔ بھیڑ وہ تھی کہ شانہ سے شانہ چھلتا تھا دم بند تھا۔ سانس لینے کو سڑک پر رستہ نہ ملتا تھا۔

ملازم و مہتمم فرد فرد کو نام بنام انعام ملے۔ سب کو دوہرے خلعت ہوئے اور دہرے انعام ملے۔ مانجھے کے زرد جوڑے بارات کے سرخ جوڑے ملے تھے، لالۂ زعفران کے تختے جا بجا کھلے تھے یہاں تک کہ پیادوں اور سواروں کو دیئے سیکڑوں تھیں ہزاروں کو دیئے۔ شام سے چلنے کی تیاریاں تھیں امیر امرا کی کوسوں تک سواریاں تھیں۔ ساز و سامان کی کثرت سے رات تمام ہو گئی۔ ظلمت شب صفحۂ روزگار سے دھو گئی۔

صبح کو نوشاہ سوار ہوا خسرو خاور کا بدار ہوا شہنائیاں پھنک رہی تھی، نیند کے جھونکوں سے باراتیوں کی گردن جھک رہی تھی۔ سب لوگ دورویہ حیرت سے پشت بدیوار تھے پرے کے پرے بشر کے ششدر نقش دیوار تھے شارع بازار پر مرقع کی پھبتی کہتے تھے چپ نہ رہتے تھے براتی جب بڑھتے تھے تمام تماش بین درود پڑھتے تھے۔

اب جلوس نکلا توزک چلا پہلے بڑے بڑے کنجل ہاتھی ان پر نوبت نشان، ماہی مراتب پھریرے زنبورک والے سانڈنی سوار، قرینے بہ قرینے سب کے سب بھر سوار

پیدل، دل کے دل، انگریز ہندوستانی فوج بے شمار اپنے اپنے قاعدے سے قطار در قطار اسکے بعد ایک فوج آئی غل ہوا کہ بحر نور کی موج آئی آخری پلٹن اور رسالا نکا ترچھا رسالا ایک دوسرے سے ٹھاٹھ میں نرالا تلنگوں کی سنگینیں شعاع مہر سے لڑتی تھیں گھوڑوں کے نعل سے ہلال فلک پر ٹاپیں پڑتی تھیں وہ رسالا اور وہ پلٹن ساری فوج کی جان تھی اور سب تن۔ ٹوپیاں غضب، کرتیاں قیامت جوانوں کے جوتوں پر شجاعت کی علامت آگے آگے انگریزی باجوں کی صدا پیچھے تلنگے اور سواروں کا بڑا جما گھوڑے شائستہ قواعد میں طاق سوار، ہوشیار شہرۂ آفاق۔ کوئی روئین تن کوئی رستم تواں سینے ہوئے گراں ڈیل جوان سفید سفید پر تلے، سیاہ توسدان بڑی چمک دمک، عجب شوکت وشان، صوبدار، جمعدار، حوالدار بڑے بڑے عہدہ دار ازسرتاپا غرق دریائے زر میں غرق کرتیوں پر سنہری لیس چاندی کے توسدان تیار۔ لیس برابر برابر جمے جمائے قاعدے سے قدم اٹھائے ایسی سپاہ دیکھی نہ بھالی حسن سے بھری قبح سے خالی ان کی وردیوں کی صفائی اگر دیکھ پائیں گورے جل جل کے کالے ہو جائیں۔

اس فوج میں رونق بہت بڑھ کے ہے سلطان عالم کی جو منظور نظر ہے

ایسا افسر اور یہ سپاہ کہاں دیانت الدولہ بہادر سا پشت پناہ کہاں ترک سواروں کے ٹھاٹ اگر جنگی لاٹ دیکھتا حیرت میں آتا کمپنی کی رجمنٹ بھول جاتا۔ جھنڈیوں کے بھرے بھرے کھلے نیزوں کے پھل ستاروں سے جلے گھوڑے تیز و دردم آہستہ آہستہ قدم قدم ٹولیاں جمائے نسیم سحری سے باگیں ملائے سوار کا جوبن گھوڑا دکھاتا تھا، نیا چھل بل کرتا ہنہناتا تھا پھرا پنے بیش قرار لال جوڑے گلے میں

جو رزم دیکھے بھالے، گھوڑوں کے گدڑے پٹے، سانڈنی سوار حور کے بچے زیر سوار براق کھیت کے گھوڑوں کا جنگل تھا، فوج تھی کہ ایک بڑا شہر دنگل تھا۔

کوئی جماتا کوئی گدگداتا تھا اپنا اپنا ہنر قبلہ عالم کو دکھاتا تھا۔

ہندوستانی پلٹنیں لیس توڑے شیر کوئی پیادہ ضیغم، کوئی فرغام، کوئی شیر، نجیب سب اشرف جیدہ کوٹ گڑھی لڑے۔ مصاف دیدہ عربی باجے بجتے کڑاکیت اچکتے، نشان کھلے، جوان سب ہتھ چھٹ، کل چلے کیل کانٹے سے درست چالاک وچست، بان بردار گتے والے زنبورچیوں کے رسالے، اونٹ بختی فلک کی طرح بلبلاتے۔ مہاریں سنبھالے سانڈنیاں اڑاتے۔ شتر سوار حد سے فزوں از شمار، نقیب چوبدار، برچھی والے، عصابردار

ہاتھیوں پر ارکان دولت ایک طرف عزیز و اقربا فر و شوکت سب کے گلے میں لباس زرتار کا علی الخصوص سلطان عالم پر عالم بہار کا فٹھ سے غٹ غول کے غول ہتھنیاں سیکڑوں نجھول، نقرئی ہودج طلائی عماریاں، ان پر لماس و یاقوت و زمرد کی گلکاریاں۔ ہاتھیوں پر جوبن تھا شہر گو لجلی بن تھا جیسے ستارے گرد ماہ کے، یہ سب گرد نوشاہ کے قبلہ عالم دولہا کو گود میں لئے فقیر فقرا کو بن مانگے توڑے کے توڑے بانٹ دیئے بحر بخشش جوش میں گوہر مراد آغوش میں، جواہر گراں بہا بصد سجگی، جسم مبارک پر سجا یوں تو ہر شخص بنا ٹھنا نکھرا نکھرا یا تھا لیکن حضرت کے چہرئے مبارک سے نیا رنگ دکھایا تھا۔ جاں نثار نے قبلۂ عالم کو بہم دیکھا تھا لیکن ایسا جوبن بہت کم دیکھا تھا اس طرح خزانۂ زر و گوہر لٹا کہ چوتھی جالے تک چلنے پھرنے والوں کو ملا۔

القصہ بصد جاہ و حشم آہستہ آہستہ، قدم قدم سواری دلہن کے گھر پہنچی دولہا کے اتارنے کو اور ٹوٹکے کرنے کو ہر ایک نسیم پہنچی اس وقت جناب کی سواری مثل باد بہاری آئی، نقارے کی صدا بلند ہوئی زنانی فوج کی باری آئی۔ تلنگوں کی پلٹن

رشکِ چمن، غیرتِ گلشن نئی نئی وردیوں پر تازہ جوبن، کوئی پری پیکر، کوئی سیمیں تن، کوئی چمپئی رنگ کی بہار سے نسرین اور کوئی نسترن بعض کمپنی حبشیوں کی ڈھنگ تختہ سوسن، بندوقیں برق دریائے آہن میں غرق، سنگینیں شفاف چمکتی ہوں تو سراسر کے پار سے کمریں لچکتی بڑھیں حرمک سوارنیاں سج دھج دکھاتی آئیں۔ کمریں لچکتی انگلیں چمکتی قواعد کا قاعدہ مدنظر قرینے قرینے برابر۔ پھر حبشنیں ترکنیں برچھی والیاں حسن کے نشے میں متوالیاں روشن چوکی والیاں کم سن تھوڑی عمر لاڈلے دن شہنا سوسکی ہمدمی کرتی تھی قدم گن گن کے رکھتی جاتی تھیں قُم یا ذنی کی صدا مردہ دلوں کو جگاتی تھی

کئی سے کہاری جوڑے غرق بھاری پہنے سر سے پاؤں تک مرصع جڑاؤ گہنے اطلس وگلبدن کے لہنگے ٹھکا مسالا۔ قیمت کے مہنگے، پر زر کاشانی مخمل کی کرتیاں پیشانی پر سنہلی روپہلی مچھلیاں، ان کی چالاکی اور پھرتیاں۔ کچھ سکھ پال بصد انداز اٹھائے کچھ خالی جلو میں ادھر ادھر عقد پروین کی طرح گرداگرد سراسر سیکڑوں چنڈول انمول، پالکی نالکی جواہر نگار مخدرات سلطان فلک قدر خجستہ صفات سوار امیرزادیاں ہمراہ چوبداروں کی صدا پیش نگاہ خواجہ سرا نواب ناظر بندوبست میں حاظر بڑا ازدہام کمال دھوم دھام۔

جس دم نوشاہ محل میں تشریف فرما ہوا لکھا نہیں جاتا کہ وہاں پھر کیا ہوا مبارک سلامت کی آواز گلے اور ساز سے آتی تھی، کوئی مہ جبیں ٹوٹکے کرتی تھی، کوئی مہ سیما رسموں کے تردد میں گھبراتی تھی جب آرسی مصحف روبرو آیا فلک نے قران السعدین دکھایا۔ مشتری وماہ ایک آئینے میں دو چار ہوئے دیکھنے والے دل سے صدقے جان سے نثار ہوئے کمسنی کے باعث عجیب حرکات کرتے تھے کبھی شرما کے چپ رہتے کبھی بھولی بھولی بات کرتے تھے۔ دلہن کو نیند کا خمار

اور دولہا اونگھتا تھا کبھی چونک کے دلہن کی خوشبو سونگھتا تھا۔ ڈومنیوں نے جو پوچھا بنے ٹونا لگا دولہا اس بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑا، بٹنہ، تیل عطر سے عالم بہار تھا۔ بیلا چنبیلی گلے کا ہار تھا۔ یہ بات بھی سنی تھی کہ دلہن والوں کا ڈھکانا دولہا کا جھک جھک کے ڈلیاں اٹھانا۔ ڈومنی دولہا دلہن کو دعا دیتی تھی۔ ٹوٹکے کے ساتھ رسم ادا کر لیتی تھی، مہر و ماہ کے گرد مشتری خصال کا دور تھا۔ صحن زمین میں چرخ بریں کا طور تھا کوئی چراغ خورشید کا کاجل لگاتی تھی۔ کوئی دلہن کی جوتی دولہا کے شانے میں چھواتی تھی قبلہ عالم اپنا جلسہ علیحدہ کر رہے تھے سب کیفیت دور سے مشاہدہ کر رہے تھے ہر رسم پر نیگ ملتا انعام ہوتا تھا۔ خاص و عام پر فیض حقداروں پر لطف عام ہوتا تھا۔

اب رخصت کی باری آئی دولہن کے واسطے سواری آئی ڈومنیوں نے جب بابل گائی دل سب کے امنڈے چھاتی بھر آئی، ہمنشیں دلہن سے رخصت ہونے لگیں یا تو چہلیں ہو رہی تھیں یا اب گلے مل کے رونے لگیں وہ جو شادی و غم توام ہے یہی ہنگام ہے۔ نہ طرب کو بقا ہے نہ الم کو ثبات ہے ہمیشہ سے جو تھا وہ رہیگا وہ خدا کا نام ہے۔ القصہ دولہا نے سہرا سر سے سرکایا، دلہن کو گود میں اٹھایا۔ سکھپال میں لا کے بٹھایا۔ برات رخصت ہوئی۔ لوگوں کو فرصت ہوئی۔ دولتخواہوں نے سکھپال پر سونے چاندی کے پھول نثار کئے۔ اشرفیاں صدقے ہوئیں روپئے کے ڈھیر لٹا دیئے۔ محتاج فقیر نہال ہو گئے۔ غریب غربا مالا مال ہو گئے گھر میں زینت بخش ہو کے بکرا ذبح کیا انگوٹھے میں لہو لگا دیا بعد اس کے کھیر نوش فرمائی رسمیں ہو چکیں پلنگ پر جانے کی نوبت آئی دولہا نے دلہن بیاہ لی۔ براتیوں نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی پھر چوتھی چالے کا اہتمام ہوا ملکوں میں اس شادی کا نام

ہوا قریب ہے کہ فضل خدا سے پنجڑی بٹے تنبول پائیں وہ دن خدا دکھائے کہ قبلۂ عالم عنایت پروردگار سے پوتا کھلائیں ۔

فضول خرچی

ہم نے واجد علی شاہ اور دوسرے سلاطین اودھ کی اور عیاشیوں کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے ۔ یہی باتیں وہ ہیں جن پر اعتراض ہے ، ولیم نائٹن کے اعتراض آپ نصیر الدین حیدر کے حالات میں پڑھ چکے ہیں وہ کہتا ہے کہ محرم میں کئی لاکھ کا سامان بنوایا جاتا ہے اگر یہ رکھ لیا جاتا تو ہر سال کام آتا مگر ہوتا یہ ہے کہ سارا سامان غرباء پر تقسیم کر دیا جاتا ہے جو اسکی نظر میں بد انتظامی اور فضول خرچی ہے اسی طرح ارباب نشاط کو انعام و اکرام شعراء پر زر و جواہر کی بارش علماء کی خدمت اہل حرفہ کو بخشش اور وہ بھی تھوڑی بہت نہیں دل کھول کے کھیل تماشے پر لاکھوں صرف کر دینا بیاہ شادی میں خزانہ خالی ہو جانا بڑی فضول خرچی نظر آتی ہے مگر یہ دکھائی نہیں دیتا کہ یہ روپیہ خزانہ سے نکل کر کہاں جاتا ہے شاید لوگوں کی نظر میں اس سے بہتر مصرف اس دولت کا یہ تھا کہ فوج رکھی جاتی اسلحہ جنگ جمع ہوتا توپوں اور بندوقوں کے ڈھالنے کے کارخانے قائم ہوتے تو اس سے سلطنت مضبوط ہو جاتی اور ضبط نہ ہوتی پرستان بنوانے اور رہس دیکھنے سے حکومت جاتی رہی ۔ ۔ ۔

جو لوگ یہ سوچتے اور کہتے ہیں مجھے ان کی عقل پر ہنسی آتی ہے کہ ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی مگر فرمانروایان اودھ اور خاص طور پر واجد علی شاہ جو نہایت دقیقہ رس تھے اتنی سی بات نہ سمجھ سکے جس کو آج ہزاروں ہمہ تن سمجھے بیٹھے ہیں ۔

ایسے لوگ تاریخ سے بے خبر یا عقل سے بے بہرہ ہیں انھیں اس وقت کے سیاسی حالات کا علم نہیں ۔ انگریزوں نے ہر ہندوستانی حکومت میں اپنی فوج اور رزیڈنٹ رکھ چھوڑا تھا اور ایک محدود فوج رکھنے کا پابند بنا رکھا تھا ۔ ظاہر ہے کہ

ایسے معاہدہ پر راضی ہونا مجبوری ہی سے ہو سکتا ہے کون اپنی حکومت میں دوسرے کی مداخلت برداشت کر سکتا ہے۔

واجد علی شاہ نے جن کی بیدار مغزی کا تمام مورخین نے اعتراف کیا ہے حکومت ملتے ہی نہایت مشقت سے امور سلطنت کو انجام دیا۔ عدل و انصاف کی سختی سے پابندی رعایا کے امور کی دیکھ بھال میں تندہی سے کام لیا۔ فوج کی نئے سرے سے تنظیم کی اور بنات خود اس کے قواعد و پریڈ لینے کی زحمت اٹھائی دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا دو سال میں ملک کی فوجی طاقت قابل اطمینان ہوگئی۔ یہ دیکھ کے ریذیڈنٹ نے اس مشغولیت سے انھیں فوراً دست بردار ہونے کی تاکید کی۔

اب ہمیں معترضین بتائیں کہ واجد علی شاہ انگریزوں سے لڑ مرتے یا ان کے حکم کی تعمیل کرتے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا جواب ہر شخص کے پاس یہی ہے کہ انگریزوں کے حکم کی تعمیل کرنا چاہیئے۔ اور یہی انھوں نے کیا تو کیا برا کیا۔

اب رہ گیا یہ کہ وہ ملک کی آمدنی جمع کرتے اور خزانہ کا سانپ بن کر بیٹھ جاتے یا علوم و فنون اور کھیل تماشے پر خزانہ خالی کر دیتے۔ اگر پہلی صورت آپ بہتر سمجھتے ہیں تو اس سے صرف انگریزوں کو فائدہ ہوتا کہ وہ حکومت کے ساتھ ایک بڑا خزانہ بھی پا جاتے۔ واجد علی شاہ سے حکومت لینے کا وقت آگیا تھا انگریز کسی طرح ہندوستان کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ زرخیز ملک کو بچھوڑ نہیں سکتے وہ تو تاش کر رہے تھے اس کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جب انھوں نے حکومت پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی تو واجد علی شاہ پر بدانتظامی کے تحریری الزامات تھوپے دوسری صورت وہ تھی جو انھوں نے اختیار کی اس سے اس کا تحریری جواب

انھوں نے یہ دیا کہ پارلیمنٹ یا گورنر جنرل جو نظام چاہیں وہ لکھ کے دیدیں وہی رائج کردیا جائے یا جو نظام مملکت برطانیہ میں رائج ہے وہ یہاں نافذ کردیا جائے اس سے زیادہ اطمینان بخش بات اور کیا ہوسکتی ہے اس کے جواب میں حکومت ضبط کرلی گئی۔ اور کہا گیا کہ ضبطی عارضی ہے ایک مناسب وقت پر حکومت واپس کردی جائےگی مگر یہ مناسب وقت کبھی نہ آیا اس سے اس وقت کی سیاسی حالت کا اندازہ کرلینا چاہیئے، کیا واجد علی شاہ کو اس کا اندازہ نہیں تھا یقیناً تھا اب وہ، ہی باتیں کرتے یا، خزانہ جمع کرتے یا رعایا کے لئے خزانہ کا منہ کھول دیتے انھوں نے دوسری صورت اختیار کی اور اس کی افادیت کیسے تاریخ بتاتی ہے علوم وفنون کو جو ترقی ہوئی وہ دنیا میں کہیں نہیں ہوئی اگر لکھنؤ کے علماء اور ان کی تصانیف کا ذکر تو ایک بار شسترہو جائے۔ اگر شعراء کا کلام جمع کیا جائے تو ایک مکان اس کے لئے ناکافی ہوگا۔ اگر وہاں کے اہل فن کے کمالات بیان کئے جائیں تو لوگ حیران ہو جائیں گے یہ سب کس چیز کا نتیجہ ہیں انھیں اولوالعزمیوں کا جس کا نام لوگوں نے فضول خرچیاں رکھ چھوڑا ہے

ہاں کھیل تماشے مرغ بازی، بٹیر بازی، کنکوے بازی ایسے مشاغل تھے جو اپنا کوئی پائیدار اثر نہیں چھوڑ گئے مگر اس وقت کے لوگوں کی اس سے پرورش ہوگئی اور یہ بھی اس کا ایک اہم پہلو ہے۔

مصوری | مصوری لکھنؤ کا خاص فن ہے واجد علی شاہ کی سرپرستی میں اس کو بھی ترقی ہوئی مصورالدولہ شاہی مصور اس فن کے بادشاہ تھے مرزا صفدر حسین صفدر اور کاشی رام بڑے باکمال اور شاہی مصوروں میں منسلک تھے۔

نواب کاظم حسین خاں شاہی خاندان سے تھے۔ تصویر کشی سے فطری

مناسبت تھی خاص طور سے جانوروں کی تصویریں بے مثل بنا تے تھے۔ ان کی بنائی ہوئی مکھیوں اور کبوتروں کی تصویریں اب تک لوگوں کے پاس موجود ہیں

میر محمد علی بھی اس زمانہ کے مشہور مصور تھے۔ میر انیس کی مجلس کا مرقع انھوں نے بنایا تھا۔ منبر پر میر انیس، پہلو میں احسن لکھنوی کے والد کھڑے ہیں، سامنے مجمع ہے۔ میر صاحب کے ہاتھ میں مرثیہ ہے جس پر یہ مصرع لکھا ہے ع

برہم ہے مرقع چمنستانِ جہاں کا

خطاطی | لکھنؤ کی خطاطی اپنے طرز میں منفرد ہے اور لکھنؤ خط کے نام سے مشہور ہے واجد علی شاہ کے زمانہ میں رئیس الدولہ شاہی خطاطوں کے افسر اور مطبع شاہی کے نگراں تھے جن کے ماتحت بہت سے خطاط تھے ان میں منشی عبدالحی خاص شہرت رکھتے تھے۔

میر احمد حسین ایسے کامل خطاط تھے کہ برا تے کتبوں سے خط ملا دیتے تھے۔ لارڈ منٹو نے ان کے ہاتھ کی تحریر رامپور میں دیکھی تو کہا یہ ہاتھ کی لکھی ہوئی نہیں ہے انھوں نے سامنے لکھ کے دکھا دیا۔

رونق علی خط شکست میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے۔

رحیم الدین کا نستعلیق میں جواب نہ تھا۔ ان کے ہاتھ کی ایک رات دن میں لکھی ہوئی کتاب گلستاں رامپور میں موجود ہے جس کا ۱۲۱۷ھ حاجی حافظ علی ہفت قلم ہے

سید احمد طباطبائی خط نسخ میں بے نظیر تھے۔

فقیر محمد خاں گویا دستخطی سادہ بناتے تھے کہ کوئی نہ بنا سکتا تھا۔

منشی امیر اللہ تسلیم مرزا رجب علی بیگ سرور اور سید مرزا انس بھی

بڑے کامل خطاط تھے۔

اخبار کا محکمہ بادشاہ کی طرف سے مظفر علی اسیر کی نگرانی میں اخبار کا محکمہ قائم ہوا یہ شاید اسی طرح کی چیز تھی جیسی سعادت علی خاں نے قائم کی تھی آجکل جسے ہم اخبار کہتے ہیں اسی طرح کا اخبار عہد واجدی ہی میں لکھنؤ اخبار کے نام سے منشی لال محمد نے نکالا۔ یہ کب نکلا اور کب تک جاری رہا اس کا صحیح پتہ نہیں چل سکا۔"ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں" ایک کتاب ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۴۷ء میں یہ اخبار موجود تھا۔

حدیث خوانی لکھنؤ میں مرثیہ خواں سوزخواں، حدیث خواں، کتاب خوان، واقعہ خوان، روضہ خواں، نثار مجلس پڑھتے تھے اور ہر ایک کے طرز میں فرق تھا۔ اُس زمانہ میں مرزا محمد ہادی صاحب صالح نے حدیث خوانی میں شہرت حاصل کی انھوں نے ایک کتاب خلاصتہ المصائب بھی لکھی ہے جسے واجد علی شاہ کے نام پر معنون کیا ہے اس سے ان کی وسعت نظر اور ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے اس میں انھوں نے ایسی روایتیں جمع کی ہیں جو کسی فضیلت سے شروع اور مصیبت پر ختم ہوتی ہیں وہیں سے مصائب کا جوڑ لگتا ہے اس کے مقدمہ میں انھوں نے حدیث خوانی کے بہت سے ایسے اصول بتائے ہیں جو بڑے تجربوں پر مبنی ہیں اور ان سے سیکھنے والوں کو بڑی مدد مل سکتی ہے۔

قرأت فن قرأت نے اس زمانے میں بڑا فروغ حاصل کیا اور بڑے کامل قاری پیدا ہوئے ان میں قاری محمد حسین کشمیری کو شہرت حاصل ہوئی۔ یہ واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتے چلے گئے تھے وہاں انھوں نے ان کو اکیل العلماء کا خطاب بھی دیا تھا اس زمانے میں فن تجوید پر رسالے لکھے گئے اور قرأت کا شوق لوگوں

میں پیدا ہوا

داستان گوئی | داستان گوئی بہت پرانی چیز ہے ہر قوم میں اس کا رواج رہا ہے مگر لکھنؤ میں اس نے فنی حیثیت اختیار کی۔ آواز کے با محل اتار چڑھاؤ مناسب ایکٹنگ اور الفاظ کے زور و شور سے ایک خاص چیز بن گئی۔ اس فن کے بڑے بڑے ماہر موجود تھے۔ داروغہ غلام عباس کو کمال حاصل تھا وہ حسن کا نقشہ کھینچتے تو پھر وہ کیفیتیں پیدا کر دیتے تھے۔ جلال کے والد میر اصغر علی طبیب تھے مگر داستان گوئی میں اتنی مہارت اور دلچسپی تھی کہ واجد علی شاہ کے یہاں داستان گویوں میں نوکر ہو گئے تھے اور فخر سے داستان گوئے شاہی اپنے کو لکھتے تھے اس کے معنی یہ ہیں کہ داستان گوئی فن شریف تھا۔

کبوتر بازی | یہ بھی لکھنؤ کا خاص فن ہے واجد علی شاہ کو خود کبوتروں کا بہت شوق تھا۔ کبوتروں کے شوقین تین طرح کے ہیں۔ ایک تو شیرازی کبوتر پالتے ہیں یہ ہر قسم کے کبوتروں سے بڑے ہوتے ہیں اور ان کی دو نسلیں بہت عمدہ سمجھی جاتی ہیں نگارا اور طوسی۔ رنگ کے لحاظ سے کاسنی، سرخ، کالے، گلدار، چپ خال پوسیٹے۔ ابا جیلئے، تو غے، دیر خال، فرقہ بند۔ خال چپ، شیرازی چپ کبرے سست رو اچھی قسم کے سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی خوبی رنگینی کے لحاظ سے ہے۔ یہ اڑان کے نہیں ہیں۔ لقا۔ لوٹن۔ نقاب پوش۔ پائوں موز۔ دو بلکے یا ہو غفوری۔ علی گو بھی اسی قسم کے کبوتر ہیں جو اڑائے نہیں جاتے۔

دوسری قسم کے وہ کبوتر ہیں جو اڑائے جاتے تھے۔ یہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ گولے اور گرہ باز۔

گولے کی ٹکڑی اڑائی جاتی ہے اور اس طرح سدھاتے ہیں کہ اڑانے والا

جب چاہے بلالے۔ اس کے ہاتھ میں ایک جھیبی (جھنڈی) ہوتی ہے اور "آ" "کو"
دو آوازوں پر وہ انھیں سدھاتا ہے اور انھیں آوازوں سے بلاتا ہے۔ دو
کبوتر باز آپس میں اپنے کبوتروں کی ٹکڑیاں لڑاتے بھی ہیں۔ اس طرح سے کہ
دونوں نے اپنی اپنی ٹکڑیاں اڑائیں اور دونوں اوپر جا کے ملیں۔ جس کے کبوتر زیادہ
سدھے ہوتے ہیں وہ دوسرے کے یہاں نہیں گرتے اور دوسرے کے کبوتر ساتھ لے
آتے ہیں جسے وہ پکڑ لیتا ہے اور یہ اس کے لئے جائز ہے' اسی لئے کہا جاتا ہے کہ
کبوتر پالے چوٹا جو تکے پرایا مال۔ ان کبوتروں کی آنکھ کالی مکو کی طرح ہوتی ہے۔
اور رنگ کے لحاظ سے سفید بے داغ الف نوکے (جو نچ پر کالا الف) گجرے
عنبر سرے۔ کبرے۔ کاسنی۔ گھاگھرے، آتشی، پنجے۔ ببرے۔ ہرے۔ نیلے۔
سبز روشن، سبز کھیرے۔ سبز بھورے' برے نیرے۔ سبز پٹھے۔ سبز پنے۔ سبز تیرے
لال بند۔ سینہ ورے۔ زاغ۔ انجیرے۔ جو گئے' کالے جو گئے۔ کل پوٹے۔
کالے پنے۔ کالے بھورے۔ کالے پٹیت۔ کالے تیرے۔ مُکھی یا مکھیارے سُرخ
سرخ رادے۔ سرخ جو گئے۔ سرخ پٹی۔ زرد۔ سنہرے۔ داغ موتی۔ چاندنا
سرمئی۔ بجلی ختنگ۔ گلابی ختنگ۔ گنڈے دار ہرے۔ مٹیارے۔ جوہرے
(اس کے شہ پر سفید ہوتے ہیں۔

گرہ باز اڑان کے کبوتر ہیں ان کی خوبی دیر تک اڑنے اور اپنے گھر ہی واپس
آنے پر ہے یہ اونچے ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ تارا ہوتے ہیں اور بند ہو جاتے
ہیں۔ جب تک تارے کی طرح جھلملاتے نظر آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تارا ہو گئے
اور جب دکھائی نہیں دیتے تو بند ہو گئے کہتے ہیں۔ صبح سے شام تک اڑنے والا
کبوتر بہترین سمجھا جاتا ہے اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ رستہ کا سچا ہو یعنی اپنے مکان کی

بلندی کرنہ چھوڑے جہاں سے اڑے وہیں بیٹھے۔ یوں تو لُرہ باز بھی ہر رنگ کے ہوتے ہیں مگراں میں ہرے شاہجہاں پوری سب سے اچھے سمجھے جاتے ہیں ان کی اڑان، سیان، شان مشہور ہے۔ اچھے کبوتر کی پہچان یہ ہے کہ آنکھ میں پتلی کے گرد سفیدی میں ٹبنکیاں بہت چمکدار ہوں جیسے موتی کوٹ کے بھر دیئے ہیں۔ سر سانپ کی طرح لمبا۔ پاؤں کی انگلیاں پتلی، ناخن پتلے اور لمبے پتلی گردن سینہ چوڑا دم اور ٹانگیں چھوٹی۔ بازوؤں کی بغلیں بھری ہوئی۔

رُوسا کے یہاں اس فن کے جاننے والے نوکر رہتے تھے جو سدھاتے بیماروں کا علاج اور قوت پرواز بڑھانے کے نسخے جانتے تھے کبوتر کس طرح کس رنگ کا لکالا جا سکتا ہے کس طرح کے کبوتر کا کیسی کبوتری سے جوڑ لگانا چاہیئے۔ یہ سب ایک فن تھا دانہ سے کبوتروں کے رنگین بچے حاصل کئے جاتے تھے مثلاً صرف مسور چھ مہینے تک کھلائی جائے تو بچے سرخ نکلیں گے۔ باجرہ سے سبز، اسی طرح اور دانوں سے رنگ حاصل کئے جاتے تھے۔

واجد علی شاہ کے زمانہ میں مزار قین اس فن کے بڑے کامل تھے انھوں نے ایسے کبوتر سدھائے تھے کہ دوسرے محلہ میں لے جاکے اڑاتے تھے۔

مرزا علی عباس بھی مشہور کبوتر باز تھے۔ کربلائے معلّٰی کے سفر میں بمبئی سے کبوتر خریدے اور اتنا جلدی سدھائے کہ جہاز پر اڑاتے رہے۔ جب سیٹی دی آکے بیٹھ رہے۔

میر محمد علی نے یہ جدت دکھائی کہ طوطوں کی ٹکڑی کبوتروں کی طرح اڑاتے تھے اور آواز دینے پر پنجرے میں آجاتے تھے۔

بٹیر بازی | بٹیر لڑانا عربوں کا خاص ذوق تھا۔ آج بھی بصرہ بٹیر بازی کا بڑا

مرکنہ - لکھنؤ میں بٹیر بازی دہلی والوں کے ساتھ آئی اور دوسرے فنون کی طرح اس نے بھی ترقی کی - اس کے شوقینوں نے اسے بھی ایک فن بنا ڈالا - اس کے لڑانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بٹیر کو موٹھ دیتے ہیں اس کو مٹھی میں پکڑے رہتے ہیں اس طرح کہ اس کا سر اوپر سے اور ٹانگیں نیچے سے نکلی رہیں اس سے وہ مانوس ہو جاتا ہے اور اسکی چربی گھل جاتی ہے - دن بھر اسی طرح لئے رہتے ہیں - رات کو کان میں پھونکتے ہیں کہ سماعت جاتی رہے اور باہر کے شور و غل سے نہ بھڑکے -

اس کو بھوکا رکھتے ہیں اور جھل (غصہ) بڑھانے کی دوائیں کھلاتے ہیں - نہرنی (ناخن گیری) سے اس کی چونچ نوکدار اور تیز کر دیتے ہیں اس کے بعد دانہ ڈال کے دو بٹیروں کو آمنے سامنے چھوڑ دیتے دونوں دانہ پر لڑنے لگتے اور اچھل اچھل کے ایک دوسرے کو لاتیں مارتے ہیں - کبھی ایک دوسرے کی چونچ پکڑے دیر تک کھڑے رہتے ہیں - .

ان کے طاقتور بنانے کے نسخے ہیں - جلاب بھی دیا جاتا ہے اس فن کے جاننے والے روساء کے یہاں نوکر ہوتے ہیں -

بٹیر کی کابک بھی نہایت خوبصورت ہوتی ہے - شوقین رُوسا سیکڑوں روپے کی کابکیں بنواتے تھے - یہ سرکی سے کبوتروں کی کابک کی طرح بنتی ہے -

قریب چھ پانچ چوڑا آٹھ انچ اونچا خانہ ہوتا ہے - دو خانے اور چار خانے کی کابکیں ہوتی ہیں - قیمتی کابک کے پائے ہاتھی دانت کے ہوتے ہیں - اوپر کا پٹ کھینچنے کے لیے بھی دانت کی پٹی لگاتے ہیں جس میں نہایت عمدہ نقش و نگار بناتے چھت زربفت یا کارچوب کی ہوتی ہے کہ بٹیر اچھلے تو اس کے سر میں چوٹ نہ آئے -

اچھے بٹیر کی پہچان یہ ہے کہ اس کا سر چاروں کونوں سے بڑا مغز بڑا گدی

گدّی چوڑی تپیچھے سے سانپ کے سر کی طرح ٹانگیں۔ محراب کی طرح پتلی خمدار کو نے بھوں تک نکلے ہوں تین چکر ہوں جو سر تک چلے گئے ہوں۔ بھویں پتلی اور پلکوں تک جھکی ہوئی مگر اونچی، آنکھیں چھوٹی، تل چھوٹے اور کلے کلّے لانبے چوڑے چونچ بھوری موٹی لمبی خمدار ناک اونچی گلے کے نیچے کا رنگ ہلکا کوڑی کی طرح کنٹھا پتلا گردن چھوٹی اور موٹی سینہ چوڑا ایک پوٹیہ سیاہی کم ہو پیٹھ جتنی لمبی اور چوڑی ہو اتنا ہی اچھا بٹیر ہوگا۔ پاؤں چھوٹے اور موٹے اسفل موٹے چوڑے گنجان پنجے لمبے موٹے انگلی، ناخن بھورے موٹے اور لمبے۔ ایسا بٹیر خوب لڑتا ہے۔

مرغ بازی | یہ بھی مسلمانوں کا قدیم شوق ہے لکھنؤ میں اس کو بھی بڑا عروج ہوا اور نیپال کی ترائی سے جنگلی مرغ پکڑ کے لائے گئے ان کی نسل بڑھائی گئی۔ جادا لاکھا کل کاٹیا، سالار جنگی، کوٹھی والے، اچھت دلی والے لڑنے والے مرغ ہیں۔ ان کا سینہ چوڑا پر اور گردن لمبی پنجے اور ناخن بڑے ہوتے ہیں ان کو اصیل کہتے ہیں ان کے خار اور چونچ بنائی جاتی ہے۔ بادام اور لسن کھلایا جاتا ہے۔ یہ اچھل اچھل کے اپنے پنجوں سے حریف کے سینہ اور منہ پر مارتے ہیں۔ مشہور ہے کہ اصیل مرغ سے زیادہ بہادر کوئی جانور نہیں۔ یہ گھنٹوں جم کے لڑتا ہے بھاگنا نہیں جانتا کبھی اپنے حریف کا پوٹا پھاڑ ڈالتا ہے، کبھی آنکھ پھوڑ دیتا ہے مگر اس پر بھی دونوں لگے رہتے ہیں اگر ایک بے دم ہو جاتا ہے اور لڑنے کی سکت نہیں رہتی جب بھی بھاگتا نہیں

سپہ گری | سپہ گری لکھنؤ کا خاص فن ہے اور نوّے فیصدی آدمی اس کو سیکھتے تھے۔ علماء، شعراء، اطبا، شہزادے سب سپہ گری میں کامل ہوتے تھے سوا علماء کے اور سب اسلحہ سے لیس رہتے تھے۔ فقیر تک ڈھال تلوار باندھتے تھے ارباب نشاط میں ڈھاڑی میراثی طبلیے اور سارنگیے بھی ورزش کرتے تھے اس

زمانہ میں مرزا جعفر علی نے بانک کے فن میں غیر معمولی شہرت و کمال حاصل کیا۔
محمد علی ساکن کٹرہ بزن بیگ علی مدبے کے موجد تھے۔
نواب معشوق محل کے داروغہ محمد مہدی نبوٹ کے استاد تھے۔
نواب جہاں پناہ محل زوجہ واجد علی شاہ بندوق کے نشانہ میں بے مثل تھیں شہسواری میں بھی کمال رکھتی تھیں حکیم محمد رشید بھی بندوق کے نشانہ میں مشہور تھے
میرن صاحب پنج بھیئے کا نشانہ ایسا تھا کہ عورت کی نتھ سے گولی نکال دیتے تھے۔ شمع کی لو پر اس طرح گولی مارتے تھے کہ شمع بجھ جاتی تھی ان کی شہرت سن کے یورپ سے انگریز لکھنؤ ان کو دیکھنے آیا اور ان کا امتحان لینے کے لئے اس نے شمع کنول میں اس طرح رکھی اس کی لو کی نوک کنول کی گگھ کے برابر تھی۔ اس نے کہا آپ گولی سے شمع بجھا دیجئے انھوں نے گولی چلائی شمع بجھی اور کنول سابوت رہا۔ اس کو حیرت ہوگئی انھوں نے کہا میں نے کنول کے کنارے سے اتنی قربت سے گولی چلائی کہ کنول محفوظ رہے اور گولی کی ہوا سے شمع بجھ جائے۔
گورنر جنرل نے ان کا کمال دیکھنے کی خواہش کی انھوں نے گھوڑے پر نیم کی پتی چپکا کے گولی ماری پتی بیچ سے دو ہو گئی اور گھوڑے پر آنچ نہیں آئی
مرزا احمد بیگ کٹیا کٹیا تلوار چلانے میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے۔

شہسواری شیخ پیر علی نے شہسواری اور چابک سواری میں وہ کمال دکھلایا کہ اس سے پہلے سننے میں بھی نہیں آیا تھا وہ گھوڑے پر اس طرح پٹری جما کے بیٹھتے تھے کہ بڑے بڑے پہلوان زور لگا کے تھک گئے اور ان کی ران کو نہ سرکا سکے۔
نواب حضور عالم علی نقی خاں وزیر اعظم شہسواری اور نیزہ بازی میں بے مثل نہ رکھتے تھے۔ گھوڑوں کا ایک سوداگر لکھنؤ آیا اس نے نواب کی شہسواری

کی تعریف سن کے ان کو اپنا کمال دکھایا۔ گھوڑے پر چکر اس طرح لگایا کہ جہاں سے چلا تھا واپسی میں انھیں سموں کے نشان پر گھوڑوں کے سُم پڑے۔

نواب نے اس کے کمال کی تعریف کی اور سمجھ گئے کہ گھوڑا سدھایا ہوا ہے۔ مشنہ سواری کو اتنا دخل نہیں انھوں نے اس سے ایک الھڑ بچھیڑا لے کے اسی طرح چکر لگا کے دیا۔ وہ بہت شرمندہ ہوا اور نواب کے کمال شہسواری کا اعتراف کیا۔

نواب حیدر خاں بنگش ساکن محمود نگر نہایت اعلیٰ درجہ کے شہسوار تھے کتنا ہی بد لگام گھوڑا ہو بغیر رکابوں کے اس پر بیٹھ کے قابو میں کر لیتے تھے۔ قوت کا یہ عالم تھا کہ مضبوط جانوروں کے سر اس طرح ٹکرا دیتے تھے کہ وہ چکنا چور ہو جاتے تھے۔

روزانہ ورزش کے بعد ایک لوٹا دودھ ایک سانس میں پیتے تھے۔ وہ تانبے کا لوٹا لکھنؤ میں موجود ہے اس پر لکھا ہے:۔

حیدر خاں ۱۲۶۱ھ اس کا وزن ڈھائی سیر ہے۔ سات سیر پانی اس میں آتا ہے غدر میں اپنے بیٹے محمد غضنفر کے ساتھ لڑتے ہوئے مارے گئے۔

یہ با کمال وہ تھے جن کا ذکر تاریخ کا جزو بن گیا۔ اس زمانہ میں گھوڑے ہی کی سواری تھی۔ ہر رئیس اور سپاہی گھوڑا رکھتا تھا۔ گھوڑا سدھانے اور مشنہ سواری سکھانے والے کتنے لکھنؤ میں تھے اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

چابک سواری | بندہ علی، صادق حسین اور پورن نے اس میں عجیب عجیب کمالات دکھائے۔ بندہ علی خاص واجد علی شاہ کا کوچوان تھا۔ چار گھوڑوں کی گاڑی روپیہ کی قطار پر چلاتا تھا کیا مجال جو پہیہ کہیں سے اتر جائے۔

قیصر باغ کے پھاٹک سے سواری چلی دونوں طرف کے پہیوں کا فاصلہ پھاٹک کی چولوں کے برابر ہوتا تھا۔

چار گھوڑوں کی گاڑی سرپٹ ایک پوئی ایک دلکی ایک قدم اور ممکن نہیں چال کے اس اختلاف سے گاڑی کی رفتار میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے۔

غدر کے بعد نواب رامپور کو ۲۲ گھوڑوں کی گاڑی چلا کے اپنے کمالات دکھائے۔

شیخ بیر علی جن کا ذکر ہم نے شہسواری میں کیا ہے وہ اعلیٰ درجہ کے چابک سوار بھی تھے یہ سب انھیں کے شاگرد تھے۔

شہزوری | لکھنؤ میں شہزوری بھی ایک فن تھا اور اظہار قوت کے مخصوص طریقے لوگوں نے اختیار کئے تھے۔ واجد علی شاہ خود بہت شہزور تھے چٹکی سے روپے کی گولی بنا دیتے تھے۔

مرتضیٰ خان مصاحب گنج میں رہتے تھے بھینسے کی دُم پکڑ لیتے تو وہ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔

مرزا امداد حسین فوج میں کپتان تھے ان کی بقیہ آج تک مفتی گنج میں موجود ہے۔ لکھنؤ کے شہزوروں میں تھے۔ ایک دن ایک مرکھنا بیل چھوٹ گیا۔ یہ اس زمانہ کی وضع کے موافق ڈھال تلوار لگائے ادھر جا رہے تھے لوگوں نے منع کیا انھوں نے سماعت نہیں کی بیل نے ان کی طرف دیکھا اور سینگیں نیچی کرکے حملہ کیا انھوں نے ڈھال پر سینگوں کو روکا اس نے بہت زور لگایا مگر اُن کے ہاتھ کو جنبش نہ ہوئی دوسرے ہاتھ سے تلوار کھینچ کے اس کی گردن اڑا دی۔

مرزا قدرت اللہ بیگ ساکن مفتی گنج بانس کی پوروں کو پکڑ کے ریشہ نکال لیتے تھے۔ ایک دفعہ ایک دہلیز کے کنڈے کو اس زور سے مروڑا کہ دہلیز چر گئی رشیدہ خانم ساکن مفتی گنج نواب ہادی علی خاں کی والدہ زور آوری میں

مشہور ہو گئیں۔ بھاگتے ہوئے چور کا پیر پکڑ کے اس زور سے جھٹکا دیا کہ اس کا گٹا اتر گیا۔

مرزا احمد حسین فوج شاہی میں رسالدار بہت موٹے اور طاقتور تھے کوئی گھوڑا ان کو نہ اٹھا سکتا تھا۔ ہاتھی کے پاٹھے بیٹھے ہاتھی کی مستک پر گھونسا مارتے تو وہ چیخ اٹھتا

ساٹھ کا ذات کا مغل بیشہ کا پیک تھا ایک دن میں ساٹھ کوس کی مسافت طے کرتا تھا۔

نواب شہنشاہ دولہ مرزا صادق علی بہادر شجاع الدولہ کی اولاد میں بڑے درزشی جوان تھے ہزار ہزار ڈنڑ کرتے تھے۔ طاقت میں مشہور تھے۔ فٹن پر عیش باغ کا میلہ دیکھنے جا رہے تھے مصاحبین خاص ساتھ تھے موتی جھیل پر پہونچ کر شور وغل سے گھوڑا بھڑکا گاڑی جھیل کے اندر جانے لگی نواب صاحب جلدی سے اترے اور پہیے کا آرا پکڑ لیا گھوڑا لاکھ بھڑکا گاڑی جنبش نہ کر سکی اور سب لوگ اتر آئے۔

امین آباد سے تعزیہ کا جلوس گزر رہا تھا، ایک انگریز فٹن پر سوار آرہا تھا اس کا گھوڑا بھڑکا اور بے قابو ہو کر ایک طرف بھاگنا چاہا نواب صاحب نے گھوڑے کا ایک پاؤں اٹھالیا اس نے لاکھ زور مارا مگر ہل نہ سکا۔ جب تعزیہ دور نکل گیا ——— پیر چھوڑ دیا۔ انگریز بہت شکر گذار ہوا کہ آپ نہ آجاتے تو نہیں معلوم کتنے آدمی کچل جاتے۔

ایک دفعہ بیمار ہوئے غسل صحت کے لیئے دیگ میں پانی بھرا گیا دیگ چھلک گئی۔ چولھے پر رکھنے کے لیئے چار آدمیوں نے اٹھانا چاہا مگر اٹھ نہ سکی۔ تو خود

اٹھا کے چولھے پر رکھ دی۔

میر پنّو صاحب گنج میں رہتے تھے بڑے طاقتور پہلوان تھے ماتھے پر کیتھا مار کے توڑ دیتے تھے۔

بیراکی لکھنؤ کے خاص فنون میں بیراکی ہے اور خسرفاء کا فن ہے۔ نصیر الدین حیدر کے زمانہ سے اس کی ترقی ہوئی میر مچھلی اور میرک جان نے اس فن میں جان ڈال دی اس کے بعد اس کو بڑا رواج ہوا۔ یہ بھی سپہ گری کا ایک جزو تھا اس سے پھیپھڑے اور بازوؤں میں اتنی طاقت آتی تھی کہ جتنی ڈنڈ مگدر سے گرمی اس کی بہار کا زمانہ تھا اس کی دو قسمیں ہیں سخت پیرائیاں اور ہلکی ملاحی۔ لمبے ہاتھ۔ کھڑی۔ شیر کی پیرائی۔ جل بانک سخت پیرائیاں ہیں۔

گٹھری۔ مردہ۔ پانی پر سونا۔ پالتھی مار کے بیٹھنا۔ دونوں زانوں پر حقہ یا کسی بچہ کو بٹھانا۔ ریل گاڑی۔ ڈبوٹ سیک پیرائیاں ہیں۔

واجد علی شاہ خود بہت اچھے پیراک تھے۔

واجد علی شاہ کے زمانہ میں مولانا مرزا مہدی صاحب ایک فاضل شخص اس کے بھی استاد تھے ان کے سیکڑوں شاگرد تھے اگر ان سے کوئی شکایت کرتا کہ آپ کو درس و تدریس میں مشغول ہونا چاہیئے تو فرماتے۔ میں عالم متبحر بنا تا ہوں بانک اور لکڑی کے فن سے بھی خوب واقف تھے۔ غدر میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔

میر صفدر علی پیراکی میں واجد علی شاہ کے استاد کھڑی میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے۔ گھنٹوں پانی میں کھڑے رہتے تھے مگر جسم کو جنبش نہیں ہوتی تھی جو سات آدمی ان کو پانی میں دباتے تھے مگر کیا مجال جو ناف کو پانی چھو لے۔

بھرا گھڑا ہاتھ میں لے کے سر پر ڈال لیا پورا گھڑا خالی ہوگیا مگر وہ اتنے ہی پانی سے نکلے رہے۔ جل بانک کے بھی استاد تھے۔ سات آٹھ آدمی دریا میں ایک طرف اور وہ اکیلے ایک طرف اور کوئی واران پر نہ چل سکتا۔ غدر کے بعد لکھنؤ میں انتقال ہوا

شیخ بدلو ذات کا نائی ہلکی اور سبک پیرائیوں کا استاد تھا پالتھی مار کے پانی پر بیٹھ جاتا دونوں پاؤں کے انگوٹھے سے پیرتا۔ بوٹ کی پیرائی بھی اچھی پیرتا تھا پانی پر چت لیٹ جاتا تھا۔ آدھا جسم پانی میں ڈوبا رہتا تھا آدھا اوپر رہتا تھا۔

ایک عجیب جدت اس نے کی تھی پانی میں ریل چلاتا تھا۔ بیس پچیس آدمیوں کی لین لگاتا اور خود سب کے آگے ہوتا پوری لین کو کھینچتا ہوا کوسوں نکل جاتا تھا۔ غدر کے بعد بہت دنوں تک زندہ رہا۔ حسین آباد کے تالاب میں اپنے کمالات دکھاتا تھا

شیخ عابد علی غیر کی پیرائی۔ کھڑی، جل بانک کے استاد تھے۔ چڑھے ہوئے دریا میں پیر کے کئی دفعہ اپنا کمال دکھایا۔ غدر کے بعد بہت دنوں تک زندہ رہے۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء تقریباً سو برس کی عمر میں انتقال کیا۔

عام باورچی | باورچیوں نے حیرت انگیز کمالات دکھائے جس کا معمولی اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پلاؤ زردہ قورمہ قلیہ کواب یہ تمام کھانے ترکستان سے آئے مگر لکھنؤ کے باورچیوں نے اس کے مزے اور اقسام میں جو اضافے کئے اس سے ترکستان کے لوگ بھی ناواقف ہیں۔ پچاسوں قسم کے کواب، بیسیوں قسم کے چاول اور قورمے وغیرہ ایجاد کئے اور ہر ایک کے مزے میں نمایاں فرق۔

پرنس عظیم الشان نے سمدھی ملاپ کی دعوت میں واجد علی شاہ کو بھی مدعو کیا تھا اس میں ستر قسم کے صرف چاول تھے۔

شاہی باورچی | واجد علی شاہ کا باورچی حیدر بخش روٹی سالن کواب

قورمہ شیرمال پلاؤ زردہ ہر کھانا مونگ کی دال کا پکاتا تھا اور کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔

انار پلاؤ اور شریفہ پلاؤ ایسا پکاتا تھا کہ اصلی انار و شریفہ معلوم ہوتا تھا۔ تین سو ساٹھ قسم کی صرف روٹیاں پکانا جانتا تھا

ایک دعوت میں اس نے قورمہ ایسا پکایا تھا کہ لوگ اسے مربہ سمجھے اس کے جواب میں حسین علی دہلوی نے پلاؤ زردہ قورما کواب پراٹھا ترکاریاں چٹنی اچار روٹی شیرمال سب پکا کے دسترخوان پر رکھیں لوگ سمجھے کہ واقعی یہ وہی چیزیں ہیں لیکن جس کو کھایا وہ شکر کی نکلی۔

شیخ فرحت اللہ نے ایک عجیب کھانا تیار کرنے کی فرمائش پر ایک بندر کے بچے کو افیون کا عادی بنایا جب وہ گھنٹوں نشہ میں غرق رہنے لگا تو ایک بڑے سے سموسے میں اس کو بٹھا کے دسترخوان پر رکھا اور چھری سے کاٹنے کی فرمائش کی وہ چیختا ہوا نکل کے بھاگا۔ چھوٹے سموسوں میں لال بند کر دیئے۔

عام رکابدار یا ورچیوں کے علاوہ لکھنؤ کے رکابدار بھی خاص چیز تھے یہ کھانا نہیں پکا سکتے تھے بلکہ اچار چٹنی مربہ اور حلوے بنانا ان کا فن تھا۔

شیخ اکرام علی بالائی کی گلوری بنا کے اس میں پستہ کی کیل لگاتا تھا اور رنگ ایسا دیتا تھا کہ بالکل سفید پان معلوم ہوتا تھا

ایک رکابدار نے درخت میں لگی ہوئی نارنگیوں میں اس طرح شیرہ بھرا کہ کہیں سے شگاف نہ معلوم ہوتا تھا نارنگیاں توڑ کر چھیلی گئیں تو پھانکوں میں نارنگی کا مزہ خوشبو سب کچھ موجود تھا مگر مٹھاس کی زیادتی تھی وہ بھی نہایت لطافت کے ساتھ

شاہی رکابدار شیخ فدا علی واجد علی شاہ کے رکابدار نے شیشہ کا ایک کنول بنایا اور شمع جلائی۔ لوگوں نے کہا اس میں صفائی کے علاوہ اور کوئی خوبی نہیں۔ اس نے توڑ کے کھلایا تو معلوم ہوا شکر کا تھا۔

مختلف اہل کمال بالائی کے پراٹھے بھی لکھنؤ کی خاص چیز تھے اکثر گھروں میں سلیقہ مند عورتیں پکا لیتی تھیں۔ امیرن ایک عورت حلوہ بے مثل بناتی تھی۔

گیندوا اور آغا نے لڈو بنانے میں شہرت حاصل کی۔

الٰہی بخش اور محمد علی نے خیاطی میں کمال دکھایا۔

عابد حسین عرف ممدو محمد حسن صابری اور مولوی جراحی میں لطفی تیلی و استخواں بندی میں مشہور تھا۔

کالے بھگت جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔

قائم علی بھانڈ نقالی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ ساڑھے تین گھنٹے تک طرح طرح کے منھ بناتا رہا۔ محرم میں ایسی سبیل رکھی کہ اسکی شہرت ہوئی حضورِ عالم نواب علی نقی خاں مع اپنی بیوی نواب محل کے سبیل دیکھنے گئے وہ ان کو دیکھتے ہی سامنے آیا اور ہاتھ اٹھا کے کہا خدا نواب صاحب کو سلامت رکھے اور بیگم صاحب کو قائم رکھے اتنی سخت بات تھی مگر انعام دیئے بغیر چارہ نہ ہوا

بھوانی بخش اور مشرف علی کشتی کے فن میں دور دور مشہور تھے۔

گوری پٹے کے اور میر فضل علی بانک کے استاد تھے۔

میر مہدی اور میر احمد علی سوز خوانی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

ولایت علی کنکوے بازی میں مشہور تھے۔

پرنس والا قدر شطرنج اور سید حسین چوسر کھیلنے میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔

مجرو گلباز اور لیلی چوری میں یکتائے زمانہ تھا۔

عظیم اللہ نائی | عظیم اللہ ذات کا نائی طبیعت کا بادشاہ تھا عالی شان عمارتیں بنوائی تھیں دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے عراقی و یمنی گھوڑوں سے اصطبل بھرا تھا نوکر چاکر خدمتگار ہر وقت دست بستہ حاضر رہتے تھے نال کٹورے کی کربلا کے پاس ایک عالی شان کربلا بنوائی جواب تک موجود ہے

انگرکھا۔ پیجامہ دوپلی ٹوپی وضع تھی بغل میں کسبت حمائل کرکے گھوڑے پر سوار ہوکے واجد علی شاہ کی حجامت بنانے جاتا تھا کسی اور کی حجامت نہیں بناتا تھا اپنے فن میں ضرور کامل رہا ہوگا جب تو بادشاہ کی حجامت بنانے کے لئے مقرر ہوا مگر اس کے کمال فن کا کوئی واقعہ سننے میں نہیں آیا شان وشوکت اور نفاست مزاج کے واقعات مشہور ہیں اس شان وشوکت سے خان کی لفظ اس کے نام سے خود بخود منسلک ہوگئی۔

ہردم تازہ حقہ کے اصلی نام عظیم اللہ خانی حقہ ہے جو اس کی خاص ایجاد ہے اور اپنے موجد کی اعلیٰ ذہانت جدت نفاست اور نزاکت مزاج کا شاہد ہے۔ نہایت شفاف اور معطر لباس ہر وقت زیب جسم رہتا تھا بدبو کی برداشت نہ تھی اس معاملہ میں نازک دماغی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ایک دفعہ کا پیا ہوا حقہ دوسری دفعہ نہیں پی سکتا تھا۔ ہر دفعہ نیا حقہ بھرا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ نوکروں نے امتحان لینے کے لئے پئے ہوئے حقے کو اندر سے خوب دھو کے عطر ڈال کر بھرا اُس نے پہلا کش کھینچتے ہی نوکر کو آواز دی اور پئے ہوئے حقے کو دوبارہ بھرنے کی وجہ پوچھی نوکر نے ہاتھ جوڑ کے کہا کہ امتحان کے لئے بہت اہتمام سے صاف کرکے اس کو بھرا تھا اور ہم مان گئے کہ سچ مچ پیا ہوا حقہ آپ نہیں پی سکتے اور دوسرا حقہ حاضر کیا۔

گرمی میں ہر سال نئے خس کی ٹٹیاں لگتی تھیں اس کا اہتمام ہوتا تھا کہ کوئی تنکا پرانا نہ لگنے پائے۔

لکھنؤ ایسے شہر میں اپنی نفاست نازک دماغی اور شان وشوکت میں مشہور تھا

شہر کی ترقی و رونق

شہنشاہ اکبر کے زمانہ کا اکبری دروازہ فرانسیسی تاجر کی بنوائی ہوئی عالیشان عمارت فرنگی محل۔ شیوخ کا مچھی بھون اور سچ محلا شاہ پیر محمد کے ٹیلہ پر اورنگزیب کی بنوائی ہوئی مسجد۔ صفدر جنگ کا قلعہ جلال آباد آصف الدولہ کا رومی دروازہ امام باڑہ اس کی بھول بھلیاں باؤنی ایرانی طرز کے چار سو باغ۔ سعادت علی خاں کی کوٹھی فرح بخش۔ موسیٰ باغ۔ حضرت عباس کی درگاہ نال کٹورے کی کربلا۔ غازی الدین حیدر کا شاہ نجف۔ چھتر منزل۔ جانوروں کی لڑائی کا میدان۔ عجائب خانہ گھوڑ دوڑ کا رمنہ۔ نصیر الدین حیدر کی کربلا موتی محل۔ تارے والی کوٹھی پرستان خیرات خانہ انگریزی اسپتال۔ یونانی شفا خانہ، شاہی چھاپے خانہ عظیم الشان کتب خا محمد علی شاہ کا حسین آباد۔ گھنٹہ گھر تالاب۔ ست کھنڈہ۔ شریف منزل۔ رئیس منزل امرا میں حسن رضا خاں کا محل۔ آغا میر کی ڈیوڑھی۔ تحسین علی خاں کی مسجد ملکہ جنان کی کربلا۔ ملکہ زمانی کا امام باڑہ۔ غفرانمآب کا امام باڑہ۔ آغا باقر کا امام باڑہ میر باقر سوداگر کا امام باڑہ شرف الدولہ کا روضہ کاظمین۔ اکرام اللہ خاں کا امام باڑہ۔ جناب عالیہ کا مقبرہ شہر کی مشہور عمارتیں تھیں

واجد علی شاہ نے سبطین آباد کا امام باڑہ بنوایا جس پر دس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ دلکشا کے برابر ایک عالیشان کوٹھی اس کے آگے کا میدان

پیش گاہ دولت خانہ بادشاہ منزل دریا کی طرف ایک صاف شفاف سڑک دونوں طرف قندیلوں اور بلوری کنول کی روشنی ہوتی تھی۔ خاص طور پر انگریز وہاں تفریح کے لیئے آتے تھے قیصر باغ جس کی تعمیر میں اسی لاکھ روپیہ صرف ہوا اس کے اندر ایک چاندی والی بارہ دری بنوائی

حضرت باغ۔ حضور باغ۔ سکندر باغ۔ بنارسی باغ ان باغوں میں چہار دیواری بلند پھاٹک خوبصورت عمارتیں نہریں ایک وسیع سڑک بنوائی

امراء میں روشن الدولہ کی کوٹھی

شہر کے اور لوگوں میں دل آرام کی بارہ دری، عظیم اللہ تائی کی عمارتیں دیانت الدولہ کی کربلا ان سب سے مل کے لکھنؤ ایک عظیم الشان شہر بن گیا۔

مولانا قبول محمد کا بیان ہے کہ

میاں جان عالم کہتے ہیں کہ روئے زمین پر کوئی ایسا شہر نہیں۔

مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں :۔

یورپ کا کوئی دارالسلطنت شان و شوکت میں لکھنؤ سے بہتر نہیں تھا۔

آبادی | پروفیسر جولیس ملاک لکھتا ہے کہ لکھنؤ کی آبادی پون ملین یعنی ساڑھے سات لاکھ تھی جس میں لاکھوں ہنر مند تھے۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو کوئی ہنر نہ جانتا ہو اسکے معنی یہ ہیں کہ ساڑھے سات لاکھ ہنر مندوں کا شہر تھا کوئی علم ایسا نہ تھا جسکے سیکڑوں باکمال موجود نہ ہوں، کوئی صنعت ایسی نہ تھی جو لکھنؤ میں عروج پہ نہ ہو۔ گوٹا لچکا سلمہ ستارہ کامدانی کا تار لکڑی کے چھاپے۔ ہاتھی کے گنگا جمنی ہودے ان کی کارچوبی جھولیں۔ گھوڑوں کے زین ساز و یرانی ڈھال تلوار توپ بندوق۔ تیر کمان، زربفت، اطلس کمخواب ململ تنزیب نہایت

کے لئے ہلکے دوپٹے سونے کے زیور دو ہزرہ کی انگوٹھیاں ہاتھی دانت کی چیزیں بالکل لکی ... ل تامدان بوجہ فنٹ ضرورت کی کوئی چیز باہر سے نہیں آتی تھی یہاں کا مال باہر جاتا تھا۔ امن وامان تھا رعایا خوشحال اور مطمئن تھی

ارزانی | ایک روپے کا بیس سیر گیہوں، اٹھائیس سیر جو چوبیس سیر مٹر۔ تیس سیر ارہر کی دال تھی۔

انگریزی عملداری میں روپے کا چودہ سیر گیہوں بکتا تھا اسی حساب سے اور چیزوں کا نرخ تھا۔ کلکتہ میں ڈاکے پڑتے تھے ٹیکسوں کے بوجھ سے رعایا پریشان تھی جولاہے بیکار ہوگئے۔ آٹھ ہزار آدمی انگریزی عملداری اور دوسری ریاستوں سے لکھنؤ میں آئے آباد اور خوشحال ہوگئے تھے۔ بقول غالب امیر گر سرکار تھی، جو بے سروپا آیا دولت مند بن گیا۔ عجیب رنگ کا شہر تھا۔ انیس و دبیر کے مرثیے حملہ حیدری، طلسم الفت، زہر عشق، گلزار نسیم، واسوخت، امانت نظم میں۔ داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا نثر میں پڑھی جاتی تھی، مشاعرے مقاصدے مجلسیں بڑے تکلف و اہتمام سے ہوتی تھیں۔ درگاہوں اور مزاروں پر جمعرات کو قوالی دھوم سے ہوتی تھی۔ اندر سبھا عوامی اسٹیج تھا۔ کشتی اور بانک پٹے کے سیکڑوں اکھاڑے تھے۔ سارا شہر سپاہی تھا۔ فقیر تک ہتھیار باندھ کے نکلتے تھے۔ گلی کوچے ارباب نشاط سے بھرے پڑے تھے۔ علماء، اطبا اور شعراء کا شمار نہ تھا۔ چودہ سو طبیب کئی ہزار ارباب نشاط دربار سے منسلک تھے۔ ہر فن کا کامل موجود تھا سہ پہر کو لکھنؤ کی جوانی نکھرتی تھی، گلی کوچوں میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ کوٹھوں کے چھجوں سے دن رہے سے چاند تارے چمکتے تھے۔ فضا میں نغمہ و آہنگ کی لہریں ناچتی تھیں۔ جسے دیکھیے اپنی وضع

میں نرالا، کوئی ڈھال تلوار لگائے، کوئی تسبیح ہاتھ میں لئے صاف ستھرا اور معطر لباس، ادب و تعظیم آداب و تسلیم خندہ پیشانی سے مزاج پرسی ہر شخص لطف زبان اور حسن بیان کا دلدادہ عاشق مزاج، دولت کی افراط بعض فقیر ہاتھی پر بھیک مانگنے نکلتے تھے امن وتھا۔ دن عیدرات شب برات تھی نہ صرف ؎

چاندنی تھا سایۂ دیوار قیصر باغ میں

رشکِ جنت ہر مکان لکھنؤ بلکہ حور و غلماں ساکنان لکھنؤ

باہر کے لوگ آتے تھے تو کہتے تھے ؎

لکھنؤ کو یوسفستاں گر کہوں تو ہے بجا جس طرف کو جا نکلئے مصر کا بازار ہے

نجات حسین عظیم آبادی نے لکھنؤ کو دیکھ کے کہا ؎ جنت هذا است کہ آباد باد

اگر فردوس بر روئے زمیں است ہمیں است وہمیں است وہمیں است

آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۸۴۹ء میں ڈلہوزی اودھ پر قبضہ کا منصوبہ بنا چکا تھا کہ اس نے برما کی لڑائی چھیڑ دی اور اودھ کی طرف سے اسکی توجہ ہٹ گئی۔ واجد علی شاہ کو آٹھ برس حکومت کرنے کا موقع مل گیا اس قلیل مدت میں انھوں نے ملک کے انتظامی ڈھانچے کو جس طرح چست و درست کیا علوم و فنون کو جو ترقی دی شہر کو جس طرح آراستہ کیا اسکی روئداد آپ سن چکے ہیں۔

برما کی مہم سے فارغ ہو کے ۳ جولائی ۱۸۵۵ء کو ڈلہوزی نے اوٹرم کمنڈ سے یہ مراسلہ کورٹ آف ڈائرکٹرز کو بھیجا جو اودھ بلیو بک

میں سب سے پہلا مراسلہ ہے:-

میں درخواست کرتا ہوں کہ اودھ کے مسئلہ کا جلد از جلد فیصلہ ہو جانا

چاہیئے۔ اس مسئلے میں کاغذات (RECORD) سے جو آپ کا رجحان معلوم ہوتا ہے اور جس عنوان سے یہ معاملہ آپ کے سامنے اب پیش ہوا ہے۔ اس سے ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس طریقے کو اختیار کرنے سے احتراز کر سکیں جس کو فوراً اختیار کرنے کی سفارش کی گئی ہے"۔

"ان حالات میں اگر آپ خیال کریں کہ آٹھ سال کا تجربہ مجھے مجوزہ کام کے لیئے زیادہ اہل قرار دیتا ہے، بہ نسبت کسی دوسرے گورجنرل کے جو اس سلطنت کے انتظام کے لیئے نیا مقرر ہو تو میں اجازت چاہتا ہوں کہ آپ کو یقین دلاؤں کہ میں اس فرض منصبی کو انجام دینے کے لیئے تیار رہوں"۔ "اگر آپ اس تجویز سے اتفاق کریں جو میں نے انتظام اودھ کے لیئے کی ہے اور چاہتے ہوں کہ اس کا جلد سے جلد نفاذ ہو جائے تو میں عرض کروں گا کہ بغیر وقت ضائع کیئے اس کام کو سرانجام دینے کے لیئے مجھ کو ضروری احکام صادر فرمائے جائیں"۔

الحاق کی اجازت | ڈلہوزی کا مراسلہ مورخہ ۳ جولائی ۱۸۵۵ء کو کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ۲۱ نومبر ۱۸۵۵ء کو منظور کر لیا اور الحاق اودھ کے متعلق کل اختیارات ڈلہوزی کو سونپ دیئے۔

اخبار کوہ نور لاہور ۲۹ جنوری ۱۸۵۶ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی ملک اودھ کی ضبطی کے کاغذات مرتب ہو چکے ہیں لیکن گورجنرل کو فساد کا اندیشہ ہے اور بڑا خطرہ یہ ہے کہ انگریزی فوج کے سپاہی اودھ کے رہنے والے ہیں رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں۔

۶ واجد علی شاہ اپنی رعایا اور فوج دونوں میں حد درجہ ہر دلعزیز تھے جو

ہر دلعزیزی واجد علی شاہ کو حاصل تھی وہ بہادر شاہ ظفر کو کبھی نہ حاصل ہو سکی اگر چہ بہادر شاہ اور ان کی رعایا کا مذہب ایک تھا لیکن واجد علی شاہ اور ان کی رعایا کے مذہب میں اختلاف تھا وہ شیعہ تھے یہ سنی اور دونوں اپنے مذہب پر سختی سے قائم تھے پھر بھی دونوں کے درمیان طبیعت اور عقیدت کا رابطہ استوار تھا۔ اودھ کی ضبطی کے کاغذات مرتب ہو چکے تھے اور واجد علی شاہ کی معزولی کا فیصلہ ہو چکا تھا لیکن بغاوت کے اندیشے سے انگریزوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ واجد علی شاہ اور ان کا دور

راجہ درگا پرشاد بوستان اودھ میں لکھتے ہیں۔ انتزاع اودھ کی خبر سن کے اودھ کے زمینداروں اور تعلقہ داروں نے حضور شاہی میں عرضیاں گذاریں کہ ہم جاں نثاری کو حاضر ہیں اگر حکم ہو تو انگریزوں کو گنگا پار نہ ہونے دیں مگر بادشاہ نے روک دیا۔

ڈلہوزی نے تیرہ ہزار فوج انگریز افسروں کے ماتحت کانپور بھیجدی رزیڈنسی کی فوج اسکے علاوہ تھی۔

ادھر رزیڈنٹ گھبرایا اور مزید ہدایتیں لینے کے لئے کلکتہ گیا۔ کانپور میں فوجوں کے اجتماع سے لکھنؤ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ لوگوں نے رزیڈنسی سے دریافت کیا کسی نے کچھ نہیں بتایا علی نقی خاں نے اسسٹنٹ رزیڈنٹ سے پوچھا تو اس نے کہا کہ نیپال کا راجہ یاترا کے لئے آرہا ہے فساد کے اندیشے سے فوج بلائی گئی ہے۔ اس سے لوگ پریشان ہیں ان کے لئے تفریح کی پروگرام مرتب کیجئے۔ جانوروں وغیرہ کی لڑائی دکھایئے کہ ان کی توجہ ادھر سے ہٹے اور فوج کے لئے رسد کا انتظام کیجئے۔ واجد علی شاہ نے راجہ جے لال کو رسد بہم پہنچانے کا حکم دیا

۳۰ جنوری ۱۸۵۶ء کو ائرم کلکتہ سے آیا وزیر اعظم نے حسب دستور اس کا استقبال کیا اس نے کہا کل دس بجے دن کو آپ ہمارے پاس آیئے گورنر جرل کے احکام سے آپ کو مطلع کریں گے دوسرے دن علی نقی خاں اس کے پاس گئے اس نے کہا وہ وقت آگیا ہے کہ برٹس گورنمنٹ اودھ پر قبضہ کرنے پر اپنے کو مجبور پاتی ہے پارلیمنٹ نے اس کو منظور کر لیا ہے۔ ہنگامہ کے اندیشے سے ایک مضبوط بریگیڈ پر گنگا پار کر کے لکھنؤ کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔ بادشاہ کو برٹش گورنمنٹ کے انصاف پر بھروسا کرنا چاہیئے جو اس بات کی ذمہ داری لیگی کہ کوئی ایسا قدم نہ اُٹھایا جائے گا جس سے بادشاہ کی عزت یا ان کے ذاتی کاموں میں کوئی کمی ہو علی نقی خاں نے کہا کہ جب ملک لے لیا جائے گا تو اس طرح کی شرط کا کوئی محل نہیں۔

ائرم نے یہ معاہدہ بادشاہ کی دستخط کے لئے علی نقی خاں کو دیا اور کہا کہ اگر آپ اس پر دستخط کرا دینگے تو ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر پشت در پشت کے لئے آپ کو دی جائے گی۔ علی نقی خاں نے شاہی مہر لگا کے یہ معاہدہ بادشاہ کے سامنے دستخط کے لئے پیش کیا۔

معاہدہ درمیان مارکوئس ڈلہوزی

اور واجد علی شاہ اور ان کے ورثاء

دفعہ ۱۔ فریقین اس پر متفق ہیں کہ ملک اودھ پر کامل اختیار بلا شرکت غیرے ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس رہے گا۔

دفعہ ۲۔ بادشاہ کا شاہی خطاب باقی رہے گا اور ان کے جانشینوں تک پہنچتا رہے گا۔

دفعہ ۳۔ فریقین اس پر متفق ہیں کہ ہز مجسٹی شاہ اودھ اور ان کے جانشینوں کے

ساتھ ہر موقع پر خود مختار شہزادوں کی طرح پوری توجہ اور عزت وتوقیر کا برتاؤ کیا جائے گا۔

دفعہ ۴۔ یہ بھی طے کیا جاتا ہے اور فریقین اس پر متفق ہیں کہ شاہ اودھ اور ان کے ورثاء لکھنؤ کے محل اور دلکشا اور بیبا پور میں کلی اختیارات ہوں گے سوا اس کے کہ بادشاہ کے حکم موت کا حکم حدود محل اور باغات کے اندر جاری نہیں کیا جائے گا اس کے لئے گورنر جنرل کی منظوری حاصل کرنا ہوگی۔

دفعہ ۵۔ ایسٹ انڈیا کمپنی محاصل اودھ سے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ بادشاہ کو دیتی رہے گی اس کے علاوہ بادشاہ کے لئے پولیس کا ایک دستہ رکھے گی بادشاہ کے جانشینوں کو کمپنی بارہ لاکھ روپیہ سالانہ دیتی رہے گی۔

دفعہ ۶۔ شاہی خاندان کے جن افراد کی کفالت بادشاہ کرتے تھے ان کو کمپنی گزارہ دیتی رہے گی۔

یہ معاہدہ علی نقی خاں نے دستخط کے لئے بادشاہ کے سامنے پیش کیا جسے دیکھ کر ان کو بڑی حیرت اور صدمہ ہوا انھوں نے رزیڈنٹ کو لکھا کہ پورے ملک میں امانی کا نظام رائج کر دیا گیا ہے۔ پولیس کے تھانے قائم کر دیئے گئے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ سے جو معاہدے ہوئے ہیں ان کی رو سے مملکت اودھ پر قبضہ کرنے کا کوئی جواز نہیں رزیڈنٹ اوٹرم نے ا دن اس کا یہ جواب دیا۔

وہ اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے اور ہز مجسٹی کے کسی بیان کو تسلیم نہیں کر سکتے گورنمنٹ ہند نے جو فیصلہ کر لیا ہے اسکی ہدایت کے بموجب دو تین دن سے زائد مہلت نہیں دے سکتے اس کے بعد وہ بادشاہ کی منظوری اور دستخط کے لئے حاضر ہوں گے تین دن کے بعد وہ آیا اور بادشاہ کو سمجھایا کہ دستخط کر دینے ہی میں ہز مجسٹی کا فائدہ

ہے مگر انھوں نے کہا کہ معاہدہ برابر والوں سے ہوتا ہے اب میری کیا حیثیت رہ گئی ہے۔ علی نقی خاں نے بھی اس کے جانے کے بعد دستخط کرنے پر اصرار کیا اور بادشاہ کے نامنظور کرنے پر انھوں نے تلوار بادشاہ کے سامنے رکھدی کہ مجھے قتل کر دیجئے یا دستخط کر دیجئے اس وقت ان کی غداری کھل گئی اور وہ غدار سمجھے جانے لگے

اس داستان کی تفصیل تاریخ لکھنؤ کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں

واجد علی شاہ سارے ہندوستان میں ہر دل عزیز تھے
اس کی وجہ یہ تھی کہ ملک کا ہر صاحب کمال اور پریشان حال لکھنؤ کو اپنا سہارا سمجھتا تھا غالب نے کہا ہے:- کہ وہ امیر گر سرکار تھی جو بے سر و پا گیا وہ نہال ہو گیا۔ سارے ہندوستان کے لوگ ان سے محبت کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ واجد علی شاہ نے معاہدہ پر دستخط کرنے سے انکار کیا اور خیال کیا کہ ملکہ وکٹوریہ سے استرداد سلطنت کی درخواست کریں گے۔ ان کے مشیروں کا بھی یہی مشورہ تھا ان سب کا خیال تھا کہ جس طرح سلاطین اپنے معاہدوں اور عدل و انصاف کی پابندی کرتے ہیں اسی طرح ملکہ وکٹوریہ بھی کریں گی۔

یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بے ایمان عہد شکن حکومت کی بے اختیار ملکہ کیا کر سکتی تھی اور کر بھی سکتی تو انھیں میں کی ایک تو وہ تھی مگر اس کو ملکہ عالیہ سمجھ کے اس کے انصاف سے آس لگائے دن گذارتے رہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ سلطنت اودھ کی ضبطی کا اثر لکھنؤ کی زندگی پر کیا پڑا یہی باتیں تاریخ لکھنؤ کا موضوع ہیں انھیں کو ہم تفصیل سے بیان کریں گے

سلسلۂ بیان کو قائم رکھنے کے لئے ہم نے اس داستان کو جہاں سے چھوڑا تھا وہیں سے شروع کرتے ہیں

بادشاہ کا سفر کلکتہ

معاہدہ پر دستخط نہ کرنے سے بادشاہ کو لکھنؤ کے قیام اور وہاں عمارتوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ انگریزوں نے انھیں کلکتہ لیجانے کا فیصلہ کیا۔

۵ رجب ۱۲۷۲ھ ۱۸۵۶ء کو بادشاہ اپنی سواری باد بہاری پر کانپور روانہ ہوئے پانچسو آدمی ان کے ساتھ تھے۔ لاکھوں آدمیوں نے بچشم اشکبار ان کو رخصت کیا دوہزار آدمی کانپور تک ان کو الوداع کہنے گئے۔ ایک مہینہ کانپور میں قیام رہا۔ اس درمیان میں مہاراجہ ایشوری نرائن سنگھ کی عرضداشت منور الدولہ مہتمم سفر کے ذریعہ نظر اقدس سے گزری کہ محب خیر طلب اس خاندان عالیشان کا ممنون قدیم ہے مرحمت خسروانی سے حضور بنارس میں املاک خیر اندیش میں رونق افروز ہوں۔

بنارس نوے برس سے سلطنت اودھ سے نکل کے انگریزی عملداری میں داخل ہوچکا تھا۔ راجہ کا کوئی تعلق بادشاہ سے نہ تھا مگر ان کی ہر دل عزیزی کا اثر تھا کہ مہاراجہ ایشوری نرائن میزبانی کے متمنی ہوئے اس میں ان کی شرافت نفس کو بھی دخل تھا

بنارس میں قیام ۱۶ اپریل ۱۸۵۶ء ۱۲۷۲ھ کو بادشاہ بنارس کی چھاؤنی سکرول میں مہاراجہ بنارس کی چھاؤنی میں مقیم ہوئے۔ مہاراجہ نے بادشاہ کا استقبال کیا اور بڑی گرم جوشی سے میزبانی کا اہتمام کیا۔ بادشاہ کی قدمبوسی کے بعد جب راجا رخصت ہونے لگا تو بادشاہ نے شرمندگی کے ساتھ کہا کہ اگر مقدرت ہوتی تو ہم راجہ کو ہاتھی اور پالکی کے ساتھ خلعت دیتے اب اس کی قیمت کے موافق زر نقد ان کو دیا جائے۔ ہم نے ان کی نذر اور پیشکش قبول کرلی یہ اس کو امانت کے طور پر اپنے پاس رکھ لیں۔ جب خدا ہم کو خلعت دینے کے قابل کرے گا اس وقت لے لیں گے۔ راجا نے بھی زر نقد نہ لیا اور عرض کیا کہ میں بھی اسی وقت خلعت لوں گا۔

آفتاب الدولہ قلق بادشاہ کے ہمراہ رکاب تھے اس سفر میں شاہی سفر کے مہتمم تھے
انھوں نے حالات سفر میں ایک مسدس سفر آشوب لکھا ہے جس میں اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے

چند دن بنارس میں تو پائی راحت　　واں کے راجا نے بڑی ختم کی انسانیت
اپنے مالک کی ہر طرح ادا کی خدمت　　شاہ کے آنے کی تھی دل میں جو اس کے حسرت

شادی و فرح سے پھولے نہ سماتا تھا وہ
اپنے جامے ہی سے باہر ہوا جاتا تھا وہ

تھالی بھر کر تو روپیہ آتے ہی صدقہ بھیجا　　پیش کش اور زر نقد بھی شہ کا بھیجا
کیا بیاں کیجیے ایک ایک کو کیا کیا بھیجا　　جتنا سامان تھا راحت کا وہ سارا بھیجا

جیسی کرتے ہیں غلام ایسی وفا کی اس نے
سب نمک خواری سرکار ادا کی اس نے

آرزو مند زیارت جو ہوا بلوایا　　بعد مجرے کے وہ اشک آنکھوں میں بھر بھر لایا
نذر دے کر قدم شاہ پہ سر نہوڑایا　　شہ نے الطاف کیا بیٹھنے کو فرمایا

بیٹھتے ہی کرم شہ کی ثنا کی اس نے
بہر افزائش اقبال دعا کی اس نے

جب قدم دیکھ کے مالک کے ہوا وہ رخصت　　شرم سے کہنے لگا وہ شہ عالی ہمت
ہاتھی اور پالکی سے ہم تمھیں دیتے خلعت　　پر کریں کیا کہ نہیں آج وہ باقی حشمت

اس کی قیمت کے موافق زر نقد ان کو دو
جس قدر ان کے ہے لائق زر نقد ان کو دو

پیش کش بھی مری جانے ابھی ان کا نہیں دو　　کہہ دو مقبول ہوا دل میں کچھ آزردہ نہ ہو
جب کہ دکھلائے گا وہ دن مرا قادر مجھ کو　　تب یہ لے لوں گا امانت ہے مری رکھ چھوڑو

عرض کی میں بھی کسی روز یہ خلعت لوں گا
اور جو کچھ کہ مرے دل میں ہے حسرت لوں گا

واہ رے پاس جو کہتا تھا کوئی اس کا یار | نہ کیا اب کی برس آپ نے کوئی تہوار
تو وہ کہتا تھا کہ ہوں عیش میں ہم تو سرشار | اور اس طرح سے لٹ جائے ہماری سرکار

شاد کیا خاک ہوں کس سے کہیں کس غم میں ہیں
اپنی سرکار کے مٹ جانے کے ماتم میں ہیں

آرزو تھی کہ مرے گھر مرا آقا آئے | تا نمک خوار بھی ہم چشموں میں عزت پائے
یا فلک دفعتہً اس قہر کی آفت ڈھائے | کہ وہ آئے بھی تو تشریف یہاں یوں لائے

ہائے کیا روؤں میں اس پھوٹی ہوئی قسمت کو
دیکھوں آوارہ وطن اپنے ولی نعمت کو

بادشاہ بنارس میں پندرہ دن رہ کر جہاز سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے
بحری سفر کس طرح کٹا اور کلکتہ میں انھوں نے کس طرح زندگی بسر کی تاریخ لکھنؤ کے
موضوع سے خارج ہے۔

سلطنت کی ضبطی اور اس کے اثرات

۱۱ر فروری ۱۸۵۶ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور واجد علی شاہ پارلیمنٹ میں مقدمہ دائر کرنے کے ارادے سے یہ شعر پڑھتے ہوئے لندن کے لئے کلکتہ روانہ ہوئے۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں   رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

چار آدمیوں سے زیادہ اکٹھا ہونا ممنوع ہوا۔ ہتھیار ضبط کر لئے گئے۔ نجم الغنی رامپوری نے ضبط کئے ہوئے اسلحے کی یہ فہرست لکھی ہے :۔

توپیں سات سو بیس۔ آتشیں ہتھیار:۔ ایک لاکھ بانوے ہزار تین سو سات

تلواریں پانچ لاکھ اناسی ہزار پانچ سو چھپن ۵۷۹۵۵۶

مختلف ہتھیار چھ لاکھ چورانوے ہزار ساٹھ

حکومت کے اسلحہ پر پہلے ہی قبضہ ہو گیا تھا بڑے بڑے امراء اور تعلقدار مستثنیٰ تھے چھوٹے زمینداروں کے اسلحے کی یہ فہرست ہے۔ کسی نے جل کے یہ شعر کہا ہے ؎

لوہے سے بہت ڈرتی ہے سرکار ہماری
پاجامہ میں کنجی کوئی زنہار نہ باندھے

اودھ کے سپاہیوں کی بڑی تعداد برخاست کر کے سکھ اور پنجابی بھرتی کئے گئے دو پلٹنیں (انیسویں اور چونتیسویں) بنگال بھیجدی گئیں۔

پروپیگنڈا شروع کیا گیا کہ واجد علی شاہ ناچ رنگ میں مشغول تھے ملک میں بدنظمی شہر میں خوشحالی دیہاتوں میں فاقہ کشی تھی ظلم و جور کی چکی میں رعایا پس رہی تھی اور واجد علی شاہ سے انتہائی متنفر تھی ان کی برطرفی رعایا کی بھلائی کے لئے ضروری

تھی۔ اس پروپیگنڈے کے لئے ایک مہینہ پہلے اخبار طلسم مولوی محمد یعقوب کی ادارت میں نکلا اس کے پانچ مہینے بعد گھیر نامی عیاش نے سحر سامری اور مولوی غلام رسول صحافت نے مخزن الاخبار جاری کیا۔ یہ سب حکومت کی طرف سے غلط پروپیگنڈے کے آرگن تھے۔ بہت سے مرقعے شائع کئے گئے جن میں واجد علی شاہ کو ناچتے اور بھاؤ بتاتے دکھایا گیا تھا۔

شہر کی درستی کے لئے چوڑی سڑکیں نکلنے لگیں جس سے ہزاروں خاندان برباد ہو گئے بادشاہ کے اٹھاسی ہزار ملازمین کی فہرست دفتر شاہی سے ملی انھیں برخاستگی کا حکم سنایا گیا۔ شاہی اسلحہ انگریزی میگزین میں داخل ہوا۔ فیل خانہ سے دو سو ہاتھی اصطبل سے دو ہزار گھوڑے اور کبوتر خانے سے دو لاکھ کبوتر ملے جو دل آرام کی بارہ دری میں کوڑیوں کے مول نیلام کئے گئے۔ ہاتھیوں کے گنگا جمنی ہودے۔ زریں جھول گھوڑوں کے ساز و یراق جو سیکڑوں من چاندی سونے کے تھے کوڑیوں میں بک گئے

تمام اہل شہر ہتھیار بند تھے سب سے اسلحہ رکھوا لئے گئے ایک تلوار بھی کسی کے پاس نہیں رہ گئی۔

شہر میں سناٹا ہو گیا نوبت کا بجنا توپوں کا چھوٹنا۔ شاہی سواری کی دھوم دھام روپیہ اشرفی کی بارش موقوف ہو گئی۔ اسی ہزار آدمی واجد علی شاہ کے نوکر تھے ان کی چہل پہل سے دن عید رات شب برات کا سماں ایک دم سے ختم ہو گیا۔ ہتھیار چھن گئے۔ معلوم ہوا کسی نے زندگی چھین لی گھر گھر ماتم برپا ہو گیا۔ کسی نے شعر کہا تھا اور بچہ بچہ کی زبان پر تھا ؎

واجد علی پیارا کلکتہ کو سدھارا
سڑکیں نکل رہی ہیں سونی گلی گلی ہے

شعرا نے دردبھری نظمیں کہیں ؎

کیونکر دل غم زدہ نہ فریاد کرے | جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ اب خداوند کریم | اُجڑی ہوئی سلطنت کو آباد کرے

انیس

عجیب مجمع اہل کمال تھا افسوس | ہزار حیف وہ صحبت فلک نہ دیکھ سکا
نہ پانچوں وقت کی نوبت نہ وردیاں نہ گجر | نہ توپ چلتی ہے اب ہے غضب کا سناٹا
جہاں میں صاحب جوہر کی ہے یہ بیقدری | ٹکے ٹکے پہ بکیں اصفہانیاں کیا کیا
کسی کا کھد گیا پشتہ کہیں گری دیوار | یہ چبوترہ کہیں غائب کسی کا دروزا
جو کچھ خریدنے بازار تک گیا کوئی | وہاں سے پھر آکے جو آیا تو گھر نہ پہچانا
یہ حکم ہے کہ نہ ہوں چار ایک جا باہم | وہ دن گئے کہ شب و روز رہتا تھا جلسا

امان علی سحر

جس جگہ گل تک ان آنکھوں نے یہ ساماں دیکھا | جا پڑی آنکھ جدھر ایک پریشاں دیکھا
جس کو دیکھا صفت گل اسے خنداں دیکھا | آج اُجڑا ہوا ہم نے وہ گلستاں دیکھا

سبق دفتر آرام نہ زنہار پڑھو
آیۂ فاعتبروا یا اولی الابصار پڑھو

کثرت لالہ و گل سے جو ہو مملو گلزار | عندلیبوں کو قدم رکھنا ہو جن شاخونپہ بار
زر گل ہر روز لٹاتی ہو جہاں باد بہار | ہر قدم پر ہوں وہیں برگ خزاں کے انبار

جائے گل خار ہوں باغی عوض گلچیں ہوں
بدلے سُرخی کے لہو سے روشِ رنگیں ہوں

جس گھڑی ہوتا ہے اس تا نہ خرابہ پہ گزر | یہ گماں کرتا ہے ہر ایک ستم دیدہ بشر
نہیں اڑتا ہے یہ سڑکوں پہ غبار آٹھ پہر | فرقت شہ میں زمیں شہر کی ہے خاک بسر

دل پہ صدمے جو گزرتے ہیں وہ سب سہتے ہیں
باغ شاہی میں سڑک دیکھ کے یہ کہتے ہیں

دل خراش ایسی الٰہی کوئی روداد نہ ہو — اس طرح گھر کسی دشمن کا بھی برباد نہ ہو
مدعی ایسا سپہر ستم ایجاد نہ ہو — کسی بے جرم پہ دنیا میں یہ بیداد نہ ہو

ایسی سرکار کسی کی نہ لٹے دنیا میں
یوں وطن سے کوئی اپنے چھٹے دنیا میں

فلق

کیوں حزیں ہیں ساکنانِ لکھنؤ — اے زمین و آسمانِ لکھنؤ
یاد ہے ہم کو وہ شوکت شہر کی — یاد ہے ہم کو وہ شانِ لکھنؤ
میرزا واجد علی شہ بادشاہ — لے گئے ہمراہ آنِ لکھنؤ

میر پر ورش علی سخی

لکھنؤ بیکس ہوا حضرت جو لندن کو گئے — ہم یہاں نالاں ہیں وہ فریاد دشمن کو گئے

شہید شاگرد ناسخ

تغیر لکھنؤ اہل شہر کے غم کا یوں اظہار کرتے ہیں ؎

ہے زباں پر ہر اک کے نالہ و آہ — جان تھا سارے لکھنؤ کی وہ شاہ
شہر شہ کے قدم سے تھا آباد — امرا عیش میں رعیت شاد
چشمۂ فیض عام جاری تھا — کس و ناکس کا کام جاری تھا
تہر ڈھاتی ہے ہائے دوری شاہ — یاد آتی ہے اب حضوری شاہ
لکھنؤ سارا ہو گیا ویران — کوچہ کوچہ پڑا ہے اب سنسان

ہوئی اس درجہ خانہ بربادی
نام کو رہ گئی ہے آبادی

شہر سے لے کے دیہاتوں تک غم و الم کی گھٹا چھائی ہوئی تھی کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ ہو اور کوئی دل ایسا نہ تھا جو سوگوار نہ ہو۔ دیہاتیوں نے گیت بنائے تھے جو مشہور ہو گئے۔ ایک گیت کے دو بول یہ ہیں ؎

واجد علی میرا پیارا — اب لندن کو سدھارا
گلیوں گلیوں خاک اڑت ہے — سڑکوں سڑکوں اندھیارا

ایک گیت کے دو بول ملاحظہ کیجئے

حضرت گئے لندن ہم پر کر پا کرو رگھو نندن

اس میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ نہیں کہا کہ ان پر کرپا کرو بلکہ یہ کہا کہ ہم پر کرپا کرو۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ رعایا بادشاہ کی تباہی کو اپنی سمجھتی تھی کسی نے کہا تھا اور مشہور ہو گیا تھا

فرنگی کے گھر گھر دیوالی ہمرے گھر گھر اندھیارا

کسی نے کہا

دل کا چین ہمارا واجد علی پیارا
لے گیا فرنگی ہتھیارا بھلا ان کو کرتارا

اس کو ٹوٹی پھوٹی شاعری نہ سمجھے یہ ٹوٹے ہوئے دلوں کی پر درد صدائیں ہیں کہ واجد علی شاہ نے رعایا کے دل میں کتنا گھر بنا لیا تھا کہ ان کی جدائی اور ان کی تباہی پر خون کے آنسو رو رہی تھی

یہ تو اودھ کے لوگ تھے چار سو میل دور دہلی میں غالب کہتے تھے

تباہی ریاست اودھ نے باآنکہ بیگانہ محض ہوں مجھکو اور بھی افسردہ دل کر دیا بلکہ میں کہتا ہوں سخت ناانصاف ہونگے وہ اہل ہند جو افسردہ دل نہ ہوں گے ادبی خطوط غالب ص۵

یہ اشعار نہیں اہل لکھنؤ کے دل کا درد ہے جس نے شعر کا قالب اختیار کر لیا ہے

انگریزوں سے نفرت و برہمی کی انتہا یہ تھی کہ جب پہلے انگریزی سکہ لکھنؤ میں آیا جس پر ملکہ وکٹوریا کا چہرہ تھا تو کسی نے شعر کہا تھا اور مشہور ہو گیا تھا۔

سرکٹ کے کمپنی کے سکے سولہ آنے کو آئینگی ملکہ تو ریا خرچی[1] چلانے کو

---

[1] بدکاری سے کمانے والی کو خرچی چلانے والی کہتے ہیں اسکے لفظی معنوں سے اس شعر میں صندت توجیہ ہے۔

ایک نیا محاورہ "انگریز بندوں" دشمنوں کے معنوں میں پیدا ہو گیا یعنی جس طرح ہر برائی اور مصیبت دشمنوں کے لیے کہی جاتی تھی اسی طرح اب عورتیں انگریز بندوں کہنے لگیں اور آج تک یہ محاورہ لکھنؤ کی عورتوں کی زبان پر ہے جیسے کسی نے کہا فلاں بیمار ہیں تو اس سے پوچھا اے ہے انگریز بندے کیا بیمار ہیں

شہر کے لوگ پڑھے لکھے معاملہ فہم اور مشغول ہوتے ہیں وہ حادثات کو بھلا دیتے ہیں مگر دیہات کے لوگ بہت دن تک یاد رکھتے ہیں خاص طور پر عورتیں لکھنؤ اور اس کے دیہاتوں میں سلطنت کی ضبطی کے معاملہ میں یہی ہوا شہر کے لوگ جب کتابوں میں واقعات پڑھتے یا عمارتوں کو چشم عبرت دیکھتے ہیں یا کبھی ذکر نکل آتا ہے تو بے اختیار آہیں بھرنے لگتے ہیں مگر دیہاتوں میں آج سو برس کے بعد بھی عید بقر عید ہولی دیوالی بہار برسات اور محرم میں یہ غم تازہ ہو جاتا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی سوانحعمری (یادوں کی برات) میں اپنے بچپنے کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ برسات میں بہت سی عورتیں ان کے صحن میں کجلی گا رہی تھیں اور وہ جھولا جھول رہے تھے کہ اتنے میں ان کی کھلائی ہانپتی کانپتی لکڑی ٹیکتی آئیں اور گانے والیوں سے کہا بچیو ذرا ٹھہر جاؤ آج یہ پھوس بڑھیا گائے گی وہ سب پیچھے سرک کر بیٹھ گئیں بڑی بی نے اپنے سر کی چادر پھینک دی ان کے سفید بال اڑنے لگے اور اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کے بڑے دردناک لہجے میں گانا شروع کر دیا۔

ہائے تمرے بنا برکھا نہ سہائے اے مورے کلکتے کے جوگیا

تمہارے بغیر برسات اچھی نہیں لگتی اے میر کلکتہ جانے والے

اللہ تمھیں لائے، ہائے اللہ تمھیں لائے اللہ تمھیں لائے

بڑی بی کو گاتے اور روتے دیکھا تو میں (جوش) جھولے سے کود پڑا ان کے سینے سے جا کے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میرے روتے ہی تمام گانے والی

چھوکریاں بھی منہ پر پلو رکھ رکھ کر رونے لگیں گھر کی تمام خواتین انتہائی سراسیمگی کے ساتھ دوڑ پڑیں اور پوچھنے لگیں اے خدا کے واسطے جلدی بتاؤ کیا ہو گیا ہے۔

....

بڑی بی:۔ ذرا انصاف سے کام لو اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کے سوچو کہ برکھارت میں برسات اور ہائے جان عالم پیا کی یاد نہ آئے، ہائے قیصر باغ میں برکھا کے جھولے میں خود دیکھ دیکھے ہوئے ہوں میری آنکھوں میں پھر رہی ہیں وہ بہاریں۔ ہائے میرے جان عالم پیا موئے فرنگیوں نے گلا گھونٹ کر تم کو مار ڈالا ہائے لکھنؤ کا سہاگ لٹ گیا۔ قیصر باغ کی بارہ دری اندھیرے میں ڈوب گئی ہائے شہزادیاں ٹھوکریں کھاتی پھرنے لگیں" اتنا کہہ کے بڑی بی نے دوبارہ اپنی آنکھوں پر پلو رکھ لیا اور رو رو کر گانے لگیں۔" ہائے تمہرے بنا ہائے تمہرے بنا برکھا نا سہائے ارے مورے کلکتہ کے جوگیا اللہ تمھیں لائے اللہ تمھیں لائے"۔

بڑی بی کے اس درد دل نے پورے گھر کو ہلا کے رکھ دیا سب کی آنکھوں سے باران جاری ہو گئے میری ماں نے چیخ ماری میری غضبناک پھوپھی کی ہچکیاں بندھ گئیں اور دادی جان بھی منہ پر آنچل رکھ کے رونے لگیں اور گانے والی چھوکریوں کا تو برا حال ہو گیا۔ گھر کا ذرہ ذرہ چیخنے لگا اللہ تمھیں اللہ تمھیں لائے اللہ تمھیں لائے

یادوں کی برات ص ۸۳

اپنا ایک اور واقعہ انھوں نے یہ لکھا ہے:۔

" ایک روز میں لکھنؤ کے نخاس والے مکان کی بالائی منزل کے برآمدے میں اپنی کھلائی بڑی بی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ سڑک سے دفعتاً تراق تڑاق کی آوازیں آئیں بڑی بی نے جھک کر دیکھا اور زار زار رونے لگیں میں نے پوچھا یہ بیٹھے بٹھائے

روتے کیوں لگیں بڑی بی انھوں نے روتے ہوئے کہا۔ بیٹا موا گاڑی والا گھوڑے کو
چابک سے مار رہا ہے تڑاق تڑاق۔ ہمارے جان عالم پیا کے زمانے میں ان گھوڑوں
کو رئیسوں کی آبرو سمجھا جاتا تھا ان کو دودھ جلیبی اور ملائی کھلائی جاتی تھی جب سے
ان بندر فرنگیوں کا راج ہوا ان غازی مردوں کو مارا جانے لگا۔ ....
کہتے کہتے اپنی بے بوئی کے کھکل سینہ پر ہاتھ مار کر کہا ہائے جان عالم پیا اب نہ پلٹیں گے
لگے فرنگی بڑی بی کی یہ بات سن کر میں بلبلا گیا اور فرنگیوں سے نفرت ہوگئی ص ۱۱۰

پرانے زمانہ سے شب عاشور دیہاتوں کی ہندو مسلمان عورتیں چیونٹیوں کی
سی قطاروں کی طرح چاروں طرف سے شہر میں گاتی ہوئی آتی تھیں۔ آصف الدولہ اور
حسین آباد شاہ نجف کے امام باڑوں کی صبح تک زیارت کرتی ہیں اور کہیں ٹھہرتی
نہیں قطار کی شکل میں گاتی ہوئی گزرتی رہتی ہیں ایک دم کے لئے توقف ممکن
نہیں کیونکہ ان کے پیچھے لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے لاکھوں میں مبالغہ ضرور معلوم ہوتا ہے
مگر جو مجمع میں نے دیکھا ہے اُس کی کثرت کا اظہار ہزاروں سے کرنا اس کی تخفیف ہے
جس طرح ان کے قدموں کی رفتار میں توقف نہیں ہوتا اسی طرح ان کی زبان بھی نہیں
رکتی مسلسل گاتی رہتی ہیں۔ اس گانے کو وہ دہاروتا کہتی ہیں۔ یہ طریقہ ہمارے
زمانہ تک تھا اور شاید اب بھی ہو ان کے گیت میں دو لفظیں بار بار آتی ہیں۔ بی بی کا
لال اور نکی" میں نے ایک سن رسیدہ آدمی سے نکی کے بارے میں پوچھا تو
انھوں نے بتایا کہ نکی علی نقی خاں ہیں واقعہ کربلا کے ساتھ سلطنت اودھ کی تباہی
کا ماتم بھی کرتی ہیں لہذا اس کا ذمہ دار علی نقی خاں کو قرار دیتی ہیں۔ یہ سکھائی ہوئی
باتیں نہیں ہیں دل سے بے اختیار نکلی ہوئی آہیں ہیں۔ بیتابانہ آنسو ہیں جو بتاتے ہیں کہ
بادشاہ اور رعایا میں کتنی محبت تھی بلکہ سارے ہندوستان کو حکومت اودھ محبوب تھی کیونکہ وہ امر گر

(العصر ۹ ... ۱۹۸ ...)

جنگِ آزادی
یا
بغاوت

خدنگ غدر کے مؤلف کا بیان ہے کہ

دو پلٹنیں (۱۹ اور ۳۴) لکھنؤ میں مقیم تھیں انھوں نے الحاق اودھ کی غیر منصفانہ کارروائی کے بارے میں مشورے کئے اور طے کیا کہ انگریزی راج الٹ دینے کے لئے بغاوت برپا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے ـــــــ ۱۸۵۷ء میں جب پلٹنوں کے تبادلہ کا وقت آیا تو ان میں سے ایک پلٹن بیرام پور اور دوسری بارک پور بھیج دی گئی ان دونوں پلٹنوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کی جانب سے سخت نفرت کا جذبہ موجود تھا اور انھوں نے دوسری پلٹنوں کے نام چٹھیاں روانہ کیں چونتیسویں پلٹن نے اس کارروائی میں پہل کی ان چٹھیوں میں ہر پلٹن کو ہندوستان کے قدیم شاہی خاندان کی یاد دلائی گئی تھی اور ظاہر کیا گیا تھا کہ اودھ کے علاقہ کی فوج کو برطرف کر دیا گیا ہے اور اس کے بجائے نئی پنجابی فوج بنائی گئی ہے جو سکھوں اور پنجابیوں پر مشتمل ہے۔ ص۵۱

یہ تحریک زور پکڑتی رہی جس کی تفصیلات تاریخوں میں موجود ہیں۔

بارک پور (بنگال) کی پلٹن نے سب سے پہلے بغاوت کی مگر وہ دبا دی گئی۔

دس مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں بغاوت ہوئی اور باغیوں نے دہلی پہنچ کے بہادر شاہ کو ہندوستان کا بادشاہ بنایا۔ یہ خبر سنتے ہی لکھنؤ کے پچاس ہزار آدمی تلوار لے کے کھڑے ہو گئے کانپور جو انگریزوں کا گڑھ تھا فتح ہو گیا اور انگریزوں نے ہتھیار ڈال دیئے بیلی گارد کا محاصرہ ہو گیا اب دہلی لکھنؤ اور کانپور غدر کے بڑے مرکز تھے اور ہر محاذ پر یوپی کے سپاہی لڑ رہے تھے۔

ہندوستان کے بیشتر حصوں میں خاموشی تھی۔ انبالہ، پٹنہ اور کلکتہ میں معمولی پشت
شت ہوئی۔ پنجاب سندھ سرحد بنگال آسام مدراس کے لوگ اور وہاں کی فوجیں، حیدرآباد
دیسی ریاستیں مددگار رہیں گورکھوں اور سکھوں نے حمایت کی۔

رانا جنگ بہادر نیپال سے فوج لے کے آیا

خود انگریزی فوجیں نہایت منظم اور اعلیٰ جنرلوں کی کمان میں لڑ رہی تھیں۔

جھانسی کی رانی اور نانا صاحب نے بے شک بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا۔

برصغیر ہندوستان کے وسیع علاقہ میں یہیں کے باشندوں کا مقابلہ تمام ہندوستانی
اور انگریزی قوم سے جس طرح ہوا اس کی کیفیت رئیس احمد جعفری کی زبانی سنیئے

"انگریزی فوج منظم تھی ماہر جنگ تھی انگریزوں کے پاس وسائل و ذرائع کی کمی نہ
تھی دولت تھی جاسوسوں کی کمک تھی رجواڑوں زمینداروں اور تعلقداروں کی مدد تھی
سکھوں اور دوسرے علاقہ کے سپاہیوں کی موج در موج فوج تھی اودھ کے باغیوں
کے پاس نہ دولت تھی نہ ذرائع تنظیم، ہاں حوصلہ تھا اور ہمت تھی مر مٹنے کا جذبہ تھا جان
دینے کا ولولہ تھا۔ انھیں ہتھیاروں سے وہ لڑتے تھے اور دشمنوں کے چھکے چھڑا دیتے تھے
(واجد علی شاہ اور ان کا دور صـ۳۸۱)

تقریباً اٹھارہ مہینے لڑائی رہی دہلی کا تین مہینے تک کا محاصرہ رہا اور فتح کی
صورت نہ نکلی تو پنجاب سے فوجیں آئیں اور سخت معرکے کے بعد دہلی فتح ہوئی اس خبر نے
اہل لکھنؤ کا جوش اور بڑھا دیا۔ رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:۔

"انگریزوں نے دہلی فتح کرلی لیکن اودھ کے باہمت لوگوں کے حوصلے
میں اس حادثہ سے بھی فرق نہیں آیا اور وہ زیادہ جوش و خروش
کے ساتھ لڑنے لگے۔ (واجد علی شاہ اور ان کا دور صـ۳۷۸)

انگریزوں کو پے در پے شکستیں ہوئیں سرکولن دو مرتبہ میدان چھوڑ کر بھاگا۔ سر ہنری لارنس ایسا مایۂ ناز جنرل جس نے دہلی فتح کی تھی جان سے مارا گیا۔ لارڈ ڈفرون خاک و خون میں غلطاں ہوا مریندر ناتھ لکھتے ہیں :۔

۱۶ نومبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے سکندر باغ پر حملہ کیا جس کا اہل لکھنؤ نے سخت مقابلہ کیا۔ کرنل گورڈن الیگزنڈر کا بیان ہے کہ قوی ہیکل حبشنیں جنگلی بلیوں کی طرح لڑ رہی تھیں اور جب تک وہ ہلاک نہیں ہوگئیں یہ شبہ بھی نہیں ہوا کہ وہ عورتیں ہیں۔

سارجنٹ فوربس میچل کہتا ہے کہ ایک عورت پیپل کے ایک بڑے درخت پر بیٹھی ہوئی انگریزوں پر نشانہ بنا رہی تھی آخر خود بھی گولی سے ہلاک ہوئی۔

اٹھارہ سو ستاون ص ۲۲۷-۲۴۲

انگریزوں کی تازہ دم فوجیں مہاراجہ کپورتھلہ اور پٹیالہ کی قیادت میں پہنچتی رہیں آخر دلکشا اور عالم باغ میں انگریزوں نے اپنی ساری طاقت مجتمع کر کے بڑا زوردار حملہ کیا اہل کیا اہل لکھنؤ نے بھی شدید مقابلہ کیا دریا خون سے رنگین ہو گئے اور پہلی مرتبہ شکست ہوئی مگر اہل لکھنؤ کی ہمت میں فرق نہیں آیا۔ لاہور کے مشہور مصنف میاں محمد شفیع نے "۱۸۵۷ء" ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے اس میں لکھتے ہیں :۔

"دنیا میں کون ایسی قوم ہے جس نے اتنی ناکامیوں میں ہمت و جرأت کا ایسا مظاہرہ کیا ہو اور شکست کے بعد تازہ دم ہو کے لڑی ہو دوسرے دن ہی لکھنؤ میں پھر ڈھول بجا اور موتی محل کے محاذ پر ایسا رن پڑا کہ پہلے دن کی لڑائی پیچھے رہ گئی لیکن انگریزوں کی منظم اور مسلح فوج کے سامنے پھر بھی کچھ پیش نہ گئی اور لکھنؤ کے مجاہد داد شجاعت دے کے بیٹھ رہے۔

اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ لکھنؤ کی حالت دہلی سے بدرجہا بہتر تھی شہر میں نسبتاً خلوص تھا اور علاقے کی وطن پرستی و دین پروری سے سرشار تھے غداروں کی کمی تھی اور لڑتے وقت سپاہی اور مجاہد عواقب و انجام سے بالکل بے نیاز ہو کر لڑے"

ص ۲۴۴

انگریزوں کی کمک ہر طرف سے ہوتی رہی آخر لکھنؤ کا محاصرہ ہو گیا اور باغی

مہینے تک انگریزوں کو لوہے کے چنے چبانا پڑے۔ مولوی ذکاء اللہ دہلوی تاریخ عروج عہد انگلشیہ میں لکھتے ہیں:۔

محصورین لکھنؤ کو اس ناامیدی نے کہ نہ کہیں سے کمک آئے گی یا اور کوئی دستگیری و تائید ہو گی ان کی ذہانت کو تیز کر دیا تھا وہ اپنی حفاظت کے لئے نئی نئی تدبیریں اپنی فکر و فہم سے ایجاد کرتے تھے۔ ص۸۵

پانچ مہینے کی لگاتار کوشش کے بعد لکھنؤ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ حضرت محل اور برجیس قدر نیپال چلے گئے۔ پندرہ دن تک لکھنؤ لٹتا رہا۔ اس مہذب قوم کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے شاہی محلوں اور امام باڑوں کے تمام شیشہ آلات توڑ دیئے قیمتی سامان لوٹ لیا۔ شاہی عجائب خانہ کے تمام جانوروں کو جس میں ایک سو سٹ صرف شیر تھے گولی مار دی۔

میجر کارنیگی نے فرح بخش کے شاہی کتب خانہ سے ساری کتابیں نکلوا کے آگ لگوا دی۔

اس زمانہ میں شرفاء لکھنؤ نے جس غیرت و حمیت کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ شرفاء کی عورتیں کنوؤں میں گر گئیں۔ کچھ معمولی درجہ کی عورتیں جو باہر نکلتی تھیں درگاہ حضرت عباسؑ میں جا کے چھپ گئیں ۔اکثر باحمیت مردوں نے اپنے صحن میں عورتوں کو قتل کر دیا جو بھاگ سکا وہ بھاگ گیا۔ شہر میں یہ ہو رہا تھا اور اضلاع میں لکھنؤ سے ہٹ کے جنگجو بہادروں نے مورچے قائم کر دیئے تھے۔ راجہ دیبی بخش سنگھ، ناظم بیسواڑہ، شیخ فضل علی ناظم میر مہدی حسن ناظم سلطانپور، محمد حسن خاں۔ گورکھپور میں خان علی خاں خیر آباد مولوی محمد خاں سنڈیلہ میں،

راجہ کاظم حسین. بہرائچ میں تجمل حسین خاں زمیندار بھٹوا مئو' لکھنؤ میں راجہ دیبی پرشاد سنگھ گونڈہ میں گلاب سنگھ راجہ مہونا نرپت سنگھ راجہ ویرانا مادھو بخش سنگھ' چودھری مصاحب علی ۔ اننڈی کورمی جوت سنگھ راجہ تردا مان سنگھ راجہ جودھیا اسی دم خم سے لڑتے رہے ہارتے بھی رہے مگر ہمت نہیں ہاری ۔ انگریز مورخ ملرس تاریخ بغاوت ہند میں لکھتا ہے کہ بینی مادھو سنگھ تعلقدار جب اپنے قلعہ کی حفاظت نہ کرسکا اور قلعہ انگریزوں کے سپرد کردیا تو اس سے کہلوایا گیا کہ خود کو بھی انگریزوں کے حوالے کردے تو اس نے جواب دیا کہ یہ جسم بادشاہ کا ہے اور اسی جوانمردی سے لڑتا رہا ۔ یہ حالات دیکھ کے جنرل اوٹرم کے پاس لارڈ کیننگ نے ذیل کا اشتہار جاری کرنے کا حکم بھیجا ۔

١ ۔ اودھ کی کل آراضی باستثنائے چھ تعلقداروں کے ضبط کی جاتی ہے ۔

٢ ۔ جو تعلقدار و زمیندار فوراً اپنے کو گورنمنٹ کے لطف و کرم کے حوالے کردے گا وہ موت اور قید کی سزا سے معاف کیا جائے گا بشرطیکہ وہ یہ ثابت کرے کہ اس نے بغیر کسی اشتعال کے کسی کو قتل نہیں کیا ۔

٣ ۔ جن لوگوں نے انگریزوں کی جانیں بچائی ہیں انھیں خاص عنایتوں سے سرفراز کیا جائے گا ۔

جنرل اوٹرم نے گورنر جنرل کو سمجھایا کہ لکھنؤ پر قبضہ تو ہوگیا ہے مگر باغی ضلع میں چلے گئے ہیں اور از سر نو مورچے قائم کردیے ہیں ایسی حالت میں اگر ان سے معزز دشمن کا سلوک نہ کیا گیا اور اچھے برتاؤ کی مستحکم ضمانت نہ دی گئی تو وہ گوریلا وار شروع کردیں گے جس میں ہزاروں انگریزوں کی جانیں جائیں گی دوسرے حکام نے بھی اس کی تائید کی

تو یہ فقرہ بڑھانے کی اجازت دی

"جو لوگ اپنے کو گورنمنٹ کے رحم و کرم کے حوالے کردیں گے ان کے استحقاق مستحکم کئے جائیں گے"۔

(تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ)

مؤلف آثار یادگار کا بیان ہے کہ اس اشتہار کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اسی زور شور سے جنگ جاری رہی لارڈ کیننگ بہت گھبرایا اور سر رابرٹ منٹگری کو اس مہم پر آمادہ کیا اور جنرل بیرڈ کو الہ آباد طلب کرکے اجازت دی کہ جس طرح اودھ کے لوگ راضی ہوں انھیں راضی کیا جائے انھوں نے بڑے بڑے وعدے کیئے اور ہر قیمت پہ راضی کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی اس پر بھی بیرڈ ہمت باندھے رہے اور معافی و درگزر کے اشتہارات جاری کرتے رہے۔ ذاتی طور پر بھی خطوط لکھے جن میں بڑے بڑے وعدے تھے بعض افراد کو یہاں تک لکھا کہ جن انگریزوں کو آپ نے قتل کیا ہے اس کا بھی خیال نہیں کیا جائے گا۔ اس پر بھی اودھ کے بہادروں نے جنگ نہیں بند کی تو خیر خواہان انگریز کے ذریعہ سے افہام و تفہیم کرائی اور ہر طرح کی ضمانت دلوائی اور لوگوں کو معافی طلب کرنے پر آمادہ کیا مگر جو آیا وہ آن بان سے آیا اور سپاہیانہ انداز میں گفتگو کی۔

تجمل حسین خاں بائیس ہزار جنگجو سپاہیوں کے ساتھ نیپال کی ترائی سے واپس آئے۔

میر مہدی حسین ناظم سلطانپور پندرہ ہزار آدمیوں کے ساتھ آئے۔

میر دوست علی خلیل بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ حاضر ہوئے

شیخ فضل علی ناظم سلون کے ساتھ پانچ ہزار مرنے والے جوان تھے

تجمل حسین خاں کی حاضری کا واقعہ آثار یادگار میں یہ لکھا ہے:-

"جنرل ہیرو ایک فوج کے ساتھ بہرائچ میں تھا کہ تجمل حسین خاں بائیس ہزار جوانوں کے ساتھ معافی کے لیے پہنچے انگریزی فوج میں ہلچل مچ گئی اور صف بندی کا حکم ہوگیا۔

تجمل حسین خاں پالکی سے اترے اور چند جاں نثاروں کے حلقے میں اس شان سے آئے کہ داہنا ہاتھ گولی لگنے سے بیکار تھا وہ ایک بانس کی نالی میں تھا جسے خدمت گار سنبھالے ہوئے تھا تنچے کی جوڑی لگی ہوئی اور بائیں ہاتھ میں تلوار، جنرل کے سامنے آکر کرسی پر بیٹھ گئے جنرل اور اس کے رفقا بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ دوران گفتگو جنرل نے غالباً تاسف کے طور پر ان کے باغی ہو جانے کا ذکر کیا۔ تجمل حسین خاں نے درشت لہجہ میں کہا ہم ہرگز باغی نہیں ہیں۔ سرکار انگریزی کا کوئی حق ہم پر نہیں تھا پشتہا پشت سے جس کا نمک کھایا تھا اس کے ناموس کا ساتھ دیا اور آپ کے ہاتھ سے بچا کے نیپال پہنچا آئے اب مُلک آپ کا ہے۔ آپ کی رعایا میں داخل ہو رہے ہیں اور اسی طرح وفادار رہیں گے۔ ہیرو نے مزاحاً یا امتحاناً کہا کہ اگر ہم آپ کو قتل کر دیں۔ انھوں نے تیور بدل کے کہا۔ ابھی تو ہم آپ یکساں ہیں، ہم بھی مسلح ہیں اور آپ بھی۔ جنرل مُسکرایا اور ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کے کہا، بہادر ایسے ہی ہوتے ہیں۔

کرنل شمیر مہتمم بندوبست نے اپنی رپورٹ میں بھی اُن کی آن بان کا ذکر کیا ہے۔

(آثار یادگار صـ ۱۳۲)

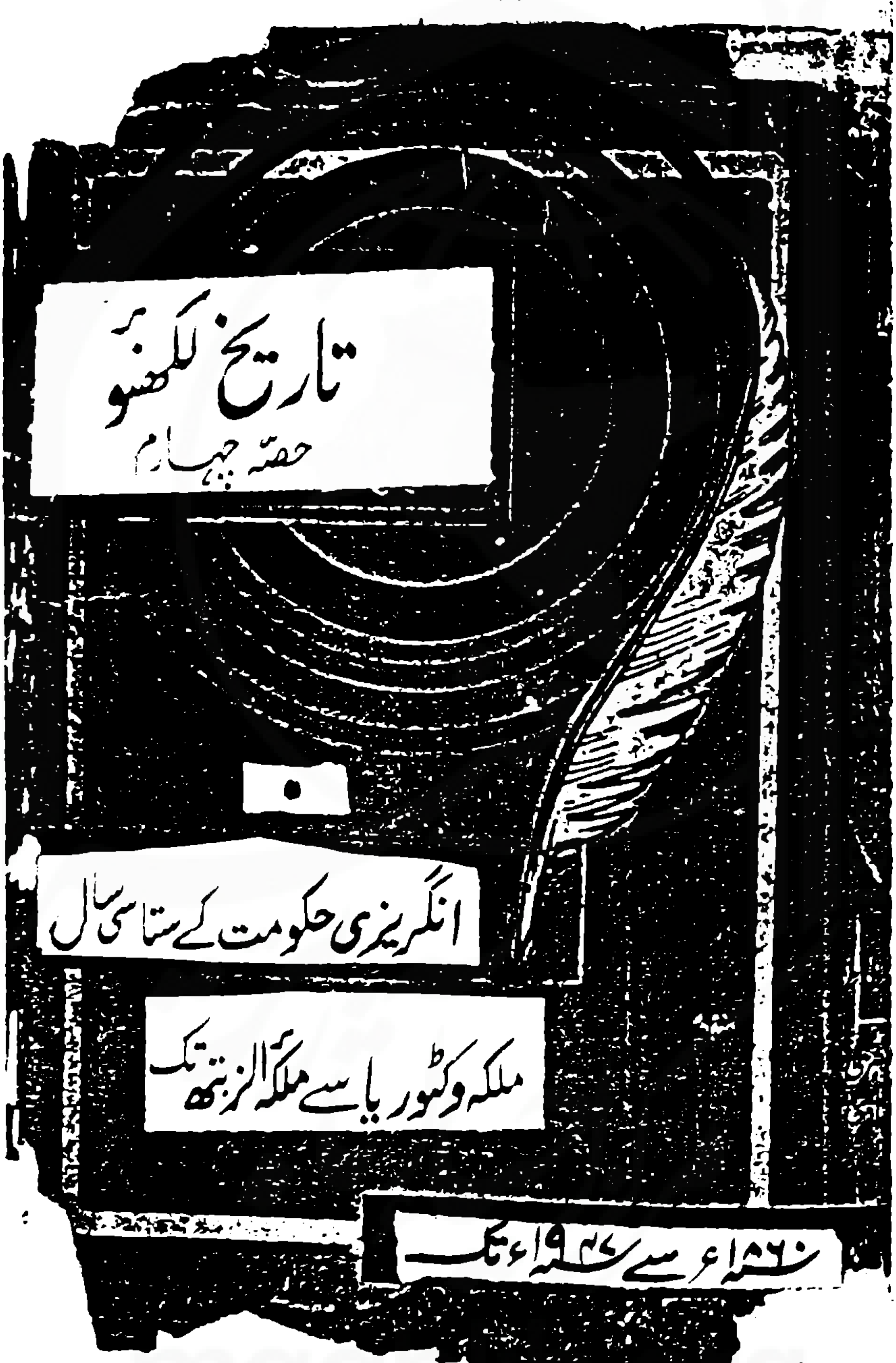
تاریخ لکھنؤ
حصّہ چہارم
انگریزی حکومت کے ستاسی سال
ملکہ وکٹوریا سے ملکہ الزبتھ تک
سنہ ۱۸۶۰ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک

maablib.org

لکھنؤ غدر کے بعد

۱۸۶۰ء سے ۱۸۸۰ء تک

لکھنؤ کا صد سالہ ذوقِ سپہ گری ضایع نہیں ہوا۔ اودھ کے جانبازوں نے اپنی بہادری کا سکہ بٹھا کے انگریزوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا اور ایسی رعایتیں حاصل کیں جو برابر کے دشمن سے لڑ کے لی جاتی ہیں۔

ملکہ وکٹوریا نے ایسٹ انڈیا کمپنی توڑ دی تعلقہ داروں اور زمینداروں کے مالکانہ حقوق تسلیم کئے مذہبی آزادی کا اعلان کیا اور اس کی تبلیغ کی اجازت دی۔ اودھ کے بااثر لوگوں کو بغاوت کے الزام سے بری کیا۔

سلطان العلما مجتہد العصر سید محمد صاحب پر مقدمہ بغاوت کی کارروائی اُن کے گھر پر ہوئی انھیں بغاوت کے الزام سے بری کیا۔ ان کی بیس ہزار سالانہ کی جائداد واگزار کی۔ دو ہزار روپیہ ماہوار پولیٹکل بینفشن پشت در پشت کے لئے دی جو ان کی اولاد میں اب تک باقی ہے۔ تنخواہ کی یہ نوعیت شاہی میں بھی نہیں تھی۔ ملکہ وکٹوریہ نے ان کی تصویر دیکھنے کی خواہش کی جنرل بیرو نے ایک ہندو مصور سے تصویر بنوائی اور ہاتھی دانت کے چوکھٹے میں لگوا کے بھیجی۔ میں نے مصور کو ہندو اس وجہ سے سمجھا کہ اُس نے چہرے کے گرد سری کرشن جی کی تصویر کی طرح سورج کی کرنیں دکھائی ہیں۔ یہ ہندو آرٹ ہے۔ شملہ کو بھی سفید کر دیا ہے۔ وہ شملہ اور عمامہ کا فرق نہیں سمجھ سکا۔ ساخت شملہ کی ہے جس میں پیچ نہیں دکھائے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شملہ پر سفید کپڑا لپٹا ہوا ہے یہ ایسی غلطی ہے جو مسلم تہذیب سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

زمینداروں اور تعلقہ داروں کو جو حقوق پہلے وہ ان کو شاہی میں بھی حاصل نہ تھے

اودھ کے باشندوں کا یہ احسان تمام ہندوستان کے والیان ریاست پر ہے کہ اس ہنگامے کے بعد انگریزوں کو ریاستوں کے انضمام کی پالیسی سے دست بردار ہونا پڑا اور تمام ہندوستان کی ریاستوں کو سو برس کی زندگی اور مل گئی، خاص طور سے تعلقہ داران اودھ کو جو حقوق حاصل ہوئے وہ کہیں کے تعلقہ داروں کو نہیں ملے۔ اس طرح انگریزوں نے اپنا تسلط قائم کیا، اودھ کا صوبہ آگرہ (جس کا دارالحکومت الہ آباد تھا) سے ملا دیا گیا اور ممالک متحدہ آگرہ و اودھ نام ہوا۔ اس سے پہلے انگریز صوبہ آگرہ کو آئین اور اودھ کو ملک بے آئین کہتے تھے۔ اب آئین و اودھ کہنے لگے۔

لکھنؤ گورنمنٹ سیٹ بنا گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر شروع ہوئی۔ اور تعلقہ داران اودھ کی [illegible] انگریزی تعلیم کے لئے کیننگ کالج قائم ہوا جس کے مصارف ان کی مال گذاری میں داخل کئے گئے۔ بیلی گارد غدر کا میوزیم بنایا گیا۔ لارڈ ڈفرن جہاں مارا گیا تھا وہاں ستون بنا۔ جنرل اڑم کی یادگار میں اڑم روڈ بنی۔ آصف الدولہ کا امام باڑہ قلعہ بنایا گیا۔ شاہی عمارتیں تعلقہ داروں پر تقسیم کر دی گئیں۔ قیصر باغ کی عمارت تمام تعلقہ داروں میں تقسیم ہو گئی۔ بہو بیگم۔ سعادت علی خاں غازی الدین حیدر نصیر الدین حیدر محمد علی شاہ وغیرہ کے کروڑوں روپئے کمپنی کے پاس جمع تھے کہ ان کے سود سے ہر مہینے ان کے متعلقین و متوسلین کو ملتا رہے۔ ان سب کا ایک ٹرسٹ بنا دیا گیا۔ تمام تنخواہیں جاری ہوئیں۔ پولٹیکل پنشن کا لاکھوں روپیہ تقسیم ہو گیا۔ جائدادیں واگزار ہوئیں۔ املاک واثاثہ کا معاوضہ ملا اور شریفوں کا کوئی خاندان ایسا نہیں رہ گیا جسے فکر معاش ہوتی۔ خوشحالی کی زندگی بسر ہونے لگی اور وہی شعر و شاعری عشق و عاشقی رقص و موسیقی مرغ بازی و بٹیر بازی، داستان گوئی و نقالی کے اشغال تازہ ہو گئے۔

بادشاہ کے نہ ہونے سے جو کمی تھی وہ تو واپس نہیں آسکتی تھی، مگر بدحالی

اور اہل کمال کی ناقدری صاحبان فن کی بیکاری کی صورت بھی پیدا نہیں ہونے پائی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ لکھنؤ والے اہل کمال کی دل سے قدر کرتے تھے صاحبان کمال محسوس کرتے تھے کہ لکھنؤ ان کا قدردان ہے۔ اس لئے کسی نے باہر قدم نہیں نکالا۔ کچھ رام پور گئے مگر لکھنؤ سے بے تعلق نہیں ہوئے اسے اپنا وطن سمجھتے رہے آمد و رفت جاری رکھی اور لکھنؤ کی علمی ادبی اور تفریحی چہل پہل میں کوئی کمی نہیں ہوئی اس کی تمام رنگ رلیاں باقی رہیں بلکہ آئیں بقول نیاز فتحپوری۔

"لکھنؤ ـــــــ نغمہ و سرود والا لکھنؤ ـــــــ مٹنے کے بعد اپنی خاک سے عبیر و گلال اڑانے والا لکھنؤ ـــــــ تاراج خزاں ہونے کے بعد بہار پر چشمک زنی کرنے والا لکھنؤ"۔ نگار جنوری ۱۹۴۳ء ریاض

واجد علی شاہ کے ساتھ تقریباً پانچسو آدمی چلے گئے تھے جن میں ہر طرح کے باکمال تھے وہ دریا کے چند قطرے تھے سارا شہر اہل کمال سے بھرا ہوا تھا

علماء میں سلطان العلماء سید محمد صاحب مجتہد العصر ان کے بیٹے بندہ حسین صاحب ملک العلماء اور بھتیجے سید تقی صاحب ممتاز العلماء مقتدر اور با اثر تھے علمائے اہلسنت میں مفتی سعد اللہ صاحب اور مفتی محمد یوسف صاحب کا شمار اکابرین میں تھا۔

رئیسوں میں سلیمان قدر واجد علی شاہ کے سوتیلے بھائی ان کے پرانے دشمن اور انگریزوں کے قدیمی خیرخواہ تھے۔ غدر کے بعد ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی بڑا وظیفہ مقرر ہوا اور شہر میں بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے۔ ان کے یہاں سہ پہر کی صحبت گویا دربار تھی جس میں ادبا شعراء لطیفہ گو سب ہی طرح کے لوگ ہوتے تھے۔ ہر ایک کے آگے پان حقہ، گرمیوں میں فالسے برف اور جاڑوں میں چائے پیش کی جاتی تھی۔ وہ خود بھی شاعر تھے اور وہی بلند ذوق رکھتے تھے جو لکھنؤ کے روساء کا تھا حقہ کو معشوق تنہائی کہتے تھے

راجہ نواب علی خاں (راجہ محمود آباد) علماء اور شعراء کے قدرداں تھے مشاعرے کثرت سے ہوتے تھے جس میں اساتذہ بھی شرکت کرتے تھے۔ شعراء میں مصحفی کے شاگرد اسیر موجود تھے۔ ناسخ کے شاگردوں میں سید میرزا انس، نواب عاشور علی خاں عاشور۔ حکیم محمد علی مسیحا کے شاگردوں میں میر وزیر علی صبا۔ میر دوست علی خلیل۔ شیخ امداد علی بحر کا شمار اساتذہ میں تھا۔

مرثیہ گویوں میں مرزا دبیر اور میر انیس کا طوطی بول رہا تھا۔

واسوخت اور اندر سبھا جان صاحب ریختی جرکین مزاحیہ گوئی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ شوق اور قلق کا نگاری میں شہرہ تھا۔

شہر کے خوش گو شعراء کلب حسین خاں الطاف۔ امیر مرزا امیر۔ مرزا محمد عسکری اوج سید محمد اشنا۔ اصغر علی خاں اصغر۔ مرزا علی محمد آرزو (نواب) اصغر علی خاں اعجاز۔ سید ابو تراب ثمر۔ محمد روشن جوشش۔ نواب حسام الدولہ حسام حسین۔ حسن علی خاں حسن مرزا حیدر خاں حیدر۔ میر غلام حسین خیال۔ خادم علی خاں خادم۔ میر جان علی درخشاں مرزا بندہ علی خضر۔ مخدوم بخش ذکا۔ میر احمد علی رسا۔ خواجہ مصاحب علی راوی۔ مرزا محمد تقی ردا جعفر خاں راغب۔ رونق علی رونق۔ مصطفےٰ بخش سالک حسین سرور۔ نوازش علی خاں سروش۔ میر حسن علی سحر۔ مرزا ابراہیم بیگ شرر۔ میر محمد شائق۔ محمد بخش شہید۔ نواب محمد علی خاں عرف تبے۔ نواب شمس آغا علی خاں شمس۔ والا جاہ عرف منجھلے صاحب شیدا فضل امام خاں شاد۔ مرزا کریم بیگ شفا۔ خواجہ امجد علی شفا۔ خواجہ محمد صولت مغل صفیر۔ نوازش علی خاں ضبط۔ محمد رضا طور۔ مرزا نوازش علی طوفان گرداب۔ اعلیٰ جاہ عرف چھوٹے صاحب عاشق۔ مولوی عباس علی عاشق۔ آغا علی رضا خاں عالی۔ مرزا واجد علی خاں۔ علام قاسم علی عشق۔ منشی احمد حسین عروج۔

عباس علی عاشق ۔ آغا علی رضا خاں عالی ۔ مرزا واجد علی خاں ۔ غلام قاسم علی عشق ۔ منشی احمد حسین عروج ۔ میر جمال الدین عارف ۔ شیخ عبداللہ عاجز ۔ اشرف علی خاں عشق ۔ آغا رضا عشق ، شیخ ذوالفقار علی فکر ۔ کاظم علی کاظم ۔ شیخ گوہر علی خبیر مرزا مسیتا منتہی ۔ مرزا حسن علی خاں ممتاز ۔ نواب آغا علی خاں مہر ۔ مرزا حسن علی کیوان میر بندہ علی قرار ۔ علی نقی خاں نقی ۔ محمد جعفر نصرت ۔ ابو محمد ناصر ۔ یوسف بیگ یوسف

ان پڑھ شعراء | قادر علی مجرم ۔ مرزا علی رضا علی

ہندو شعراء | منشی جوالا پرشاد برق ۔ پنڈت کدار ناتھ فرحت ۔ پنڈت دیبی پرشاد فرقت ۔ پنڈت گنگا پرشاد رحمت ۔ پنڈت پاس کرن مروت ۔ پنڈت شیو پرشاد ناظم ، گھیر نرائن عیاش

شاعرہ خواتین | عورتوں میں بھی شعر و سخن کا ذوق تھا ۔ معزز خواتین میں امیر بیگم بہت اچھے شعر کہتی تھیں ؎

جدھر کو دیکھنے سے جانِ زار جاتی ہے
اسی طرف کو نظر بار بار جاتی ہے

سلطانی بیگم دختر نواب معتمد الدولہ ؎

تھی وہ نگاہ یا کوئی ناوک کا تیر تھا
ملتے ہی آنکھ رہ گیا میں تھام کے دل

نجم النساء عفت ؎

ہم جوائے جانِ جہاں تم سے بچھڑ جاتے ہیں
صدمے ہوتے ہیں قلق ہوتے ہیں گھبراتے ہیں

عسکری بیگم حجاب ۔ ملا محمد زماں اصفہانی کی پوتی محمد علی مسیحا کی شاگرد ؎

رات کو آئیں گے ہم صاف معمہ یہ ہے
وعدہ وصل کیا اس نے دکھا کر گیسو

قمر النساء زوجہ اشرف علی خاں مسرور دونوں میں بے انتہا محبت تھی

جسے لوگ کہتے ہیں خورشید رخشاں
شرارہ ہے یہ میرے سوزِ نہاں کا

شاعرہ طوائفیں | قمر جان عرف منجھو مشتری تخلص حسن و جمال اور موسیقی

میں کمال کے ساتھ ساتھ شاعرہ بھی تھی۔ فارسی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ فارسی نظم ونثر پر قدرت رکھتی تھی۔ اس کا مجموعہ نثر فارسی خانہ خیال نثر مشتری کے نام سے شائع ہوئی ہے جو بہت مختصر ہے۔ اس کے علاوہ کچھ فارسی خطوط بھی ہیں جو رضا علی وحشت کلکتوی نے شائع کر دیے ہیں۔ ترانہ خیال اس کا اردو دیوان جس میں ایک سو سے زیادہ غزلیں ہیں زیادہ شعر مشکل صنعتوں میں لکھے ہیں — اُردو میں بھی بہت اچھا کلام ہوتا تھا ؎

انقلاب سحر و شب کے تماشے دیکھے گزرے ہیں شعبدۂ دہر نظر سے کیا کیا

مشہور تھا کہ آغا علی شمس اس کو کہہ کے دیدیتے ہیں مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ اصلاح ضرور دیتے سب کچھ ان کا نہیں تھا۔ اس کا کئی دفعہ امتحان بھی ہوا۔ مہاراجہ پٹیالہ لکھنؤ آئے اور مشتری سے عین محفل میں مہاراجہ کی تعریف میں غزل گانے کی فرمائش کی گئی۔ اس نے کئی شعر اُسی وقت نظم کرکے گائے جس پر لوگوں کو حیرت ہو گئی۔ مہاراجہ بہت خوش ہوئے اور اُسے انعام دیا۔

باہر کسی رئیس کے یہاں شادی میں ناچنے کے لئے بلائی گئی اُس وقت وہ حاملہ بھی تھی۔ رئیس کے کسی مصاحب نے بھری محفل میں بلند آواز سے یہ شعر پڑھا ؎

حمل نو مہینے کا ہے مشتری کو کوئی دم میں بچہ ہوا چاہتا ہے

کوئی اور ہوتا تو حواس جاتے رہتے اس نے برجستہ کہا۔

خوشی آپ کو اس قدر کیوں نہ ہو کہ ہمشیر زادہ ہوا چاہتا ہے

غالب کے خلاف بھی اس نے اودھ اخبار میں مضامین لکھے تھے جو شاید قاطع برہان کی بحث کے سلسلے میں تھے۔

بڑی صاحب جائداد تھی۔ رئیسانہ شان سے رہتی تھی۔ ادباء اور شعراء کا اس کے کوٹھے پر جمگھٹا رہتا تھا۔ اپنی غزلیں گا کے سناتی تھی آخر میں گانا ترک کرکے ایک

رئیس سے نکاح کر لیا تھا۔

زہرہ مشتری کی بہن تھی اور اردو میں خوب شعر کہتی تھی ؎

ہائے بے فائدہ خراب ہوا — عشق کی میں نہ انتہا سمجھا

شیریں یہ بھی شعر و سخن میں مشہور تھی امداد علی بحر کی شاگرد اور صاحب دیوان تھی۔

حور منا جان نام محمد رضا طور کی شاگرد ؎

امراؤ جان امراؤ ؎

امراؤ کیا کہوں کہ شب ہجر بیش غم — چبھتا رہا ہر اک رگِ جاں میں سحر تلک

موسیقی اس زمانہ میں موسیقی کو بڑا عروج ہوا۔ شاہی میں بھی ایسے موسیقار نہ تھے بندا دین کالکا اور بھیرو ٹھاکر پرشاد کے بیٹوں نے وہ کمال پیدا کیا کہ روئے زمین پر ان کا ہمسر نہ تھا۔ بندا دین ناچ کے تمام فنون میں کمال رکھتا تھا۔ گت کا ناچ رقص کے استادانہ ٹکڑے اصلی صورت میں دکھاتا تھا۔ گھونگھرو بجانے میں وہ قدرت تھی کہ تیس سو جو اسی گھنگھرو پاؤں میں باندھ کے رقص کرتا۔ جتنے گھنگھرو چاہتا اتنے ہی بجتے۔ رقص کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک چیز کو ادا کرتا۔ ایک ایک بات کو سو سو اداؤں سے بتاتا۔ ایسی نازک خیالی اور جدت طرازی ہوتی تھی کہ لوگ ششدر و حیران ہو جاتے تھے۔ بندا دین ناچتا اور کالکا پاس کھڑے ہو کے اس کی تشریح کرتا ناچ میں اس کے پاؤں اس نزاکت سے زمین پر پڑتے تھے کہ تلوار کی باڑھ پر ناچتا اور چرکا نہیں آتا تھا۔ چاندنی کے فرش کے کنارے تھالی میں سیندور رکھ دیا جاتا تھا اسی میں کھڑے ہو کے رقص کرتا ہوا فرش پر آتا اور رقص تمام کر کے فرش کے کنارے آتا تو کبھی کرشن جی کی تصویر بنی ہوتی۔

زہرہ۔ مشتری۔ خورشید۔ شیریں۔ امراؤ جان۔ مغل جان۔ منا جان۔ گانے اور ناچنے میں اپنا مثل نہیں رکھتی تھیں۔

یہ سب کہنے کو طوائفیں تھیں مگر ان میں ہر ایک صاحب جائداد تھی لاکھوں نہیں تو

ہزاروں کی آدمی تھی۔ تہذیب و شائستگی کا معیار تھی۔ شعروسخن میں اچھا ملکہ رکھتی تھیں اُن کے کوٹھے تہذیب و تمدن اور ادب و شعر کی درس گاہ تھے ان سے جنسی خواہش پوری کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کے ہاتھ سے پان کی ایک گلوری مل جانا اور کوئی گانا سُن لینا بہت بڑی بات تھی۔

اس زمانہ میں موسیقی کا ذوق عام تھا ان کے یہاں جانے کی اصل غرض ان کی موسیقی ہوتی تھی اور اسی سے ان کی قدر ہوتی تھی۔ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے زمانہ میں پنجاب سے کنچنیاں اور چونے والیاں آئیں ان میں غضب کا حسن تھا اور اپنے حسن کی وجہ سے کنچنی کہی جاتی تھیں یعنی سنہری کنچن ہندی میں سونے کو کہتے ہیں۔ کنچنیوں کا پیشہ کھلم کھلا بدکاری تھا ان کے مرد بھی اس پر راضی تھے۔ چونے والیاں بظاہر چونا بیچتی تھیں مگر اصل پیشہ ان کا بھی وہی تھا۔ اسی طرح سے نٹنیاں، ناگرنیاں اور ڈومنیاں تھیں۔ ان سب نے لکھنؤ آکے محسوس کیا کہ یہاں بدکاری اچھا ذریعہ آمدنی نہیں۔ روساء تک ان کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ وہ بھی موسیقی کی تعلیم حاصل کرکے بھاری بھرکم ہوگئیں۔ اُن کی قدر بڑھ گئی۔ لکھنؤ کی طوائف کی خصوصیت حسن و جمال کے ساتھ موسیقی میں کمال، تہذیب و شائستگی۔ شعروشاعری کے ذوق میں بے مثل ہونا تھا۔ ان میں ایک رکھ رکھاؤ تھا۔ انھیں چیزوں کو دیکھنے کے لئے باہر کے روساء اور شعراء آتے تھے۔ ایسی صورت میں وہ آسانی سے کسی کی آغوش میں نہیں جاسکتی تھیں۔

ڈراما ڈرا واجد علی شاہ کے عہد میں ایجاد ہوچکا تھا۔ یہ زمانہ اس کے عروج کا تھا ہندوستان میں اس کی اصل نوٹنکی، رام لیلا اور رہس ہے۔ رام لیلا میں رام چندر جی کا بن باس۔ راون کا سیتا کو لے جانا۔ ہنومان جی کا لنکا فتح کرنا۔ سیتا جی کو واپس لانا رام چندر جی کا بن باس کی مدت پوری کرکے اجودھیا پلٹنا اور بھرت سے ملنا۔ یہ پورا قصہ

پندرہ دن میں دکھایا جاتا تھا جن میں معمولی درجہ کا پاٹ اٹھاروں کی حد تک تھا۔

رہس وہ حلقہ کا ناچ ہے جو کنہیا جی گوپیوں کے ساتھ ناچتے تھے۔ کنہیا اور گوپیوں کے قصہ کو نوٹنکی کی طرح دکھانے کو ناٹک رہس کہا جاتا تھا۔

واجد علی شاہ نے جب رادھا کنہیا کا ڈرامہ تیار کیا تو اس کا نام رہس رکھا۔ اس کے بعد جب اُنھوں نے اپنی دوسری مثنویوں کو ڈرامہ بنایا تو اس کو بھی رہس ہی کہا اور اس کے جلسے کا بجائے ناٹک رہس کے جلسہ رہس نام رکھا یعنی رہس کو ڈراما اور اسٹیج کو جلسہ رہس کے معنوں میں استعمال کیا۔

امانت نے واجد علی شاہ کے رہس کو دیکھ کے اپنے شاگرد میر عابد علی عبادت کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی تو اس کا نام بھی رہس رکھا اس کی بڑی شہرت ہوئی مختلف منڈیاں قائم ہوئیں جو یہ تماشا دکھاتی تھیں۔ شادی بیاہ میں دور دور بلائی جاتی تھیں۔ اس کا کھیل کھلی جگہ میں بڑے شامیانہ کے نیچے یا کسی بڑے مکان کے صحن میں ہوتا۔ تین طرف تخت تماشائیوں کے لئے بچھائے جاتے۔ ایک طرف راجہ اندر کے لئے ایک سجا ہوا تخت اور پریوں کے لئے کرسیاں۔ بیچ کی چھوٹی ہوئی جگہ اسٹیج تھی۔ تخت اور کرسیوں کے پیچھے سازندے ان کے پیچھے سرخ پردہ۔

کھیل شروع ہوتا ہے، سازندے آمد گاتے ہیں۔

سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے　　پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے (۷ شعر)

پردہ اُٹھتا، مہتاب چھٹتی اور اندر محفل میں یہ گاتا ہوا آتا ہے

راجہ ہوں میں قوم کا اندر ہے میرا نام　　بن پریوں کی دید کے نہیں مجھے آرام (۵ شعر)

یہ پانچ شعر ہیں آخری شعر میں وہ حکم دیتا ہے

لاؤ پریوں کو مری جلدی جا کر ہاں　　باری باری آ کر مجرا کریں یہاں

اس حکم کے سنتے ہی پکھراج پری کی آمد گائی جاتی ہے ؎

محفلِ راجہ میں پکھراج پری آئی ہے ساری معشوقوں کی سرتاج پری آئی ہے (۱۳ شعر)

زرد رنگ کی مہتاب چھٹتی ہے اور پکھراج پری زرد کپڑے پہنے سنہرے پر لگائے یہ

یہ اشعار گاتی ہوئی محفل میں آتی ہے ؎

گاتی ہوں میں اور ناچ سدا کام ہے میرا آفاق میں پکھراج پری نام ہے میرا (۹ شعر)

اس کے بعد تین شعر کا ایک چھند۔ چھ شعر کی ٹھمری۔ پانچ شعر کی بسنت۔ تیرہ شعر کی

ایک غزل بسنت کی۔ بارہ شعر کی ہولی۔ پھر ایک نو شعر کی غزل پھر سترہ شعر کی غزل اس کے بعد

گیارہ شعر کی ایک غزل گاتی ہے۔ اب راجہ اندر کہتا ہے ؎

خوب ریجھایا ناچ کے گا کے پاس مرے اب بیٹھ تو آ کے

خوش ہوئی تجھ سے محفل ساری اب ہے نیلم پری کی باری

اندر حکم دیتا ہے لاؤ نیلم پری کو۔ نیلم پری کی آمد گائی جاتی ہے ؎

سبھا میں آمد نیلم پری ہے سراپا وہ نزاکت سے بھری ہے (۷ شعر)

نیلے رنگ کی مہتاب چھٹتی ہے اور نیلی چمکدار پوشاک اور نیلم پر لگائے نیلم پری لال

پردے کے پیچھے سے یہ اشعار گاتی ہوئی آتی ہے ؎

حوروں کے ہوش اڑتے ہیں اڑنے کی شان پر نیلم پری ہے نام مرا آسمان پر (۹ شعر)

اس کے بعد تین شعروں کے دو چھند پانچ شعر۔ ان کی ایک ٹھمری کھماج کی دھن میں

سات شعروں کی ہولی اور تین غزلیں گاتی ہے اس کے بعد راجہ اندر کہتا ہے۔

دکھا چکی تو کرتب سارے پہلو میں بیٹھ اب ہمارے

اور لال پری کو آنے کا حکم دیتا۔ لال پری کی آمد۔ سازندے گاتے ہیں۔

سبھا میں لال پری کی سواری آتی ہے جمانے رنگ اب اندر کی پیاری آتی ہے (۷ شعر)

لال مہتاب چھٹتی ہے اور لال پری یہ گاتی ہوئی آتی ہے ؎

(شعر) انساں کا کام حُسن پہ میرے تمام ہے جوڑا ہے سرخ لال پری میرا نام ہے

پھر یہ تین شعروں کا چھند ایک ٹھمری ایک انترہ ایک ساون پہ غزل، ایک ہولی سند کانی کی دُھن میں اور ایک غزل دیس کے دھن میں پھر تین غزلیں گاتی ہے ــــ اب راجہ اندر کہتا ہے :-

کاٹی رات مزے میں ساری بیٹھو مرے پہلو میں پیاری
بہت لڑائی تو نے جان اب ہے سبز پری پر دھیان ـــ لاؤ سبز پری کو ـــ آمد سبز پری کی ؎

(شعر) آتی نئے انداز سے اب سبز پری ہے لب سُرخ ہیں پر سبز میں پوشاک ہری ہے

سبز رنگ کی مہتاب چھٹتی ہے اور سبز پری اپنی تعریف میں یہ اشعار گاتی ہوئی آتی ہے ؎

(شعر) معمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں دھانی مری پوشاک ہے میں سبز پری ہوں

گانا سنتے سنتے راجہ اندر کو نیند آجاتی ہے اور سبز پری یہ چوبولا گاتی ہے ؎

راجہ جی تو سو گئے دیا نہ کچھ انعام جاتی ہوں میں باغ میں یہاں میرا کیا کام
سُن رے کالے دیو تو میری اک بات آتی تھی راجہ کے گھر میں جو آج کی رات
شہزادہ اک بام پر سوتا تھا نادان جوبن اُس کا دیکھ کر نکل گئی میری جان
اُس کو اگر تو اٹھا لا جلدی جا کر یار لونڈی تیری ہو جاؤں گی سُن بے تکرار

کالا دیو نظم میں کہتا ہے کہ :-

تو راجہ کے گھر میں پریوں کی سردار ہے میں تجھ سے انکار نہیں کر سکتا پتہ بتا

ابھی لاتا ہوں، سبز پری پتا بتاتی ہے اور وہ شہزادے کو سوتے میں اٹھا لاتا ہے سبز پری اس کو دیکھ کے خوش ہوتی اور اس کو شانہ ہلا کر جگاتی ہے۔ شہزادہ جاگتا ہے اور گھبرا کے پوچھتا ہے کہ میرا مکان اور کوٹھا کہاں ہے۔ میں یہ خواب دیکھ رہا ہوں یا سو رہا ہوں ــ پھر

حیرت میں وہ یہ غزل گاتا ہے ؎

گھر سے یاں کون خدا کے لئے لایا مجکو　کس ستمگار نے سوتے سے جگایا مجکو (۱ شعر)

سبز پری شہزادے کا ہاتھ پکڑ کے کہتی ہے ؎

دیکھو تم میری طرف گھر کا مت لو نام　لونڈی مجھ کو جان کر کرو یہاں آرام

بتلاؤ اپنا حسب نسب اور تم اپنا نام　رہتے ہو کس کام میں ہوگا کہاں مقام

شہزادہ ؎　محلوں میں رہتا ہوں عیش ہے میرا کام　شہزادہ ہوں ہند کا نام ہے میرا گلفام

تو عورت کس قوم کی اپنا نام بتا　دونوں شانوں پر تیرے نکلا ہے یہ کیا

سبز پری :۔　قوم کی ہوں میں پری سمجھ نہ تو حیوان　یہ دونوں پر ہیں میرے مورکھ نادان

رہتی ہوں میں قاف میں سبز پری ہے نام　راجہ اندر کے یہاں ناچ ہے میرا کام

شہزادہ :۔　جلدی یہ بتلا مجھے دل کو ہے وسواس　میرا آنا کس طرح ہوا تیرے پاس

سبز پری :۔　تجھ پر میں عاشق ہوئی چلتے چلتے راہ　اٹھا منگایا یاں تجھے بھیج کر دیو سیاہ

پھر غزل پڑھتی ہے ؎　سر پہ آنکھوں پہ کلیجہ پہ بٹھاؤں تجکو　آ مرے پاس گلے سے میں لگاؤں تجکو (۳ شعر)

شہزادہ　تو بیسوا ہے مجھے خبردار ہاتھ نہ لگا　آپ بدنام ہوئی مجھ سے گھر بار چھڑایا (۱۲ شعر الیٰ)

سبز پری :۔ زندگی کا ہے مزہ ایسی ملاقاتوں میں　جو نکلے مجھ سے بگھارو نہ ذرا باتوں میں

شکر اللہ کا کر کھل گئی قسمت تیری　یک بیک مجھ سی پری کو ہوئی الفت تیری (۱۲ شعر)

شہزادہ :۔ گھر کے چھٹنے کا ہے غم اُو وفا کرتا ہوں　وصل کا وعدہ میں اس شرط پہ ہاں کرتا ہوں

سُنی اندر کی سبھا میں نے کہانی میں ہے　اس کا ارمان مجھے جوش جوانی میں ہے

سبز پری :۔ ایسی باتوں کا زبان پر لانا اور جان کو آفت میں پھنسانا اچھا نہیں ہے۔ اگر کسی نے راجہ کو خبر کر دی تو وہ مجھے اور تجھے جلا کے خاک یا کنوئیں میں قید کر دے گا (۶ فقرہ)

شہزادہ :۔ میں نہ مانوں گا تری ملاقات کس دن کام آئے گی۔ سب میں سمجھتا ہوں۔ وہاں

تو کسی دیو سے پھنسی ہے اس لیئے مجھ کو نہیں لے جاتی۔ (۴شعر)

سبز پری :۔ ایسی بات زبان سے نہ نکالو ہوش میں آؤ، منھ سنبھالو اگر ایسا ہوتا تو میں آدمی زاد پر کیوں مرتی پری ہو کے موئے دیو کا ٹری جوتی پر قربان کردوں (۳شعروں میں

شہزادہ :۔ مجھے باتوں میں نہ اڑا صبح ہونے والی ہے پرستان میں لے جا کے مجھے پھر یں سُنا نہیں تو اپنا گلا کاٹ کے مرجاؤں گا ۴شعروں میں

سبز پری :۔ اپنی جوانی مفت تو نے خراب کی شیر کے منھ میں خود سے جارہا ہے چل تجھے لیئے چلتی ہوں۔ (۲شعروں میں

شہزادہ :۔ کس طرح چلوں تو اڑ جائے گی میں ہاتھ پھیلا کے رہ جاؤں گا۔ کسی دیو کے پر مجھے لادے۔ (۴شعروں میں)

سبز پری :۔ بہکی بہکی باتیں نہ کرو۔ میرے تخت کا پایہ ہاتھ سے مضبوط تھام لو وہاں جا کے مجھ سے کوئی بات نہ کرنا تمھیں درختوں میں چھپا دوں گی۔

دوبارہ سبز پری اندر کی سبھا میں آتی ہے :۔ اور شرماتیاً یہ غزل گاتی ہے ؎

سبھا میں بلوا کے مجھے آپ کیا آرام آئی ہوں پھر یہاں کرنے اپنا کام (۳شعر)

دو ٹھمریاں بیرج کی دھن میں اور تین غزلیں دیس کے دُھن میں گاتی ہے جس میں تازہ مبتلائے عشق ہونے کے مضامین ہیں۔ ابھی وہ غزل گا ہی رہی تھی کر لال دیو نے راجہ سے کہا کہ درخت شمشاد کے نیچے ایک چاند سی صورت کا آدمی چھپا ہوا ہے عقل حیران ہے کہ اس کو یہاں کون لایا۔

سبز پری مایوسی سے کہتی ہے :۔ ایسی باتیں نہ کر........ ہائے کمبخت تجھے کیا مل گیا (۵شعر)

راجہ اندر غضبناک ہو کے لال دیو سے پوچھتا ہے۔ تو کیا بک رہا ہے میرے باغ میں انسان کا

کہاں گذر کوئی دیو یا پری لائی ہوگی اسے کھینچتا ہوا میرے سامنے لا (۵ شعر)

لال دیو گلفام کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے۔

پرستان میں تو کیوں کر آیا ہے ——— چل تجھے راجہ نے اپنے حضور میں بلایا ہے

اور اس کو کھینچتا ہوا راجہ اندر کے سامنے لاتا ہے اور کہتا ہے:-

حضوری میں حاضر ہے یہ شعلہ خو   مہاراج صاحب نگہ رو برو (۵ شعر)

راجہ اندر پوچھتا ہے۔

ارے کون ہے تو، ترا کیا ہے نام   سبھا تو نے کی میری برہم تمام (۵ شعر)

گلفام ہاتھ جوڑ کے عرض کرتا ہے۔

میں فلک کا ستایا ہوں، سبز پری کا دیوانہ ہوں، اسی کے ساتھ یہاں آیا ہوں (۵ شعر)

راجہ اندر سبز پری کو بلاتا ہے

ارے او پری سبز او بے حیا   مرے سامنے جلد آ بیسوا (۵ شعر)

سبز پری راجہ اندر سے عرض کرتی ہے۔

جفاؤ ستم کی سزاوار ہوں   حقیقت میں تیری گنہگار ہوں (۴ شعر)

سبز پری گلفام کے گلے لگ کے اس کو نادم کرتی ہے۔

ارے کیوں میں واں تجھ سے کہتی تھی کیا   نہ مانا مرا ہائے تو نے کہا (۵ شعر)

راجہ اندر گلفام کو قید کر دیتا ہے اور سبز پری کے پر نچوا کے اس کو نکلوا دیتا ہے۔

سبز پری جوگن بن کے پرستان میں ٹھمری اور غزلیں گاتی پھرتی ہے جن میں ہجر و فراق کے مضامین ہیں۔ کالا دیو راجہ اندر سے کہتا ہے آجکل ایک جوگن پرستان میں آئی ہوئی ہے جس کے گانے میں بڑا درد و اثر ہے۔ (۵ شعر)

راجہ اندر مشتاق ہو کے جوگن کو بلواتا ہے۔ (۵ شعر)

کالا دیو جوگن سے راجہ کا اشتیاق بیان کرتا ہے وہ ادائے بے نیازی سے منظور کرتی ہے (۵ شعر)
کالا دیو جوگن کو سبھا میں حاضر کرتا ہے

راجہ اندر اس سے جوگ لینے کی وجہ پوچھتا ہے وہ پر درد لہجہ میں اپنا حال یہ بیان کرتی ہے۔ (۵ شعر)

میرا معشوق مجھ سے چھٹ گیا ہے۔ میں غم کی ستائی ہوں اگر میرے گانے سے آپ کا دل خوش ہو تو جوگن کے سوال کو رد نہ کیجئے گا۔

یہ کہہ کے وہ بھیرویں کی دھن میں ٹھمری گاتی ہے۔

راجہ اندر محظوظ ہو کر اس کو پان کی گلوری دیتا ہے۔

وہ پان لینے سے انکار کرتی ہے اور بھیرویں کی دھن میں ہولی گاتی ہے (چھ شعر)

راجہ اندر خوش ہو کے اس کو ہار دیتا ہے مگر وہ انکار کرتی ہے اور ایک غزل اور بھیرویں کی دھن میں ہولی گاتی ہے۔ (چھ شعر)

راجہ اندر اس کو شالی رومال دیتا ہے۔ وہ انکار کرتی ہے اور کہتی ہے جو مانگوں وہ پاؤں۔ راجہ کہتا ہے مانگ کیا مانگتی ہے۔

جوگن طلب گلفام میں یہ غزل گاتی ہے۔

ہوتا ہے کوئی آن میں اب کام ہمارا انعام میں دیجئے ہمیں گلفام ہمارا (۷ شعر)

راجہ اندر سبز پری کو بہچانتا ہے اور لال دیو کو گلفام کی رہائی کا حکم دیتا ہے (۵ شعر)

سبز پری گلفام سے ملتی ہے اور دونوں میں جدائی کے دنوں کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے۔

سبز پری :- قہر تھا ہجر، قیامت تھی جدائی تیری میرے خالق نے مجھے شکل دکھائی تیری
شہزادہ :- خاک ہے منھ پہ ملی بال ہیں سر کے بکھرے ہائے اس عشق نے کیا شکل بنائی تیری

سبز پری :- مجھ پہ ہونا تھا جو کچھ ہو گیا اس کا نہیں غم — ہو گئی قیدِ مصیبت سے رہائی تیری
شہزادہ :- تو مرے آگے نکالی گئی تھی نوچ کے پر — راجہ تک پھر ہوئی کس طرح رسائی تیری
سبز پری :- بن کے جوگن ہوئی اندر کی سبھا میں داخل — پھر یہاں چاہ مجھے کھینچ کے لائی تیری
شہزادہ :- کہہ کے راجہ سے مجھے کس نے تجھے دلوایا — دشمن جاں تھی مری جان جُدائی تیری
سبز پری :- گا کے اور ناچ کے راجہ کو رجھایا میں نے — تب ملاقات میسر مجھے آئی تیری
شہزادہ :- زر کی طالب نہ ہوئی مجھ کو لیا راجہ سے — اب شرف لے گئی شاہی پہ گدائی تیری
سبز پری :- دیو کمبخت نے کس زور سے پہنچا پکڑا — ہو گئی لال نزاکت سے کلائی تیری
شہزادہ :- مرضِ عشق نے سارا ترا جوبن لوٹا — آدھی صورت بخدا میں نے نہ پائی تیری
سبز پری :- قید نے کر دیا بیمار سے بد تر تجھ کو — گھر میں لے چل کے کروں گی میں دوائی تیری
شہزادہ :- پنڈلیاں سوجی ہیں تلووں میں چبھے ہیں کانٹے — خار دیتی ہے مجھے برہنہ پائی تیری
سبز پری :- مجھ کو ایذا ہوئی پاپوش کے صدقے ہوئی — جان اللہ نے گلفام بچائی تیری
شہزادہ :- میں ترے ہاتھ لگا تو مرے پھندے میں پھنسی — میرا مطلب ہوا اُمید بر آئی تیری
سبز پری :- ہے تمنا یہ مرے دل میں کہ تا حشر فلک — فضل استاد سے اب ہو نہ جدائی تیری

سبز پری گلفام سے بغل گیر ہوتی ہے اور سب پریاں مل کے مبارکباد گاتی ہیں :-

شادیِ جلوۂ گلفام مبارک ہووے — عیش و عشرت کا سرانجام مبارک ہووے

اور ڈرامہ ختم ہو جاتا ہے — (۹ شعر)

یہ ہے ہندوستان میں ڈرامے کی ابتدائی شکل، جو لکھنؤ میں بنی۔ پہلے اس کا نام رہس تھا پھر اندر سبھا ہوا۔ اس کی مقبولیت دیکھ کے بہت سے لوگوں نے اسی انداز کے قصے لکھے ان سب کا نام اندر سبھا رکھا گیا۔ ان میں مداری لال کی اندر سبھا بہت

پسند کی گئی جس میں ماہ منیر کا قصہ ہے اُس زمانہ میں لکھنؤ ڈرامے کا بہت بڑا مرکز بن گیا مختلف مثنویوں اور قصوں کا ڈرامہ کھیلا گیا۔

لکھنؤ میں ڈرامے کا زور اور مقبولیت دیکھ کے بمبئی کے پارسیوں نے اس کی نقل کی اور بہت سے ڈرامے تیار کئے جو انہیں ڈراموں (یعنی واجد علی شاہ اور امانت کے ڈراموں سے ماخوذ تھے۔

رفتہ رفتہ اس کو ترقی ہوئی بڑی بڑی تھیٹریکل کمپنیاں ۱۹۲۵ء تک قائم تھیں مگر سینما کی ایجاد اس کا زور توڑ چکی تھی ۱۹۲۷ء میں جب ٹاکی سینما آ گیا تو ان تمام کمپنیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ دیہاتوں کے میلوں میں معمولی درجہ کی کمپنیاں ڈرامے کا کھیل دکھاتی تھیں۔

لکھنؤ کا اثر ڈرامے اور سینما پر

لکھنؤ میں موسیقی سے عام طور پر بڑی دلچسپی تھی جب ناٹک شروع ہوا تو اس میں بھی گانا غالب رہا اور پلاٹ کے لحاظ سے جہاں گانے کا محل نہیں تھا وہاں بھی گانے سے دلچسپی پیدا کی گئی اس کا اثر تھیٹریکل کمپنیوں پر بھی ہوا ان کے پلاٹ میں بھی بے محل گانوں کی فراط رہی یہ عیب آج تک سینما میں بھی موجود ہے جو لکھنؤ کی یادگار ہے

کنکوے بازی

غدر کے تین سال بعد شہزادوں اور نوابوں میں کنکوے بازی ہوئی ایک طرف شہزادہ مرزا ولی عہد بہادر خلف شہزادے مرزا حیدر شکوہ صاحب دہلوی دوسری طرف نواب علی محمد خان ساکن احاطہ مرزا علی صاحب دونوں کے بہت سے لوگ شریک ہو گئے۔ ڈھائی سال تک مسلسل کنکوے بازی اس شدومد سے ہوئی کہ بیسوں گھر تباہ ہو گئے۔ برسات میں بھی کنکوا اڑانا بند نہیں ہوتا بڑے بڑے ظروف میں نیل بھرا رکھا ہوتا تھا جس میں کنکوے ڈبو کے اڑائے جاتے

تھے جن صاحب کی باری میدان کی ہوتی تھی وہ شام ہی سے تشریف لے آتے تھے باورچی مشعلچی ارباب نشاط ساتھ ہوتے کھانے تیار ہوتے محفل رقص وسرود رات بھر گرم رہتی تمام رات جلسہ ناچ رنگ کا رہتا صبح کو نماز کے بعد کنکوے لڑنا شروع ہوتے اور سیکڑوں ہزاروں روپے خرچ ہوجاتے ڈھائی سال کے بعد شہر کے روسا اور علماء نے صلح کرادی اور ہنگامہ ختم ہوا اس وقت نامی کنکوے لڑنے والے محمد حسن صاحب نواب فضل علی خاں عرف نواب محمد ہادی صاحب تھے جن میں محمد ہادی صاحب اس وقت صرف موجود ہیں اس کے بعد ۱۳۰۰ء سے پھر چند سال تک کثرت سے کنکوے بازی ہوئی اس وقت کے مشہور کنکوے باز نواب نواب یوسف حسین خاں صاحب نواب محمد ہادی نواب افضل علی شہزادہ مرزا سلطان بخت بہادر مرحوم نواب شاہ میر خاں عرف نواب اغن صاحب تھے۔

یہ رسالہ جس کا تاریخی نام خورشید خرد ہے اور سید محمد حیدر صاحب ایڈوکیٹ اور سید احمد مجتبیٰ بی ایس سی علیگ نے لکھا ہے اور نظامی پریس سے شائع ہوا ہے

ہاتھی کی لڑائی۔ چیتوں اور باز سے شکار شاہی کے ساتھ گئے مگر بٹیر بازی مرغ بازی اسی طرح باقی رہی۔ ہتھیار کی ضبطی سے سپہ گری کے اکثر فنون برباد ہوگئے مگر بانک پٹہ بنوٹ بانا اسی عروج پر رہا۔ بیراکی کا فن بھی کمال کے درجہ پر تھا۔

مشاعرے اسی دھوم دھام سے ہوتے تھے

خاندان اجتہاد کی ایک نئی ایجاد مسالمہ | محمد جعفر صاحب امید نے مسالمہ ایجاد کیا یہ محمد باقر صاحب کے بیٹے اور سلطان العلماء سید محمد صاحب الدولہ مجتہد العصر کے پوتے تھے۔ محرم سے آٹھویں ربیع الاول مسالمے ہوتے تھے جس میں شعراء سلام کہہ کے پڑھتے رہے مگر اس کا رواج کم ہوتا گیا کیونکہ ان ایام میں لوگوں کو مجلسوں سے فرصت نہ ملتی تھی۔ رفتہ رفتہ مسالمہ بہت کم ہو گیا اور اب بالکل موقوف ہے

اخبار | حکومت اور رعایا سے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لئے اخبار کی بھرمار ہوئی۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۸۵۹ء منشی نولکشور نے اودھ اخبار نکالا

۱۸۵۹ء مولوی چراغ علی نے مرقع تہذیب نکالا

۱۸۶۰ء میں مسٹر جیکب نے منشی گنگا پرشاد کی ادارت اودھ گزٹ شائع کیا

۱۸۶۰ء میں مسٹر جیکب نے دیوان گلدستہ نکالا یہ ہندوستان میں پہلا ادبی رسالہ تھا

۱۸۶۱ء۔ دکھنا رنجن مکرجی نے ہندوستانی اخبار نکالا۔

۱۸۶۲ء۔ انجمن تعلقہ داران اودھ کی طرف سے انجمن ہند کنور ہرنام سنگھ اہلوالیہ کی ادارت میں نکلا۔

۱۸۶۳ء میں گورنمنٹ کی طرف سے گورنمنٹ گزٹ جاری ہوا

۱۸۶۵ء۔ میں مولوی محمد یعقوب نے دوبارہ اخبار کارنامہ جاری کیا۔

۱۸۶۶ء میں عیسائی مشن کی طرف کوکب عیسوی نکلا جو بعد میں کوکب ہند ہو گیا

۱۸۶۸ء میں پنڈت دیبی پرشاد نے گلشن کشمیر جاری کیا

۔

۱۸۶۹ء میں پادری مسمورا نے شمس الاخبار جاری کیا
۱۸۷۰ء میں پنڈت بیج ناتھ نے سحر سامری جاری کیا
۱۸۷۰ء میں غلام محمد تپش نے مشیر قیصر نکالا۔
۱۸۷۲ء میں مرزا محب نے مخزن صادق جاری کیا۔

۱۸۷۲ء میں مولوی محب علی نے اخبار الاخبار جاری کیا

۱۸۷۲ء میں منشی چندن لال نے جامع الاخبار جاری کیا
۱۸۷۳ء میں منشی خیراتی لال نے خیر خواہ اودھ جاری کیا
۱۸۷۳ء میں پادری مسمورا نے خیر خواہ اطفال نکالا

۱۸۷۳ء میں لالہ گوکل پرشاد نے تہذیب لکھنؤ جاری کیا۔
۱۸۷۴ء میں لالہ گوکل پرشاد نے تاج الاخبار جاری کیا۔
۱۸۷۴ء میں شمس العلماء مولانا ابوالحسن عرف بچن صاحب نے آثارالاعصار اور اصح الاخبار نکالا۔ پہلے اخبار کے ایڈیٹر سید محمد صاحب اور دوسرے کے فدا علی عیش تھے۔
۱۸۷۴ء میں منشی محمد علی نے روزنامہ اخبار جاری کیا
۱۸۷۴ء میں فتح محمد تائب نے رسالہ گلدستہ شعراء جاری کیا۔
۱۸۷۴ء میں مولوی چراغ علی نے مرقع تہذیب جاری کیا
۱۸۷۵ء میں منشی امتیاز علی وکیل نے انجمن اسلام جاری کیا
۱۸۷۶ء میں منشی رام سہائے تمنا نے گلدستہ سخن رسالہ جاری کیا

۱۸۷۶ء میں خیراتی لال نے منبع الاحکام جاری کیا

۱۸۷۷ء میں منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ نکالا۔

۱۸۷۷ء میں منشی امبکا پرشاد نے سرپنچ نکالا۔

تہذیب و تمدن میں لکھنؤ وہی شاہی عہد کا لکھنؤ تھا۔ شاہی زمانہ کی چہل پہل تو ختم ہو گئی تھی باقی زبان وہی تھی۔ وہی نفاست مزاج وہی شعر و شاعری وہی کھیل تماشے وہی عاشق مزاجی، وہی بانکپن وہی الوالعزمیاں

لکھنؤ

چودھویں صدی ہجری

سنہ ۱۸۸۰ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک

لکھنؤ پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوئے بیس برس ہو چکے تھے انگریزی فوجیں انگریزی حکام شہر میں کثرت سے آ گئے تھے۔ ہندوستانیوں میں بہتوں نے ان سے تقرب حاصل کر لیا تھا۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہو گئی تھی اور انگریزی تہذیب نے قدم جمالئے تھے، ہندوستانی انگریزی پڑھ کے اپنے کو مہذب کہنے لگے تھے مگر لکھنؤ کے پرانے لوگ انھیں تہذیب سے عاری سمجھتے تھے اس طرح نئی اور پرانی تہذیب میں کشمکش تھی جیسا کہ شیخ فدا علی صاحب عیش کے شہر آشوب سے معلوم ہوتا ہے وہ کہتے ہیں ؎

اب یہ تہذیب ہے یوں چال بشر چلتے ہیں   سیٹیاں منہ سے بجاتے ہیں جدھر چلتے ہیں

لال ٹوپی تو سر پاک پہ کترے ہوئے بال   تولیا جیب میں جاکٹ کے بجائے رومال

لکڑی تو ہاتھ میں رہتی ہے ڈبل چلتے ہیں چال   گوشت بریان ولایت کو سمجھتے ہیں حلال

کوئی کھانا ہو اٹھاتے ہیں چھری کانٹے سے

میز پر بیٹھ کے کھاتے ہیں چھری کانٹے سے

باتیں کرنے میں زمانہ سے نیا طرزِ کلام   وق کرو مت ہمیں کرنے دو ہمارا ہمیں کام

جا کے بنگلے پہ ابھی بول دو صاحب کو سلام   ملنا ہم چاہتے ہیں آئے گا ہم ہوتے ہی شام

ننگے سر بنگلے میں ہر وقت رہا کرتے ہیں

پانیر بیٹھ کے کرسی پہ پڑھا کرتے ہیں

ہوگئی شہر کی صورت سے زباں بھی تو خراب   قتل ارد وئے معلٰی کو سمجھتے ہیں ثواب
تھی بچاری بلاغت پہ فصاحت پہ عذاب   فصحا اگلے زمانہ کے ہیں مانند دواب

بات کرنے کی لیاقت اُسے اک آن نہیں
جس میں انگریزی نہ تعلیم ہو انسان نہیں

عہد شاہی کے جو کچھ لوگ نظر آتے ہیں   نیم وحشی وہی اس وقت میں کہلاتے ہیں
بعضوں سے غیر مہذب بھی سُنے جاتے ہیں   پڑھ کے انگریزی مہذب کا لقب پاتے ہیں

جز زبان اُن کی ہے عمدہ وہ زباں ہے اب تو
فعل انگریز کا مطبوع جہاں ہے اب تو

سلطنت جب سے گئی رونق و زینت بھی گئی   شاہزادوں کی جو عزت تھی وہ عزت بھی گئی
زیست کا لطف گیا چین کی صورت بھی گئی   برکت اٹھ گئی ہر چیز کی لذت بھی گئی

دیکھو اندھیر نئی روشنی کا دور ہے سب
لوگ اب اور ہیں ڈھنگ اور ہے رنگ اور ہے اب

اس سب کے باوجود ابھی ہندوستانی تہذیب کی شہنشاہی کل کی بات تھی پرانے رؤسا اور شرفاء موجود تھے جنھیں اپنی تہذیب سے عشق تھا دربار شعراء اور دوسرے اہل کمال موجود تھے اور ان کی تہذیب کے بعض پہلو ایسے دلکش تھے کہ انگریز بھی اس سے دلچسپی رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ صوبہ کا صدر مقام الہ آباد تھا مگر گورنر زیادہ لکھنؤ میں رہتا تھا اسی کے ساتھ شہر کا وہ حصہ جو سعادت علی خاں نے انگریزی طرز کا بنایا تھا اسی طرف انگریزیت کا غلبہ رہا۔ پرانے شہر میں انگریز اور انگریزیت کے قدم نہیں آئے۔ لکھنؤ کے پرانے علوم وفنوں کی آبیاری ہوتی رہی۔ اس کے قدر دان اہل فن کی دل کھول کے خدمت کرتے رہے اور عام شہری فنی نزاکتوں کو سمجھنے

اور داد دیتے رہے جس کا اندازہ میرانیس کے حیدرآباد والے واقعہ سے ہوتا ہے کہ جب وہ مرثیہ پڑھنے بیٹھے اور کئی بند ہوا پر اڑ گئے تو انھوں نے مرثیہ تہ کرکے زانو پر رکھا اور مجمع پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈال کے کہا۔ ہائے لکھنؤ تجھے کہاں سے لاؤں۔ یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے پھر بھی انگریزیت سے پرانی تہذیب کے لوگ بھی محفوظ نہیں رہے۔ بہت سی انگریزی لفظیں وہ اپنے لہجے میں تولنے لگے جیسے سکریٹری کو سکتر فیشن کو فیشن۔ ہاسپٹل کو اسپتال وغیرہ۔

علمار کی علمی عظمت کو ابھی تک زوال نہیں ہوا تھا

فرنگی محل مولانا عبدالحیٔ نے معقولات میں صدرا اور شمس بازغہ پر معرکہ آرا حواشی لکھ کر بزرگوں کے نام کو روشن کردیا اور درس وتدریس میں وہ شہرت حاصل کی کہ ملا نظام الدین کا دور لوگوں کو یاد آگیا۔ مولانا فضل اللہ بھی علم وفضل میں شہرت رکھتے تھے۔ مولانا فضل اللہ کی قابلیت کا بھی شہرہ تھا۔ بہت سے علماء ان کے شاگرد ہیں۔

مولانا عبدالرب، مولانا عبدالرزاق، مولانا رحمت اللہ بھی درس وافادہ کی مسند بچھائے ہوئے تھے۔

مولانا محمد نعیم نے معقولات حدیث وتفسیر اور درس وتدریس میں نام پیدا کیا۔

خاندان اجتہاد تاج العلماء سید علی محمد معقول ومنقول فقہ واصول کلام ومناظرہ میں یکتائے زمانہ فن اخلاق کے مجدد اور عبرانی زبان کے عالم متبحر تھے تقریباً تین سو کتابیں مختلف علوم وفنون کی تصنیف کیں۔ اخلاق محمدی ان کی ایک اچھوتی کتاب ہے جس میں فن اخلاق کے اصول پر آنحضرت کی سیرت کو منطبق کیا ہے۔

مجاور حسین جو کراچی میں ڈاکٹر حسنی کے نام سے مشہور تھے یہ اطراف بلاواں کے رہنے والے گورنمنٹ اسکول میں اردو ٹیچر تھے ان کا تبادلہ رائے بریلی ہوا وہاں ان سے میر شفقت حسین صاحب سے ملاقات ہوئی یہ جناب تاج العلماء کے داماد تھے ان سے اس کتاب کا ذکر آیا مجاور حسین صاحب نے ان سے کتاب دیکھنے کے لئے لی اسکی نقل کرلی اور اس کا اردو ترجمہ کر کے ارجح المطالب اور دوسری اردو کی کتابوں سے اس میں جگہ جگہ اتنے اضافے کئے کہ ایک جلد کی چار جلدیں ہوگئیں اور اپنے نام سے اسکو چھپوا لیا مگر اصل خاکہ جو کتاب کی جان تھا وہی رہا اس میں کسی طرح کا اضافہ ان کی بساط سے باہر تھا جب میں نے یہ کتاب دیکھی تو ان کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی اصل کتاب مولانا قائم مہدی صاحب قبلہ مجتہد کے پاس اب موجود ہے میں نے ان کو لکھا اسکی نقل مجھے بھیج دیجئے تو میں اس کو شائع کر دوں مگر انھوں نے کوئی توجہ نہ کی۔

جناب تاج العلماء کا ۱۳۱۲ھ میں انتقال ہوا۔ تقریباً چھوٹی بڑی ساڑھے تین سو کتابیں اپنی تصنیف چھوڑیں۔ ان کے تلامذہ میں مولانا ابوالحسن صاحب کشمیری مجتہد اور شیخ ممتاز حسین صاحب عثمانی علامہ ہندی ور والد مرحوم امتیاز خاص رکھتے تھے۔

مولانا ابوالحسن عرف بچھن صاحب ملک العلماء بندہ حسین صاحب کے دوسرے بیٹے ۱۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے علوم عقلیہ اور فقہ واصول کی تکمیل کی ورع و تقدس کی بنا پر ان کے والد نے اپنے فرزند اکبر پر ان کو ترجیح دے کے اپنا جانشین بنایا ان کی زندگی

میں انھوں نے شہرت حاصل کی واجد علی شاہ نے ان کو ملاذ العلماء کا خطاب دیا۔ ملکہ وکٹوریا نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ عدالت دیوانی کی حاضری سے مستثنیٰ کیا اور دربار میں ۲۲ نمبر کی کرسی دی

درس و تدریس میں انھوں نے شہرت حاصل کی۔ منطق میں اپنے وقت کے ارسطو سمجھے جاتے تھے۔ چند دن کے بعد منطق کی تمام درسی کتابیں ان کے معیار تدریس سے گر گئیں تو چند طلباء کو زبانی درس دینا شروع کیا افسوس کر وہ تقریریں جو انکی لکھی نہیں گئیں ورنہ منطق میں ایک ایسی کتاب تیار ہو جاتی تو پچھلی تمام کتابوں پر خط تنسیخ کھینچ دیتی۔ منطق میں ان کی تصنیف تنضید النقود فی حل مغالطہ عامۃ الورد و معرکہ آرا کتاب ہے اور شائع ہو چکی ہے۔ یہ ہندوستان میں منطق میں آخری تصنیف ہے اس کے بعد منطق میں کوئی صاحب تصنیف ہندوستان کی خاک سے پیدا نہیں ہوا۔

انھوں نے مجلس بھی پڑھنا شروع کی جس میں نکات علمیہ ہوتے تھے۔ یہ مجلس محمد باقر صاحب کے یہاں منگل کو ہوتی تھی جس سے وہ محمد باقر منگلی مشہور ہو گئے تھے۔

شیعوں کے دو قومی اخبار نکالے ان کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ ان کے زمانہ میں اور اس کے بعد کسی عالم کو نصیب نہیں ہوئی۔ کئی فقہی کتابیں لکھیں۔

ایک لطیفہ | وہ فلسفی حلم و بردباری کے ساتھ شگفتہ مزاج بھی تھے اس زمانہ میں طلبائے اہل سنت سند فراغ پر شیعہ علماء سے اور

شیعہ طلباء سنی علماء سے بھی دستخط لیتے تھے۔ ایک سنی طالب علم ان کے پاس سند پر دستخط لینے آیا جو مولانا فضل اللہ صاحب فرنگی محلی نے اس کو دی تھی۔ مولانا نے کچھ سوالات کرکے سمجھا کہ سند میں استعداد سے زیادہ تعریف ہے اس کے نیچے لکھا

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

سنہ ۱۳۰۹ء میں ہیضہ میں انتقال ہوا تین صاحب زادے چھوڑے مولانا محمد طاہر صاحب سید علی صاحب اور مولانا عابد علی صاحب شاگردوں کی فہرست طولانی ہے بس یوں سمجھ لیجئے کہ ان کے بعد کے تمام علماء اور طلباء ان کی شاگردی پر نازاں تھے۔

مولانا محمد حسین عرف علن صاحب جناب چھجن صاحب کے بڑے بھائی سنہ ۱۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماجد سے تحصیل علم کی حکیم نبا صاحب سے طب پڑھی اور ان کے مطب میں بیٹھے۔ ذکاوت اور ذہانت میں کسی سے کم نہ تھے۔ والد نے ورع و تقدس کی وجہ سے انکے چھوٹے بھائی کو اپنا جانشین بنایا اس سے بد دل ہو کے کچھ دن کربلائے معلی چلے گئے وہاں سے آکے مطب شروع کیا اور موثر علاج کئے۔ جناب چھجن صاحب کے انتقال کے بعد بزرگ خاندان اجتہاد جناب سید علی اکبر صاحب خلف سلطان العلماء نے شہر کے علماء اور روساء کو جمع کرکے چھوٹے بھائی کا ان کو جانشین بنایا اور اس وقت سے ان کو مرجعیت حاصل ہوئی۔ درس و تدریس میں ان کا کوئی مثل نہ تھا۔ طلباء کا ہجوم رہتا تھا۔

قاضی مبارک اور ملا صدرا پر ایسے ایسے اعتراض کرتے تھے کہ لوگ دنگ رہ جاتے تھے

جناب بخش صاحب کی طرح انھوں نے مجلسیں بھی پڑھنا شروع کیں۔
جس میں مطالب علمیہ ہوتے تھے اس میں بڑی شہرت حاصل کی۔ لوگ کہتے
تھے کہ غفرانمآب کا چراغ جل رہا ہے۔ گھوڑے کی سواری بھی کرتے تھے

اس پر بعض علماء نے اعتراض کیا مرزا محمد جعفر صاحب اوج ان کے
مقلد و معتقد خاص تھے فرماتے تھے کہ جامع معقول و منقول ہیں تو جناب علن صاحب باقی دوسرا کیسا ہے
ان کو یہ اعتراض ناگوار ہوا انھوں نے ایک مرثیہ میں کئی بند اس کے متعلق کہے اور مجلس
میں پڑھے ان کے بعد جب ان کے مراثی چھپے تو یہ بند نکال دیے گئے مگر وہ
زبان زد ہو گئے تھے مرتضیٰ حسین صاحب فاضل نے مطلع انوار میں ایک بند
شائع کیا ہے۔ شاید ان کے پاس ایک ہی بند ہو۔ مجھے ایک بند اور مل گیا جو ہدیۂ
ناظرین ہیں۔

مقام حیف ہے وا حسرتا وا اسفا تشخص اور تمرد ہو شیوہ علماء
جو مستحب ہے فرس کی سواری بیا وہ ناروا ہو اور اسکے عوض فنس ہو روا
سوار چار کے کاندھے پہ جیتے جی ہونا
گنہ نہیں ہے یہ عہدی ہے واقعی ہونا
یہ جس کے پاس فنس میں سوار ہو کے گئے نہیں اترتے ہیں جب تک قدم وہ آ کے نہ لے
ہر ایک بات بس آہستگی کے ساتھ جسے ہے ذکر غیر کا تو کیا یہ خود نہیں سنتے
جو کوئی زور سے بولا تو غیظ طاری ہے
عبث غریب پہ فتویٰ کفر جاری ہے

maablib.org

۱۳۲۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ چار صاحبزادے چھوڑے۔ محمد جعفر عرف جعفن صاحب محمد آغا دلدار علی عرف منے آغا۔ راز حسن، اختر عرف سید رضی ہدف تخلص

مولانا سید محمد مصطفےٰ عرف میر آغا صاحب، عمدۃ العلماء سید ہادی صاحب کے بیٹے جناب غفرانمآب کے پرپوتے

۱۲۵۲ھ میں پیدا ہوئے اپنے خاندانی علماء سے تحصیل علم کی علم ہیئت وفقہ اور تقدس وورع میں مشہور تھے۔ جناب بچھن صاحب کے بعد انکے اکثر مقلدین نے ان کی تقلید کرلی تھی۔ ہیئت پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ شرح لمعہ اور شرح کبیر پر ان کے گرانقدر حاشیے ہیں ۱۳۲۳ھ میں انتقال ہوا ان کے فرزندوں میں مولانا سبط محمد ہادی اور مولانا حسین حیدر کا شمار فاضل خاندان اجتہاد میں تھا

مولانا سید محمد ابراہیم صاحب ممتاز العلماء محمد تقی صاحب کے فرزند اکبر ۱۲۵۹ء میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کی اور ان کے جانشین ہوئے حکومت برطانیہ سے شمس العلماء کا خطاب اور دربار میں ۴۲ نمبر کی کرسی ملی۔ نہایت مدبر اور صاحب جرأت وہمت تھے غدر کے بعد انگریزوں نے امامباڑہ آصفی کو فوجی قلعہ اور ٹیلہ کی مسجد کو اسپتال بنا لیا تھا۔ ہندوستانیوں کو قتل وغارت اور پھانسیاں دیدے کے خوف وہراس کی چٹان کے نیچے اس طرح سے دبا دیا تھا کہ ان کے خلاف زبان ہلانے کی کسی میں جرأت نہیں تھی۔ سید ابراہیم صاحب پہلے شخص ہیں جو اس چٹان کو الٹ کے شیر کی طرح گرجتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور انگریزوں سے مسجد وامامباڑہ کی واگذاری کا مطالبہ کیا۔ سخت جد وجہد اور آزمائشوں میں مبتلا ہو کے آخر ۱۲۸۴ھ میں

دونوں کو واگذار کرالیا۔ یہ پہلی آواز تھی جو انگریزوں کے خلاف بلند ہوئی اس کو دیکھ کے بعد میں سیاسی جماعتیں قائم ہوئیں ۱۳۰۱ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ چار صاحبزادے چھوڑے مولانا محمد تقی صاحب مولانا ابوالحسن صاحب مولانا سید احمد صاحب اور سید رضی صاحب قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی اولادیں تھیں مگر صاحب علم نہ تھیں

مولانا ہدایت حسین صاحب زبدۃ العلماء مولانا سید علی نقی کے صاحبزادے سن ولادت معلوم نہیں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ واجد علی شاہ نے نجم العلماء کا خطاب دیا تھا درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے لکھنؤ میں شیعوں کے اموات کو غسل دینے کا کوئی انتظام نہ تھا انھوں نے پاٹے نالے کے قریب ایک بہت بڑا قطعۂ زمین خرید کے غسل خانہ تعمیر کرایا جو آج بھی موجود ہے۔ ایک اقامت گاہ بنوائی کہ شہر کے کسی شخص کو کسی ناگہانی حادثہ سے عارضی قیام کی ضرورت ہو یا باہر سے کسی آنے والے کو عارضی قیام کی ضرورت ہو تو اسکے لئے جاء قیام مہیا رہے۔ مگر جو آیا اس نے قبضہ کرلیا اور وہ اسکی ذاتی ملکیت بن گیا۔ ۱۳۰۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

تصانیف کتب معقولات اور شرح لمعہ پر ان کے حواشی تھے جو ان کے کتب خانہ کی تباہی کے ساتھ تباہ ہوگئے۔ واجد علی شاہ کی تین کتابوں کی شرح لکھی

(۱) صحیفہ سبحانیہ کی مبسوط شرح مواہب سلطانیہ فارسی میں ہے

اس میں پانچ صفحے کا منظوم دیباچہ ہے جس سے ان کی سخن گوئی میں کمال ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) جوہر عروض کی شرح جس سے فنون شعریہ پر ان کی معلومات کا اندازہ ہوتا ہے

(۳) مباحثہ بین النفس والعقل کی شرح۔ افاضل خاندانِ اجتہاد۔

مولانا سید علی اکبر صاحب خلف سلطان العلماء ۱۲۴۹ھ میں پیدا ہوئے جامع معقول و منقول تھے مگر انگریزی نوکری کرکے ڈپٹی کلکٹر ہوگئے تھے عدالت کھو بیٹھے تھے لیکن اپنی بلند پایہ تصنیفات سے اپنا علمی وقار برقرار رکھا۔ بزرگ خاندان اجتہاد سمجھے جاتے تھے تمام علماء اور اکابر شہر ان کا بزرگانہ احترام کرتے تھے

۱۳۲۷ھ میں انتقال ہوا۔ ان کے کئی بیٹے تھے۔ بڑے صاحبزادے مولانا علی غضنفر۔ ڈاکٹر علی مظفر مولانا علی گوہر مولانا علی منور قابل ذکر ہیں۔ مولانا رضا حسین صاحب جناب علین صاحب چھوٹے بھائی معقول و منقول فقہ و اصول میں اپنے والد کے شاگرد تھے طبعاً گوشہ نشین تھے۔

غالباً ۱۹۲۶ء میں انتقال ہوا۔

مولانا سبط محمد سید مرتضیٰ خلف سلطان العلماء کے صاحبزادے صاحب درس افادہ تھے کچھ دنوں بعد سیتاپور میں امام جمعہ و جماعت رہے وہیں ۱۳۲۶ھ میں انتقال ہوا

سید مرتضیٰ میرآغا صاحب کے چھوٹے بھائی عالم و متقی درس و تدریس میں زندگی گذاری ۱۳۱۳ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا سید حسن صاحب جناب سید محمد نقی ممتاز العلماء کے چھوٹے صاحب زادے خاندانی علوم میں عالم متبحر تھے مگر درجہ اجتہاد پر فائز نہ تھے۔ تقدس و ورع میں مشہور تھے ـــــ میں انتقال ہوا۔
ایک صاحب زادے مولانا سید محمد عرف آغا جون صاحب ان کی یادگار تھے۔

مولانا ابوالحسن عرف ابو صاحب جناب ممتاز العلماء صاحب کے شاگرد اور داماد تھے اس طرح وہ بھی خاندان اجتہاد سے منسلک سمجھے جاتے تھے فقہ و اصول کی تدریس میں شہرت رکھتے تھے اور مجتہدین میں ممتاز درجہ کے مالک تھے۔

۱۳۰۶ھ میں انتقال ہوا۔ تین صاحبزادے چھوڑے۔ سید محمد جعفر سید محمد باقر اور سید محمد ہادی ان میں دو مجتہد ہوئے جن کا ذکر اپنے محل پر ہوگا

خاندان اجتہاد کے علاوہ مولانا احمد علی صاحب محمد آبادی جناب غفرانمآب کے شاگرد معقول و منقول فقہ و اصول میں ان کی شخصیت مسلم تھی۔ ادیب بھی بڑے پایہ کے تھے۔ عربی فارسی اردو ہر زبان میں شعر کہتے تھے، تمام علماء ان کا بزرگانہ احترام کرتے تھے اور مجتہدین کرام میں ان کا بڑا درجہ تھا۔ ۱۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے ۱۲۹۵ھ میں انتقال ہوا۔ ان کے ایک صاحبزادے نجم الدین علی میاں کامل شاعر اعظم تھے۔

مولانا مفتی محمد عباس صاحب ۱۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے جناب سید حسین صاحب خلف غفرانمآب کے شاگرد تھے۔ فلسفہ و منطق فقہ و اصول کلام مناظرہ

حدیث تفسیر میں عالم متبحر تھے۔ ادب میں یکتائے زمانہ تھے۔ ہر علم میں انھوں
بلند پایہ کتابیں لکھی ہیں ۱۳۰۷ھ میں انتقال ہوا۔

ان کے کئی بیٹے تھے مگر مولانا محمد علی اور مولانا احمد علی عالم ہوئے

مولانا غلام حسنین علامہ کنتوری ۱۲۴۷ھ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم
کنتور میں پائی تحصیل علم کیلئے لکھنؤ آئے اور ممتاز العلماء سید محمد تقی صاحب سے
معقولات اور فقہ واصول کی کتابیں پڑھیں مفتی محمد قلی صاحب کی صاحبزادی
سے شادی کی اور لکھنؤ میں قیام کر لیا۔ عجیب وغریب شخصیت تھے۔
فلسفہ ومنطق، ہیئت ریاضی اقلیدس، طب، ادب، تاریخ حدیث تفسیر
کسی علم میں بند نہ تھے۔ ہمہ گیر ذہن تھا۔ سمر بزم کیمیا صابون سازی
اور گھڑی سازی میں مہارت رکھتے تھے۔ بہت اہم کتابوں کے مصنف تھے
لاخباری جاری کیا۔ رسالہ تحافتہ الفلاسفہ زکالا متشرع ومتقی صاحب
نفس ذکی تھے ۱۳۲۴ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا حامد حسین صاحب مفتی محمد قلی صاحب کے صاحبزادے ۱۲۴۹ھ
میں پیدا ہوئے۔ مولانا سید مرتضیٰ صاحب خلاصۃ العلماء فرزند سلطان العلماء
سے معقولات کا اور جناب سید حسین صاحب سید العلماء سے فقہ واصول کا درس
لیا مدرسہ شاہی میں ممتاز العلماء کی ماتحتی میں مدرس ہوئے۔ زندگی تصنیف وتالیف
اور مطالعہ میں گذار دی۔ بہت سی کتابیں جن میں عبقات الانوار ان کی سعی و
کاوش کا شاہکار ہے۔ یہ کتاب اب تک اپنے موضوع پر حرف آخر تھی۔
مگر اب عراق کے ایک عالم علامہ عبدالحسین امینی نے الغدیر لکھ کے اور
اور مطالب علمیہ کے اضافہ سے اس نقش ثانی کو نقش اول سے بہتر بنا دیا مگر
الفضل للمتقدم تقدم کی فضیلت حاصل رہے گی۔

مولانا پر الزام بعض کتابوں میں مولانا پر ایک الزام ہے مگر انھوں نے اپنی صفائی میں جو کیا اس کا ذکر نہیں اس وجہ سے ضروری ہوا کہ معاملہ کے دونوں رخ پیش کر دیئے جائیں جو تاریخی دیانت کا تقاضا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ امجد علی شاہ کے زمانہ میں جب مدرسہ شاہی قائم ہوا اور اس کے صدر مدرس مولانا محمد تقی خلف سید العلماء سید حسین ابن غفرانمآب مقرر ہوئے۔ ممتاز العلماء فخر المدرسین ان کو خطاب ملا اور بہت سے علماء ان کی ماتحتی میں نوکر رکھے گئے ان میں مولانا حامد حسین صاحب بھی تھے۔ ان کے پاس لکھنؤ میں کوئی مکان نہ تھا۔ ممتاز العلماء نے کہا کہ نخاس میں میرا ایک مکان ہے وہ میں آپ کو دیتا ہوں جب مجھے یا میری کسی اولاد کو ضرورت ہو خالی کر دیجئے گا۔ مولانا نے اس میں قیام کر لیا۔ ایک مدت کے بعد ممتاز العلماء کے بیٹے شمس العلماء سید ابراہیم صاحب نے ان کو لکھا کہ مجھے مکان کی ضرورت اب آپ خالی کر دیجئے انھوں نے خالی کرنے سے انکار کیا۔ شمس العلماء نے ان پر مقدمہ دائر کر دیا۔ وکلاء نے مولانا کو مشورہ دیا کہ آپ کا مدت سے اس پر قابض قبضہ مخالفانہ کی بنا پر آپ سے مکان واپس نہیں لیا جا سکتا۔ مولانا نے یہی جواب دعویٰ داخل کر دیا۔ قبضہ مخالفانہ کی بنا پر مولانا مقدمہ جیت گئے شہر میں چرچا ہوا۔ لوگوں نے برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا چھوڑ دی۔ مولانا نے اپنی صفائی میں کہا کہ یہ مکان وقف عام ہے سید ابراہیم کو خالی کرانے کا کوئی حق نہ تھا وہ اپنا معاملہ حاکم جور کے پاس لے گئے وہاں کا جو قانون تھا اس کی بنا پر میں نے جواب داخل کیا اگر وہ اپنا مرافعہ حاکم شرع کے

پاس لے جاتے تو میرا یہ جواب نہ ہوتا اور وقف عام کی بنا پر میرا قبضہ بحال رہتا اب میرا قبضہ وقف عام کی بنا پر ہے قبضہ مخالفانہ کی بنا پر نہیں۔ لوگوں نے کہا کہ اچھا وقف ہے کہ متولی کو کوئی حق نہیں رہا۔ اب وقف عام اور ملک خاص میں کیا فرق رہ گیا۔ یہ عوام کی باتیں ہیں جو مسئلہ شرعی سے واقف نہیں ہوتے اس وجہ سے قابل توجہ نہیں ہیں مگر سید العلماء مولانا علی نقی صاحب نے حیات ممتاز العلماء جنت مآب میں اس واقعہ کی جو نوعیت لکھی ہے وہ بالکل مختلف ہے ان کی عبارت یہ ہے۔

محلہ نخاس ــــــ میں متعدد مکانات کا ایک سلسلہ تھا جنھیں بنظر اعانت اکثر تلامذہ و متوسلین کو رہنے کے لئے دیدیا گیا تھا جنکی تفصیل وصیت نامہ مذکورہ (رجسٹرڈ) میں موجود ہے۔ ان مکانات کے متعلق بھی وصیت نامہ میں صراحت ہے کہ جب میری اولاد کو ضرورت ہو تو یہ حضرات جو ان مکانات میں مقیم ہیں ان مکانات کو اولاد کی خاطر خالی کر دیں۔ اہل علم کو محسوس ہونا چاہیے کہ اس قسم کی شرط وقف عام میں نہیں ہو سکتی اس شرط کا ہونا ہی وقف خاص میں ہونے کا قطعی ثبوت ہے حیات جنت مآب ص۲۸

یہ مکان وقف خاص ہو یا وقف عام وہ ملک خاص بن چکا ہے جہاں تین پشت سے مولانا کی اولاد اس پر قابض ہے شکست و ریخت سب ہوتی رہتی ہے اور کسی سے اجازت کی ضرورت نہیں۔ اگر ان کی اولاد میں کوئی اسے فروخت کرنا چاہے تو کوئی مانع نہیں کیونکہ چار پشت سے ان کا قبضہ ہے۔ بہرحال مولانا حامد حسین صاحب خود مجتہد تھے۔ مجتہدین کے معاملہ میں ہم ایسے لوگوں کو محاکمہ کا حق نہیں اس کا تفصیلی ذکر ضروری تھا کیونکہ کتابوں میں یک طرفہ بیان ہے۔

مولانا ابوالقاسم صاحب کشمیری۔ (والد سید علی صاحب حائری) شاگرد سید تقی صاحب جیّد علماء میں تھے۔

داب سر نوازش علی خاں نے سید تقی صاحب سے ایک عالم کے قیام کی لاہور میں خواہش کی انھوں نے ان کو بھیجدیا۔ وہاں انھوں نے جمعہ و جماعت قائم کی اور نواب صاحب ان کے کفیل رہے۔

مولانا کرامت حسین صاحب بھی ایک قابل ذکر شخصیت ہیں۔ انھوں نے ممتاز العلماء سید تقی صاحب سے درسیات کی تکمیل کرکے انگریزی پڑھی اور ولایت جاکر بیرسٹری پاس کی لکھنؤ اور الہ آباد میں کچھ دنوں وکالت کے بعد الہ آباد ہائی کورٹ کے جج ہوگئے مگر کسی زمانے میں علمی مشاغل سے دستبردار نہیں ہوئے۔

پنشن کے بعد لکھنؤ میں قیام کر لیا تھا ذیا بیطس کے مریض تھے ابلے ہوئے شلجم سے روٹی کھاتے تھے۔ ایک دن احباب کی دعوت کی سب کے آگے عمدہ عمدہ کھانے آئے ان کے سامنے ابلا ہوا شلجم آیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ یہ روز آپ سے کیسے کھایا جاتا ہے۔ فرمایا میں بہت شوق سے کھاتا ہوں۔ تولہ بھر کی زبان کے لئے سارے جسم کو تکلیف دینا کونسی عقل کی بات ہے۔

کوئی اولاد نہ تھی بیوی بھی مر چکی تھیں معمولی خرچ تھا اسی ہزار روپے جمع کئے تھے اس سے لڑکیوں کا اسکول کھولا (جواب عیسائیوں کے زیر اہتمام کالج ہے جس میں عیسائی لڑکیاں پڑھتی ہیں) سر سید احمد خاں نے علی گڑھ میں لڑکوں کا کالج کھولا یہ وہ زمانہ تھا کہ علماء اور پرانے زمانہ کے شرفاء لڑکوں کو انگریزی تعلیم سے روکتے تھے اکبر الہ آبادی بھی اسی خیال

کے تھے انھوں نے ایک نظم کہی جس میں اس کے نتائج و عواقب سے آگاہ کیا اس نظم کے دو شعر یہ ہیں ؎

اک پیر نے تعلیم سے نسواں کو سنوارا | اک پیر نے تہذیب سے لڑکوں کو ابھارا
یہ تن گئے پتلون میں وہ سایہ میں پھیلی | پیجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اتارا

لکھنؤ کی شریف زادیاں اسکول میں پڑھنے نہیں جاسکتی تھیں عیسائی لڑکیاں پڑھتی تھیں اور اب بھی عیسائی لڑکیاں پڑھتی ہیں ان کی عیسائی قوم کی یہ خدمت لوگوں کو سخت ناگوار تھی۔ مادہ کے قدم کے قائل اور معراج کے منکر تھے۔ یہ نص قرآنی سے انکار تھا۔ ۱۳۳۵ھ میں پینسٹھ برس کی عمر میں انتقال ہوا کسی شیعہ قبرستان میں دفن کی اجازت نہیں ملی شہر سے دور تال کٹورہ کی کربلا کے قریب مرزا کینواں جاہ کے احاطہ میں دفن ہوئے ان کے چچازاد بھائی مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ نے نماز پڑھائی خاندان کے لوگ جنازے میں شریک ہوئے مرنے کے بعد لوگ آنجہانی کہتے تھے۔

کتابیں انھوں نے کئی لکھیں جن میں فقہ اللسان بہت عمدہ کتاب ہے

امراء میں مرزا عالیجاہ اور والاجاہ کا شمار علماء میں تھا

مولانا غنی نقی صاحب داعی پوری شاگرد ملک العلماء سید بندہ حسین صاحب معقولات میں شہرت رکھتے تھے۔ غدر کے بعد جب لکھنؤ میں کیننگ کالج قائم ہوا تو یہ اس میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ مولوی جعفر حسین صاحب مولوی محمد تقی صاحب شاگرد تاج العلماء مولوی حیدر علی صاحب م ۱۳۰۰ھ مولوی حبیب حیدر صاحب م ۱۳۰۳ھ مولوی مرزا رضا علی صاحب م ۱۳۳۱ھ مرزا محمد خلیل اور مولوی

حسن مرزا مولوی اولاد حسین برادر منیر کا شمار ممتاز اہل نظم میں تھا۔

مولانا سید علی صاحب شاگرد سلطان العلماء نے حدیث خوانی میں شہرت حاصل کی مجالس علویہ ان کی مشہور کتاب ہے۔ مرزا محمد ہادی صالح نے بھی حدیث خوانی میں شہرت حاصل کی اور ایک بہت عمدہ کتاب خلاصۃ المصائب لکھی۔

طبابت اطبا میں حکیم نبا مرحوم کے بھانجے محمد حسین عرف محمد جی اور ان کے بھائی حکیم حیدر حسین حکیم عابد علی مشہور تھے۔

حکیم محمد جی کا مثل نہ تھا اپنے وقت کے لقمان درس وتدریس تشخیص معالجہ میں یکتائے زمانہ، بڑے جید اطباء ان کے شاگرد تھے۔ والد مرحوم نے بھی ان سے طب پڑھی تھی۔

جھوائی ٹولہ بھی اطبا کا ایک بڑا مرکز تھا حکیم عبدالعلی اور حکیم محمد اسمٰعیل حکیم محمد مسیح کا شمار اکابرین تھا۔

رؤسا امیر الدولہ راجہ امیر حسن خاں (راجہ محمود آباد) نے مذہب شیعہ اختیار کرلیا اور جناب بچھن صاحب کے مقلد ہوئے ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے چار دیہات چین حیاتی نذر کئے۔ غفرانمآب کے امامباڑے میں مدرسہ ایمانیہ قائم کیا۔ شعراء کے بھی قدر دان تھے۔ حکیم ضامن علی جلال کی تنخواہ معین کی اور آغا بحر شرف کا دیوان چھپوا دیا۔ نواب مہدی حسین عرف آغا ابو صاحب خاندانی نواب اور خاندانی عالم تھے۔ نواب والاجاہ جن کا شمار علماء میں تھا ان کے صاحبزادے تھے۔ گورنمنٹ

سے سی آئی ای کا خطاب ملا بڑے باا ثر اور حکام رس تھے انھوں نے کوشش کرکے سلطان المدارس قائم کیا اور اسکے اخراجات وقف حسین آباد سے منظور کرائے۔ اپنا عالیشان کتب خانہ مدرسہ کو دیدیا۔

ناظم صاحب نے وقف ناظمہ قائم کیا۔ ایک امام باڑہ بنوایا اور مدرسہ ناظمہ قائم کیا۔ جناب ابو صاحب کو اس کا صدر مدرس بنایا۔ کھجوہ میں ایک بڑی عمارت مولانا حامد حسین صاحب کو کتبخانہ کے لئے دی اور پچاس روپیہ ماہوار ان کا وقف سے مقرر کیا۔ محمد عباس علیخاں مرزا بہادر خطاب با اثر علم وفن کے قدردان تھے۔ مرزا محمد ہادی عزیز کی نوعمری کا زمانہ تھا۔ کہ انکے بھائی حکیم مرزا محمد مہدی صاحب کا انتقال ہو گیا اور عزیز صاحب پریشان حال ہو گئے چونکہ شاعری میں متعارف ہو چکے تھے ان کی پریشان حالی معلوم کرکے انھوں نے ان کو اپنا ... بنا کر فکر معاش سے آزاد کردیا۔

بڑے صاحب عالم، علماء سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ جناب نجھن صاحب کے مقلد تھے ان کی خدمت بھی کرتے رہتے تھے

نواب سردار صاحب شیش محل کے نواب خود بھی شاعر تھے علی میاں کامل کے شاگرد اور ان کے کفیل تھے۔

حامد علی خاں بیرسٹر مشرقی تہذیب کے دلدادہ شعر وسخن کے والہ وشیدا۔ شعراء اور ادباء کے قدردان تھے۔ لندن بیرسٹری کا امتحان دینے گئے تو وہاں بھی چوڑی دار پاجامہ انگرکھا اور دوپلی ٹوپی

بہنتے رہے لکھنؤ میں ان کے دم سے ادبی چہل پہل تھی۔ شعراء کی دعوتیں کرتے رہتے تھے

علی بخش باورچی | ان کا باورچی علی بخش تھا۔ یہ نصیرالدین حیدر کے زمانہ میں شاہی باورچیوں میں نوکر ہوا۔ امجد علی شاہ کے زمانہ میں اس نے شہرت حاصل کی۔ انتزاع سلطنت کے بعد محسن الدولہ کا نوکر ہوا پھر داروغہ واجد علی کا۔ آخر میں حامد علی خاں کے یہاں ملازمت کر لی۔ ایک ایک چیز کو سو سو طرح سے پکاتا تھا اور ہر ایک کے مزے میں فرق ہوتا تھا۔ کواب پلاؤ میٹھے چاول سب مونگ کی دال کے پکاتا تھا اور کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ حامد علی خانصاحب کو کئی دن اس نے مٹر کی پھلیاں پکا کے کھلائیں اور ہر مرتبہ نیا مزا ہوتا تھا۔ انھوں نے پوچھا اس طرح کتنے دن تک پکا سکتے ہو اس نے کہا سال بھر تک۔ حامد علی خانصاحب سمجھتے تھے کہ میں اسکے کمال کے مطابق اس کو تنخواہ نہیں دیتا مختلف بہانوں سے دیتے رہتے تھے۔ کسی ضرورت سے حیدرآباد دکن گئے وہاں نواب سالار جنگ سے اسکی تعریف کی اور چاہا کہ وہ اسے نوکر رکھ لیں وہ بہت خوش ہوئے اور تین سو روپے ماہوار اسکی تنخواہ مقرر کر دی۔ حامد علی خانصاحب نے واپس آکر علی بخش کو خوشخبری سنائی اور سامان سفر درست کرنے کی تاکید کی۔ علی بخش کئی مہینے تک وعدے کرتے رہے۔ آخر ایک دن خانصاحب نے پوچھا کہ کئی مہینے ہو گئے حیدرآباد سے تقاضے کا خط بھی آیا ہے۔ اگر کچھ روپیوں کی ضرورت ہو

تو دیدوں سامان سفر درست کرکے چلے ۔ آخر علی بخش کھل پڑے کہنے لگے بات یہ ہے کہ حیدرآباد جانے کو جی نہیں چاہتا پوچھا کیوں کیا وہاں کے لوگ سمجھیں گے کہ اب لکھنؤ میں اس کا کوئی قدردان نہیں رہا خانصاحب بہت متاثر ہوئے اور اسکی تنخواہ بڑھائی

نواب علی خاں صفدر جنگ کے خاندان سے تھے ۔ بڑے صاحب ذوق اور سخی و جواد تھے ۔ آغا میر کی ڈھوڑی سے امین آباد جانے والی سڑک پر ایک چھوٹا سا ریل کا پل پڑتا ہے وہیں سے سڑک مڑتی ہے اس کے سامنے نہایت عالیشان سرخ عمارت ہے یہی ان کا مکان تھا یہ محلہ چودھری کی گڑھیا کہلاتا ہے ۔ نواب صاحب شاعر اور شاعروں کے قدردان تھے ۔ بڑے اہتمام سے مشاعرے کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ ہر اتوار کو شعراء کی محفل منعقد کرتے تھے ۔ آخر میں دسترخوان بچھتا تھا ۔

نواب مہدی حسین صاحب ماہر خاندان اجتہاد سے تھے مگر دولت مندی کی وجہ سے نواب کہے جاتے تھے ۔ بڑے بلند پایہ شاعر تھے ۔ غزل مرثیہ رباعی اور سلام سب کچھ کہتے تھے ۔ مرزا محمد ہادی عزیز کا قول مشہور ہے جو بعض کتابوں میں بھی ہے کہ ماہر صاحب کا کلام انیس کے کلام سے کسی طرح کم نہیں ۔ وہ مشاعرے بھی کرتے تھے مگر مجلسیں بڑے اہتمام سے کرتے تھے ۔ مجلسوں کی ایک تاریخ بھی ہے جو قابل ذکر ہے

مجلسیں شاہان اودھ غربا پروری کی غرض سے مجلسوں میں کھانا تقسیم کرتے تھے طباق میں پلاؤ اس پر قورمے کا پیالہ اور روٹی حسین آباد اور آصف الدولہ کے امام باڑے میں شاہ نجف میں سوا پاؤ برفی کی ہانڈیاں اور کبھی متنجن اب بھی تقسیم ہوتا ہے کیونکہ وقف باقی ہے کھانے کی یہ تقسیم دیکھ کے اکثر لوگ کھانا یا کم سے کم پلاؤ تقسیم کرنے لگے۔

ماہر صاحب کی مجلسیں مجلسوں کا جو اہتمام مہدی حسین صاحب ماہر کرتے تھے وہ دنیا میں کہیں نہیں ہوا انھوں نے اپنا مکان اس طرح کا بنایا تھا جس طرح وہ مجلسیں کرنا چاہتے تھے۔ ذی الحجہ کی پہلی تاریخ سے ان کا خیمہ کسی محلہ میں نصب ہوتا جہاں ان کے آدمی اہل محلہ کی فہرست مرتب کرتے سہ پہر کو وہ اپنی جوکڑی پر وہاں جاتے فہرست پیش کی جاتی ہر شخص کے مکان پر جا کے مجلس کا وعدہ لیتے اٹھائیس ذی الحجہ کو ہر شخص کے مکان پر سوا پاؤ برفی کی ہانڈی مجلس کے حصہ کے نام سے بھیجی جاتی۔ پہلی محرم کو فرنگی محل کے پل سے ان کے گھر تک قالینوں کا فرش بچھتا اور سیاہ جھنڈیاں لگائی جاتیں بائیں طرف کا کمرہ کفش خانہ جہاں آنے والے جوتا اتارتے اور ایک ٹکٹ ملتا جس کا نمبر کا ہوتا اسی نمبر کا ایک ٹکٹ اسکے جوتے میں رکھ دیا جاتا۔ داہنی طرف کے کمرے میں مختلف سائز کی سیاہ شیروانیاں ٹنگی ہوتی تھیں جو سیاہ شیروانی پہن کے نہیں آتا تھا وہ اس کمرے میں جا کے اپنے سائز کی شیروانی پہن کے اپنی شیروانی وہاں لٹکا دیتا تھا اس کے بعد مجلس میں جاتا تھا جب کچھ لوگ آ جاتے تھے تو ایک تختی سامنے آتی جس پر لکھا ہوتا حقے لاؤ پھر دوسری تختی آتی چائے لاؤ (گرمی میں شربت)۔ مجمع ہونے کے بعد مجلس شروع ہوتی ختم مجلس پر صحن میں دیواروں کی کھڑکیوں سے مرقع دکھائے جاتے پھاٹک اندرونی کنارے پر ماہر صاحب

آب زمزم کی شیشی رومال پر رکھ کے دونوں ہاتھوں سے ہر شخص کے سامنے پیش کرتے اور کل کا وعدہ لیتے پھاٹک کے بیرونی دروازے پر حصّہ تقسیم ہوتا طباق میں پلاؤ اس پر قورمے کا پیالہ اور ردٹی رومال سے بندھی ہوئی شیرمال اور روساء حصّہ ہاتھ میں لے کے جانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے وہ کسی غریب لڑکے کو دیدیتے تھے کچھ دور پر لوگ کھڑے رہتے تھے وہ پانچ آنے میں ایک حصّہ خرید لیتے تھے۔

مشاعرے | نواب اصغر حسین صاحب فاخر ماہر صاحب کے بھتیجے بھی بہت دولتمند لکھنؤ کے اساتذہ میں تھے مشاعرے بڑے اہتمام سے کرتے تھے بعد ختم مشاعرہ دسترخوان بچھتا تھا۔ خاندانی اثر سے تقویٰ و پرہیزگاری کا مجسمہ تھے کبھی ان کی زبان سے جھوٹ نہیں سنا گیا۔

انکے بردتے قائم مہدی صاحب ساحر ان کی ادبی یادگار اس برصغیر میں اس وقت سب سے بڑے مرثیہ نگار ہیں کراچی میں لکھنؤ کی شاعری ان کے دم سے زندہ ہے۔

نواب پھلکی قدر خاندانی شہزادے تھے۔ سال بھر کے تھے کہ باپ نے انتقال کیا۔ کچھ دنوں کے بعد والدہ بھی راہی جنّت ہوئیں۔ قریب کے عزیزوں نے جائداد پر قبضہ کرلیا۔ ان کو تعلیم دلوانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ جب ہاتھ پاؤں کے ہوگئے تو گھر سے نکال دیا۔ بیچارے پھلکیاں بیچ کر گذر کرنے لگے۔ لوگوں نے بتایا کہ آپ کی بہت بڑی جائداد ہے۔ کچھ لوگ حمایت پر آمادہ ہوگئے۔ مقدمہ دائر ہوا ساری جائداد ان کو مل گئی۔ پھلکیاں بیچنے کی زندگی بھول گئے۔ رئیسوں

کی زندگی اختیار کی۔ وہی ادب و تہذیب وہی تراش و خراش اور وہی سب ذوق ان کے بھی ہو گئے جو رؤسائے لکھنؤ کے مشاعرے اور مجلسیں بڑے اہتمام سے کرتے تھے۔ شیخ علی عباس وکیل لکھنؤ کے چوٹی کے وکیلوں میں تھے مجلسیں بڑے اہتمام سے کرتے تھے جس میں بڑا مجمع ہوتا تھا۔ مولانا سبط حسن صاحب کی ذاکری انھیں کے یہاں سے چمکی۔ وہ مولانا کے قدردان تھے اور جب تک زندہ رہے ان کی خدمت کرتے رہے۔

شہنشاہ حسین صاحب بھی بڑے مشہور وکیل اور شہر کے مقتدر لوگوں میں تھے۔ چھوٹی شہزادی اپنے بزرگوں کی شان و شوکت کی یادگار تھیں ہر ہفتہ نیا جوڑا پہنتی تھیں شیخ امداد علی بحر کی قدردان تھی وہ انھیں کے یہاں رہتے تھے ان کی کفالت کرتی تھیں

عربی شاعری اور مقاصدہ کی ایجاد۔ اگر دہلی کو مشاعرہ کی ایجاد کا فخر حاصل ہے تو لکھنؤ کو مقاصدے کی ایجاد کا شرف حاصل ہے اس کے بانی مولانا سید محمد مہدی صاحب ادیب تھے۔ یہ مفتی میر عباس صاحب کے شاگرد اور عربی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ عربی میں قصیدے کہتے تھے اور مقاصدے منعقد کرتے تھے۔ یہ عربی شاعری کا زریں عہد تھا۔ اس سے پہلے اس کو اتنا عروج نہیں ہوا تھا۔ سیکڑوں عربی زبان کے شاعر تھے جو ان محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ اکابر علماء جو مقاصدوں میں نہیں

جاتے تھے وہ بھی قصیدے بھیجتے تھے۔ والد مرحوم کی کمسنی کا زمانہ تھا وہ بھی ان مقاصدوں میں شریک ہوتے تھے فرماتے تھے کہ ان مقاصدوں میں اردو کے شاعروں کی طرح مجمع ہوتا تھا اس کے معنی یہ ہیں کہ عربی سے ذوق رکھنے والے اس کثرت سے لکھنؤ میں موجود تھے ان میں اکثر صاحب دیوان تھے مگر عوام سے اس کا تعلق نہ تھا اس لئے انکے اخلاف نے اس کی اشاعت وحفاظت نہیں کی اور وہ تمام سرمایہ تلف ہو گیا۔ نہ شعراء کے تذکرے لکھے گئے۔ خاص خاص لوگوں کے حالات سے کچھ لوگ واقف ہیں۔

سید العلماء مولانا علی نقی صاحب نے ان لوگوں کے کلام کا بڑا ذخیرہ بہت کوشش سے جمع کیا تھا مگر ان کے گھر میں آگ لگا دی گئی اور سارا ذخیرہ نذر آتش ہو گیا۔

اردو مقاصدے | کچھ دنوں کے بعد لکھنؤ میں اردو مقاصدے بھی ہونے لگے اور پھر سارے ہندوستان میں پھیل گئے۔

اردو شعراء | میر نفیس پیارے صاحب، رشید مرزا محمد جعفر صاحب اوج مولوی علی میاں کامل۔ نواب مہدی حسین ماہر نواب اصغر حسین فاخر۔ حکیم ضامن علی جلال۔ سید مرزا تعشق۔ محمد مصطفےٰ عرف لڈن صاحب خورشید منشی امیر احمد تسلیم شیخ امداد علی بحر منشی اسمعیل حسین منیر حکیم محمد علی مسیحی آغا علی شمس۔ آغا بجو شرف۔ شیخ جان محمد شاد منشی امیر اللہ تسلیم۔ غلام حسین قدر

منشی امیر احمد مینائی کا شمار اساتذہ میں تھا

شہر کے خوشگو شعراء | عباس حسین فصاحت سید حسین لطافت پسران امانت عابد علی عبادت اسلام علی ریاضت نجابت علی نجابت ہادی علی جنت۔ افضل علی رافت محمد حسن صحت۔ شیخ ولایت علی ولایت محمد وزیر علی حسرت۔ سید صادق علی صداقت۔ شرافت علی راحت ریاضت علی متانت ریاضت متانت طلعت وحدت کثرت عشرت صولت اصالت۔ راحت۔ محبت شاگردان امانت یہ سب امانت کے مشہور شاگرد تھے ان کے علاوہ ہر شاعر کے بے شمار شاگرد تھے جن کی فہرست طولانی ہے۔

ہندو شعراء | منشی دوارکا پرشاد افق۔ طوطا رام شایان: لالہ گرداس شہرہ۔ منشی خیراتی لال طاہر۔ منشی کرشن چند فیسر منشی رام سہائے تمنا پنڈت تربھون ناتھ ہجر۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ منشی کشوری لال نور منشی نوبت رائے نظر۔ یہ لوگ بڑے پایہ کے شاعر تھے۔

شاعرہ خواتین | عورتوں کو بھی شعر و سخن کا ذوق تھا۔ شریف زادیوں میں منور بیگم منور مستور بیگم مستور لکھنؤ کی رئیس زادی تھیں۔ ان کا شعر ہے

خزاں تھی بھی نہ کسی سے رہا ہے اپنا گریبان بے رفو برسوں

نازا جھی بی شاگرد مرزا فدا حسین فدا

دل جل گیا حرارت داغ فراق سے اس آفتاب حشر کا ہوگا زوال کیا

دھواں اٹھتا ہے جس دم آہ کرتا ہوں شب ہجراں
نہ پوچھو ہمنشیں حالت ہمارے قلبِ سوزاں کی

نظیرن ؎

تو جو اغیار کے پہلو میں نہاں رہتا ہے
مجھ کو تنہائی میں پہروں خفقان رہتا ہے

نواب بیگم عرف چھوٹی بیگم حجاب دختر نواب اعظم علیخاں صاحب دیوان تھیں۔

بن کے تصویر حجاب ان کو سراپا دیکھوں
منہ سے بولو نہ کچھ آنکھوں سے تماشا دیکھوں
مجھ کو حیران ترا اور مجھے حیران مرا
حق نے کیا خوب بنائی ہیں یہ تصویریں دو

افضل النساء مطلوب بھی خوب شعر کہتی تھیں۔

شاعرہ طوائفیں | وزیر جان مشہور زمانہ تھی بلا کی خوبصورت غضب کا گلا اور قیامت کی ذہین تھی اس کا کوٹھا شعراء اور موسیقی کے باکمالوں کا مرکز تھا اپنی غزل گا کے سناتی تھی اور محویت کا عالم طاری کر دیتی تھی ؎

نالۂ سوزاں جو کھینچے میں نے رو کر ہجر میں
رشک سے بجلی جلی شرمندہ ابر تر ہوا

زہرت جان فرحت ؎

دل لگایا ہے تری زلف دوتا سے کچھ ہو　　سانپ کو چھیڑ لیا اب تو بلا سے کچھ ہو

مزیّب رسین جان ؎

ہو گئی ہے شام اب تو تیرے کوچے کے قریب　　شب کی شب رہنے دے او ظالم ذرا منزل کے پاس

زینت اگن جان ؎

کیا کہوں چپ چپ ہیں کیوں شہر خموشاں کے مکیں　　کوئی بتلاتا نہیں منزل بمنزل کیا ہوا

ناز امیر جان ؎

اپنے پہلو میں جگہ دی سرِ محفل مجھ کو　　دلدہی یار نے کی دیکھ کے بیدل مجھ کو

مہک بگن جان ؎

بس رہی ہے کیا کسی کی زلف میں　　آج کچھ مہکی ہوئی آتی ہے روح

جعفری۔ شاگرد منشی فدا حسین فضا

منھ کو آ جائے کلیجہ ضبط کی طاقت نہ ہو　　گر ہمارا دل رہے دم بھر کسی کے دل کے پاس

وزیر جان و خورشید جان طوائفیں بھی شاعرہ تھیں۔

مہتاب جان مہتاب تخلص نازک اندام، بلا کی شوخ اور ذہین گانے اور ناچنے میں اسکی نزاکت جادو کرتی تھی شعر بھی خوب کہتی تھی ؎

دیکھا جو مجھکو پھیر کے منھ مسکرا دیئے　　بجلی گری تڑپ کے دل بے قرار پر

ریختی | عصمت ریختی کہنے میں بہت مشہور تھے ان کے مقابلے میں امجد علی خاں نے ریختی کہنا شروع کی خوب مقابلے ہوتے تھے۔ محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور دونوں اپنا اپنا کلام سناتے تھے۔ ہدایت اللہ اس صحبت میں آیا کرتے تھے۔

مزاحیہ گو شعراء | مولانا حکیم قدرت اللہ انصاری فرنگی محلی علمائے فرنگی محل سے تھے مزاحیہ شعر کہتے تھے مگر سنجیدگی کے ساتھ ۔ ہ

اتو لقا آپ کا اندازاے اللہ میاں نکلا
نشاں بھی بے نشاں نکلا مکاں بھی لامکاں نکلا

خنداں عبدالحمید نام ۱۹۲۷ء میں انتقال ہوا۔

میں ایک ساز ہوں مگر الٹے طریق کا
وہ چھیڑنے لگا تو میں خاموش ہو گیا

ہوا ہے شوق داغ دل کی کنکیا اڑانے کا
بٹا کرتا ہوں ڈورا

رستم علی عالم متبحر جامع معقول و منقول طبیعت مزاح کی طرف مائل تھی اپنا شعر کسی کو نہیں سناتے تھے عبدالباری آسی نے ان کے بعد ان کے دوستوں سے کچھ شعر حاصل کر کے تذکرۂ خندۂ گل رعنا میں شائع کئے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے ۔ ہ

پھلا پیٹ کو وہ پھر رہے ہیں کچھ مہینے سے
ذرا سی گوشت کی بوٹی نے آخر یہ گرانی کی

باقر حسین نام مشک گنج لکھنؤ کے رہنے والے مزاحیہ گوئی میں مشہور تھے ۔ ہ

کیا بتائیں حسرتیں کس کس طرح ہیں جاگزیں
دل کے اوپر دل کے نیچے دل کے اندر دل کے پاس

بے سبب کس واسطے پھیلا مرا پائے نظر
سبزۂ خط عارض جاناں یہ تھا کائی نہ تھی

زیرک پنڈت گو بندرام کشمیری فنون شعریہ سے خوب واقف تھے فارسی کی اچھی استعداد تھی

سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ نظم ونثر دونوں میں ظرافت کے جوہر دکھاتے تھے ان کا ناول حاجی بغلول ظرافت کا شاہکار ہے ظریفانہ شعر بھی خوب کہتے تھے

لاؤ بالی لکھنؤ کے رہنے والے ہر رنگ میں شعر کہتے تھے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

اسٹیشن عدم کو ملے ہم فراق میں
جانی تمہارا ہجر نہیں ریل ہو گیا

سنی میر پرورش علی نام اردو ہندی دونوں میں شعر کہتے تھے ؎

بوسہ اللہ سنی مانگتا ہے ایک دیجئے گا تو دس پائیگا
خواہش نہ قند کی ہے نہ خواہاں شکر کے ہیں
چسکے پڑے ہوئے تری میٹھی نظر کے ہیں

۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں تباہ کن بارش ہوئی۔ سیکڑوں مکان گر گئے ہزاروں بے گھر ہو گئے۔ مولانا صفی نے بھی اس پر ایک نظم کہی ہے لاؤ بالی کہتے ہیں ؎

دریا الٰہی ابر سے کیونکر ابھل پڑا
کیوں ابر بھی نہ اسکے برابر ابھل پڑا
بجلی گری ہے یا کوئی جوہر ابھل پڑا
اس طرح ستمبر کا یہ گوہر ابھل پڑا
سے چادر کی کمر سے ابھل پڑا

ان پڑھ شعراء | بلاقی نام بدتر تخلص ذات کا کبڑیا صرف خربوزے اور آم بیچتا تھا ان کی فصل میں اتنا کما لیتا تھا کہ سال بھر بیٹھ کے کھاتا تھا۔ شاعر و بذلہ سنج و لطیفہ گو و حاضر جواب اور زندہ دل آدمی تھا رؤسا اس کے مشتاق رہتے تھے۔ ہر ایک کے یہاں ڈالی لگا کے لے جاتا تھا نوکر نے اطلاع دی اور فوراً بلا لیا گیا۔ بیٹھتے ہی مچھے دار باتیں شروع کر دیں لوگ سنتے رہتے اور لطف لیتے رہے۔ چلتے وقت جو اس نے مانگا وہ مل گیا۔ رؤسا مول تول کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے اور اس کی پرورش بھی مدنظر رہتی تھی۔ اس طرح اسکی جیب بھر جاتی تھی۔ رؤساء نے منھ لگا رکھا تھا مگر وہ بھی حد ادب سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ مرزا بہادر محمد عباس علی خاں' جگر' کے حضور میں حاضر تھا اور پائیں فرش پر بیٹھا ہوا لطائف و ظرائف بیان کر رہا تھا۔ مرزا بہادر اور اہل صحبت بدتر کی دلچسپ باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے جگر مرحوم کبھی کبھی مسکرا دیتے تھے اور کوئی گرما گرم فقرہ بھی چست کر جاتے تھے جسے سن کر وہ نہایت عجز و انکسار کے ساتھ سلام عرض کرتا

شاعری کیا کرتا ہوں آم بیچنے کا ڈھنگ نکالا ہے۔ خدا کی عنایت اور سرکاروں کی بدولت ان دو فصلوں میں سال بھر کے لئے آسودہ ہو جاتا ہوں" ایک دعائیہ شعر بھی کہا تھا جو ایسے موقعوں پر پڑھا کرتا تھا۔

تم سلامت رہو اے آم کے کھانے والو!
ہم تو دن رات یہی دل سے دعا کرتے ہیں

لچھے دار باتیں شروع کر دیتا تھا اپنے شعر سناتا۔ روساء نے شاعری کے اور لطیفہ گوئی کے شوق میں اس کو منھ لگا رکھا تھا مگر کبھی ادب و تعظیم کی حد سے آگے نہیں بڑھتا تھا بڑا منکسر تھا رئیسوں کے منھ چڑھنے کے زعم میں خود کو نہ بھولا، جہاں جہاں جاتا وہاں کے عملہ سے عجز و مراعات پیش آتا۔ ایک دفعہ کسی نے مزاح کی راہ سے بدتر تخلص اختیار کرنے کا باعث دریافت کیا تو جواب دیا میاں پڑھا نہ لکھا قوم کا کبڑیا بھی کہیں شاعری کر سکتا ہے؟ خدا کی قدرت اور لکھنؤ کی ہوا کا اثر ہے جو کچھ اوٹ پٹانگ بک لیتا ہوں جیسا کلام ویسا تخلص۔ سچ یہ ہے کہ دنیا بھر کے شاعر خوشتر اور بلاقی بدتر ہے" ۔ ایک مرتبہ دہلی گیا وہاں کے لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاعری کا ذکر چلا۔ ان حضرات کے اشعار سنے اپنے کہے ہوئے شعر گوش گزار کئے سب خوش ہوئے۔ تعریفوں سے حوصلہ افزائی فرمائی۔ ایک صاحب ظریف الطبع بھی تشریف فرما تھے اس کو چھیڑنے

کے لئے یہ شعر موزوں کر کے پڑھا:۔

ہیں دلی والے لکھنؤ والوں کے سامنے
ہو جیسے کوئی شیر غزالوں کے سامنے

سر جھکا کر جواب دینے کی فکر کرنے لگا۔ فوراً مصرع ذہن میں آیا سر اٹھا کر دست بستہ التماس کی حضور! میں نے اس شعر کو پہلے بھی سنا ہے لیکن دوسرے مصرع کی ترکیب بدلی ہوئی ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں؟ انھوں نے فرمایا پڑھو اس نے پڑھا:۔

ہیں دلی والے لکھنؤ والوں کے سامنے
ہو جیسے کیچوا کوئی کالوں کے سامنے

اور ہاتھ جوڑ کر گزارش کی: سرکار! آپ لوگ بڑے آدمی ہیں، بندوق سے شیروں بھیڑیوں کا شکار کر سکتے ہیں، شجاعت و دلیری آپ کی میراث ہے۔ میں ٹکے کا کٹر یادہ دل گردہ کہاں سے لاؤں جو ان خونخوار درندوں سے مقابلہ کروں۔ میری زندگی تو کھیتوں میں گزری ہے۔ ان کی مینڈوں پر برسات کی فصل میں اسی قسم کے کیڑے مکوڑوں کو رینگتے دیکھا ہے اور انھیں کو جانتا پہچانتا ہوں۔

بد تو لکھنؤ سے دلی محبت تھی، یہاں کے شعراء کو دنیا بھر کے شاعروں سے بہتر سمجھتا تھا۔ اسے دہلی تو لکھنؤ کے مناقشے و مناظرے بہت زیادہ متاثر کرتے۔ ان موقعوں پر جہاں تک زبان کو یارا ہوتا وہ اپنی عقل و بساط کے موافق اہل لکھنؤ کی فضیلت ثابت کرتا

اور وصف و ثنا بیان کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا۔ اس کے مزاج میں پرلطف شوخیاں تھیں۔ کوئی بات ظرافت سے خالی نہ جاتی۔ اکثر ستم ظریف حضرات بدتر کو چھیڑنے کی نیت سے شعرائے دہلی کا چرچا کرتے ہوئے ان کی فضیلت و فوقیت ثابت کرتے۔ جس سے بگڑے دل بدتر چراغ پا ہو کر الٹی سیدھی تقریر شروع کر دیتا مگر اتنا ضرور تھا کہ اشتعال کے وقت بھی مخاطب کا ادب و حفظ مراتب فروگزاشت نہ کرتا۔ آخر میں ضیق النفس میں مبتلا ہو کے انتقال کیا۔ سارا کلام تلف ہو گیا۔ ان پڑھ شعرا کے تذکرے سے جو شعر ملے ہیں وہ نقل کئے جاتے ہیں۔

تڑپتا ہوں درد جدائی سے کیونکر
اُدھر جانے والے اِدھر دیکھ لینا
جو سچ مچ ہے یہ عشق صادق ہمارا
تو خود ہوگا تم کو اثر دیکھ لینا

مر گیا وہ اسی تمنا میں نہ سنا تم نے حال "بدتر" کا

وصل سے کر دیا انکار یہ کیا تم نے کیا
دیکھو اک بات میں بس ٹوٹ گیا دل میرا

ڈسا اس زلف کی ناگن کا بچتا ہے کہیں بدتر
مرے جینے کی چارہ ساز کیوں تدبیر کرتے ہیں

وفاداری میں کاٹی زندگی اُس کی سزا یہ ہے
ہماری لاش کو بھی کو بکو تشہیر کرتے ہیں

اُس کی آنکھوں میں کب حیا آئی   جان لینے کو یہ ادا آئی
جب سے اُس شوخ کا شباب آیا   دلِ بے تاب کی قضا آئی
نہیں معلوم ہنسنے والوں کو   رونے والوں پہ کیا گزرتی ہے
صاف آتی ہے تیری زلف کی بو   جب اِدھر سے صبا گزرتی ہے

اسلام علی نام ریاضت تخلص آغا حسن۔ امانت کا خانہ زاد لوگ اس کو امانت کا غلام کہتے تھے۔ امانت لکھنؤ کے اساتذہ میں تھے ان کے بہت سے شاگرد تھے ہر وقت شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ اسلام علی موزون طبع تھا۔ گھر کی فضا نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ شعر کہنے لگا مگر کسی کو سناتا نہ۔ ایک دن ہمت کرکے امانت سے کہا کہ میں نے ایک غزل کہی ہے اصلاح کے لئے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ مسکرائے اور کہا پڑھو اس نے غزل پڑھی تو بہت خوش ہوئے اور ریاضت تخلص تجویز کیا اس وقت سے وہ مشاعروں میں غزل پڑھنے لگا۔ تذکرہ سراپا سخن میں ایک غزل اس کی ہے

آئے نظر نہ اس صنم مہ لقا کے ہاتھ
کب کی دعا نہ میں نے خدا سے اٹھا کے ہاتھ

فتح محمد نام حقیر تخلص لکھنؤ کے محلہ ٹکسال میں رہتے تھے۔

کور مادر زاد تھے قرآن حفظ کر لیا تھا۔ کتاب کی تجارت کرتے تھے اور جو شخص کوئی کتاب مانگتا تھا انداز سے نکال کے دیدیتے تھے

علماء کی صحبت میں رہتے مناظرہ کا شوق تھا ہر بات علماء سے پوچھ کے معلوم کر لیتے تھے حافظہ بلا کا تھا۔

کئی کتابیں انھوں نے املا کرائیں۔ ان کا ایک سالہ شریعت عز ا بے نظر کے نام سے چھپا۔ غیر مقلدین سے مناظرہ کرتے تھے۔ انھوں نے علماء کی صحبت میں فارسی اور عربی بھی سیکھ لی تھی یہ مشہور نعت ان ہی کی ہے

ہے ظل خدا سایۂ دامان محمد

اس مخمس کا ہر چوتھا اور پانچواں مصرع فارسی میں ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:۔

ہیں ارض وسما تابع فرمان محمد ہے ظل خدا سایہ دامان محمد
کس طرح نہ مخلوق ہو قربان محمد لولاک کہ نازل شدہ در شان محمد
جز ولیت زا و صاف فراوان محمد

قدرت علی نام امیر تخلص باوضع احباب پرست، زندہ دل قدیم شرفائے لکھنؤ کی وضع میں رہتے تھے۔ مشرو یا گلبدن کا پاجامہ سفید کرتا اس پر انگرکھا پہنتے تھے۔ جاڑوں میں انگرکھا سر ملکے کپڑے کا ہوتا تھا۔ چکن کا کاروبار کرتے تھے۔ مال تجارت لے کے باہر بھی جاتے تھے۔ حافظہ بہت قوی شعرائے ماضی وحال کے اردو فارسی شعر سیکڑوں یاد تھے۔ بدیہہ گوئی میں حیرت انگیز کمال

حاصل تھا۔ کلام سارا تلف ہو گیا۔ ایک شعر ان ٹرہ شعراء کے تذکرے سے نقل کیا جاتا ہے ؎

بتلائیے کہ دل کو مرے کیا کیا حضور
مٹھی میں ہے کہ آپ کی زلفِ رسا میں ہے

خبیر ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہوئے۔ دستکاری آبائی پیشہ تھا حسین آباد لکھنؤ میں رہتے تھے۔
کسی ضرورت سے کانپور گئے وہاں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی یہ اس کا شکار ہو گئے۔ ان کا ایک شعر سنئے ؎

خبیر اک دن اٹھا لائیں گے اپنے دل کے ٹکڑوں کو
کسی دن تو گزر ہوگا زمینِ کوئے قاتل پر

عابد حسین نام عابد تخلص عباس حسین فصاحت کے شاگرد تھے کنی بسولی بناتے تھے اور نخاس میں دو تین آنے کی بکتی تھی یہی ذریعہ معاش تھا۔ اس میں بھی کچھ بچا لیتے تھے۔ شاعری سے عشق تھا مشاعرہ کرتے۔ ان کی غربت اور شوق کو دیکھ کر شعراء اپنی شرکت فرض سمجھتے کسی رئیس کے یہاں سے دری چاندنی مانگ لاتے تھے۔ مٹی کے چراغ ہوتے تھے ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ہجر کی رات کوئی رہ رہ کر / دونوں ہاتھوں سے دل مسلتا ہے
اپنے بیمار کی خبر لینا / اب کوئی دم میں دم نکلتا ہے
دل بیتاب کا خدا حافظ / ناوک چشم یار چلتا ہے
شانہ سنگر لاکھ ہو دل صد چاک / کہیں زلفوں کا خم نکلتا ہے
پھر دل قابو میں دل نہیں آتا / جب مچلتا ہے یوں مچلتا ہے
ماہتابی یہ ہے وہ رخ قمر / ترنم سے چاند چھپتا پھرتا ہے

گلشن بیگم گلشن لکھنؤ کی شریف زادی عفت مآب جوانی میں بیوہ ہوگئیں۔
اُن کا شعر ہے۔

تقدیر کی جفائیں ستم آسماں کے ہیں ۔۔۔ کب تک لڑیں گے اُن سے ہم ایسے کہاں کے ہیں

موسیقی | شرعی طوائف کی لڑکی نجبن عرف نجا ادھا بگن۔ گوہر جان۔ چھوٹی بڑی جدّن چونے والی حیدر سب فن موسیقی میں یکتا تھیں۔ بندادین، کالکا اور بیندا ابھی زندہ تھے۔

چودھرائن کا گھر جہاں اب حنا بلڈنگ ہے موسیقی کا سب سے بڑا مرکز تھا جہاں جہاں سے لوگ لکھنؤ آتے تھے وہیں جا کے اس فن کے کمالات دیکھتے تھے دلفریب تمدن زبان، شاعری سب کا لطف وہاں آتا تھا۔

نقالی | نقالی بھی لکھنؤ کا ایک مخصوص فن ہے یہاں کے بھانڈ ڈرامے کی طرح نقل کرتے تھے اور ایسی ذہانت و فطانت دکھاتے تھے کہ برسوں لوگوں کی تفریح کا سامان بنے رہتے تھے۔

ان بھانڈوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جس کے یہاں نقل کرنے جاتے تھے اس پر کوئی نہ کوئی چوٹ ضرور کرتے تھے اس زمانے میں جان علی بھانڈ بہت مشہور تھا غالباً اسی کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ گڑھیا والے نواب کے یہاں نقل کرنے گیا، ایک بھانڈ دوڑتا ہوا سامنے آیا اور ساتھیوں سے کہا اٹھو اٹھو تعظیم کرو۔ سب نے کہا کس کی تعظیم کریں کوئی ہے بھی کہا نواب صاحب آتے ہیں یہ کہہ کر ہانڈی کھولی تو ایک بڑا سا مینڈھک اچھل کے بیٹھ گیا۔ کہا آپ گڑھیا کے نواب ہیں۔

پیراکی | آغا صاحب پیراکی میں شیدی عنبر کے شاگرد تھے میر مچھلی اور میرک جان کے شاگردوں میں بہت سے موجود تھے اور گومتی میں دن بھر آدمی ہی آدمی نظر آتے

تھے۔ کنارے پر بازار لگ جاتا تھا خاص طور سے کابلی کچالو والوں کی بڑی بکری ہوتی تھی۔ پیرنے والوں کو جب بھوک لگتی دو چار پیسے کی کابلی کچالو کھا کے پیٹ بھر لیتے تھے اور پھر دریا میں اُتر جاتے تھے۔

سپہ گری فن سپہ گری میں بانک کے استاد میر شیر علی تھے جن کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ کشتی میں بڑے سید اور چھوٹے سید نے نام پیدا کیا۔ بڑے سید نہایت گورے چٹے لمبے تڑنگے سڈول بدن خوبصورت اور سجیلے جوان تھے صافہ، لمبا کرتا اور تہمت باندھ کے نکلتے تھے لوگ کام چھوڑ کے دیکھنے لگتے تھے لکڑی، بنوٹ، تلوار، کٹار، بانک پٹا سب ہی جانتے تھے اور سب میں کمال تھا۔ کشتی کے فن میں بھی کامل تھے اور اکھیڑ کے بادشاہ کہے جاتے تھے۔ دیکھنے والے بتاتے تھے کہ وہ اپنے ڈیل ڈول اور حسن صورت کے ساتھ جب خم ٹھونک کے یا علیؑ کا نعرہ مارتے حریف کی طرف بڑھتے تھے تو بڑے بڑے پہلوانوں کے حواس جاتے رہتے تھے اور پہلی اکھیڑ میں وہ ہوا پر نظر آتا تھا اور ان کے بھائی چھوٹے سید کشتی کے فن میں کمال رکھتے تھے۔

خطاطی کا فن لکھنؤ کی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی فن ہر زمانہ میں ایجاد ہوتا رہا اس زمانے میں چھاپے خانے کثرت سے قائم ہوئے اس زمانے میں خطاطی نے کافی عروج کیا۔ کامل خطاط اور ماہر نستعلیق پیدا ہوئے منشی جعفر حسین اس زمانے کے مشہور خطاط تھے۔ منشی ظہور احمد نے معکوس نویسی ایجاد کی کاپی کے بجائے پتھر پر الٹا لکھ دیتے تھے۔ نوک پلک اور حسن خط میں سیدھی کتابت سے کسی طرح کم نہ ہوتا تھا اس کا بڑا رواج ہوا اور ہمارے زمانہ تک لکھنؤ میں خوشنویسی کا فن زندہ تھا اور کہیں کا کاتب الٹا نہیں لکھ سکتا تھا۔

چھاپے خانوں کی کثرت اور کاتبوں کے کمال نے لکھنؤ کو کتابت وطباعت کا مرکز بنا دیا ایسی اچھی کتابیں دنیا بھر میں کہیں نہیں چھپتی تھیں۔ اس زمانے کی چھپی ہوئی کتابیں کتب خانوں میں موجود ہیں جن میں ہمارے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے

میرن جالیے | میرن جالیے کا جال بنانے میں کوئی جواب نہ تھا۔ ہزاروں دستاویزیں جعلی بنا کے مقدمات میں داخل کر کے مقدمے جتوا دیئے تمام وکلاء سے وابستہ تھے آخر میں پکڑے گئے۔ تلاشی میں تہ خانے کے اندر سے چوہے بلیاں اور دیگیں پلی ہوئی ملیں نئے کاغذوں کو دیمک لگا کے پرانا بناتے تھے۔ پرانی دستاویزوں سے چوہے کا پیشاب لگا کر حرف اڑاتے تھے اس کی جگہ نئے الفاظ لکھتے تھے۔ خط پہچانا نہیں جا سکتا تھا بلیاں اس لئے پلی تھیں کہ چوہے کو چینی کی پلیٹ میں بٹھا کر اسی طرح بلی کو اس کے سامنے وہ ڈرکے مارے پیشاب کر دیتا تھا۔ اس طرح چوہے کا پیشاب حاصل کرتے تھے

قیصر حسین داستان گو:۔ یہ لکھنؤ کے آخری داستان گو تھے جن کا کمال دور دور مشہور تھا اور اونچی اور پائیدار آواز سے داستان کہتے تھے۔ ۹۰ سال کے قریب عمر پائی آخری وقت تک اسی دم خم سے داستان کہتے تھے۔

ایک ایسا باکمال نائی تھا جس کی تراش سے تین دن تک کھونٹیاں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

ھدایت اللہ خاں ھُدا علم نجوم میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے۔

شاہ میر خاں کارمالی اور دعا تعویذ میں جواب نہ تھا۔

سجاد حسین۔ سادے کار دوہری زہ کی انگوٹھیاں بنانے میں کامل تھے اور سونے و چاندی کے پتروں پر فرضی اور اصلی تصویریں اس نوک پلک سے ابھارتے تھے کہ لوگ حیران ہو جاتے تھے۔ انگلینڈ بلائے گئے تھے اور بغیر خاکہ بنائے ہوئے

تصویر بنا کے لوگوں کو حیران کر دیا۔

ڈراما اس زمانہ میں ڈرامے کو بہت ترقی ہوئی۔ اکثر مثنویوں کے قصّہ کا ڈرامہ تیار کیا گیا ان میں زہر عشق کا ڈرامہ بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ مولوی عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں :-

"لکھنؤ میں شروع شروع ڈرامے کا رواج ہوا تو کسی نے زہر عشق کا قصّہ اسٹیج پر دکھایا پرانے لوگوں سے یہ روایت سننے میں آئی ہے کہ گناہگار کنواری لڑکی کا جنازہ اٹھنا اور اس کے پیچھے اعزہ اور والدین کا ماتم کرتے ہوئے چلنا اور پچھاڑیں کھانا جب دکھایا گیا تو تماشا گاہ ایک بزم عزا بن گئی۔ لکھنؤ کی نزاکت قیامت خیز واقعیت کی نقل کا بھی تحمل نہ کر سکی، ہچکیوں اور سسکیوں کا تار بندھ گیا۔ بعض کو غش آ گیا ایک آدھ نے شاید خودکشی کی ٹھان لی اس پر تماشہ بھی ممنوع ہو گیا اور کتاب کی اشاعت عرصہ تک بند رہی (مقالات عبدالماجد ۱۵۹)

اخبار اس زمانہ میں لکھنؤ اخبارات کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ ہندوستان میں کسی شہر سے اتنے اخبار نہیں نکلتے تھے۔ نیا سال دس پانچ اخبار اپنے ساتھ لاتا۔

۱۸۷۷ء میں منشی نوروز علی شیدا نے مزاحیہ اخبار انڈین پنچ نکالا۔

۱۸۸۰ء میں ذخیرہ اشرف حاجی محمد اشرف نقوی کی ادارت میں۔

〃 ریاض الاخبار مولوی محمد یوسف

〃 تبیان الاخبار مولوی محمد علی

۱۸۸۲ء روزنامچہ عبدالبصیر حضور بلگرامی

〃 ستیارہ اودھ محمد حسین اغلب

۱۸۸۲ء	شوخ اودھ	احمد حسین	
//	مہر ظرافت (مزاحیہ)	رام سہائے تمنا	
//	اخبار الاخبار		
//	پیام یار	منشی نثار حسین نگار	
//	امامیہ اخبار	سید عباد علی مہتمم عابد علی رضوی	
۱۸۸۳ء	سلطان الظرفا	ڈاکٹر اسحاق خاں	
//	لکھنؤ پنچ	عاشق لکھنوی	
//	فیض سخن	عباس حسین ہوش	
//	ہندوستانی	لالہ بھگوانداس	
//	اتالیق ہند	منشی محمد علی خاں	
//	جام جہاں نما	سری کرشن قیصر	
//	رعنا	عاشق حسین عاشق	
۱۸۸۴ء	بے نظیر	پنڈت شیونا تھ سنگھ	
//	جونس گزٹ	سری کرشن چند قیصر	
//	مرقع نگار	عاشق حسین عاشق۔ سب ایڈیٹر مرتضیٰ حسین عاشق	
//	قومی کایستھ نگم او مابان	دیبی پرشاد	
//	جامع الاخلاق	سید باسط حسین	
//	رفیق نسواں	عیسائی مشنری کی طرف سے	پادری ٹی کریون
//	تحفہ عشاق		

۱۸۸۴ء	نگم اومایان	لالہ شمبھو ناتھ
"	الحشر	مرزا محمد ہادی
"	محشر	عبدالباسط محشر
"	انتخاب	سخاوت علی موج
۱۸۸۵ء	اختر اودھ	سید عاشق علی عاشق سب ایڈیٹر منشی عبدالواحد
"	رہنما	منشی محمد احمد قمر
"	قیامت	خواجہ عاشق علی خواجہ وزیر
"	دامن گلچیں	محمد احمد قمر مینائی
"	خنجر عشق	
"	آزاد	منشی احمد علی شوق
"	ہردل عزیز	سری کرشن قیصر
"	درد دل	مہتمم حسین علی خاں
۱۸۸۶ء	نغمۂ بہار	مہدی حسن عقیل۔ مالک۔ یعقوب علی نصرت
"	سحر سامری	منشی شنکر دیال فرحت
"	صحیفہ نامی	خواجہ احمد حسن
۱۸۸۷ء	دلگداز	عبدالحلیم شرر
"	جوبلی پیپر	سید عزیز حسن
"	ادیب	ہدایت رسول قمری
"	بہار ہند (مزاحیہ)	محمد مرتضیٰ عاشق
۱۸۸۸ء	وکیل قومی	مرزا عبداللہ حسرتی

١٨٨٦ء	حامی اسلام	مہتمم منشی تیغ بہادر
"	اختر ہند	اختر الدولہ حاجی محمد اشرف
"	گزٹ	خواجہ سید حسن خاں
١٨٨٩ء	انتخاب خورشید	
١٨٩١ء	گلچیں	مہتمم محمد عسکری وسیم
١٨٩٢ء	ادیب	
١٨٩٤ء	انڈین ریفارم	رام جی داس بھارگوا
"		مرزا عباس قزلباش
١٨٩٦ء	خدنگ نظر	نوبت رائے نظر
"	زندہ دل	محمد مرزا موج

اس دور کا عظیم کارنامہ نظم اخبار پندرہ روزہ ہے اس کے ایڈیٹر منشی دوارکا پرشاد افق مددگار منشی رام سہائے تمنا تھے۔ اس اخبار کے بارہ صفحے تھے آٹھ نظم اور چار نثر کے۔ یہ ہند کا پہلا اخبار ہے جو نظم میں شائع ہوا اور حیرت کی نظر سے دیکھا گیا اس کے اشعار کی برجستگی اور بندش کی چستی اہل لکھنؤ کی جدت، ذہانت اور شاعرانہ کمال کا شاہکار ہے۔ سلطان الاخبار بنگلور نے فروری ١٨٨٩ء میں اس پر یہ منصفانہ تبصرہ کیا ہے۔

بکچھ عرصہ سے ہندوستان کا اکلوتا اخبار دفتر مطبع میں آتا ہے۔ ہم نے اس اخبار کو تنقید کی نظر سے دیکھا اور اس کے منظومہ مضامین کو نکتہ چینی کے خیال سے پڑھا ہمیں خوشی ہوئی کہ باوجود اس خیال کے ہم نے اخبار کو ہر طرح سے عمدہ پایا نظم میں فصاحت کے ساتھ شاعرانہ

لطافتیں ہیں ۔ "نظم اخبار" کے کلام سے مفقود ہے خبروں کو موتیوں کے سلک میں ایسا پرو دیا ہے گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے کہیں مسدس کہیں رباعیات اور کہیں غزلیات کی دھوم ہے۔ ہر ایک شعر میں زمانہ کی حالت اور نیچرل مضامین کا ہجوم ہے ایڈیٹر نے اپنی کے جوہر دکھائے ہیں کہ برجستہ کہنا پڑتا ہے کہ شعر گوئی اس کا نام ہے۔

منشی دوارکا پرشاد افق نے ہندیوں پر ثابت کر دیا کہ ابھی ہند کی خاک میں وہ نور ہے کہ جس طرف متوجہ ہو وہ کام دکھائے کہ اہل سے بن نہ پڑے گا۔

آگرہ اخبار نے ۵ فروری ۱۹۰۰ء کے شمارے میں اس پر تبصرہ بھی نظم کیا جس کا آخری بند یہ ہے

ہیں تمنا و افق زمزمہ پیرا اسکے　　ایسا اخبار نہ دیکھا نہ سنے یہ نغمے
مشق اول کے ورق ہیں کہ سخن کے چربے　　حق تعالیٰ نظر بد سے بچائے رکھے

کونپلیں پھوٹی ہیں نخل سمن اردو میں
پھول پھیلے ہوئے دیکھو چمن اردو میں

پہلے پرچہ کا پہلا صفحہ جس میں ایڈیٹوریل ہے ملاحظہ کیجئے۔

مہینے میں دو بار پانچویں اور بیسویں کو شائع ہوتا ہے

NAZM AKHBAR

نظم اخبار جلد ۲

ہے شکر اس خالق عالی صنعت کا   مصنف ہے جو بند شش جہت کا
اشاعت نظم کی فرمائی جس نے   ردیف ہر دمہ چمکائی جس نے
دکھائیں خوبیاں فکر متیں کی   غزل تصنیف کی دنیا و دیں کی
کہا خمسہ جہاں میں انس و جن کا   کیا دیواں مرتب رات دن کا
رقم [illegible] ی دین و ایمان   بیان نظم بید و نثر قرآں
کہے قطعہ چہار انفاس تن کا   عناصر اور اخلاطِ بدن کا
بلاغت نظم پر دیں میں دکھائی   فصاحت نثر نسریں میں دکھائی
رباعی لکھی اطراف جہاں کی   کہی بیت ابروئے رفتے
دو جہاں کا   کہا مصرع ہلال آسماں کا
اس کا ایسا فیض علم و فن ہے   ریاضِ دہر گلزار سخن ہے
چکوریں شاعر شیریں زباں ہیں   عنادل طوطی ہندوستان ہیں
غزل گو ہر جوان بوستاں ہے   ہر اک سوسن کا پھول اہل زباں ہے
زبان دانی کا ہے قمری کو غرہ   ہے صاف اہل چمن کا روزمرہ
حنا ہے بوستاں اہل قلم ہے   صبا گویا نسیم تیغ دم ہے

ہے شعر آب موجوں کی زبان پر — لب جو پر ہے مصراع صنوبر
بہارِ نظم ہر جانب عیاں ہے — زیادہ بوستاں سے بوستاں ہے
مسلسل ہے وہ نثر سنبلستان — صفت میں جس کے عاری گلستان
دکھاتی ہے ہر اک شے نظم کی شان — گل صد برگ نظروں میں ہے دیوان
ہر اک پتا نہال بوستاں کا — ہے گلدستہ کلامِ شاعراں کا
بکھانی لے اگر چھیڑی کہاں کی — ضرورت طولِ گیسو ہے بتاں کی
پڑ دے اخبارِ نظم کی دھوم — دکھا دے جلوۂ اخبارِ منظوم
مہینے میں ہو جوشِ نظم دوبار — رہے ماہ دو ہفتہ جس میں اخبار
ہر اک انداز کے مضموں ہوں اس میں — مطالب نثر کے موزوں ہوں اس میں
ذہانت کوئی باریکی نہ چھوڑے — قلم جودت ہر اک مضموں میں توڑے
جو غافل جو محوِ خوابِ آرام — تو یہ پانی کے چھینٹے کا کرے کام
سخن سنجی میں ہو ضرب المثل یہ — بنے زیبِ مضموں کو کنول یہ
قمر ہو یہ کتابِ نخلِ بد کو — ہو پانی آتشِ جہل و حسد کو
عروسِ نظم کو بجائے افشاں — مسی و سرمہ و گلگوں نہ زباں
بنے ہر گلستانِ سخن پھول — ہو گوشِ شعر گوئی کو کرن پھول
خبر کیوا سطے یہ تار ہو جائے — گلوئے علم و فن کا ہار ہو جائے
بنے یہ مخبرِ حالاتِ عالم — دوائر سب ہوں اس کے تابع جم
رہے پہنے یہ فردوسی کا جامہ — بیان جنگ میں ہو شاہ نامہ
ہو خوش اس کی روش سے کل زمانہ — نہ دکھنے دے یہ تسبیحوں کا دانہ
ظرافت کا نیا انداز دکھلائے — مذاقِ فکر کا اعجاز دکھلائے

رعایا کا دل و جاں سے ہو غمخوار　　رہے ہر دم مطیع حکم سرکار
ضمیمہ میں بہار نثر دکھلائے　　جمالِ گلعذار نثر دکھلائے
غرض اخبار کے جو جو ہوں منصب　　وہ سب اس میں ہوں بطرز انسب
نہ دے زلفِ سخن کو لے افق طول　　تراجمہ ہو بہ طرز معقول
بڑھا تاریخ سے توقیرِ اشعار　　رقم کر سب بدل منظوم اخبار

اب اس کی ایک خبر سُنیئے۔ لاہور میں دارو طوائف بڑی خوبصورت تھی۔ میراں بخش سے اس کا تعلق تھا، کچھ دن کے بعد اس نے کسی اور سے دل لگایا میراں بخش سے ملنا چھوڑ دیا۔ یہ گھات میں رہے ایک دن موقع پاکے ناک کاٹ لی مقدمہ عدالت میں پہنچا یہ خبر کو نظم اخبار شائع کرتا ہے۔

یہاں کی ہے طوائف ایک مشہور　　پرستاں کی پری فردوس کی حور
حسین و نازک و چالاک ہے وہ　　جہاں کی رنڈیوں کی ناک ہے وہ
زمانے میں ہے دارو نام اس کا　　تھا یوسف بندۂ بے دام اس کا
مزاجِ حسن ہفت افلاک پر تھا　　پئے عشاق غصہ ناک پر تھا
ہے سب عشاق کو جاں بخش اس کا　　تھا یارِ غار میراں بخش اس کا
محبت میں بہم شیر و شکر تھے　　گل و بلبل پئے اہل نظر تھے
وفاداری کا دم بھرتے تھے دونوں　　نہ تھا کھٹکا مزے کرتے تھے دونوں
فلک نے تفرقہ کی رہ نکالی　　گرہ دارو کے نازک دل میں ڈالی
ہو دارو کو شوقِ بے وفائی　　نظر سے صورتِ عاشق گرائی
بگاڑی ایک عرصے کی بنی بات　　نئے دھوکے کی چالوں نے کیا مات
سرِ عاشق پہ مارا خنجرِ جور　　جو اپنے لئے ڈھونڈھا کوئی اور

ہوئی میراں بخش کی سمجھی قدامت　　جفا سے بند کی صاحب سلامت
ہوا بیتاب میرا بخش کا دل　　جگر سینہ میں تڑپا شکل بسمل
رکھی دار وغے اٹھتے بیٹھتے ناک　　کسی دن پا کے موقع کاٹ لی ناک

مٹا اسباب خود بینی کا دم میں　　گئی چہرے کی مرغوبی عدم میں
گئی حب بے رخی سے اس طرح ناک　　نہ تاب آئی ہوئی دار وغضبناک
رخِ مطلب پہ کی غازے کی مالش　　عدالت چڑھ کے کی عاشق پہ نالش

جہاں کو اس خبر سے آگہی ہے
بس اب پیشی پہ پیشی ہو رہی ہے

اخبار کی تاریخ میں اس اخبار کی حیرت کی نظر سے دیکھا گیا۔ یہ دنیا میں پہلا اور آخری اخبار ہوتا اگر اس کو دیکھ کے ایران سے اشرف الدین نسیم نے نسیم شمال نہ نکالا ہوتا۔ سنہ ۱۹۱۳ء افق کا اور ۱۹۲۳ء میں نسیم کا انتقال ہوا۔ اولیت کا شرف لکھنؤ ہی کو حاصل رہا۔

لکھنؤ

۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۷ء تک

اودھ میں انگریزی حکومت کو چالیس برس ہو چکے تھے انگریزی تعلیم وتہذیب آندھی کی طرح پھیلتی جا رہی تھی بہت سے کالج اور کلب کھل گئے تھے مگر پرانے لکھنؤ میں (امین آباد سے مفتی گنج تک) پرانی تہذیب اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ موجود تھی۔

انگریزی حکومت کا سینتالیس سالہ دور اپنی موت پر ختم ہوا جس میں لکھنؤ کے علوم وفنون کے چار طبقے پیدا ہوئے جنھیں ہم ترتیب وار پیش کرتے ہیں۔

پہلا طبقہ

علماء فرنگی محل میں مولانا عبدالباری صاحب جن کا ذکر خیر اس کتاب میں کئی جگہ آچکا ہے اس دور کی عظیم شخصیت تھے۔ اعلیٰ درجہ کے فلسفی و منطقی عظیم سیاست داں شعلہ بیان مقرر اپنی خاندانی سیرت کے حامل مرنجان ہر فرقہ کے دوست اور محبوب تھے ان کے صاحبزادے مولانا جمال میاں تحریک پاکستان کے سرگرم حامی کراچی میں مقیم ہیں۔ مولانا عین القضاۃ صاحب فرنگی محلی نہ تھے مگر وہاں قیام کی وجہ سے فرنگی محلی لکھے جاتے تھے۔ معقولات میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ منطق وفلسفہ کی کتابوں پر ان کے گرانقدر حاشیے ہیں صوفی صافی بھی تھے سخاوت میں بھی مشہور تھے۔ سائل کو بے مانگے دیتے تھے

درس و تدریس میں بھی مشغول رہتے تھے۔ اپنے والد کے قائم کیے ہوئے مدرسہ فرقانیہ کے منتظم اور اخراجات کے کفیل تھے۔ مذہبی منافشات سے دامن بچائے رہتے تھے

خاندان اجتہاد میں مولانا آقا حسن صاحب ندوۃ العلماء ۱۲۸۲ھ میں پیدا ہوئے۔ خاندانی علماء سے تحصیل علم کی فلسفہ منطق اور ریاضیات میں امتیاز خاص رکھتے تھے اپنے ماموں اور خسر جناب میر آغا صاحب کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ قوم کی بیداری میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ ان کے عم میں کوئی نہ کر سکا۔ پورے ہندوستان میں بیداری کی لہر دوڑا دی۔ شیعہ کانفرنس شیعہ یتیم خانہ شیعہ عربی کالج شیعہ انگریزی کالج۔ عماد الاسلام پریس قائم کیا۔ غفرانمآب کی کتاب عماد الاسلام جو اُس وقت تک نہیں چھپی تھی اس کی تین جلدیں چھپوائیں۔ پہلی جلد کا اردو میں ترجمہ کیا۔ الناطق اخبار نکالا ان کے قائم کئے ہوئے ادارے آج تک موجود ہیں۔ شیعہ کانفرنس کا اجلاس ہر سال کسی شہر میں ہوتا ہے جس میں قومی امور طے پاتے ہیں ۱۳۴۸ھ میں انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادے مولانا کلب حسین صاحب مجتہد ۱۳۴۸ھ میں اُن کے جانشین ہوئے

مولانا ابن حسن صاحب شمس العلماء ۱۲۹۱ھ میں پیدا ہوئے۔ خاندانی علماء سے تحصیل علوم کی ابتداء عمر میں حدیث خوانی میں عظیم شہرت حاصل کی۔ خدا نے حسن صورت کے ساتھ حسن صوت کی نعمت بھی عطا کی تھی۔ جب وہ لحن داؤدی میں قصیدہ پڑھتے تھے تو در و دیوار وجد میں آکر جھومنے لگتے تھے کچھ دنوں کے بعد عراق گئے وہاں خیریۂ اودھ کے مقسم مقرر ہوئے پانچ

برس کے بعد لکھنؤ واپس آئے اور آخر عمر تک درس و تدریس میں مشغول رہے رسائل وغیرہ پر گرانقدر حاشیے لکھے ١٣٦٦ھ میں انتقال ہوا۔ ایک صاحبزادے مولانا قائم مہدی صاحب یادگار چھوڑے۔

مولانا محمد باقر صاحب باقر العلوم ١٢٨٥ھ میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تکمیل علوم کرکے عراق گئے وہاں پانچ برس درس خارج میں شریک رہ کے ہندوستان واپس آئے۔ سلطان المدارس کے صدر مدرس مقرر ہوئے اپنی تدریسی قابلیت تقدس، نیک نفسی اور کم سخنی سے عظیم شہرت حاصل کی ١٣٤٦ھ میں کربلائے معلی زیارت کو گئے وہاں نمونیہ میں انتقال ہوا ان کے دو صاحبزادے مولانا سید محمد اور مولانا سید علی قابل ذکر ہیں —

ایک کتاب اسوال رغاب عن مسئلہ الحجاب جس کی عبارت ادیبانہ ہے۔

مولانا محمد ہادی صاحب ہادی الملۃ ١٢٩١ھ میں پیدا ہوئے جناب ابو صاحب کے صاحبزادے اپنے والد سے تحصیل علم کرکے عراق گئے وہاں سے فارغ ہو کے ہندوستان آئے اور سلطان المدارس میں مدرس دوم مقرر ہوئے۔ درس و تدریس میں عمر گزار دی۔ پیشانی پر سجدہ کا نشان کثرت عبادت کا نشان تھا۔ متقی و پرہیزگار تھے ١٣٥٧ھ میں انتقال ہوا۔ تین صاحبزادے یادگار چھوڑے۔ مولانا سید احمد صاحب مولانا سید حسن صاحب۔ مولانا سید حسین صاحب

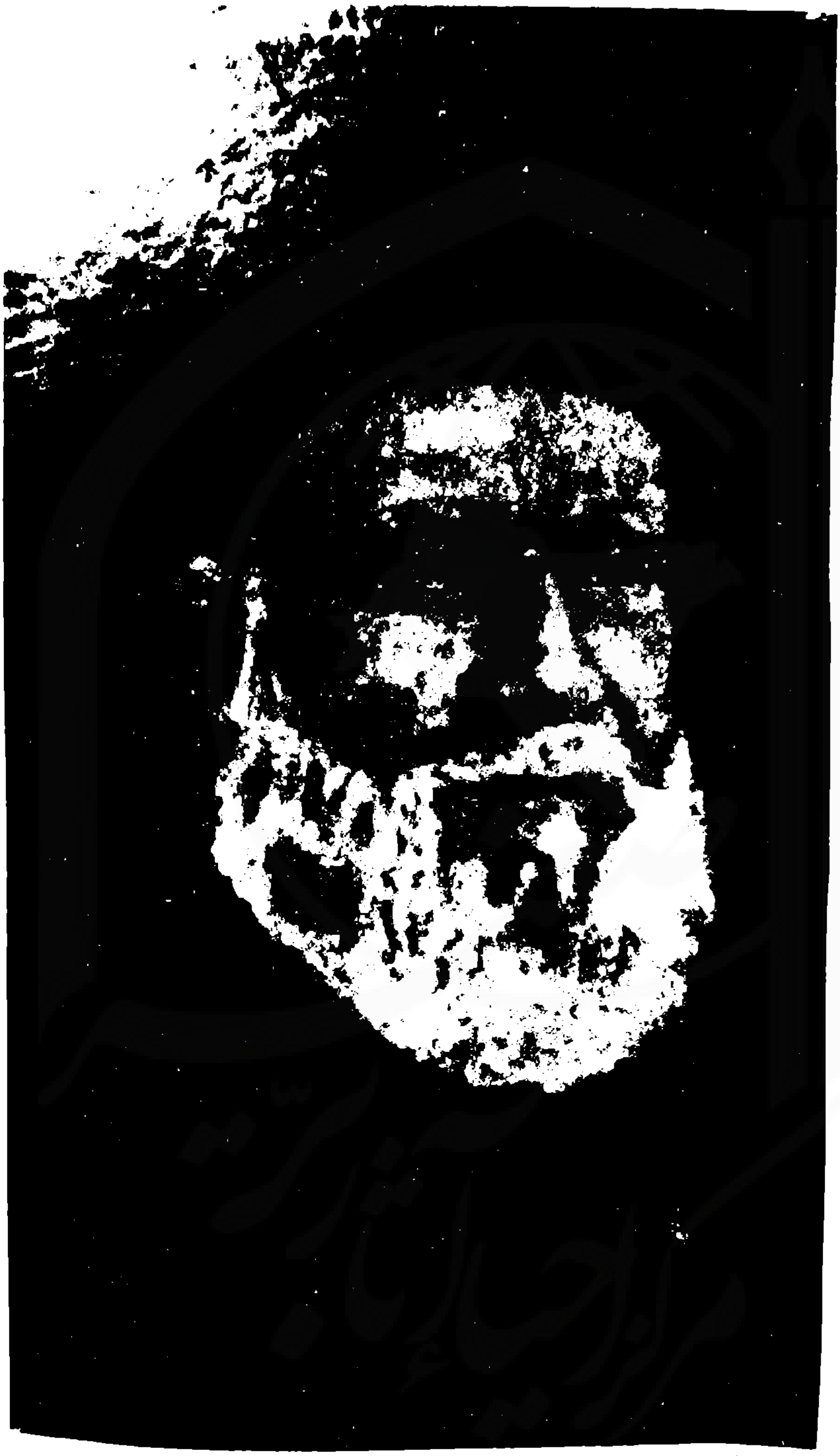

اعلم العلماء مولانا سبط حسین صاحب قبلہ مجتہد العصر
۱۴؍شعبان ۱۲۸۵ھ میں پیدا ہوئے۔ اُسی سال

سلطان العلماء کا انتقال ہوا۔ مفتی میر عباس صاحب نے تاریخ کہی

قبلہ وکعبہ چو برخواست ازیں دارفنا ایکہ گرد رہ او افسر تارک باشد

پسر دختر فرزند وے آمد بوجود ایکہ در مولد او ماہ چو صحنک باشد

سال تاریخ وے از چرخ کہن پرسیدم

گفت ۔ نو سبط حسین ست مبارک باشد
۱۲۵۸

اپنے ماموں جناب بچھن صاحب اور جناب علی صاحب سے معقولات اور اپنے رشتہ کے نانا جناب تاج العلماء سے فقہ و اصول کا درس لیتے تھے اس زمانہ میں تاج العلماء نے منجزات مریض پر ایک رسالہ لکھا ان کو بھی دیا دیا۔ انھوں نے اسکی رد لکھ کے ان کی خدمت میں پیش کی جس کو وہ دیکھ کے بہت خوش ہوئے اور اجازہ اجتہاد مرحمت فرمایا اسکے بعد نظر الی الاجنبیہ یہ رسالہ لکھا جس کی بڑی شہرت ہوئی اسکے علاوہ کئی کتابیں لکھیں جو میر عابد علی صاحب مالک مطبع اثنا عشری کو دیدیں وہ اس کو چھاپتے رہے حکیم محمد جی صاحب سے طب پڑھی اور ان کے مطب میں بیٹھے۔ مولانا محمد مہدی صاحب ادیب کے مقاصدوں میں عربی قصیدے پڑھتے تھے۔

سفر عراق ہندوستان کی تعلیم سے فارغ ہو کے عراق گئے وہاں ان کے پھوپھی زاد بھائی مولانا کلب باقر صاحب مجتہد ہجرت کر کے مقیم تھے وہ ان کو سرکار مرزا کی خدمت میں سامرہ لے گئے اور ان کا تعارف کرایا۔ انھوں نے چند سوالات کر کے درس خارج میں شرکت کی اجازت دیدی۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے سرکار مرزا سے عرض کیا کہ میں آپ سے رسائل پڑھنا چاہتا ہوں۔

فرمایا میں سطحی درس ترک کرچکا ہوں مگر آپ کی ذہانت اور خاندانی اعزاز کی بنا پر آپ کی خواہش رد نہیں کرسکتا۔ سہ پہر کو مرافعہ کے بعد آیا کیجئے اس طرح درس خارج کے ساتھ درس سطحی بھی شروع ہوگیا۔

سرکار مرزا دمہ کے مریض تھے جب دورہ پڑتا تھا تو مہینہ مہینہ بھر درس موقوف رہتا تھا اس زمانہ میں وہ نجف اشرف جاکے مرزا حبیب اللہ رشتی کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے انتقال کے بعد وہ کربلائے معلیٰ چلے آئے اور آغائے سہرستانی کے درس میں شریک ہوئے ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ صاحب رسائل کے معاصر کے شاگرد ہیں اور سرکار مرزا و مرزا حبیب اللہ رشتی کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے شبہ محصورہ کی بحث میں سرکار مرزا کو حجیت ظن کی بحث میں مرزا حبیب اللہ رشتی کو خاموش کردیا تھا

لہ عراق میں دو طرح کا درس ہوتا ہے ایک سطحی دوسرا خارجی سطحی درس کتابی ہوتا ہے جب طالب علم تمام کتابیں پڑھ لیتا ہے اور کوئی درسی کتاب باقی نہیں رہتی اس وقت درس خارج میں شریک ہوتا ہے جو زبانی ہوتا ہے موضوع معین ہوتا ہے استاد اس پر تقریر کرتا ہے اور یہ طلبا و جو جید علماء ہوتے ہیں اس پر اعتراض کرتے ہیں بحث و مباحثہ ہوتا ہے اور درس دینے والا ایسا متبحر ہوتا ہے کہ سب کو خاموش کردیتا ہے جو اتنی لیاقت نہیں رکھتا وہ درس خارج دینے کی جرأت نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے ہر زمانہ میں دو تین سے زیادہ درس خارج دینے والے نہیں رہے اور اکثر ایک ہی ہوا۔

جب ان کے درس میں شریک ہوئے تو معلوم ہوا کہ انکی شہرت ان کے علم کے مطابق ہے۔ پانچ برس ان کے درس میں شریک رہ کے دورہ مکمل کیا انھوں نے اجازہ دیا جس میں مجتہد الکامل لکھا اور درس خارج دینے کی فرمائش کی مگر انھوں نے ان کے احترام میں درس خارج نہیں شروع کیا۔ سطحی درس دیتے رہے ان کے انتقال کے بعد درس خارج دینا شروع کیا جس میں جید علماء شریک ہوتے تھے اور اپنے معاصرین سے برابر کا مقابلہ کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں خیریّہ اودھ کے مقسم مقرر ہوئے جس میں وہ طلباء کو وظائف دیتے تھے۔

ایک واقعہ | مولانا مفتی احمد علی صاحب اس زمانہ میں ان سے پڑھتے تھے اور وہ تیس روپیہ ماہوار ان کو وظیفہ دیتے تھے وہ ناقل تھے کہ ایک دن ہم اور مولانا محمد داؤد صاحب زنگی پوری جناب کے ساتھ صحن امام حسینؑ میں پہنچے وہاں جناب اخوند ملا محمد کاظم خراسانی اور کئی آدمی بیٹھے تھے ہم لوگ بھی وہاں جاکے بیٹھ گئے۔ کسی نے جناب اخوند سے رسائل کی ایک عبارت کا مطلب پوچھا انھوں نے مطلب بیان کیا۔ جناب نے کہا آپ مطلب نہیں سمجھے یہ کہہ کے مطلب بتانا چاہا مگر ان کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ گھورتے ہوئے اٹھ کے چلے گئے۔ یہ بات وہاں کے دستور کے خلاف تھی۔ کوئی شخص کسی سے بھی کسی وقت بحث و مباحثہ سے گریز نہیں کرتا مگر نہیں سمجھے کو انھوں نے چھوٹا منھ بڑی بات سمجھا۔

کیونکہ سن میں بھی تفاوت تھا اور شہرت و مرجعیت میں بھی اس کے ایک مدت
کے بعد جب انھوں نے کفایہ لکھی جو جناب کے پاس بھیجی انھوں نے لکھا
کہ آپ نے میرے قول کی تصدیق کردی کہ آپ رسائل نہیں آپ فرماتے ہیں کہ
میں نے رسائل سرکار مرزا سے پڑھی ہے اور انھوں نے صاحب رسائل سے
صاحب رسائل کا مطلب سرکار مرزا کے واسطے سے آپ تک پہنچ گیا۔ اب
آپ نے دیکھیں ویمکن کہہ کے احتمالات پیدا کئے ہیں اور ایک ایک عبارت
کا کئی کئی مطلب بیان کیا ہے یہ کیوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو آپ
نے سرکار مرزا سے چند سبق پڑھے یا اس زمانہ میں آپ میں اتنی استعداد
نہ تھی جو آپ رسائل سمجھ سکتے۔ ذاتی مطالعہ سے رسائل سمجھنے کی کوشش
کی جس سے احتمالات پیدا ہوئے یا اپنی موشگافیاں ظاہر کرنے کے لئے زبردستی
احتمالات پیدا کئے۔ عراق میں ان کو بڑی عظمت حاصل ہوئی جس کا شہرہ
ہندوستان تک پہنچا کہ دفعتاً ہندوستان آنے کا خیال پیدا ہوا وہ
تمام چیزیں چھوڑ کر ۱۳۲۱ھ میں ہندوستان آگئے اور آتے ہی معطل ہو گئے
نہ بحث مباحثہ نہ درس خارج۔ مالی حالت بھی خراب ہو گئی۔ لوگوں نے
پڑھنے کی خواہش کی رسائل پڑھانا شروع کی اس کی یہ حالت تھی کہ طالبعلم
نے عبارت پڑھی ترجمہ کیا اور اس کے مطالب کی تشریح شروع ہوئی ان نے اسکے
رموز و غوامض بیان کئے قطرہ سمندر ہو گیا دو تین دن کے بعد یا طالب علم نے
آنا چھوڑ دیا یا خود اس نے کہہ دیا کہ کل سے آپ زحمت نہ کیجئے گا
جانشینی ۱۳۲۵ھ میں جناب علن صاحب کا انتقال ہوا بزرگ خاندان

جناب سید علی اکبر صاحب خلف سلطان العلماء نے علماء و روساء شہر کو اپنے یہاں بلا کے فرمایا کہ میں نے بچھن صاحب کا جانشین ملن صاحب کو بنایا تھا اب ملن صاحب کا جانشین سبط حسین صاحب کو بناتا ہوں سب نے پسندیدگی کا اظہار کیا اس طرح غفرانمآب کی جانشینی کا سلسلہ ان تک پہنچا جناب ملن صاحب کے صاحبزادوں نے جناب غفرانمآب کی املاک پر قبضہ دینے سے انکار کا مقدمہ دائر ہوا جناب باقر العلوم اور جناب سید ہادی صاحب نے اعلمیت کی گواہی دی اور جناب سید علی اکبر صاحب اور جناب سید سخاوت حسین صاحب نے بحیثیت بزرگ خاندان عملدرآمد قدیم کی گواہی دی اور کہا کہ سبط حسین صاحب علم و فضل میں غفرانمآب کی جانشینی کے مستحق ہیں مقدمہ چلا جس کی روئداد طولانی اور ناخوشگوار ہے اس وجہ سے ہم اس کو چھوڑتے ہیں

آغائے آجری سے مباحثہ اسی زمانہ میں آغا شیخ غلام حسین آجری عراق سے آئے اور مولانا ناصر حسین صاحب کے مہمان ہوئے۔ علمائے لکھنؤ سے دید باز دید ہوئی۔ عراق میں دستور ہے کہ جب دو عالم یکجا ہوتے ہیں تو کوئی علمی بحث چھڑ جاتی ہے کسی اور طرح کی بات چیت شان علم کے خلاف سمجھتے ہیں یہاں بھی جس سے ملاقات ہوئی اس سے علمی گفتگو شروع کر دی مگر گفتگو سے بددل ہوئے اور ان کے متعلق اچھی رائے قائم نہیں کی۔ مولانا ابوالحسن عرف ملن صاحب جو اس وقت جناب سے پڑھتے تھے انھوں نے کہا آپ سے آغا کی ملاقات نہیں ہوئی فرمایا وہ مجھ سے ملنے نہیں آئے میں بھی باز دید کو نہیں گیا۔ انھوں نے کہا کہ کل وہ میرے یہاں آئیں گے آپ بھی تشریف

لے آئیے یہیں ملاقات ہو جائے فرمایا اچھا۔ دوسرے دن ان کے آنے سے
پہلے مولانا کاظم حسین صاحب اور مولانا ناظم حسین صاحب اور حکیم محمد عباس
صاحب کے ہمراہ جناب وہاں پہنچ گئے کچھ دیر کے بعد آغا شیخ غلام حسین صاحب
مولانا شبیر حسن صاحب کے ساتھ تشریف لائے اور بیٹھتے بیٹھتے اصول فقہ
کی چند اصطلاحیں صرف کردیں جناب نے فرمایا یہ اصطلاحیں آپ نے بے محل
صرف کیں فرمایا میں نے مطائبتہً کہی ہیں تحقیقاً نہیں اس کے بعد تربوز سے
ضیافت ہوئی اس کے بعد مولانا شبیر حسن صاحب نے جناب آغا سے
کہا کہ جو مسئلہ آپ نے جناب نجم الملتہ سے پوچھا تھا وہ جناب سے بھی پوچھئے
انھوں نے وہ مسئلہ اور جناب نجم الملتہ کا جواب بتایا جناب نے کہا جواب
انھوں نے صحیح دیا اس پر انھوں نے تقریر کی جناب نے اس کا جواب دیا
پھر اس کا جواب جناب آغا نے دیا اس کا جواب پھر انھوں نے دیا جناب آغا
نے فرمایا کہ میں نے ہندوانہ بہت کھا لیا ہے نفس تنگی کر رہا ہے اس کو کل پر
رکھئے دوسرے دن مولانا ابوالحسن صاحب مولانا کاظم حسین صاحب مولانا
ناظم صاحب اور حکیم محمد عباس صاحب سرسوی مولانا ناصر حسین صاحب کے
کتبخانہ کجھوہ پہنچے جہاں جناب آغا کا قیام تھا مولانا ناصر حسین صاحب بھی موجود
تھے رسمی سلام و مزاج پرسی کے بعد جناب نے کہا کل کا مسئلہ طے ہو جائے
جواب جناب شیخ کو دینا تھا انھوں نے گفتگو شروع کی جناب نے اس کا جواب
دیا مولانا ناصر حسین صاحب نے فرمایا ایک بات میں کہوں اب بھی مان لیں
اور آپ بھی یہ کہہ کے انھوں نے ایک تقریر کی جناب نے آغا سے کہا اس تقریر

کو آپ اپنی طرف سے قبول کرتے ہیں میں جواب دوں انھوں نے کہا نہیں یہ سمجھتے نہیں اور پھر دونوں میں گفتگو شروع ہوئی۔ مولانا ناصر حسین صاحب نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اس گفتگو میں شریک نہ ہوں اور یہ سمجھتے نہیں سننے کے بعد کچھ کہنے کا محل باقی نہ تھا انھوں نے فرمایا کہ آپ لوگ میرے مہمان ہیں اور میں اس بحث کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں دیتا بحث ختم ہوگئی اور طے پایا کہ جناب شیخ کل جناب کے یہاں آئیں گے یہ بحث مشہور ہوگئی تھی دوسرے دن مدرسہ ناظمہ اور سلطان المدارس کے اساتذہ اور شہر کے بعض اہل علم جناب کے مکان پر پہنچ گئے۔ آغا مہدی صاحب نے تاریخ لکھنؤ میں لکھا ہے کہ جاوید صاحب اور عارف صاحب ایسے شعراء بھی آئے اور لوگوں کو جگہ نہ ملی وہ چھت پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد جناب آغا مولانا شبیر حسن کے ساتھ تشریف لائے اور گفتگو شروع ہوئی جناب آغا کے جواب کے بعد انھوں نے ان کا موقف تسلیم کر لیا شربت سے ان کی ضیافت ہوئی مجمع برخواست ہوا۔[1] جناب شیخ مولانا شبیر حسن صاحب کے ساتھ رخصت ہو گئے جاوید صاحب نے برجستہ ایک رباعی پڑھی ہے

ہے علم میں سب سے بڑھ کے پایہ ان کا یکتائی کا دعویٰ کرے سایہ ان کا
اب مجتہد عصر ہیں یہ سبط حسین آنکھیں کھلیں دیکھا جو اجالا ان کا

---

[1] اس واقعہ کو تفصیل سے سید العلماء مولانا علی نقی صاحب نے پیام اسلام میں شائع کیا ہے۔

جناب نے کہا اچھا ہوا آپ نے اُن کے سامنے نہیں پڑھی اس میں طعن کا پہلو ہے۔

میر عابد علی صاحب مالک مطبع اثنا عشری بھی موجود تھے نے کہا یہ تقریریں لکھ کے آپ دیدیں تو میں چھاپ دوں۔

فرمایا اس میں فتح وشکست کی نمائش ہے یہ ہندوستانی ذہنیت ہے ہم اس کے عادی ہیں اگر ہماری دلیلوں کو کسی نے مان لیا تو ہم اس کو اپنی فتح نہیں سمجھتے ہیں نہ ماننے والا اپنی شکست سمجھتا ہے۔ علمی بحث کسی نہ کسی منزل پر پہنچتی ہے اس میں فتح وشکست کا کوئی خیال نہیں اگر اس کو فتح وشکست سمجھا جائے تو علمی بحث کا دروازہ بند ہو جائے جیسا کہ ہندوستان میں ہے مگر اس بحث کا اثر یہاں بہت ہوا اور لوگوں نے ان کی یکتائی تسلیم کر لی۔

مولانا شبیر حسن صاحب کے صاحبزادے مولانا پروفیسر مظفر حسین صاحب ظفر کراچی میں ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میرے والد جناب کو اصول کا گاما کہتے تھے۔ تمام علماء اس واقعہ سے متاثر ہوئے۔ اگر انکے سامنے کسی نے کسی اور عالم سے مسئلہ پوچھا تو وہ ان کے سامنے جواب نہیں دیتے تھے

ایک واقعہ مولانا ناصر حسین صاحب کنتور جارہے تھے اور مولانا سبط حسین صاحب بلرام پور چھوٹی لائن کے اسٹیشن پر دونوں حضرات میں ملاقات ہوئی ایک ڈبہ میں دونوں حضرات بیٹھے مولوی سجاد حسین پیش نماز بہرائچ بھی اس ڈبہ میں آکے بیٹھ گئے جب ریل چلی تو انھوں نے مولانا ناصر حسین صاحب سے پوچھا کہ میں نے فلاں کتاب میں پڑھا ہے کہ بیضہ مرغ مثل بیضہ کو سفید

حرام است سمجھ میں نہیں آیا فرمایا جناب سے پوچھیئے۔ جناب نے کہا سوال آپ سے ہے جواب میں کیوں دوں فرمایا نہیں اور اصرار کیا جناب نے کہا کبھی کوئی مرغ بھی انڈا دیتا ہے وہ انڈا حرام ہے بیضہ گوسفند سے اُس کے انثیین مراد ہیں۔ عبارت میں ایک صنعت پیدا کی ہے۔ میں بھی اس سفر میں ساتھ تھا۔

حسین آباد کی مہندی کا فتویٰ وقف حسین آباد کا چیرمین ڈپٹی کمشنر اور سکریٹری کوئی پینشنر ڈپٹی کلکٹر ہوتا ہے۔ علماء میں سے ایک عالم نے ڈپٹی کمشنر سے جاکے کہا کہ حسین آباد کی منہدی جو اٹھائی جاتی ہے وہ حرام ہے وقف کا روپیہ فعل حرام پر نہیں خرچ ہونا چاہیئے لہٰذا اس کو بند کردیجئے۔ ابوابراہیم صاحب فیض آبادی سکریٹری تھے ڈپٹی کمشنر نے ان سے کہا کہ آپکے مولانا نے کہاہے کہ یہ منہدی کا اٹھانا حرام ہے لہٰذا اس کو بند کردیجئے انھیں یہ بات بہت ناگوار ہوئی انھوں نے ڈپٹی کمشنر سے کہا کہ وہی ایک عالم نہیں ہیں اور علماء بھی ہیں سب سے پوچھا جائے جو مجاری کی رائے ہو اس پر عمل کیا جائے بات معقول تھی اس نے مان لی۔ انھوں نے ایک استفتا تیار کیا کہ حسین آباد کی منہدی کا اٹھایا جانا جائز ہے یا حرام مولانا آقا حسن صاحب مولانا نجم الحسن صاحب، مولانا سید محمد باقر صاحب نے لکھا کہ حسین آباد کی منہدی کا اٹھایا جانا جائز ہے۔ جناب نے لکھا کہ حسین آباد کی منہدی کا اٹھایا جانا واجب ہے۔ ہر طرف مضحکہ ہونے لگا۔ بعض علماء نے ابوابراہیم سے اس کی نقل مانگی کہ چھپوا کے تقسیم کریں گے انھوں نے یہ کہہ کے نقل دینے

سے انکار کیا کہ ہمارا کام نکل گیا کسی کو ذلیل کرنا ہمیں منظور نہیں۔ مولانا ابوالحسن صاحب اور علامہ ہندی صاحب نے آکر کہا کہ بھائی صاحب یہ آپ نے کیا لکھ دیا شہر میں منھ دکھلانے کے قابل نہیں رہے فرمایا اپنا فتویٰ نہیں بدلوں گا لوگوں کا خیال بدل دوں گا ابوابراہیم صاحب سے کہیئے کہ وہ فتویٰ لیکے آجائیں علامہ ہندی صاحب ان کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کو فتویٰ لیکے بلایا ہے انھوں نے کہا کیا واپس لینا چاہتے ہیں؟ وہ فتویٰ لیکے آئے اور کہا فتویٰ حاضر ہے فرمایا واپس لینا مقصود نہیں اس پر آپ یہ لکھیئے کہ آپ نے اس کو واجب لکھا ہے اس کی دلیل کیا ہے۔ انھوں نے لکھ دیا اس کے نیچے لکھا کہ محمد علی شاہ سلطان العلماء کے مقلد تھے وہ عروسی قاسم کی روایت پڑھنا جائز سمجھتے تھے جیسا کہ انھوں نے صوفی محمد سمیع کے جواب میں لکھا ہے بادشاہ نے اپنے مجتہد کے فتوے کی بنا پر مہندی اٹھانا اپنے وقف نامے میں لکھا ہے اب اس کا بند کرنا منشاء واقف کے خلاف اور اس کا اٹھانا واجب ہے ابوابراہیم صاحب بہت خوش ہوئے اور اس کو چھپوا کے تقسیم کیا لوگوں کو حیرت ہوگئی بعض نے کہا کہ بہت دور کی کوڑی لائے۔

جونپور میں قیام اہل جونپور ماہ صیام میں ہر سال کسی عالم کو لکھنؤ سے بلواتے تھے اس سال جناب کو بلایا عید کے بعد بھی ان کو روک لیا وہاں شعر و سخن کا چرچا تھا۔ قصیدہ خوانی کی محفلیں ہوتی تھیں۔

شعر گوئی شعر کہہ کے لوگوں کو دینا شروع کیا لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ یہ جناب کا کلام ہے۔ عربی کلام کی طرح یہ اردو کلام بھی محفوظ نہیں رہا چند شعر

یاد ہیں جو حاضر خدمت ہیں - ایک قصیدہ میں امیرالمومنین اور امام حسینؑ کا تقابل نظم کیا ہے جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

امیرالمومنین فرماتے ہیں میں وہ ہوں جس کی ولادت خانۂ کعبہ میں ہوئی امام حسن عرض کرتے ہیں ؎

اگر بیت الولادۃ آپ کا مسجود عالم ہے
تو میری ماں کا دامن آپ کے سجدے کے قابل ہے

ایک قصیدے میں امام حسین کا تقابل امیرالمومنین سے نظم کیا ہے

امیرالمومنین فرماتے ہیں میں وہ ہوں جس نے دوش پیغمبر پر قدم رکھے امام حسین عرض کرتے ہیں ؎

سوارِ دوشِ پیغمبر ہیں بابا آپ بھی لیکن
مرے ہاتھوں میں باگیں بن گئیں زلفیں پیمبر کی

ایک قصیدہ میں جناب امیر اور جناب سیدہ کا تقابل ہے اس کا آخری شعر یہ ہے ؎

منظور نظر حق کو از بسکہ تقابل تھا دونوں کی زمانہ پر یوں فرض مودت کی
گر نام جپا جائے دنیا میں یداللہ کا تسبیح پڑھی جائے خاتون قیامت کی

ایک مرثیہ میں جناب سیدہ اور امیرالمومنین کا تقابل ہے
ایک بند کے چار مصرعے یاد رہ گئے

شرف جہاد کا مخصوص گر علی سے تھا مباہلہ میں علی سے بڑھی رہیں زہرا
اس امتحاں میں خدا کے ولی کے آگے تھیں رسول پاک کے پیچھے علی کے آگے تھیں

غزل بھی خوب کہتے تھے ایک غزل کے تین شعر ملاحظہ کیجیے ؂

بت بھی اس حسن خداساز پہ قرباں ہوجائے کافر آنکھوں کو جو دیکھے تو مسلماں ہوجائے

بائے وہ زلف کو بکھرا کے کسی کا کہنا جس کو ہونا ہو پریشاں وہ پریشاں ہوجائے

جان لینا کہ ہوا ختم اسیر گیسو آپ سے آپ اگر زلف پریشاں ہوجائے

مرزا محمد ہادی صاحب عزیز اس شعر کو شعرائے حال کی فکر سے باہر کہتے تھے۔

دل تھام لیا اپنا صحرا میں بگولوں نے اف کہہ کے جو گرد اٹھی بیٹھی ہوئی تربت کی

مرزا صاحب کا یہ قول ان کی زندگی میں دُرِ منظوم میں شائع ہو چکا ہے

مولانا سبط حسن صاحب اس شعر پر وجد کرتے تھے فرماتے تھے۔

دوسرا مصرع الہامی ہے ؂

یہ کون انگڑائیاں لے لے کے گزرا طور سے موسیٰ

بقدرِ قوت دیدار دیکھا اور نہ پہچانا

خدا نے ان کو عجب ذوق سلیم اور شاعرانہ صلاحیت دی تھی۔ کسی نے

میر نفیس کا یہ مصرع پڑھا ؂

زیادہ چلنے میں بلبل ہوا سے لڑتی ہے

فرمایا۔ تنک مزاج ہے بلبل ہوا سے لڑتی ہے

کسی نے میر نفیس کا یہ مصرع پڑھا ؂

منہ پہ تلواروں کے جاتا ہے بھڑکنا کیسا

فرمایا۔ آتشِ حرب کا خوگر ہے بھڑکنا کیسا

غالب کا شعر ہے

نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر   جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

فرمایا کیسی الجھی ہوئی زبان ہے شعر یوں پڑھیئے

نکالے جاتے نہ جنت سے حضرت آدم   عوض گیہوں کے جو کھاتے یہ بیسنی روٹی

حکیم آشفتہ صاحب نے ایک قطعہ سنایا جس کے آخری دو مصرعے یہ تھے

اے مالک کائنات جلوے برسیں   اس بزم کو بزم نور کرنا ہے مجھے

فرمایا دوسرے مصرع کو یوں بدل دو

اے ابر کرم فلک سے جلوے برسیں

مطب | جونپور میں انکے ایک عقیدت مند دوست کی لڑکی کو نمونیہ ہوگیا۔ حالت خراب سن کے عیادت کو گئے وہاں معالج حکیم صاحب بھی موجود تھے انھوں نے نسخہ لکھا جناب نے اس سے اختلاف کیا مریضہ کے والد نے کہا حضور خود ہی نسخہ لکھدیں انھوں نے نسخہ لکھدیا پہلی خوراک میں افاقہ ہوا اور وہ جلد صحت یاب ہوگئیں اس کا شہرہ ہوا مریض آنے لگے بارہ بجے دن تک فرصت نہیں ملتی تھی ایسے معرکے کے علاج کیے کہ اطباء حیران ہوگئے

سید الساجدین اور زین العابدین دو بھائی پولیس میں تھے۔ سید الساجدین کی بیوی کو ایک حکیم صاحب نے مسہل دیا شام تک دست نہیں رکے۔ چارپائی کاٹ دی گئی۔ بدن اطراف ہوگیا دانت بیٹھ گئے آنکھیں دھنس گئیں حکیم صاحب کو بلایا انھوں نے کہا ایک وقت دعا کا بھی آتا ہے چادر اڑھادی گئی رونا پیٹنا پڑ گیا۔ زین العابدین نے کہا جناب کو دکھا دیا جائے۔

سید الساجدین نے کہا جناب حضرت عیسیٰ ہیں مگر زین العابدین نے
آ کے حال بیان کیا نبض دیکھی پوچھا میٹھے نیبو مل جائیں گے کہا نہیں فرمایا
سنترے لے آئیے اس کا پانی نکلوا کے کہا تھوڑا تھوڑا ان کے منھ میں ڈالئے
اس طرح کہ اچھو نہ ہونے پائے۔ سید الساجدین یہ سُن کے جل گئے کہ مردے
کو سنترے کا پانی پلانے کو کہتے ہیں کہا حضور خود ہی پلا دیں کہا ایک چاقو
اور دو چمچے لائیے۔ چاقو دانت میں ڈال کے اسے ابھاریئے جب ذرا کھل
جائیں تو چمچے کی ڈنڈی اور ابھاریئے پھر تھوڑا تھوڑا پانی ڈالئے اس عمل سے
چند منٹ کے بعد جبڑے ڈھیلے ہو گئے نصف گلاس پیا تھا کہ آنکھیں کھول دیں
اور دوپٹے سے منھ ڈھانک لیا۔ فرمایا سب پانی پلا دیجئے یہ کہہ کے چلے گئے
دو گھنٹے کے بعد آدمی آیا کہ حضور مردہ کھانا مانگ رہا ہے کہا شلہ مونگ
دیجئے کہا کوئی دوا فرمایا کسی دوا کی ضرورت نہیں۔

انھیں حکیم صاحب نے اسی محلہ میں ایک آدمی کو مسہل دیا دوپہر تک
اس کو کوئی دست نہیں آیا وہ ہزیان بکنے اور کپڑے پھاڑنے لگا۔ سید الساجدین
نے کہا جناب سے جل کے کہو آدمی نے آ کے حالت بیان کی فرمایا سنترے
کا پانی ایک گلاس پلا دو۔ پلاتے ہی دست آنے لگے شام کو آدمی آیا کہ
دست رک نہیں رہے ہیں فرمایا سنترے کا پانی ایک گلاس پلا دو۔ پلاتے
ہی دست بند ہو گئے۔ ایک حکیم صاحب جو ان سے قانون پڑھتے تھے کہنے
لگے سرکار سمجھ میں نہیں آیا کہ سنترے پر کوئی روحانی عمل کیا گیا۔ فرمایا
جب سخت مسہل دیا جائے گا تو یا طبیعت مغلوب ہو جائے گی اور اتنے

دست آئینگے کہ مریض بے حال ہو جائے گا اس وقت طبیعت کو تقویت و فرحت پہنچانے کی ضرورت ہے یا سخت مسہل سے طبیعت غالب ہو جائیگی اور کوئی دست نہیں آئے گا۔ اور ہزیان بکنے لگے گا اس وقت طبیعت کو قوت ایسی چیزوں سے پہنچانا چاہیئے

ڈپٹی غلام مہدی صاحب ان کے معتقد خاص تھے ایک تقریب میں ان کے یہاں سلطانپور گئے ہوئے تھے۔ ایک پنشنر ڈپٹی کلکٹر تھے رات کو ان کو بدہضمی ہوئی صبح کو ڈاکٹر کو دکھایا اس نے دوا دی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ایک حکیم صاحب کے علاج سے قے اور پیٹ کا درد جاتا رہا مگر دست بند نہیں ہوئے شام کو بے حال ہو گئے۔ ڈپٹی صاحب سے کہلوایا کہ اگر ہو سکے تو جناب کو لے آؤ وہ لے کے آئے نبض دیکھی کہا پلاؤ کھایئے گا وہ سمجھے کہ طعن کر رہے ہیں کہ پلاؤ بہت کھا لیا اس سے بدہضمی ہو گئی کہا حضور میں نے پلاؤ نہیں کھایا۔ فرمایا اس وقت پلاؤ کھایئے گا۔ کہا بدہضمی میں فرمایا ہاں کہا اگر حضور حکم دیں کہا پلاؤ پکوا کے کھایئے۔ یہی آپ کی دوا ہے۔ انھوں نے پلاؤ کھایا دست بند ہو گئے۔ وہاں ایک حکیم صاحب بہت قابل تھے جناب آقا حسن صاحب سے معقولات اور حکیم مرزا محمد مہدی صاحب سے طب پڑھی تھی کہنے لگے سرکار بدہضمی کی دوا پلاؤ آج ہی معلوم ہوئی فرمایا میں نے نبض دیکھی تو مادہ فاسد خارج ہو چکا تھا نبض خالی تھی۔ ضعف طبیعت سے اسہال ہو رہا تھا اس وقت ایسی غذا کی ضرورت تھی جو قابض و مقوی ہو وہ پلاؤ سے بہتر کوئی غذا نہ تھی۔

جونپور میں ایک صاحب کی بیوی کو مرض ہو گیا وہ ان کو لائے نبض و قارورہ دیکھا کہا یہ حاملہ ہیں بعد وضع حمل خود اچھی ہو جائیں گی کسی دوا کی ضرورت نہیں انھوں نے دائی کو دکھایا اس نے کہا حمل نہیں ہے وہ لکھنؤ لے گئے حکیم منے آغا صاحب کو دکھایا اور تشخیص بیان کی انھوں نے کہا وہ عالم ہیں روحانی قوت سے حمل تجویز کیا ہے۔ کوئی نبض ایسی نہیں جس سے حمل کا پتہ چل سکے مہینہ بھر ان کا علاج کیا کوئی فائدہ نہیں ہوا اور اطبا کو دکھایا تین مہینے تک مختلف طبیبوں کا علاج کرتے رہے تین مہینہ کے بعد کچھ پیٹ بڑھا ہوا دکھائی دیا۔ دائی کو دکھایا اس نے کہا تین مہینے کا بچہ پیٹ میں وہاں اطبا کو گالیاں دیتے ہوئے جونپور آئے۔ جناب سے کہا یہ کیسے حکیم ہیں جو کہتے ہیں کہ نبض سے حمل کا پتہ نہیں چل سکتا فرمایا وہ صحیح کہتے ہیں آپ نے قارورہ نہ دکھایا ہوگا۔ ایک حکیم بیٹھے تھے انھوں نے کہا سرکار قارورہ سے حمل کا پتہ کیسے چلتا ہے۔ فرمایا حاملہ کے قارورہ میں ابر داشراق ہوتا ہے اور اسی سے میں نے حمل تجویز کیا تھا۔

سیرت | ان کی سیرت کا ایک اہم عنصر اپنی ذات سے بے اعتنائی تھی جو زندگی بھر ان کے ساتھ رہی۔ جب تک واجد علی شاہ زندہ رہے۔ وہ علماء کو خطاب دیتے رہے ان کے بعد علماء نے اپنا خطاب خود تجویز کرنا شروع کیا۔ جناب نے کوئی خطاب تجویز نہیں کیا۔ سرکار مرزا ان کو آقائے ہندی کہتے تھے۔ سامرہ میں یہی خطاب تھا درس خارج دینے اور مقسم ہونے کے بعد لوگ ان کو جناب آقا کہنے لگے۔ ہندوستان آئے تو لوگ انھیں کربلائی کہنے اور لکھنے لگے۔ جونپور میں قیام کی وجہ سے جونپوری کہے جانے لگے۔ اس میں کسی میں ان کی خواہش

کو دخل نہ تھا جس نے جو کہا بات منظور کر لیا۔

کبھی انھوں نے نہیں سوچا کہ مجھے اپنی شہرت کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ عراق میں جو ان کو علمی وقار حاصل ہوا تھا اور جو معاشی حالت بہتر ہو گئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ وہیں رہتے اور اسی طرح اکابر علمی مقابلہ کرتے رہتے ایک دن وہ آتا کہ عراق کے سب سے بڑے فقیہ تسلیم کر لیئے جاتے مگر وہ دفعتاً لکھنؤ آ گئے۔ یہاں بحث مباحثہ سب ختم ہو گیا۔ مالی حالت بھی خراب ہو گئی۔

اہل جونپور نے بلایا وہاں چلے گئے مطب و معالجہ اور شعر و شاعری میں مشغول ہو گئے وہاں سے پھر لکھنؤ چلے آئے یہاں نہ مطب رہا نہ شعر و شاعری درس و تدریس اور مباحثہ مگر وہ بھی دو تین آدمیوں میں محدود رہا کیونکہ ان کی تقریر کو سمجھنا ہر شخص کے لئے ممکن نہ تھا۔

اہل بنارس لے گئے وہاں مطب اور شعر و شاعری رہی پھر لکھنؤ آ گئے اس طرح کوئی ایک مستقر نہ رہا یہ ان کے علم کا زور تھا کہ تنکے کا منھ چیر دو تو یہی کہے گا کہ علم میں سب سے بہتر تھے مگر خود اس کا کوئی فائدہ نہ اٹھایا لکھنؤ میں درس و تدریس سے ان کی علمی برتری ثابت ہوتی رہی۔ آخر عمر میں جونپور میں قیام کر لیا تھا وہیں ۱۳۲۷ھ میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ رات کو تین بجے دل کا دورہ پڑا نو بجے دن کو ایک لڑکے کو پکارا اس کے سہارے سے اٹھ کے کھڑے ہوئے اور زیارت پڑھی پھر لیٹ گئے اور کچھ پڑھنے لگے۔ دفعتاً ہاتھ بڑھا کے لڑکے کے پنجوں میں پنجے ڈال کے زور کیا اور روح پرواز کر گئی۔

شاد ذاکر حسین صاحب جوان کے مخلص دوست اور عقیدتمند تھے
ان کو اطلاع ہوئی وہ چند آدمیوں کو لیکے آئے اور جنازہ دریا پر لے گئے
سارے شہر میں خبر پھیل گئی لوگ دریا پر جمع ہوگئے۔ مولانا کلب حسین
کو نماز پڑھانے کے لئے تار دیا گیا۔ غسل وکفن کے بعد جنازہ مفتی محلہ لایا گیا
مفتی محمد باقر صاحب رئیس جونپور جن کی کمر خمیدہ ہوگئی تھی لکڑی ٹیکتے ہوئے آئے
اور جنازہ کا پایہ پکڑ کے چیخ مار مار کے رونے لگے۔ خواتین بھی ڈیوڑھی تک
آگئیں اور ہائے جناب ہائے جناب کا شور اندر سے باہر تک بلند ہوگیا۔
جنازہ جامع مسجد میں رکھا گیا دن بھر اور رات بھر قرآن خوانی
ہوتی رہی صبح کو اطراف میں بھی خبر پہنچ گئی۔ ہر طرف سے لوگ آکے اپنے عزیزوں
کے یہاں ٹھہر گئے۔ بنارس اور غازی پور سے لوگ آئے صبح کو مولانا
کلب حسین صاحب تشریف لائے پہلے مجلس ہوئی جس میں انھوں نے
فرمایا خاندان اجتہاد میں پانچ عالم سب سے بڑے ہوئے جناب غفرانمآب
سلطان العلماء ان کے بھائی سید العلماء اور تاج العلماء و پانچویں
یہ تھے انکی ذات پر خمسۂ نجبہ کا خاتمہ ہوگیا اس پر بڑی رقت ہوئی
اس عرصہ میں سارا شہر جمع ہوگیا نماز کے بعد جنازہ اٹھا آگے آگے
مولانا کلب حسین صاحب سر برہنہ تھے آدمیوں کا سمندر لہریں مار رہا
تھا۔ بعض لوگوں نے کہا جنازہ ہمارے گھر میں جائے گا عورتیں بے چین
ہیں گھروں میں جنازہ گیا صحن میں عورتوں نے جنازہ کے گرد حلقہ باندھ کے
ماتم کیا پھر جنازہ اٹھایا گیا تو ڈیوڑھی تک عورتوں نے ہائے جناب ہائے جناب

کہہ کے جنازہ کو رخصت کیا۔

کچھ لوگوں نے کہا اس ٹھاٹھ سے آج تک کسی کا جنازہ نہیں اٹھا۔ لوگوں نے کہا آج تک اس ٹھاٹ کا کوئی آدمی نہیں مرا۔ دس بجے دن کو جنازہ اٹھا بعد مغرب کے سپرد خاک ہوئے۔

شاہ ذاکر حسین صاحب نے مولانا کلب حسین صاحب کو سوم کی مجلس کے لئے روک لیا۔ سوم کی مجلس میں شہر اور اطراف شہر کے لوگوں کے علاوہ علمائے اہل سنت میں مولانا محمد قاسم بھی شریک ہوئے اس کے بعد شہر میں مجلسیں شروع ہوئیں اتنی مجلسیں اور اتنے قرآن شاید ہی کسی کے لئے پڑھے گئے ہوں۔ چالیس دن تک مجلسیں ہوتی رہیں۔

چالیسویں کی دو مجلسیں مقرر ہوئیں۔ پہلی مجلس دس بجے دن کو مولانا کلب حسین صاحب نے اور دوسری مجلس دو بجے دن کو مولانا علی نقی صاحب نے پڑھی جس میں شہر اور بیرونجات کے لوگ اور علمائے اہل سنت شریک ہوئے اس کے بعد بھی مجلسیں ہوتی رہیں۔ آخری مجلس مہتروں نے کی جس کو مولانا علی نقی صاحب نے پڑھا۔ دلیسہ کی دس مجلسیں ہوتی رہیں جن میں تمام علمائے خاندان اجتہاد پڑھتے رہے۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے مگر مجلسیں کم ہو گئیں کیونکہ بہت سے علمائے خاندان اجتہاد رحلت فرما گئے۔

تصانیف

عراق جانے سے پہلے جو کتابیں لکھی تھیں وہ میر عابد علی صاحب

مالک مطبع اثنا عشری کو دیئے گئے تھے جو اس کو چھاپتے رہے ان میں ایک کتاب عرائس الافکار نظرالی الاجنبیہ لکھی جو اس موضوع پر حرف آخر سمجھی جاتی ہے یہ چھپ چکی ہے۔

شباب علم کے زمانہ میں ان کی کتاب مشارع الشوارع تھی جس پر ان کو ناز تھا یہ کتاب سید العلماء مولانا علی نقی صاحب قبلہ کو مقدمہ لکھنے کے لئے دی ان کے یہاں آگ لگا دی گئی اور وہ کتاب خاکستر ہو گئی۔ ان کے حالات جناب سید العلماء نے تفصیل سے پیام اسلام میں لکھے ہیں جو ایک کتاب کے بقدر تھے اس کو میں نے جمع کیا تھا اور کتابی صورت میں چھپوانے کا ارادہ تھا مگر بدقسمتی سے میرے لڑکے محمد نقی نے وہ سب راستہ میں کہیں گرا دیا۔ مولانا علی نقی صاحب کے یہاں وہ سارا سرمایہ جل گیا اور ان کے تمام آثار مٹ گئے۔

اولاد

ان کی اولاد میں کوئی عالم نہیں ہوا۔ بڑے بیٹے سید جواد صاحب نے بیالیس برس کی عمر میں عراق میں انتقال کیا۔ ایک بیٹے سید حسن یادگار چھوڑے جو تہران میں مسجد غرقانیہا میں امام جمعہ و جماعت تھے۔ ایک حادثہ میں وہ اور ان کے ساتھ کئی اولادیں جاں بحق ہو گئیں اب ان کی اولاد میں کون باقی ہے اس کا علم نہیں۔

دوسرے صاحبزادے مولوی غلام عباس صاحب برست میں پیشنماز تھے وہیں ان کا انتقال ہوا ان کے بیٹے حسن عباس بی اے جونپور میں ہیں

تیسرا میں ننگ خاندان ہوں میرے چار بیٹے تھے بڑے بیٹے محمد مرتضیٰ نے
اس سال انتقال کیا۔ دوسرے بیٹے محمد موسیٰ ایم اے انکم ٹیکس افسر ہیں
تیسرے بیٹے محمد تقی ایم اے ایل ایل بی مجسٹریٹ ہیں۔ چوتھے بیٹے محمد فاخر
دائم المریض ہیں۔ جناب کے چوتھے بیٹے مولوی محمد زمان علم نجوم میں کامل
دستگاہ رکھتے تھے انھوں نے ایک کتاب نجوم السماء لکھی جو چھپ گئی ہے۔
اس علم کے جاننے والے کہتے ہیں کہ کتاب بلند پایہ ہے سنہ میں انتقال
ہوا کوئی اولاد نہ تھی۔

پانچویں بیٹے محمد رضا بی اے اسسٹنٹ مختار کار ہیں ان کے دو
بیٹے حیدر رضا اور صفدر رضا ہیں۔ صفدر رضا بی اے ہیں اور انکم ٹیکس
میں ملازم ہیں ان کے نواسوں میں مولانا احمد محسن صاحب نے درجہ اجتہاد پر فائز ہو کے ان کی مسند کو آباد کیا۔

تلامذہ

عراق میں ان کے تلامذہ بہت تھے جن میں مفتی احمد علی صاحب
کا نام مجھے معلوم ہے۔ لکھنؤ میں مولانا ابوالحسن عرف ... صاحب مولانا
محمد رضی صاحب اور مولانا محمد صادق صاحب فقہ و اصول میں ان کے
ایسے شاگرد تھے جو ان کی تقریر کو سمجھتے تھے ان کے علاوہ حکیم احمد حسن
مولوی سجاد حسین عرف لڈن صاحب بھی شاگردوں میں تھے۔

مولانا کاظم حسین صاحب اور مولانا ناظم صاحب بھی ارشد تلامذہ
میں تھے۔

امام اہل سنت مولوی عبد الشکور صاحب نے بھی ان سے

مسلم الثبوت پڑھی تھی۔

ان کے علاوہ دو دو چار چار سبق کے بے شمار شاگرد تھے

افاضل خاندان اجتہاد

مولانا علی غضنفر صاحب سید علی اکبر صاحب کے فرزند اکبر علوم رسمیہ کی تحصیل خاندانی علماء سے کی نہایت ذکی و ذہین ظریف الطبع اور حاضر جواب تھے۔ عیسائی پادریوں سے مناظرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے ایک ضخیم کتاب رد نصاریٰ شائع ہو چکی ہے شیعہ کانفرنس کے پہلے سکریٹری اور شیعہ یتیم خانہ کے پہلے نگراں تھے یتیموں کو اپنے ہاتھ سے کھلاتے تھے جب تک زندہ رہے یہ خدمت انجام دیتے رہے ۱۳۴۲ھ میں انتقال ہوا کوئی اولاد نہ تھی۔

مولانا سید محمد عرف آغا جون جناب سید حسن صاحب کے فرزند ممتاز العلماء سید تقی صاحب کے پوتے کربلائے معلیٰ میں پیدا ہوئے ان کی کھلائی عجمن تھی وہ انھیں آغا جون کہتی تھی یہی نام ان کا مشہور ہو گیا۔ خاندانی علوم کی تحصیل لکھنؤ میں کی طب بھی پڑھی درس بھی دیتے تھے مطب بھی کرتے تھے اور مجلسیں بھی پڑھتے تھے۔ جب مدرسۃ الواعظین قائم ہوا تو اس کے سکریٹری مقرر ہوئے اور مدتوں نہایت قابلیت سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ آنکھوں میں موتیا ہو گیا ایک ڈاکٹر نے دونوں آنکھوں کا آپریشن ایک ساتھ کر دیا جس سے بصارت جاتی رہی۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے جان بوجھ کے آپریشن خراب کر دیا۔ اس کے بعد گوشہ نشین ہو گئے۔

۱۳۰۹ھ میں انتقال ہوا۔

تصنیفات میں ایک ضخیم مجلد مجلسوں کے مسودات کا چھوڑا ۔ اولاد میں مولانا آغا سید صاحب اکلوتے بیٹے تھے ۔ مولانا سعادت حسین صاحب مولانا ہدایت حسین صاحب کے صاحبزادے عالم دمتقی تھے ان کے بیٹے قیصر حسین صاحب کراچی آگئے تھے ۔

خاندان اجتہاد کے علاوہ اس دور کی عظیم شخصیت مولانا ناصر حسین صاحب تھے ۱۲۸۴ھ میں پیدا ہوئے معقولات اور فقہ و اصول کی تحصیل اپنے والد سے کی ۔ ادبی کتابیں مفتی میر عباس صاحب سے پڑھیں ۔

شاہی مزاج پایا تھا ۔ صبح کو نہایت زرق برق استری کئے ہوئے کپڑے پہن کے لقوے کی وجہ سے منہ پر رومال رکھے ہوئے گھر سے برآمد ہوتے تھے ۔ نخاس کے پُل کے سامنے ایک بالاخانہ پر نشست تھی جہاں چاندنی کے سفید بے شکن فرش کے حاشیہ پر لوگ منتظر بیٹھے ہوتے تھے جناب تشریف فرما ہوتے تھے اگر کسی نے آپس میں بات کی تو فرمایا خاموش رہئیے ۔ کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا تو اس کا جواب دیا ۔ اگر اس نے وضاحت کے لئے کوئی شبہ وارد کیا تو فرمایا میں اس کا عادی نہیں ہوں ۔ اس نے کہا میں نے اسے سمجھنے کے لئے عرض کیا ہے ۔ فرمایا خاموش رہئیے کچھ دیر کی نشست کے بعد فنس میں بیٹھ کے کھجوہ اپنے کتب خانہ گئے وہاں کتب بینی میں مشغول ہو گئے ۔ حافظہ بلا کا تھا جو کتاب دیکھ لی وہ یاد ہو گئی ۔ ان کا دماغ معلومات کا طوفان خیز سمندر تھا ۔ عربی کے قدیم ادب پر جو ان کو قدرت حاصل تھی وہ ہندوستان میں کسی کو نہ تھی ۔ ہر سال تیرہ رجب کو ناظم صاحب کے امام باڑہ میں محفل پڑھتے تھے اس میں ایک نیا خطبہ لکھ کے لاتے تھے جو بہت طولانی ہوتا تھا اس میں قرآن کے کسی سورہ

کی آیتیں ضم ہوتی تھیں اس کے بعد فضائل حضرت علیؑ میں کچھ حدیثیں بیان فرماتے تھے۔

ان کی طبیعت میں شان اور رکھ رکھاؤ تھا۔ کبھی کسی رئیس سے ملنے نہیں گئے۔ اس سے بڑا اثر اور عظمت حاصل ہوئی۔ مسٹن صاحب گورنر ان سے ملنے آیا یہ اتنی غیر معمولی بات تھی جس کی خبر اخباروں نے سارے ہندوستان میں پہنچائی۔ اس نے ان کی عظمت میں چار چاند لگا دیئے کیونکہ گورنر سے گورنمنٹ ہاؤس میں بھی ملنا بڑے بڑے راجاؤں اور نوابوں کے لئے آسان نہ تھا۔ اس کا خود جناب کے گھر آنا ایک حیرت انگیز بات تھی۔

ایک دھچکا: ۱۹۱۸ھ کی جنگ عظیم ختم ہوئی۔ نجف اشرف پر انگریزوں کی گولہ باری سے ہندوستان میں سخت ہیجان پیدا ہوا ہر طرف انگریزوں کے خلاف جلسے ہوئے اور جلوس نکلنے لگے۔ مولانا ناصر حسین صاحب نجف اشرف گئے اور وہاں سے آ کے روضۂ امیرالمومنین پر گولہ باری کی تردید کی۔ اس سے ان کے خلاف سخت ہنگامہ برپا ہوا۔ اور مسٹن صاحب گورنر کا آنا اور شمس العلماء خطاب پانا اسکی تمہید سمجھا گیا ورنہ گورنر کا بے ضرورت آنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور مولوی مہدی حسن صاحب جو مولانا کے بہنوئی تھے ان کی یہ کارگزاری سمجھی گئی کیونکہ اُسی زمانہ میں ان کو مسٹن صاحب نے خان بہادر کا خطاب دلوایا، مولانا کی مخالفت نے اتنا زور پکڑا جب وہ کسی مجلس میں جاتے تھے تو لوگ نازیبا کلمات کہتے ہوئے مجلس سے اٹھ جاتے تھے مگر اقبال کے بلند تھے رفتہ رفتہ لوگ بھولتے گئے اور ان کا وقار بحال ہو گیا۔

۱۳۶۱ھ میں انتقال ہوا حسب وصیت آگرے میں شہید ثالث کے مزار کے احاطہ میں دفن ہوئے ڈاکٹر آفاق حسین صاحب نے اظہار حقیقت میں لکھا ہے جو شہید ثالث کی قبر پر فاتحہ پڑھتا ہے وہ ان کی قبر پر بھی فاتحہ پڑھتا ہے وہاں وہ چھوٹے حضرت کہے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اُن کے تدبر کا نتیجہ تھا اگر وہ لکھنؤ میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہو جاتے تو یہ بات نہ ہوتی۔

———

تصانیف مشہور تھا کہ عبقات کی تصنیف میں مشغول ہیں اور حدیث غدیر کی جلد انہیں کی لکھی ہوئی ہے جو انہوں نے اپنے والد کے نام سے شائع کی ہے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں میں نے یہ لکھ دیا تھا مگر ان کے نواسے نے مجھ سے شکایت کی۔ کہ آپ نے ان کو جھوٹا اور دھوکے باز قرار دیا۔ کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ لکھتے خود اور نام لگا دیتے اپنے والد کا میں نے کہا جو میں نے سنا تھا وہ لکھ دیا۔ کہا سنی سنائی بات کہیں کتاب میں لکھی جاتی ہے۔

مولانا مرتضیٰ حسین صاحب فاضل نے مطلع انوار میں بھی عبقات کی حدیث غدیر والی جلد کو مولانا ناصر حسین صاحب کی تصنیف نہیں قرار دیا ہے کچھ اور کتابیں لکھی ہیں مگر وہ غلط معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ان کی تصنیف کوئی شائع نہیں ہوئی اگر وہ لکھتے تو ضرور چھپواتے کیونکہ وہ مالدار آدمی تھے۔

اولاد اولاد کی طرف سے بد قسمت تھے ان کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد نصیر تھے جن کو انہوں نے بہت چاہا کہ وہ ان کے صحیح جانشین ثابت ہوں۔ نصیر الملۃ خطاب دیا۔ مگر وہ آزاد منش تفریحات کی طرف زیادہ مائل تھے اپنے والد کی زندگی تک تو ذرا دبے رہے ان کے بعد کانگریس میں داخل ہوئے اور اس کے ٹکٹ پر مجلس قانون ساز کے ممبر ہوئے لوگوں نے کہا کہ غیر اسلامی حکومت کی مجلس قانون ساز میں شریک ہونا حرام ہے مگر انہیں ان باتوں کی کب پروا تھی۔ چھوٹے بھائی جن کا خطاب ان کے والد نے سعید الملۃ قرار دیا تھا اپنے والد کی جانشینی کے مدعی ہوئے مگر بڑے بھائی اپنے حالات پر نظر کر کے خاموش رہے۔

ڈاکٹر آفاق حسین صاحب نے اظہار حقیقت میں لکھا ہے کہ انہوں نے والد کی جانشینی کے اعلان کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ میرے والد کے مقلدین میری تقلید نہ کریں۔ اور مسائل شرعیہ پر وہ اس وقت تک دستخط نہیں کرتے تھے جب تک کسی کا جواب اس پر نہیں لکھا ہوتا

ڈاکٹر صاحب نے تو اس بات سے ان کی علمی تہی دامنی ثابت کرنا چاہی مگر اس سے ان کا تقدم ثابت ہوتا ہے۔ اب اس گھر میں کوئی اتنا بھی نہیں جہاں تین پشت تک بلبلیں چہکتی تھیں۔ وہاں اب سناٹا ہے، بقول شاعر ع

چغد نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ع

ہمیں است رسم سرائے کہن

مولانا نجم الحسن صاحب بھی اس دور کی عظیم شخصیت تھے ۱۲۷۹ھ میں پیدا ہوئے ملاذ العلماء جناب بچھن صاحب سے معقولات اور مفتی میر عباس صاحب سے فقہ و اصول کی تحصیل کی۔ اور ان کی صاحبزادی سے شادی ہوئی۔ فلسفہ، منطق، ہیئت، فقہ اصول، کلام مناظرہ، حدیث، تفسیر اور ادب پر اتنا عبور تھا کہ جید طلبا کو مطمئن کر دیتے تھے۔ اتنا جامع علوم کوئی شخص اس عصر میں نہ تھا یوں تو تمام علماء انہیں علوم کی تحصیل کرتے تھے۔ مگر تدریس اسی علم کی کرتے تھے۔ جس سے ان کو طبعی مناسبت ہوتی تھی مگر جناب کو تمام علوم سے یکساں طور پر فطری مناسبت تھی۔ حسن تدبیر اور سیاست میں بھی یکتائے زمانہ تھے مرجان مرنج اور صلح کل تھے۔ سب کے دوست اور سب کے دل میں جگہ بناتے ہوتے تھے۔ حکومت سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ نجم الملۃ کہے جاتے تھے۔ ۱۳۵۷ھ میں انتقال ہوا۔

تصانیف: کتابیں بھی کئی تصنیف کی ہیں۔ ایک کتاب سرادق عفت، ایک خلافت و نبوت ہے جس کی تعریف میں نے بہت سنی ہے مگر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

اولاد: اولاد کی طرف سے غم نصیب تھے ان کے بڑے صاحبزادے مولانا سید محمد ن صاحب ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ذکاوت و ذہانت میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے ہندوستا

کی تعلیم سے فارغ ہو کے عراق جانے کا ارادہ تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔ دو نوں صاحبزادے مولانا محمد ذکی صاحب اور مولانا محمد رضی صاحب یادگار چھوڑے۔ مولانا محمد رضی صاحب درجۂ اجتہاد پر فائز ہوئے۔

جناب کے دوسرے صاحبزادے مولانا محمد کاظم صاحب ســــہ میں پیدا ہوئے۔ ذکاوت ذہانت میں اپنے بھائی سے کم نہ تھے ابتدائے عمر ہی سے علمی وقار پیدا کیا۔ عراق جانے سے قبل انتقال ہوگیا۔ دو صاحبزادے اپنے بعد چھوڑے۔ مولانا محمد صادق صاحب جو مولانا سبط حسین صاحب کے رشید شاگرد تھے جوانی میں ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ دوسرے صاحبزادے مولانا محمد محسن صاحب عالم متبحر اور علم دین کی خدمت میں مشغول ہیں۔

مولانا ظہور الحسن صاحب سادات بارہا سے تھے بچپن میں لکھنؤ آگئے تھے اور ملاذ العلماؒ جناب بچھن صاحب کے شاگرد ہوئے۔ معقولات میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے۔ خاموش اور خشک مزاج تھے۔ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے آخر میں معقولات کا درس ترک کر دیا تھا اور جناب غفرانمآب کی کتاب عماد الاسلام کا درس دیتے تھے۔ ۱۳۵۶ھ میں انتقال ہوا۔ کربلائے معلیٰ میں دفن ہوئے۔

تصنیفات اصول کافی کی شرح رسالہ جذر اصم ان کی یادگار ہے اور اولاد کوئی نہ تھی۔

مولانا ابوالحسن صاحب کشمیری ســــہ میں پیدا ہوئے۔ مقبرہ جناب عالیہ میں رہتے تھے۔ جناب تاج العلماؒ کے شاگرد تھے۔ مجتہدین کرام میں ان کا شمار تھا ســــہ میں انتقال

تصانیف

مولانا محمد حسین صاحب محقق ہندی ۱۲۷۶ھ میں پیدا ہوئے۔ جناب تاج العلماء سے کتب درسیہ کی تکمیل کی درجہ اجتہاد پر فائز ہوئے۔ تبلیغ کا بہت شوق تھا۔ مختلف مقامات پر جاکے تبلیغی تقریریں کرتے تھے ۱۳۳۷ھ میں انتقال ہوا۔

تصانیف: تفسیر البرہان حاشیہ وغیرہ۔

افاضل شہر

مولانا مرزا محمد ہادی صاحب مرزا رسوا ۱۲۷۵ھ میں پیدا ہوئے۔ فلسفہ منطق ہیئت کلام مناظرہ ادب تاریخ کیمیا موسیقی پیراکی، انگریزی میں پی ایچ ڈی، عربی، فارسی کے انشا پرداز اردو کے شاعر و ادیب، رڑکی کالج سے انجنیری کا امتحان دیا کوئٹہ میں ریل نکل رہی تھی وہاں نوکری ملی۔ ایک انگریز انجنیئر نے نقشہ دیا کہ اس کے مطابق کام کرو اس کے نقشہ میں غلطیاں نکال کے اس کو دکھائیں اس نے ایک ہمارے نقشہ میں غلطیاں نکالنے کی آپ کو کس نے اجازت دی۔ کہا غلطیوں کی اصلاح ہر شخص کا فرض ہے۔ اس کو سمجھایا آخر اس نے اپنی غلطی تسلیم کرلی وہیں عربی میں ایک رسالہ کیمیا پر ملا اس کو دیکھا اور استعفیٰ دے کے لکھنؤ آئے اور کیمیا بننے لگی آخر رولڈ گولڈ تیار کرلیا جس کا فارمولا ایک امریکن فرم نے خرید لیا۔ ریڈ کرسچین کالج میں پروفیسر ہوئے وہاں پرنسپل کی فرمائش سے اردو شارٹ ہینڈ مینول تیار کردی۔ رسد باندھی اور ذریع مرزائی بنائی۔ ایک تاجر کتب نے ناول لکھنے کی فرمائش کی اس کو دو ناول لکھ کے دیئے امراؤ جان ادا اور شریف زادہ یہ دونوں ناول اردو میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

شاعری میں رباعی مثنوی قصیدہ سب کچھ کہا اور بے مثل کہا۔

یہ شعر اُن کا زبان زد ہے ؎

وضع کے پابند ہم دیوانگی جدت پسند — پھر گلا ہا جائے تو ہاقیس کی زنجیر کا

پیرلکی کا شوق ہوا تو دن بھر دریا میں رہتے تھے۔ کئی عورتوں سے عشق کیا۔ ایک طوائف پر ایسے عاشق ہوئے اسی کے کوٹھے پر رہنے لگے۔ موسیقی کا شوق ہوا تو ہر وقت ستار ہاتھ میں رہنے لگا انگریزی پڑھنے کا خیال ہوا تو پی ایچ ڈی کر لیا۔ الحکم رسالہ نکالا جس میں نہایت فلسفیانہ مضامین لکھے تھے۔ غلام احمد قادیانی اسی نام کا ایک رسالہ نکالتے تھے انہوں نے نوٹس دیا کہ آپ نے ہمارے رسالہ کا نام رکھ کے ہماری شہرت سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ کیوں نہ آپ کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ اُن کے جواب میں مرزا صاحب نے لکھا کہ آپ اپنے رسالہ کی ہجے لکھ کے بھیج دیجئے وہ اس مرلک کو سمجھ کے خاموش ہو رہے۔ آخر میں حیدر آباد میں دارالترجمہ سے منسلک ہو گئے جہاں فلسفہ اور ہیئت کی بہت سی کتابوں کے ترجمے کئے۔

اتنے بڑے فلسفی و منطقی ہونے کے باوجود مذہب میں بہت سخت تھے ان کے برادر نسبتی نے جائیداد کا ان پر دعویٰ دائر کیا، بیٹی کو ایک نوحہ لکھ کے دیا کہ دوپہر کو اسے پڑھا کرو اس کا پہلا مصرع یہ ہے۔

اے کُل کے مددگار مدد کرنے کو آؤ فریاد کو پہنچو

یہ نوحہ فریادی ماتم کے نام سے مشہور ہے اور اب تک ہر موقع پر پڑھا جاتا ہے۔

تحفہ اثنا عشریہ کی رد ہدیۂ سنیہ کئی جلدوں میں لکھی آخر عمر میں اپنا کتب خانہ مدرسۃ الواعظین کو دے گئے جس میں یہ کتاب بھی ہے۔

مولانا سید علی زینبی نے مجھ سے بیان کیا کہ میں ندوہ میں پرنسپل تھا وہاں مسجد کی تعمیر کا خیال ہوا۔ مرزا صاحب اس زمانہ میں لکھنؤ آئے تھے۔ خیال ہوا کہ ان سے مسجد کی سمت

درست کرائی جائے۔ انہیں مدعو کیا گیا تشریف لائے قطب نما وغیرہ رکھ کے سمت کی تعین کی اس کے بعد چائے پیش کی گئی۔ ایک صاحب نے پوچھا حضور اس وقت بارہویں امام کیا کر رہے ہیں۔ فرمایا جو حضرت عیسیٰ کر رہے ہیں۔ ۱۳۵۰ھ میں انتقال ہوا۔

تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے کتنی کتابوں کے ترجمے کئے اس کا علم بھی نہیں۔ اولاد۔ ایک صاحب زادے شکل صورت قد و قامت میں ان کی تصویر تھے مگر اور کچھ نہ تھے۔ ان کے انتقال کے بعد لکھنؤ چلے آئے تھے۔

مولانا علی حیدر نظم طباطبائی ۱۲۷۵ھ میں پیدا ہوئے۔ علوم عربیہ کے عالم متبحر انگریزی کے فاضل مٹیا برج میں واجد علی شاہ کے مدرسہ میں مدرس اعلیٰ اور شاہزادوں کے استاد تھے۔ بادشاہ کی بیویاں اُن سے بادشاہ کو خطوط لکھواتی تھیں۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد نظام دکن نے ان کو اپنے یہاں بلا لیا اور نظام کالج میں پروفیسر مقرر کیا۔ اسکے بعد دار الترجمہ میں عربی کتابیں ترجمہ کرنے پر مامور ہوئے۔ نواب حیدر یار جنگ خطاب ملا۔ انہوں نے اردو کو بلینک ورس اور جدید رجحانات سے آشنا کیا۔ انگریزی کی نظم گرے کی ایلجی کا ایسا موکہ آرا ترجمہ کیا جو اب تک اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ مختلف موضوع پر گرانقدر مضامین لکھے۔ واجد علی شاہ کے درباری شعرأ کے حالات کا تذکرہ لکھا۔ وضع اصطلاحات اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

غالب ایک مہمل گو شاعر سمجھے جاتے۔ دہلی میں ان کی مہمل گوئی پر برابر طعن ہوتا رہتا۔ ؎

مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب نے بھی عاجز آ کے اپنی مہمل گوئی تسلیم کر لی اور کہا

نہ سہی گر مرے اشعار ہیں جو معنی نہ سہی

فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ ۔ بگزار از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

مولانا نے ان کے دیوان کی شرح لکھ کے ان کو بدیع الاسلوب شاعر ثابت کیا یہ شرح حقیقت میں بتاتی ہے کہ شعر کس طرح سمجھنا چاہئیے۔ اس کے بعد بہت سی شرحیں لکھی گئیں مگر اس شرح سے کوئی بے نیاز نہیں رہ سکا۔ ۱۳۵۲ھ مئی ۱۹۳۲ء میں انتقال ہوا۔

مولانا علی اصغر صاحب جو ملا علی اصغر کے نام سے مشہور تھے۔ جون پور وطن تھا۔ بچپنے ہی میں لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں تحصیل علم کی عربی فارسی ادب میں کمال حاصل تھا۔ بڑے بڑے علماء ان کے شاگرد تھے۔ کیننگ کالج میں عربی کے استاد تھے۔ علمائے لکھنؤ ان کا احترام کرتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں انتقال ہوا۔ کوئی اولاد نہ تھی۔

مولانا محمد مہدی حسن میر حامد علی مختار کے بیٹے ۱۲۸۵ھ میں پیدا ہوئے مولانا حامد حسین صاحب کے شاگرد تھے۔ عربی و فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ بڑے ذکی ذہین تھے۔ علماء کے لباس میں رہتے تھے۔ ابتداً میں کئی مناظرے بھی کئے اس کے بعد سیاست کے میدان میں اترے مگر اہل علم کے لباس میں رہے۔ حکام رسی اختیار کی خان بہادر کا خطاب حاصل کیا۔ مولانا حامد حسین صاحب کی صاحبزادی سے شادی ہوئی مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا سید باقر صاحب کی بہن سے شادی کی۔ قومی سیاست میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ساری قوم ایک طرف اور وہ ایک طرف مگر کامیابی انہیں کو ہوتی تھی۔ قد لمبا گردن لمبی منہ لمبا بات کرنے میں ان کے ہونٹ کی حرکت اونٹ کے ہونٹ کی حرکت سے مشابہ تھی۔ ان کے سیاسی حریف انہیں اونٹ کہتے تھے۔ جب شیعہ کالج پر انہوں نے قبضہ کیا تو ان کے مخالفین نے شعر کہا ؎

بلبلاتا آرہا ہے اشتر بغداد قوم　　　کعبۂ کالج کی جانب توڑ کر اپنی نکیل

لکھنؤ میں اونٹ کے نام سے مشہور تھے۔ حقیقت میں ان کے سیاسی حریفوں نے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ مگر انصاف کی بات ہے کہ انہوں نے جس ادارے پر قبضہ کیا اس میں کوئی ابتری پیدا

نہیں ہونے پائی بہت سے قومی امور انہوں نے اس طرح انجام دیئے کہ دوسرا نہ دے سکتا ۱۳۲۷ھ
انتقال ہوا کوئی بیٹا نہیں تھا۔

یہ مشاہیر تھے ان کے علاوہ لکھنؤ کے شرفا میں کوئی ایسا نہ تھا جو علم وفضل کا حامل اور
شعر وسخن کا دلدادہ نہ ہو۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے دلگداز رسالہ نکالا اور ناول نگاری میں شہرت حاصل کی۔

حکیم محمد علی طبیب بھی اس وقت مشہور ناول نگار تھے۔ منشی احمد حسین صاحب ساکن گولا گنج
فارسی نظم ونثر میں مہارت رکھتے تھے۔

سید جالب دہلوی ہمدم کے ایڈیٹر یہ اخبار مہاراجا صاحب کی سرپرستی میں نکلتا تھا وہی
ان کو لکھنؤ لاتے تھے۔

مہاراجہ اس وقت کانگریسی تھے حکومت کے خلاف ذرا سی بات پر اخباروں کا ڈیکلریشن منسوخ
ہو جاتا تھا مگر جالب صاحب اس طرح انگریزوں کے خلاف لکھتے تھے کہ کبھی قانونی گرفت میں
نہ آسکے تاریخی واقعات کا خزانہ تھے ساتویں محرم کو حاضری میں ان کے ایک دوست نے بلالیا وہاں
بے تکلف احباب کا مجمع تھا کسی نے کہا جالب صاحب آج کے ان سے متعلق کوئی واقعہ بیان کیجئے انہوں
نے نصیر الدین حیدر بادشاہ کا ایک واقعہ ساتویں محرم کا بیان کیا لوگ ان کی وسعت معلومات اور
حاضر دماغی سے حیران ہو گئے۔ ترکی ٹوپی پہنتے تھے جو کانوں پر آکے رکتی تھی۔ بائیں طرف حقہ
بھرا رہتا تھا۔ دہنے ہاتھ میں سگریٹ ہوتی تھی کبھی حقہ سگریٹ کے کش لگاتے تھے۔ ہمدم
میں اشتہار دینا کلید کامیابی ہے ان کا مخصوص جملہ تھا۔

بٹلر صاحب گورنر اور مہاراجہ میں دوستی کے پینگ بڑھے ان کو ہندوستانی تہذیب سے
اُنس تھا پمپ چوڑی دار پیجامہ انگرکھا، دوپلی ٹوپی بھی کبھی کبھی پہنتے تھے۔ حقہ بھی پیتے تھے

اور ہندوستانی کھانوں سے بھی رغبت تھی۔ موسیقی کے بھی شوقین تھے یہ سب شوق مہاراجہ کے ذریعہ پورے ہوتے تھے انہوں نے کوشش کر صوبہ کا دارالسلطنت لکھنؤ منتقل ہو جائے۔ مہاراجہ نے ان کا مجسمہ قیصر باغ میں اور دوسری جگہ بٹلر پیلس کی شاندار عمارت تعمیر کرائی۔ مرزا سمیع اللہ بیگ اور سر وزیر حسن مشہور وکیل تھے۔

اطبائ حکیم امیر حسین مرزا محمد مہدی، حکیم باقر حسین، حکیم عبدالعزیز شہر کے طبیب اپنے وقت کے جالینوس تھے ان کے علاوہ سیکڑوں طبیب تھے۔

حدیث خوانی بڑے قاری چھوٹے قاری اور قاری تینچہ نے حدیث خوانی میں شہرت حاصل کی، قاری تینچہ بیس پچیس منٹ کی مجلس پڑھتے تھے اس وجہ سے تینچہ مشہور ہو گئے۔ ان کے علاوہ عباس حسین واقعہ خوانی کے مشہور ذاکر تھے۔

داستان گوئی عابد حسین داستان گوئی میں مثل نہیں رکھتے تھے ان کے علاوہ بہت سے افیونی بڑے پُرلطف طریقہ سے کہانی اور قصہ سناتے تھے۔

روٗسا مہاراجہ سر محمد علی خاں (راجہ محمود آباد) بڑے رعب و دبدبے کے رئیس تھے۔ اعلیٰ درجہ کے شاعر شعرا اور علما کے قدردان عارف صاحب کے شاگرد تھے۔ ریاض خیرآبادی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب ان سے وابستہ تھے علما میں مولانا نجم الحسن صاحب مولانا ابن حسن صاحب مولانا سبط حسن صاحب کے قدردان تھے۔ مولانا امداد امام اثر کی ضخیم ادبی کتاب کاشف الحقائق چھپوا کے مفت تقسیم کی، دینداری میں بھی کوئی رئیس ان کا مقابل نہ تھا محمود آباد میں بڑے دھوم سے تعزیہ داری کرتے اتنا پلاؤ تقسیم ہوتا تھا کہ غربا اسے خشک کر کے رکھ لیتے تھے اور سال بھر پانی ڈال کے پکا کے تازہ کر لیتے تھے۔

لکھنؤ میں چھوٹی رانی کے محل میں بہت بڑا امام بارہ بنوایا جس میں مولانا سبط حسن صاحب

مجلس پڑھتے تھے اور پُر تکلف حصّہ تقسیم ہوتا تھا۔ آٹھویں محرم کو ایک علم اٹھتا تھا جو پاٹے نالے سے گزرتا تھا۔ محمود آباد میں خود اپنا کہا ہوا مرثیہ پڑھتے تھے۔ مدرسۃ الواعظین ان کا وہ دینی کارنامہ ہے جو بڑے بڑے علما نہیں کر سکے۔ انہوں نے یہ مدرسہ قائم کیا اور اس کا نصاب خود بنایا کہ جو طالب علم سلطان المدارس اور مدرسہ ناظمیہ سے فارغ التحصیل ہو وہ مدرسۃ الواعظین میں داخل کیا جائے تیس روپے ماہوار وظیفہ ہو تین برس تک اس کو علم کلام مناظرے کی کتابیں پڑھائی جائیں اور تقریر کی مشق کرائی جائے اس کے بعد وہ اندرون ملک اور بیرون ملک تبلیغ کے لئے جائیں۔ تین برس کے بعد ان کو مدرسہ سے خارج کر دیا جائے اور دوسرا گروہ بھیجا جائے اس طرح ہر سال ایک جماعت مبلغین کی تیار کی جائے۔ مولانا سبطِ حسن صاحب کو اس کا مدرس اعلیٰ جناب نجم الملۃ نگران اعلیٰ اور شہر کے افاضل کو مجلسِ منتظمہ کا ممبر بنایا۔ اس کے لئے عالیشان عمارت خریدی اس کو پھر سے تعمیر کرایا جس میں طلبا کی قیام گاہ کتب خانہ تقریر کا حال تعمیر کرایا ان سب پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا۔ اس وقت جہاں جہاں علما ہیں وہ سب مدرسۃ الواعظین کے مبلغ ہیں۔ الواعظ اخبار نکالا۔ اس کے مصارف کے لئے جائداد وقف کی یہ مدرسہ آج بھی قائم ہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام میں کئی لاکھ روپیہ یکمشت دیا۔ اور ماہانہ رقم معین کی جو تنسیخ زمینداری تک جاری رہی ان کا ایسا علم و فن کا قدر دان دریادل اور دیندار کوئی رئیس نہ تھا۔ داد و دہش بھی عام تھی۔ عہد شاہی کے بعد ایسا رئیس پیدا نہیں ہوا۔

شہزادے باقر مرزا صاحب متولی وقف حسین آباد بڑے رعب و داب سے رہتے تھے مگر اپنی کوٹھی کے اندر باہر کی کسی بات سے ان کا تعلق نہ تھا۔

نواب صاحبان شیش محل لکھنؤ کے پرانے رؤسا منور الدولہ کی اولاد میں تھے۔ لکھنؤ کے بڑے رؤسا میں شمار تھا۔ شہر کے کسی معاملہ میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ ساری نوابی شیش محل کے

اندری رد تھی۔

نواب سنہ ۱۹۱ء خادم حسین امین الدولہ نواب امداد حسین خان کی اولاد میں تھے سنہ ۱۹۱ء میں ان کو وراثت میں کئی لاکھ روپے ملے جو اسی سال اڑا دیئے۔ ایک سال نوابی کے ٹھاٹھ رہے اس وجہ سے نواب سنہ ۱۹۱ء مشہور ہوگئے تھے۔

شہر میں چھوٹے چھوٹے وثیقہ دار تھے جو بزرگوں کی وضع پر قائم تھے ان کی وجہ سے لکھنؤ میں علمی چہل تھی۔

اخبار | اثنا عشری، الناطق، النجم مذہبی، اودھ پنچ اور سرپنچ سیاہ، سفینہ، ہمدم سیاسی اردو کے مشہور اخبار تھے۔ انجمن تہذیب نے بہار سخن، رعنا منشی درگا پرشاد نے خمخانۂ عشق، سخاوت علی متوج نے انتخاب، معصوم علی محشر نے تحفۂ عشاق فتح محمد تائب۔ گلدستۂ شعرا، تصویر حسین خاں نے پیام عشاق۔ قمر مینائی نے دامن گلچیں۔ وسیم خیرآبادی نے گلچیں، محسن ابر معیار یعقوب علی آہ نے انتخاب اخبار نکالا۔

شعرا | بندہ کاظم جاوید علی محمد صاحب عارف، خورشید حسن عرف دولہا صاحب عروج، مرزا محمد جعفر صاحب اوج کا شمار صف اول کے اساتذہ میں تھا یہ لوگ مرثیہ اس پایہ کا کہتے تھے کہ علامہ شبلی ایک دفعہ اوج و عروج کی مجلسوں میں شریک ہوئے تو کہا کہ لکھنؤ میں ابھی انیس و دبیر زندہ ہیں۔

غزل گویوں میں بندہ کاظم جاوید علی محمد عارف جلیل احمد جلیل مانکپوری، ریاض خیرآبادی اساتذہ میں ممتاز تھے۔ نواب محمد عسکری عرف بنّن صاحب بلیغ نواب احمد علی عرف بتّن صاحب ثروت نواب محمد باقر علی خاں عرف بنّے صاحب مشتاق نواب محمد ذکی علی خاں ہاتف کسریٰ جاہ نواب محمد احمد علی عرف مصطفےٰ مرزا کسری (نبیرۂ امجد علی شاہ) نواب مرزا احمد علی خاں ثمر، قارق

یعقوب علی نصرت کا شمار بھی اساتذہ میں تھا۔ ان حضرات کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ احمد علی شوق نیچرل نظمیں کہنے میں شہرت رکھتے تھے۔

مزاحیہ گو ا قاسم حسین صاحب شکیل کورٹ انسپکٹر ایک مخصوص طرز کے مالک تھے ایسی ہجو اردو میں کوئی نہ کہہ سکا۔

شہر کے خوشگو شعرا ا سید یعقوب علی آہ، سید محمد ابراہیم مرزا اثر، نواب احمد علی خاں احمد، سید محمد تقی تقی، پیارے صاحب جگر، جواد علی صاحب جواد۔ شیخ علی حزیں صاحب حزیں، نواب مرتضیٰ حسین خاں صاحب دانش، محمد سعید صاحب درد نواب سردار بہادر صاحب ذہین، سید رضا حسین ریاض، نواب مبارک حسین صاحب سالم، نواب جہاندار مرزا، نواب محمد امجد علی خاں سطوت۔ نواب مرزا محمد سلطان علی سلطان، نبیرۂ نواب مکرم جہاں، سید حسین صاحب سعید، فدا حسین صاحب سیف، نواب محمد مہدی علی خاں صولت، نواب پیارے مرزا، میر عابد حسین صاحب عابد، شیخ قربان حسین عبرت، وارث حسین عدیل، نواب مرزا صاحب غفلت، فدا حسین فدا، نواب فریدون عالم بہادر فریدوں۔ بنیاد حسین صاحب فلک، نواب مرزا محمد علی خاں فوق، میر علی شبر قمر، نواب سلطان بہادر متین، شیخ محمد علی مخزوں، داروغہ سید محمد مصور، سید مہدی صاحب مہدی، نواب سید نادر نواب مرزا محمد نادر شاہ نادر، مرزا باقر حسین نامی، منشی نثار احمد نثار، نواب محمد عابد علی خاں نجم۔ مرتضیٰ حسین صاحب نحیف۔ نواب بہادر علی خاں جگر، مرزا کاظم حسین ستاب، نواب حاجی سلطان خاں شرر، حاجی سلطان احمد شوخ، سید الطاف حسین محمد حسن خاں احسن، منشی مرتضیٰ حسین ادم، اعجاز حسین صاحب اعجاز، بہادر حسین صاحب انجم، نواب مہدی علی خاں بدر رسید، باقر مرزا جمشید، سید فاضل حسین رمز، نواب سجاد علی خاں سجاد، نواب باقر علی خاں شائق، منشی صادق علی خاں سرشار، احسن مرزا صاحب شرر، باقر حسین صاحب شہرت خلف لطافت، نواب پیارے مرزا صبا، نواب بہادر

علی خاں عاشق ۔ شیخ عبدالرحیم کلیمؔ، مرزا علی محمد مخزونؔ، سید رضا حسین فیض آبادی مدحتؔ، شیخ محمد اسمٰعیل مذاقؔ، سید علی محسن ابرؔ، سید میرن صاحب آبروؔ، محمد جعفر عرف محمد صاحب بہارؔ، سید حسن صاحب بیتابؔ، سید شریف حسین حبیبؔ، حاجی منّے صاحب حسن منشی عبدالرؤف عشرتؔ، نواب قاسم علی خاں قاسمؔ، مرزا محمد ہادی رسواؔ، نواب مرتضیٰ حسین خاں مشتاقؔ، نواب محمد وصی علی خاں وصفؔ۔ احمد خاں صاحب نظمؔ، میر ذاکر حسین یاسؔ، منشی مرتضیٰ حسین آرامؔ، نواب محمد مہدی علی خاں ثمرؔ۔ نواب محمد مہدی علی خاں برادر بدر جیا ۔ سلطان خاں صاحب حشرؔ۔ منشی غضنفر علی صاحب حکیمؔ۔ میر فاضل حسین رمزؔ۔ سید ابوالقاسم عرف ابن صاحب سعیدؔ، خواجہ معین الدین چشتی سلامؔ، حاجی سلطان علی صاحب شورؔ۔ محمد علی صاحب حسرتؔ، مولوی صادق علی صاحب مائلؔ، نواب ہادی علی خاں یکتاؔ۔ حکیم ننّو صاحب اطہرؔ، باقر حسین باقرؔ، محمد مہدی جدیدؔ، نواب علی نقی خاں جمیلؔ، سکندر مرزا سکندرؔ، محمد احمد علی بہادر عرف بوا صاحب سکندرؔ، حکیم سلطان مرزا سلطانؔ، سید حسن سعیدؔ، سید قوت علی شورشؔ، آغا وزیر حسن خاں عطاؔ، سید عنایت مہدی کلیمؔ، مرزا مغل صاحب مغلؔ، مرزا وصی علی خاں مظہرؔ، منّے صاحب شہیدؔ، نواب حسین خاں یوسفؔ، شیخ اطہر حسین اطہرؔ، نواب محمد شفیع علی خاں نوازشؔ ۔ نواب فخر الدین حسین خاں فخرؔ، مرزا کاظم حسین خاں مدہوشؔ باقر حسین مصلحؔ، نواب نوازش علی خاں نوازشؔ ۔ محمد اسعد وصلؔ، محمد مہدی صاحب اجلؔ، شیخ اصغر حسین اصغرؔ، سید محمد اصغر خلف میر وزیر علی اخگرؔ، رسواؔ ۔ منّے صاحب ریاضؔ، جہاندار مرزا سطوتؔ، نواب عطا علی خاں عطاؔ عبدالعزیز صاحب عزیزؔ نواب غنی بہادر غنیؔ ۔ ساجد حسین فہیمؔ، سید دلدار علی مضطرؔ، نواب بڑے آغا مہرؔ، ذاکر حسین ندیمؔ، احمد علی خاں نشترؔ، محمد ہاشم یوسف مرزا یوسفؔ، نواب مبارک حسین خاں سالمؔ، سید محمد سلطان سلطانؔ۔

<u>ہندو شعراء</u> پنڈت برج نرائن چکبستؔ، لالہ نوبت رائے نظرؔ اساتذہ میں تھے۔ پنڈت کالی سہائے جگن ناتھ پرشاد بیدلؔ، کنج بہاری لال مسکینؔ، شیام لال خوش دلؔ، رائے میکو لال عشرتؔ،

بابو دیوکی نندن ، منشی بالکرشن قمر پرشاد کول. بشن نرائن در۔

سارا شہر شعر کا مذاق رکھتا تھا۔ اس دور کی شاعری کے متعلق عبدالباری صاحب آسی الدنی لکھتے ہیں:۔

"جب میں لکھنؤ آیا (۱۹۰۴ء) تو مجھے روز روشن کی طرح یہ بات معلوم ہوگئی کہ لکھنؤ کی شاعری اوج کمال پر جارہی ہے اور دلی کے اساتذہ صرف شوخی داغ کہن کی وجہ سے گلفروشی کر رہے ہیں باقی کچھ نہیں ہے۔ تذکرۂ خندۂ گل[۹]

مصوری | میر عابد حسین صاحب کا شغف مصوری میں کمال رکھتے تھے ان کے بنائے ہوئے مرقع اور تصویریں خالی طور پر بخارا میں ربیع الاول کے آخری اتوار کے جلسہ میں لگائی جاتی تھیں۔ ایک شاہکار ان کا قابل دید تھا جو پہلی نظر میں ایک باغ نظر آتا تھا جس میں روشن، کیاریاں، درخت، پتیاں، پھل پھول، چڑیاں ان کے چھوٹے چھوٹے اور انڈے تک دکھائی دیتے تھے مگر نظر جما کے دیکھئے تو صاف نواب اقبال جہاں بیگم دام اقبالہا خطِ گلزار میں پڑھا جاتا تھا اور انڈے چھوٹے پھل پھول سب نقطے دائرے حروف و حرکات تھے پرانے زمانے کی تعلیم تھی شعر بھی خوب کہتے تھے مصوری کی بدولت حسین آباد اسکول میں ڈرائنگ ماسٹر ہوگئے۔ یہی ذریعہ معاش تھا۔ بیر بخارا کے جلسہ کے روح رواں تھے۔ ۲۹ر جولائی ۱۹۲۲ء کو انتقال ہوا۔

موسیقی | موسیقی میں چودھرائن کا کوٹھا رقص و موسیقی تہذیب و تمدن اور زبان و شاعری کا مرکز تھا۔ اس کے سامنے خواجہ عبدالرؤف عشرت کی دکان شعرا اور ادبا کا اڈا تھی جہاں سے لطف نظارہ بھی حاصل ہوتا تھا اور گا، ما، پا، دھا، نی کی آوازیں بھی آتی تھیں۔ مولانا شبلی بھی کبھی کبھی وہاں آکے بیٹھتے تھے۔

ننھوا، بچوا چودھرائن کی لڑکیاں۔ ماہ منیر، رشک منیر، گلاب جان، جھگن جان، سلطانی

—

جمیلہ جان، نواب جان، اختر جان رسیلی، مہر جان، شمشادی جان اس کی نوچیاں حسن و جمال اور کمال فن میں شہرت رکھتی تھیں۔ یہ مرکز رقص و غنا چوک میں تھا جہاں حنا بلڈنگ ہے۔ نشتری بائی تکیت گنج میں رہتی تھی خنجری ہاتھ میں لے کے ناچتی تھی۔

اللہ رکھی سانولی تھی مگر صورت میں غضب کی کشش تھی تہذیب میں اخلاق میں مشہور تھی۔ کامتا کماری خنجری لے کے بتاسوں پر ناچتی تھی دور دور سے اس کا کمال دیکھنے لوگ آتے تھے۔ بنّی جان ستار بجانے میں کمال رکھتی تھی۔ بڑے بڑے ستار بجانے والے اسکا کمال دیکھنے آتے تھے۔

مشتری جان۔ سنہرے گھونگھروالے بال۔ صورت پر غضب کا بھولا پن۔ جب ناچتی تھی لوگوں پر جادو کرتی تھی۔ گل بہار۔ عجب آن بان اور شوکت و شان کی طوائف تھی۔ ڈیوڑھی پر دو دربان معین تھے جو آنے والے سے اس کا نام پتہ پوچھ کے اطلاع دیتے تھے اگر کوئی معقول اور مشہور آدمی ہوا تو اس کو اجازت مل جاتی تھی نہیں تو واپس کر دیا جاتا تھا۔ حُسن صورت کے ساتھ کمال میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی اس کا گانا سننے کے خواہشمند مہینوں امیدواری کرتے تھے شب پنجشنبہ کسی سے نہیں ملتی تھی۔ دن کو روزہ رکھتی تھی اور شب جمعہ درگاہ جاتی تھی۔ بڑے بڑے رؤسا ہی اس کے یہاں آتے تھے۔ چاول والی گلی میں مکان تھا۔

فیروزہ جان۔ شیریں گفتاری اور تہذیب میں مشہور تھی گانا بھی خوب جانتی تھی۔ صورت کی اچھی نہ تھی لوگ اس کی باتوں پر زیادہ مرتے تھے۔ اچھن اِدھا بگّن حسن و جمال اور کمال فن میں مشہور تھیں۔

نقال | نقالی میں فضل حسین، انار دانہ اور اللہ بندے مشہور تھے۔

پیراکی | شیدی عنبر کا پیراکی میں جواب نہ تھا۔

سوز خوانی | سوز خوانی میں منجھو صاحب نے وہ کمال پیدا کیا کہ ان سے پہلے اور ان کے بعد

کوئی ایسا سوز خوان پیدا نہیں ہوا۔ ان کے علاوہ نادر مرزا اور سجاد حسین بھی باکمال سوز خوان تھے۔

سپہ گری نواب سجاد علی اور آغا ابّو صاحب کا سپہ گری میں مثل نہ تھا۔ علمائیں شمس العلماء مولانا ابن حسن صاحب کو اس میں کمال کا درجہ حاصل تھا اور کشتی میں صادق پہلوان اور زوار پہلوان کا مثل نہ تھا۔

کنکوے بازی اس زمانہ میں کنکوے بازی کو بڑا عروج ہوا کوئی گھر کنکوے بازے خالی تھا اور کھینچ کے لڑانے کا فن ایجاد ہوا۔ دو دو میل لمبے پیچ لڑائے جاتے تھے۔ میدان بدلے جاتے تھے۔ بڑے بڑے کنکوے باز ہزاروں تماشبین اور ہر طرح کے دکاندار جمع ہو جاتے تھے۔ کنکوے کا مشہور میدان میڈیکل کالج کے پیچھے گومتی کے کنارے جناتوں کی مسجد کے پاس اور دوسرا میدان گنگا پرشاد کے مندر کے قریب راج گھاٹ پر تھا۔

اس زمانہ کے مشہور کنکوے باز بڑے محمد ہادی تھے کئی لاکھ روپیہ ان کو ترکے میں ملا سب کنکوے میں اُڑا دیا ان کی شہرت دور دور تھی نواب صاحب رامپور نے کنکوا لڑانے کو بلایا پانچ روپیہ پیچ کی بازی بدی گئی۔ بڑے محمد ہادی کئی پیچ کٹ گئے لوگوں نے کہا:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

دس پندرہ پیچ کٹنے کے بعد بیٹھ رہے۔ نواب صاحب نے کہلوایا دو چار پیچ اور لڑاؤ کہا اب پچاس روپیہ پیچ لڑاؤں گا وہ لقمہ تر پہلے ہی تھے جا چکے تھے پچاس روپیہ پیچ منظور ہو گیا۔ اب جو کنکوا لے کے میدان میں آئے تو شام تک کاٹتے رہے کئی ہزار روپے جیتے۔

نواب فضل حسین بھی کنکوا لڑانے میں مشہور تھے۔

کنکیا سات قسم کی ہوتی تھی۔ اِدّھے، پونتا، اَنا، سوا تین، دھیلچی، دمڑجی، بائی اک تاوا۔ دھیلچی دمڑجی چھوٹے بچے کھینچتے پھرتے تھے۔ بڑے کنکوے، کنکوے باز لڑاتے تھے۔ رنگ کے

لحاظ سے سادے کنکوے یہ تھے انگاریہ، کالا، اودا، نیلا، ہرا، شربتی، آسمانی، نارنجی، کشمشی، فرنگی، خاکی، سفید، تربوزی، زعفرانی، دھانی، لرونیا، ننھے وار۔ اک منگی

جوڑ لگانے کے جو مختلف بمعیب بنائی گئی تھیں وہ بہت ہیں جوڑ میں کمال یہ تھا کہ ہر طرف سے برابر اور اتنا پتلا کنارا جس کی حد نہیں اور مضبوط اتنا کہ کبھی نہ کھلے۔

بنّے صاحب اس کے بڑے مشہور کاریگر تھے ہاتھی، تیر، تیتر، بٹیر، ہر شکل کے کاغذ کاٹ کے لگاتے تھے۔ سجاد حسین چیپ کے موجد تھے۔ سیکڑوں وضع کے کنکوے بنائے گئے

۱۔ طوقیا، ۲۔ نعلدار، ۳۔ دوپنی طوقیا، ۴۔ مانگدار طوقیا، ۵۔ چیپ طوقیا، ۶۔ نعلدار طوقیا، ۷۔ چیپ دوپنی طوقیا، ۸۔ چیپ دوپنی نعلدار طوقیا، ۹۔ چیپ مانگدار، ۱۰۔ چیپ مانگدار دوپنی نعلدار طوقیا، ۱۱۔ جمدھر طوقیا، ۱۲۔ جمدھر نعلدار طوقیا، ۱۳۔ جمدھر دوپنی طوقیا، ۱۴۔ جمدھر دوپنی نعلدار طوقیا، ۱۵۔ اک گُلی، ۱۶۔ دوگلی، ۱۷۔ اک گلی۔ الفیا، ۱۸۔ دوگلی۔ الفیا، ۱۹۔ اک چشمی، ۲۰۔ دوچشمی، ۲۱۔ اک چشمی مانگدار، ۲۲۔ دوچشمی مانگدار، ۲۳۔ چاند تارا، ۲۴۔ دوپنی چاند تارا۔ ۲۵۔ دوپنی نعلدار چاند تارا، ۲۶۔ چاند تارا مانگدار، ۲۷۔ چاند تارا طوقیا مانگدار، ۲۸۔ چاند تارا چیپ طوقیا مانگدار، ۲۹۔ اک باز، ۳۰۔ دوباز، ۳۱۔ دوباز چیپ، ۳۲۔ دوباز چیپ طوقیا نعلدار، ۳۳۔ دوباز چیپ دوپنی طوقیا، ۳۴۔ دوباز ٹیری، ۳۵۔ دوباز دوپنی طوقیا ٹیری، ۳۶۔ دوباز دوپنی نعلدار طوقیا ٹیری، ۳۷۔ چیپ، ۳۸۔ ٹیری، ۳۹۔ الفیا، ۴۰۔ مانگدار، ۴۱۔ جمدھر، ۴۲۔ طوقیا، ۴۳۔ نعلدار، ۴۴۔ دوپنی، ۴۵۔ پٹی دار، ۴۶۔ دوپٹی دار، ۴۷۔ سہ پٹی دار، ۴۸۔ چہار پٹی دار، ۴۹۔ پٹی دار طوقیا، ۵۰۔ دھاری دار، ۵۱۔ صراحی دار، ۵۲۔ صراحی دار طوقیا، ۵۳۔ صراحی نعلدار طوقیا، ۵۴۔ صراحی دار دوپنی دار، ۵۵۔ صراحی دوپنی نعلدار طوقیا، ۵۶۔ صراحی ٹیری، ۵۷۔ صراحی چیپ دار پنی، ۵۸۔ صراحی مانگدار دوپنی طوقیا۔ ۵۹۔ ابابیلیا۔

تہذیب شائستگی و تہذیب، متانت و وقار، ذوق سخن۔ سپاہیانہ بانکپن، اولوالعزمی، غیرت و حمیت، نفاست و پاکیزگی میں لکھنؤ کو اب بھی امتیاز خاص حاصل تھا۔

جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں۔

"اللہ اللہ وہ ان کے لچکیلے سلام وہ ان کی نشست و برخاست کے پاکیزہ انداز وہ ان کی تہذیب میں ڈوبی ہوئی قطع وہ ان کے لباس کی انوکھی تراش خراش وہ مسائل علمی و ادبی کی توضیح کے ہنگام ان کے الفاظ کا ٹھہراؤ وہ ان کے لہجوں کے کٹاؤ۔ اثنائے غزل خوانی میں وہ حسب مفہوم شعر ان کی آنکھوں کا رنگ اور ان کے چہروں کا اتار چڑھاؤ وہ قہقہوں سے دامن کش ان کا ہلکا ہلکا تبسم وہ ان کا انکسار کے سانچے میں ڈھلا ہوا وقار اور باوجود کمال وہ ان کا ہاتھ جوڑ جوڑ کے اپنی ہیچ مدانی کا اعتراف یہ ساری باتیں دیکھ کے میں نقش بردیوار ہو کر رہ گیا۔ وہ تمام لوگ اس قدر شائستہ شستہ اور رکھ رکھاؤ والے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کرۂ خاک کے نہیں کسی کرۂ نور کے باشندے ہیں۔ ص ۱۰۳ (یادوں کی بارات)

اسی زمانے کے ایک مشاعرے کا حال بھی جوش صاحب کی زبانی سنیئے۔

مشاعرے کے دروازے پر رنگین قمقمے روشن ہیں اندر سفید براق چاندنی بچھی ہوئی ہے دیواروں سے لگے ہوئے گاؤ تکیے رکھے ہوئے ہیں۔ ہر شاعر کے سامنے ایک ایک ہر دم تازہ حقہ ہاروں سے لپٹا ہوا، ایک ایک اگالدان اور پانوں کی ایک ایک کاغذی ہانڈی رکھی ہوئی ہے جس پر شالباف اور لچکا لپٹا ہوا ہے۔ ہر آنے والے شاعر کے استقبال میں شعراء حسب آداب دوزانو یا سروقد کھڑے ہو ہو کر بسم اللہ بسم اللہ کہہ رہے ہیں۔ آداب، بندگی تسلیم اور اہلاً و سہلاً و مرحبا کے نعرے گونج رہے ہیں۔

اب تمام شعراء و سامعین آچکے ہیں حقے پئے اور پان کھائے جا رہے ہیں اتنے میں کشمیری چائے آتی ہے کیا مجال ہے کہ چائے پیتے میں کسی کے لب سے کوئی آواز بلند ہو جائے یا چائے کا ایک قطرہ بھی فرش پر ٹپک جائے۔ اب مشاعرے کا آغاز ہو رہا ہے تمام شعراء حسب مدارج عمر و فن بڑی ترتیب کے ساتھ دوزانو بیٹھے ہیں۔ میر مشاعرہ نے اپنی غزل سے مشاعرے کا آغاز کیا ہے۔ حقے بینا اور پان یکسر موقوف ہو چکا ہے۔ ہر مصرع دہرایا اور ہر شعر پر داد دی جا رہی ہے۔ سبحان اللہ، ماشاء اللہ، واہ واہ سے تمام ہال گونجا ہوا ہے میر مشاعرہ کے بعد وہ اپنے ہاتھ سے شمع گردش کر رہی ہے اور شعراء اپنا اپنا کلام سنا رہے ہیں اور پھر نوبت دور دور تک ...

اب حضرت بلیغ (صدر مشاعرہ) کی سامنے والی صف میں ایک صاحب کلام سنا رہے ہیں۔

تمام شعراء کے ساتھ بلیغ صاحب بھی جی کھول کر داد دے رہے ہیں مگر سامنے بیٹھے ہوئے شعراء یہ دیکھ کر حیرت طاری ہے کہ بلیغ صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آرہا ہے اور ایک رنگ جا رہا ہے۔ شدید کرب کے آثار ان کے چہرے سے نمایاں ہیں مگر جی کڑا کر کے وہ داد دیئے جا رہے ہیں۔ لوگ بلیغ صاحب سے اس تغیر کا سبب پوچھنا چاہتے ہیں مگر اثنائے غزل خوانی میں پوچھتے ہیں تو آداب مشاعرہ پر حرف آتا ہے، سب دم بخود بیٹھے ہیں کہ اتنے میں آدھ گھنٹے کے وقفے کا اعلان ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ لوگ حال پوچھیں اور مشاعرے میں خلل پڑے بلیغ صاحب اپنے ایک بے تکلف دوست کو اشارہ کر کے فوراً ایک کمرے میں چلے گئے اور انگرکھے کے بند کھول کر اپنے دوست سے کہہ رہے ہیں کہ ذرا دیکھئے تو میری پشت پر کیا قیامت برپا ہے۔

یہ دیکھ کر دوست کی ہلکی سی چیخ نکل جاتی ہے "ارے کھنکھجورا" وہ فوراً دوسرے دروازے سے باورچی خانے جاتے ہیں اور وہاں سے خوب سرخ کر کے لے آتے ہیں۔ کھنکھجورے کے نکلتے ہی بلیغ صاحب کی پشت سے خون بہنے لگتا ہے۔ یہ تمام کارروائی اس قدر چپ چاپ ہوتی ہے کہ اہل مشاعرہ میں سے کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی۔

آپ نے دیکھا کہ اس قدر شدید کرب میں مبتلا ہو جانے کے بعد بھی بلیغ صاحب نے آداب مشاعرہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جان پر بنی ہوئی تھی مگر داد میں کمی نہیں کی۔

یہ تھی لکھنؤ مرحوم کی تہذیب اور یہ تھے لکھنؤ کے مشاعروں کے آداب۔

ختم ہو گیا وہ دور، لٹ گیا وہ بازار اٹھ گئے وہ گاہک، بکس گئے وہ پھول بکھر گئیں وہ کلیاں، بجھ گئے وہ چراغ رُندھ گئی وہ چاندنی، تڑق گئیں وہ محرابیں اور اجڑ گئیں وہ محفلیں رہے نام اللہ کا۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے

"اخبار جنگ"

ایک اور مشاعرہ کا واقعہ مشہور ہے کہ ایک انگریزی دان نوجوان پیارے صاحب رشید کے آگے آکے بیٹھ گئے اور ٹوپی اُتار کے زانو پر رکھ لی۔ رشید صاحب جبر کئے بیٹھے تو رہے مگر عہد کر لیا کہ اب کبھی مشاعروں میں شریک نہ ہوں گا۔ اور پھر کسی مشاعرے میں نہیں گئے۔ فرماتے تھے کہ انگریزیت برتی جاتی ہے مشاعرے اب شرکت کے قابل نہیں رہے۔

اسی زمانے کا واقعہ تو ہے کہ ایک بہت بڑے مشاعرے میں دور دور سے لوگ بلوائے گئے۔ سائل دہلوی پہلی مرتبہ لکھنؤ آئے۔ انہوں نے لہجہ میں غزل شروع کی سارا مشاعرہ بھیا لک ہو گیا ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگا نواب عسکری مرزا صاحب بلیغ اٹھ کے چلے گئے اس وقت لہجہ سے غزل پڑھنا آداب مشاعرہ اور شاعری شان کے خلاف تھا اس میں بات یہ تھی کہ شعر کو لہجہ سے چمکانا اس پر رنگ چڑھانا جس کا مقصد مصنوعی دلکشی پیدا کر کے عوام سے داد لینا تھا جو شاعر کا نقص تھا۔

اسی لکھنؤ کے متعلق پنڈت برج نرائن چکبست نے لکھا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کی اس مٹی ہوئی حالت پر بھی ایک عالم ہے۔ اس شہر مرحوم کے باشندوں کا طرز معاشرت اسکی گزشتہ عظمت کی یاد دلاتا ہے اور دل میں ایک درد محبت پیدا کرتا ہے۔ یہاں نگاہ عبرت کا ہونا لازمی ہے۔ میرے دوستو یہاں کی خاک کو یہ فخر حاصل ہے کہ میں بھی کبھی امیروں اور شہزادوں کی آنکھوں کا سرمہ تھی۔ یہاں کی عالی شان مگر شکستہ عمارتوں کے ٹوٹے پھوٹے در و دیوار زمانے کے نشیب و فراز کی تصویریں ہیں ؎

ہر کجا خشتِ کہن بینی درین ویرانہ ہست فرد دفترِ احوالِ صاحب خانہ[1]

گو کہ یہاں کے شرفا فلک زدہ ہیں اور زمانے نے ان کے جاہ و جلال کو خاک میں ملا دیا ہے مگر ان میں بوئے ریاست پائی جاتی ہے وہ ایک خاص وضع کے پابند ہیں جسکو وہ آئین شرافت سمجھتے ہیں اور ایک خاص تہذیب کی یادگار ہیں۔

اسلاف کے کچھ اثر ہیں باقی اس راکھ میں کچھ شرر ہیں باقی (مضامین چکبست)

[1] اس شعر کا پہلا مصرع غلط مشہور ہے۔ صحیح یہ ہے۔ ع
ہر کجا افتادہ بینی خشتے در ویرانہ

دوسرا طبقہ

علماء فرنگی محل میں مولانا قطب الدین عبد العلی صاحب مولانا عبد الباری صاحب کے بعد ان کے جانشین قرار پائے۔ عالم و متقی اور صاحب درس و وفادار تھے۔

مولانا صبغت اللہ صاحب فرنگی محل کی رونق تھے درس بھی دیتے تھے اور مقرر بھی بہت اچھے تھے۔ اپنی خاندانی روش پر قائم سنی شیعہ سب کے دوست تھے۔ شیعوں کے مذہبی جلسوں میں بھی تقریریں کرتے تھے۔

مولانا عنایت اللہ صاحب بڑے صاحب علم اور صاحب ذوق تھے درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔

مولانا احمد علی صاحب بھی فرنگی محل کے اکابر میں تھے اور صاحب درس و افادہ تھے۔

مولانا عبد الحکیم ٹکسال والے علمائے اہل سنت میں ایک خاص درجہ رکھتے تھے۔ محلہ ٹکسال میں سکونت تھی اس وجہ سے ٹکسال والے والے کہے جاتے تھے خاموش بزرگ تھے مذہبی مناقشات سے علمائے فرنگی محل کی طرح دور رہتے تھے۔ ان کے صاحبزادے مولانا عبد الودود شمس ہمارے بے تکلف دوست تھے۔ شیعوں کی محفل قصیدہ خوانی میں مدحیہ اشعار پڑھتے تھے۔

مولانا عبد الشکور پاٹے نالے پر رہتے تھے دار المبلغین قائم کیا تھا جہاں طلبا کو تبلیغ کی تعلیم دیتے تھے خود بھی تحریر و تقریر سے ہمیشہ تبلیغ میں مشغول رہے ان کی تحریر و تقریر کے دو موضوع تھے جن پر وہ زندگی بھر لکھتے اور تقریریں کرتے رہے ایک یہ کہ شیعوں کا ایمان قرآن پر نہیں ہے دوسرے قاتلان حسین شیعہ تھے۔

شیعوں کے علم و تعزیہ کے مقابلہ میں جھنڈا اٹھانے کی تحریک شروع کی علما نے

فرنگی محل کو بھی اپنے ساتھ شریک کرنا چاہا۔ انہوں نے کہا یہ بدعت ہے۔ ہم اس میں شرکت نہیں کرسکتے۔ وہ مولانا عین القضاۃ کے شاگرد تھے ان سے کہا کہ ہم شیعوں کے علم و تعزیہ کے جواب میں جھنڈا اٹھانا چاہتے ہیں آپ کی سرپرستی ضروری ہے فرمایا ایک بدعت شیعہ کرتے ہیں دوسری تم شروع کرنا چاہتے ہو اور ہماری سرپرستی کے خواہشمند ہو یہ کیسے ممکن ہے مگر مولانا اس پر مصر رہے۔ اس تحریک نے زور پکڑا علماً اور ربا فہیم اہلسنت تو علیٰحدہ رہے مگر عوام ان کے شریک ہوگئے جس کے تلخ نتائج ہوتے ان کی تفصیل مناسب نہیں۔

علمائے خاندان اجتہاد میں مولانا محمد طاہر صاحب خلف اکبر جناب ملاذ العلماً بچھن صاحب ۱۲۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان کی تعلیم ختم کرکے عراق گئے۔ ورع و تقویٰ میں اپنے والد بزرگوار کی تصویر تھے۔ وہاں درس خارج میں شریک رہ کے چھ برس کے بعد ہندوستان واپس آئے۔ ایک سال بعد مدقوق ہوئے ۱۳۲۵ھ میں چالیس سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ ایک صاحب زادے مولانا ابوالحسن صاحب تھے۔

مولانا سید احمد علامہ ہندی جناب سید ابراہیم صاحب کے صاحب زادے ۱۲۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ جناب تاج العلماً کے شاگرد تھے کچھ دنوں کے بعد عراق گئے وہاں خیریۂ اودھ کے مقسم ہوگئے۔ چار پانچ برس کے قیام کے بعد ہندوستان آئے۔ ایک رسالہ التبلیغ نکالا بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۳۶۶ھ میں انتقال ہوا۔ اولاد میں کوئی عالم نہیں ہوا۔

مولانا ابوالحسن عرف منن صاحب جناب سید ابراہیم صاحب کے چھوٹے صاحب زادے ۱۲۹۶ھ میں پیدا ہوئے۔ بحرالعلوم جناب علن صاحب سے معقولات اور جناب مولانا سبط حسین صاحب سے فقہ و اصول کا درس لے کے عراق گئے۔ وہاں پانچ برس تک درس خارج میں شریک رہ کے اجتہاد کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے۔ ہندوستان واپس آکے زندگی بھر

درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے ۱۳۵۵ھ میں مسلول ہو کر انتقال فرمایا پانچ صاحب زادے یادگار چھوڑے جن میں چار آفتاب و ماہتاب بن کے چمکے ان کا ذکر ان کے محل پر کیا جائے گا۔

افاضل خاندان اجتہاد مولانا کاظم حسین صاحب مولانا غلام حسین صاحب خلف سلطان العلماؒ کے نواسے ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ بحر العلوم جناب علن صاحب سے معقولات اور قدوۃ العلماؒ مولانا آقا حسن صاحب سے ہئیت اور مولانا سبط حسین صاحب سے فقہ و اصول کی کتابیں پڑھیں نہایت ذکی و ذہین تھے علوم عقلیہ میں اپنے زمانہ میں فرد فرید تھے صاحب تذکرۂ بے بہا نے لکھا ہے کہ اکثر مدعیان اجتہاد سے بہتر ہیں۔ اس زمانہ کے جتنے علماؒ ہیں سب ان کے شاگرد ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں انتقال ہوا ایک صاحب زادے محمد زکریا تھے۔ صدر الافاضل ان کی زندگی میں رحلت فرما گئے۔

مولانا وجاہت حسین صاحب ناظم مولانا کاظم حسین صاحب کے چھوٹے بھائی ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ بحر العلوم جناب علن صاحب سے معقولات اور جناب آقا حسن صاحب سے ہئیت اور مولانا سبط حسین صاحب سے فقہ و اصول کا درس لیا۔ ممتاز الافاضل اور صدر الافاضل کی سند حاصل کی۔ سلطان المدارس میں مدرس مقرر ہوئے۔ خوش پوشاک جامہ زیب ہنس مکھ ظریف الطبع شاعر ذاکر فقیہ فلسفی و منطقی سب ہی کچھ تھے کوئی بات لطیفہ سے خالی نہ تھی۔

ایک لطیفہ سلطان المدارس کے ایک اہلکار کے بیخانہ کے مقام پر پھوڑا نکل آیا تعلیم کے وقفہ میں سب مدرس جناب سید باقر شمس صاحب کے پاس بیٹھے تھے جناب نے ان اہلکار کے متعلق پوچھا کہ اب وہ کیسے ہیں ایک صاحب نے کہا کل میں ان کی عیادت کو گیا پھوڑا ابھی پھوٹا نہیں تکلیف بہت ہے۔ فرماتے تھے کہ میری غیر حاضری سے مدرسہ کے انتظام میں

ابتری پیدا ہوگئی ہوگی۔ ایک صاحب نے کہا یہ تو انہوں نے صحیح نہیں کہا۔ ناظم صاحب نے فرمایا مقعد صدق میں تو پھوڑا نکلا ہے تو سیخ کہاں سے نکلے۔ جناب سید باقر صاحب نے مسکرا کے فرمایا عجیب مضحک بات آپ نے فرمائی۔

اودھ پنچ میں اخبار کی طرف سے جو مزاحیہ اشعار چھپتے تھے وہ سب ان کے لکھے ہوتے تھے۔ اکثر مضامین بھی اس میں لکھتے تھے مگر اپنے نام سے نہیں لکھتے تھے۔ سب اودھ پنچ کی طرف سے شائع ہوتے تھے۔ سنجیدہ اشعار بھی بے مثل لکھتے۔ ان کا مشہور قصیدہ آبشار صفا چھپ چکا ہے جس کا مطلع ہے۔

بہار آتے ہی ہم ایسی خزاں کی گت بنا دینگے ۔ کہ جس پر ہنس پڑیں گے پھول غنچے مسکرا دینگے

اسی میں شعر ہے۔

یہ کیوں گھبرا کے سوتے سوتے پوچھا کیا بجا ہوگا ۔ مری جاں صور ہے ہم خود اندھیرے منہ جگا دیں گے

مرتضیٰ حسین صاحب فاضل نے مطلع انوار میں ان کی ذاکری کے متعلق لکھا ہے۔

خطابت میں ان کے آغاز ہی سے عروج فن ظاہر ہوتا تھا لطیف نکتے فکر انگیز علمی مباحث شگفتہ پیرائے میں بیان کرتے تھے۔ سامعین پر وجد طاری ہو جاتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ سورہ دہر کی تیس آیتیں ہونے پر اپنے پُر لطف انداز میں بیان فرمایا کہ قرآن مجید کا ارشاد ہے مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا چونکہ سیدہ عالم نے تین روٹیاں تین دن میں تین سائلوں کو دیں لہٰذا خدا نے ہر روٹی پر دس گنا اجر دیا۔ اس نکتہ نے سننے والوں پر ایک عجیب اثر چھوڑا ان کی ہر مجلس میں اسی قسم کی باریکیاں عام فہم انداز میں ہوتی تھیں اسی طرح ان کے قصیدے اردو شعر زبان زد ہو جایا کرتے تھے۔ مطلع انوار ص۴۰۳

فقہ و اصول میں بھی ان کو بڑا درک حاصل تھا وجوب نماز جمعہ پہ ایک استدلالی رسالہ

رسالہ لکھا جس کو دیکھ کے مولانا سبط حسین صاحب نے ان کو اجازہ اجتہاد دیا مگر انہوں نے کبھی دعوائے اجتہاد نہیں کیا۔ ۱۹۲۵ء میں ۴۴ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔

مرزا محمد ہادی صاحب عزیز کا مصرع تاریخ بہت پسند کیا گیا۔

عازم ملک ارم شد ناظم ملک کمال
۱۹۲۵

ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ شاگرد بہت تھے جن میں مولانا محمد مصطفیٰ صاحب جوہر مولانا مرزا یوسف حسین صاحب وغیرہ مشہور ہیں۔

مولانا محمد تقی صاحب جناب سید ابراہیم صاحب کے فرزند اکبر متقی پرہیزگار خاموش نیک نفس بزرگ تھے۔ ۱۲۹۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۴۱ھ میں انتقال فرمایا دو صاحبزادے چھوڑے مولانا سید محمد عرف میرن صاحب اور مولوی آغا مہدی صاحب۔

مولانا علی گوہر صاحب جناب سید علی اکبر صاحب کے تیسرے بیٹے وجیہہ وشکیل تھے۔ پیش نمازی کا اجازہ تھا پہلے نماز بھی پڑھاتے تھے اس کے بعد پیش نمازی ترک کر دی تھی۔ ۱۹۵۴ء میں انتقال ہوا اولاد میں کوئی عالم نہیں ہوا۔

مولانا علی منور صاحب جناب سید علی اکبر صاحب چوتھے صاحبزادے بڑے قابل لائق تھے۔

مولانا سبط محمد ہادی عرف کلن صاحب جناب میر آغا صاحب کے بڑے صاحب زادے پیش نمازی تک تعلیم تھی۔ مجلسیں خوب پڑھتے تھے سنہ میں انتقال ہوا کوئی بیٹا نہ تھا۔

مولانا عابد علی صاحب جناب ملاذ العلماً کے چھوٹے صاحب زادے مولانا ابوالحسن عرف منن صاحب کے شاگرد متقی اور پرہیزگار تھے نماز بھی پڑھاتے تھے اور مجلسیں بھی پڑھتے شاعر بھی تھے ان کے نوحوں کی بیاضیں چھپ چکی ہیں۔ آخر عمر میں ہجرت کر کے کربلائے معلیٰ چلے گئے تھے وہیں ۱۹۶۵ء میں انتقال ہوا۔ ان کے صاحب زادے محمد زائر صاحب کراچی میں ہیں۔

مولانا سید علی صاحب آشفتہ خاندان اجتہاد کے رکن غفرانمآب سے قریب تر تھے یعنی ان کے پیروتے تھے۔ ذہانت و ذکاوت میں ممتاز تھے۔ بحرالعلوم جناب علامہ صاحب سے معقولات کا درس لیا اور حکیم اجمل خان سے طب پڑھی لکھنؤ میں مطب شروع کیا باکمال شاعر اور فن سپہ گری میں استاد کامل تھے۔ ایک ادبی رسالہ مبشر نکالتے تھے۔ آخر میں حیدرآباد دکن میں دارالحکمۃ کے پرنسپل مقرر ہوگئے جہاں وہ درس بھی دیتے تھے۔ مریضوں کا علاج بھی کرتے تھے۔ نظام حیدرآباد کے طبیب خاص بھی تھے وہیں مرض گردہ میں انتقال ہوا۔ سارا کلام تلف ہوگیا کوئی بیٹا نہ تھا۔

خاندان اجتہاد کے علاوہ مولانا مفتی محمد علی صاحب جناب مفتی محمد عباس صاحب کے صاحبزادے ۱۲۹۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی ان کے بعد وہ مولانا محمد مہدی صاحب سے کتب ادبیہ کی تحصیل کی مدرسہ ناظمیہ میں بھی پڑھا اس کے بعد عراق جا کے فقہ و اصول کا درس لیا اور اجازۂ اجتہاد لے کے ہندوستان واپس آئے۔ شیعہ عربی کالج میں ادب کے مدرس مقرر ہوئے علوم ادبیہ میں شہرت رکھتے تھے۔ عربی فارسی اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور بہت خوب کہتے تھے۔ برجستہ گوئی میں بھی کمال تھا۔ ان کے کلام کا بڑا ذخیرہ ہے مگر شائع نہیں ہوا۔ ۱۳۶۱ھ کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادے مولانا طیب آغا صاحب قم میں مقیم ہیں۔

مولانا مفتی احمد علی صاحب مولانا مفتی محمد علی صاحب کے چھوٹے بھائی ۱۳۰۳ھ میں پیدا ہوئے چار برس کے تھے کہ یتیم ہوگئے جناب ابو صاحب صاحب نے کفالت کی نو برس کے سن میں سلطان المدارس میں داخل کیا مولوی جعفر حسین صاحب سے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پانچ برس کے بعد یعنی ۱۳۱۷ھ میں چودہ برس کے سن میں جناب نجم الملۃ نے اپنی نگرانی میں لے لیا اور مدرسہ ناظمیہ میں داخل کر کے پڑھانا شروع کیا۔ ۱۳۱۵ھ میں اپنی والدہ کے ساتھ کربلائے معلیٰ گئے۔ وہاں مولانا سبط حسین صاحب نے اپنی کفالت میں لے کر فکر معاش سے آزاد کر دیا اور ان کو

پڑھنا شروع کیا مگر پڑھنے سے زیادہ بحث و مباحثہ کا شوق تھا۔ اُن کے درس خارج میں بیٹھنے لگے اُن کے عراق سے آنے کے بعد مرزا حسین خلیل کے درس خارج میں بیٹھنے لگے۔

۱۳۲۶ھ میں ہندوستان آئے اور علامہ ہندی صاحب کی صاحبزادی سے شادی کی چند دنوں کے بعد ان کے اصرار سے ان کو کربلائے معلیٰ زیارت کو لے گئے اور اسی سنہ میں واپس ہندوستان آئے امروہہ جائس وغیرہ میں بعض عربی اور اسی کے مدرس رہے آخر میں جناب نجم الملۃ نے مدرسہ ناظمیہ میں مدرس دوم رکھ لیا اُن کے بعد مدرس اوّل ہو گئے۔ ۱۳۵۰ھ میں رحلت فرمائی۔ کوئی کتاب تصنیف نہیں کی نہ کوئی بیٹا چھوڑا۔

افاضل شہر

مولانا سبط حسن صاحب ۱۲۹۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن جائس میں حاصل کر کے لکھنؤ آئے۔ نواب اصغر حسین صاحب فاخر نے اپنے محل واقع نرہی پر ان کو ایک کمرہ قیام کے لئے دیا اور ان کے تمام اخراجات کا تکفل کیا۔ مدرسہ ناظمیہ میں نام لکھوایا جہاں سے انہوں نے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد سلطان المدارس سے صدر الافاضل کی سند حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان دیا۔ خطابت میں انہوں نے وہ شہرت حاصل کی کہ کوئی اُن کا مثل نہ تھا۔ نہایت بچے اور مرصع فقرے آواز کے ساتھ ہاتھ اور چشم و ابرو کے موزوں اشاروں سے مطالب ادا کرتے تھے کہ مجمع پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا تھا ایک عالم ان کی ذاکری کا گرویدہ تھا۔ مہاراجہ محمود آباد نے جب مدرسۃ الواعظین قائم کیا تو ان کو اس کا مدرس اعلیٰ مقرر کیا اور ۱۹۲۵ء میں ان کو شمس العلماً کا خطاب دلوایا۔ اردو فارسی عربی میں اعلیٰ درجہ کے شعر کہتے تھے۔ ۲۸ محرم الحرام ۱۳۵۴ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی۔

تصانیف عربی فارسی اردو میں کئی تصنیفیں ہیں جو شائع ہو چکی ہیں۔ اولادیں بھی کئی تھیں۔

ان میں سالک صاحب بہت اچھے شاعر تھے۔ ایک صاحبزادے وارث حسین صاحب لندن میں مقیم ہیں اور مجلسیں خوب پڑھتے ہیں۔

ایک صاحبزادے لکھنؤ میں ہیں وہ شاعر بھی ہیں اور کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ انگریزی میں ایم اے ہیں اور عربی کے بھی فاضل ہیں۔

مولانا محمد رضا صاحب شمس پور ضلع جونپور کے رہنے والے ۱۲۹۶ھ میں پیدا ہوئے سن شعور کو پہنچ کے لکھنؤ آئے اور علماء سے درس لیا فلسفہ و منطق میں تبحر حاصل کیا سلطان المدارس میں استاد معقولات مقرر ہوئے۔ ذاکری میں بڑا کمال حاصل بیان فلسفیانہ ہوتا تھا۔ مُلا صدرا اور بوعلی سینا کے افکار کو آسان زبان میں بیان کرتے تھے۔

مولانا سبط حسن صاحب کے برابر ان کو شہرت اور مقبولیت حاصل تھی۔ دونوں حضرات کے بیان میں جداگانہ لطف تھا۔ ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۲ء کو رحلت فرمائی۔ دو صاحبزادے مولانا سید محمد صاحب صدر الافاضل اور مولانا سید علی صاحب صدر الافاضل ایم اے تھے۔

مولانا عالم حسین صاحب بڑا گاؤں ضلع فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم فیض آباد میں حاصل کر کے لکھنؤ آئے اور سلطان المدارس سے صدر الافاضل کا امتحان پاس کیا اور اسی مدرسہ میں ادب پڑھانے پر متعین ہو گئے۔ لغت و اشعار عرب کے ماہر تھے متنبی سبعۂ معلقہ نہج البلاغہ پڑھاتے تھے۔ عربی نظم و نثر قلم داشتہ لکھتے تھے۔ نہایت متقی و پرہیزگار تھے سہ پہر کو تفریح کے لئے نکلتے تھے۔ وکٹوریا اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے پیجامہ ٹخنوں تک اٹھاتے رہتے تھے۔ مجلس بھی پڑھتے اور علمی بیان ہوتا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوا۔ اولاد میں مولانا خادم حسین صاحب مولانا جواد حسین صاحب مولانا زین العابدین صاحب۔

مولانا سجاد حسین عرف لڈن صاحب جو لڈن صاحب مناظر مشہور تھے منطق و فلسفہ اور

طب میں اعلیٰ قابلیت کے مالک تھے مناظرے میں ید طولیٰ رکھتے تھے ہر مذہب کے مناظرے مناظرے کے لئے اور سب پر غالب آئے مطب بھی کرتے تھے مجلسیں بھی پڑھتے سادہ وضع میں رہتے تھے منطق کے درس میں مست رہتے تھے ۔ بہت سے ان کے شاگرد تھے ۔ ۱۳۴۰ھ میں وفات پائی ۔

شیخ ممتاز حسین ۔ ایڈیٹر اودھ پنچ ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے جناب تاج العلماء سے فلسفہ منطق ہیئت و اخلاق کی کتابیں پڑھیں اور عبرانی سیکھی ۔ منشی کرامت حسین صاحب سے قدم و حدوث پر بحث ہوئی اُن کی فرمائش سے اودھ پنچ نکالا مرزا احمد ہادی مرزا کے ساتھ ریڈر کریچین کالج اردو شارٹ ہینڈ مینول تیار کی ۔ مرزا صاحب اور مولانا علی حیدر نظم طباطبائی ان کے قدردان تھے ۔ بلا کے ذہین صاحب فکر و نظر زبردست انشاپرداز نقاد تھے صرف اپنی ذہانت سے ظرافت کے پہلو نکالتے تھے ۔ ۱۹۲۷ء میں انتقال ہوا ۔

اطباء | حکیم احمد حسن صاحب حکیم منے آغا صاحب فاضل حکیم منے آغا صاحب آفتاب حکیم مظفر حسین صاحب حکیم مجن صاحب حکیم اغن صاحب حکیم میرن صاحب، حکیم عبد المعید صاحب، حکیم عبد الحسیب صاحب، حکیم ہادی رضا صاحب، حکیم دیانۃ الحق صاحب شہر کے مشہور طبیب تھے ۔

شعراء | مولانا علی نقی صاحب صفی اودھ کے امیر خسرو تھے ہر صنف میں کہا ہے اور اس کا حق ادا کر دیا ہے ۔ اردو میں ایسا کوئی شاعر پیدا نہ ہوا ۔

مرزا محمد ہادی صاحب غزل اور قصیدے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ۔ انوار حسین صاحب آرزو غزل گوئی اور خالص اردو میں یکتائے زمانہ تھے ثاقب صاحب غزل اور قطعہ کے استاد تھے ۔ کاظم حسین صاحب محشر قصیدہ بے مثل کہتے تھے ۔ مرثیہ گویوں میں عسکری مرزا صاحب مؤدب فنون شعریہ سے واقفیت میں یکتا اور متروکات میں شدید تھے ۔ فرزند حسین ذاخر مرتبہ غزل بھی کہتے

تھے مختار نامہ بھی بے مثل کہا تھا اور نوحے بھی بے مثل کہتے تھے۔ مولانا آقا حسن صاحب نے ان کو دعبل ہند کا خطاب دیا تھا۔

خوشگو شعرا خوشگو شعرا میں مجاور حسین تمنا استادی کا درجہ رکھتے تھے ان کا شعر ہے ؎

خدا معلوم کس عالم میں اتنے دن گزرے ہیں — کہ دل کی چوٹ بھی ابدا نہیں دیتی جوانی میں

الطاف حسین عرف ابو صاحب عالمؔ حیدر حسین صاحب نکہتؔ فریدون مرزا مجروحؔ محمد صاحب بہارؔ سید حسن بیتابؔ، نواب سلطان بہادر نظرؔ، شیخ قربان حسین عزتؔ، نواب امراؤ مرزا مہرؔ، نواب نادر مرزا انجمؔ، حکیم مرزا محمد علی مخزونؔ، سید کاظم حسین ہدفؔ، میر صادق حسین صبرؔ، سید صاحب حشرؔ، سید علی عرف آغا صاحب، کوثرؔ محمد حسین صاحب فرحتؔ اصغر علی خاں صاحب ارشدؔ شمشاد حسین صاحب گویاؔ، زاہد حسین صاحب فوقؔ، ظفر حسین صاحب ظفرؔ، مظفر حسین صاحب خمارؔ، نواب پٹن صاحب رازؔ، محمد عباس صاحب جنونؔ، حکیم احمد حسن صاحب حسرتؔ، نواب لڈن صاحب صولتؔ، نواب علی قدر صاحب نگینؔ وراثت علی صاحب فکرؔ، سید علی غضنفر صاحب غضنفرؔ، سید علی مظفر صاحب، مولانا کلب عسکری صاحب بدرؔ، میر عابد علی صاحب شمشادؔ، سید باقر رضا صاحب جوشؔ، محمد عاشق صاحب جنونؔ، محمد صاحب شاکرؔ، خواجہ مبشر حسین مبشرؔ

مزاحیہ گو شعرا حقیقت یہ ہے کہ جو مزاحیہ گو شعرا گزرے ہیں ان میں مسخرہ پن کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ سب سے پہلے میر جعفر زٹلی نے مزاحیہ گوئی کا حق ادا کیا ہے ان کے بعد اکبر الہ آبادی نے

لے یہ ادوار ہم نے ابتدائی شہرت کے لحاظ سے قائم کئے ہیں ورنہ ہر دور میں پہلے دور کے بہت سے باکمال موجود تھے اور بعض نے اتنی عمر پائی کہ دوسرے دور کے بیشتر افراد ان کے سامنے مر گئے۔

اس میں کمال حاصل کیا ان کے یہاں نہ صرف مزاح تھا بلکہ اکثر معاشرہ کی خرابیوں کا مذاق اڑا کے اسکی قباحت ظاہر کرتے تھے ان کے بعد لکھنؤ میں جناب مقبول حسین ظریف نے ظرافت کا اعلیٰ معیار پیش کیا ان کے یہاں بھی اکثر معاشرہ کی خرابیوں کا مضحکہ ہے۔ ان کے دو لطیفے بھی ہیں۔

لطیفہ ۱ | رفاہ عام میں مشاعرہ تھا جس کے صدر سر وزیر حسن تھے۔ شعر پڑھا:

داڑھی مونچھیں صاف ہیں شکل چقندر دیکھئے　　مادہ رو ہیں مغربی تہذیب کے نر دیکھئے

سر وزیر حسن صاحب نے خوب تعریف کی۔

لطیفہ ۲ | رفاہ عام کلب میں مشاعرہ تھا، سر سیتارام بڑے صاحب ذوق اور اردو شاعری کے دلدادہ تھے۔ صدر مشاعرہ تھے ظریف صاحب نے شعر پڑھا۔

نر ہے یا مادہ عجب ترکیب ہے اس نام کی　　کچھ حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے سیتا رام کی

بعض شعر میں بہت اچھی ادبی تنقید ہے۔ ہندوستان کے فارسی گو شعرا کے کلام میں فارسیت نہیں ہوتی اس کو ظریف صاحب نے بڑے شاعرانہ انداز میں کہا ہے۔

فارسی میں کسی ہندی کا جو دیوان نکلا　　بیضۂ بلبل شیراز سے الّو نکلا

محمد ذکی صاحب مرثیہ گو میں کمال رکھتے تھے۔

نواب عالیقدر شاہی خاندان سے تھے۔ ظریفانہ شعر خوب کہتے تھے۔ ان کا شعر ہے۔

آ کے پوچھا جو مرے طائر دل کو اس نے　　ناز اس شوخ کا شاید کوئی بلی ہو گا

ظرافت شیخ نور محمد ساکن حسین گنج لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ تلاش دل

تلاش دل جو تمھیں چھلنی لئے پھرا برسوں　　تمہارے کوچہ کی اک عمر خاک چھانی ہے

غٹ غوں لکھنؤ کے رہنے والے باوقار شخص تھے

ہوا ہے گھر ہمارا جب سے برباد　　وہ کہتے ہیں ہمیں بندر کی اولاد

لباس نو ہے بی شیریں کے بر میں نیا تیشہ خریدیں بھائی فرہاد

تذکرۂ خندۂ گل میں ایسے بہت سے شاعروں کا ذکر ہے ان کا لکھنا طول کلام کا باعث ہوگا۔

ان پڑھ شعرا احمد علی احمد شریف خاندان تھے مگر تعلیم سے محروم رہنے کی وجہ سے خدمتگاری کا پیشہ اختیار کیا۔ ان کا شعر ہے ؎

کون مارا گیا ناکام تمنا یارب کیوں یہ روتی ہوئی مقتل سے قضا آئی ہے

واجد علی نائی صرف غزل کہتا تھا۔ اُن کا شعر ہے ؎

نہ ہوا اس پہ بھی وہ شوخ وفا کا قائل ہنس ہنس کے سہے اور کبھی شاکی نہ ہوا

سید احمد حسین شفیق مفتی گنج کے رہنے والے نہایت خوشگو شاعر تھے ہر صنف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کا دیوان چھپ چکا ہے غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اک جوانی کا سبب اور پُر ارماں ہونا سخت مشکل ہے مری موت کا آساں ہونا

دیکھ کر روتے ہوئے مجھ کو تمہیں ہنسنا نہ تھا برق کے گرنے سے بیتاب اور بھی دل ہوگیا

کس کشاکش میں پھنسا جا کر یہاں کوئی دوست اک طرف سے موت آئی اک طرف سے بےدوست

حال بیمار محبت کا بہت نازک ہے اب چمک درد کی اٹھے گی تو مر جائے گا

دل عشاق پہ آئیں گی بلائیں لاکھوں آپ کے دوش پہ گیسو جو بکھر جائے گا

دل کا کنول بجھے ہوئے مدت گزر گئی اب یہ چراغ لائقِ محفل نہ رہا

دستِ طلب بڑھا تو مگر بات بھی گئی
مرنے کے بعد کیا کفِ سائل میں رہ گیا

تمہاری زلف کے کوچہ میں ڈر ہے لٹنے کا اندھیری رات میں جاتا ہے قافلہ دل کا

سید صادق علی عرف چھنگا صاحب تخلص حسین لکھنؤ سبزی منڈی میں پیدا ہوئے ایسے باکمال

شاعر تھے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان سے بڑا بھی کوئی شاعر تھا۔ غزل قصیدہ مرثیہ سب کچھ کہتے تھے آخر میں صرف مرثیہ کہتے تھے۔ ایک مرثیہ میں طوفان نوح نظم کیا ہے چند بند ملاحظہ ہوں۔

جس جس جگہ تھی ریت وہاں دھارے ہو گئے — بہتے ہوئے حباب بھی سیارے ہو گئے
ذرے زمیں کے ٹوٹے ہوئے تارے ہو گئے — ابھرے رہے جو نخل وہ فوارے ہو گئے
ملتی تھیں موجیں، عرش معلیٰ کے کاخ سے
کونپل کے بدلے دھار نکلتی تھی شاخ سے

تھا جو کہیں اتار زمیں کا، کہیں چڑھاؤ — پانی کا اس سبب سے نہ تھا ایک سا بہاؤ
ٹھیرے ہوئے میں تھا خس و خاشاک کا جماؤ — اور زور تھا جہاں یہ وہاں کوہ بھی تھے ناؤ
پتھر بھی انقلاب نیا اک دکھا گئے
مغرب کے جو پہاڑ تھے مشرق میں آ گئے

میداں سارے غرق تھے اور سبزہ زار غرق — کیا ذکر ہے مکانوں کا تھے کوہسار غرق
بڑھتا جو اور ہوتی جہنم کی نار غرق — المختصر تھی، ہستی ناپائیدار غرق
یہ وجہ تھی، جو موت ہر اک کو پسند تھی
راہ عدم نہ ہوتی تو ہر راہ بند تھی

ڈوبے ہوئے تھے آب میں اس طرح کوہسار — جس طرح سنگریزے ہوں کچھ تہ میں آشکار
قہر خدا محیط تھا موجیں تھیں بے قرار — تھے مچھلیوں کے واسطے گرداب کے حصار
تھرا رہا تھا مہر بلندی سے آب کی!
پانی کو ناپتی تھی کرن آفتاب کی

برف باری سے بیاباں کا ہے سبزہ پامال — پالا کھانے سے ٹھٹھرے ہوئے جنگل کے نہال

اوس میں بھیگ کے نرگس کا برا ہے احوال　　　بیل جو باغ میں ہے اسی پہ ہے فالج کا خیال

گر بشر کھائیں ہوائیں کی تو ہوں تن نیلے!
آج تک ہیں اسی دن سے اب سوسن نیلے

اوس پڑنے سے ہے بھیگی ہوئی صحرا کی زمیں　　　طائروں کو بھی برودت سے کہیں چین نہیں
برف اس حد کی گری ہے کہ وہ صحرا ہے سفید　　　کوہ اسود تھا جو پہلے، وہی سارا ہے سفید
منزلوں دیکھیے میدان میں سبزہ ہے سفید　　　سنگِ مرمر کی طرح سامنے دریا ہے سفید

پانی جمنے سے سمندر میں کہاں جوش ہے آج
جو شجر بن میں ہے گویا وہ کفن پوش ہے آج

جانور جانوں سے بیزار نظر آتے ہیں　　　برف کے دشت میں انبار نظر آتے ہیں
طرفہ دنیا کے کچھ آثار نظر آتے ہیں　　　یعنی بلور کے اشجار نظر آتے ہیں

بلبلیں باغ میں بے کار بھی اب روتی ہیں
برگ ہیرے کے جو ٹکڑے ہیں تو گل موتی ہیں

ایک مرثیہ اُن کا بہت مشہور ہے جو سوز خوان پڑھا کرتے ہیں۔

آج مقتل میں عجب بے سروساماں ہیں حرم

ان پڑھ شعرا کے تذکرے میں لکھا ہے کہ دولہا صاحب عروج میں ان کی مجلس مرثیہ خوانی میں بلند آواز سے کہا آپ فخر ہندوستان ہیں ان کے کمالِ فن کے سب معترف تھے۔

۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا کوئی بیٹا نہ تھا۔ سارا کلام تلف ہو گیا۔

شاعرہ خواتین | سردار بیگم نام سردار تخلص، شریف زادی تھیں پڑھی لکھی نہ تھیں مگر شعر خوب کہتی تھیں ؎

موت آئے کسی بہانے سے　　　دل مرا اٹھ گیا زمانے سے

رعنائی قدسیہ بیگم غزل خوب کہتی تھیں ان کا شعر ہے ؎

کم بخت کیسی آنکھ لگی اور دکھ ہوا　　　میں جانتی تھی آنکھ لگی دل کو سکھ ہوا

ماہرہ چھنگا صاحب حسین کی بڑی صاحبزادی تھیں خوب شعر کہتی تھیں۔ اور پڑھتی بھی خوب تھیں صرف عورتوں کی محفل میں۔

شاعرہ طوائفیں | چھوٹی صاحب لکھنؤ کی رہنے والی حسن و جمال میں یکتا شعر بھی کہتی تھی ؎

جسکی چالاکی کے آگے برق بھی غمناک ہے　　　یار میرے ہاتھ آیا اس قدر چالاک ہے

قدیر جان، گوہر جان کی بیٹی پاٹے نالے پر رہتی تھی۔ اس کا شعر ؎

وصل کی شب بھی نہ باز آیا شرارت سے وہ شوخ

مسکرا کر پھیر لی کروٹ ستم ہم پر ہوا

ہندو شعرا | ہندو شعرا میں منشی بشیشر پرشاد منور، پیارے لال شاکر، منی لال افسر، لالہ گوری پرشاد مجروح۔ غزل گو اور نانک چند مرثیہ کہتے تھے۔

سارا شہر شاعری میں غرق تھا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں دو چار شاعر نہ ہوں شادی و غم کے دعوت نامے مجلس و محفل کے رقعے نظم ہوتے تھے۔

چوک میں ایک پان کی دکان پر یہ مصرع لکھا تھا۔ ع

کرتی ہے سرخرو وہ گلوری ہے پان کی

نخاس میں حکیم میرن صاحب کے دواخانے کا نام "معدن الادویہ" تھا۔ اسکے سائن بورڈ پر یہ مصرع لکھا تھا۔

ع "دواخانہ معدن الادویہ"

کاظم حسین مقدس خاندانی نواب زادے تھے۔ گورنمنٹ سے وثیقہ ملتا تھا۔ عربی فارسی کی تحصیل کی تھی اس وجہ سے بجائے نواب کے مولوی کہے جاتے تھے وہ نظم میں بات کرتے تھے۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت کی دکان چوک میں ادبأ اور شعرأ کا اڈہ تھی۔

متعدد انجمنیں تھیں آئے دن مشاعرے ہوتے تھے۔ صرف اعلان مجمع کے لئے کافی ہوتا تھا۔ ہندو بھی عام طور پر اردو شاعری سے دلچسپی رکھتے۔ زبان و بیان کی نزاکتوں کو سمجھتے تھے۔

منوہر لال زتشی محکمہ تعلیم میں انسپکٹر تھے اردو کی اچھی لائبریری تھی وسیع مطالعہ تھا اور صاحب نقد و نظر تھے۔

احسان العجم خاقانی مشکل گوئی میں مشہور ہے اس کے قصیدوں کی بہت سی شرحیں ایران و ہندوستان میں لکھی گئی ہیں ان میں محمد عبدالوہاب افضل بن ثابت، محمد داؤد شادی آبادی، شوکت میرٹھی، شاداں بلگرامی کی شرحیں اور رسلمانی کا حاشیہ مشہور ہے مگر محمد تقی شادمان لکھنوی نے ایک معرکہ آرا شرح لکھ کے یہ ثابت کر دیا کہ ایران و ہندوستان میں کوئی نقاد سخن احسان العجم کو اس طرح نہ سمجھ سکا۔

خطاطی | مرزا محمد جواد اپنے وقت کے اعجاز رقم تھے۔

موسیقی | رؤسا میں راجہ نواب علی خاں کو موسیقی میں بڑا کمال تھا۔ ایک ضخیم کتاب دو جلدوں میں معارف النغمات انہوں نے لکھی ہے جو اس فن کی سب سے بلند پایہ کتاب ہے۔

بندادین کے تین لڑکے اچھن، لچھو اور شمبھو اپنے بزرگوں کی یادگار اور موسیقی کے بحر ذخار تھے تلوار کی دھار اور بتاشے پر ناچتے تھے۔ شمبھو میوزک کالج دہلی کے پرنسپل ہو گئے۔

نرائن کتھک بہت خوبصورت اور نازک اندام تھا۔ اجنبی عورت سمجھتے تھے۔ ناچنے میں اپنا مثل نہیں رکھتا تھا۔

طوائفوں میں جلی خورشید حُسن و جمال اور کمالِ فن میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ کنکوا بھی خوب لڑاتی تھی۔

عرش منیر اور رام دلاری۔ سبزی منڈی میں۔

رام پیاری بساطیوں کی مسجد کے سامنے۔

جان بہار میوہ والی سرائے میں۔

بے نظیر اور فیروزہ جان۔ نخاس میں۔

اندری گھسیاری منڈی میں نیاز فتح پوری کی پڑوسن۔

دُرگا بائی کھالے جی کے بازار میں۔

دولت جان بزازہ میں، ثریا جان امین آباد میں، رفیق جان لال باغ میں۔

کشوری جان چوپٹیوں پر مشہور طوائفیں لکھنؤ کی تہذیب اور کمالِ فن کا نمونہ تھیں۔ اسی زمانہ میں ایک میوزک کالج اعلیٰ پیمانے پر قائم ہوا۔

مہتاب ڈومنی لکھنؤ کی مشہور ڈومنی پاٹے نالے میں رہتی تھی۔ زنانی محفلوں کی بہار تھی تین اور اسکی ہم نوا ساتھ ہوتی تھیں۔ ایک طبلہ ایک مجیرا۔ ایک سارنگی بجاتی اور سب مل کے دھن پر گاتیں اور نقلیں کرتیں۔ اس زمانہ میں بیس روپیہ لیتی تھیں۔ پاندان کا خرچ، ناشتہ کرایہ انعام، سہرا گوائی، تل چٹوائی، گلوری اُٹھوائی، غلام کہلائی الگ لیتی تھی۔ پتیلیاں بھر بھر کے کھانا لے جاتی تھی۔

کنکوے بازی چھوٹے محمد ہادی، سلطان بخت، حیدر دائی والا، عاشق شیر شکاری امیر علی ٹوپے والے ضیغم حسین، نواب اغن صاحب، پیارے صاحب، ڈرائنگ ماسٹر جلی خورشید طوائف کنکوا اڑانے میں اور میرن صاحب کنکوا بنانے میں مشہور تھے۔ جہاں کنکوا بنانے اور لڑانے میں

جدتیں پیدا کی گئیں وہاں اس سے بعض موقعوں پر کام بھی لئے گئے۔

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن آیا۔ کانگریس نے سائمن گو بیک کی تحریک شروع کی۔ حکومت نے سائمن گو بیک کہنا جرم قرار دیا۔ قیصر باغ میں کمیشن کی پارٹی تھی۔ گورنمنٹ کا گلیوں میں سرِ راہ مکانوں پر سخت پہرہ تھا کہ کوئی سائمن گو بیک نہ کہے یا کسی چیز پر لکھنے نہ پائے۔ کمیشن راستہ سے تو گزر گیا۔ مگر عین جلسے میں کسی نے کنکیا پر جلی حروف میں سائمن گو بیک لکھ کے گرایا اور حکومت کے انتظام کو خاک میں ملا دیا۔

بٹیر بازی | بٹیر بازی ابھی زندہ تھی۔ بنے صاحب پیر بخارا میں۔ احمد نواب عرف نبو موذن مسجد آتو جی۔ نواب بڈھن صاحب۔ مودی پہلوان شیش محل اور ربلاقی تمباکو والا۔ چھوٹی شہزادی کی ڈھیوڑی پر شہر کے نامی بٹیر باز تھے۔

پیراکی | خلیفہ رضا حسین ملاحی اور کھڑی کے استاد تھے۔ سید ضامن حسین کو ہر طرح کی پیراکی میں کمال تھا۔

سپہ گری | آغا ابو صاحب۔ نوابوں میں اور ممتاز العلماء مولانا ابوالحسن عرف منن صاحب علماء بانک بنوٹ کے استاد تھے۔ صادق پہلوان اور زوار پہلوان کا کشتی میں نظیر نہ تھا۔ سبحان پہلوان حسین آباد میں اصغر حسین چھاپے ساز مفتی گنج میں شام بہاری فتح گنج میں رام داس امین آباد میں گردھارا بسنتہ کھالے جی کی بازار میں شہر کے مشہور پہلوان تھے۔ مولی پہلوان فن اور نفاست میں مشہور تھے زردوزی کی جانگھیا پہن کے کشتی لڑتے تھے اور مٹی کہیں نہ لگنے پاتی تھی۔ آغا پہلوان بھی مشہور تھے۔ زور آوری میں چھوٹے آغا کا مثل نہ تھا۔ تانبے کی دلدار سینیاں چٹکی سے چیر ڈالتے تھے بندوق کا نشانہ بھی بہت اچھا تھا۔ ہتیلی پر گلاب کا پھول رکھ کے اُڑا دیتے تھے۔ پنجہ اُن کا کوئی پھیر نہ سکا۔

کنکوا بھی خوب لڑاتے تھے۔

نبو پہلوان چوک میں شام کو حقہ پلاتے تھے۔ دو زلفیں ان کے شانوں پر لٹکتی رہتی تھیں دونوں میں دو آدمیوں کو لٹکا لیتے تھے۔ لالہ کمہار (جو پٹیوں کا بڈھا) پھل اور ترکاریاں ایسی بناتا تھا کہ اصلی میں ملا کے رکھ دینے کے بعد تمیز نہیں ہو سکتی۔ آدھ انچ کا سارس اور مختلف جانور، روغنی چلمیں، منڈ کا کلس، مکان کی روغنی جالیاں، مٹی کے آدمی مختلف پیشے کے۔ اور جانور۔ ایسے عمدہ بناتا تھا کہ ان کا مثل کہیں نہ بنتا تھا۔

گھسیٹے، الٰہی بخش، تراب علی، بابو نائی حجامت بنانے میں شہرت رکھتے تھے۔ مشہور ہے کہ الٰہی بخش ایک انگریز کی حجامت بنایا کرتا تھا۔ ایک دن حجامت بنانے گیا وہ سو رہا تھا۔ نوکر نے کہا صاحب سو رہے ہیں۔ اس نے کہا کوئی حرج نہیں سونے دو مجھے ان تک پہنچا دو۔ وہ لے گیا۔ اس نے سوتے میں حجامت بنا دی۔ جب وہ جاگا اور اُس نے اُس کا یہ کمال آئینے میں دیکھا تو بلوا کے کہا دونوں ہاتھ پھیلاؤ اور جس قدر روپیہ آئے وہ تمہارا انعام۔ چھتر روپے اس کے دونوں ہاتھوں میں آئے۔ ناخن تراشی میں بڑا کمال تھا۔ اور ناخن کاٹنے کے بعد پندرہ بیس تراشے بال سے باریک مگر سالبوت نکالتا تھا۔

کاظم حسین جوہر شناسی میں مشہور تھے کلکتہ، بمبئی تک اُن کی ڈھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جوہری مشورہ کے لئے بلاتے تھے اور ہزاروں روپیہ دیتے تھے بہت شان سے رہتے۔ خدمت گار پانوں کی ڈبیا لئے پیچھے چلتا تھا۔ دس پندرہ آدمی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔

مانک چند، موتی لال جی، لچھمی نرائن، پنالال جوہر شناسی میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے۔

نواب حیدر بہادر بھی ایسے جوہر شناس تھے کہ ہندوستان بھر کے جوہری ان کا لوہا مانتے تھے۔ بگڑے ہوئے موتیوں کی جلا میں ہندوستان بھر میں مشہور تھے۔

نگینہ ساز | امجد حسین مہدی گنج میں، مرزا علی حسین، میر سید علی اور للن صاحب مفتی گنج، صادق حسین چشم جھپک کھالے جی کی بازار میں، بھولا ناتھ، احسان کھنڈ والے تکیہ جھنوائی ٹولہ میں مرزا حیات بیگ دوگانواں میں بہترین نگینہ ساز تھے۔ کلکتہ اور بمبئی کے بازاروں میں اُن کے بنے ہوئے نگینے بکتے تھے۔

حکاک | شہنشاہ مرزا حکاک کو زمرد بنانے میں کمال تھا۔ ایک دفعہ محمود علی چار یاری عاشق شیر نگار وغیرہ نے ان سے دس تولہ کا زمرد بنوایا اور بمبئی لے جاکر دس لاکھ کا فروخت کیا۔ روپیہ کی تقسیم میں جھگڑا ہوا۔ محمود علی چار یاری نے نصف مانگا کیوں کہ اس نے فروخت میں زیادہ کاوش کی تھی ساتھیوں نے مساوی دینا چاہا۔ اس نے جوہری سے کہہ دیا۔ یہ لوگ دھوکہ دہی میں گرفتار ہوئے اور مقدمہ چلا مگر عدالت سے چھوٹ گئے۔ کیونکہ دھوکہ دہی ثابت نہیں ہوئی۔ وکیل نے یہ بحث کی کہ شیشہ جو زمرد کہہ کے پیش کیا گیا تھا وہ سامنے تھا کسی لفافے میں بند کر کے قیمت طے نہیں ہوئی خریدنے والے نے کیوں خریدا نتیجہ میں سب چھوٹ گئے۔

اخبار | سیارہ، سفینہ، الناطق، سرفراز، آزاد، مسلم گزٹ، ہمدم، حقیقت، جدت، حق، ہمت، اودھ پنچ، سرپنچ، اخبار اور النجم، سہیل یمن، الواعظ، التبلیغ، مبصر، ادب، جام جہاں نما، الناظر، نگار، نظر، معیار، صاعقہ مشہور ادبی اور مذہبی رسالے تھے۔

مختلف اشیاء | غلام حسین کے پُل کا پینے کا تمباکو، لونگ کا خمیرہ اور سیخ کے گولا کواب، کنکر کے کنویں کی سہال شاخیں، پاٹے نالے کی اندرسے کی گولیاں اور تل کے لڈو، نخاس اور فرنگی محل کے پُل کی نہاری، بقر عیدی کی شیرمال، ممولا کی مسجد کی بالائی، اصغر علی محمد علی کا عطر مشہور زمانہ تھا

عمارتیں | اس زمانے میں چار باغ کا ریلوے اسٹیشن نہایت عالی شان تعمیر ہوا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اُسی انجنیئر نے اسی نقشے کا کانپور اسٹیشن بھی بنایا مگر جو شان لکھنؤ کے اسٹیشن کی ہے

وہ کانپور کے اسٹیشن کی نہیں۔ یہی حالت میڈیکل کالج کی ہے جو کلکتہ میڈیکل کالج کے نقشہ پر بنا۔ مگر جو حُسن لکھنؤ میڈیکل کالج پر برس رہا ہے وہ کلکتہ میڈیکل کالج کو نصیب نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ زمین کا معجزہ ہے۔

اسمبلی ہال اور لکھنؤ یونیورسٹی بھی اس زمانہ کی خوبصورت اور شاندار تعمیر ہے۔ رؤسا میں چھوٹی رانی (مہاراجہ محمود آباد کی زوجہ ثانی) کا مکان بھی شہر کی عالی شان عمارتوں میں ہے۔

عجائب خانہ ایسا عجائب گھر ہندوستان میں کہیں اور نہیں۔ اپنی وسعت کے ساتھ ایک بڑی خصوصیت اس کی یہ ہے کہ خونخوار شیر، چیتے، تیندوے بے کٹھرے کے آدمیوں کے سامنے گھومتے پھرتے ہیں، ہر درندے کے رہنے کے لئے ایسی کوٹھری بنائی ہے جو اوپر سے چھوٹی سی پہاڑی معلوم ہوتی ہے کچھ دور پر اس کے چاروں طرف اتنی چوڑی نہر بنائی ہے کہ وہ جست کر کے پار نہ کر سکے۔ نہر کے ایک طرف تماشائی کھڑے رہتے ہیں۔ دوسری طرف شیر ٹہلتا رہتا ہے۔ ایسی بہت سی پہاڑیاں ہیں۔

ہر طرح کے چرند پرند جمع کئے گئے ہیں۔ جنہیں دیکھ کے خدا کی قدرت اور صنعت نظر آتی ہے ساری دنیا کے مشہور اور عجیب جانور لائے گئے ہیں۔ جگہ جگہ سبزہ زار، پھولوں کے تختے، درختوں کے جھنڈ بڑے بڑے درخت سلیقہ سے لگائے گئے ہیں۔ سنگ مرمر کی چھوٹی چھوٹی برجیاں اور بنچیں ہیں کہ سیر کرنے والے دھوپ اور برسات میں پناہ لے سکیں۔ یہ شاہی زمانے کی بنی ہوئی ہیں انہیں بڑے سلیقے سے باغ کے نقشے میں شامل کر لیا گیا ہے۔

اس زمانہ میں بھی لکھنؤ ہندوستان کے خوبصورت شہروں میں تھا، اہمیت کے لحاظ سے تہذیب و تمدن کا مرکز زبان و شاعری کا گھر اور اہل کمال کا مخزن تھا۔ یہاں کے باشندوں کی وضع قطع نشست و برخواست نفاست اور ذہانت کا شہرہ تھا۔ فلسفہ، منطق، کلام و مناظرہ میں یہاں کی برتری سب کو تسلیم تھی۔ ہندوستان کے ہر گوشہ سے مشرقی علوم حاصل کرنے والے لکھنؤ آتے تھے۔ مصنوعات

نفاست اور نزاکت میں مشہور تھیں۔ ساری دنیا کے لوگ لکھنؤ کی سیر کے مشتاق تھے۔

بقول نیاز فتح پوری کے اس زمانے میں بھی چوک میں شام کو سورج نکلتا تھا۔ اور ایسی چہل پہل نظر آتی تھی کہ لوگ دیکھنے آتے تھے۔ جوش ملیح آبادی نے اُس وقت کے چوک کی چہل پہل اس طرح بیان کی ہے۔

''چوک میں جب میں نے قدم رکھا عُود اگر لوبان کی لپٹوں نے میرا استقبال کیا پھر ہار والے کی سریلی آواز آئی ہار بیلے کے پھول، چنبیلی کے تنبولیوں کی وہ جھلملاتی تتری کُلاہیں۔ وہ دوپلی ٹوپیاں وہ شربتی کے انگرکھے، وہ گھٹنے گھٹنے پٹے۔ وہ چوڑی دار پائجامے، شانوں پر وہ ریشمی بڑے بڑے رومال، آڑی ترچھی مانگیں، کلّوں میں دبی ہوئی معطر گلوریاں، ساقیوں کے ہاتھوں میں وہ خوشبودار تمباکو کے حقے حقوں پر وہ لپٹے ہار ہاروں سے پانی کے قطروں کا وہ ترشح وہ بجتے کٹورے، وہ سارنگیوں کی تھرتھراہٹ کے ہواؤں میں ہلکورے وہ گمکتے ہوئے طبلے بالاخانوں کے چھجوں سے وہ مکھڑوں کی برستی ہوئی چاندنی اور زلفوں کے گرتے ہوئے سیاہ آبشار، کوٹھے والیوں کوئی گوری، کوئی چمپئی، کوئی سانولی سلونی، خدو خال اس قدر باریک گویا ہیرے کے قلم سے ترشے ہوئے کوئی کڑیل جوان، کوئی نوجوان، کوئی ان دونوں کے درمیان ہمکتی ہوئی اٹھان کوئی گٹھے جسم کی اور کوئی دھان پان، کسی کی ناک میں نتھ، کسی کی ناک میں نیم کا تنکا، تماشائیوں کا ہجوم، شانوں سے شانے چھلتے رہے۔ کوٹھوں پر نظر جمائے ہوئے آنے والوں کا ٹکراؤ اور ٹکراؤ پر وہ دست بستہ عذر خواہیاں''۔ (یادوں کی بارات صفحہ ۱۰۱)

تیسرا طبقہ

علماء علمائے اہل سنت میں مولانا قدرت اللہ رآد مدرسہ فرقانیہ علوم عربیہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے مگر فارسی سے ان کو عشق تھا۔ زندگی بھر فارسی نظم ونثر لکھنے اور پڑھنے میں مشغول رہے۔ شعر بھی خوب کہتے تھے۔ مشہور تھا کہ انھوں نے اپنی عربی کو فارسی پر قربان کر دیا ہے فارسی سے ذوق رکھنے والے بہت سے ان کے شاگرد تھے۔

مولانا سید علی زینبی فلسفہ منطق وہئیت میں بڑا درجہ رکھتے تھے۔ پہلے ندوہ کے مدرس اعلیٰ تھے اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی فارسی کے مدرس ہو گئے۔ کم گو اور سنجیدہ شخص تھے۔

علمائے خاندان اجتہاد میں عمدۃ العلماء مولانا کلب حسین ۱۳۱۱ھ میں پیدا ہوئے۔ سلطان المدارس سے صدر الافاضل کی سند حاصل کی۔ اور گھر میں اپنے والد بزرگوار سے پڑھ کر عراق گئے وہاں تین برس تک اکابر علماء سے درس لے کے ہندوستان آئے۔ فن خطابت میں وہ کمال حاصل کیا کہ اس وقت کے اکابر کے سامنے شہرت حاصل کر لی۔

۱۳۴۵ھ میں مجلس شام غریباں قائم کی جو اتنی مقبول ہوئی کہ آج برصغیر کے ہر شہر میں ہوتی ہے۔ ۱۳۴۶ھ میں اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ امامت جمعہ وجماعت اور ان کے اوقاف کے متولی ہوئے۔ حسن اخلاق میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ صاحب نفس زکی تھے۔ برائی کرنے والوں کے ساتھ نیکی کرتے تھے۔ ہنس مکھ ذہین شاعر فن سپہ گری کے ماہر تھے۔ ہند وپاک میں ہر دل عزیزی اور شہرت کے مالک تھے۔ ۱۳۸۳ھ / ۱۹۶۳ء کو رحلت فرمائی۔

ان کی معرکہ آرا تصنیف مجالس شیعہ ہے جو ہند وپاک میں چھپ چکی ہے۔ مولانا کلب

عمدۃ العلماء مولینا کلب حسین صاحب قبلہ مجتہد العصر

بانیٔ شامِ غریباں ـــــ عمدۃ العلما مولانا سید کلب حسین صاحب مجتہد

شامِ غریباں کا نام سنتے ہی تصور رہم کو   میں ان کا جواب نہیں ہوا مگر وہ شعلہ بیان مقرر نہیں

عابد صاحب مجتہد جوان کے فرزند اکبر تھے اُن کے جانشین ہوئے مولوی کلب ہادی صاحب اور کلب باقر صاحب پاکستان میں ہیں۔ مولانا کلب صادق صاحب لکھنؤ میں اُن کا نام روشن کئے ہوئے ہیں۔

مولانا سید محمد عرف میرن صاحب جناب سید ابراہیم صاحب کے پوتے ۱۳۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہو کے عراق گئے اور درجہ اجتہاد پر فائز ہو کے ہندوستان واپس آئے۔ اور تدریس میں مشغول رہے۔ مجلسیں بھی خوب پڑھتے تھے۔ حسین آباد کی مسجد میں امامت فرماتے تھے ۱۳۸۰ھ میں انتقال ہوا۔ جناب ممتاز العلماء کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔ دو صاحبزادے مولانا سید علی صاحب اور مولانا سید حسن صاحب یادگار چھوڑے ہیں۔

افاضل خاندان اجتہاد

مولانا اولاد حسین عرف للن صاحب تخلص شاعر بڑے ذکی و ذہین حدیث و تاریخ کے بحر ذخار شعلہ بیان خطیب بلند پایہ شاعر ظریف الطبع تاریخ میں ان کی کتاب تذکرۃ الصحابیات بلند پایہ ہے۔ ان کے اشعار کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۸ء میں انتقال ہوا۔ اولاد میں کوئی عالم نہیں ہوا۔

مولانا سید احمد صاحب جناب ہادی الملۃ کے فرزند اکبر ۱۳۱۶ھ/۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے سلطان المدارس سے صدر الافاضل کا امتحان پاس کیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سلطان المدارس سے صدر الافاضل کا امتحان دیا۔ اُسی مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے۔ عربی ادب سے ان کو بڑی دلچسپی تھی۔ مجلسیں بھی خوب پڑھتے تھے۔ مسجع و مقفیٰ اور صنائع و بدائع سے لبریز ہوتی تھی۔ ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء میں انتقال ہوا۔

مطلع انوار ص۸۷

خاندان اجتہاد کے علاوہ مولانا عبد الحسین ۱۳۱۰ھ میں پیدا ہوئے۔ فلسفی و منطقی

ادیب و شاعر شگفتہ مزاج سلطان المدارس کی علمی شان وضع داری و اخلاق میں منفرد تھے۔ ۱۳۸۱ھ ۱۹۶۱ء میں انتقال ہوا۔

مولانا مرزا عبد الحسین صاحب مولانا مرزا محمد عسکری صاحب قبلہ لکھنؤ کے ایک ذی علم رئیس کے بیٹے تھے ۱۳۰۰ھ کو کربلائے معلیٰ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی لکھنؤ آکے تکمیل کی۔ مولانا علم رجال میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ صحیح بخاری کے رواۃ پر بڑی تحقیق کی تھی اور ایک ضخیم کتاب تیار کی تھی جس کا خلاصہ رجال بخاری کے نام سے امامیہ مشن نے شائع کیا۔ حدیث و اصول وکلام پر بھی بڑا دست رس حاصل تھا خطیب و واعظ مصنف و محقق و متورع بزرگ تھے۔ کچھ دنوں تک خیر پور میرس میں امام جمعہ و جماعت اور مفتی ریاست بھی رہے۔ تصنیفات رجال بخاری کے علاوہ حقیقت السرائر فی الکبائر عربی میں چھپ چکی ہیں۔ ۱۳۶۵ھ میں انتقال ہوا۔ اولاد میں مرزا محمد کاظم صاحب کراچی میں وکیل ہیں اور پوتے ڈاکٹر شاکر صاحب ایم بی ایس، دانتوں کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔

اطبا اس طبقہ سے پہلے کے اطبا سب موجود تھے۔ اس زمانہ میں حکیم دلدار حسین مولائی حکیم محمد کاظم اور حکیم ناطق کو عروج ہوا۔

شعرا خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر، شبیر حسن خاں، جوش ملیح آبادی، مہدی حسین ناصری، آل رضا رضا، جعفر حسین منظر، سراج احمد سراج، حکیم سید علی آشفتہ، حکیم ابو العلا ناطق، تصدق حسین شمس، مولوی اولاد حسین عرف للن صاحب، شاعر دلدار حسین عرف منے آغا راز اجتہادی، سید حسن اختر ہدف اجتہادی، قدیر احمد قدیر، سردار حسین بہزاد محمد رضی شگفتہ منیر

مرثیہ گو بابو صاحب فائق، مذحسن فائز بادشاد مرزا شمیم آل رضا رضا با کمال مرثیہ گو تھے۔

مزاحیہ گو شعرا | سید محمد علی حسین گنج لکھنؤ کے رہنے والے عربی فارسی کی اعلیٰ استعداد تھی شعر خوب کہتے تھے ۔

کل ایک بک ڈپو کے منیجر نے یہ کہا　　کچھ ملک و قوم کی بھی اصلاحات چاہیئے
دلچسپ ناولوں کی ضرورت ہے ملک کو　　کشاف چاہیئے نہ اشارات چاہیئے

جو کر حسن جعفر نام شریف خاندان شوخ مزاج تھے ۔

کسی کے کان پھٹ جاتے تو کوئی گونگا ہو جاتا　　اگر بند نصیب دشمنان کوئی نغا ہوتا

خنداں عبد الحمید نام باقر صاحب حمید کے شاگرد تھے ان کا شعر ہے

میں ایک ساز ہوں مگر الٹے طریق کا　　وہ چھیڑنے لگا تو میں خاموش ہو گیا

زکی لکھنؤ گولا گنج کے رہنے والے ہر تبہ گوئی میں کمال رکھتے ۔ مزاحیہ اشعار خوب کہتے تھے ۔

نہ اُچکے کس لئے صیاد بانس چھوٹا ہے　　یہ کوششیں ہیں فقط میرے آشیاں کے لئے

رستم لکھنؤ کے رہنے والے عالم و فاضل شخص تھے ظرافت سے طبعی لگاؤ تھا شعر کہتے تھے مگر اسکی اشاعت پسند نہ کرتے تھے ایک شعر ملاحظہ ہو ۔

ہر اک زبان پہ غلغلہ ہے کھدر اور سوت کا　　پھنسی ہے مادر وطن جناب نورباف سے

اسد علی نام اسد تخلص لکھنؤ کے رہنے والے تھے ۔

اُٹھا پردہ بس اب آزادیاں بڑھتی ہیں نسواں کی　　یہ ہے تاثیر یورپ کے جنون فتنہ سلماں کی
سیاہی ہے یہ اے مغرب　　تیری زلف پریشان کی

ضاحک اودھ پنچ کے نامہ نگار تھے ۔ داغ کے مرنے پر یہ شعر کہا ہے

یاد ش بخیر آ کے اجل نے چھڑا دیا　　گویا کہ داغ صفحۂ ہستی پہ داغ تھے

دل چودھری عبدالرحمن ساکن لکھنؤ۔

میاں مجنوں نے ڈھیلا کھینچ مارا جوش وحشت میں　　اٹھا کر پردۂ محمل اگر لیلیٰ کبھی جھانکی

ان پڑھ شعرا | شیخ تصدق حسین تصدق لکھنؤ کے رہنے والے ان پڑھ تھے داستان گوئی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ تہذیب و تمدن میں پڑھے لکھوں سے کم نہ تھے۔ ان کا شعر ہے

جیسے ہیں گل زار حسینان لکھنؤ　　معشوق ہیں خطا کے نہ ایسے ختن کے ہیں

ضامن حسین خاں ضامن لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ریاست بلرام پور میں چپراسی تھے۔ بال بچے لکھنؤ میں رہتے تھے اس وجہ سے لکھنؤ آتے رہتے تھے

پردۂ جسم جو مسکن تیرا اے جاں ہوتا　　شعلۂ طور چراغ تہ داماں ہوتا

موئے مژگاں دیکھ کر بھایہ رخساروں کے پاس　　پھول ہیں دو بوستان حسن میں خاروں کے پاس

اُدبا | پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب نے بڑی کاوش سے قلمی اور مطبوعہ کتابوں کا نادر ذخیرہ جمع کیا اور ساری عمر مطالعہ میں صرف کر کے جس دقت نظر سے اپنے نتائج تحقیق پیش کئے وہ ایک عظیم کارنامہ ہے۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، واجد علی شاہ ان کی ایسی کتابیں ہیں جن کا مثل نہیں۔ وہ صرف ادیب نہ تھے بلکہ ادیب گر تھے۔ ایسے لوگوں کی ہمت افزائی کرتے رہتے تھے جو علمی کاموں میں مشغول رہتے تھے۔

نیاز فتحپوری بھی مخصوص شہرت کے مالک تھے انہوں نے ہر موضوع پر لکھا ہے اپنی پُرزور اور شگفتہ طرز تحریر اور ذہانت سے بڑی بلند پروازیاں دکھائی ہیں۔

علی عباس حسینی نے فن افسانہ نگاری میں امتیاز حاصل کیا۔ اس زمانہ میں پریم چند کے بعد اُن کا ایسا افسانہ نگار کوئی نہ تھا۔

مولانا اختر علی تلہری۔ بڑے دقیق النظر مضمون نگار تھے مفکر یگانہ کہے جاتے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب طرز انشا پرداز اور دقیق النظر تھے۔ "صدق" اخبار نکالتے تھے۔ قرآن مجید تفسیر بے مثل لکھی ہے۔

مرزا محمد عسکری بی۔اے۔ بڑے پایہ کے ادیب تھے۔ ان کی کتب نوادر ادبی خطوط غالب سکسینہ کی تاریخ ادب اردو کا ترجمہ بے نظیر کتابیں ہیں۔

نورالحسن صاحب نیر بی اے۔ ایل ایل بی۔ نے نوراللغات چار ضخیم جلدوں میں لکھی جو ایک شاہکار ہے۔

امیر احمد علوی سب جج کاکوروی نے یادگار انیس لکھی اس وقت تک انیس پر ایسی کتاب نہیں لکھی جا سکی۔ کاکوری کو بھی لکھنؤ کا ایک محلہ سمجھنا چاہیے جو صدیوں سے علم و فضل کا مرکز ہے۔ یہاں کے لوگ حکومت اودھ کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

مرزا محمد عسکری صاحب کے علاوہ یہ تمام حضرات لکھنؤ کے رہنے والے نہ تھے مگر فدائے لکھنؤ لکھنؤ تھے۔ ترک وطن کر کے ساری زندگی لکھنؤ میں گزار دی۔ اور ایسے ہی لوگوں سے لکھنؤ لکھنؤ ہوا ایسی ہی ہستیاں لکھنؤ ساز تھیں۔ آپ لکھنؤ کے بیشتر اہل کمال کو باہر کا پائیں گے۔ مگر وہ لکھنؤ کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔ اور لکھنؤ اُن پر فدا تھا۔ ناسخ، آتش، انیس، دبیر کوئی لکھنؤ کا نہ تھا یہی حال علما کا ہے جسے آپ دیکھیں گے باہر کا پائیں گے اور ان سے پوچھیں گے تو وہ اپنے کو لکھنؤ کا کہیں گے کیونکہ باپ دادا کے وقت سے لکھنؤ ان کا وطن بن چکا تھا۔

مُنّی جرنلسٹ عربی فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ انگریزی میں میٹرک تھے۔ انگریزوں کو اردو فارسی پڑھاتے تھے۔ مضمون نگاری میں شہرت حاصل کی۔ ان کا کالم گلچھرے اودھ پنچ میں بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ اُن کا کتب خانہ بھی بہت اچھا تھا کئی کتابیں بھی تصنیف کیں مگر

اب کسی کا پتہ نہیں۔

سپہ گری کشتی کے فن میں بڑے سید اور چھوٹے سید کے بہت سے شاگرد تھے ہر محلہ میں کشتی کے اکھاڑے تھے جہاں استاد شاگردوں کو کشتی کا فن سکھاتے تھے۔ بانک اور پٹے کے فن کے بڑے بڑے باکمال موجود تھے۔ جل بانک اور اگن بانک کو بڑی ترقی ہوئی۔ اس فن کے بہت سے باکمال پیدا ہوئے۔ پانی میں بانک اور پٹے سے دشمن کا مقابلہ اور اگن بانک خول دار لٹوؤں میں بڑے بڑے سوراخ بنا کر گودڑ بھر دیتے تھے۔ اور اُس میں تیل ڈال کر جلاتے جب اُس میں سے شعلے نکلنے لگتے تو دشمن پر حملہ کرتے۔

اظہارِ قوت ہر زمانہ میں اظہارِ قوت کے مختلف طریقے طاقتور لوگوں نے ایجاد کئے تھے اس زمانہ میں منصور نگر میں غلام حیدر سہ پہر کو گھر سے نکلتے تھے۔ داہنے ہاتھ کو کہنی سے موڑ کے بازو پر ایک بچے کو بٹھاتے تھے۔ گھنٹوں اس کو لئے گھومتے رہتے اور ہاتھ کو کمر پر نہیں رکھتے تھے نہ کسی اور چیز کا سہارا لیتے تھے ہاتھ سینے کے آگے رہتا تھا۔

کشمیری محلہ میں علی حسین صاحب پھونک مار کے سوڈے کی بوتل جو شیشے کی گولی سے بند ہوتی تھی اُس کو کھول دیتے تھے۔

موسیقی میوزک کالج قائم ہوا چوک میں لکھنؤ کی مشہور خاندانی طوائفوں کے کوٹھے موسیقی کا مرکز تھے۔ اور شام کو وہی چہل پہل نظر آتی تھی جو چوک کی خصوصیت تھی۔ علوم وفنون میں کمال نشست و برخواست میں سلیقہ ادب و تعظیم کی پابندی وضع قطع کی دلکشی زبان و شاعری اور ہر بات میں نفاست و شستگی نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ ہر شخص لکھنؤ کی سیر کا اب بھی مشتاق تھا۔ شہر کے مختلف بازاروں کی مختلف فضا دیکھنے کے قابل تھی۔ چوک کی فضا امین آباد کی رونق حضرت گنج کی شان و شوکت ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھی اور دیکھنے کے قابل تھی لکھنؤ کی عمارتیں سیاحان عالم کو حیران کر دیتی تھیں۔ لکھنؤ کے لوگوں کی گرمیٔ اختلاط اور تہذیب و شائستگی نو واردوں کے دلوں کو مسخر کر لیتی تھی۔

مشہور شاعر اختر شیرانی لکھنؤ کی سیر کو آنے اور یہاں کے حالات اور لوگوں کے خلوص و محبت سے متاثر ہو کے یہ نظم کہی۔

بعد مدت کے نظر آیا دیارِ لکھنؤ
دل فدائے لکھنؤ آنکھیں نثارِ لکھنؤ

عرش ساماں کیوں نہ ہو ارضِ دیارِ لکھنؤ
ہے بہارِ خلد سے بڑھ کر بہارِ لکھنؤ

مٹ چکے ہیں گرچہ تاج و تاجدارِ لکھنؤ
پھر بھی زندہ ہے ابھی روحِ وقارِ لکھنؤ

مشرقی رنگِ تمدن کی ہے خالص یادگار
کیوں نہ ہو ہر مشرقی دل سے نثارِ لکھنؤ

نو بہارِ خلد کے کھوئے ہوئے کچھ خواب ہیں
مایۂ حیرت نہیں نقش و نگارِ لکھنؤ

یہ محل اسلاف کی تہذیب کا گہوارہ ہے
ہند میں باقی ہے یہ تنہا وقارِ لکھنؤ

یہ فلک رتبہ مکاں یہ خلد ساماں گلستاں
رشکِ مہر و ماہ ہیں نقش و نگارِ لکھنؤ

وہ ہے تنہا آسماں پر اس میں ہیں لاکھوں نہاں
کیوں نہ ہو زہرہ کو رشکِ نغمہ زارِ لکھنؤ

ماہ در آغوش ہے ہر ذرہ اس کی خاک کا
اے زہے حسنِ طرب گاہِ دیارِ لکھنؤ

محفلِ شعر و ادب ہے مستِ صہبائے نیاز
ہے "نگار" لکھنؤ بے شک نگارِ لکھنؤ

خامۂ جالبؔ کہ ہے جس پر صحافت کو غرور
ایک مدت سے ہے مخمورِ بہارِ لکھنؤ

کس ادب سے لب پہ آتا ہے مرے احسنؔ کا نام
جن کی ہستی ہے فروغِ افتخارِ لکھنؤ

حضرتِ شہزادۂ باقر علی خاں کا خلوص
دل میں ہے مہماں بطورِ یادگارِ لکھنؤ

چونک کر خوابِ لحد سے اپنے ویرانوں کو دیکھ
جانِ عالم! آہ او جانِ بہارِ لکھنؤ

ایک حسنِ ناز میں تڑپائے گا برسوں ہمیں
یہ خلش دل پہ رہے گی یادگارِ لکھنؤ

اگلی عظمت یاد آتی ہے یہ رونق دیکھ کر
ہم تو اخترؔ اب بھی ہیں ماتم گسارِ لکھنؤ

چوتھا طبقہ

ابھی باقی ہے کچھ کچھ دھوپ دیوار گلستاں پر
اس مٹی ہوئی حالت میں بھی ابھی لکھنؤ پھر لکھنؤ تھا

علمائے فرنگی محل | فرنگی محل میں مولانا ارادت اللہ انصاری نے اپنے خاندانی علماء سے معقولا اور سید العلماء مولانا علی نقی صاحب سے ادب کی تحصیل کی۔ اعلیٰ درجہ کے انشاء پرداز تھے ایک اخبار بھی نکالتے تھے جو بہت مقبول تھا

مولانا عبدالباری صاحب کے صاحبزادے مولانا جمال میاں بڑے عالم اور زبردست مقرر تھے اور پاکستان تحریک کے سرگرم کارکن تھے وہ ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے ورنہ ان کا شمار اکابر علمائے فرنگی محل میں ہوتا۔

خاندان اجتہاد میں مولانا علی نقی صاحب سید العلماء اس دور کی عظیم شخصیت تھے وہ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علوم کی۔ مدرسۂ ناظمیہ سے ممتاز الافاضل اور سلطان المدارس سے صدر الافاضل الہ آباد یونیورسٹی سے عالم کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں اول آئے اور طلائی تمغہ ملا۔ عربی کے پروفیسر خلیل عرب نے ان کو سو میں سو نمبر دیئے۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ پورے نمبر دینا قاعدے کے خلاف ہے انھوں نے کہا کہ کم نمبر اس لئے دیئے جاتے ہیں کہ اس سے بہتر لکھنے کی گنجائش ہوتی ہے جب اس کا امکان نہ ہو تو پورے نمبر نہ دینا حق تلفی ہے

وہ ساڑھے تین سو کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کی کوئی کتاب ایسی

سید العلماء مولانا علی نقی صاحب قبلہ مجتہد العصر

نہیں ہے جس میں ان کی ذہنی موشگافیاں ایسی ہیں جن کے بارے میں کوئی یہ کہہ سکے کہ ہم اس کو فلاں کتاب میں دیکھ چکے ہیں۔ ہر بات مدلل اور دلیل اچھوتی ہے۔ اسی طرح تقریر میں جو وہ علمی اور منطقی موشگافیاں کرتے تھے کوئی نہیں کہہ سکتا یہ بات فلاں سے سن چکے ہیں اسکے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ اس سے پہلے نہیں لکھا گیا اور جو کچھ کہا وہ اس سے پہلے نہیں کہا گیا۔

ان کی تمام تصنیفیں مذہبی ہیں ان میں ایسی بھی ہیں جو شیعہ سنی اختلافی مسائل پر لکھی گئی ہیں مگر انھوں نے بحث کا رخ موڑ دیا ہے۔ ایک کتاب میں لکھا ہے کہ فقہائے اہلسنت میں آپس میں اختلاف ہے فقہائے شیعہ میں بھی آپس میں اختلاف ہے اسی طرح بعض مسائل میں علمائے اہلسنت اور علمائے شیعہ میں اختلاف جب ان باتوں کو فرقہ وارانہ رنگ نہیں دیا جاتا تو کوئی وجہ نہیں کہ ان باتوں کو فرقہ وارانہ رنگ دیا جائے علمی حیثیت سے ہر مسئلہ پر گفتگو ہونا چاہیئے ان کی اس فکر کا یہ نتیجہ ہوا کہ طعن بشنیع کا دروازہ بند ہو گیا۔ نیاز فتحپوری کی فرمائش سے مسئلہ خلافت پر جو مضامین انھوں نے لکھے ہیں جن کو نیاز فتحپوری نے ہر نام اور آزاد خیال شیعہ" کے نام سے اس وجہ سے شائع کیا کہ وہ ان کو مذہبی رنگ نہیں دینا چاہتے تھے۔ ان مضامین کو نیاز صاحب تک پہنچانے والا میں ہی تھا ان میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں مل سکتا جو کسی کے لئے ناگواری کا باعث ہو۔

جس سال وہ پہلی مرتبہ کراچی تشریف لائے تو نواب صاحب نے ان کی دعوت کی۔ اور لوگوں کو بھی بلایا۔ میں بھی مدعو تھا۔ وہاں ایک شیعہ وکیل نے ان سے پوچھا کہ قبلہ شیعہ سنی اتحاد کی بھی کوئی صورت ہے۔ فرمایا جن باتوں میں اتحاد ہے ان کو مقدم کیجیے اور متحد ہو جائیے۔ جن میں اختلاف ہے ان کو اپنی ذات تک رکھئے۔ اس اصول پر وہ خود زندگی بھر عامل رہے اسی سبب سے علمائے اہلسنت سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ علمائے فرنگی محل اپنے مرتبہ کے لحاظ سے یعنی کے تمام علمائے اہلسنت میں بلند ترین مقام رکھتے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ محترم ہیں اس زمانہ کے تمام علمائے فرنگی محل اُن کے شاگرد ہیں مولانا عبدالباری صاحب کے صاحبزادے مولانا جمال میاں فرنگی محلی بھی ان کے شاگرد ہیں اور کراچی میں مقیم ہیں۔ جب سید العلماء پہلے پہل یہاں تشریف لائے تو مولانا جمال میاں نے ان کی دعوت کی اس دعوت میں میں بھی شریک تھا۔ جناب سید العلماء جس طرح شیعوں کے یہاں مجلسیں پڑھنے جاتے تھے اسی طرح اہلسنت حضرات کے یہاں محفل میلاد میں تقریریں کرتے تھے۔ شیعہ سنی دونوں انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے علیگڈھ میں انھوں نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ جتنے شیعہ ان کے گرویدہ تھے اتنے ہی اہلسنت بھی۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ قابل بیان ہے جس زمانے میں ہندو پاکستان میں جنگ ہو رہی تھی سید العلماء عبا اور عمامہ پہنے ہوئے کہیں جا

رہے تھے۔ ایک نیا تھانیدار آیا ہوا تھا اس نے انھیں جاتے ہوئے دیکھا تو ایک کانسٹبل سے کہا کہ وہ پیرا شوٹ اوڑھے ہوئے پاکستانی جاسوس جا رہا ہے، اسے پکڑ لاؤ۔ کانسٹبل انھیں تھانے کی طرف لے کر چلا۔ سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی۔ کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جو اپنے گھر میں رہا ہو۔ کسی کے ہاتھ میں لاٹھی، کسی کے ہاتھ میں ڈنڈا، کسی کے ہاتھ میں لوہے کی سلاخ۔ سب نے آکے تھانے کو گھیر لیا۔ یونیورسٹی کے طلبا بھی پہنچ گئے۔ طیب جی وائس چانسلر تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور پنڈت نہرو سے ان کے مخصوص تعلقات تھے۔ وہ بہت رعب اور دبدبے کے آدمی تھے۔ انھیں معلوم ہوا، وہ بھی پہنچ گئے اور تھانیدار کو ڈانٹنا شروع کیا کہ ابھی تمھیں برخواست کراتا ہوں۔ تمھیں نہیں معلوم تم کس شخصیت کو پکڑ لائے ہو۔ تھانے کے گرد ہزاروں کا مجمع اور طیب جی کا ڈانٹنا، وہ تھر تھر کانپنے لگا اور کہا کہ میں معافی مانگتا ہوں طیب جی نے کہا ہاتھ جوڑ کر معافی مانگو۔ اس نے کہا کہ یہ مہا پرش ہیں۔ میں پیر پکڑ کر معافی مانگوں گا۔ طیب جی نے ان سے کہا کہ تشریف لے چلیے۔ اٹھے اور فرمایا جب یہ اپنوں کو نہیں پہچانتے تو پاکستانی جاسوسوں کو کیا پہچانیں گے۔ یہ ان کے اثر و اقتدار اور عام مسلمانوں میں ان کی مقبولیت کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

ان کا علمی کاموں سے انہماک خصوصاً تصنیف و تالیف کے کام سے ان کی والہانہ وابستگی ان کی زندگی کا ایک نہایت اہم رخ ہے

پہلی مرتبہ جب میں کراچی سے انھیں لینے گیا شام ہو چکی تھی کھانا آیا

کھانا کھانے کے بعد قلم ان کے ہاتھ میں تھا اور گفتگو شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ گیارہ بج گئے فرمایا اب سونے کا وقت آ گیا اب بھی آرام کیجئے آج فاقہ ہوا میں نے کہا ابھی آپ نے کھانا کھایا ہے۔ فرمایا جس دن کچھ نہیں لکھتا اس دن ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فاقہ کیا

ان کے تصنیف و تالیف کا طریقہ بھی نیا تھا چار کتابیں سلسلے سے رکھی رہتی تھیں قرآن مجید اور گھڑی سامنے ہوتی تھی۔ ایک کتاب لکھنا شروع کی جب اس سے اکتا گئے تو دوسری شروع کر دی اس طرح ایک وقت میں چار مختلف موضوع پر کتابیں لکھتے جب تھک جاتے تھے تو قرآن کی تلاوت کرنے لگتے پھر کتابیں لکھتے تھے۔ ایک دن میں نے عرض کیا کہ ایک کتاب مکمل کر کے دوسری کتاب شروع کیجئے فرمایا اس طرح کام زیادہ ہوتا ہے کئی کتابیں ایک ساتھ تیار ہو جاتی ہیں۔

پندرہ سولہ برس کے سن سے وہ اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے مگر آپ کو سن کر تعجب ہو گا کہ اردو جوان کی مادری زبان تھی اس میں شعر اچھے نہیں کہہ سکتے تھے۔ فارسی کا بھی یہی حال تھا ان کو خود بھی اس کا احساس تھا۔ وہ صرف تاریخیں اردو فارسی میں کہہ لیا کرتے تھے۔ کسی اور صنف میں کوئی شعر نہیں کہا۔ لیکن عربی شاعری سے ان کو اتنی فطری مناسبت تھی کہ وہ ایسے ایسے شعر کہتے تھے جن پر اہل زبان وجد کرتے تھے۔ ان کی ایک نظم "تاثرات الجمال" مصر کے ایک جریدے "الجامعہ" میں شائع ہوئی۔

اس کے متعلق علامہ اختر علی تلہری لکھتے ہیں کہ :-

عربی شعر و ادب پر انھیں زبردست قدرت حاصل ہے۔ آپ کا ایک لطیف قطعہ "نافرات الجمال" کے عنوان سے مصر کے ایک مجلۂ "الجامعہ" میں فاضل مدیر کے اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوا ہے :-
اس سخت قافیہ اور اس سخت وزن کی پابندی کے ساتھ نظم کے استحکام اور شعری ترنم کے مالک الفاظ کے انتخاب میں جو ندرت آفرینی کی گئی ہے وہ پڑھنے والے کو مسحور بنائے بغیر نہیں رہ سکتی

علامہ امینی نے "الغدیر" میں ان کا قصیدہ نقل کیا ہے۔ قم میں ان کے تعائد لوگوں کے پاس ہیں اور بہت شوق سے پڑھے جاتے ہیں جو اس کا ثبوت ہے کہ اہل زبان ان کے قصیدوں کو عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جہاں تک مجھے اندازہ ہے عرب ممالک میں کوئی بڑا شاعر موجود نہیں - اگر اندازہ صحیح ہے تو اس زمانے میں ان سے بڑا عربی زبان کا کوئی شاعر نہیں تھا اور جب ہم ان کے کمالات پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کا ایسا صاحب طرز انشا پرداز، ایسا سلیقۂ تصنیف رکھنے والا، ایسا مقرر، ایسا شاعر کوئی دنیائے اسلام میں اس وقت موجود نہیں تھا جو ان تمام صفتوں کا جامع ہو ۱۹۸۸ء میں یہ نابغۂ روزگار ہستی سفر آخرت پر روانہ ہو گئی ۔ مگر یہ انتقال جسمانی تھا۔ ایک ہندو فلسفی کا قول ہے کہ مہا پرش مرت کو جیت لیتے ہیں یعنی موت پر فتح حاصل کر لیتے ہیں۔ انھیں لوگوں میں سید علی نقی بھی تھے جن کو موت نہ مار سکی بقول جناب شاہد لکھنوی "زندہ رہیں گے ذہن بشر میں علی نقی" ان کی تصنیفات ان کی حیات کی ضامن ہیں
جناب ساحر لکھنوی نے بالکل صحیح کہا ہے

وہ کیا مرے گا جو زندہ رہے کتابوں میں

مولانا سید محمد صاحب جناب باقر العلوم کے فرزند اکبر ۱۳۱۶ھ میں پیدا ہوئے۔ انتہائی مقدس ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ سلطان المدارس کے اساتذہ سے درس کے فراغت کے بعد نجف گئے۔ آیت اللہ اور ان کے معاصرین کے درس خارج میں شریک ہوئے۔ ۱۳۵۱ھ کو لکھنؤ آئے اور اپنے والد مرحوم کی جگہ سلطان المدارس کے پرنسپل مقرر ہوئے ۱۳۵۲ھ کو لکھنؤ میں رحلت فرمائی

مطلع انوار ص ۶۶۱

مولانا سید علی صاحب مولانا سید محمد صاحب کے چھوٹے بھائی ہندوستان سے تحصیل علم کر کے عراق گئے وہاں سے آ کے سلطان المدارس میں مدرس ہوئے۔ مولانا سید محمد صاحب کے بعد مدرسہ کے پرنسپل ہو گئے

مولانا سید محمد حسن صاحب خلف مولانا سید ہادی صاحب ۱۳۲۶ھ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا ناظم حسین صاحب سے معقولات اور دوسرے اساتذہ سے فقہ و اصول کی تعلیم حاصل کر کے عراق گئے وہاں اکابر علماء کے درس میں شریک ہوئے اجازۂ اجتہاد لے کے ہندوستان واپس آئے اور سلطان المدارس میں مدرس دوم مقرر ہوئے ۱۹۵۰ء میں ہجرت کر کے کربلائے معلیٰ چلے گئے اور اب وہیں مقیم ہیں

مولانا سید محمد حسین صاحب، مولانا سید حسن صاحب کے چھوٹے بھائی سنہ میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان سے تکمیل علوم کر کے عراق گئے

وہاں درس خارج میں شریک ہو کے درجہ اجتہاد پر فائز ہو گئے ہندوستان واپس آئے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے فقہ و اصول میں امتیاز خاص کے مالک تھے ۱۹۳۷ء میں انتقال ہوا۔

افاضل خاندان اجتہاد

مولانا کلب نقی صاحب مولانا کلب عسکری صاحب کے صاحبزادے سید علی اکبر صاحب خلف سلطان العلماء کے نواسے مولانا آقا حسن صاحب کے برادر نسبتی سنہ میں پیدا ہوئے ابتدائے عمر ہی سے ذکاوت و ذہانت میں ممتاز تھے معقولات اور فقہ و اصول میں مولانا علی نقی صاحب کے ہم پلہ سمجھے جاتے تھے۔ ہندوستان میں تکمیل علوم کر کے عراق گئے۔ وہاں سنہ میں انتقال کیا۔

مولانا حسین حیدر صاحب جناب میر آغا صاحب کے صاحبزادے سنہ میں پیدا ہوئے۔ ذہین و ذکی تھے۔ ہندوستان سے تحصیل علم کر کے عراق گئے وہاں ان کا دماغی توازن خراب ہو گیا واپس آ کر سنہ میں رحلت فرمائی۔

مولانا علی داور صاحب سید علی اکبر صاحب کے چھوٹے صاحبزادے سلطان المدارس سے سند الافاضل کیا تھا مجلسیں خوب پڑھتے تھے جوانی میں مرض سل میں مبتلا ہو گئے ۱۳۵۲ھ میں انتقال کیا۔

مولانا ابوالحسن عرف ابو صاحب مولانا محمد طاہر صاحب کے بیٹے

العلماء مولانا ابوالحسن عرف بچھن صاحب کے پوتے صدرالافاضل کرکے امراض میں مبتلا ہو گئے اور آگے کچھ نہ پڑھ سکے۔

افاضل شہر

مولانا محمد عمید صاحب ۱۳۱۲ھ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے مدرسہ ناظمیہ سے ممتازالافاضل کا امتحان پاس کیا ناظمیہ اور دوسرے مدارس میں استاد رہے۔

دقیق النظر عالم اور فلسفی تھے۔ تقریر میں منطقی استدلال ان کا حصہ تھا ۱۳۸۷ھ ۱۹۶۷ء میں وفات ہوئی۔ تصنیفات میں نجاست مشرکین رسالہ لکھا اور بعض کتابوں پر حواشی ہیں۔ ایک صاحبزادے مولانا محمد ہادی صاحب ہیں۔

مولانا ابن حسن صاحب نونہروی ۱۳۰۸ھ میں پیدا ہوئے۔ نونہرہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرکے لکھنؤ آئے۔ ۱۳۲۹ھ ۱۹۱۱ء میں سلطان المدارس میں داخل ہوئے تکمیل کے بعد مدرسہ میں مدرس مقرر ہو گئے آخر میں مدرسۃ الواعظین کے پرنسپل ہو گئے اور آخر تک رہے بڑے ذہین اور بلا کا حافظہ تھا۔ ذاکری میں بڑا کمال اور شہرت حاصل کی ۱۴۰۰ھ ۱۹۸۰ء میں فالج میں انتقال ہوا۔

ان کے صاحبزادے مولانا شبیہ الحسن صاحب پی ایچ ڈی لکھنؤ یونیورسٹی میں ادب کے پروفیسر ہیں۔

مولانا ظفر مہدی صاحب گہرجائسی ۱۳۱۲ھ کی ابتدا میں پیدا ہوئے علوم مروجہ کی تحصیل کی عربی فارسی اور نظم و نثر میں امتیاز حاصل کیا ایک رسالہ سہیل یمن نکالتے تھے بڑے وسیع النظر تھے۔ تقریر بھی خوب کرتے تھے۔ راجا صاحب محمود آباد کے اتالیق تھے وہ ان کے بڑے قدرداں تھے۔ آخر عمر میں امراض میں مبتلا ہوئے وہ صاحب فراش رہ کر ۱۳۶۵ھ میں انتقال کر گئے

شعراء | شاعری میں شبیر حسین خاں صاحب جوش اور مرزا جعفر علی خاں اثر نے کمال حاصل کیا۔ اثر صاحب کا انتقال ہو گیا اور جوش صاحب سے بحمد اللہ لکھنؤ کا نام روشن ہے۔

مرثیہ گویوں میں فائز۔ فائق۔ ثمر۔ آشفتہ۔ شدید، فرید پرانے انداز کے مرثیہ گویوں کو زندہ کئے ہوئے تھے۔

شہر کے شعراء | سید آل رضا رضا۔ منظر حسین منظر۔ سراج احمد سراج۔ مولوی اولاد حسین شاعر۔ ظفر عباس فضل۔ تصدق حسین شمس، حکیم ناطق۔ سید نواب افسر۔ دلدار حسین عرف منے آغا راز۔ احسن اختر ہدف۔ محمد رضی شگفتہ۔ نجود موہانی۔ انفر موہانی۔ علی بادر صدر۔ قدیر احمد قدیر۔ سردار حسین بہزاد۔ بن صاحب راز معروف شعراء تھے ان کے علاوہ ہزاروں شاعر تھے

ہندو شعراء | پنڈت انندنرائن مُلّا۔ گوپی ناتھ امن۔ پختہ مشق شاعر ہیں

شاعرہ خاتون | کنیز فاطمہ حیا کو شعر و شاعری بڑی شہرت حاصل ہوئی مولوی عبدالباری فرنگی محلی کی صاحبزادی صغریٰ بیگم بہت خوب شعر کہتی تھیں ان کا مجموعہ کلام "نوائے آگہی" ۱۹۴۸ء میں ہمدم بکڈپو لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اور اب پاکستان میں ۱۹۶۰ء میں دوبارہ شائع ہوا ہے اس مختصر مجموعہ میں حمد نعت منقبت سب ہی طرح کا کلام ہے۔ ایک غزل کا مطلع ملاحظہ کیجئے۔ ؎

پھر سے دہراتی ہوں دل عشق کے افسانے کو
ہے یہی ایک کہانی ترے بہلانے کو

حیا کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تمام شاعرہ عورتوں نے اپنے لئے مذکر کی ضمیریں استعمال کی ہیں مگر صغریٰ ہر ایک مونث ضمیریں لائی ہیں

یادگار بھانڈ اس زمانہ میں معمولی درجہ کے لوگوں میں یادگار بھانڈ خوب شعر کہتا تھا اس کی ایک غزل کے دو شعر سنیئے ؎

کیا عجب گر میرے آب اشک کی تاثیر سے　　پھوٹ نکلیں کونپلیں ہر دانہ زنجیر سے
وجہ خاموشی نہ پوچھیں آپ مجھ دلگیر سے　　ایک دل پایا تھا وہ بھی چھن گیا تقدیر سے

سودے والوں کی صداؤں میں اب بھی دل کشی تھی اس زمانے میں ایک برف کی قلفی والا یہ آواز لگاتا تھا "محبت میں گھل رہی ہے"

ایک ادبی مقدمہ لکھنؤ میں ہر زمانے میں باہر کے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو لکھنؤ کے باکمالوں میں نقص نکالنا تفریحی شغل سمجھتے تھے اس زمانہ میں بیخود موہانی اور افقر موہانی اس میدان کے مرد تھے۔ ایک مشاعرہ میں یہ دونوں حضرات اور اکثر نوجوان شعراء شریک تھے۔ سراج کی غزل سب سے اچھی رہی۔ افقر موہانی "جام جہاں نما" ایک رسالہ نکالتے تھے۔ اس میں

کہ فلاں مشاعرے میں سراج لکھنوی نے سراج جھنجھانوی کی غزل اپنے نام سے پڑھ دی۔ سراج نے دعویٰ دائر کر دیا۔ مقدمہ چلا۔ افقر نے سراج جھنجھاوی کا ایک دیمک لگا ہوا دیوان پیش کیا جس میں وہ غزل تھی ادھر سے کہا گیا کہ نئی کتاب میں بھی دیمک لگ سکتی ہے اور لگائی جا سکتی ہے ہمیں مہلت دی جائے تو ہم نئی کتابوں کو اسی طرح بنا کے پیش کریں گے عدالت نے موقع دیدیا۔ بہت سی نئی کتابیں دوستوں اور عزیزوں میں تقسیم

کی گئیں۔ حکیم آشفتہ صاحب نے ایک کتاب ہم کو بھی دی کہ گیلی زمین پر پانی چھڑک کے
کتابیں کھیں۔ ایک ہفتہ کے اندر اس میں دیمک لگ گئی ایسی بہت سی کتابیں
عدالت کو دکھائی گئیں۔ گواہوں کے بیانوں میں بڑا لطف آیا سراج کی طرف
سے شعراء پیش ہوئے۔ مولانا صفی بھی گواہوں میں تھے۔ اکثر گواہوں کی بڑی
توہین ہوئی۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ آپ شاعر ہیں انھوں نے کہا ہاں تو اُن
سے عروض و قافیہ کے مشکل سوال کئے گئے (جو بیخود موہانی نے تیار کئے تھے)
اکثر جواب نہ دے سکے (تمام مسائل ہر وقت کس کو یاد ہوتے ہیں) ان کی بڑی
توہین ہوئی اور شہر بھر میں چرچا ہو گیا۔ اس سلسلہ میں شیخ ممتاز حسین ایڈیٹر
اودھ پنچ کا بیان بڑا زوردار تھا۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ آپ شاعر ہیں انھوں
نے کہا کہ میں شاعر اور شاعروں کا اُستاد ہوں۔ جب اُن سے عروض و قافیہ
کا سوال کیا گیا تو انھوں نے وکیل کو خوب ڈانٹا اور کہا کہ آپ کو کیا حق ہے
ایسے سوالات کرنے کا جس کے جواب کی صحت یا عدم صحت کو عدالت نہ سمجھ سکے
اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عدالت ایسے سوالات کرنے کی اجازت کیوں دیتی
ہے جج صاحب بھی شرمندہ ہوئے اور ایسے سوالات کرنے سے روک دیا۔
مختصر روئداد یہ ہے کہ افقر موہانی معافی مانگ لی اور مقدمہ ختم ہو گیا۔

اطباء خاندانی اطباء میں حکیم محمد عسکری عرف بتن صاحب نے علمی وقار پیدا
کرنا شروع کیا تھا کہ موت نے عین شباب میں خاندانی اطبا کا ایک سلسلہ قطع
کر دیا۔ نئی پود میں حکیم محمد اطہر صاحب شاگرد حکیم احمد حسن صاحب ذی علم

اطبا ءمیں تھے۔ یہ لوگ نوجوان تھے ان کے سامنے وہ اطباء موجود تھے جن کا ذکر ہم نے بیسویں صدی کی ابتداء میں کیا ہے ان کے درمیانی لوگ بھی موجود تھے جن میں حکیم سید علی آشفتہ ۔ حکیم صاحب علم ۔ حکیم ہادی رضا ۔ حکیم شمس الدین حکیم وہاج الحق انصاری ۔ حکیم ناطق حکیم غنی صاحب مشہور تھے ۔

امراؤ جان چوک میں بستی بالا چوک کے پارک میں رام دلاری سبزی منڈی (چوک) میں کلیان رتی جاسنی رگما مگر بلا کی دلکشی اور تان کوتل کی کوک سے کم نہ تھی یہ ہیں جان حسین بھی اور کامل فن بھی، جوانی ہی میں گانا چھوڑ کے نکاح کر لیا تھا اور میونسپلٹی کی طرف سے فٹ پاتھ کے دوکانداروں سے محصول لینے کا ٹھیکہ لے لیا تھا یہی بسر کی صورت تھی ۔

نایاب جان میانہ قد، داہنے رخسار پر تل ہرن کی سی آنکھیں ۔ غضب کا بھولا پن ۔ شاہگنج میں دو منزلہ ذاتی مکان میں رہتی تھی ۔

کشوری جان صورت کی اچھی نہ تھی مگر فن میں کامل تھی ۔

نازنین نخاس میں رہتی تھی نہایت عالی شان دو منزلہ عمارت سرمئی رنگ کی بنوائی تھی ۔ اس زمانہ میں لکھنؤ کی ساری طوائفوں میں یہ دولت مند تھی ۔ اس عمارت کی وجہ سے اور بھی مشہور ہوگئی تھی ۔

دلربا چوک میں خاندانی طوائف تھی اس کی شہرت حکیم شمس الدین کے مقابلہ میں میونسپلٹی کے الیکشن میں ہوئی ۔ یہ الیکشن تفریح کا سامان بن گیا دونوں طرف سے پروپیگنڈے کے لئے اخبار بھی نکالے گئے

حکیم شمس الدین کے اخبار کی پیشانی پر یہ مصرع لکھا جاتا تھا ۔ ع

دل رباکو دیجیے دل ووٹ شمس الدین کو۔

اردو کے تمام اخباروں کے لئے یہ الیکشن ایک تفریح کا سامان تھا خوب خوب مضمون نکلتے تھے۔

نقالی پرانے زمانہ میں بھانڈ اور نقالوں کا اصل ہنر مسخرہ پن تھا جس میں معمولی درجہ کا گانا ناچنا بھی داخل تھا۔ کربلا اور نورا بھانڈ آصف الدولہ کے زمانہ میں اسی طرح کے تھے مگر لکھنؤ میں اس فن کو بھی ترقی ہوئی اور ان کی نقالوں کے طبع زاد قصوں میں ظرافت کے نہایت عمدہ پہلو ہوتے تھے۔ بیکے بعد ان بھانڈوں نے اور ترقی کی۔ ہمارے زمانہ میں ظفر بھانڈ اور یادگار بھانڈ موسیقی میں بھی کامل تھے۔

بہروپیے ننھے اور پیارے بہروپیے اپنے فن میں بڑے کامل تھے۔ بعض موقعوں پر انھوں نے اچھا خاصا ڈاکہ ڈالا کیا۔ پولیس کا روپ بھرکے مکانوں کی تلاشی کی اور مال اسباب سب باہر اٹھوا لائے جب تھانے پر چلنے کا وقت آیا تو جھک کے سلام کیا کہ میں بہروپیا ہوں۔ اس طرح اکثر رئیسوں کو دھوکا دیا اور دیر تک دھوکے میں رکھا۔

بٹیر باز قمر نواب شیش محل میں۔ اصغر باورچی غلام حسین کے پل۔ ڈلی پہلوان مکا کا باغ۔ شیدی پہلوان مولوی گنج۔ چھٹے مرزا مشک گنج۔ رزاق رکاب دار غلام حسین کے پل میں۔ منھو صاحب پیر بخارا میں۔ بچھن صاحب اور بڈھن صاحب مشک گنج میں۔ بنے صاحب باغ مرزا جمعہ خاں میں۔ دلارے صاحب مرزا علی خاں بیگ کا احاطہ میں۔ مودی پہلوان شیش محل میں مشہور بٹیر باز تھے۔

بٹیر کی پالیاں | شہر کے مختلف حصوں میں مختلف دنوں میں بٹیر کی پالیاں ہوتی تھیں ان میں مشہور مقامات یہ تھے :۔
شیش محل۔ مرزا علی خاں کا ہاتا۔ چھوٹی شہزادی کی ڈیوڑھی۔ میر عشق کی بغیہ باورچی ٹولہ

مرغ کی پالیاں | مرغ کی پالیوں کے مشہور مقامات یہ تھے۔
شریفہ باغ۔ تحسین گنج۔ بارودخانہ۔ آغا میر کی ڈیوڑھی۔ کٹرہ ابوتراب خاں۔ کشمیری محلہ

کنکوے بازی | کنکوے بازی میں قمر نواب شیش محل میں۔ نواب کلن صاحب اور نواب پتن صاحب تحسین گنج میں۔ اچھن صاحب رئیس منزل میں۔ چھوٹے آغا صاحب جانکی لال رستوگی راجہ کی بازار میں۔ رام بہاری رستوگی، رستوگی ٹولہ میں۔ بدلو کہار جوبٹیوں میں بابو منھیار، چوڑی والی گلی میں۔ ریاست پاٹے نالے پر کنکوے بازی میں شہر بھر میں مشہور تھے۔

باقر نواب صاحب اور منّن صاحب۔ بشیر صاحب۔ داور بیگ صاحب سجاد حسین صاحب۔ بنّے صاحب۔ کاظم حسین صاحب توپ دروازے میں دلارے صاحب پیارے صاحب رستم نگر میں کنکو اپنانے میں شہرت رکھتے تھے

سپہ گری | میر صفدر علی (مولوی گنج) بانک بنوٹ کے استاد۔ اور شمشیر زنی کا فن جاننے والوں کے آخری فرد تھے۔ عنایت علی (بیر بخارا میں) بانک کے فن میں کامل تھے۔ مولانا کلب حسین عرف کبّن صاحب لکڑی اور کشتی میں مہارت رکھتے تھے۔ مولانا علی نقی عرف نقن صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا

سید مرتضیٰ صاحب بانک نوٹ میں کمال رکھتے ہیں۔

پیارے جانی (منصور نگر) بانک نوٹ میں کامل تھے اور پرانی قسم کے سوڈے کی بوتلیں جن میں شیشہ کی گولیاں ہوتی تھیں اور بڑی قوت سے کھلتی تھیں پھونک مار کے کھول دیتے تھے۔

پہلوانوں میں چھدن پہلوان (بزازہ میں) صمد (محمود نگر میں) جھنگا۔ پل غلام حسین میں۔ لالہ بہاری لال۔ تمباکو منڈی میں (ٹوپی پہن کے کشتی لڑتے تھے) سیتا تمباکو منڈی میں کالے جوگی، جوبٹیوں پر۔ مولی اور بھندی نائی۔ سرائے معالی خاں میں مرزا چھوٹے نواب اور بڑے نواب محلہ امام باڑہ آغا باقر میں۔ جھاؤلال کے پل الیاس نظر آباد میں۔ متھو گھوسی۔ تکیہ پیر جلیل میں۔ مرتضیٰ اور متھرا داس قیصر باغ و بد حضرت گنج میں۔ آغا علی، حیدر گنج، شمشاد اور گیندا کھالے کی بازار میں۔ بھو اور تلسی رام وکٹوریا گنج میں۔ دھرم داس کھالے کا بازار میں، لچھا اور بھوا، حسین آباد میں۔ رام دیال اور منشی رام بڑھئی پہلوانی میں مشہور تھے

مصوری | سید محمد عسکری صاحب مصوری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے آرٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں چلے آئے۔ کچھ دن ہوئے کہ انتقال ہوگیا۔

مرزا مغل فوٹوگرافی اور قلمی دونوں طرح کی تصویریں بنانے میں کمال رکھتے تھے۔

خطاطی | آصف مرزا نے خطاطی میں شہرت حاصل کی چاول کے دانے پر قل ہو اللہ مع بسم اللہ کے لکھ دیتے تھے۔ نجم الحسن خط نسخ میں کامل تھے۔

سوز خوانی | باسو صاحب سوز خوانی میں مشہور تھے،

قرأت | قرأت میں قاری سید حسین اور قاری سرفراز حسین کا مثل نہ تھا۔

ملمع سازی | علی حسین (میر عشق کی بقیہ) ملمع سازی میں بے نظیر تھے ان کا ملمع برسوں نہیں اترتا تھا

پیراکی | امجد حسین صاحب خلیفہ و داماد رضا حسین صاحب۔ سید اکبر علی صاحب پرنسپل شیعہ کالج۔ یوسف علی خاں صاحب بی اے۔ منّے خاں صاحب اور للّو کہار پیراکی کے استاد کامل تھے۔ ان کے سیکڑوں شاگرد تھے

یوسف علی خاں صاحب پاکستان بننے کے بعد یہاں چلے آئے اور کراچی میں بقید حیات ہیں۔

سادے کاری | بنّن صاحب۔ صفدر حسین۔ ریاست حسین اور راحت حسین دہری زہ کی انگوٹھیاں بہت عمدہ بناتے تھے۔ بنّن صاحب اور دلدار حسین کا کلکتہ میں انتقال ہوگیا۔ صفدر حسین بمبئی میں ہیں۔ ریاست حسین اور راحت حسین کراچی میں بقید حیات ہیں مگر ان کے فن کے قدردان مر چکے ہیں۔

نگینہ سازی | نگینہ سازی کا فن ابھی تک لکھنؤ میں زندہ تھا۔ کلکتہ، بمبئی دہلی اور راجپوتانہ میں یہیں کا مال بکتا تھا۔

سجاد حسین نگینہ ساز ایک رتی کے پچاس پہلدار رنگ تراشتے تھے۔ ذاکر حسین بھی انھیں کے برابر کاریگر تھے۔ اسی خاندان کی فرد بہادر حسین عرف دلارے کراچی میں موجود ہیں اور یہ کام خوب جانتے ہیں

جگّن صاحب دو پلکا بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ایک

دفعہ مصری کا نگینہ بنا کے ہیرے کی جلا پیدا کی اور جوہری دھوکا کھا گئے۔
عبدالمجید کوٹ اور کانڈنی کی نگینہ سازی میں مشہور تھے۔ حیدر حسین منصور نگر میں دو پلکے کے مشہور کاری گر تھے۔ حنیف اور مبارک منصور نگر میں نگینہ سازی کے ماہر تھے۔
بشیر احمد نصیر خاں سرکہ والی گلی میں مرزا یوسف حسین اور بابو میاں دوگانوا میں عظمت علی راجہ کی بازار میں۔ اسمٰعیل۔ اسحٰق۔ نعیم۔ ممتاز فتح گنج میں۔ بہو صاحب کفایت اللہ۔ ولی اللہ۔ چھوٹے میاں منصور نگر میں۔ مرزا شدو بیگ تکیہ جھنوائی ٹولہ۔ مرتضیٰ حسین مولوی گنج میں۔ لڈن صاحب۔ چندھے سلیمان قدر کے ہاتے میں کجن صاحب بڑوتے رسی بٹان میں۔ احمد حسین مشک گنج میں۔ محمد احمد۔ نور احمد سلطان تکیہ داتا شاہ میں۔ غلام دستگیر کڑہ برن بیگ میں۔ بشارت حسین اور لڈن صاحب مصاحب گنج میں۔ چھنو صاحب مفتی گنج میں یہ داستان گو بھی تھے۔
ہاتھی دانت کا کام حکیم جان اور نبی جان چوک میں پارک کے سامنے ہاتھی دانت کے بے مثل کاری گر تھے۔
متفرق صنعتیں زری، زردوزی، کامدانی، سلما، ستارہ، بادلہ، لکڑی سے چھاپے، چناوٹی، حقہ کی مہنال چاندی کی دوہری زہ کی انگوٹھیاں، ٹاپے ٹوکریاں، مونڈھے، چارپائی کے پائے رنگین، اور چاندی کے نقشیں، نامی بسکٹ ننداکے کابلی امین آباد میں۔ لکھنؤ کی مشہور چیزیں ہیں

عباس چائے والے کی دوکان بھی بہت مشہور تھی۔ چوک میں تحسین کی مسجد کے پھاٹک کے سامنے تین در کی مربع دوکان تھی۔ کنارے کے ایک در میں عباس بیٹھتے تھے جن کے آگے چائے کا سماور اور بالائی کا کونڈا رکھا ہوتا تھا۔ دوکان کے اندر ایک پتلا سا کمرہ تھا جس میں پتلی پتلی میزیں ایک دوسری سے ملی ہوئی بچھی تھیں اور اُس کے چاروں طرف کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر رکابیوں میں طرح طرح کے کیک اور بسکٹ رکھے رہتے تھے۔ گاہک جاکے بیٹھ جاتے تھے اور بالائی یا بغیر بالائی کی چائے طلب کرتے چائے پینے کے بعد گاہک عباس کے پاس جاکے بتاتا تھا کہ اُس نے چائے کے ساتھ کچھ اور کھایا یا نہیں اسی حساب سے وہ دام بتا دیتے۔ دوکان دار کی طرف سے کوئی نگراں نہیں تھا۔ گرمیوں میں فالودہ شربت اور اب لسی بھی بکنے لگے تھے۔

کھانے کی چیزیں | فرنگی محل کے پل اور نخاس کے پل کی نہاری۔ کنکر کے کوئیں کی سہال شاخیں بلوچ پورہ میں الہ دین کے بوٹیوں کے کواب۔ غلام حسین کے پل پر اصغر کے سیک کواب، چوک میں سدے کے شامی کواب پاٹے نالے کی برفی امین آباد کا حلوہ سوہن اور برفی صمد کی قفلیاں چون چون باورچی کی کھیر اکبری دروازے کی روغنی کھرمیا مٹی کی ترکاریاں۔ غلام حسین کے پل کا پینے کا تمباکو احمد حسین دلدار حسین کا کھانے کا تمباکو اصغر علی محمد علی کا عطر حنا اور شمامتہ العنبر۔ فیض اللہ گنج کے پونڈے شہد پور کے خربوزے انگلی کے برابر موٹی ککڑیاں، کڑھی اور دودھ بتی ٹوپیاں اور کرتے ٹلنیے کے برتن اور سادے بارنقشین

اور ایسی قلمی کہیں نہیں ہوتی تھی

اخبار آزاد۔ ہندوستانی۔ طوفان۔ وثیقہ دار۔ اسد۔ رضا کار طوفان تنظیم۔ طوائف۔ میخانہ۔ قومی آواز۔ تنویر۔ قیامت۔ صدق اور سچ اخبار فروغ اردو۔ مشاعرہ۔ سخن سنج۔ سخنور۔ نظر حقائق باوقعت رسالے نکلے اور ایک بڑا کارنامہ اس دور کا یہ ہے کہ مولانا سید علی نقی عرف نقن صاحب نے عربی کا ایک رسالہ "الرضوان" جاری کیا۔

رؤسا :- پچھلے دور کے تمام روسا اور بااثر لوگ زندہ تھے اس زمانہ میں راجہ امیر احمد خاں محمود آباد کی ریاست پر متمکن ہوئے وہ خود عالم اور علم کے قدردان ہیں۔ اہل کمال کی سرپرستی انھوں نے میراث میں پائی تھی سے وابستہ تھے ان کے علاوہ بہت سے لوگوں کو انھوں نے اپنے گرد و پیش جمع کیا۔ ظریف صاحب کا وظیفہ معین کیا مانی صاحب کو بلہرہ کا منیجر بنایا، مولوی ابن حسن صاحب جارچوی کو جامعہ سے استعفیٰ دلوا کے لائے ایک ادارہ دارالتصنیف والتالیف قائم کیا، بعض لوگوں کو عراق تعلیم کے لئے بھیجا ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا جس کا مثل ہندوستان میں کم ہوگا۔

غریب پروری اب یہ باب ختم ہو رہا ہے اور اس شہر مرحوم کی دو تین خصوصیتیں باقی رہ گئی ہیں ان کو بھی بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ لوگ کہتے تھے کہ بڑا غریب پرور شہر تھا۔ بادشاہ اور روساء سے ہر موقع پر اتنا مل جاتا تھا کہ شہر سے دیہات تک لوگ آسودہ حال ہو جاتے تھے اتنا تو ہم نے بھی دیکھا ہے کہ محرم اور صفر دو مہینے تک غربا مجلس کے حصوں پر بسر

کر سکتے تھے۔ شاہی اوقاف میں سیکڑوں آدمی قرآن خوانی پر مقرر تھے۔

ہر بادشاہ کی وفات کے دن مجلس ہوتی کھانا تقسیم ہوتا اور ایک جوڑا کپڑا بہت قیمتی مع پر تکلف کھانوں کے کسی عالم کی خدمت میں بھیجا جاتا۔ والد مرحوم سے میں نے سنا ہے کہ شاہی زمانہ میں روساء کی طرف سے ماہِ صیام میں سحر کے وقت کہار بہنگیاں لے کر محلہ محلہ گھومتے تھے جس میں ہمہ نعمت ہوتی تھی دودھ، دہی، بالائی، روٹی۔ سالن۔ کباب، شکر، یہاں تک کہ تمباکو بھی ہوتا تھا اور جس غریب کو سحر کے وقت کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی وہ لے لیتا تھا

شریف پروری | شہر کی شریف پروری تو میں نے بھی دیکھی ہے معمولی اور اوسط درجہ تک کے لوگ گرمیوں میں گھر کے اندر عموماً صرف پاجامے پہنے رہتے تھے ایک جوڑا کپڑا نہایت صاف اور عمدہ الگنی پر پڑا رہتا تھا۔ سہ پہر کو وہ کپڑا پہن کے بقول شاد عظیم آبادی ؎

لئے دیئے ہوئے اور آبرو بنائے ہوئے

کہ تا نہ سمجھے کوئی ان کو مفلس و نادار

گھر سے نکلتے تھے اور دیکھنے میں اچھے خاصے ذی حیثیت معلوم ہوتے تھے ہر محلے میں کہاروں کے اڈے تھے، دروازے پر کھڑے ہو کے آواز دی میاں مہرا ایک کہار بے جامہ اور لنگر کھا پہنے آ گیا اس کو کپڑا اور روپیہ دیا اور بتایا۔ ایک آنے کی بالائی۔ دو پیسے کی نہاری۔ دو آنے کا سیر بھر آٹا۔ دو پیسے کی ارہر کی دال دو پیسے کی لکڑی غرض دن بھر کا سودا منگوا لیا، دو پیسے اس کو دیدیئے۔ اس طرح کسی شریف کو بازار سے سودا لانے پر مجبور نہیں

ہونا پڑتا تھا

نکتہ سنجی۔ حسن اخلاق و شعر و سخن۔ عاشق مزاجی۔ سپاہیانہ بانکپن —
اولوالعزمی یہاں کی مٹی کی تاثیر تھی۔

پانچ چھ برس کا بچہ ادب و تعظیم کا مجسمہ بن جاتا تھا۔ سات آٹھ برس
کے سن تک وہ شعر سمجھنے لگتا تھا اور یہ سب باتیں اس وقت تک
موجود تھیں۔ شوکت تھانوی نے نقوش کے شخصیات نمبر میں سچ کہا ہے کہ لکھنؤ
اب بھی اس لائق ہے کہ اس کے لئے کہا جائے ع

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے

ڈاکٹر صفدر حسین صاحب صفدر کی اُس زمانہ میں لکھنؤ آمد و رفت
تھی انھوں نے اس سے متاثر ہو کے یہ نظم کہی تھی ؎

شام اودھ

وہ مہکتے ہوئے کوچے وہ چمکتے ہوئے بام — مے جذبات سے ہونٹوں کے چھلکتے ہوئے جام
وہ جوانی کی لہک اور وہ عارض کے گلاب — جس کی خوشبو سے تمناؤں کی جنت شاداب
میں مروّت، وہ زبانوں میں مٹھاس — وہ تخاطب کے قرینوں میں خلوص احساس
وہ تبسم کی شعاعیں، وہ ترنم کی پھوار — جیسے گلزار میں بھیگی ہوئی ساون کی بہار
کبھی احساس کی آواز میں بجلی کی کڑک — کبھی گفتار کے لہجے میں کٹوروں کی کھنک
تو را ایسے کہ محبت کی جو توثیق کریں — ولولے گرمئی جذبات کی تصدیق کریں
مثنوی کا کوئی کردار، غزل کا کوئی زود — خنکی صبح گلستاں لئے رخسار کی دھوپ

گوشے گوشے میں وہ انوار جمال و خوبی ‌ ‌ ‌ سارے ماحول میں اک کیفیت محبوبی
ان کی تاریخ حسیں اُن کے فسانے بھی حسیں ‌ ‌ ‌ ان کے شیون بھی حسیں ان کے ترانے بھی حسیں
رنگ و بو کا وہ تلاطم وہ سجاوٹ وہ نکھار ‌ ‌ ‌ کھلتے چہروں کے تبسم سے خزاں میں بھی بہار
یاد آتے ہیں تو احساس پہ چھا جاتے ہیں ‌ ‌ ‌ عرش تخئیل کی زنجیر ہلا جاتے ہیں
گومتی چپ ہے لئے اپنے کناروں کا سکوت ‌ ‌ ‌ ہر کھنڈر عظمت دیرینہ کا بھرپور ثبوت
چتر و محراب، کلس، گنبد و بام و دیوار ‌ ‌ ‌ ایک اُجڑی ہوئی تہذیب کے خس پوش مزار
چشم محراب، مساجد نگراں ہیں اب بھی ‌ ‌ ‌ سرد ہونٹوں میں کچھ آثار اذاں ہیں اب بھی
لکھنؤ دور ہے اب، دل سے قریں تھا پہلے ‌ ‌ ‌ اے جنوں دیکھ ترا نجد وہیں تھا پہلے
دل کو اک رابطہ اُس کے خس و خاشاک سے تھا ‌ ‌ ‌ ایک گل میری تمنا کا اُسی خاک سے تھا
اے زمیں دفن ہے اک دل کا سہارا تجھ میں ‌ ‌ ‌ سو رہا ہے مری قسمت کا ستارا تجھ میں
آہ اے شام اودھ منزل ویران نشاط ‌ ‌ ‌ اک دبستان لطافت ترے ایوان نشاط
تیرے ماضی کے شبستاں میں بھٹکتا ہے شعور ‌ ‌ ‌ چاندنی ذہن کی پھیلی ہے خلا میں تا دور
مرثیہ اپنا سناتی ہیں عمارات کہن ‌ ‌ ‌ جن کی ہر خشت ہے اک صفحۂ تاریخ وطن
دل خوابیدہ کو ٹھوکر سی لگا دیتی ہے ‌ ‌ ‌ تیرے کھنڈروں میں اداسی یہ صدا دیتی ہے
جھریاں روئے تمدن کی عیاں دیکھتے جاؤ ‌ ‌ ‌ سینۂ شہر پہ زخموں کے نشاں دیکھتے جاؤ
جب کبھی آئی ترے گلشن سے ہوائے سو دماغ ‌ ‌ ‌ جھلملانے لگا شاعر کے تصور کا چراغ
نکہت و رنگ سے لبریز فضا یاد آئی ‌ ‌ ‌ دل پہ جذبات کی گھنگور گھٹا سی چھائی
جب کیا غور چھلک آئے پلک تک آنسو ‌ ‌ ‌ زیست محسوس ہوئی ایک حباب لب جو
دل عزاخانہ لگتے ہیں در و بام اداس ‌ ‌ ‌ اک سلگتی ہوئی بستی ہے سر شام اداس
گرد رہ رہ کے جو اٹھتی ہے افق میلا ہے ‌ ‌ ‌ تپش سینۂ ماضی کا دھواں پھیلا ہے

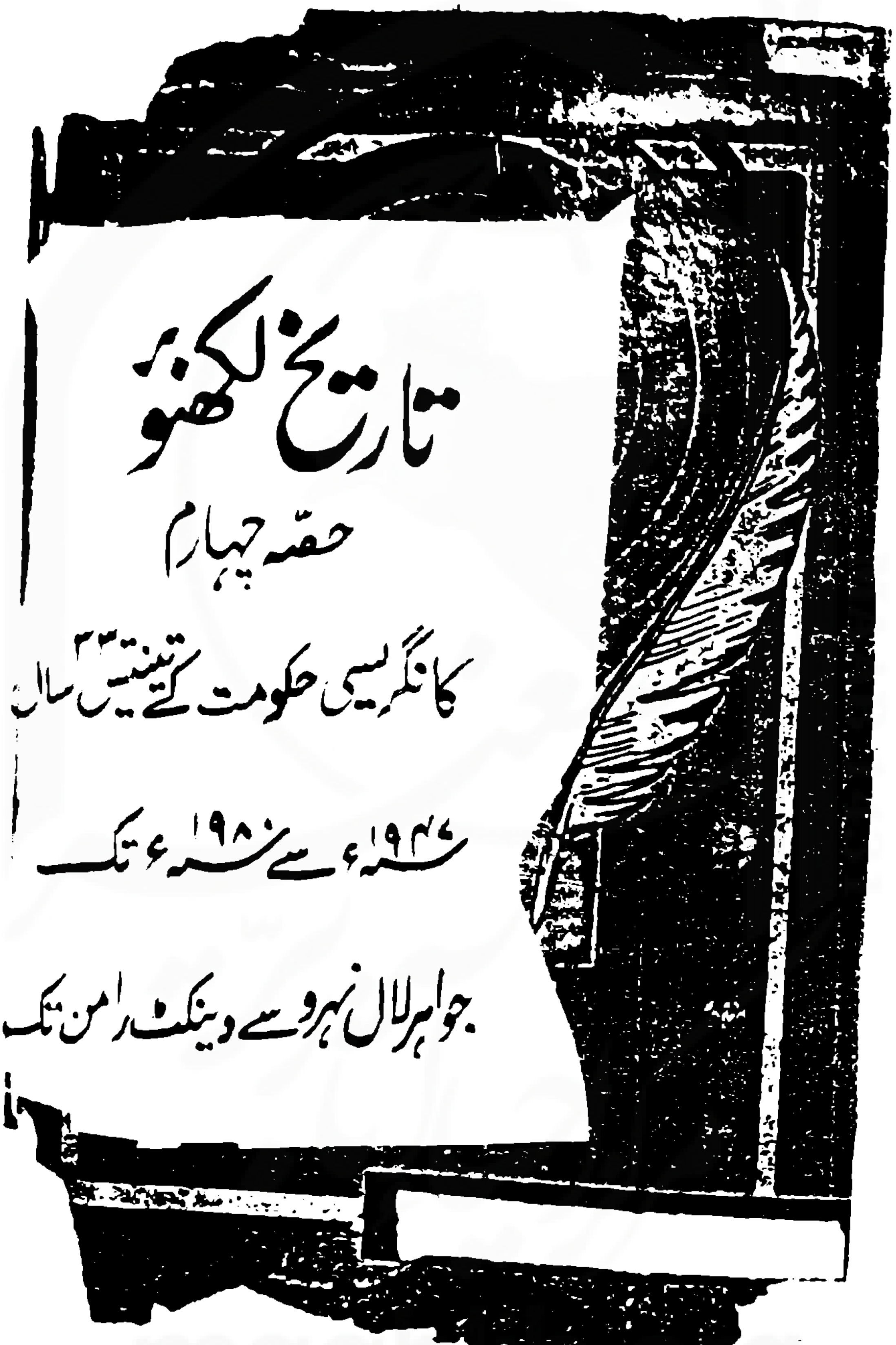
تاریخ لکھنؤ
حصہ چہارم
کانگریسی حکومت کے تینتیس ۳۳ سال
۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۰ء تک
جواہر لال نہرو سے وینکٹ رامن تک

لکھنؤ مرحوم

ماتم یک شہر آرزو

۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۰ء تک

ہندوستان اور مرہٹے | ہندوستان میں مرہٹے اکبر کے زمانہ سے نمودار ہوئے۔ سوریا مائے اور نانا بھائی کی سرکشیوں کا ذکر ابوالفضل نے اپنے رقعات میں کیا ہے

اورنگ زیب کے عہد میں شیواجی نے زور پکڑا۔

محمد شاہ کے دور میں مرہٹوں نے دہلی پر حملہ کیا جس کو برہان الملک اور صفدر جنگ نے بری طرح پسپا کیا۔ مگر مغلیہ سلطنت کمزور ہوتی گئی اور مرہٹے زور پکڑتے گئے۔ یہ دیکھ کے حافظ رحمت خاں نے احمد شاہ ابدالی کو بلوایا۔ پانی پت کے میدان میں ابدالی شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ نے مرہٹوں کو ایسی شکست دی کہ ان کا سارا زور ختم ہو گیا۔ اس جنگ میں دو لاکھ مرہٹے اور ان کے تمام سردار مارے گئے۔ غرض ہر محاذ پر مسلمان مرہٹوں کو کچلتے رہے اور کبھی ان کو پنپنے نہیں دیا۔ اس وجہ سے مرہٹوں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے ہمیشہ آگ بھڑکتی رہی۔

کانگریس نے جب انگریزوں کے خلاف مہم چلائی تو مرہٹے بڑی سرگرمی سے اس میں داخل ہو گئے۔ اس کے اعلیٰ اصولوں کی پابندی کی غرض سے نہیں بلکہ یہ سمجھ کے انگریزوں کے جانے کے بعد ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو گی مٹھی بھر کانگریسی کس شمار میں ہوں گے۔

۱۹۴۷ء میں انگریز گیا اور کانگریس کی حکومت آئی ولبھ بھائی پٹیل مرہٹہ سردار کانگریس کے سرگرم کارکن تھے، وہ وزیر داخلہ ہوئے انھیں مسلمانوں سے انتقام لینے اور صدیوں کا غبار دل سے نکالنے کا موقع مل گیا۔ پہلے دہلی میں فوج بلوا کے مسلمانوں کا قتل عام کیا اس کے بعد ان کی معاشی تباہی کی طرف متوجہ ہوئے یوپی اور بہار میں مسلمان تعلقہ دار اور زمیندار بہت تھے اور خوشحال تھے انکی وجہ سے تمام مسلمان خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ پٹیل نے ان دو صوبوں کی زمینداریاں ختم کردیں اور ظاہر کیا کہ زمیندار کو کسان سے سرکاری مالگذاری سے زیادہ وصول کرنے کا کوئی حق نہیں۔ کسان کی گاڑھی کمائی سے وہ کیوں حصہ بٹاتا ہے کسان پر یہ بے جا دباؤ ہے لہٰذا زمینداری اور تعلقہ داری کو ختم کرکے کسان کو زمین کا مستقل مالک بنا دیا اور ان سے صرف سرکاری مالگذاری وصول کی جانے لگی۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے کسان کو فائدہ ہوا مگر صرف یوپی اور بہار کے کسانوں پر یہ مہربانی کیوں کی گئی۔ اگر اپنے خیال میں مخلص تھے تو سارے ہندوستان کی زمینداریاں تعلقہ داریاں اور جاگیرداریاں کسانوں پر بانٹ دیتے۔ یوپی اور بہار کے باشندوں میں کسانوں کے ایک طبقے کے فائدہ کے مقابلے میں دونوں صوبوں کے اور طبقات کو نقصان زیادہ پہنچا۔ زمینداروں اور تعلقہ داروں کے لاکھوں نوکر جو ۹۹ فی صدی کوئی سند نہیں رکھتے تھے اور کسی نوکری کے قابل نہ تھے بیکار اور خستہ حال ہو گئے۔ تعلقہ داروں اور زمینداروں کا پیسہ جو خون بن کے علوم و فنون کی رگوں میں دوڑ رہا تھا اس کی گردش ایکدم سے رک گئی خاص طور پر اودھ اور اس میں بھی لکھنؤ جو مشرقی تہذیب و تمدن کا واحد مرکز تھا تباہ ہو گیا۔ جو کہ گلستان کو خون سے لالہ زار بنا لیا۔ طوائفوں کے کوٹھے جہاں بلبلیں چہکتی تھیں

وہاں الوّ بولنے لگا۔ آپ کہیں گے کہ اچھا ہوا زنا اور غنا کا خاتمہ ہو گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو بڑی خوش آئند بات ہوتی مگر یہ نہ ہوا نہ کبھی ہو سکتا ہے جب تک انسانی وجود باقی ہے یہ باتیں ختم نہیں ہو سکتیں۔ لکھنؤ کا چوک تو ویران ہو گیا۔ کلب کی آبادی اور رونق بڑھ گئی۔ نغموں کی لہروں سارنگیوں کی تھرتھراتی ہوئی آوازوں اور طبلوں کے تھاپ کی گمک کی جگہ بینڈ و بجنے لگا۔ سوسائٹی گرلز بڑی افراط اور آسانی سے زینت آغوش بننے لگیں زنا چوگنا بڑھ گیا۔

طوائفوں کے کوٹھوں پر شراب کا دور نہیں چلتا تھا۔ کلبوں میں کنٹر لنڈھائے جانے لگے۔ طوائفوں کے کوٹھوں سے لوگ لڑکھڑاتے ہوئے نہیں اترتے تھے کلبوں سے لڑکھڑاتے ہوئے نکلنے لگے۔

طوائفوں کے کوٹھوں پر ناچ نہیں ہوتا تھا کلبوں میں ناچ بھی ہوتا ہے وہ بھی اس طرح کہ ایک مرد کا ہاتھ دوسرے کی بیوی کی کمر میں۔ دوسرے مرد کا ہاتھ دوسری کی بیوی کی کمر پر حلقہ باندھ کے ناچتے ہیں اور بوسہ بازی بھی کرتے جاتے ہیں۔ اور مرد اپنی بیوی کا بوسہ لیتے ہوئے دوسرے مرد کو دیکھتا ہے اور اسے قابل اعتراض نہیں سمجھتا۔ بیشہ ورنا چنے والیاں تنہا ناچتی ہیں اور ایک نہایت ہلکا باریک ریشمی زرتار لہنگے کا طرح کا جامہ ہوتا ہے جو ناچنے میں ہوا بھر کے پھیل جاتا ہے اور تصور میں دریچہ کا درشن کر لیتے ہیں۔ جس سے ان کی آنکھوں اور دل کو بڑا سرور حاصل ہوتا ہے اور یہی سرور بہم پہنچانا ناچنے والیوں کا اہم مقصد ہوتا ہے۔ اتنی بے حیائی لکھنؤ کی طوائف بھی نہیں برداشت کر سکتی اس کے معنی یہ ہیں کہ مشرقی طرز کی مہذب عیاشی ختم ہو گئی اور مغربی طرز کی حیا سوز عیاشی کو فروغ ہو گیا۔ میوزک کالج بھی کھلا ہے جس میں لڑکے اور لڑکیاں گاتی

اور تھرکتی ہیں۔ یہ تو حال صرف مہذب ناچ اور گانے کی تباہی کا ہے۔ اسکے علاوہ اور
علوم و فنون جو لکھنؤ کی خصوصیت تھے یعنی علمائے لکھنؤ اطبائے لکھنؤ۔ بانکے بیچے باز
صناع و دستکار باورچی اور رکابدار سارے ہندوستان میں مشہور تھے ان کا
خاتمہ ہوگیا۔ اب لکھنؤ میں نہ تو کوئی طبیب ہے نہ شاعر نہ بانکا نہ کوئی صنعت
ہے تباہی ہے بربادی ہے افلاس ہے بے روزگاری فاقہ کشی ہے یہ برکتیں
ہیں کانگریس حکومت کی جو تعلقہ داری و زمینداری ختم کر دینے سے پھیل گئی ہیں
صرف علماء رہ گئے ہیں۔ فرنگی محل اور ندوہ میں کتنے عالم ہیں۔ شہر میں کتنے علمائے
اہلسنت ہیں اس کا مجھے علم نہیں، خاندان اجتہاد کے علماء کو جانتا ہوں اور وہ
یہ ہیں۔

لکھنؤ میں علمائے خاندان اجتہاد۔

مولانا کلب عابد صاحب مجتہد مولانا کلب حسین صاحب مجتہد کے بڑے
صاحبزادے ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان کے مشہور فلسفی مولینا
کاظم حسین صاحب سے معقولات اور فقہ و اصول کی تکمیل مدرسہ ناظمیہ سے
کرکے عراق گئے وہاں پانچ برس تک درس خارج میں شریک رہ کے اجازہ اجتہاد
کے لئے ہندوستان واپس آئے لکھنؤ میں اپنے والد کی جگہ امام جمعہ و جماعت
ہوئے مجلسیں بھی معرکے کی پڑھتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں دینیات کے ڈین
مقرر ہوئے اپنے دور کے علماء میں اعلیٰ درجہ کے سیاستداں تھے۔ شیعہ عالم ہوتے
ہوئے سنی اور شیعہ دونوں ان کو اپنا قائد مانتے تھے۔ ۱۹۸۶ء میں ایک
حادثہ میں انتقال ہوا —— پہلے شیعوں کی نماز ہوئی اس کے بعد سنیوں
نے نماز جنازہ پڑھی۔ ہر گھر پر کالے جھنڈے نصب کئے گئے تھے اتنا غم کسی عالم

کا اس نوعیت کے ساتھ نہیں منایا گیا یہ ان کی سیاست اور خلوص کا نتیجہ تھا۔

مولانا سید مرتضیٰ صاحب مولا ابوالحسن عرف منن صاحب قبلہ مجتہد کے دوسرے صاحبزادے مولانا علی نقی صاحب قبلہ کے چھوٹے بھائی اپنے والد اور بھائی سے تحصیل علم کی مدرسہ ناظمیہ سے ممتاز الافاضل کا امتحان پاس کیا اس کے بعد عراق جا کے درس خارج میں شریک ہوئے درجہ اجتہاد پر فائز ہوئے وہاں سے لکھنؤ آئے مدرسہ ناظمیہ میں درس دیتے ہیں۔ فقہ و اصول میں اس وقت ہندوستان میں ان کا کوئی مثل نہیں ہے۔

مولانا محمد کاظم صاحب مجتہد مولانا محمد مرتضیٰ صاحب کے چھوٹے بھائی غالباً ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے اپنے والد اور بھائی سے درس لیا۔ مولانا کاظم حسین صاحب سے معقولات پڑھی۔ مدرسہ ناظمیہ سے ممتاز الافاضل کر کے عراق گئے اور وہاں بھی درس دیتے رہے اور درس لیتے بھی رہے۔ پانچ برس میں تکمیل کر کے قم آئے وہاں بھی درس و تدریس میں مشغول رہے وہاں سے لکھنؤ آئے۔ اب علی گڑھ یونیورسٹی میں دینیات کے ڈپٹی میں کئی رسالے بھی تحریر فرمائے ہیں۔ جن کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دماغ فلسفیانہ ہے۔

مولانا محمد باقر صاحب مجتہد مولانا ابوالحسن صاحب کے چھوٹے فرزند انگریزی میں ایم اے ہیں سنسکرت کی اعلیٰ سند رکھتے ہیں علوم عربیہ کی ہندوستان میں تکمیل کر کے عراق گئے اور درس خارج میں شریک ہوئے وہاں سے اجازہ اجتہاد لے کے ہندوستان واپس آئے اب دبئی میں امام جمعہ و جماعت ہیں اور خاموش تبلیغ میں مشغول ہیں۔

مولانا قائم مہدی صاحب مجتہد مولانا ابن حسن صاحب شمس العلماء

صاحبزادے لکھنؤ میں تکمیل علوم کرکے عراق گئے وہاں درس خارج میں شریک رہے پانچ برس میں دورہ ختم کرکے اجازہ اجتہاد لے کے ہندوستان واپس آئے یہاں ایک تبلیغی ادارہ دینی کتابوں کی اشاعت کا قائم کیا جس سے کچھ کتابیں شائع ہوئیں۔

مولانا کلب جواد صاحب مولانا کلب عابد صاحب اعلی اللہ مقامہ کے صاحبزادے قم میں زیر تعلیم ہیں بہت امیدیں ان سے وابستہ ہیں۔

مولانا کلب صادق صاحب۔ مولانا کلب حسین صاحب کے چھوٹے صاحبزادے انگریزی میں پی ایچ ڈی خاندانی علوم کے عالم متبحر خطیب معجز بیان امام جمعہ وجماعت علی کانگریس کے بانی شیعوں کے قائد لیے دینی مدرسہ اور ایک اقامت گاہ کے موسس ہیں۔

مولانا سید علی مولانا میرن صاحب اعلی اللہ مقامہ کے فرزند اکبر لکھنؤ میں تحصیل علم کی یونیورسٹی میں شعبہ عربی و فارسی کے مدرس ہیں مجلسیں بھی خوب پڑھتے ہیں خاندانی وجاہت چہرے سے ٹپکتی ہے خلیق اور مرنجان مرنج بزرگ ہیں

مولانا سید حسن صاحب ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے علم و تقدس ذکاوت و ذہانت کے وارث علوم عقلیہ و نقلیہ کے عالم متبحر خطیب شعلہ بیان خلیق و متواضع شہرت عظیم کے مالک لکھنؤ کی عزت و آبرو، تبلیغ کے لئے بیرون ملک بھی جاتے ہیں۔ ہر دل عزیز اور پرکشش شخصیت ہیں۔

مولانا عبدالحسن صاحب، مولانا ابوالحسن صاحب کے چھوٹے صاحبزادے مدرسہ کے ممتاز الافاضل ہیں ابتدائے عمر ہی میں بصارت سے محروم ہو گئے

مولانا دائم مہدی صاحب اور مولانا صائم مہدی صاحب مولانا قائم مہدی صاحب قبلہ کے صاحبزادگان

ہم نے انھیں دیکھا ہے صاحب جبہ و عمامہ ہیں علم کا حال نہیں معلوم مگر شملۂ بمقدار علم ضرور ہو گا۔

مولانا علی محمد صاحب سید العلماء مولانا علی نقی صاحب اعلی اللہ مقامہ کے فرزند ارجمند غالباً ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے کیا علوم عربیہ کی تحصیل اپنے والد سے کی انگریزی عربی اور فارسی کے اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز ہیں کچھ کتابیں فارسی میں لکھی ہیں جو ایران کے مدارس میں داخل نصاب ہیں۔ بعض کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ ایران کے طبقہ علماء میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

یہ معلومات جناب ساحر لکھنوی نے بہم پہنچائی ہیں۔

مولانا ملا حسین صاحب مولانا ابوالحسن صاحب کے فرزند رشید سلطان المدارس میں مدرس ہیں صاحب نفس ذکی اور متقی ہیں مجلسیں بھی پڑھتے ہیں۔

علمائے خاندانِ اجتہاد پاکستان میں

مولانا محمد رضی صاحب قبلہ مجتہد العصر مولانا سید محمد مصطفےٰ عرف میر آغا صاحب مجتہد کے نواسے مولانا کلب حسین صاحب مجتہد کے نواسے مولانا نجم الحسن صاحب مجتہد کے پوتے ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے اپنے دادا کے زیر سایہ پروان چڑھے انھیں سے معقولات اور فقہ و اصول کا درس لیا اس کے بعد اعلم العلماء مولانا سبط حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ سے فقہ و اصول میں تبحر حاصل کیا۔ انھیں کی فرمائش سے ایک

[illegible] علامہ [illegible] صاحب قبلہ مجتہد العصر

استدلالی رسالہ نجوم الافکار لکھا جس پر انھوں نے اجازہ اجتہاد دیا اسکے بعد عراق جلکے وہاں کے علماء سے درس لیا اور اجازہ اجتہاد لے کے ہندوستان واپس آئے کچھ دنوں کے بعد ہجرت کرکے کراچی آگئے۔ یہاں حکومت سے ایک قطعۂ زمین حاصل کرکے حسینی ہائی اسکول قائم کیا حکومت نے ان کو اسلامی مشاورتی کونسل زکوٰۃ کمیٹی کا ممبر اور شرعی عدالت کا مشیر مقرر کیا۔

ادارۂ نشر علوم دینیہ کے صدر ہیں بہت سے فقہی رسالے اور ایک ضخیم کتاب شہادت کبریٰ لکھی ہے جسکی پہلی جلد تقریباً سات سو صفحے کی شائع ہوئی ہے امام حسین علیہ السلام کے اتنے مفصل حالات آج تک کسی کتاب میں نہیں لکھے گئے

عربی ادب پر بھی ان کو زبردست قدرت حاصل ہے اردو کے بلند پایہ شاعر ہیں ان کا دیوان شعر بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس پیرانہ سالی میں بھی کتب بینی اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے ہیں

اتحاد بین المسلمین کے علمبردار ہیں ایک ادارہ اس کا بھی قائم ہے جس کے وہ صدر ہیں۔

حکومت سے ایک قطعہ زمین حاصل کیا ہے جس میں کتب خانہ دینی مدرسہ اور اقامت گاہ کا منصوبہ ہے۔ ان کے صاحبزادے قمر عباس یوسف عباس شمیم عباس اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

مولانا محمد محسن صاحب قبلہ مجتہد العصر ۱۳۱۲ھ میں پیدا ہوئے اپنے خاندان کے علماء سے تحصیل علم کی مدرسۂ ناظمیہ سے ممتاز الافاضل امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ یونیورسٹی کے بھی کئی امتحانات دیئے۔ ذکاوت و ذہانت میں اپنے اقران سے ممتاز تھے ان کے اساتذہ ان کی ذہانت کے معترف تھے لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہو کے عراق گئے وہاں پانچ برس تک درس خارج میں شریک

محسن الملۃ مولانا سید محمد محسن قبلہ مجتہد العصر

رہ کے درجہ اجتہاد پر فائز ہو کے کراچی آئے ادارہ تعلیمات الٰہیہ قائم کیا جس سے
بہت اہم موضوع پر رسالے شائع ہوئے۔ ایک کتاب مسائل و دلائل لکھنا
شروع کی تھی جس میں ہر مسئلہ کے نیچے اسکی فقہی دلیل تھی۔ یہ کتاب اردو میں تھی
اگر یہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی تو اردو میں استدلالی فقہ کی ایک کتاب تیار ہو جاتی۔
جو اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہوتی اور اردو داں طبقہ کے لیئے بے حد مفید ہوتی۔
وہ ہر مسئلہ کے ساتھ اسکی فقہی دلیل سے بھی واقف ہو جاتے ایسی کتاب کی سخت
ضرورت ہے۔ ایک تفسیر بھی لکھنا شروع کی تھی کہ دفعتہً خیال آیا کہ پاکستان
میں کوئی شیعہ یتیم خانہ نہیں ہے۔ سارا کام چھوڑ کے اسکی طرف متوجہ ہو گئے کئی برس
کی انتھک کوششوں کے بعد حکومت سے ایک قطعہ زمین سولہ ہزار سات سو مربع گز
حاصل کیا جس پر ایک خوبصورت یتیم خانہ بنوایا۔ ایک ہال ایک سو سات فٹ لمبا
پچاس فٹ چوڑا اتنا ہی لمبا چوڑا اس کے آگے کا چبوترہ۔ اتنا بڑا ہال پاکستان
میں کوئی نہیں ہے۔ ایک مسجد تعمیر کرائی اور ایک انگریزی دواخانہ بنوایا جس سے مریضوں
کو کم قیمت پر دوا دی جاتی ہے۔ دس بجے دن سے ایک بجے دن تک یتیم خانہ میں رہ
کے وہاں کے انتظامات کرتے ہیں اسکے بعد گھر آتے ہیں۔ تین بجے دن سے ان کے
وظیفہ کا وقت شروع ہوتا ہے اس سے فارغ ہو کے پھر یتیم خانہ جاتے ہیں۔
آٹھ بجے رات کو وہاں سے واپس آتے ہیں۔ کبھی تنہا کھانا نہیں کھاتے۔ جب
تک دسترخوان پر کوئی مہمان نہ ہو چار بجے رات سے بارہ بجے رات تک معتقدین
کے فون اور آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور کار افتا و اجتہاد
میں مشغول رہتے ہیں۔ کوئی سائل محروم نہیں جاتا۔ داد و دہش صبح سے شام تک
جاری رہتی ہے۔ فقہ و اصول کلام و مناظرہ میں ان کا مثل نہیں۔ اس دور میں

اتنی توبی خدمت کسی عالم دین نے نہیں کی اسی وجہ سے لوگ انھیں محسن الملتہ کہتے ہیں مگر اس میں ان کی خواہش کا دخل نہیں۔ انھوں نے کبھی اپنے نام کے ساتھ محسن الملتہ لکھا نکسی سے فرمائش کی۔

مولانا ابن الحسن صاحب کربلائی۔ اس کتاب میں جن علماء کے حالات ہم نے لکھے ہیں وہ اپنی ذاتی معلومات سے لکھے ہیں۔ مولانا ابن الحسن صاحب کے حالات ہم کو معلوم نہیں تھے ان سے دریافت کئے تو انھوں نے ازراہ انکسار بتانے سے انکار کیا۔ ہمیں نہیں معلوم وہ کب پیدا ہوئے کس سے پڑھا کتنا پڑھا بس اتنا معلوم ہے کہ کھارا در کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھاتے ہیں۔ فیڈرل بی ایریا کے ایک بنگلہ میں قیام ہے۔ ایک رسالہ جمع بین الصلوٰتین اوقات نماز پر لکھا ہے سورۂ بقرہ تک ایک تفسیر لکھی ہے جو بہت آب و تاب سے چھپی ہے۔ یہ ع ر بی میں ہے

مولانا سید محمد مہدی عرف آغا سید صاحب بزرگ خاندان اجتہاد غفرانمآب کی چھٹی پشت میں ۱۳۱۳ھ خانوادہ علم میں پیدا ہوئے۔ گہوارۂ علم میں تربیت پائی اپنے بزرگوں سے تحصیل علم کی ۔ بھاگلپور میں مدتوں امام جمعہ و جماعت رہے۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی آ گئے۔ یہاں بھی کئی مسجدوں میں امامت کے فرائض انجام دیئے۔ نہایت نیک نفس اور مقدس بزرگ تھے۔ دنیا کے کسی معاملہ میں گفتگو نہیں کرتے اپنی ضرورت بھر کی بات کرتے تھے۔ کبھی کھلکھلا کر نہیں ہنستے۔ ہنسی کی بات پر ہلکی سی مسکراہٹ ان کے چہرہ کی رونق بڑھا دیتی تھی۔ کم آمیز اور عزلت پسند بزرگ تھے ۱۳۹۵ھ کو صفر کے مہینہ میں انتقال ہوا۔

خراسان باغ میں دفن ہوئے پسماندگان میں ایک بیوہ اعلم العلماءؒ

مولانا سبط حسین صاحب کی بڑی صاحبزادی اور تین بیٹے مولانا محمد محسن صاحب مجتہد پیر ساوی اور احمد حسن آغا ایک صاحبزادی ہیں جو سید حمید رضوی بلگرامی کو منسوب ہوئیں۔

مولانا آغا مہدی صاحب ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔

بچپنے میں بہت بیمار رہتے تھے اس وجہ سے تعلیم باقاعدہ نہ ہو سکی مگر اہل علم کے لباس میں رہتے تھے۔ کتب بینی کا شوق تھا۔ وسعت نظر بہت پیدا کی بہت سے رسالے اور کتابیں لکھیں۔ ۱۹۸۶ء میں انتقال ہوا۔

مولانا محمد نصیر صاحب علامہ مہدی کے پوتے مدرسہ ناظمیہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کر کے لاہور چلے آئے۔ یہاں مجلسیں پڑھنے میں شہرت حاصل کی اسکے بعد کراچی آ گئے۔ یہاں ان کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اعلیٰ درجہ کے ذاکروں میں شمار ہوئے علامہ مفتی نصیر الاجتہادی کے نام سے مشہور ہوئے حکومت نے ان کو اسلامی مشاورتی کونسل کا ممبر منتخب کیا اور ستارہ پاکستان خطاب دیا۔

۱۹۹۰ء میں پچپن برس کی عمر میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا

مولانا محمد حسین صاحب مولانا محمد محسن صاحب قبلہ کے فرزند نجف اشرف میں تحصیل علم کی جب صدام نے علماء و طلبا کو وہاں سے نکالا تو قم آ گئے۔ وہاں سے کراچی آئے۔ مجلسیں خوب پڑھتے ہیں۔ محرم میں مختلف مقامات پر بلائے جاتے ہیں۔ تصنع اور تکلف سے دور فقیر منش آدمی ہیں۔ کس وقت کہاں ہیں یہ علم حاصل کرنا بڑی تحقیق کا کام ہے جو کسی کے امکان میں نہیں ان کے چار بھائی اور ہیں محمد حسن محمد احسن بی اے۔ ایل ایل بی جو اپنے والد کے اکثر امور میں معاون ہیں محمد مستحسن بی اے محمد عارف بی۔ اے کے متعلم اور شاعر ہیں۔

والسلام
ذرۂ ناچیز
محمد باقر شمس
یکم اگست ۱۹۹۰ء

۸۰۵۰

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	دیباچہ طبع دوم	۴	۱۹	نقالی	۲۳
۲	دیباچہ طبع اول	۷	۲۰	داستان گوئی	۲۴
۳	تعارف	۹	۲۱	جملہ خوانی	۲۴
۴	ابتدائیہ	۱۲	۲۲	خطاطی	۲۵
۵	جغرافیہ	۱۲	۲۳	مصوری	۲۵
۶	پہاڑ	۱۲	۲۴	معماری	۲۵
۷	معدن	۱۲	۲۵	باورچی	۲۸
۸	دریا	۱۲	۲۶	نہاری	۲۶
۹	صحرا	۱۲	۲۷	کواب	۲۶
۱۰	دشت	۱۳	۲۸	رکابدار	۲۹
۱۱	موسم	۱۳	۲۹	حلوائی	۳۰
۱۲	آب و ہوا	۱۴	۳۰	تنبول	۳۰
۱۳	آب و ہوا کا اثر انسانوں پر	۱۴	۳۱	کمہار	۳۰
۱۴	شاعری	۱۵	۳۲	کسیرے	۳۱
۱۵	مشاعرے	۱۶	۳۳	مسی گر	۳۱
۱۶	سودے والے	۲۰	۳۴	قلعی گر سنار	۳۱ ۳۱
۱۷	موسیقی	۲۰	۳۵	سادے کار	۳۱
۱۸	رقاصی	۲۲	۳۶	حکاک	۳۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۷	جوہری	۳۱	۵۶	پارچے والی گلی	۴۲
۳۸	ملمع ساز	۳۱	۵۷	چاول والی گلی	۴۱
۳۹	رفوگر	۳۱	۵۸	پھول والی گلی	۴۱
۴۰	رنگریز	۳۱	۵۹	یحییٰ گنج	۴۲
۴۱	چھاپے گر	۳۱	۶۰	میوے والی سرئی	۴۲
۴۲	جوڑی والے	۳۲	۶۱	لکھنؤ کی صبح	۴۴
۴۳	درزی	۳۲	۶۲	مقدمہ	۴۵
۴۴	نداف	۳۲	۶۳	اودھ کے تقدس کی تاریخ	۵۱
۴۵	پھول والے	۳۲	۶۴	اجودھیا نام پڑنے کی وجہ	۵۱
۴۶	شہ سواری	۳۲	۶۵	اجودھیا کا تقدس	۵۲
۴۷	سپہ گری	۳۲	۶۶	اجودھیا کی بوجہدی	۵۳
۴۸	بہروپیئے	۳۲	۶۷	باشندے	۵۳
۴۹	طوائفیں	۳۳	۶۸	طبعی خصوصیات	۵۳
۵۰	مہترانیاں		۶۹	لکھنؤ کے تقدس کی تاریخ	۵۴
۵۱	علماء	۳۵	۷۰	ودیانگر	۵۴
۵۲	اطباء	۳۵	۷۱	کاشی	۵۵
۵۳	اہل لکھنؤ اتنے ذہین کیوں ہیں	۳۸	۷۲	پراگ	۵۵
۵۴	لکھنؤ کی شام	۴۱	۷۳	اودھ کے ہندو حکمراں	۵۵
۵۵	وکٹوریا اسٹریٹ	۴۱	۷۴	اودھ میں اسلامی علوم و تمدن کی تاریخ	۵۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۷۵	پانچویں صدی ہجری	۵۶	۹۳	بہرائچ	۶۷
۷۶	ظہور اسلام	۵۶	۹۴	گوپامئو	۶۷
۷۷	جائس	۵۷	۹۵	کوئل ضلع علی گڑھ	۶۷
۷۸	لکھنؤ میں اسلامی علوم وتمدن کی تاریخ	۵۸	۹۶	بدایوں	۶۸
			۹۷	جونپور	۶۸
۷۹	اطراف لکھنؤ کے علماء	۶۰	۹۸	ظفرآباد	۶۸
۸۰	پالی مئو	۶۰	۹۹	جھونسی ضلع الہ آباد	۶۹
۸۱	ولمئو	۶۱	۱۰۰	مچھ گوان	۷۳
۸۲	کنتور	۶۱	۱۰۱	بہرائچ	۷۴
۸۳	کڑہ	۶۱	۱۰۲	کنتور	۷۴
۸۴	مارہرہ	۶۲	۱۰۳	کچھوچھہ	۷۴
۸۵	بدایوں	۶۲	۱۰۴	ردولی	۷۵
۸۶	کرک	۶۳	۱۰۵	دریاباد	۷۶
۸۷	بلگرام	۶۳	۱۰۶	خیرآباد	۷۶
۸۸	اطراف لکھنؤ کے علماء	۶۶	۱۰۷	نصیرآباد	۷۷
۸۹	سترکھ	۶۶	۱۰۸	مالکپور	۷۷
۹۰	کوڑہ	۶۷	۱۰۹	کرمو	۷۸
۹۱	دلوہ	۶۷	۱۱۰	فتحپور	۷۸
۹۲	سندیلہ	۶۷	۱۱۱	قنوج	۷۹

نمبرشمار	مضمون	صفحہ	نمبرشمار	مضمون	صفحہ
۱۱۲	منکن پور	۷۹	۱۳۱	مانکپور	۹۲
۱۱۳	جونپور	۸۰	۱۳۲	کوڑہ	۹۳
۱۱۴	ظفرآباد	۸۳	۱۳۳	فتحپور	۹۳
۱۱۵	مچھلی شہر	۸۴	۱۳۴	جونپور	۹۴
۱۱۶	بنارس	۸۴	۱۳۵	ہڑونا	۱۰۱
۱۱۷	کاکوری	۸۵	۱۳۶	ظفرآباد	۱۰۲
۱۱۸	امیٹھی	۸۵	۱۳۷	غازی پور	۱۰۲
۱۱۹	خیرآباد	۸۸	۱۳۸	زمانیہ	۱۰۲
۱۲۰	ردولی	۸۹	۱۳۹	بجرباکوٹ	۱۰۳
۱۲۱	چندوار	۹۰	۱۴۰	جھونسی ضلع الہ آباد	۱۰۳
۱۲۲	سندیلہ	۹۰	۱۴۱	ماہل ضلع اعظم گڈھ	۱۰۳
۱۲۳	گوپامنو	۹۱	۱۴۲	بنارس	۱۰۳
۱۲۴	بلگرام	۹۱	۱۴۳	جائس	۱۰۴
۱۲۵	سدھور	۹۱	۱۴۴	نصیرآباد	۱۰۴
۱۲۶	لاہرپور	۹۱	۱۴۵	سلون	۱۰۵
۱۲۷	صفی پور	۹۲	۱۴۶	کوئل ضلع علی گڑھ	۱۰۵
۱۲۸	فتحپور	۹۲	۱۴۷	بدایوں	۱۰۵
۱۲۹	نیوتنی	۹۲	۱۴۸	سنبھل	۱۰۵
۱۳۰	الہ آباد	۹۲	۱۴۹	اعظم پور	۱۰۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۵۰	امروہا	۱۰۸	۱۶۸	کڑہ	۱۳۴
۱۵۱	دسویں صدی ہجری تک	۱۰۹	۱۶۹	مانکپور	۱۳۴
	ہندوستان علمی معیار		۱۷۰	الہ آباد	۱۳۵
۱۵۲	میر فتح اللہ شیرازی	۱۱۱	۱۷۱	جھونسی	۱۳۵
۱۵۳	تاریخ اکبری	۱۱۲	۱۷۲	رائے بریلی	۱۳۷
۱۵۴	کمالات	۱۱۳	۱۷۳	سلون	۱۳۸
۱۵۵	کاکوری	۱۲۱	۱۷۴	نصیر آباد	۱۳۸
۱۵۶	چوراس	۱۲۲	۱۷۵	جائس	۱۳۹
۱۵۷	امیٹھی	۱۲۲	۱۷۶	جونپور	۱۴۰
۱۵۸	سترکھ	۱۲۴	۱۷۷	بھیرا	۱۴۵
۱۵۹	دیوہ	۱۲۴	۱۷۸	مچھلی شہر	۱۴۵
۱۶۰	ردولی	۱۲۵	۱۷۹	گورکھپور	۱۴۶
۱۶۱	خیرآباد	۱۲۵	۱۸۰	چڑیاکوٹ	۱۴۶
۱۶۲	ہرگام	۱۲۷	۱۸۱	دیوگام	۱۴۶
۱۶۳	گنگوہ	۱۲۷	۱۸۲	بحری آباد	۱۴۶
۱۶۴	پہانی	۱۲۸	۱۸۳	بنارس	۱۴۶
۱۶۵	گوپامئو	۱۲۸	۱۸۴	بدایوں	۱۴۷
۱۶۶	بلگرام	۱۲۹	۱۸۵	مرادآباد	۱۴۸
۱۶۷	کوڑہ	۱۳۳	۱۸۶	سنبھل	۱۴۸

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۸۷	امروہا	۱۵۰	۲۰۶	چھوٹے زمیندار	۱۵۹
۱۸۸	لکھنؤ کی علمی فضا	۱۵۲	۲۰۷	بنجارے	۱۵۹
۱۸۹	امیٹھی	۱۵۴	۲۰۸	محمد امین سعادت خاں	۱
۱۹۰	کاکوری	۱۵۵		نامزد گورنر	
۱۹۱	شعراء و اطبا	۱۵۵	۲۰۹	ایک ناخوشگوار واقعہ	۱۶۷
۱۹۲	تعلیمی نظام	۱۵۵	۲۱۰	محمد امین سعادت خاں فوجدار	۱۶۸
۱۹۳	لکھنؤ کی سیاسی حالت	۱۵۶	۲۱۱	آصف جاہ کی بغاوت	۱۶۹
۱۹۴	شیوخ مچھی بھون	۱۵۶	۲۱۲	حسین علی کا قتل	۱۶۹
۱۹۵	سیوخ بنہرا	۱۵۷	۲۱۳	سعادت خاں برہان الملک	۱۷۰
۱۹۶	رام نگر کے پٹھان	۱۵۷	۲۱۴	عبداللہ خاں سے مقابلہ	۱۷۲
۱۹۷	ملیح آباد کے پٹھان	۱۵۷	۲۱۵	سعادت خاں برہان الملک بہادر	۱۷۱
۱۹۸	سندیلہ کے پٹھان	۱۵۷		جنگ اکبر آباد میں	
۱۹۹	راجا گونڈہ	۱۵۷	۲۱۶	برہان الملک صوبہ دار اودھ	۱۷۲
۲۰۰	راجا بلرام پور	۱۵۸	۲۱۷	برہان الملک لکھنؤ میں	۱۷۳
۲۰۱	راجہ رسالپور	۱۵۸	۲۱۸	بیتواڑہ پر حملہ	۱۷۴
۲۰۲	راجا سمرن گڑھ	۱۵۸	۲۱۹	تاریخ لکھنؤ حصہ دوم	۱۶۱
۲۰۳	راجا بیسواڑہ	۱۵۸	۲۲۰	سلطنت اودھ کا قیام	۱۶۵
۲۰۴	راجا تلونی	۱۵۸	۲۲۱	سید محمد امین سعادت خاں	
۲۰۵	راجا کوڑہ	۱۵۸		برہان الملک بہادر جنگ	

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۲۲	بانی سلطنت اودھ	۱۷۵	۲۴۱	برہان الملک کے ذاتی اوصاف	۱۸۵
۲۲۳	نسب	۱۷۵	۲۴۲	حلیہ	۱۸۵
۲۲۴	تعلیم وتربیت	۱۷۵	۲۴۳	شجاعت	۱۸۵
۲۲۵	محمد نصیر اور محمد باقر ہندوستان میں	۱۷۵	۲۴۴	سرداران فوج	۱۸۵
۲۲۶	محمد امین ہندوستان میں	۱۷۶	۲۴۵	ہندوستانی سردار	۱۸۶
۲۲۷	محمد امین دہلی میں	۱۷۶	۲۴۶	ہندو امراء	۱۸۶
۲۲۸	محمد امین میر منزل	۱۷۶	۲۴۷	انتظامی قابلیت	۱۸۶
۲۲۹	محمد امین ٹھیکیدار	۱۷۷	۲۴۸	شاعری	۱۸۶
۲۳۰	محمد امین سعادتخان	۱۷۷	۲۴۹	شعراء	۱۸۶
۲۳۱	محمد امین سعادت خاں کا	۱۷۷	۲۵۰	زبان	۱۸۶
۲۳۲	تلوئی پر حملہ	۱۷۴	۲۵۱	تہذیب	۱۸۸
۲۳۳	اجودھیا کی اہمیت	۱۷۵	۲۵۲	ازواج	۱۸۸
۲۳۴	صدر جہاں بیگم کی شادی	۱۷۶	۲۵۳	اولاد	۱۸۸
۲۳۵	شجاع الدولہ کی ولادت	۱۷۷	۲۵۴	شہر کی رونق وترقی	۱۸۹
۲۳۶	بھگونت سنگھ پر حملہ	۱۷۷	۲۵۵	شیعیت کی ابتدا	۱۹۰
۲۳۷	باجی راؤ سے جنگ	۱۷۹	۲۵۶	خاندان فرنگی محل	۱۹۱
۲۳۸	نادر شاہ سے جنگ	۱۸۰	۲۵۷	درس نظامی	۱۹۳
۲۳۹	برہان الملک کی وفات	۱۸۳	۲۵۸	لکھنؤ کے دوسرے علماء	۱۹۴
۲۴۰	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۸۳	۲۵۹	مولانا احمد	۱۹۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۶۰	مولانا عبدالحق	۱۹۴	۲۷۹	بہانی ضلع ہردوئی	۲۰۰
۲۶۱	مولانا عبدالعزیز	۱۹۴	۲۸۰	مولانا مربی دیۂ ضلع بارہ بنکی	۲۰۰
۲۶۲	مولانا غلام مصطفیٰ		۲۸۱	مولانا احمد الفیاض	۲۰۰
۲۶۳	مولانا عبدالرشید	۱۹۵	۲۸۲	خیرآباد	۲۰۰
۲۶۴	مولانا محمد رضا		۲۸۳	مولانا صفت اللہ	۲۰۰
۲۶۵	مولانا غلام محمد		۲۸۴	مولانا صالح محمد	۲۰۰
۲۹۶	امیٹھی ضلع لکھنؤ	۱۹۵	۲۸۵	مولانا محمد غوص	۲۰۰
۲۶۷	مولانا عبدالباسط	۱۹۵	۲۸۶	مولانا احمد اللہ	۲۰۰
۲۶۸	مولانا عبدالقادر	۱۹۶	۲۸۷	کنتور ضلع بہرائچ	۲۰۰
۲۶۹	مولانا عاصم	۱۹۶	۲۸۸	مولانا امین الدین	۲۰۰
۲۷۰	مولانا عبداللہ	۱۹۶	۲۸۹	مولانا بدیع الدین ماری	۲۰۱
۲۷۱	بھٹولی ضلع لکھنؤ	۱۹۶	۲۹۰	مولانا طفیل محمد	۲۰۱
۲۷۲	مولانا افہام اللہ	۱۹۶	۲۹۱	صفی پور ضلع اناؤ	۲۰۱
۲۷۳	سندیلہ ضلع ہردوئی	۱۹۶	۲۹۲	مولانا ضیاء اللہ	
۲۷۴	مولانا احمد اللہ		۲۹۳	مولانا	۲۰۱
۲۷۵	مولانا جمال اللہ	۱۹۹	۲۹۴	رائے بریلی	۲۰۱
۲۷۶	مولانا قادری	۱۹۹	۲۹۵	مولانا محمد حکم	۲۰۱
۲۷۷	مولانا کرم اللہ	۱۹۹	۲۹۶	مولانا محمد	۲۰۱
۲۷۸	مولانا نعمت اللہ	۲۰۰	۲۹۷	مولانا محمد	۲۰۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۹۸	بسیلون ضلع رائے بریلی	۲۰۲	۳۱۶	مولانا غلام مصطفی	۲۰۶
۲۹۹	مولانا عبدالشکور		۳۱۷	نواب مرزا مقیم ابوالمنصور خاں صفدر جنگ	۲۰۶
۳۰۰	مولانا محمد اشرف		۳۱۸	صفدر جنگ سے بغاوت	۲۰۶
۳۰۱	جائس ضلع رائے بریلی	۲۰۲	۳۱۹	بیسواڑہ پر حملہ	۲۰۷
۳۰۲	مولانا بدیع الزماں متولی	۲۰۲	۳۲۰	صفدر جنگ پٹنہ میں	۲۰۷
۳۰۳	مولانا فیروز	۲۰۲	۳۲۱	صفدر جنگ دہلی میں	۲۰۷
۳۰۴	نصیرآباد ضلع رائے بریلی	۲۰۲	۳۲۲	صفدر جنگ میر آتش	۲۰۷
۳۰۵	مولانا عبدالباقی	۲۰۲	۳۲۳	علی محمد خاں روہیلہ سے جنگ	۲۰۹
۳۰۶	مولانا نور محمد	۲۰۳	۳۲۴	شجاع الدولہ کی شادی	۲۱۰
۳۰۷	جونپور	۲۰۳	۳۲۵	احمد شاہ ابدالی سے جنگ	۲۱۲
۳۰۸	مولانا محمد سعید	۲۰۳	۳۲۶	محمد شاہ کا انتقال اور احمد شاہ	۲۱۷
۳۰۹	مولانا حسن سعید	۲۰۳		کی تخت نشینی	
۳۱۰	مولانا محمد پناہ	۲۰۳	۳۲۷	صفدر جنگ پر قاتلانہ حملہ	۲۱۸
۳۱۱	مولانا غلام رشید		۳۲۸	صفدر جنگ وزیر اعظم	۲۱۸
	الہ آباد	۲۰۳	۳۲۹	احمد خاں بنگش سے جنگ	۲۱۸
۳۱۲	مولانا اسد اللہ	۲۰۳	۳۳۰	صفدر جنگ کا احمد خاں سے	۲۲۱
۳۱۳	مولانا محمد ماہ	۲۰۴		جنگ کا مشورہ	
۳۱۴	مولانا ضیاء اللہ	۲۰۴	۳۳۱	احمد خاں بنگش پر دوبارہ حملہ	۲۲۱
۳۱۵	مولانا عبدالجلیل مرادآباد	۲۰۴	۳۳۲	صلح کی بات چیت	۲۲۲

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۳۳	جاوید خاں کا قتل	۲۲۲	۳۵۱	عالمگیر ثانی کا قتل	۲۴۰
۳۳۴	صفدر جنگ اور غازی الدین		۳۵۲	میدان باؤلی کی جنگ	۲۴۰
	خاں سے جنگ	۲۲۴	۳۵۳	دکن سے مرہٹوں کی آمد	۲۴۰
۳۳۵	صفدر جنگ کا انتقال	۲۲۵	۳۵۴	پانی پت کی جنگ اور	
۳۳۶	ذاتی اوصاف	۲۲۶	۳۵۵	شجاع الدولہ	۲۴۲
۳۳۷	حلیہ	۲۲۶	۳۵۶	مرہٹوں کی تباہی	۲۴۴
۳۳۸	نفاست	۲۲۷	۳۵۷	بکسر کی جنگ	۲۴۵
۳۳۹	علم پروری	۲۲۷	۳۵۸	شجاع الدولہ کو شکست	۲۴۶
۳۴۰	وسعت دسترخوان	۲۲۸	۳۵۹	شجاع الدولہ بریلی میں	۲۴۶
۳۴۱	سخاوت	۲۲۸	۳۶۰	کوڑہ جہاں آباد کی جنگ	[illegible]
۳۴۲		۲۲۹	۳۶۱	اس وقت کی انگریزی پالیسی	۲۴۷
۳۴۳	شجاع الدولہ کی مسند نشینی	۲۳۲	۳۶۲	دو انگریز جنرلوں کی گرفتاری	۲۴۷
۳۴۴	ایک سازش	۲۳۲	۳۶۳	شجاع الدولہ انگریزی کیمپ میں	۲۴۸
۳۴۵	ایک الزام	۲۳۲	۳۶۴	انگریزوں سے صلح کی بات چیت	۲۴۸
۳۴۶	جناب عالیہ کی مداخلت	۲۳۴	۳۶۵	شجاع الدولہ کی کلائیو سے ملاقات	۲۴۹
۳۴۷	راجہ بنارس پر حملہ	۲۳۵	۳۶۶	انگریزوں سے مصالحت	۲۴۹
۳۴۸	شجاع الدولہ نواب سعد اللہ خان	۲۳۵	۳۶۷	راجا بلونت سنگھ کی معافی	۲۴۹
۳۴۹	غازی الدین خاں کا حملہ	۲۳۶	۳۶۸	شجاع الدولہ کا ملک پر قبضہ	۲۵۰
۳۵۰	روہیلہ مرہٹہ جنگ اور	۲۳۸	۳۶۹	فیض آباد کو مستقر بنایا	۲۵۰
	شجاع الدولہ		۳۷۰	فیض آباد کی ترقی	۲۵۰

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۷۱	فوجی تیاری	۲۵۳	۳۸۹	شکار	۲۶۰
۳۷۲	آصف الدولہ کی شادی	۲۵۴	۳۹۰	مذہب	۲۶۱
۳۷۳	روہیلکھنڈ پر حملہ	۲۵۵	۳۹۱	ذمہ داری کا احساس	۲۶۱
۳۷۴	شجاع الدولہ کی حکومت		۳۹۲	سفارت خانے	۲۶۱
	کا رقبہ	۲۵۶	۳۹۳	اقتصادی پالیسی	۲۶۲
۳۷۵	شجاع الدولہ کا انتقال	۲۵۶	۳۹۴	زراعت کی ترقی	۲۶۲
۳۷۶	شجاع الدولہ کے ذاتی اوصاف	۲۵۷	۳۹۵	عمارت کا شوق	۲۶۲
۳۷۷	شکل و شمائل	۲۵۷	۳۹۶	ملکی نظام	۲۶۳
۳۷۸	تعلیم	۲۵۷	۳۹۷	بہو بیگم کا خزانہ	۲۶۳
۳۷۹	اخلاق	۲۵۷	۳۹۸	عدل و انصاف	۲۶۴
۳۸۰	مزاج کی نرمی	۲۵۷	۳۹۹	شاعری کا ذوق	۲۶۵
۳۸۱	تمکنت	۲۵۷	۴۰۰	شاعرات	۲۶۵
۳۸۲	سیاست	۲۵۸	۴۰۱	شعراء	۲۶۵
۳۸۳	حسن پرستی	۲۵۸	۴۰۲	باہر سے آنے والے شعراء	۲۶۶
۳۸۴	کھیل تماشے	۲۵۹	۴۰۳	اہل دہلی کی آمد	۲۶۷
۳۸۵	جانوروں کی لڑائی	۲۵۹	۴۰۴	طوائفوں سے دلچسپی	۲۶۸
۳۸۶	سپہ گری	۲۵۹	۴۰۵	بے تعصبی	۲۶۹
۳۸۷	پہلوانی	۲۵۹	۴۰۶	تفریحات	۲۶۹
۳۸۸	پیراکی	۲۵۹	۴۰۷	علم و فن کی قدردانی	۲۶۹

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۴۰۸	تفضل حسین خاں علامہ	۲۷۰
۴۰۹	میرشمس الدین جعفر	۲۷۰
۴۱۰	اطباء	۲۷۰
۴۱۱	فیض آباد کا تمدن	۲۷۱
۴۱۲	خطاطی	۲۷۱
۴۱۳	فنون سپہ گری	۲۷۱
۴۱۴	کھانے میں جدتیں	۲۷۲
۴۱۵	ارباب نشاط	۲۷۳
۴۱۶	شام اودھ	۲۷۳
۴۱۷	معاشرہ کی سنجیدگی	۲۷۴
۴۱۸	مذہبی رواسم	۲۷۵
۴۱۹	آصف الدولہ کی تخت نشینی	۲۷۸
۴۲۰	بدنظمی	۲۷۹
۴۲۱	سعادت علیخاں کی روہیلکھنڈ سے برطرفی بنارس جونپور اور غازی پور انگریزوں کو دیدیا	۲۷۹
۴۲۲	مختار الدولہ کا قتل	۲۸۰
۴۲۳	ایلچ خان کی آمد	۲۸۰
۴۲۴	حسن رضا خاں نائب ریاست	۲۸۰
۴۲۵	شکیت رائے	۲۸۰
۴۲۶	حیدر بیگ خاں	۲۸۰
۴۲۷	تفضل حسین خاں کی سفارت	۲۸۰
۴۲۸	انگریزوں کی مداخلت سے پریشانی	۲۸۱
۴۲۹	حکیم ارشد سے مرض الموت میں مبتلا ہونے کا مشورہ	۲۸۱
۴۳۰	آصف الدولہ کا انتقال	۲۸۱
۴۳۱	آصف الدولہ کے ذاتی اوصاف	۲۸۲
۴۳۲	لہو ولعب	۲۸۲
۴۳۳	علم کی قدردانی	۲۸۲
۴۳۴	شہر کی وسعت	۲۸۲
۴۳۵	لکھنؤ میں نئے محلے	۲۸۳
۴۳۶	باغات	۲۸۳
۴۳۷	عمارات کی تعمیر	۲۸۳
۴۳۸	وزیر علی کی شادی	۲۸۴
۴۳۹	شکار	۲۸۴
۴۴۰	جدت پسندی	۲۸۴
۴۴۱	سخاوت	۲۸۴
۴۴۲	شجاعت	۲۸۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۴۴۳	روہیلکھنڈ کی جنگ	۲۸۵	۴۵۹	معارف النغمات کی تصنیف	۲۹۳
۴۴۴	شاہ عالم کی مدد	۲۸۵	۴۶۰	علامہ تفضل حسین خاں اور موسیقی	۲۹۳
۴۴۵	کھانے کا شوق	۲۸۶	۴۶۱	بھانڈ سیانورا اور کربلا	۲۹۳
۴۴۶	دینداری	۲۸۶	۴۶۲	خطاطی کی ترقی اور مشہور خطاط	۲۹۳
۴۴۷	تعزیہ داری	۲۸۶	۴۶۳	طغرا نویسی	۲۹۳
۴۴۸	شاعری	۲۸۷	۴۶۴	طب یونانی اور مشہور اطبا	۲۹۴
۴۴۹	آصف الدولہ کی بیوی		۴۶۵	علوم عربیہ	۲۹۵
	شمس النساء شرم کی	۲۸۹	۴۶۶	لکھنؤ کا تمدن	۲۹۵
	شاعری		۴۶۷	لکھنؤ کے صناع	۲۹۵
۴۵۰	شعراء کی قدردانی	۲۹۰	۴۶۸	لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کا موازنہ	۲۹۶
۴۵۱	مصحفی کی توہین پر	۲۹۰	۴۶۹	عہد آصفی میں شیعیت کی تجدید	۲۹۷
۴۵۲	انشاء کو سزا	۲۹۰	۴۷۰	شیعیت کی تجدید میں نواب	
۴۵۳	دہلی کے نامور افراد لکھنؤ میں	۲۹۰		حسن رضا خاں کی سعی	۲۹۷
۴۵۴	دوسری جگہ سے آنیوالے شعراء	۲۹۱	۴۷۱	تیرہویں صدی ہجری میں	
۴۵۵	ادبی مرکزیت لکھنؤ کو	۲۹۲		شیعیت کی تجدید	۳۰۰
۴۵۵	موسیقی کو ترقی	۲۹۳	۴۷۲	مغلوں سے پہلے شیعہ اپنے کو	
۴۵۶	عہد آصفی کی مشہور طوائفیں	۲۹۳		ظاہر نہیں کرسکتے تھے	۳۰۰
۴۵۷	طبلہ نواز	۲۹۳	۴۷۳	مغل حکومت اور شیعہ	۳۰۰
۴۵۸	کتھک ناچ کو ترقی	۲۹۳	۴۷۴	علمائے اہلسنت جو شیعہ ہوئے	۳۰۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۴۷۵	نصیر آباد جائس کے شیعہ	۳۰۲	۴۸۹	عماد الاسلام کا دنیا میں مثل نہیں	۳۰۶
۴۷۶	جائس کے علمائے شیعہ	۳۰۲	۴۹۰	عماد الاسلام پر علماء کی آرا	۳۰۶
۴۷۷	شیعیت کی زبوں حالی	۳۰۲	۴۹۱	غفرانمآب کی جلالت علمی	۳۰۷
۴۷۸	مولانا دلدار علی غفرانمآب کی شخصیت	۳۰۲	۴۹۲	غفرانمآب کی جلالت علمی کے متعلق علماء کے اقوال	۳۰۷
۴۷۹	مولانا دلدار علی کا علم دین حاصل کرنے کے لئے گھر سے نکلنا	۳۰۳	۴۹۳	شیعوں کی پہلی نماز جماعت	۳۰۹
			۴۹۴	شیعہ قومیت کی تشکیل	۳۰۹
۴۸۰	مولانا دلدار علی کی سرفراز الدولہ سے گفتگو	۳۰۳	۴۹۵	نماز جمعہ کی ابتداء	۳۰۹
			۴۹۶	موعظہ کی ابتداء	۳۱۰
۴۸۱	مولانا دلدار علی کا علم دین حاصل کرنے کے لئے عراق کا سفر	۳۰۴	۴۹۷	آصف الدولہ کا بھنگ نوشی سے توبہ کرنا	۳۱۰
۴۸۲	مولانا دلدار علی کا نجف میں تحصیل علم کرنا	۳۰۴	۴۹۸	اصلاحی کوششیں	۳۱۰
			۴۹۹	تصوف کی مخالفت	۳۱۰
۴۸۳	نجف میں غفرانمآب کے حالات	۳۰۵	۵۰۰	اخباریت کی رد تعزیہ داری	۳۱۱
۴۸۴	اپنی اولاد میں علم دین باقی رہنے کی دعا	۳۰۵	۵۰۱	تعزیہ داری میں اصلاحیں	۳۱۲
			۵۰۲	حدیث خوانی کی ابتداء	۳۱۳
۴۸۵	رسول پور کے سید کا واقعہ	۳۰۵	۵۰۳	درس و تدریس	۳۱۳
۴۸۶	غفرانمآب کی حکومت سے بے اعتنائی	۳۰۵	۵۰۴	ہندوستان کے گوشے گوشے میں مبلغین بھیجے	۳۱۳
۴۸۷	تصنیف و تالیف میں مشغولیت	۳۰۶			
۴۸۸	عماد الاسلام کی تصنیف	۳۰۶	۵۰۵	غفرانمآب کی تحریک کی غیر معمولی کامیابی	۳۱۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۵۰۶	غفرانمآب کی کامیابی پر علماء کا اعتراف	۳۱۷		معاہدہ پر انگریزوں نے نواب سے دستخط لی	۳۳۲
۵۰۷	غفرانمآب نے حکومت کا کوئی عہدہ قبول نہیں کیا	۳۱۸	۵۲۱	کمپنی نے زبردستی آدھا ملک لے لیا	۳۳۳
۵۰۸	غفرانمآب سب سے بڑے مجدد مذہب ہیں	۳۱۸	۵۲۲	تیسرے معاہدہ پر	۳۳۴
۵۰۹	غفرانمآب کی تحریک سے کربلا سے نجف تک نہر بنی	۳۱۹	۵۲۳	رزیڈنٹ سے کشمکش	۳۳۵
			۵۲۴	ملکی انتظام	۳۳۵
۵۱۰	قبرستان	۳۱۹	۵۲۵	صبح کا دربار	۳۳۵
۵۱۱	وزیر علی آصف جاہ	۳۲۲	۵۲۶	بارہ بجے دن کا دربار	۳۳۶
۵۱۲	وزیر علی کی تخت نشینی	۳۲۲	۵۲۷	تفریح	۳۳۶
۵۱۳	وزیر علی آصف الدولہ کا بیٹا	۳۲۴	۵۲۸	شام کا دربار	۳۳۷
۵۱۴	محضر پر دستخط	۳۲۴	۵۲۹	نئے انتظامات	۳۳۷
۵۱۵	وزیر علی کی معزولی	۳۲۴	۵۳۰	عدل وانصاف	۳۳۸
۵۱۶	مورخین کی غلط فہمی	۳۲۶	۵۳۱	فراست	۳۳۸
۵۱۷	سعادت علی خاں کی تخت نشینی	۳۲۹	۵۳۲	شہر کی ترقی	۳۳۹
۵۱۸	سعادت علی خاں سے انگریزوں نے عہدنامہ پر دستخط کرائی	۳۲۹	۵۳۳	انگریزیت اور انگریزی طرز کا شہر	۳۳۹
			۵۳۴	شکار	۳۴۰
۵۱۹	عہدنامہ کے دفعات	۳۲۹	۵۳۵	گھوڑوں کا شوق	۳۴۱
۵۲۰	چار مہینے کے بعد دوسرے		۵۳۶	رقص وسرود سے دلچسپی	۳۴۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۵۳۷	ہولی	۳۴۲	۵۵۵	بانکے	۳۶۰
۵۳۸	تعزیہ داری	۳۴۲	۵۵۶	جہانگیر بیگ نکٹے	۳۶۲
۵۳۹	سیاست	۳۴۲	۵۵۷	موسیقی	۳۶۴
۵۴۰	طبیعت	۳۴۳	۵۵۸	خطاطی	۳۶۴
۵۴۱	ادبیت	۳۴۴	۵۵۹	تمدن	۳۶۵
۵۴۲	فصاحت	۳۴۶	۵۶۰	فرنگی محل	۳۶۵
۵۴۳	قدر کمال	۳۴۶	۵۶۱	خاندان اجتہاد	۳۶۵
۵۴۴	عربی شاعری	۳۴۵	۵۶۲	سعادت علی خاں کا انتقال	۳۶۵
۵۴۵	فارسی شاعری	۳۴۶		دوسرے علماء	۳۶۶
۵۴۶	فارسی گو ہندو شعراء	۳۵۰		اطراف لکھنؤ کے علماء	۳۶۸
۵۴۷	اردو شاعری	۳۵۱	۵۶۳	سعادت علیخاں پر ایک نظر	۳۷۲
۵۴۸	باہر سے آنے والے شعراء	۳۵۱	۵۶۴	تاریخ لکھنؤ حصہ سوم	
۵۴۹	لکھنوی شعراء	۳۵۲		لکھنؤ کے دور شاہی کے	
۵۵۰	ہندو شعراء	۳۵۵		اکتالیس سال	۳۷۵
۵۵۱	شاعرہ عورتیں	۳۵۵	۵۶۵	شاہ زمن غازی الدین حیدر کی	۳۷۹
۵۵۲	ان پڑھ شعراء	۳۵۶	۵۶۶	مسند نشینی	۳۷۹
۵۵۳	لکھنؤ کی دہلی پر برتری	۳۵۶	۵۶۷	شاہی کا اعلان	۳۸۰
۵۵۴	لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کا موازنہ	۳۵۵	۵۶۸	علمی ذوق	۳۸۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۵۶۹	رفاہ عام کے کام	۳۸۲	۵۸۶	ولیم نائٹن سے ملاقات	۴۰۶
۵۷۰	تعمیرات	۳۸۲	۵۸۷	دربار کی کیفیت	۴۰۷
۵۷۱	جدت طرازی	۳۸۲	۵۸۸	عورتوں کی مگس رانی	۴۰۸
۵۷۲	تصنیفات	۳۸۳	۵۸۹	پرستان	۴۰۹
۵۷۳	خطاطی	۳۸۴	۵۹۰	پرستان کی پریاں	۴۰۹
۵۷۴	سپہ گری	۳۸۴	۵۹۱	پریوں کا پہرہ	۴۰۹
۵۷۵	کھانوں میں جدتیں	۳۸۵	۵۹۲	پریوں کا لباس	۴۰۹
۵۷۶	مصوری	۳۸۶	۵۹۳	ایک شکار کے حالات	۴۱۱
۵۷۷	بھانڈ	۳۸۷	۵۹۴	باز اور چیتوں کے شکار	۴۱۵
۵۷۸	موسیقی	۳۸۷	۵۹۵	زنانہ پلٹن	۴۱۹
۵۷۹	تعزیہ داری	۳۸۷	۵۹۶	پلٹن کا لباس	۴۱۹
۵۸۰	اولوالعزمی	۳۸۷	۵۹۷	کہاریاں اور ان کا لباس	۴۲۰
۵۸۱	غازی الدین حیدر کا انتقال	۳۹۱	۵۹۸	بیگمات کا لباس	۴۲۰
۵۸۲	نصیرالدین حیدر سلیمان جاہ	۳۹۴	۵۹۹	سواری کا اہتمام	۴۲۲
۵۸۳	نصیرالدین حیدر کی عیش پرستیاں	۳۹۶	۶۰۰	کھیل تماشے	۴۲۴
۵۸۴	راگ مالا کا جلسہ	۳۹۹	۶۰۱	بارہ سنگھوں کی لڑائی	۴۲۴
۵۸۵	ولیم نائٹن کی کتاب		۶۰۲	گینڈے کی لڑائی	۴۲۴
	اے ایسٹرن کنگ میں نصیرالدین حیدر کے حالات	۴۰۵	۶۰۳	لڑائی کے ڈیڑھ سو ہاتھی	۴۲۵

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون
۶۰۴	ہاتھی کی لڑائی کا دردناک واقعہ	۴۲۷	۶۱۹	ہیراکی
۶۰۵	محرم کی تفصیلات	۴۲۸	۶۲۰	شاعری
۶۰۶	رفاہ عام کے کام	۴۳۵	۶۲۱	مرثیہ
۶۰۷	علمی کام	۴۳۶	۶۲۲	سوزخوانی
۶۰۸	خطاطی و طباعت	۴۳۶	۶۲۳	حدیث خوانی
۶۰۹	ڈرامے کی ایجاد	۴۳۷	۶۲۴	کھانے میں جدتیں
۶۰۷	راگنیاں عورتیں	۴۳۹	۶۲۵	مٹھائیاں
۶۰۸	ماروراگ	۴۳۸	۶۲۶	تمباکو
۶۰۹	نائکی کہنرا	۴۳۸	۶۲۷	رنگریز
۶۱۰	اہیری ٹوڈی راگنی	۴۳۹	۶۲۸	نئے قسم کا جوتا اور کپڑا
۶۱۱	ملتاگوری راگنی	۴۳۹	۶۲۹	لباس
۶۱۲	جھنجھوٹی راگنی	۴۳۶/۴۳	۶۳۰	فریدون بخت رفیع الدین حیدر مناجان
۶۱۳	کافی راگنی	۴۳۹	۶۳۱	مناجان کے نسب کی تحقیق
۶۱۴	نقالی	۴۴۰	۶۳۲	مناجان کی تخت نشینی
۶۱۵	داستان گوئی	۴۴۰	۶۳۳	مناجان کی گرفتاری
۶۱۶	مصوری	۴۴۰	۶۳۴	مناجان کی موت
۶۱۷	سپہ گری	۴۴۰	۶۳۵	محمد علی شاہ کی تخت نشینی
۶۱۸	جل بالک	۴۴۰	۶۳۶	انگریزوں سے نیا عہدنامہ

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۶۳۷	ملکی انتظام	۴۵۰	۶۵۲	محکمۂ شرعیہ کا قیام	۴۶۲
۶۳۸	جامع مسجد کی تعمیر	۴۵۰	۶۵۳	اسلامی نظام	۴۶۲
۶۳۹	امام باڑہ حسین آباد	۴۵۰	۶۵۴	خزانہ پر زکوٰۃ	۴۶۴
۶۴۰	غرباء کے لئے مکانات کی تعمیر	۴۵۰	۶۵۵	مجتہد العصر کی عدالت	۴۶۴
۶۴۱	نجف میں نہر آصفی کی مرمت	۴۵۱	۶۵۶	بادشاہ کے خلاف سوداگر کا	
۶۴۲	امام حسن عسکریؑ کے روضہ کے			دعویٰ اور اسکی ڈگری	۴۶۴
	گنبد پر سونا چڑھوایا اور چہار	۴۵۲	۶۵۷	اس واقعہ پر مرزا دبیر کے بند	۴۶۴
	دیواری بنوائی		۶۵۸	طوائفوں پر قدغن	۴۶۵
۶۴۳	کربلا میں ایک مسافر خانہ بنوایا	۴۵۲	۶۵۹	مدرسہ سلطانی کا قیام	۴۶۵
۶۴۴	حر کے روضہ کی تعمیر	۴۵۲	۶۶۰	نجف میں نہر حسینی کی تعمیر	۴۶۷
۶۴۵	خطاطی	۴۵۲	۶۶۱	حضرت مسلم و ہانی کے	۴۶۷
۶۴۶	رقاصی	۴۵۲	۶۶۲	روضہ کی تعمیر	
۶۴۷	شاعری	۴۵۴	۶۶۳	مسجد کوفہ کی مرمت	۴۶۷
۶۴۸	موسمی تفریح	۴۵۴	۶۶۴	مسجد کوفہ میں اذان کا منار	۴۶۷
۶۴۹	شہر کی ترقی	۴۵۵	۶۶۵	شیخ ابراہیم قلمخان کا قصیدہ	۴۶۸
۶۵۰	گنبد خانہ		۶۶۶	امجد علی شاہ کی فرمائش سے	
	کی تعمیر	۴۶۰		علم کلام کی کتاب	
۶۵۱	امجد علی شاہ کی تخت نشینی	۴۶۲	۶۶۷	امجد علی شاہ کے عہد	
				اردو میں تفسیر	

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۶۶۸	علم ہیئت کی کتاب	۴۷۱	۶۸۴	خاندان اجتہاد	۴۸۵
۶۶۹	تعزیہ داری کو ترقی	۴۷۲	۶۸۵	سلطان العلماء محمد مجتہد العصر	۴۸۵
۶۷۰	اہل لکھنؤ کا سپاہیانہ بانکپن	۴۷۳	۶۸۶	علماء کی کثرت	۴۸۵
۶۷۱	ان پڑھ شعراء	۴۷۳	۶۸۷	علمائے خاندان اجتہاد	۴۸۶
۶۷۲	میر انیس کا لکھنؤ میں قیام	۴۷۳		علمائے عراق کی نظر میں	
۶۷۳	میر انیس و دبیر میں شاعرانہ چشمک	۴۷۴	۶۸۸	سلطان العلماء	۴۸۸
۶۷۴	خطاطی	۴۷۵		کی عبادت	
۶۷۵	مصوری	۴۷۶	۶۸۹	سلطان العلماء کا رعب و جلال	۴۸۸
۶۷۶	سپہ گری	۴۷۶	۶۹۰	حق پر استقامت	۴۹۰
۶۷۷	علمی ترقی کا حال	۴۷۶	۶۹۱	سلطان العلماء کی سلاطین	۴۹۴
۶۷۸	شہر کی ترقی و رونق	۴۷۷		سے مخالفت	
۶۷۹	نواب فرخ آباد کی آمد	۴۷۹	۶۹۲	عزاداری	۴۹۴
	اور ان کی دعوت		۶۹۳	واجد علی شاہ اختر	۴۹۷
۶۸۰	گاڑی کی ایجاد	۴۸۰	۶۹۴	ولی عہدی میں فوج کی تربیت	۴۹۷
۶۸۱	امجد علی شاہ کے ذاتی اوصاف	۴۸۲	۶۹۵	واجد علی شاہ کی تخت نشینی	۴۹۸
۶۸۲	علم پروری	۴۸۲	۶۹۶	فوجی ترقی	۴۹۹
۶۸۳	عہد امجد علی شاہ میں شیعیت	۴۸۵	۶۹۷	مملکت کے امور میں مشغولیت	۵۰۰
	کا عروج		۶۹۸	مظلوموں کی دادرسی کا صندوق	۵۰۰

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۶۹۹	نظام حکومت میں تبدیلی	۵۰۱	۷۱۵	فیل خانے کا انتظام	۵۱۵
۷۰۰	دستور داعی	۵۰۱	۷۱۶	گھوڑے	۵۱۵
۷۰۱	فوجی سرگرمیوں سے رزیڈنٹ	۵۰۹	۷۱۷	کبوتر خانہ	۵۱۵
	کی ناراضی		۷۱۸	شاہی کتب خانہ	۵۱۵
۷۰۲	اودھ پر قبضہ کا منصوبہ	۵۱۰	۷۱۹	عدل وانصاف	۵۱۶
۷۰۳	لارڈ ہارڈنگ کا واجد علی		۷۲۰	ہنومان گڑھی کا واقعہ	۵۱۸
	شاہ پر برہمی کا الزام	۵۱۱	۷۲۱	رحمدلی	۵۱۹
۷۰۴	واجد علی شاہ کا جواب	۵۱۱	۷۲۲	دینداری	۵۲۰
۷۰۵	ڈلہوزی گورنر جنرل ہوا	۵۱۱	۷۲۳	بے تعصبی	۵۲۴
۷۰۶	ڈلہوزی کا کرنل سلیمن کو خط	۵۱۱	۷۲۴	ہندو منصبدار	۵۲۶
۷۰۷	سلیمن رزیڈنٹ لکھنؤ آیا	۵۱۲	۷۲۵	رعایا پروری	۵۲۷
۷۰۸	بادشاہ کی بیماری	۵۱۲	۷۲۶	علمی استعداد	۵۲۷
۷۰۹	بادشاہ کی صحت	۵۱۲	۷۲۷	بادشاہ کی فارسی نثر لکھنے	۵۲۹
۷۱۰	مملکت کا نظم ونسق	۵۱۳	۷۲۸	بھانڈوں کے نئے نقل	۵۳۱
۷۱۱	عدالتی نظام	۵۱۳	۷۲۹	گیت	۵۳۱
۷۱۲	پولیس کا محکمہ	۵۱۵	۷۳۰	شاعری کا ذوق	[illegible]
۷۱۳	محاصل کی وصولی	۵۱۵	۷۳۱	یادخلو [illegible]	[illegible]
۷۱۴	کہاروں کا انتظام	۵۱۵	۷۳۲	[illegible]	۵۳۵

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۷۳۳	ہندو شعراء	۵۳۷	۷۴۹	ڈرامہ کا خیال کیوں پیدا ہوا	۵۵۰
۷۳۴	باہر سے آنے والے شعراء	۵۳۷	۷۵۰	جوگیا میلا	۵۵۶
۷۳۵	شاعرہ عورتیں	۵۳۸	۷۵۱	جوگی میلے کا جشن	۵۵۷
۷۳۶	عربی شاعری	۵۳۸	۷۵۲	سرور کا بیان	۵۶۰
۷۳۷	مرثیہ	۵۳۸	۷۵۳	نامی کاکوروی کا بیان	۵۶۰
۷۳۸	ریختی	۵۳۸	۷۵۴	پرستان	۵۶۲
۷۳۹	مزاحیہ گوئی	۵۳۹	۷۵۵	باغ ارم	۵۶۳
۷۴۰	واسوخت	۵۳۹	۷۵۶	ولی عہد کی شادی	۵۶۳
۷۴۱	اندر سبھا	۵۳۹	۷۵۷	چھوٹے مرشدزادے کی شادی	۵۶۵
۷۴۲	موسیقی کا شوق	۵۴۰	۷۵۸	شاہان اودھ پر فضول خرچی	۵۷۳
۷۴۳	موسیقی کی غایت	۵۴۱		کا الزام	
۷۴۴	موسیقی کا جواز	۵۴۲	۷۵۹	فضول خرچی کے افادی پہلو	۵۷۵
۷۴۵	واجد علی شاہ اور موسیقی		۷۶۰	مصوری	۵۷۵
	کی سرپرستی	۵۴۴	۷۶۱	خطاطی	۵۷۶
۷۴۶	موسیقی سے بادشاہ کو		۷۶۲	اخبار کا محکمہ	۵۷۷
	حظ نفس مقصود نہ تھا	۵۴۴	۷۶۳	قرأت	۵۷۷
۷۴۷	لکھنؤ میں	۵۴۶	۷۶۴	کبوتر بازی	۵۷۸
	ایک عجیب شخصیت	۵۴۸	۷۶۵	کبوتر کی طرح طوطے اڑانا	۵۸۰

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۷۶۶	بٹیر بازی	۵۸۰	۷۸۵	سلطنت کی ضبطی کی تحریک	۵۹۵
۷۶۷	سپہ گری	۵۸۲	۷۸۶	الحاق کی اجازت	۵۹۶
۷۶۹	چابک سواری	۵۸۴	۷۸۷	سلطنت کی ضبطی کے تعلقات	۵۹۷
۷۷۰	مصوری	۵۷۶	۷۸۸	واجد علی شاہ کے سامنے	۵۹۸
۷۷۱	خطاطی	۵۷۷		معاہدہ دستخط کے لئے	
۷۷۲	بٹیر بازی	۵۸۱	۷۸۹	معاہدہ کی دفعات	۵۹۸
۷۷۳	مرغ بازی	۵۸۲	۷۹۰	بادشاہ کا دستخط کرنے سے انکار	۶۰۰
۷۷۴	شتر سواری	۵۸۳	۷۹۱	سلطنت کی ضبطی	۶۰۰
۷۷۵	شہ زوری	۵۸۵	۷۹۲	بادشاہ کا سفر کلکتہ	۶۰۱
۷۷۶	پیراکی	۵۸۷	۷۹۳	بنارس میں قیام	۶۰۱
۷۷۷	عام باورچی	۵۸۸	۷۹۴	راجہ بنارس کی میزبانی	۶۰۳
۷۷۸	شاہی باورچی	۵۸۸	۷۹۵	سلطنت کی ضبطی اور اسکے	
۷۷۹	عام رکابدار	۵۸۹		اثرات	۶۰۴
۷۸۰	مختلف اہل کمال	۵۹۰	۷۹۶	بادشاہ کے خلاف پروپگنڈہ	۶۰۴
۷۸۱	عظیم اللہ ثانی	۵۹۱	۷۹۷	ہتھیاروں کی ضبطی	۶۰۵
۷۸۲	شہر کی ترقی و رونق	۵۹۲	۷۹۸	شہر میں سناٹا	۶۰۵
۷۸۳	آبادی	۵۹۴	۷۹۹	رعایا کا غم و الم	۶۰۶
۷۸۴	ارزانی	۵۹۴	۸۰۰	غم انگیز نظمیں اور گیت	۶۰۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۸۰۱	ایک نیا محاورہ	۶۰۹	۸۱۷	ڈراما	۶۲۸
۸۰۲	برسات میں جوش ملیح آبادی کے گھر کا واقعہ	۶۰۹	۸۱۸	لکھنؤ کا اثر ڈرامے اور سنیما پر	۶۳۸
			۸۱۹	کنکوے بازی	۶۳۸
۸۰۳	دیہاتی عورتوں کے گیت	۶۰۹	۸۲۰	خاندان اجتہاد کی ایجاد مسائل	۶۳۹
۸۰۴	واقعۂ کربلا کے ساتھ سلطنت اودھ کا ماتم	۶۱۱	۸۲۱	اخبارات	۶۳۹
			۸۲۲	لکھنؤ	۶۴۱
			۸۲۳	چودھویں صدی ہجری	۶۴۱
۸۰۵	جنگ آزادی	۶۱۳	۸۲۴	۱۸۵۸ء سے ۱۹۰۱ء تک	۶۴۱
۸۰۶	بغاوت کے تفصیلات	۶۱۴	۸۲۵	فرنگی محل	۶۴۳
۸۰۷	اہل لکھنؤ کی بہادری کی تعریف	۶۱۵	۸۲۶	مولانا عبدالحی	۶۴۳
	مورخین کی زبانی		۸۲۷	مولانا فضل اللہ	۶۴۳
۸۰۹	شرفائے لکھنؤ کی عزت	۶۱۷	۸۲۸	مولانا عبدالرب	۶۴۳
۸۱۰	غدر کے بعد لکھنؤ کی حالت	۶۲۱	۸۲۹	مولانا عبدالرزاق	۶۴۴
۸۱۱	شہر کے خوشگو شعراء	۶۲۴	۸۳۰	مولانا رحمت اللہ	۶۴۳
۸۱۲	ان پڑھ شعراء	۶۲۵	۸۳۱	مولانا محمد نعیم	۶۴۳
۸۱۳	ہندو شعراء	۶۲۵	۸۳۲	خاندان اجتہاد	۶۴۳
۸۱۴	شاعرہ خواتین	۶۲۵	٦٣٣	تاج العلماء	۶۴۳
۸۱۵	شاعرہ طوائفیں	۶۲۵	٦٣۴	تاج العلماء کی کتاب کا صرفہ	۶۴۴
۸۱۶	موسیقی	۶۲۸	٦٣۵	مولانا ابوالحسن عرف مچھن صاحب	۶۴۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
٦٣٦	مولانا محمد حسین عرف علن صاحب	٦٤٦	٦٥٣	مولانا محمد نقی صاحب	٦٥٦
٦٣٧	مولانا محمد مصطفےٰ عرف میر آغا صاحب	٦٤٧	٦٥٤	مولانا مرزا رضا علی صاحب	٦٥٦
٦٣٨	مولانا محمد ابراہیم صاحب	٦٤٨	٦٥٥	مولانا مرزا محمد خلیل	٦٥٦
٦٣٩	مولانا ہدایت حسین صاحب	٦٤٩	٦٥٦	مولانا سید علی صاحب	٦٥٧
٦٤٠	مولانا علی اکبر صاحب	٦٤٩	٦٥٧	مولانا مرزا محمد ہادی صاحب	٦٥٧
٦٤١	مولانا سبط محمد صاحب	٦٥٠	٦٥٨	اطبا	٦٥٧
٦٤٢	مولانا سید مرتضیٰ صاحب	٦٥٠	٦٥٩	روسا	
٦٤٣	مولانا رضا حسین صاحب	٦٥٠	٦٦٠	راجا امیر حسین خاں	٦٥٧
٦٤٤	مولانا ابو الحسن عرف ابو صاحب	٦٥١	٦٦١	آغا ابو صاحب	٦٥٧
٦٤٥	مولانا احمد علی صاحب	٦٥١	٦٦٢	سلطان المدارس کا قیام	٦٥٨
٦٤٦	مولانا مفتی محمد عباس صاحب	٦٥١	٦٦٣	ناظم صاحب	٦٥٨
٦٤٧	مولانا غلام حسین صاحب		٦٦٤	مدرسہ ناظمیہ کا قیام	٦٥٨
٦٤٨	علامہ کنتوری	٦٥٢	٦٦٥	محمد عباس علی خاں مرزا بہادر	٦٥٨
٦٤٩	مولانا حامد حسین صاحب	٦٥٢	٦٦٦	پیارے صاحب عالم	٦٥٨
٦٥٠	مولانا کرامت حسین صاحب	٦٥٥	٦٦٧	نواب سردار صاحب	٦٥٨
٦٥١	مرزا عالیجاہ والاجاہ	٦٥٦	٦٦٨	حامد علی خاں بیرسٹر	٦٥٨
	مولانا مفتی نقی		٦٦٩	علی بخش باورچی	٦٥٩
٦٥٢	مولانا جعفر حسین صاحب	٦٥٦	٦٧٠	نواب علی خاں گڑھیا کے نواب	٦٦٠

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۶۷۱	نواب مہدی حسین ماہر	۶۶۰	۷۰۳	معکوس نویسی	۶۷۸
۶۷۲	مجلسیں	۶۶۱	۷۰۴	مبرن جالے لیے	۶۷۹
۶۷۳	ماہر صاحب کی مجلسیں	۶۶۱	۷۰۵	قیصر حسین داستان گو	۶۷۹
۶۷۴	مشاعرے	۶۶۲	۷۰۶	ہدایت اللہ خاں	۶۷۹
۶۷۵	نواب اصغر حسین فاخر	۶۶۲	۷۰۷	شاہ میر خاں رمال	۶۷۹
۶۷۶	نواب پھلکی قدر	۶۶۳	۷۰۸	سجاد حسین سادے کار	۶۷۹
۶۷۷	شیخ علی عباس وکیل	۶۶۳	۷۰۹	ڈراما	۶۸۰
۶۷۸	شہنشاہ حسین وکیل	۶۶۳	۷۱۰	اخبار	۶۸۰
۶۷۹	عربی مقاصدے کی ایجاد	۶۶۳	۷۱۱	نظم اخبار	۶۸۳
۶۸۰	محمد مہدی صاحب ادیب لکھنوی	۶۶۳	۷۱۲	لکھنؤ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۷ء تک	۶۸۹
۶۸۱		۶۴۱	۷۱۳	پہلا طبقہ	۶۸۹
۶۸۲	چودھویں صدی ہجری	۶۴۱	۷۱۴	علمائے فرنگی محل	۶۸۹
۶۸۳	انگریزی تہذیب کے خلاف نظمیں	۶۴۱	۷۱۵	مولانا عین القضاۃ	۶۸۹
۶۸۴	اردو شعراء	۶۶۴	۷۱۶	خاندان اجتہاد	۶۹۰
۶۸۵	شہر کے خوشگو شعراء	۶۶۵	۷۱۷	مولانا آغا حسن صاحب	۶۹۰
۶۸۶	ہندو شعراء	۶۶۵	۷۱۸	مولانا ابن حسن صاحب	۶۹۰
۶۸۷	شاعرہ خواتین	۶۶۵		مولانا ابن حسن صاحب	۶۹۰
۶۸۸	شاعرہ طوائفیں	۶۶۶			
۶۸۹	مزاحیہ گو شعراء	۶۶۸			
۶۹۰	ان پڑھ شعراء	۶۷۰			
۶۹۱	بلاقی بدتر	۶۷۰			
۶۹۲	اسلام علی یافت	۶۷۴			
۶۹۳	شیخ فتح محمد حقیر	۶۷۴			
۶۹۴	قدرت علی	۶۷۵			
۶۹۵		۶۷۶			
۶۹۶	عابد حسین عابد	۶۷۶			
۶۹۷	گلشن بیگم	۶۷۷			
۶۹۸	موسیقی	۶۷۷			
۶۹۹	نقالی	۶۷۷			
۷۰۰	بیساکی	۶۷۷			
۷۰۱	سپہ گری	۶۷۸			
۷۰۲	خطاطی کا فن	۶۷۸			

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۷۴۲	مولانا محمد باقر صاحب	۶۹۱	۷۵۹	سید جالب	۷۲۴
۷۴۳	مولانا محمد ہادی صاحب	۶۹۱	۷۶۰	بٹلر صاحب گورنر	۷۲۴
۷۴۴	مولانا سبط حسین صاحب	۶۹۲	۷۶۱	اطبار	۷۲۵
۷۴۵	مولانا علی غضنفر صاحب	۷۱۴	۷۶۲	حدیث خوانی	۷۲۵
۷۴۶	مولانا سید محمد عرف آغا جان صاحب	۷۱۴	۷۶۳	داستان گوئی	۷۲۵
۷۴۷	مولانا سعادت حسین صاحب	۷۱۵	۷۶۴	روسار	۷۲۵
۷۴۸	مولانا ناصر حسین صاحب	۷۱۵	۷۶۵	مہاراجہ سر محمد علی محمد جان	۷۲۵
۷۴۹	مولانا نجم الحسن صاحب	۷۱۸	۷۶۶	شہزادے باقر مرزا	۷۲۶
۷۵۰	مولانا ظہور الحسن صاحب	۷۱۹	۷۶۷	نواب صاحب شیش محل	۷۲۶
۷۵۱	مولانا ابو الحسن صاحب کشمیری	۷۲۰	۷۶۸	نواب [illegible]	۷۲[illegible]
۷۵۲	مولانا مرزا محمد ہادی صاحب مرزا	۷۲۰	۷۶۹	اخبار	۷[illegible]
۷۵۳	مولانا علی حیدر نظم طباطبائی	۷۲۲	۷۷۰	شعراء	۷[illegible]
۷۵۴	مولانا علی اصغر صاحب	۷۲۳	۷۷۱	بندہ کاظم جاوید	۷۲۷
۷۵۵	مولانا مہدی حسن	۷۲۳	۷۷۲	جلیل مانکپوری	۷۲۷
۷۵۶	مولانا عبد الحلیم شرر	۷۲۳	۷۷۳	ریاض خیرآبادی	۷۲۷
۷۵۷	محمد علی	۷۲۴	۷۷۴	امجد علی شوق	۷۲۸
۷۵۸	منشی احمد حسین صاحب	۷۲۴	۷۷۵	مزاحیہ گو شعراء	۷۲۸

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۷۷۶	شہر کے خوشگو شعراء	۷۲۸
۷۷۷	ہندو شعراء	۷۲۹
۷۷۸	مصوری	۷۳۰
۷۷۹	موسیقی	۷۳۰
۷۸۰	نقالی	۷۳۱
۷۸۱	پیراکی	۷۳۱
۷۸۲	سوزخوانی	۷۳۱
۷۸۳	سپہ گری	۷۳۲
۷۸۴	کنکوے بازی	۷۳۲
۷۸۵	[illegible]	۷۳۴
۷۸۶	[illegible] صاحب اور مشاعرہ	۷۳۴
۷۸۷	پیارے صاحب اور مشاعرہ	۷۳۶
۷۸۸	دوسرا طبقہ	۷۳۷
۷۸۹	علماء	۷۳۷
۷۹۰	مولانا قطب الدین عبدالوالی	۷۳۷
۷۹۱	مولانا صبغت اللہ	۷۳۷
۷۹۲	مولانا عنایت اللہ	۷۳۷
۷۹۳	مولانا احمد علی	۷۳۷
۷۹۴	مولانا عبدالحکیم ٹکسال والے	
۷۹۵	مولانا عبدالشکور	۷۳۷
۷۹۶	مولانا محمد طاہر صاحب	۷۳۸
۷۹۷	مولانا علامہ ہندی صاحب	۷۳۸
۷۹۸	مولانا ابوالحسن عرف منشی صاحب	۷۳۸
۷۹۹	مولانا کاظم حسین صاحب	۷۳۹
۸۰۰	مولانا ہدایت حسین عرف ناظم	۷۳۹
۸۰۱	مولانا محمد نقی صاحب	۷۴۱
۸۰۲	مولانا علی گوہر صاحب	۷۴۱
۸۰۳	مولانا علی منور صاحب	۷۴۱
۸۰۴	مولانا عابد علی صاحب	۷۴۱
۸۰۵	مولانا سید علی صاحب آشفتہ	۷۴۲
۸۰۶	مولانا مفتی محمد علی صاحب	۷۴۲
۸۰۷	مولانا مفتی احمد علی صاحب	۷۴۲
۸۰۹	مولانا سبط حسن صاحب	۷۴۳
۸۱۰	مولانا محمد رضا صاحب	۷۴۴
۸۱۱	مولانا عالم حسین صاحب	۷۴۴
۸۱۲	مولانا سجاد حسین صاحب ناظر	۷۴۴
۸۱۳	شیخ ممتاز حسین ایڈیٹر اودھ پنچ	۷۴۵
۸۱۴	اطباء	۷۴۵
۸۱۵	شعراء	۷۴۵
۸۱۶	مزاحیہ گو شعراء	۷۴۶
۸۱۷	ان پڑھ شعراء	۷۴۸
۸۱۹	شاعرہ خواتین	۷۵۰
۸۲۰	شاعرہ طوائفیں	۷۵۱
۸۲۱	ہندو شعراء	۷۵۱
۸۲۲	محمد تقی شادمانی	۷۵۲
۸۲۳	خطاطی	۷۵۲
	موسیقی	۷۵۲

MAAB 1431
maablib.org